مکتبہ اطہر

اپنی بات

واقعات سے وقت کی شناخت ہوتی ہے اور عظیم شخصیتیں اور افراد واقعات کی پہچان کا سبب ہوتے ہیں۔ مثلاً ہزاروں برس سے دنیا میں اپریل کا مہینہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے لیکن ہم ہندستانیوں کی تاریخ میں اسی اپریل کے مہینے میں جلیان والا باغ میں ہزاروں نہتے ہندستانیوں پر اندھا دھند گولیاں برسائی گئیں ___ ۱۹۱۹ء میں اپریل کا یہ مہینہ تاریخ کا ایک یادگار مہینہ اور ہماری جہد آزادی کا ایک ایسا عنوان بن گیا جس میں خون کی سرخی اور چمک دمک موجود ہے۔ ہم اپنے ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں اور آزاد ہندستان کے کروڑوں عوام ان شہیدوں کی یاد مناتے ہوئے جہد آزادی کی تاریخ کو پہچان عطا کرتے ہیں۔

اسی مہینے میں کچھ اہم پہلو مذہبی نوعیت کے ہیں ___ ان میں رام نومی کا تہوار ہے جو احترام و عقیدت کے ساتھ منایا جاتا ہے اور ان اصولوں اور آدرشوں کو یاد کیا جاتا ہے جن کی علامت رام چندر جی تھے۔

ہماری ہندستانی تہذیب کا سنہرا ورق عدم تشدد اور رواداری کی بنیادوں پر اہمیت کا حامل بنا ہے چنانچہ آج سے ڈھائی ہزار برس قبل مہابیر سوامی نے جنم لیا تھا اور اس عدم تشدد کے فلسفے کو عملی شکل عطا کی تھی۔

اسی مہینے میں مذہبی بنیادوں پر عید قرباں کا تہوار بھی ہے جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان مناتے ہیں اور فریضۂ حج ادا کرتے ہیں نیز حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد مناتے ہیں۔

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو یہ مہینہ عظیم شخصیتوں کے عظیم کارناموں کی یاد منانے کا مہینہ ہے اور یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ اسی مہینے میں بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر ۱۴ تاریخ کو پیدا ہوئے تھے وہ ہمارے ملک کے ماہر قانون سازوں میں سے ایک تھے اور ہندستانی آئین کے خد و خال متعین کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

ان سب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اور ان کی یاد مناتے ہوئے ہمارا یہ وطنی فریضہ ہے کہ ان اعلا ترین اصولوں اور آدرشوں کو اپنائیں جن کی بنا پر ان تاریخوں کو اہمیت حاصل ہے۔

ادارۂ نیا دور کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ صحت مند ادبی روایات کو اپناتے ہوئے اپنے قارئین کے تعاون کے سہارے لوگوں میں وطن پرستی کے تصورات کی اشاعت کرے اور اقبالؔ کے لفظوں میں ؎ "خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" ___ کی پاسداری کرتے ہوئے ان تصورات کو اپنائے۔

■ ہندی کے شاعر اور اہل قلم اور ذاتی طور پر راقم الحروف کے قدردان اور بے انتہا شفقت رکھنے والے آنجہانی راجیش شرما (جوائنٹ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات) نے چوتھی مارچ ۱۹۹۶ء کی سوگوار دوپہر میں اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ ان کا المناک حادثہ پورے محکمہ کے لیے تو افسوس ناک تھا ہی ذاتی طور پر مدیر نیا دور اور پورے ادارے کے لیے بے حد المناک اور دل خراش تھا وہ محکمہ میں سب سے انتہا ہر دلعزیز تھے۔ نیا دور کے لیے خصوصی تعلق خاطر رکھتے تھے اور اس کی خصوصی اشاعتوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ اس کے قدردان اور مداح بھی رہتے۔ ان کے پس ماندگان کو تعزیت پیش کرتے ہوئے ادارہ ان کی روح کے سکون و شانتی کے لیے دعاگو ہے۔

ایڈیٹر

دیکھ سکے آنکھ بھی تاکہ تجلّیِ ذات
اس کیلئے اوڑھ لی ہم نے نقابِ صفات

کھول تو اس راز کو پکھ تو نگاہِ عمیق
کیا ہے فنا و ثبات، کیا ہے ممات و حیات

دَورِ ترقی نہیں، دَورِ تنزّل ہے یہ
تو جسے کہتا ہے دن، میرے لیے ہے وہ رات

سبحہ و زنّار میں فرق نہ میں نے کیا
ایک ہے میرے لئے صومعہ و سومنات

نغمۂ اقبالؔ کا سیلِ رواں دیکھ کر
دل نے کہا پا لیا چشمۂ آبِ حیات

دہر میں اے رودِ سندھ! تیرا نہیں ہے جواب
دیکھ چکی ہے نظر راویؔ و نیلؔ و فراتؔ

(پروفیسر) جگن ناتھ آزادؔ
شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی
جموں - ۱۸۰۰۰۶

علی سردار جعفری
[illegible]
ممبئی [illegible]

آوارہ[1]

آوارہ : (فارسی) سرگرداں، پریشان، مارا مارا پھرنے والا، بے دیار، بے خانماں۔ (اُردو) بدکار، بدچلن، شہدا، اوباش، کوچہ گرد، سیلانی۔ یہ لفظ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ جدید اُردو شاعری کا اہم لفظ ہے جس نے اپنے دامن میں ترقی پسند اور اس کے بعد آنے والی نئی شاعری کے بہت سے تصورات کو سمیٹ لیا ہے اور ان تصورات نے اس بدنام لفظ کو ایک شاعرانہ بانکپن دے دیا ہے۔ اُردو میں یہ لفظ پہلی بار غالباً اٹھارھویں صدی میں استعمال ہوا ہے (میں تلاش میں ہوں کہ اس سے پہلے یہ کہاں استعمال ہوا ہے) اٹھارھویں صدی ہندستان کی تاریخ میں مغل انحطاط، انتشار، اُبتری، خانہ جنگی، نادرشاہی قتل عام اور ابدالی حملوں کی صدی ہے۔ فرانسیسیوں، پرتگالیوں اور انگریزوں کی دراز دستیوں کی صدی ہے۔ اس کے وسط میں جنگ پلاسی نے ہندستان کی دو سو برس (دراصل ایک سو نوّے سال) کی غلامی کا سنگِ بنیاد رکھ دیا۔ اس صدی میں ہندستانی سماج کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں اور ہر طرف افراتفری کا دَور دورہ تھا اور ایک نراجی کیفیت طاری تھی۔ بے روزگاری اور مفلسی عام تھی اور بدحالی دلّی کے شاہی قلعوں اور محلوں میں پہرہ دے رہی تھی (میر کی آپ بیتی "ذکرِ میر" میں اس کی دردناک تصویریں ملیں گی) اُردو شاعری پر اس کا اثر ناگزیر تھا اور غزل نے اپنی جمالیاتی معصومیت کھو دی اور وہ سماجی مفہوم اور معاشرتی مسائل سے آلودہ ہو گئی۔ وہ جو صرف معشوق نواز اور عاشق طراز تھی، زمانے کے ناز اُٹھانے لگی۔ اس پس منظر میں میر تقی میر نے جو کہ خدائے سخن تھے "آوارہ" کو پریشاں حالی مصیبت اور دربدر پھرنے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

آسودہ کیونکہ ہوں میں کہ مانند گردباد
آوارگی تمام ہے میری سرشت میں

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

اس عہد کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی آوارہ کا یہی تصوّر ہے:

نہ تنہا مصحفی ہی اس کے ہاتھوں سے ہے آوارہ
کوئی بھی چین سے یارو نہ زیرِ آسماں بیٹھا (مصحفی)

میر نے زیادہ تر غبار اور بگولوں کی تشبیہ سے کام لیا ہے لیکن اگر کہیں صبا اور نسیم کی تشبیہ کو ہاتھ لگایا ہے تو بھی پریشاں حالی کے تصوّر سے الگ نہیں گئے ہیں۔ دربدر ٹھوکریں کھانے کے لیے بھی میر نے صبا ہی کی تشبیہ اختیار کی ہے ؎

ایسی نہیں ہوئی ہے صبا دربدر کہ ہم

یا —

"گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم"

انیسویں صدی میں غالب نے آوارہ اور آوارگی کے مفہوم کو وسعت عطا کی اور پریشاں حالی اور کوچہ گردی میں آزادہ روی کو بھی شامل کر دیا اس طرح اس تصوّر میں شگفتگی پیدا ہو گئی ؎

[1] زیرِ طبع کتاب "سرمایۂ سخن" کا ایک لفظ (س۔ج)

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شعر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ غالب کا خیال آوارگی سے لذت حاصل کر رہا ہے یہاں یہ آسمان کی دین نہیں ہے دل کی تمنا ہے۔ عافیت دشمنی کی طرح آوارگی بھی ایک شوق بن گئی ہے ؎

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

——— غالب

عاشق کا بے ننگ و نام ہونا تو پرانی بات تھی لیکن اس پر جیسا فخر غالب نے کیا ہے شاید ہی کوئی اور شاعر کرے ؎

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

یہ عافیت دشمنی ہی ہے اور کیا ہے۔ اس جذبے میں صوفیوں کا ایک فرقہ (ملامتیہ) شریک ہو سکتا ہے۔

غالب کی شاعری میں کوچہ گردی بڑا محبوب مشغلہ ہے ؎

گلیوں میں میرے نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

کوچہ گردی کو آوارہ گردی کہہ لیجئے اور آوارہ گردی کو بے پروا خرامی، مفہوم وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ فارسی کے ایک شعر میں آوارہ کا لفظ نہیں ہے لیکن ساری شان آوارگی ہی کی ہے۔ عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا ؎

شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

یہ وہ گلی ہے جس میں دین و دل عزیز رکھنے والے داخل نہیں ہو سکتے۔

یہ ورثہ جب ترقی پسند شاعروں تک پہونچا تو ان پر جہانِ معنی کی نئی جہات کے دروازے کھل گئے۔ اٹھارھویں صدی شکست کی صدی تھی اور بیسویں صدی فتح و کامرانی کی بشارت لے کر آئی تھی (اس پر اقبال کی شاعری میں جشنِ عظمتِ آدم شاہد ہے)۔ اب آوارہ صرف کوچہ گرد اور پریشان روزگار ہی نہیں تھا بلکہ باغی بھی تھا۔ انسانی آزادی اور سربلندی کا مجاہد بھی اور تلاشِ حسن و حق میں سرگرداں بھی ؎

سرکشی پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بیباک و خراب

——— سردار جعفری

ایک نوجوان پاکستانی شاعر حبیب جالب کی نظموں کے مجموعے کا نام "برگِ آوارہ" ہے ؎

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

اس کا نہایت بھرپور اظہار مجاز نے اپنی نظم "آوارہ" (تخلیق ۱۹۳۸ء) میں کیا ہے جس میں میر کی پریشاں حالی اور دردمندی، غالب کی آزادہ روی اور لذت اندوزی کے ساتھ ساتھ ہمارے نئے عہد کی باغیانہ روح بھی جلوہ گر ہے۔ اس نظم کا آوارہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کا ہندستانی نوجوان ہے۔ حساس، سرکش، رومانی۔ جس کے دل کی دھڑکنیں ساری دنیا کے باغی نوجوانوں کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہیں۔ آج انسانی قدریں پھر زوال آمادہ نظر آتی ہیں، مجاز کی نظم "آوارہ" ہمارے دلوں کو چھو لیتی ہے ؎

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی

جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لیے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز کی نظم آوارہ نے سارے ہندستان میں اک دھوم مچا دی۔ فراق گورکھپوری کے الفاظ میں:

"اس تیور کی نظم شاید ہی دیکھنے میں آئی ہوگی.... یہ نظم بارود پر چنگاری کے منڈلانے کا منظر پیش کر رہی تھی نظم کی نوک پلک نظر فریب بھی تھی اور اعلان خطرہ بھی کر رہی تھی۔ ایک سوئے ہوئے جوالا مکھی کے عنقریب پھٹ جانے کی گڑگڑاہٹیں اس نظم میں سنائی دیتی تھیں۔ نظم میں ایک خطرناک دل کشی تھی۔ اس میں مقناطیسی کشش تھی۔"

(مجاز کی موت کے بعد بیان۔ مجاز ایک آہنگ، کراچی)

فراق نے نظم کے بار بار یاد آنے کی صفت کا بھی ذکر کیا ہے جس کو Haunting quality کہتے ہیں ـــــ ڈاکٹر ملک راج آنند نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"آوارہ میں بیان کردہ ناامیدی کا جذبہ ہی وہ تمثیل بن گیا جس نے اس دور کے نوجوانوں کے لاشعور کی نچلی سطحوں کو مس کیا تھا۔ محل کی آڑ سے نکلنے والے زرد چاند، ملّا کے عمامے اور بیوہ کی جوانی جیسے لسانی پیکروں

(باقی ص ۱۷ پر)

کرن

مرا آج رونے کو جی چاہتا ہے

وہ چپکے سے آنا مری زندگی میں
کہ جیسے چمن میں بہاروں کا دامن
یہ میرے لبوں پر تبسم تمہارا
کہ پھولوں پہ ہو جیسے گرتی سی شبنم
یہ گل کھل رہے ہیں مگر پنکھڑی سے
مجھے لگ رہا ہے بکھرنے کا عالم
یہ گل اب پرونے کا جی چاہتا ہے
مرا آج رونے کا جی چاہتا ہے

تھے تم ہی ہماری محبت کی منزل
مسافت مگر اب تو بڑھنے لگی ہے
وہ جس شام کا وعدہ تم نے کیا تھا
وہی شام جیسے کہ ڈھلنے لگی ہے
بڑی بے قراری سی لگنے لگی ہے
کہ اب رات بھاری سی لگنے لگی ہے
یہ دامن بھگونے کو جی چاہتا ہے
مرا آج رونے کو جی چاہتا ہے

رتن سنگھ
ای/۱۴۶ - مرلا تال
عقب جینتی سینما
جبل پور

پیامِ عید الاضحیٰ

منزل کی روشنی ہے عیدُ الاضحیٰ
معراجِ زندگی ہے عیدُ الاضحیٰ
محبوبِ خدا فقط ہے راہِ تسلیم
اک درسِ الٰہی ہے عیدُ الاضحیٰ

پیغامِ وفا سب کو سناتا ہے یہ دن
تہذیبِ بندگی سکھاتا ہے یہ دن
اللہ کے احکام پہ سر خم کر دو
آ کے ہر برس بتاتا ہے یہ دن

رباب رشیدی
۱۲۰ - تازی خانہ
لکھنؤ

سخن فہم

اپنے اک دوست سے میں نے یہ کہا بعدِ غزل
شکریہ حسنِ سماعت کا مگر کیا کہیے!
داد و تحسین کے بے رنگ سے رسمی جملے
کیا ملا ہے صلۂ عرضِ ہنر کیا کہیے

یونہی ہوتا تو نہیں معجزۂ فن کا ظہور
خوں کلاکار کا ٹپکا تو کلا جاگی ہے
زخم جب تار نے کھائے ہیں تو نغمے اگلے
چوٹ جب ساز کو پہنچی تو صدا جاگی ہے

تم نے دیکھا ہی نہیں آہ پسِ پردۂ فن
کس قدر درد کے طوفان ہوا کرتے ہیں
دوڑتا ہے رگِ اشعار میں شاعر کا لہو
ورنہ الفاظ تو بے جان ہوا کرتے ہیں

یہ تو دیکھا کہ بہت شوخ ہے تصویر کا رنگ
یہ نہ سمجھا کہ مصور کا لہو شامل ہے
سن کے یہ تلخ بیانی مری وہ صاحبِ ذوق
بولے بیکار کی اس بحث سے کیا حاصل ہے
فن کے شائق ہیں شریکِ غمِ فنکار نہیں
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

(ڈاکٹر) پیام اعظمی
تنظیم المکاتب، گولہ گنج
لکھنؤ

راج بہادر گوڑ

فرقہ پرستی کے خلاف منشی پریم چند کا جہاد

یہ پریم چند کی پیدائش کی صدی ہے اور عالمی امن کونسل کی تجویز پر دنیا بھر میں منائی جاتی ہے۔ ہندستان کو تو اپنے اس سپوت پر جس قدر بھی ناز ہو کم ہے چنانچہ پریم چند صدی کی تقریبات ملک بھر میں منائی جانے والی ہیں۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ایسے میں پریم چند کی روایات کو کھنگالنا اور عصری ہندستان میں سماجی کشمکش سے اُنکی مُطابقت تلاش کرنا اور ان سے روشنی حاصل کرنا ادیبوں سماجی اور سیاسی کارکنوں کے لیے بہت ضروری ہے۔

پریم چند اپنے دور کے نہ صرف چوٹی کے ادیب اور فنکار تھے بلکہ ان کی ایک عہد ساز شخصیت تھی۔ انھوں نے اپنے ورثہ کا جائزہ لیا اور اس میں جو ناقابل قبول عناصر تھے ان کے خلاف بغاوت کی جو بعد کی نسلوں کے لیے روایت بن گئے۔

پریم چند ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ کو پیدا ہوئے، ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ کو ان کا انتقال ہوا۔

انیسویں صدی کے آخری دہے نشاۃ ثانیہ کے زمانہ رہے ہیں اور نشاۃ ثانیہ کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ انگریزی تعلیم کے زیر اثر یہاں ملک کے مختلف حصّوں میں جو نیا متوسّط طبقہ اُبھر رہا تھا۔ اس نے ایک انگڑائی سی لی اور ملک کی تہذیبی زندگی میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ اسی زمانے میں سماجی اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ نشاۃ ثانیہ کے رہناؤں نے محسوس کیا کہ ہندستانی سماج کا کربناک ٹھہراؤ سمندر پار سے آنے والوں کے سامنے ملک کو سبکی اور اہانت سے دوچار کر رہا ہے۔

اسی زمانے میں ملک کی مختلف زبانوں میں نئی ادبی تحریکیں شروع ہوئیں جن کا مقصد ایک معیاری زبان کو فروغ دینا تھا جو بول چال کی زبان سے قریب ہو اس کی فیضیاب ہو اور اس سے اکتساب کرے۔ یہی بنگالی تلگو، مراٹھی، کنڑی وغیرہ سبھی ہندستانی زبانوں میں ہو رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ناول کا رواج ہوا۔ نئی صحافت کی نیو پڑی طنز و مزاح کو فروغ ملا کہ وہ ادیبوں کے ہاتھوں میں سماجی اصلاح کا ہتھیار تھا۔

دوآبۂ گنگ و جمن میں اسی نشاۃ ثانیہ کا جہاں روشن پہلو یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک اور بھارتندو نے اردو اور ہندی کو نکھارا۔ ادب کو نئے اُفق سے اور نثر کو نئے میدانوں سے آشنا کیا وہیں اس نشاۃ ثانیہ کی ایک کوتاہی (اور کربناک کوتاہی) یہ رہی کہ اس عظیم علاقے کی زبان بجائے متحد ہو کر معیاری بننے کے بٹ گئی۔ اردو، ہندی ایک ہی بولی۔ کھڑی بولی کے دو روپ ہو گئیں دونوں کا لوک آدھار جبکہ ایک ہی ہے کھڑی بولی اور دونوں کی گرامر ایک ہے دونوں کا ذخیرہ الفاظ بڑی حد تک مشترک ہے لیکن علمی یا ادبی اصطلاحوں کے لئے اگر ایک نے سنسکرت سے رجوع کیا تو دوسری نے فارسی کو اپنے مزاج کے مطابق پایا۔ ہندی اگر تت سم (سنسکرت کے الفاظ جوں کے توں) الفاظ کو اپناتی تھی تو اردو تد بھو (سنسکرت کے الفاظ بدلی ہوئی شکل میں) اور اب بھرنش سے اپنا دامن بھرتی تھی دونوں ہی ہند آریائی زبانیں ہیں۔ دونوں کی آنول اسی سرزمین دوآبہ گنگ و جمن میں گڑی ہے۔ دونوں یہیں پیدا ہوئیں، پروان چڑھیں اور یہیں کی روایات کو اپنے اندر سمویا۔

اردو اور ہندی میں جہاں بہت سی قدریں مشترک ہیں وہیں رسم خط کچھ الفاظ اور کچھ کچھ مزاج میں اختلاف بھی ہے۔

بدیسی راج میں اسی اختلاف کو ہوا دی گئی ہے اور اس علاقے کی تہذیبی فضا میں اردو اور ہندی کا تنازعہ کھڑا کر دیا گیا اور اردو اور ہندی کو توام بہنوں کے بجائے دشمن جاں سوکنوں کا نام دے دیا گیا۔

پریم چند نے جب آنکھ کھولی اور ادبی تخلیقات شروع کیں تو ایک طرف بدیسی راج ان کے فنکار دماغ پر زبردست بوجھ بنا ہوا تھا۔ ان کے محبوب عوام اور خاص طور پر کسان (جن سے پریم چند کو خاص انس ہے کیونکہ وہ خود دیہات سے متعلق تھے) سخت اذیتوں میں مبتلا تھے اور دوسری طرف ادیب اور فنکار اردو اور ہندی علی گڑھ اور بنارس اسکولوں میں بٹ گئے تھے۔

پریم چند کی ساری زندگی ان حقیقتوں سے سینہ سپری میں گذری۔

پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ناول اور کہانیاں لکھتے اور اس طرح ان دونوں زبانوں کی مشترکہ قوتوں کو ابھارتے تھے اور یہ پریم چند کا میری رائے میں سب سے بڑا ادبی اور تہذیبی کارنامہ ہے خود ان کی ذات ان دونوں زبانوں اور ان زبانوں کے تخلیقی ادب کا سنگم تھی۔

پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں کا بیشتر مواد دیہات اور کسانوں کی زندگی سے لیا گیا ہے اور یہی وہ وسیع دنیا ہے جہاں سامراجی استحصال کی سب سے زیادہ عریاں تصویر نظر آتی ہے اور یہیں سے وہ سوتے بھی پھوٹتے ہیں جو ہندستان کو ایک نئے مستقبل سے آشنا کر سکتے ہیں۔

فرقہ وارانہ تنگ نظری اصل میں متوسط طبقہ کی آفریدہ اور غاصب مفادات کی پروردہ ہے متوسط طبقہ کی یہ خصوصیت ہے کہ جہاں وہ وسیع تر مفادات کے پیش نظر اتحاد و اتفاق کا روح پرور نظارہ پیش کر سکتا ہے وہیں روٹی روزی کے اپنے سوالوں پر اپنے ہی طبقہ کے دوسرے حصوں کے خلاف صف آرا بھی ہو سکتا ہے۔ سارے تنگ نظر، فرقہ وارانہ اور بین علاقائی تنازعے متوسط طبقہ کی اسی تنگ نظری کے آفریدہ ہوتے ہیں۔

پریم چند نے دیہات کو اپنا موضوع بنا کر اپنے ہی آپ میں منقسم اور بٹے ہوئے متوسط طبقہ کے سامنے بنیادی، سماجی حقیقتیں کھول کر رکھ دیں۔ یہ ہر قسم کی تنگ نظری کے خلاف بنیادی لڑائی تھی۔

اپنی کہانی "پنچایت" میں پریم چند نے جمن شیخ اور الگو چودھری کے دو کردار پیش کیے ہیں۔ دونوں کی سادگی اور اصول پرستی کہانی کی جان ہے دونوں میں چشمک اور غلط فہمی پیدا ہو بھی سکتی ہے تو اصول پرستی ان غلط فہمیوں کو دھو بھی دیتی ہے یہی غلط فہمی شہروں میں کچھ اور گل کھلاتی ہے۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں ہی کی بہترین قدریں ابھار کر دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کی دعوت دی ہے۔

"حج اکبر" ایک مسلمان متوسط طبقے کے گھر کی کہانی ہے۔ صابر حسین کا بچہ نصیر اپنی آیا عباسی سے بہت مانوس ہے لیکن صابر حسین کی بیوی شاکرہ کسی طرح عباسی کی چھٹی کر دینا چاہتی ہے۔ عباسی کے چلے جانے کے بعد نصیر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ بیمار پڑ جاتا ہے۔ شاکرہ کے دل میں بھی کانٹا کھٹکنے لگتا ہے۔ صابر حسین جو ویسے مرنجاں مرنج قسم کے انسان ہیں بیوی سے جھگڑ پڑتے ہیں اور پھر عباسی کو لینے نکل جاتے ہیں۔ ادھر عباسی بھی سخت عذاب میں ہے نصیر کے بغیر اس کے لیل و نہار کاٹے نہیں کٹتے۔ وہ حج کے ارادے سے گھر سے نکلتی ہے اور ریل میں بیٹھ بھی چکی ہوتی ہے ایسے میں صابر حسین آتے ہیں اور عباسی کو نصیر کی حالت بتاتے ہیں۔ عباسی سامان ریل کے ڈبے سے باہر پھینک دیتی ہے۔ اتر پڑتی ہے اور صابر حسین کے ساتھ گھر آجاتی ہے۔ نصیر آنکھیں کھول دیتا ہے اور اچھا ہونے لگتا ہے۔

عباسی کا حج چھوٹ گیا لیکن جو ثواب اُسے حاصل ہوا وہ "حج اکبر" کا تھا۔

یہی کہانی پریم چند نے "مہا تیرتھ" کے عنوان سے ہندی میں بھی لکھی ہے۔ صابر حسین کی جگہ "اندرمنی" شاکرہ کی جگہ "سکھدرا" بچہ "ادومنی" اور آیا "کیلاشی" ہیں۔

متوسط طبقہ کے دو گھر۔ ایک مسلم اور دوسرا ہندو۔ نام الگ الگ ہیں لیکن دونوں کی جیون کہانی ایک ہی ہے۔

ہندو مسلم ایکتا کے جذبے کو ابھارنا ہی تو مقصود ہے۔

پریم چند نے اپنی ایک دوسری کہانی "عیدگاہ" میں ایک بیوہ امینہ کے پوتے حامد کی اپنی دادی کے ساتھ بے پناہ محبت کو دکھلایا ہے امینہ مفلس ہے۔ عید کے دن اپنے پوتے کو کچھ پیسے دیتی ہے کہ جائے اور کوئی کھلونا لے آئے۔ حامد کے ساتھ اور بھی کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے تھے۔ ہر ایک نے اپنی مرضی کی گڑیا خریدی مگر حامد نے سب کچھ چھوڑ کر دست پناہ (چمٹا) خریدا کیونکہ روٹی سینکنے میں اسکی دادی کی انگلیاں جلتی تھیں۔

ایک غریب مسلمان گھر میں محبت کی یہ قدریں پروان چڑھ رہی ہیں

پریم چند اپنے ہندو پڑھنے والوں کو یہ دکھا کر اعلیٰ قدروں کو اُبھار دیتے ہیں جو دونوں ہی میں مشترک ہیں

اپنی ایک اور کہانی "معافی" میں پریم چند ایک بوڑھے مسلمان شیخ حسن کی زبانی اسلام کی اعلیٰ قدروں کو آشکارا کرتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بتاتے ہیں کہ فتح کے بعد اسپین میں عیسائیوں پر جو مظالم توڑے گئے اس میں اسلام کا نہیں مسلمانوں کا قصور رہے۔ شیخ حسن کے اکلوتے لڑکے جمال کو پیٹر کے بیٹے داؤد نے قتل کر دیا ہے اور داؤد کا مسلمان پیچھا کر رہے ہیں۔ داؤد بھاگتا ہوا شیخ حسن کے گھر میں گھس جاتا ہے جبکہ شیخ حسن قرآن شریف کی تلاوت میں محو ہے۔ شیخ حسن اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ پناہ میں ہے اور جو پناہ لیتا ہے اس پر ہاتھ اٹھانے کی اسلام اجازت نہیں دیتا چاہے وہ بیٹے کا قاتل اور قتل کا بدلہ قتل ہی کیوں نہ ہو۔

اپنی بیسیوں کہانیوں میں پریم چند نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہترین روایتوں اور قدروں کو ابھارا ہے اور ان دونوں عظیم فرقوں کو ستیزہ کاری سے بچنے کی ترغیب دی ہے۔

پریم چند نے ایک ڈرامہ "کربلا" لکھا اس میں انھوں نے ساہس راؤ کا کردار پیش کیا ہے۔ یہ ایک ہندو ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی راستہ سے گذرنا چاہتا ہے جہاں کربلا کے میدان میں حضرت امام حسینؓ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ یزید کی فوجوں سے برسرِ پیکار تھے۔ ساہس راؤ حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے اور ان کی طرف سے جنگ میں حصّہ لے کر شہید ہو جاتا ہے۔ شاید کچھ مسلمانوں نے اسے خلافِ واقعہ سمجھ کر اس پر اعتراض کیا اس پر پریم چند ۲۲ جولائی ۱۹۲۴ء کو منشی دیانرائن نگم کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"تاریخ اور ڈرامے میں فرق ہے جیسا کہ آپ خود تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخی ڈرامہ خاص کر کیرکٹروں میں تو کوئی تغیر نہیں کر سکتا مگر ثانوی کیرکٹروں کی تبدیلی و ترمیم یہاں تک کہ تخلیق میں بھی اسے آزادی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تاریخی حیثیت سے آپنے ساہس راؤ کے تداخل پر اعتراض کیا ہے بے شک قدیم روایات میں اس کا کوئی ذکر نہیں مگر ایک روایت ہے جو میں نے رسالہ آئینہ الہ آباد سے لی ہے ممکن ہے کہ وہ روایت غلط ہو لیکن مان لیجئے زیبِ داستان ہی کے لیے لی گئی ہے تو کیا؟ ڈرامہ تاریخ تو نہیں ہے اس سے کسی تاریخی کیرکٹر پر اثر نہیں پڑتا۔ ان کیرکٹروں کا منشا رہے حضرت حسینؓ پر فدا ہو جانا۔ ان کا وجود ہی اسی لیے ہوا ہے۔ یہ ڈرامہ تاریخی ہونے کے ساتھ پولیٹیکل ہے"۔

(مدن گوپال۔ "پریم چند کے خطوط" ص ۱۹۲، ۱۹۳)

اس خط سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ پریم چند ہندو مسلم اتحاد کو ملک قوم کی ایک پولیٹیکل ضرورت سمجھتے ہیں اور اسی مقصد سے تاریخ کی تاویل کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات پر جب کہانی یا ڈرامہ لکھتے ہیں تو اس قدر تحریف کو گوارا کرتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور متحد ہونے میں مدد ملے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ بددیانتی سے پریم چند پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کی ادبی تخلیقات میں پولیس انسپکٹر، داروغہ وغیرہ جیسے ظالم کردار اکثر مسلمان ہوتے ہیں اور اسے وہ پریم چند کی "فرقہ پرستانہ ذہنیت" سے منسوب کرتے ہیں۔

لیکن حافظ محمد عبداللہ نے بھی تو رابرٹ اسمتھ اور ولیم لیب کی ایما پر ایک ڈراما "ناٹک پولیس ڈراما" لکھا تھا۔ جہاں بنیا ہے "دھن داس" پولیس سب انسپکٹر ہے "رشوت بیگ" اور ہیڈ کانسٹبل ہے "زبردست خاں"۔ (حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ اردو ادب میں طنز و مزاح ص ۳۵۴، ۳۵۵ پر فٹ نوٹ) اس ڈرامہ کا مقصد یہ تھا کہ پولیس کو عبرت دلائی جائے لیکن حوالہ دیا وزیر آغا نے، ڈرامہ لکھا حافظ محمد عبداللہ نے اور اس مسلمان ڈرامہ نگار نے بھی تو پولیس سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹبل کو مسلمان دکھایا ہے۔ کیا یہ بھی فرقہ دارانہ تنگ نظری ہے؟

مجھے یاد پڑتا ہے کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مضمون میں اس اعتراض کو غلط بتایا ہے کیونکہ اس زمانہ میں ان عہدوں پر مسلمان ہوتے بھی تھے اور پریم چند نے زندگی ہی سے کیرکٹر لیے ہیں۔ یہ تنگ نظری نہیں حقیقت پسندی ہے۔ پریم چند ہوں کہ حافظ محمد عبداللہ وہ حقیقت کو مجروح نہیں کرتے اور ان ادبی تخلیقات کا منشاء فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینا نہیں ہے بلکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے

نبرد آزما ہونے کے لیے عوام کو متحد ہونے کی ترغیب دینا اور سماج کے ظالم عناصر کو عبرت دلانا مقصود ہے۔

پریم چند نے خود اپنی کہانیوں کے مجموعے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچے میں جو اگست ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا۔ کہا ہے کہ ادبی تخلیق مصنّف کے خیال، اس کی ذہنی کیفیت اور تربیت کی نشاندہی کرتی ہے موجودہ افسانے کا بنیادی نقطۂ نظر ہی ذہنی اتار چڑھاؤ ہے۔ واقعات اور کردار تو اس نفسیاتی حقیقت کی تصدیق کے لیے ضروری ہیں۔

اسی دیباچے میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ کہانی کا تفریحی مقصد بھی ہے اور ادبی بھی۔ ادبی وہ ہے جس سے ہمارے نازک ذہنی احساسات کو تحریک ملتی ہے۔ ہم صداقت، بے لوث خدمت، انصاف اور نیکی کا جو غیر شعوری عنصر ہے وہ جاگ اٹھے"

پریم چند کی ادبی تخلیقات ان کے اسی ادبی نظریے سے پھوٹتی ہیں اور اسی سماجی مقصد کی تکمیل کرتی ہیں۔

منشی دیانرائن نگم نے کہا ہے (حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ منشی پریم چند۔ شخصیت اور کارنامے۔ ڈاکٹر قمر رئیس)

"پریم چند تنگ نظر خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمانوں دونوں سے نالاں رہتے تھے۔ اور تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔

کسی زمل صاحب نے منشی پریم چند پر الزام لگایا تھا کہ وہ برہمنوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے بنارسی داس چترویدی کو ۱۸ جنوری ۱۹۳۴ء کے اپنے ایک انگریزی خط میں لکھتے ہیں۔

"انھوں نے (مسٹر زمل) مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں برہمنوں کے طبقہ کا مذاق اڑاتا ہوں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے نام نہاد پجاریوں، مہنتوں اور مذہبی آوارہ گردوں کی مکاریوں کا مذاق اڑایا تھا"

(مدن گوپال)، "پریم چند کے خطوط" ص ۲۹۹)

یہ بھی صحیح ہے کہ ملک کے اس وقت کے حالات اور تنگ نظر فرقہ پرست عناصر کے پروپگنڈے نے کبھی کبھی منشی پریم چند کا موڈ بگاڑ دیا تھا اور پریم چند نے ایک آدھ مرتبہ متحدہ ہندستانی قوم کے تصوّر کو ناممکن خیال کیا ہے۔ منشی دیانرائن نگم نے ایک ہفتہ وار اخبار کے جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اگست ۱۹۱۲ء کے ان کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"..... مگر اخبار کا نمونہ کا م پڑ ہی ہو [illegible] ہندستانی قوم پر اعتماد نہیں رہا۔ اور اسکی کوشش فضول ہے"

(مدن گوپال۔ منشی پریم چند کے خطوط، ص ۴۴)

لیکن وہ کون سے مراحل تھے جنھوں نے ایک لمحے کے لیے ہی سہی پریم چند پر اس قسم کا موڈ طاری کر دیا تھا؟ کیونکہ یہ ان کا رویہ ہرگز نہیں ہے۔

پریم چند کی کہانیوں کے مجموعے "سوز وطن" کو انگریزی کلکٹر نے ان کے "باغیانہ" خیالات کے پھیلانے کے الزام میں ۱۹۰۸ء میں جلا دیا تھا اور اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند نے کہا بھی تھا کہ محض سیاستداں عوام کی قسمتوں کو نہیں بدل سکتے۔ ادیبوں اور فنکاروں کو بھی اہم حصّہ ادا کرنا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو انگریز افسران کی کتاب اس طرح نذر آتش نہ کرتے۔

لیکن بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کئی ایک دوسرے سے متصادم تحریکیں چل پڑی تھیں۔

ایک طرف ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کانگرس نے دادا بھائی نوروجی کی تحریک پر سودیسی بائیکاٹ اور قومی تعلیم کا سہ نکاتی پروگرام منظور کیا تھا۔ قومی تعلیمی ادارے جگہ جگہ قائم ہو رہے تھے۔

۱۹۰۷ء میں سورت کانگرس میں "نرم دل" اور "گرم دل" کے درمیان جھڑپ ہو گئی اور کانگرس میں پھوٹ پڑ گئی۔ آگے چل کر ۱۹۱۶ء میں نئی عوامی "ترک موالات" کی تحریک کے پس منظر میں پھر سے کانگرس کے دونوں گروہوں میں اتحاد ہوا"

بال گنگادھر تلک "گرم دل" کے رہنما تھے۔ اور اس گرم دل کی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں وہ بدیسی سامراج کے خلاف عوامی جدوجہد چاہتے تھے مزدوروں سے علاقہ پیدا کر لیا تھا اور زیادہ ریڈیکل تھے وہیں وہ اپنے مزاج میں "ہندو" تھے۔ مغربی رجحانات کو مضر خیال کرتے تھے ہندستانی عوام کو قدامت پسند قوتیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ کٹر ہندوپن اور قدیم "آریائی تہذیب" کی کچھ لوگ دہائی دیتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں جہاں ان

فرقہ پرست ہندوؤں نے ہندو مہا سبھا بنائی ، یہیں کچھ مسلمانوں نے مسلم لیگ کی بنا ڈالی۔ کانگریس کے گرم دل پر بھی اس ہندو مہا سبھا کی چھاپ نمایاں تھی تلک اور لالہ لاجپت رائے اس گروہ کے رہنما تھے پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی "آپ بیتی" میں کہا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں ہندستانی قومی احیا پر سماجی نقطہ نظر سے رجعت پسندی کی چھاپ تھی مگر تلک اور لاجپت رائے کا مزدور طبقہ سے بھی تعلق تھا۔ تلک بمبئی کے مزدوروں سے متعلق تھے۔ ان کی گرفتاری پر بمبئی کے مزدوروں نے تاریخی ہڑتال کی تھی۔ لاجپت رائے نے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے تاسیسی اجلاس کی صدارت کی تھی۔

اسی زمانہ میں آزادی پسند نوجوانوں میں ، دہشت پسندی ، کا رجحان فروغ پا رہا تھا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو خودی رام بوس نے مظفر پور میں بم کے دھماکے کئے تھے۔

۱۹۰۸ء میں لاہور کانگریس کے اجلاس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی تھی۔

مسلمانوں میں سر سید کی علی گڑھ تحریک کے ساتھ ساتھ اس کی مخالفت میں اور کچھ کچھ اس کے اندر بھی مسلم تنگ نظر عناصر بھی پرورش پا رہے تھے کچھ ایسا ماحول بنا تھا کہ ۱۸۶۷ء میں خود سر سید نے ایک انگریزی افسر کو لکھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں فرقوں کے درمیان لسانی اور تہذیبی خلیج بڑھتی جا رہی ہے اور کسی متحدہ قومیت کے فروغ دینے میں ان دونوں کا مل کر کام کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔

مئی ۱۹۱۰ء میں منشی دیا نرائن نگم کے نام اپنے ایک مکتوب میں منشی پریم چند لکھتے ہیں کہ "نظر صاحب نے اپنے اس رسالہ کو بالکل اسلامی ڈھنگ پر چلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے"۔

(مدن گوپال: "پریم چند کے کچھ خطوط" ص ۳۸) اس جملے سے پریم چند کی اکتاہٹ واضح ہے۔

ایسے میں احیار پسند ماحول نے، جبکہ خودی رام بوس جیسے نوجوانوں کی تحریک منشی پریم چند کے اعتدال پسند ذہن کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی تھی۔ جبکہ تقسیم بنگال کی مخالفت میں ابھرنے والی متحدہ عوامی جدوجہد سرد پڑ چکی تھی اور کانگریس پر بھی اعتدال پسندی پھر سے چھانے لگی تھی۔ پریم چند پر وقتی طور پر ایک ایسا موڈ طاری کر دیا تھا جبکہ وہ متحدہ قومیت سے کچھ مایوس سے معلوم ہوتے تھے۔

لیکن ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء سے پریم چند اپنے اصلی متحدہ قومیت کے بنیادی رویّے کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ یہ زمانہ انگریزی سامراج کے خلاف ایک نئے ابھار کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں میں حسرت موہانی اور شبلی نعمانی جیسے رہنما آگے آتے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں کانگریس لیگ اتحاد کی بنیاد پڑتی ہے۔ گاندھی جی سیاسی افق پر چھائے ہوئے ہیں۔ علی برادران اور گاندھی جی کی رہنمائی میں زبردست متحدہ تحریک چل پڑتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے عروج پر در مناظر دکھائی دیتے ہیں ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے منشی پریم چند کے فنکار ذہن کے سامنے نئے امکانات اور نئی شاہراہیں کھول دیں۔

پریم چند کے اگست ۱۹۱۲ء کے اس خط میں لکھے ہوئے اس جملے کو محض ایک عارضی موڈ سمجھنا چاہئے۔ اور اس کے پیچھے ہندو مسلم احیا پسندی کا پھیلایا ہوا کفر ہے جس نے فنکار پریم چند کے ذہن پر بے دردی سے ضرب لگائی اور ان کا موڈ بگاڑ دیا۔

منشی پریم چند نے فرقہ واریت کے خلاف سخت باتیں لکھی ہیں۔ کہتے ہیں۔

" فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے۔ اُسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شاید شرم آتی ہے۔ اس لیے وہ اس گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جماتا پھرتا تھا۔ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی اب تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب، نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب مگر ہم آج بھی ہندو مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ تہذیب کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آریہ تہذیب ہے، ایرانی تہذیب ہے، عرب تہذیب ہے۔ لیکن عیسائی تہذیب، مسلم یا ہندو تہذیب

نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

(حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ امرت رائے، ہندی "پریم چند قلم کا سپاہی"، ص ۵۲۸)

کوئی چتر سین صاحب تھے جنھوں نے ایک کتابچہ "اسلام کا وِش ورکش (اسلام کا زہریلا درخت)" لکھ مارا تھا۔ پریم چند تڑپ جاتے ہیں۔ ۱۷ جولائی ۱۹۳۲ کو بنارسی داس چترویدی کے نام اپنے ایک انگریزی خط میں لکھتے ہیں۔

"اسلام کا وِش ورکش میں نے اب تک نہیں دیکھا لیکن چترشٹ میں اس کا جو اشتہار چھپا ہے اس سے میں بخوبی بھانپ سکتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ انتہائی شرانگیز اور سستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں کچھ لکھوں گا اور جبکہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور ہیں لیکن ہمیں اسکی پرواہ نہیں کرنی چاہئے ہمارا مقصد مقدس ہے۔"

(مدن گوپال۔ "پریم چند کے خطوط"، ص ۲۹۵)

اسی دن منشی پریم چند نے جتندر کمار کے نام اپنے ہندی خط میں یہ لکھا ہے۔

"اور یہ چتر سین کو کیا ہو گیا ہے: اسلام کا وِش ورکش۔ لکھ ڈالا اسکی ایک آلوچنا تم لکھو اور وہ پستک میرے پاس بھیجو۔ میں نے چترویدی سے پرستاؤ مانگا ہے۔ اس کمیونل پروپگنڈے کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

(مدن گوپال۔ پریم چند کے خطوط۔ ص ۲۹۷)

بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں "شدھی"، "ہندو سنگھٹن" اور تبلیغ اسلام کی تحریکیں چلی تھیں جب ترک موالات کی تحریک ختم ہوئی تو انگریزوں نے بھی اور اندرون ملک رجعت پسند اور احیار پرست قوتوں نے سر اٹھایا اور اس قسم کی تباہ کن، کینہ پرور اور شرانگیز تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں مولانا محمد علی جوہر ان حالات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"جب حکومت نے بڑے چھوٹے تیس چالیس ہزار لیڈروں کو جیل خانوں میں بھر دیا اور عوام ایک بے سر فوج کی طرح رہ گئے حکومت کے گرگے اور وہ لوگ جن کی لیڈریاں اس عجیب و غریب ہنگامے سے ماند پڑ گئی تھیں نکلے اور عوام کو ان کے صحیح رہنماؤں سے جو قید میں گرفتار تھے بدظن کرنا اور گمراہ کرنا شروع کر دیا ایک طرف شدھی سنگھٹن کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ دوسری طرف تبلیغ و تنظیم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔"

(حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ "سیاسی جائزہ۔ از عتیق صدیقی ماہنامہ آجکل۔ دسمبر ۱۹۷۸ء)

منشی پریم سنگھ بھی اس تحریک کے سخت خلاف تھے اور انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ کانگرسی رہنما بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے تھے منشی دیانرائن نگم کے نام ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین چار دن میں بھیجوں گا۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اس مضمون کو "زمانہ" میں جگہ دیں گے۔

(ڈاکٹر قمر رئیس۔ منشی پریم چند۔ شخصیت اور کارنامے، ص ۱۷۲)

پریم چند نے اپنی کئی کہانیوں میں "شدھی" پر کس کر حملے کیے ہیں۔ اپنی ایک کہانی "تالیف" میں ایک ہندو سبھائی کردار "لیلادھری" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جب سے شدھی کی تحریک جاری ہوئی تھی۔ ان کی مالی حالت بہت روبہ اصلاح ہوگئی تھی۔۔"

اپنی ایک دوسری کہانی "بڑے بابو" میں ایک ملازمت کے خواہشمند سے "بڑے بابو" کو اس طرح مخاطب بتاتے ہیں۔

"سوامی شردھانند کی خدمت میں جاکر شدھی پر آمادگی ظاہر کیجئے پھر دیکھئے آپ کی کتنی تواضع اور تکریم ہوتی ہے۔۔۔ اس کے بعد اسلام کی مخالفت پر ایک دو مضمون یا سلسلۂ مضامین کسی ہندو رسالے میں لکھ دیں گے تو آپ کی زندگی اور معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

اس سے بھی سہل نسخہ ہے تبلیغی مشن میں شریک ہو جائیے۔ کسی ہندو عورت خصوصاً نوجوان بیوہ پر ڈورے ڈالئے۔ آپ کو یہ دیکھ کر

حیرت ہوگی کہ وہ کتنی آسانی سے آپ سے متنفر ہو جاتی ہے۔ آپ اسکی حیات تاریک کے لئے مشعل ثابت ہوں گے وہ بے عذر ہوتی ہے۔ شوق سے اسلام قبول کرے گی بس آپ شہیدوں میں داخل ہو گئے۔ اگر آپ ذرا احتیاط سے کام کرتے رہیں تو آپ کی زندگی بڑی فارغ البالی سے گزرے گی۔

آپ بھول کر بھی اپنی پیشانی کو منت کش سجدہ نہ بنائیں کوئی مضائقہ نہیں آپ بھول کر بھی زکوٰۃ سے اپنے آپ کو ملوث نہ کریں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اپنے کو اپنے مذہب کے نام پر فریاد کرنے کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہنا اور دوسروں کو آمادہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ کے ضلع میں دو ڈپٹی کلکٹر ہندو ہیں اور مسلمان صرف ایک تو آپ کا فرض ہے کہ ہز اکسلنسی گورنر کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کے لیے رو سا قوم کو آمادہ کریں اگر آپ کو معلوم ہو کہ کسی میونسپلٹی نے قصابوں کو شہر سے باہر دوکان رکھنے کی تجویز پاس کردی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ زعمیانِ قوم کو اس میونسپلٹی کی سرزنش کرنے کے لیے تحریک کریں۔ آپ کو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے قومی خدمت کا راگ الاپنا چاہئے مثلاً امتحان کے نتائج میں اگر آپ کو مسلمان طلبا کی تعداد مناسب سے کم نظر آئے تو آپ کو فوراً چانسلر کے پاس ایک گمنام خط لکھ کر بھیجنا ہوگا کہ اس معاملہ میں ضرور سختی سے کام لیا گیا ہے۔

غرض عظیم فنکار پریم چند نے تنگ نظری کے خلاف، فرقہ پرست ذہنیت کے خلاف توسن قلم کی جولانیاں دکھلائی ہیں۔ ہر عظیم فنکار کی طرح وہ اپنے پڑھنے والوں کے نازک ذہنی احساسات کو مہمیز کرتے ہیں۔ وہ صداقت، بے لوث خدمت، اور انصاف، اور نیکی کے غیر ملوث عناصر کو جوان کے پڑھنے والوں میں موجود ہیں۔ جھنجھوڑ کر جگاتے ہیں۔ پریم چند کی روایت آج ہمارے ملک کے لیے نہایت ہی اہم ہے۔

□□

> "کہا جاتا ہے کہ میں امن کا مخالف ہوں، یہ درست نہیں ہے میں تو امن میں یقین رکھتا ہوں لیکن اس امن میں جو انصاف پر مبنی ہو، نہ کہ قبرستان کے امن میں۔ جب تک دنیا میں انصاف کا احترام نہیں ہوتا تب تک کسی قسم کا امن قائم نہیں ہو سکتا۔"
>
> ڈاکٹر امبیڈکر

عقیدت تیری

نیتاجی سبھاش چندر بوس کی یاد میں

تھی پرے شرحِ معانی سے عقیدت تیری
ایک ایثار مسلسل تھی حقیقت تیری

نام پہ تیرے زمانے کی جبیں جھکتی ہے
آج تاریخ کی زینت ہے شہادت تیری

چیر کر خونی خلاؤں کے سیہ سینے کو
چاند تاروں سے ہم آغوش ہے ہمت تیری

کون کہتا ہے کہ تو رزم میں ناکام رہا
ڈھل گئی اہلِ اہنسا میں شجاعت تیری

بن گئی جوششِ خودی، سوزِ یقیں، نقشِ عمل
مادرِ ہند کے قدموں میں عبادت تیری

روحِ آزادی کو پھر ل نہ سکا تیرا وجود
کوئی لوٹا نہ سکا تجھ کو امانت تیری

موت کا تیری یقیں آئے تو کس کو آئے
آج بھی کرتے ہیں محسوس قیادت تیری

ہمہ تن گوش ہے اک بزم یہی لگتا ہے
شعرِ راہی کی سماعت ہے بدولت تیری

رام پرکاش راہی
۱۹۸ ۔ اے جی ٹی آر انکلیو
دہلی ۹۲۔۔ ۱۱

غزلیں

ہجر کی آنکھ بھیگی ہوئی سوکھتی نہیں
لگ کر یہ بوند بھر سی نمی سوکھتی نہیں

ڈھلنے کو راکھ میں ادھر آجائے کوئی بھی
نم شعلگی سے اب یہ گلی سوکھتی نہیں

بینائیاں گنواری گئیں اس یقین پر
اشکِ رواں کی نہر کبھی سوکھتی نہیں

خالی سی خانقاہ میں صحرا کے بیچوں بیچ
ہو جائے جو بھی گود ہری سوکھتی نہیں

جب آئیں مسکرانے پہ ڈوریں بھرے ہونٹ
شبنم میں ڈوبی ڈوبی ہنسی سوکھتی نہیں

انجان نگہتوں میں سرابور چل پڑو
شاخِ گماں کی کوئی کلی سوکھتی نہیں

مُصوّر سبزواری

چودھری سرائے
سنبھل
مرادآباد

چاندنی، خوشبو، صبا اور نغگی اچھّی لگی
جھومتی گاتی، مہکتی زندگی اچھّی لگی

دوستوں کا پُوچھنا کیا؟ وہ تو اپنے جانِ دل
ہم کو دشمن کے لبوں پر بھی ہنسی اچھّی لگی

ایرکنڈیشنڈ کمرے ہوں مُبارک آپ کو
ہم کو اپنے جھاڑ کی چھاؤں گھنی اچھّی لگی

زندگانی یوں گزر جاتی سلیقے سے مگر
کیا کریں، یہ دل، جسے آوارگی اچھّی لگی

ہر قدم پر دردو غم، ظلم و ستم، رنج و الم
ہر قدم پر پھر بھی ہم کو زندگی اچھّی لگی

ایک دُنیا دیکھ آئے، کیا کریں پھر بھی جناب
اپنے گھر کے پاس کی ہے جو گلی اچھّی لگی

کل جو بچّی رو رہی تھی راستے میں، آج وہ
اپنی ماں کے ساتھ ہنستی کھیلتی اچھّی لگی

سُلیمان اطہر جاوید

پروفیسر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی،
حیدرآباد ۵۰۰۰۴۶

دوھے

اُس نے ہی سب سکھ دیئے جس نے دیا شریر
تن سے بھوگو جگت کو، من سے رہو فقیر

میں سستی، میں سوہنی، میں صاحبان، میں ہیر
ثابت کر دکھلاؤں میں، بھیج کوئی گورو پیر

پکّا دھاگا موہ کا، دے اپنوں کو توڑ
کچّا دھاگا پریم کا دے بچھڑوں کو جوڑ

مُرشد کے انگنا کھلے صبر شکر کے پھول
چُن چُن مالا میں کری سائیں کرے قبول

سائیں تجھ میں یوں بسے جیوں عطروں میں باس
جیوں چکنائی تیل میں جیوں ہونٹوں میں پیاس

تن کے سادھو سیکڑوں، من کا سادھو کوئے
من کا سادھو وہ بنے جو اپنی میں کھوئے

آن پُرش دیکھوں نہیں مجھ کو تیری آن
آن دکھا دے سکھ مجھے پیاس مری پہچان

ڈاکٹر نریش

پروفیسر و صدر
شعبۂ جدید ادب، پنجاب یونیورسٹی
چنڈی گڑھ
۱۶۰۰۱۴

پروفیسر سیّد محمود الحسن



حیات اللہ انصاری کو "اقبال سمان"

انتہائی مسرت کی بات ہے کہ اُردو کے ممتاز ادیب صحافی، ناول نگار، افسانہ نگار اور دانش ور و مفکر جناب حیات اللہ صاحب انصاری کو گزشتہ ماہ حکومت مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا ادبی اعزاز "اقبال سمان" عطا کیا گیا۔ یہ اعزاز موصوف کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا ہے۔ اس تقریب میں صدر جمہوریہ ہند عزت مآب شنکر دیال شرما بھی مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے اور ملک و قوم کے لیے حیات اللہ صاحب کی خدمات کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا۔

حیات اللہ صاحب لکھنؤ میں فرنگی محل کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جو علمی، ادبی اور روحانی حیثیت سے غیر معمولی شہرت و امتیاز رکھتا ہے چنانچہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان خاندانی روایات کا گہرا اثر رہا لیکن انفرادی مطالعے کے ذوق اور اکتسابات نے شروع ہی سے ان میں ایک دانش ورانہ کرب اور قومی و ملکی مسائل سے دل چسپی پیدا کر دی اور معاشرے میں ایک طرح کا انقلاب پیدا کرنے کا احساس ابھرنے لگا۔ اسی جذبے نے ان کی شخصیت کو ہمہ گیر بنا دیا۔ گاندھی جی کی تحریک اور ان کے نظریات سے قربت، آزادی کی جدوجہد اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ اور عوامی زندگی میں بیداری و ترقی کا شعور پیوست کرنا، ان تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ساری زندگی وقف کر دی اور آج تک کسی نہ کسی انداز سے اسے پورا کر رہے ہیں۔

اہم چیز یہ ہے کہ انھوں نے صحافت اور ادب دونوں شعبوں کے ذریعے سے جس طرح عوام کے ذہنوں میں وسعت اور سوچنے سمجھنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کر دی۔ جس طرح معاشرتی و سیاسی انقلاب کا پیغام پیش کر دیا وہ اس حد تک کسی دوسرے ادیب و مفکر سے نہ ہو سکا۔

حیات اللہ صاحب نے صحافت کا جو معیار اور امتیاز قائم کر دیا روایتی انداز سے الگ کر کے اس فن میں جس طرح ادبی امتزاج اور اعلیٰ قدروں کو پیش کرنے پر توجہ دی اُردو میں یہ خصوصیات کہیں اور نہیں تلاش کی جا سکتیں۔ اس کے ذریعہ عوام کو حوصلہ ملتا ہے کہ سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے اور سیاسی و نظریاتی اختلافات کے باوجود ایمان داری کا ساتھ ہر قدم پر دینا چاہیے۔

اسی طرح ان کے افسانوی ادب کی ہر تخلیق ایک مخصوص طرز فکر انفرادی رجحان اور غیر معمولی صناعانہ قوت کا احساس دلاتی ہے جس میں ہندستانی عوام کی زندگی اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں پوری طرح محسوس کی جا سکتی ہیں۔ خاص طور سے ان کے ناول "لہو کے پھول" میں نہ صرف ہندستان کی جدوجہد آزادی کی پوری تاریخ یا گاندھی جی کے نظریات اور سیاسی رہنماؤں کی قربانیاں سمٹ کر سامنے آ جاتی ہیں بلکہ ہر فرد کے دُکھ درد اور کرب و انتشار کی داستانیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ آج بھی ان کی تخلیقات کی تابناکی اپنے موضوع اور فنی عظمت کی وجہ سے متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔

ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ انھوں نے اُردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کے لیے جس طرح کی جدوجہد کی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ انھوں نے ریاست اتر پردیش کے ۲۲ لاکھ افراد سے دستخط کرا کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی تھی کہ اُردو کو ریاست میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔ دراصل یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اُردو والوں کو بہت سے حقوق حاصل ہو گئے۔

حیات اللہ صاحب سیاسی حیثیت سے بلند مرتبوں پر فائز رہے ریاست اترپردیش کی قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور نہ معلوم کتنی سرکاری یا نیم سرکاری کمیٹیوں کے ممبر بنائے گئے، لیکن اُردو کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے جدو جہد کا جو جذبہ موجزن تھا وہ آج بھی اسی طرح برقرار ہے اور اس کے لیے وہ کسی قسم کی مصالحت کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دراصل انھیں جو اعزازات دیے گئے، وہ ان کی ذات کے لیے اعزاز نہیں تھا بلکہ ان اداروں کے لیے عزت و وقار کا اظہار تھا جن کی طرف سے یہ اعزازات ملے۔

راقم الحروف ادارہ نیا دَور اور اس کے قارئین کی طرف سے حیات اللہ صاحب کی خدمت میں نذرِ تہنیت پیش کرتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں ہمارے ادبی سرمایے کو وسعت حاصل ہوتی رہے گی۔

□□

آوارہ ——— صفحہ ۶ کا بقیہ

نے اُردو کی مہتاب زدہ رُومانیت کو تم جیسے شعراء کے آتشیں شعور کی بھٹی میں پگھلا کر ایک ایسی حقیقت بنا دیا تھا جو پُرانی نسل کے شعراء کے ادراک سے باہر تھا۔ یہ نظم آوارہ ایک ایسی موج شعور بن گئی ہے جس نے ہمیں زندگی کی سچائیوں کو مختلف جہتوں کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

اور قرۃ العین حیدر نے مجاز کی مجموعی شاعری کے پیشِ نظر جس میں آوارہ بھی شامل ہے لکھا ہے:

"جس طرح اوڈن کے 'سالِ نو کا خط' کمنیں کا "خزاں نامہ" اور اسپنڈر کی نظمیں اپنے وقت کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ بالکل اس طرح مجاز بھی اپنے زمانے کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے نغمہ سرا ہے۔"

(مجاز: ایک آہنگ۔ کراچی)

پھر آئی فصل کے مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

——— مجروح سلطان پوری

رُباعیات

کچھ حال ہی ازراہِ مدارات تو پوچھ
رندوں سے کبھی ان کی شکایات تو پوچھ
اے انجمنِ عصر کے مہتاب نشین
صہبا نہیں دیتا ہے نہ دے بات تو پوچھ

سچّائی چھپانے سے نکھر آتی ہے
آنکھیں ہوں تو مٹ کر بھی نظر آتی ہے
جس طرح کسی خط کو جلا دینے سے
قرطاس پہ تحریر اُبھر آتی ہے

ڈر اس سے کہ یہ ہے مرے بھائی مٹّی
اپنی نہ سمجھ یہ ہے پرائی مٹّی
اک عمر سے جسموں کا سفر شاہد ہے
تھک ہار کے مٹّی ہی میں آئی مٹّی

فولاد کو بھی خاک بنا دیتی ہے
گرتی ہوئی قدروں کو اٹھا دیتی ہے
اِک رنگ میں رہتا نہیں کوئی اے دوست
حالات کو تاریخ سزا دیتی ہے

جاں اپنی ہتھیلی پہ جو رکھ لیتے ہیں
جینے کے لیے زہر بھی چکھ لیتے ہیں
وہ لوگ جو تحقیق کی رکھتے ہیں نگاہ
اک بُوند سے دریا کو پرکھ لیتے ہیں

تسنیم فارُوقی
۱۸۳۔ تلسی داس مارگ، لکھنؤ

نذرِ امبیڈکرؒ

ساتھ لے کر چراغِ نظر ایک شخص
تیرگی سے لڑا عمر بھر ایک شخص

کیسا دستور اس نے مرتب کیا
ملک کا بن گیا راہبر ایک شخص

قوم کی پستیوں پر ہمیشہ رہا
مضطرب اور باچشمِ تر ایک شخص

علم کی دین سے، علم کے فیض سے
کس قدر ہو گیا معتبر ایک شخص

علم کی لو کو ہم تیز کرتے رہیں
جس سے ہوتا ہے ممتاز تر ایک شخص

علم ہی وسعتِ فکر پیدا کرے
علم ہی سے بنے خودنگر ایک شخص

علم انسانیت کو فروزاں کرے
اور اسی سے ہو اہلِ ہنر ایک شخص

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
اقصیٰ پبلک لائبریری
کاکوری۔ ضلع لکھنؤ

ہندی نظم: راجیش شرما

وہ دن کتنے سندر تھے

وہ دن کتنے سندر تھے
جب تھوڑی سی خبریں تھیں
تھوڑے سے غم
ہم ایک ایک خبر گھونٹ لیتے تھے
شام تک ہر غم میں شریک ہو لیتے تھے
ہر گلی ہر سڑک ہر چوراہا
جب گزشتہ اور آج پر فیصلہ دیتا تھا
شہر چین کی نیند سوتا تھا۔

وہ دن کتنے سندر تھے
جب سچ بولنے والے
خدمت کرنے والے
جل دینے والے
حفاظت کرنے والے
اپنے اپنے خانوں میں محفوظ تھے
وہ جانے جاتے تھے
پہچانے جاتے تھے
شام تک ان کی ملاقات ہو جاتی تھی
بات ہو جاتی تھی۔

وہ دن کتنے سندر تھے
جب سب کو اپنا راستہ پتہ تھا
پتہ تھی اپنی گلی
نکڑ کا حلوائی پتہ تھا اور
چوراہے کا پنواڑی
پوری گلی جب ایک گھر ہوا کرتی تھی
وہ دن کتنے سندر تھے!!

ترجمہ: محمد مسعود
[illegible] لکھنؤ



نامی انصاری
۲۹۵/۹۹، نالہ روڈ، حسین گنج
کان پور - ۲۰۸۰۰۱

خودنوشت

خبرِ تحیّرِ عشق سُن....

اودھ کا قدیم تاریخی قصبہ جائس (ضلع رائے بریلی) اودھی زبان کے مشہور صوفی شاعر ملک محمد جائسیؔ صاحب پدماوت کی نسبت سے مشہور خاص و عام ہے۔ میں اسی قصبے میں ۱۳؍جنوری ۱۹۳۰ء کو عالم وجود میں آیا۔ اسکول سرٹیفکٹ میں تاریخ پیدائش ایک سال کم یعنی ۱۳؍جنوری ۱۹۳۱ء درج ہے۔

میرے والد مولوی محمد بخش مفتوںؔ (۱۹۰۷ء تا ۱۹۸۵ء) ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول میں ٹیچر تھے لیکن اردو زبان و ادب میں خاصا درک رکھنے کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبانوں کے بھی جانکار تھے۔ دورانِ ملازمت انھوں نے ہندی نارمل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا جس کی وجہ سے ہندی میں بھی ان کی قابلیت مسلمہ تھی۔ ان کی علمی لیاقت کی وجہ سے قصبے کے شرفاء ان کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کا ذوقِ شاعری نہایت پاکیزہ تھا۔ غزلوں کے علاوہ نعت، منقبت، سلام اور قصیدہ گوئی پر بھی ان کو دسترس حاصل تھی۔ قصبے میں ہونے والے مشاعروں اور سالموں میں وہ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اس طرح شعر و شاعری سے میری اوّلین شناسائی والد مرحوم کے توسط ہی سے ہوئی۔ میرا تخلص "نامی" بھی انھیں کا تجویز کردہ ہے۔ میرا اصل نام محمد رحمت اللہ ہے لیکن اب اس نام سے کم ہی لوگ مجھے جانتے ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے کے سیاسی منظر نامے پر مسلم لیگ چھائی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہوتے یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب ہندوستان کو آزاد ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اسی حساب سے کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مسلمان زمینداروں اور خوشحال طبقوں کی جذباتی وابستگیاں مسلم لیگ کے ساتھ تھیں مگر میرے والد نیم سرکاری اسکول ٹیچر ہونے کے باوجود کانگریس کے طرفدار تھے۔ عملاً انھوں نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن نظریاتی طور سے ان کی پوری ہمدردی کانگریس کے ساتھ تھی اور وہ اسی کو برٹش گورنمنٹ کا وارث اور جانشین سمجھتے تھے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں مجھے ان کے یہ نظریات قابل قبول نہیں معلوم ہوتے تھے اس لئے کہ رائے عامہ اس کے خلاف تھی لیکن بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ ان کے نظریات نہ صرف یہ کہ درست تھے بلکہ ان سے پیدا ہونے والے نتائج بھی وہی نکلے جن کا انھیں اندیشہ تھا۔

بہرحال ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی وہ اسکول ٹیچر ہی رہے اور ۱۹۶۷ء میں جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ والد کو خوشخطی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کے تحریر کردہ متعدد طغرے ضلع کی تعلیمی نمائش میں انعام کے حقدار ہوئے۔ میری والدہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھیں مگر اردو کی چھپی ہوئی کتابیں بخوبی پڑھ لیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ محرم کے دنوں میں وہ "موازنۂ انیس و دبیر" میں شامل مرثیے قدرے بلند آواز سے غالباً حصولِ ثواب کی غرض سے پڑھا کرتی تھیں۔ ہم لوگ پانچ بھائی بہن ہیں۔ مجھ سے چھوٹے میرے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ واضح رہے کہ میرا شجرۂ نسب گیارھویں بارھویں صدی کی کسی مشہور تاریخی یا علمی شخصیت پر منتج نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی میرے اجداد ترکستان سے براہِ ایران و توران ہندوستان وارد ہوئے تھے اور پنجاب و دہلی ہوتے ہوئے ضلع رائے بریلی کے قصبہ جائس تک پہنچے تھے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے

اس مضمون کا عنوان سراج اورنگ آبادی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

خبرِ تحیّرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

آبا و اجداد نامعلوم صدیوں سے اسی قصبے کی سرزمین سے وابستہ تھے۔

سات سال کی عمر میں مجھے قصبے کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا گیا لیکن اس سے پہلے مجھے گھر پر حروف شناسی اور تختی لکھنے کی مشق کرا دی گئی تھی۔ بنیاد مضبوط ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ میں پڑھنے میں ہمیشہ تیز رہا اور ہر درجے میں اوّل آتا رہا۔ تختی پر مشق کرنے کی وجہ سے میری اُردو کی تحریر اچھی ہو گئی تھی جس کا فائدہ یہ ملا کہ بعد میں جب میں نے ہندی اور انگریزی رسم الخط سے شناسائی حاصل کی تو ان دونوں میں بھی میری تحریر اچھی اور خوبصورت رہی۔

جائس کے مڈل اسکول سے میں نے مڈل کا فائنل امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پورے ضلع میں تیسری پوزیشن آئی۔ محکمہ تعلیم نے آگے پڑھنے کے لئے میرا وظیفہ بھی منظور کیا لیکن گھر کے معاشی حالات اس قابل نہ تھے کہ والد مجھے رائے بریلی کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرواکر اس کے اخراجات برداشت کرتے۔ قصباتی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے میرے اندر اتنی سمجھ تھی اور نہ حوصلہ کہ میں اپنے بل بوتے پر رائے بریلی یا لکھنؤ جاکر داخلہ لے لیتا اور آگے کی تعلیم جاری رکھتا۔ اس لئے مزید تعلیم حاصل کرنے کی للک کے باوجود میرا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مڈل درجات میں میرے ہم سبق سیّد حبیب احمد اور محمد وسیم انصاری تھے۔ سیّد حبیب احمد کا چند سال پہلے کراچی میں انتقال ہو گیا اور حاجی محمد وسیم انصاری دو مرتبہ تلوئی حلقۂ انتخاب سے یوپی اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ وہ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے معتمد خاص تھے۔

میرے دو تین سال چھوٹے موٹے کاموں میں گزرے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں والد کی ایما پر حصولِ ملازمت کے لئے میں کانپور آگیا اور پھر یہی میرا وطنِ ثانی بن گیا۔ یہاں میرے بڑے پھوپھی زاد بھائی ایک تھانی ٹیکسٹائل مل (ایلگن ملز کمپنی لمٹیڈ) میں برسرکار تھے۔ انھوں نے بڑی سعی و سفارش سے مجھے اس مل میں عارضی طور سے کلرک کی جگہ پر لگوا دیا۔ ۴۴ سال کی ملازمت کے بعد میں جولائی ۱۹۹۱ء میں ایکسپورٹ افسر کی پوسٹ سے ریٹائر ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا اور ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مہاتما گاندھی شہید کر دئے گئے۔ سارے شہر میں ان کے قتل کی خبر سے جو بے مثال سناٹا چھا گیا تھا، وہ اب تک میری نگاہوں میں تازہ ہے۔

میں نے دورانِ ملازمت ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات پاس کئے۔ بی۔ اے کا امتحان میں نے اُردو اور انگریزی ادب کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں اور اس کے دو سال بعد ایم۔ اے اُردو کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس دوران ادب سے میری دلچسپی میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ آزادی کے فوراً بعد اُردو ادیبوں اور شاعروں کا ایک باوقار حلقہ کانپور میں موجود تھا۔ نریش کمار شادؔ، ساحرؔ ہوشیار پوری اور دیوندر اسّر بھی کچھ دنوں یہاں مقیم رہے۔ یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا اور اس کے ہفتہ وار جلسے باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ جس میں دیوندر اسّر، سرشار صدیقی، سلطان نیازی، سلمان ملک، للت موہن اوستھی، رحمت شمیم، منظور احمد، عبدالرزاق، گووند موتس اور دوسرے بہت سے نوجوان قلم کار اور غیر قلمکار سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ میں بھی انجمن کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ یہاں میں نے بہت کچھ سیکھا۔ یہاں ایک اور حلقہ بزرگ شاعروں کا تھا جس میں ثاقبؔ کانپوری، شارقؔ ایرایانی، ندرتؔ کانپوری، وفاؔ شاہجہاں پوری، کوثرؔ جائسی اور کبھی کبھی نشورؔ واحدی بھی شریکِ محفل ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں اب صرف کوثرؔ جائسی ہی بقیدِ حیات ہیں۔

یہ میرا عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا اور ترقی پسند تحریک کے عروج کا۔ مجھے فطری طور سے اس ادبی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی لیکن ان کی یہ بات کبھی میرے گلے سے نیچے نہیں اتری کہ ترقی پسند ادیبوں کو مزدوروں اور کسانوں کی تحریک میں عملی حصہ لینا چاہئے یا ادب کو صرف اشتراکی مقاصد کا تابع ہونا چاہئے۔ اشتراکی نظریات سے مجھے دلچسپی تھی لیکن میں کبھی کسی سیاسی جماعت کا ممبر نہیں بنا۔

کانپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کئی مرتبہ منظم اور منتشر ہوئی۔ آخری دور میں سیّد علی رضا حسینی اور افسر رضا مرحوم نے مل کر انجمن کے ماہانہ جلسوں کا انصرام کیا۔ تقریباً دس سال تک یہ انجمن فعال رہی، مگر یہ ایک وسیع البنیاد ادبی انجمن تھی جس میں نظریاتی باتوں پر اصرار نہیں کیا جاتا تھا اور شرکار آزادی کے ساتھ اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں مقامی ادبا اور شعرا کے ساتھ ساتھ باہر کے معتدد حضرات بھی اکثر آجاتے تھے۔ مثلاً مجروح سلطان پوری، قاضی عبدالستار اور نازش پرتاپگڑھی وغیرہ۔ اگست ۱۹۸۵ء میں افسر رضا کے انتقال کے بعد یہ

سلسلہ خود بخود ختم ہوگیا اور اب اس کے احیار کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔

اسی زمانے میں ۵۴-۱۹۵۳ء میری دوستی سعید اختر نعمانی (مرحوم) سے ہوگئی۔ اسرار الحق مجازؔ ان کے چچا تھے۔ ان کے ساتھ میں نے کئی مرتبہ لکھنؤ میں ان کے نیو حیدر آباد والے مکان میں قیام کیا اور مجازؔ مرحوم کی صحبت سے مستفید ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں جگرؔ مراد آبادی مرحوم جب کانپور آئے تھے تو گنگا دھر ناتھ فرحتؔ ایڈوکیٹ کے ہاں قیام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں مجازؔ بھی آئے ہوئے تھے، اس لئے ہم دونوں ہر روز وہاں جاتے اور لطف صحبت اٹھاتے۔ گنگا دھر ناتھ فرحتؔ کے انتقال کے بعد جگرؔ صاحب، بشیر احمد انکم ٹیکس افسر کے مکان پر مہمان ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں جگرؔ صاحب کی ایک لمبی غزل ماہنامہ آجکل میں شائع ہوئی تھی جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

فضلی سے ہے آبروِ غزل کی　　اس دور میں سب سے برگزیدہ

بشیر صاحب کے مکان پر ایک نشست میں یہی شعر موضوعِ گفتگو بن گیا۔ بشیر صاحب، اکبرؔ الٰہ آبادی کے نواسے تھے اور اپنی لمبی داڑھی اور مذہبی وضع قطع کے باوجود کچھ منہ پھٹ قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے برجستہ کہہ دیا کہ اس شعر سے پلاؤ کی خوشبو آتی ہے۔ جگرؔ صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا لیکن قبل اس کے وہ منہ سے کچھ کہتے، نشورؔ صاحب نے کہا "نہیں نہیں اس شعر سے محبت کی خوشبو آتی ہے"۔ وہاں موجود دوسرے لوگوں نے بھی نشورؔ صاحب کی تائید کی اور اس طرح فضا کا بوجھل پن ختم ہوگیا۔ مذکورہ شعر جگرؔ صاحب کے آخری مجموعہ کلام "آتش گل" میں شامل ہے لیکن ذرا سے تغیر کے ساتھ۔

فضلی سے ہے آبروِ غزل کی　　ہر صنفِ سخن میں برگزیدہ

فضل احمد کریم فضلیؔ الٰہ آبادی پاکستان کے ایک متمول شخص تھے اور جگرؔ صاحب کے بڑے قدر داں تھے، اس لئے جگرؔ صاحب جب کبھی مشاعروں میں شرکت کے لئے پاکستان جاتے تو انھیں کے یہاں قیام کرتے تھے۔ یہ شعر اسی رشتۂ محبت و مؤدت کی یادگار ہے۔

۱۹۶۲ء کے آس پاس سید علی رضا حسینی کانپور آگئے تھے اور کرائسٹ چرچ کالج میں اُردو کے استاد ہوگئے تھے۔ انہوں نے کالج میں چند یادگار ادبی جلسے منعقد کئے۔ غالبؔ صدی کے موقع پر میں نے پروفیسر احتشام حسین کی دلنواز تقریر اسی کالج کے جلسے میں سنی اور بعد میں شخصی طور پر بھی ان سے متعارف ہوا۔ وہ تقریر و تحریر دونوں میں یکتا تھے لیکن حق تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے آل احمد سرورؔ کے مضامین پڑھنے میں زیادہ لطف آتا تھا کیونکہ ان کی تحریر میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی تھی اور ان کا اسلوب بیان بھی مجھے بہت دلکش لگتا تھا۔ ادبی تنقید میں اگر دلکش نثر بھی شامل ہو جائے تو اس کی اپیل بہت بڑھ جاتی ہے۔ سرور صاحب کے علاوہ اس دور میں ڈاکٹر خورشید الاسلام اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا اسلوب بیان مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کو میں بہت کم سمجھ سکا ہوں لیکن مشرقی شعریات پر نارنگ صاحب کا مقالہ اپنی تشریح و تعبیر کے ساتھ ساتھ اپنی سجیلی نثر کے باعث بھی گراں مایہ ہے۔ دورِ حاضرہ میں تنقید کی گرم بازاری کا ایک نتیجہ یوں بھی سامنے آیا ہے کہ بعض نامور نقاد اپنی تنقیدی بصیرت پر انحصار کرنے کے بجائے ٹوپی سے خرگوش برآمد کرنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ادب میں تجارت زدگی کے ساتھ اب شعبدے بازی بھی اپنا مقام بنا رہی ہے جو ظاہر ہے کہ ادب کی ترقی کے لئے فالِ نیک نہیں۔

تنقید میرا خاص موضوع ہے مگر میرا میدان عملی تنقید ہے۔ میرے تنقیدی مضامین ملک کے متعدد ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور پسند بھی کئے جاتے ہیں، کبھی کبھی ناپسند بھی۔ بعض اوقات مجھے پڑھنے والوں کی نکتہ چینیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ؎ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل۔ یہ صورت حال خاص کر اس وقت پیش آتی ہے جب کسی مشہور ادبی شخصیت کے کارناموں کا معروضی اور دیانتدارانہ جائزہ پیش کیا جائے اور اس میں رو رعایت سے کام نہ لیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب یا ناقد کی پیشہ ورانہ دیانتداری اور اس کا معروضی نقطۂ نظر ہی تنقید نگاری کی اوّلین شرط ہے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ اس شرط کو اپنے مضامین میں بروئے کار لا سکوں۔

میں نے اب تک درجنوں کتابوں پر طویل و مختصر تبصرے بھی کئے ہیں جو ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں حمید نسیم کی کتاب "ناممکن جستجو" پر ایک طویل تبصرہ بھی شامل ہے جو "سوغات" میں شائع

ہو چکا ہے۔ تبصرہ نگاری ایک مشکل، پیچیدہ اور نازک فن ہے لیکن اگر
اس کے تقاضوں کو سنجیدگی سے نہ لیا جائے تو تبصرہ نگاری بہت آسان
اور سہل الحصول بھی ہے۔ پھر اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے میں ہنسیاں خاکر
احباب بھی راہ کا پتھر بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا عالمانہ مقالہ "جوان
کی تبصروں کی کتاب موسوم بہ "کتاب شناسی" میں شامل ہے۔ ہر تبصرہ نگار
کو ایک مرتبہ ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

شعر گوئی میں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں شروع کی تھی۔ پہلے
میں ہلکی پھلکی رومانی نظمیں کہتا تھا۔ ترقی پسند مصنفین سے یاد اللہ ہوئی تو
اس زمانے کے مقبول عام موضوعات پر نظمیں کہنے لگا لیکن اس میں میری
کوئی انفرادیت قائم نہ ہو سکی۔ بعد میں نہ جانے کس طرح میں غزل کی طرف
متوجہ ہو گیا اور "یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا"۔ میری غزلوں کے دو مجموعے
برگ سبز (۱۹۸۱ء) اور روشنی اے روشنی (۱۹۹۴ء) شائع ہو چکے ہیں
اور دونوں پر یوپی اُردو اکادمی لکھنؤ کے انعامات ملے ہیں۔ اکادمی کی مرتب
کردہ کتاب "دستاویز" (مطبوعہ ۱۹۸۳ء) میں بھی میرے مختصر سوانح کا ایک صفحہ
شامل ہے۔ اس دوران تنقیدی ادب سے بھی میری دلچسپی مستحکم ہوتی گئی۔
میرے پندرہ مضامین کا مجموعہ "افکار و اظہار" ۱۹۸۵ء میں نصرت پبلشرز
لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کتاب پر متعدد ادبی رسائل میں حوصلہ افزا تبصرے
شائع ہوئے۔ اس کتاب کی رسم اجرا کے موقع پر پریس کلب کانپور میں ایک
بڑا پروقار ادبی جلسہ منعقد ہوا جس میں رام لعل، ڈاکٹر نیر مسعود، عابد سہیل،
اقبال مجید، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور خالد عابدی بطور خاص شامل ہوئے
اور اس کتاب کے مضامین پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ اسی جلسے میں برادرم
تسکین زیدی کے پہلے افسانوی مجموعے "فصیل" کی رسم اجرا بھی عمل میں
آئی۔ شاعری میں میں نے کسی کا تلمذ اختیار کیا نہ مضمون نویسی میں۔ میں
نے جو کچھ حاصل کیا محنت اور مطالعے سے حاصل کیا۔

ادھر گزشتہ چند برسوں سے میں "آزادی کے بعد اُردو نثر میں
طنز و مزاح کی صورت حال" پر کام کر رہا تھا۔ اس کتاب کا مسودہ مکمل ہو
گیا ہے اور حالات سازگار رہے تو اسی سال اس کے شائع ہونے
کی توقع ہے۔

شاعری اور تنقید کے علاوہ مجھے اُردو کی تمام اصناف سخن اور
قدیم و جدید ادب سے گہری دلچسپی ہے، الا نثری نظم اور آزاد غزل کے
کہ یہ دونوں اصناف سخن مجھے سعی رائیگاں کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتیں۔
غزل کا معاملہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو کی نئی اور پرانی بستیوں میں غزل گو
شاعروں کا ایک جم غفیر جمع ہے۔ اس بھیڑ میں کسی کا چہرہ صاف نظر
نہیں آتا حالانکہ ہر شاعر اپنا چہرہ پہچنوانے کی فکر میں غلطاں ہے۔
پاکستان کے ایک ادبی رسالے میں، اس سال ۱۲۷ غزلیں اور دوسرے
میں ۱۵۵ غزلیں بیک وقت شائع ہوئی ہیں۔ اسی سے غزل کی گرم بازاری
اور ساتھ ساتھ اس کی درماندگی اور ناقدری کا احساس ابھرتا ہے۔
غزل کی درماندگی یہ ہے کہ "معاصر" کی ایک سو پچپن غزلوں میں سے
اگر شاعروں کے نام نکال دئے جائیں تو چند مستثنیات کے علاوہ ساری
غزلیں ایک ہی شاعر کی کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ناقدری یوں کہ مشکل
ہی سے کوئی قاری ان غزلوں کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ غزل
کے اس وحدت و کثرت کے دور میں مجھے ذاتی طور سے ہندوستان میں
عرفان صدیقی اور پاکستان میں افتخار عارف ہی ایسے دو شاعر نظر آتے
ہیں جن کی غزلوں کا ذائقہ سب سے الگ اور منفرد ہے، اور ان کے بیشتر
اشعار ذہن و دل کو بے ساختہ متوجہ کر لیتے ہیں۔ مشاعروں کے مقبول ترین
شاعر اب بھی ہندوستان کے بشیر بدر اور پاکستان کے احمد فراز ہیں
اور ان کے یہ مقامات آہ و فغاں اب بھی محفوظ ہیں۔ فکشن میں میری اولین
پسند، قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان کے یہاں جو رچا ہوا تاریخی اور تہذیبی
شعور ہے اور ناول نگاری کا جو دلکش، منفرد اور تازہ کار اسلوب ہے،
اس کا کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ گردش رنگ چمن اور چاندنی
بیگم ہیں ان کے تازہ کار ذہن کی رسائی اور ان کے تہذیبی شعور کی کارفرمائی
قدر اوّل کی چیزیں ہیں۔ تحقیق اور خاص کر متنی تحقیق میں رشید حسن خاں کا
میں بیحد قائل ہوں، البتہ میری خاص دلچسپی فی الوقت نثری طنز و مزاح
سے ہے۔ ابن انشا اور آل احمد سرور کی طرح میں بھی قتیل شیوۂ یوسفی ہوں۔
مشتاق احمد یوسفی جیسی کانٹوں میں تتلی اور پھولوں میں ایسی نثر شاید کوئی دوسرا
لکھ ہی نہیں سکتا۔ کم از کم ہمارے زمانے میں اس پائے کی نثر ہندو پاک
کا کوئی اردو ادیب نہیں لکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر مشفق خواجہ کی نثر بھی کیل کانٹے
سے پوری طرح لیس اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے اور ان کی تحریر کا

ایک ایک لفظ اپنی مستحکم قدر و قیمت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے ملک میں یوسفی اور خواجہ کے پائے کا طنز و مزاح نگار کیوں نہیں پیدا ہوا۔

میری پسندیدہ کتابوں میں غبارِ خاطر، دیوانِ غالب، آبِ حیات، آبِ گم، کلیاتِ اقبال اور کلیاتِ فیض شامل ہیں، تاہم میں اقبال کو عمداً زیادہ نہیں پڑھتا ہوں کہ کلامِ اقبال حواس پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ پھر کچھ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ شاعر کے لئے یوں بھی میر، غالب اور اقبال کو پڑھنا مانع ہے کہ نادانستہ طور پر یہ آپ کے لاشعور پر قبضہ جمالیں گے اور آپ کی ذاتی فکر و نظر کو متاثر کر دیں گے۔

عوامی مشاعروں میں شرکت سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی کہ اس میں کامیاب ہونے کے لئے گلے بازی کے ساتھ ساتھ اداکاری کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور ان دونوں عناصر سے میری دور کی رشتے داری بھی نہیں ہے، البتہ مقامی شعری نشستوں میں اکثر شریک ہو جاتا ہوں کہ وہاں کلام کو توجہ سے سنا جاتا ہے اور داد بھی میرٹ پر ہی ملتی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اُردو پروگراموں سے گزشتہ ۱۵ برسوں سے وابستہ ہوں۔ ریڈیو سے غزلیں سنانے کے علاوہ میں نے تقریباً درجن بھر ادبی فیچر بھی لکھے ہیں جو وقتاً فوقتاً ریڈیو سے نشر ہوئے اور پسند کئے گئے۔ لکھنؤ دوردرشن کے ادبی پروگرام اودھ پنچ میں بھی متعدد بار حصہ لے چکا ہوں۔

کانپور اگرچہ ایک بڑا شہر ہے اور لکھنؤ سے بہت قریب بھی ہے لیکن یہاں کوئی قابلِ لحاظ ادبی فضا نہیں بن پائی۔ اوّل تو یہاں اردو کا کوئی سرکاری یا نیم سرکاری مرکز نہیں ہے دوسرے اور شہروں کی طرح کانپور میں بھی شائقوں کی بہتات ہے۔ چند گنے چنے لوگ ہی ایسے ہیں جو اُردو کے پورے ادبی منظر نامے سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں جب کہ بیشتر حضرات کسی ادبی رسالے میں صرف وہی غزل پڑھتے ہیں جس پر ان کا نام چھپا ہوتا ہے، رسالے کے دوسرے مضامین سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کانپور کی بعض مقامی ادبی انجمنیں اب بھی کافی فعال ہیں لیکن ان کا دائرۂ عمل بیشتر حالات میں صرف شعری نشستیں منعقد کرنے ہی تک محدود ہے تاہم یہ بھی غنیمت ہے کہ بیاباں کی شبِ تاریک میں کبھی کبھی کوئی قندیل چمک تو جاتی ہے۔

میری ذاتی زندگی عام طور سے ہموار اور باقاعدہ رہی ہے کیونکہ میں فطرتاً اعتدال پسند ہوں اور انتہا پسندانہ سرگرمیوں سے گریز کرتا ہوں۔ روشن خیالی اور سائنسی اندازِ فکر کو میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ زندگی اور ادب دونوں ہی میں اس کو بروئے کار آنا چاہئے۔ تنگ نظری، بنیاد پرستی، کٹر پن اور فرقہ پرستی ایسے سنگین امراض ہیں جن کے ہوتے ہوئے کوئی معاشرہ صحت مند نہیں رہ سکتا۔ میں جز وقتی ادیب ہوں لیکن مجھے اطمینان ہے کہ گزشتہ ۲۵ برسوں میں میں نے اُردو ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کی ہے اور اپنے افکار و نظریات کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے (غالبؔ)

غزل

یہ بھی شاید کوئی آسیبِ سفر لگتا ہے
پاؤں دہلیز میں رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے

جہاں ہم سائے کو ہمسائے سے ڈر لگتا ہے
ایسے ماحول میں جینا بھی ہنر لگتا ہے

دربدر ہونے کا احساس نہ پوچھو لوگو!
گرتی دیوار کا سایہ بھی تو گھر لگتا ہے

جب پلا دیتا ہے مٹی کو کسان اپنا لہو
تب کہیں پیڑ کی شاخوں میں ثمر لگتا ہے

کتنا مصروف ہے اس دور کا انساں کہ امیر
شہر میں رہتے ہوئے شہر بدر لگتا ہے

امیر انصاری
حسن پور، مرادآباد

غزلیں

ہماری شہرتوں کا وقت بھی کہاں ٹھہرا
ندی کا شور پہاڑوں کے درمیاں ٹھہرا

بچھائے بیٹھے تھے ہم لوگ راہ میں آنکھیں
نہ میر کارواں ٹھہرا، نہ کارواں ٹھہرا

ہمیں پتہ ہے زمیں چل رہی ہر گردش میں
کوئی بتائے کہاں جا کے آسماں ٹھہرا

لگائی آگ تو ہر سمت روشنی پھیلی
بجھائی آگ تو چاروں طرف دھواں ٹھہرا

نکالا کانٹے سے کانٹا کسی طرح ہم نے
چبھے تو دونوں مگر ایک مہرباں ٹھہرا

سبب تھا رنج کا کوئی نہ وجہ راحت کی
کبھی کبھی کوئی عرصہ بہت گراں ٹھہرا

غلام مرتضیٰ راہی

۱۳۵ ۔ محلہ بنی
فتح پور
۲۱۲۶۰۱

عشق کو میرے ہوا دیں گے ترے شہر کے لوگ
پھر مرا درد بڑھا دیں گے ترے شہر کے لوگ

پیار کرنے کی سزا دیں گے ترے شہر کے لوگ
اور کیا اس کے سوا دیں گے ترے شہر کے لوگ

اپنی ناکام کہانی کو چھپانے کے لیے
میرا افسانہ سنا دیں گے ترے شہر کے لوگ

جب بھی اٹھے گا قدم پیار کی منزل کی طرف
راہ دشوار بنا دیں گے ترے شہر کے لوگ

زندگی کے مجھے پیچیدہ مسائل دے کر
نیند پلکوں سے اڑا دیں گے ترے شہر کے لوگ

بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کبھی اے شبنم
میرا گھر بار جلا دیں گے ترے شہر کے لوگ

شبنم گورکھپوری

۱۵۴ ۔ نور پور
گورکھپور ۔ ۲۷۳۰۰۱

راہ دیتی جو نہیں، گردش ایام نہ دے
بس خدا میرا مجھے حوصلۂ خام نہ دے

نامکمل سی کوئی چیز ہے میرا چہرہ
جب تک اس کو تری تسلیم کوئی نام نہ دے

مجھ کو ڈس جائے مری رات کا لمحہ لمحہ
یاد اگر حسن تصور میں بسی شام نہ دے

ہم سفر جب سے ہوئی ہے مری بالغ نظری
راہ کا کوئی شجر سایۂ آرام نہ دے

درمیاں تیرے مرے جو بھی ہے بہتر ہے یہی
اس کو بے نام ہی رہنے دے کوئی نام نہ دے

احترام اسلام

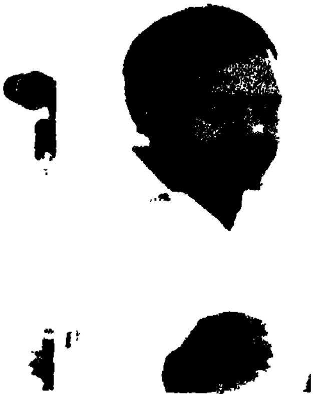
۷۱۶/۵۴۰ اتر سوئیا
الہ آباد
۲۱۱۰۰۳



محترمہ مایاوتی وزیراعلیٰ اترپردیش



گورنر اترپردیش شری رومیش بھنڈاری



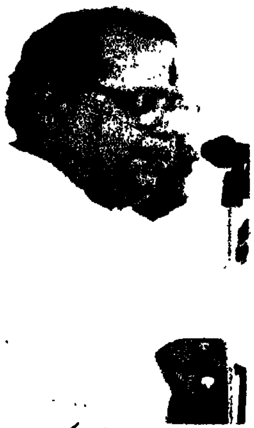
شری آر، کے، چودھری
(امداد باہمی)



شری سکھ دیوراج بھر
(دیہی ترقی)



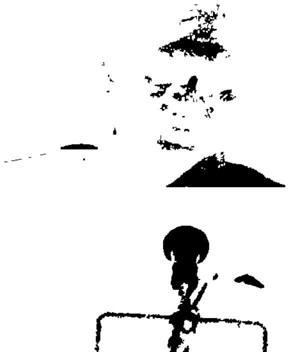
شری لال جی ٹنڈن
(شہری ترقیات اور ہاؤسنگ)



شری کلراج مشرا
(محکمہ تعمیرات عامہ اور سیاحت)



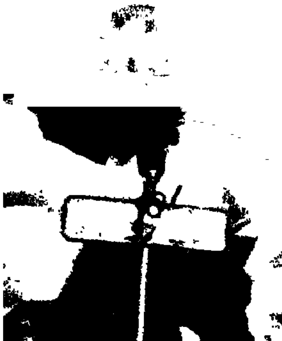
قاضی محمد [illegible] الدین



شری نریندر سنگھ گور



شری نسیم الدین صدیقی



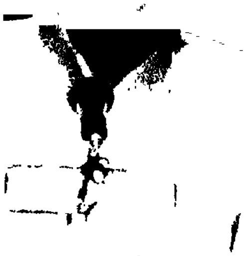
شری ادم پرکاش سنگھ
(آبپاشی اور محکمہ زراعت)



شری رماپتی شاستری
(صحت اور میڈیکل)



شری سری رام پال
(درج فہرست قبائل اور ذاتوں کی بہبود)



شری ہری کرشن سریواستوا
(خواتین اور بچوں کی بہبود)



شری مارکنڈے چند
(کلچر اور کھیل کود)



شری ویریندر سنگھ
(مالی)



شری سوامی پرشاد موریہ
(کھادی اور دیہی صنعت)



شری برکھو رام ورما
(پارلیانی امور اور ماحولیات)



شری رام ویر اپادھیائے
(ٹرانسپورٹ)



شری [illegible] گپتا
([illegible])



ڈاکٹر [illegible] پال [illegible]
(ثانوی تعلیم اور [illegible])



مسٹر [illegible]
([illegible])



شری سید [illegible] رضوی
([illegible] اور [illegible])



شری لال جی پرشاد
(ہوم گارڈس)



شری مات ور سنگھ
(اترا کھنڈ ڈیولپمنٹ)



شری دھرم پال سنگھ
(تعمیرات عامہ اور سیاحت)



شری بنشی دھر بھگت
(غذا، شہری رسد اور رینٹ کنٹرول)



شری بھولا شنکر موریا
(سائنس اور ٹیکنالوجی)



شری بنیاد حسین انصاری
(اقلیتی بہبود اور مسلم اوقاف)



شری رام پرشاد چودھری
(علاقائی ترقی)



شری گنگا پرشاد پشکر
(دیہی انجینئرنگ سروس)



شری گوبند پرشاد
(محنت اور روزگار)



شری رادھے شیام کوری
(قومی یکجہتی اور بیگار مخالف)



شری مہندر ناتھ پانڈے
(دیہی زمین، دیہی ترقی اور ...)



شری بابو لال کشواہا
(ہینڈلوم اور سیکب صنعت)



شری بھگوتی پرشاد
(ایکسائز)



شری جے پال سنگھ
(آبپاشی، سیلاب کنٹرول)



شری رام شنکر پال
(امداد باہمی)



شریمتی راج راجے سنگھ
(انسٹی ٹیوشنل فائنانس، ٹریڈ ٹیکس، اسٹامپ کورٹ فیس)



شری شیو چرن پرجاپتی
(پسماندہ طبقات کی بہبود)



شری بالیشور تیاگی
(پنچایتی راج)



شری بھگوتی پرشاد ساگر
(توانائی کے متبادل ذرائع)



شری رام اچل راج بھر
(زرعی تعلیم)



شری [illegible]



شری [illegible]



شری اشوک یادو
[illegible]



شری [illegible]

احمد سہیل

جنیاتی ساختیات: گولڈمین کا تناظر

لوسین گولڈمین کی ادبی اور عمرانیاتی فکر نے ساختیات کے میدان میں اس طور پر توسیع کی کہ وہ ساختیات کے روایتی متنی رویّوں سے ہٹ کر ایک سائنسی اور منطقی تنقیدی ادب کی بنیادیں تلاش کرتے ہیں جس سے ادب کا جمالیاتی پہلو بھی متاثر نہ ہو اور عمرانیاتی حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

گولڈمین نے ادب اور عمرانیات کے درمیان جنیاتی ساختیات کا پل تعمیر کرکے جہاں کئی فکری مغالطے کھڑے کئے وہاں کئی برسوں سے لسانیات اور ساختیات کے کئی گم شدہ اور الجھے ہوئے پیچیدہ سوالات کے جوابات کا سراغ لگانے کی کوشش کی جو گولڈمین سے پہلے ادب اور عمرانیات کی فکری فضا میں معمّہ بنے ہوئے تھے۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں گولڈمین کا پیرس میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے کوئی ایک سال کے بعد "ٹائمز" کے ادبی صفحہ پر ڈیوڈ کونیڈ کا ایک مضمون شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا جس میں بڑے ہی دلچسپ انداز میں گولڈمین کے ساختیاتی اور عمرانیاتی ذہن کو کنسٹری کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اُن کے تنقیدی، تحقیقی اور فلسفیانہ رویوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا گیا کہ انھوں نے کئی "شہدار" کو عالم نیند میں چہل قدمی کے لئے اکیلا چھوڑ دیا جن میں وہ خود بھی شامل ہیں جہاں وہ ادب کی عمرانیات کے مرتبے کا استحقاق حاصل کرتے ہیں۔ گولڈمین کی موت کے ساتھ ہی ان کے تنقیدی نظریات اور تعصّبات کو خاصے نقادوں نے منفی رنگ بھی دیا۔

گولڈمین کے زیادہ تر نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ انھوں نے اپنے ابتدائی خیالات کو بعد میں از سر نو ترتیب دیتے ہوئے "دلیل اور استدلال" کو کم ہی اہمیت دی۔ گولڈمین کا سب سے بڑا کارنامہ یا ان کے تنقیدی اور فلسفیانہ ذہن کا نچوڑ ۱۹۵۶ء میں جنیاتی ساختیات کی صورت میں سامنے آیا جس کو وہ عظیم ادبی اور فنکارانہ اظہار کے تناظر کا نام دیتے ہیں۔ تناظر کی یہ شے ایک قسم کا اجتماعی گروہی شعور ہے جو تخلیق کار کے ذہن تک رسائی کرواتا ہے جس کے پس منظر میں ادب اور معاشرے کے ارتباط کی فکر پوشیدہ ہے جو مزید توسیع پاکر ادب کی عمرانیات کی صورت میں گولڈمین کی تحریروں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ اس فکر میں کہیں نہ کہیں ساختیات کا نیا میدان جزوی ساختیات (مائیکرو اسٹرکچر ازم) کے تصور میں ہمارے ذہن میں ترتیب پاتا ہے۔ ان کے فلسفیانہ ذہن نے تاجیات ثقافتی اشیاء خاص طور پر فنکارانہ تخلیق کاری (ادب) تصوراتی تعبیریت (فلسفہ) اور معاشرتی اور نظری ساخت کا تکون تشکیل دیتے ہوئے تمام مسائل کو معاشرتی سیاق میں دیکھا ان کی تمام فلسفیانہ موشگافیاں ینوہیگل ازم سے شروع ہوتی ہیں جو بعد میں مارکسیت میں مدغم ہو جاتی ہیں لیکن جب وہ انسانی رویوں کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ژاں پیاژے کے انسانی موضوعات کی انفرادیت سے بھرپور فکر سے استفادہ حاصل کرتے ہیں جو ژاں پیاژے کے لیے تو انفرادی نوعیت کا ہے مگر گولڈمین ژاں پیاژے کے اس انفرادی تصور کو اجتماعی صورت دے دیتے ہیں جبکہ وہ جنیاتی ساختیات کہتے ہیں جس کا دوسرا نام تاریخی ساختیات بھی ہے۔ یاد رہے کہ گولڈمین نے کچھ عرصے ژاں پیاژے کے ساتھ بھی کام کیا۔

جنیاتی ساختیات نہ صرف ایک طریقۂ کار ہے بلکہ یہ ایک عمرانیاتی ماڈل پر نئے تحقیقی مباحث کو جنم دیتی ہے جو ثقافتی حوالے کو بنیاد بناتے ہوئے کوئی بہت زیادہ قابلِ تعریف نتائج کے اسباب پیدا نہیں کرتی ۱۹۶۰ء میں فرانسیسی ساختیات نے ادبی اور فلسفیانہ فضا میں چونکا دینے والے رویوں سے علم و ادب کو نئی وسعت دی۔ لیوی اسٹروس لینس نوکو الیتھسر وغیرہ نے اشارہ فہمی کو نہایت ہی گہرائی سے تجزیہ کیا جس کو بعد میں رونالڈ بارتھ نے نئے فکری رویوں کے ساتھ آگے بڑھایا جس کے پس منظر میں ماسر کے بنیادی تصورات کی چھاپ تھی۔ لسانیات کے اشارہ فہمی کے

ماڈل (جو بارتھ کی نظر میں متن گھڑت ہے) کو متن کے مختلف اجزا کو موضوعی حوالے سے پرکھا گیا۔ اس سے پہلے متن کی اصطلاح کو صرف معروضی حوالے سے تجزیہ کیا جاتا تھا اور نہ ہی اسکی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا تھا جہاں اس کے تجریدی پہلوؤں کو مطالعہ کرتے ہوئے معاشرتی اور تاریخی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ یوں ساختیات کے حوالے سے متن کے مطالعہ میں نئی وسعتوں کا اضافہ ہوا اور باریکیوں میں جھانکتے ہوئے متن کے داخلی روابط سے بحث کی گئی کیونکہ تخلیق میں متن کا ایک خود مختار نظام رواں دواں ہوتا ہے جو کہ متن کی اصلاحی حقیقتوں کو اجاگر کرتا ہے کیونکہ یہاں نظری صورتحال جنسیاتی ساختیات کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔

ہیئت پسندانہ ساختیات کے متعلق گولڈمین نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ معاشرتی حقائق اور تاریخی سمتوں کے طریقۂ کار کا رد ہے جنسیاتی ادب تاریخی نوعیت کا ہوتا ہے جس میں فلسفیانہ اور ادبی متن کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تاریخی فریم ورک میں رہتے ہوئے متبادل توجیہات تلاش کی جاتی ہیں ادب کی گم گشتہ اصطلاحوں اور معنوں کو دوبارہ ہی کیوں نہ زندہ کیا جائے۔ گولڈمین کے خیال میں جنسیاتی اور غیر جنسیاتی ساختیات دراصل انسانی کردار کے ادراک سے مشتر کی جاتی ہیں۔

(۱) انسانی کردار بحیثیت ساختیاتی کردار کے ایک وسیع بساط پر پھیلا ہوتا ہے جو افراد کے آپسی برتاؤ سے شناخت کیا جاتا ہے۔

۲۔ ساخت انسانی رویّوں کا لازمی جزو ہے جو تاریخی اور سوانحی پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتی ہے جہاں سابقہ ساخت اور کردار و برتاؤ کا مخصوص سیاق ایک دوسرے سے جُدا ہوتا ہے۔

دلائل کے یہ دو تضادات جو ایک دوسرے کا تقابل اور موازنہ کرتے ہیں اور ساختیات کی تاریخ کا ٹھوس بنیادوں پر بھی مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ اس سطح پر نتائجی حقائق کی صورتحال سے بھی نظریں نہیں چرائی جا سکتیں جو کہ حسّی نوعیت کی ہوتی ہیں جہاں ساختیات کا نشر پن پھر سے یکجا ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ مظاہر کئی نئے مسائل کو جنم دیتے ہیں جہاں سائنسی تجزیہ نگاری کے علاوہ ایک خاص قسم کے نتائجی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے تصورات کو پھر سے باندھا جاتا ہے۔ یہاں جنسیاتی ساختیات کا عمل اثر پذیری کی مسلکی سطح پر آجاتا ہے مگر اس تصور کے چند نظری عناصر کو طریق کار سے کسی طور پر بچا کر بھی رکھے جانے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ اس مرحلے پر گولڈمین عارضی طور پر اپنے ہی بنائے ہوئے تاریخی ماڈل سے باہر بھاگ نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں جدلیات میں پناہ حاصل کرتے ہوئے اپنی ہی دلیل کو نظریاتی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

روایتی عمرانیات اور ادبیات (مثلاً پلیخانوف) میں بنیادی فرق یہ ہے کہ گولڈمین طریقۂ کار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے سابقہ معاشرتی، تاریخی ماحولیات کو سیاق و سباق کے طور پر برتتے ہیں جو کہ معاشرتی تاریخی تناظر میں نئی حرکیات کو جنم دیتی ہیں جو اُن کے یہاں غالب نظریہ بن کے ابھرتا ہے۔

جنسیاتی ساختیات بنیادی طور پر جرمنی کی نئی عینیت پسندی ہے جو نظری سائنس اور ثقافتی یا شہری سائنس کے درمیان فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ گولڈمین کے خیال میں نظری سائنس بین السطور دنیا کا مادی مظہر ہے جو بغیر کسی تربیت کے مطالعہ کیا جاتا ہے جو ایک ایسے سائنسی طریق کار کو وضع کرتا ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور مطالعہ کرنے والا دنیا کے موضوعی مظاہر کا تجزیہ بالکل اسی طرح کرتا ہے جیسے وہ پہلے معروضی مظاہر کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے۔ معاشرتی اور تاریخی احوال میں پہلے ہی سے حدود کی خاصی جکڑ بندیاں ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گولڈمین کے یہاں معروض اور موضوع کا تعلق تاریخی ہوتے ہوئے بھی جدلیاتی ہے۔ انھوں نے ہیگل کے غیر تنقیدی تصوّر اصلاح کلیت (TOTALITY) کو بھی خوش آمدید کہا جو مکمل موضوعی اور معروضی تصورات کا احاطہ کرتی ہیں۔

جنسیاتی ساختیات میں نزاع اس وقت سامنے آئے جب اسے مصنوعی (PSEUDO) مارکسی حوالے سے پرکھا گیا اور اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ ادب صرف نقل ہے اور فنکارانہ عمل کو دوبارہ زندہ کرتے ہوئے عمرانیاتی تصورات کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا جس کے ردعمل سے نیا نظریہ سامنے آیا جس میں کئی میکانیکی اور منصوبہ جاتی راہوں کو اپناتے ہوئے ادب کو براہِ راست مارکسی ماتحتی میں دے دیا گیا جہاں ایک طرف ادبی تخلیق کے پیچھے معاشرے کا عمرانیات اور اقتصادی ڈھانچہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ادبی تخلیق کا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ گولڈمین کا جنسیاتی ساختیات کا نظریہ کمزور سیاسی ادبی اور معاشرتی نظریات اور عقائد کا مجموعہ ہے جو کہ نہایت عجلت میں سرانجام دیا گیا۔ یہاں ذہن (ZIMA) کے سائنسی اصولوں کے

تجربات کی طرف بھی رجوع ہوتا ہے۔ زیما نے اصول مماثلت (PRINCIPLE OF HOMOLOGY) کو جمالیاتی ساختیہ اور معاشرتی ساختیہ میں تقسیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ گولڈمین کے تصوّرات کانت کے نظریات کا الوداعیہ ہے۔ زیما نے گولڈمین کے بورژوازی فلسفیانہ افکار کی تین سطحیں بتائی ہیں۔

(i) انفرادی سطح۔ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تجربیت روشن خیالی اور عقلیت پسندی کا ظہور ہوتا ہے۔

(ii) المیاتی سطح: جب کانت اور پاسکل کے تصوّرات کے برعکس جایا جاتا ہے۔

(iii) جدلیاتی سطح: جب ہیگل مارکس اور لوکاش کے نظریات کو بیان کیا جاتا ہے۔

گولڈمین کے نزدیک بڑی توجیہہ تجربیت کے لیے ہوتی ہے کانت اور پاسکل کے تصورات ناالہیت کا المیہ ہیں جو کہ بس انفرادیت کا تصوّر ہے اور انفرادی موضوع ہے۔ ٹھوس آگہی ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر ہوتا ہے (زرریاتی ماورائیت) اور موضوع ہی تاریخی طریقۂ کار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اوپر زیما نے مماثل اصولوں کی جو تین سطحیں بتائی ہیں وہ رسے ژان اور پاسکل کے جنسیاتی ساختیات کے بنیادی اصول ہیں۔ رسے ژان کا ذاتی شعور وجودی شعور کی شکل اختیار کر جاتا ہے جبکہ جدلیاتی ماورائیت دنیا کا انقلابی تصور ہے جو انسانی معاشرے کی جانب فرد کی ذاتی مراجعت ہے جس کی مثال ژان ژینے کے ڈرامے اندرے مارکیس کے ناولز اردو میں ن م راشد کی شاعری اور انور خاں کے افسانے ہیں۔ تخلیقی عمل ہمیشہ مقتدر ہوتا ہے جو خصوصاً گروہوں کے شعور کی عکاسی کرتا ہے۔

گولڈمین کے یہاں فطرت کا معاملہ بہت جلد علم الادراک سے تبدیل ہو کر تاریخیت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور فوراً ہی جدلیاتی روپ دھار لیتا ہے یوں معروض یا موضوع کی شناخت محض تاریخ کا جز بن کر رہ جاتی ہے یہاں جدلیاتی طریقہ کار کا عمل جنسیاتی ساختیات میں دو سطحوں میں منقسم ہو جاتا ہے اس مرحلے پر تخلیق کار کا ارتقا موضوعی اور معروضی دونوں ہی زاویوں سے پرکھا جاتا ہے جس کو ہم تاریخی سیاق میں پرکھ سکتے ہیں (DIACHRONIC) تو دوسری سطح پر ٹھوس ساختیاتی ڈھانچے کو ایک خاص زمانی رویّہ کے ساتھ مستحکم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو ایک قسم کا غیر تاریخی یک زمانی تصور ہے (SYNCHRONIC VIEW) یہاں گولڈمین تاریخی شناخت کی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔ وہ علم الادراک کی مشکلات سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں جو انسانی سائنس سے متعلقہ علوم پر نہایت ہی گہرائی سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کا تاریخی زاویہ نگاہ اصل میں ادب یا عمرانیات کا غیر تاریخی (SYNCHRONIC) منظر نامہ ہے وہ معروضی سطح پر معاشرے کے تاریخی حقائق کو تلاش کرتے ہیں جو اُن کے یہاں علم الادراک کے انسانی مسائل ہیں۔

لیوی اسٹروس کے بقول معاشرتی حقائق اور اس کے نتائج دراصل زبان کی اصل ساخت ہے جو زبان کے موضوع (اس کے متعلقہ اشیا بھی!) کو مکمل طور پر اظہار کا جامہ نہیں پہناتی کیونکہ اس کے شناختی اجزاء بے نام (گم شدہ) ہوتے ہیں کیونکہ زبان کی خود اپنی حقیقتیں ہوتی ہیں اور وہی اپنی سچائی کے اصول اپنے ہاتھوں سے ترتیب دیتی ہے زبان اپنا معروضی ڈھانچہ خود ہی بناتی ہے اور جب چاہے بگاڑ بھی دیتی ہے کیونکہ انسانی استدلال اس بارے میں کسی سوال کا جواب دینے میں قاصر رہتا ہے۔ گولڈمین کا نقطۂ نظر کلی طور پر فرد کے کردار کا اظہار ہے جس کو فرد کسی مخصوص حالات میں بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ ژان پیاژے کے تصوّرات کے زیر اثر رہ کر انسانی حقائق کو دوہری صورتوں میں برتتے ہوئے انھیں قدیم ساختیات سے باہر نکال پھینکتے ہیں (جس کو رد ساختیات بھی کہہ سکتے ہیں) کیونکہ یہ تصوّر نئے معاشرتی گروہوں کی کلیت کی ساخت نو بھی کرتا ہے اور نئی ساخت سے ضروریات کے مطابق نئے مطالبات تسلیم کرواتا ہے جو جلد ہی موضوع اور معروض کے درمیان میزانیہ بن جاتے ہیں۔ گولڈمین کے نزدیک انسانی حقائق، اقتصادی معاشرتی، سیاسی یا ثقافتی نوعیتوں کے ہوتے ہیں اور تاریخی اشیاء کی فکر موضوع کی قائم مقام بن جاتی ہے اور یوں موضوع انفرادی نوعیت سے اپنی شکل تبدیل کر کے اجتماعی صورت میں نمودار ہوتا ہے شاید اس لیے فرد ماورائی کا موضوع آگے چل کر فرد کے باہمی تعلقات میں منتقل ہو جاتا ہے۔

یہ تصورات ساختیات کے بنیادی مفروضات ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ہیگل مارکس فرائڈ اور لوکاش سے وضع کیے گئے ہیں جو گولڈمین کے

جنسیاتی ساختیات کے تصور کو تشکیل دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ تمام معروضات اس بات کا احاطہ کرتے ہیں کہ معاشرے میں انفرادی یا اجتماعی طور پر فرد کے اعمال۔ لایعنی نہیں ہوتے چاہے فرد کسی مقصد (مقاصد) کو حاصل کرنے میں کامیاب رہے یا اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

جنسیاتی ساختیات انسانی سائنس کے ایک خصوصی سیاق کے ساتھ تاریخی اور ادبی پس منظر میں تجزیہ کرتا ہے تو انسانی سائنس گولڈمین طریقہ کار سے تعبیر کرتے ہیں جہاں سے انسانی روابط کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس موضوع کے تحت سائنسی تحقیقات (انکوائری) پیچیدگی پیدا کرتی ہیں کیوں کہ نہ ہی ان کی مشابہتیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہیں۔ یہ یکسانیت ادب کے دو بڑے مکتبۂ فکر مراد مارکسی اور فرائڈین اسکول کے اختلاف سے شروع ہوتی ہے جن کے طریقۂ کار اور انداز فکر میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ انسانی حوالے سے جنسیاتی ساختیات کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ موضوع اور معروض کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے اور ان دونوں تصورات کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کرتا ہو لیکن بعض دفعہ یہ مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے کہ توازن کے اس عمل کے دوران موضوع کا ذہن ساختیہ اور خارجی دنیا اس کے کردار سے کنٹرول ہونا شروع ہو جاتے ہیں یوں ایک نئے نظام توازن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

انسانی حقائق دو اقسام کے طریق کار کو تشکیل دیتے ہیں۔

۱۔ رد ساختیات۔ جو پرانی ساخت ہوتی ہو۔

۲۔ ساخت سازی۔ ایک قسم کی نئی کلیت کی جو کسی معاشرتی گروہ کی پیداوار میں در آتی ہے۔ اس کی کو توازن کا عمل کسی طور پر بہتر بناتا ہو۔

گولڈمین کا کہنا ہے کہ ہم حقائق کی بات کرتے ہیں تو اس عمل میں موضوع کا عمل بھی کارفرما ہوتا ہے۔ جب وہ دیگر نوعیات کا ذکر کرتے ہیں یہ بتاتے ہیں کہ ان تصورات کا ردعمل کے طور پر متفرق ریڈیکل رویئے سامنے آتے ہیں جن میں حقیقت بھی ہو سکتی ہے (جس کو ہم تجربی استدلالی یا مظہریاتی کہہ سکتے ہیں) اور انفرادیت سے (EPIPHENO MENON) اور اس میں سے اجتماعیت کا نظارہ صرف اور خالصتاً متقدر موضوعیت میں کرتے ہیں۔ آخر کار جدلیاتی تصوریت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس میں ہیگل اور مارکس کے انکار کو برتا جاتا ہے۔ یہاں رومانیت اجتماعیت کا اصل موضوع بن جاتا ہے اور یہ فراموش کیے بغیر کہ اجتماعیت فرد کی پیچیدہ صورتحال کے بین التعلقات کو بیان کرتے ہوئے انسانی ساختیے کی انتہائی موضوعیت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے جو بحیثیت کردار سازی کے زیر اثر بحث کی جاتی ہیں۔

فرد اپنی زندگی میں ہر لمحہ آگہی کے عمل سے گذرتا ہے۔ آگہی کا مسئلہ اس بات کی آگہی ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہتا ہے۔ جب روحانوی سطح پر آکر سوچا جاتا ہے تو اس کا انداز متصوفانہ ہو جاتا ہے اور یہاں فرد کسی بھی حقیقت کی تشریح کرنے سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ تخلیقی عمل کائنات انسانی اور کائنات کے تجربی نمونوں کے باہم پر اسرار وحدت کا نام ہے۔ تخلیق کا متصوفانہ رویہ ذہنی کیفیات سے معروضی اشیاء کے لامحدود قسم کے حسی اور تجربی روابط ہوتے ہیں جن میں جذبات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن تخلیقی مفہوم کا اصل سرچشمہ فرد کا اجتماعی شعور ہوتا ہے۔ تخلیق میں حقیقت کا شعور فنون لطیفہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن یہ اس قسم کی گہری حقیقت نہیں ہوتی جو سائنسی یا فلسفیانہ فکر کے فرد کے تجربے میں آئی ہے۔ گولڈمین اس بات کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ ادب گروہ سے متعلق ہوتا ہے نہ کہ فرد سے۔ جس نے اسے تحریر کی شکل دی ہوتی ہے۔ جدلیاتی نقطۂ نظر سے اس کے انفرادی پہلوؤں سے بھی انکار ممکن نہیں ہے اور نہ ہی عقلیت پسندی نہ تجربیت پسندی اور نہ ہی مظہریت پسند معاشرے کی ماحولیاتی حقیقت۔ اس کی خارجی صورتحال سے انکار کرتے ہیں جہاں فرد کی عملی حقیقت ایک ثقافتی روش پر سفر کرتی ہے۔ اس مقام پر دو مسائل سر اٹھاتے ہیں (i) موجود گروہ اور اس کی عملیات میں کس طرح روابط کا نظام انجام پاتا ہے (ii) جو عمل سر انجام دیا جا رہا ہے وہ گروہ سے کس قدر متعلق ہے۔

سب سے پہلے مرحلہ پر (خاص طور پر جارج لوکاش کی تحریریں) جس چیز کی طرف کروٹ بدلتی ہیں وہ ادب کی عمرانیات کا علم ہے۔ عمرانیات کے دیگر ادبی مکتبۂ فکر چاہے وہ بڑے ہوں یا نئے۔ وہ اس بات کو متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادبی متن کے اجتماعی شعور کی نوعیت کیا ہو یہ طریقہ کار بعض دفعہ خاصے مفید نتائج کا بھی موجب ہوتا ہے تو بعض دفعہ اس کے منفی پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن میں دو خاصے اہم ہیں۔

(۱) ادب سیاق کے عناصر کو اجتماعی شعور سے حاصل کرتا ہے جو

اس کے اردگرد بکھرے ہوئے تجربی پہلوؤں کی معاشرتی حقیقت ہوتی ہے جو منتشر ہوتی ہے اس میں کبھی بھی کسی ترتیب وار نظام کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں لکھنے والا صرف چند نکات ہی اخذ کر پاتا ہے۔ اس مرحلے پر خاص طور پر عمرانیاتی طریق کار، متن میں تلازمہ بندی کر کے اس ڈھیلی گرفت میں وحدت کی صورت پیدا کر دیتے ہیں جن کو خصوصی کلیدی، ادبی نوعیت کے نکات کا نام دیا جا سکتا ہے۔

(ii) معاشرے کے فوری پہلوؤں کو اجتماعی شعور دوبارہ زندہ کرتا ہے جب ادیب اپنی تحریروں کے متعلقہ متن میں ذاتی تجربات کو کم بیان کرتا ہے

اس موقع پر جنسیاتی ساختیات اپنے اظہار میں مکمل طور پر ایک تغیّر پذیر مظہر بن جاتی ہے جہاں بنیادی قیاسات ادبی اور تخلیقی کردار کی اجتماعی تصویر کو اجاگر کرتے ہیں اور جہاں حقیقت اور کائنات کا ساختیہ مماثلت (HOMOLOUS) کا ذہنی ساختیہ بن جاتی ہے جو کسی مخصوص، معاشرتی گردہی صورتحال میں یا کسی دانشورانہ روابط میں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں۔ سیاق کی اس سطح پر تمثالی کائنات کو ساختیات کی باہوں ہی میں نگہداشت میسّر آتی ہے اور اس قسم کی فضا بن جاتی ہے کہ تخلیق کار کی سوچوں کو مکمّل آزادی کے ساتھ اپنی بات کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہاں ذاتی تجربہ جہاں اپنے تمثالی جمال سے لطف اندوز ہوتا ہے تو دوسری جانب ادبی تجزیے کا مرحلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

یہاں آکر عمرانیات، ساختیاتی عمرانیات سے جدا ہو جاتی ہے اصل چیز جو سامنے آتی ہے وہ کسی نہ کسی طور پر فرد کا اجتماعی شعور ہوتا ہے جہاں علم الادراک کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ تمام انسانی گروہوں افعال ایک شعور کے تحت کام کر رہے ہیں جہاں ساختیاتی معروضات تشکیل دیے جاتے ہیں جہاں حقائق کو جاننے کی سعی کی جاتی ہے۔ اجتماعی شعور کے حوالے سے دانشورانہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے ساختیے کو عارضی یا جزوی عنصر کے طور پر تسلیم کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے جہاں اس کے آپسی تعلقات کو مماثلت (HOMOLOGIES) کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے جو اصل میں ایک ثقافت کو تشکیل دے رہے ہوتے ہیں۔

ذاتی ساختیہ آج بھی مارکس اور فرائڈین نظریات کے زیر اثر مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کے مخصوص طریقہ کار کو اپنا کر دلائل دیتے ہوئے نتائج مرتب کیے جاتے ہیں لیکن گولڈمین کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جب نظریات اور طبعزاد فکر عقیدے (پتھر کی لکیر) کا روپ دھار لے تو فکر میں جمود کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے اور مسئلہ اتنا جذباتی ہو جاتا ہے کہ بنتی ہوئی بات بھی بگڑ جاتی ہے (اسکی مثال مارکسی اور فرائیڈین اسکول کی پرانی دشمنی ہے۔ ان دونوں مکاتب نے ادب، معاشرتی اور بشری علوم پر اچھے اور برے دونوں ہی اثرات مرتب کئے اس سے سب واقف ہیں) گولڈمین نے فردیاتی اور رائیت کو موضوعیاتی ساختیات کی شکل دینے کی بھی کوشش کی جو کہ فرد کے داخل کا ذہنی اور جذباتی اظہار ہے جو ان کی نظر میں عمل کردار ہے جہاں وہ فکر کے دو انتہا پسندانہ پہلوؤں کو ذہن میں بسائے ہوئے ہیں خاص طور پر ان کی فکر پر شہوانی معنویت اتنی حاوی ہے کہ ان کے معاشرتی مفاہیم انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں تو دوسری جانب وہ انفرادی سرگرمیوں کو کچھ زیادہ ہی معاشرتی معنویت کا رنگ دے دیتے ہیں اور وہ ان دونوں مظاہر میں شدت جذبات سے مجبور ہو کر کچھ زیادہ ہی روابط کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ اگر گولڈمین کی جنسیاتی ساختیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے جو بھی دلائل ساختیاتی سیاق میں دئے ہیں کہیں وہ لوکاش کے طبقاتی شعور کے تاریخی نظریے کی عمرانیاتی / ساختیاتی تشریح تو نہیں جس میں تاریخی مادیت کے نظریے کا بھی دبے الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے لوکاش نے ہیگل اور کانٹ کے تصورات کو جس طرح رد کیا۔ گولڈمین نے انھیں مزید توسیع دی جہاں لوکاش کے منطقی سفر کو ہیگل کی جمالیات میں بھی تلاش کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ دیگر ساختیات نقادوں کے مقابلہ میں گولڈمین نے خاص عمرانیات سے بھی سب سے زیادہ استفادہ حاصل کیا۔ خاص کر انھوں نے جنسیاتی ساختیات کی بنیادیں جرمن عمرانیات داں مارکس ویبر کے تصورات میں تلاش کرتے ہوئے جہاں وہ ویبر کے طبعیات (DATA) کی تجزیاتی جامعیت کے قائل ہیں جو تحقیق کا سب سے اہم داخلی عنصر ہے۔ جو انسانی کردار کے مطالعہ میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں جو کسی طور پر مظہریت یا نفسیاتی تجزیے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جہاں سے معنویت کے افعال اور واقعات کو شعوری بنیادیں فراہم ہوتی ہیں اور اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ تاریخ اپنا مطالعہ سب سے پہلے فرد کے احوال کی آگہی سے شروع کرتی ہے۔

جنسیاتی ساختیات کا تصور اصل میں ہیئت پسندانہ ساختیات کے خلاف گولڈمین کا شدید قسم کا فکری ردّعمل ہے۔ وہ ہیئت پسندانہ ساختیات کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہیں کیوں کہ لیوی اسٹراس نے ساختیات کے سلسلے میں یہ رویّہ اپنایا تھا کہ ذہن نظام کا فطری میلان یہ ہوتا ہے کہ معاشرت سے ریڈیکل راہوں کو مٹا دیا جائے کیوں کہ اس کی تمام تر دل چسپی تاریخ اور معنویت کے مسائل میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تمام کی تمام کلیت ہم آہنگ فلسفہ خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل دیتا ہے۔

ہیئت پسندانہ ساختیات کانٹ ازم کی مقدار نفی کی موضوعیت کے درمیان دوئی ہے۔ جب کہ التھسر (ALTIHSSER) کا کہنا ہے کہ "یہ مادیت کی تشکیل نو کرتی ہے۔" لیکن ساتھ ہی ساتھ جنسیاتی ساختیات علم الادراک کے ان مباحث کو بھی چھیڑتی ہے جو ہیئت پسندانہ ساختیات کے بنیادی مسائل ہیں۔ گولڈمین نے ہر اس ساختیاتی تجزیے کی کھل کر مخالفت کی جس میں معاشرتی اثرات اور عوامل کی اہمیت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ خاص طور پر ان کی جنسیاتی ساختیات اس عقائدی وظائفی ساختیات کی پرزور مذمت کی جو تخلیق کو ان کے اصل معنوں سے دور کر دیتی ہے۔ بشریاتی ساختیات وہ اس حد تک قبول کرتے ہیں جہاں تک ان کا مفروضہ نظریہ متاثر نہ ہو اور ثقافتی نظام کی تعیّنات سمجھیں، حالاں کہ انھوں نے لیوی اسٹراوس کی ساختیاتی ثقافتی بشریات کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا۔

گولڈمین نے ادب کی تفہیم کے لیے کسی تحریر میں پوشیدہ عناصر اور دیگر اجزا کی شناخت کو ضروری تصوّر کرتے ہوئے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ کسی تخلیق یا تحریر کے پس منظر میں تاریخی شعور اور ان کی بنیادوں میں معاشرتی عوامل کو تلاش کیے بغیر ہم صحیح طور پر ادب کو نہیں سمجھ سکتے۔ گولڈمین کا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تحریر میں جو لاتعداد عناصر مختلف اکائیوں کی صورت میں بکھرے ہوتے ہیں ان کے باہمی روابط کو بھی تلاش کرنا ضروری ہے جس کو وہ عمومی تخلیقی تشکیلیت سے موسوم کرتے ہیں۔

گولڈمین نے جنسیاتی ساختیات کو بیان کرتے ہوئے محنت کش طبقے کی صارفیت پسند معاشرے میں ارتباط کے مسئلے پر بھی اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔ کیوں کہ بقول مارکسی فلسفہ محنت کشوں کا طبقہ وہ واحد طبقہ ہے جو نئی ثقافت کی بنیادیں رکھتا ہے لیکن وہ معاشرے سے مربوط نہیں ہوتا۔ اگر روایتی عمرانیاتی ذہن سے سوچا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ثقافتی تخلیقیت جب ہی پیدا ہوتی ہے جب ذہنی ساختیے اور تخلیق کار کے درمیان ہم آہنگی ہو۔ یہاں معاشرتی گروہ کی بھی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ جیکولس لینھارٹ نے لکھا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ ایک مارکسٹ دانشور کے یہ صورت حال مایوس کن ہے محنت کش طبقے کے انضمام کا نعرہ ساٹھویں دہائی میں لگایا گیا جو ثقافتی تخلیقیت کا کا لعدم نظریہ ہے جس کو مارکسی نقاد گولڈمین نے بیان کیا ہے۔"

اس بیان کی اس طور پر بھی تشریح کی جا سکتی ہے کہ دنیا کا ناظر ایک ثالثی ساختیہ ہے۔ اسی تصور کو لے کر گولڈمین نے اپنی کتاب: TOWARDS A SOCIOLOGY OF NOVEL میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو مفروضات کے مماثلیاتی HOMOLOGICAL ارتباط کے مابین ایک قسم کی ریڈیکل ساختیاتی تفریق پیدا کر دیتے ہیں جنسیاتی ساختیات میں سب سے اہم عنصر عمرانیات اور عصری ادب کے مسائل میں جو تخلیقی عمل سے لے کر معاشرے کی کلیت سے منسلک ہیں بقول گولڈمین یہ ادیب کا مبادلیاتی تصور ہے جو وظائفی نوعیت کا ہوتے ہوئے بھی معروضی نوعیت کا احاطہ کرتا ہے کیونکہ اجتماعی شعور انفرادی شعور سے ارفع ہے۔ انفرادی شعور عموماً اس سطح پر آکر اجتماعی شعور کو واضح طور پر فریب میں مبتلا کر کے خود موضوع سے باہر راہ فرار اختیار کر جاتا ہے۔

گولڈمین کے تصور جنسیاتی ساختیات کو غیر متنی ساختیات بھی کہا گیا۔ وہ فرد کے تخلیقی رویوں کو ایک وسیع معروض کے تناظر میں دیکھتے ہیں جہاں مارکسی عمرانیاتی شعور کو ساختیاتی بنیادیں فراہم ہوتی ہیں۔

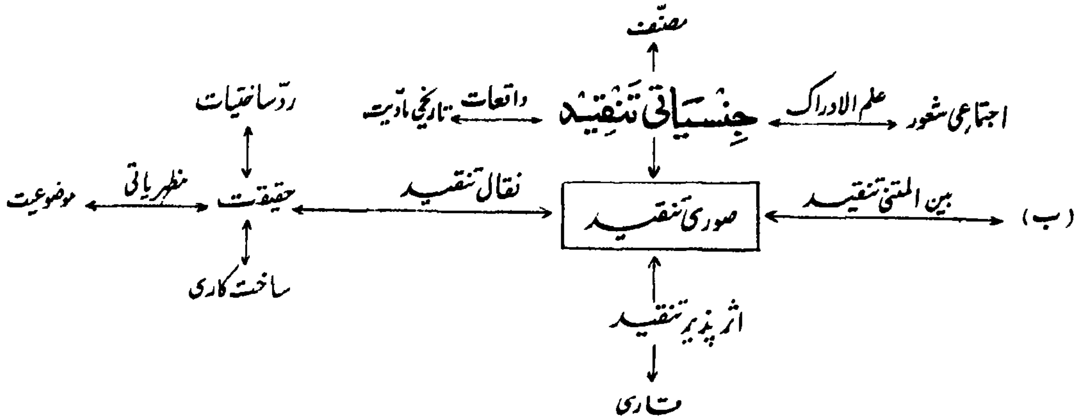
گولڈمین کے بعد جنسیاتی ساختیات کے میدان میں سرگرمی خاصی مدھم پڑ گئی ہے۔ آج انھیں انتقال کیے ہوئے تقریباً بائیس سال گزر گئے ہیں، لیکن ان کے جنسیاتی ساختیات کے تصوّر کو کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ملا جو ان کے تصوّرات کو توسیع دے۔

دوسری وجہ آج کا عالمی معاشرہ جس غیر نظریاتی اور غیر وابستہ (غیر سکہ بند) راہوں پر گامزن ہے اسے گولڈ مین جیسے لوگوں کے ریڈیکل اور انقلابی نظریوں کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ صورت حال اس سبب پیدا ہوئی کہ یہ وقت کا تقاضا ہے، کیوں کہ آج بیسویں صدی کے اختتام پر ادب اور معاشرتی تخلیق کار سے مختلف نوعیت کے مطالبات کر رہا ہے کیوں کہ دنیا کے مسائل کی نوعیت اور حالات کی صورت حال پہلے سے یکسر نہیں تو خاصی حد تک ضرور بدل گئی ہے۔

لوسین گولڈ مین کا جنسیاتی ساختیات کا فلسفہ ایک شکست خوردہ فلسفے سے جذباتی وابستگی کا اظہار ہے جہاں ادب اور معاشرے کی تمام تر "حقیقت پسندانہ" توجیحات عینیت پسندی کی ڈھول ثابت ہوتی ہیں۔

□□

گولڈ مین کی جنسیاتی ساختیاتی تنقید کا فکری ڈھانچہ



REFERENCES CITED

Adorno, T.W.
Prisms: Cultural Criticism And Society,
Superman, London 1967.

Caute, David.
Portrait Of The Artist And Midwife; In
Time Literary Supplement,
26 November, no 3639, 1465-1466, 1971.

Cros, Edmon.
Theory And Practice Of Sociocriticism,
University Of Minnesota Press,
Minneaplis, MN. 1988, pp3-19.

Comrie, Bernard.
Genetic Classification, Contact, and
Variation, Georgetown University Round
Table On Languages And Linguistics,
1988, p 81-93.

Goldmann, L.
The Balcony: A Realist Play, Praxis, 4
1st Published 1960.

Goldmann, L.
Cultural Creation In Modern Society, Telos
Press, 1980.

Goldmann, L.
Towards The Sociology Of The Novel, Methuen,
London, 1975.

Goldmann, L.
Method In The Sociology Of Literature:
Status And Problems Of Method," In Albrecht,
etal 1970.

Goldmann, L.
Lukacs And Heidegger, Ruthledge And Kegan
Paul, London, 1977.

Goldmann, L.
Racine, Cambridge, Rivers Press,
1972.

Goldmann,L.
Ideology And Writing,In Times Literary Supplement28,September 1967-903-905.

Goldmann,L.
"Criticism Dogmatism In Literature," in David Cooper(ed)The Dialectics Of Liberation, Penguin,Harmondsworth,1968.

Goldmann,L.
The Human Sciences And Philosophy,CAPE, London,1969.

Goldmann,L.
The Hidden god,Routledge & Kegan Paul, London,1964.

Horkheimer,Mand.Adorno,T.W.
Dialectic Of Enlightenment,Allen Lane, London 1973.

Mackey,Richard(ed)
"Velocities Of Change",The John Hopkins University Press Baltimore and London 1974 p82-102(on Goldmann)

Martindale,D.
The Nature And Types Of Sociological Theory,Houghton Mifflin,Boston 1960. Ch.17&18.

Said,Edward W.
"A Sociology Of Mind",Partisan Review33 (1966) 444-448 On Lucien Goldmann.

Sayre,R.
Lowenthal,Goldmann And Sociology Of Literature,Telos,no45 Autumn 1980.

Stamiris,yiannis.
Main Currents in Twenieth Century Literary Criticism-A Critical Study,Tory,New york, 1986,p53-63.

Scigaj,Leonard M.
Genetic Memory And Three Traditions Of Crow, Perspective On Contemporary Literature,1983,V 9 pp83-93.

Selden,Ramon(ed),
The Theory Of Criticism, From Palato To The Present:A Reader, Longman,London, Newyork 1988,p434-435.

Swingewood,Alan.
Socological Poetics And Aesthetic Theory, St.Martin NEW York 1987 pp25-34.

Wawthorn,Jermy.
Foundation Issue In Literary Theory, Edward Arnold,London,1987 pp84-87.

°°°°°°°

غزل

یہ زخم ہاتھوں کے کہتے ہیں کامیاب ہوں میں
گلوں سے دور ہوں، کانٹوں کو دستیاب ہوں میں

ہے میرے جسم میں محفوظ خوشبوؤں کا جہاں
یہ اور بات کہ سوکھا ہوا گلاب ہوں میں

مرا وجود ہے تیری حیات کا ضامن
تو ماہتاب اگر ہے تو آفتاب ہوں میں

خوشی سے تم نے جسے آج تک ادا نہ کیا
وہ قرض ہوں میں تمھارا اور اک حساب ہوں میں

پلٹ کے آئیں نہ آنسو مرے تعاقب میں
تجھے یقین اگر ہے کہ صرف خواب ہوں میں

اب اچھے لگتے نہیں ہیں یہ خواب کے پردے
اب اس کی جاگتی آنکھوں کا اضطراب ہوں میں

کتابِ وقت پہ دنیائے بے وفا جاوید
جو لکھ کے بھول گئی ہے وہ انتساب ہوں میں

جاوید برقی
نشاط گنج
لکھنؤ

ڈاکٹر سید عبد الباری
محلہ لالہ کا پروا، سلطان پور ۲۲۸۰۰۱

اِقبالؔ : شخص اور شاعر

کسے معلوم تھا کہ ۱۸۷۳ء میں عین اس وقت جب کہ انگریزی اقتدار کا سورج برصغیر میں نصف النّہار پر تھا اور کہیں سے مغربی تہذیب کے جلال و جبروت سے گلو خلاصی کے سلسلے میں امید و آرزو کی کوئی کرن نمودار نہیں ہوئی تھی، کشمیر سے قریب اور ہمالیہ کے دامن میں آباد ایک خاموش و پرسکون شہر سیالکوٹ میں ایک کشمیری نژاد نومسلم سپرو برہمن خاندان میں ایک ایسا ستارہ طلوع ہوگا جو مشرق اور مغرب کے افق کو تابناک بنا دے گا اور مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے تاریک و ہلاکت خیز پہلوؤں سے اہل مشرق کو آگاہ کر کے خودی و خود اعتمادی کی چنگاریوں سے ان کے وجود کو ستیز کر دے گا۔ اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد عرف نتھو پیشے کے اعتبار سے کلاہ ساز اور دھسّوں کے تاجر تھے مگر اپنے متصوفانہ مزاج اور سادگی و قلندری کی وجہ سے شہر میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ علامہ میر حسن ان کو ان پڑھ فلسفی کے لقب سے پکارتے تھے۔ میر تقی میرؔ کے والد نے اوّل اوّل انھیں خدا اور خلقِ خدا سے عشق کا سبق دیا تھا شیخ نور محمد نے اپنے سعادت مند بیٹے اقبال کو احترام آدمیت، عشقِ رسولؐ، مروّت، رحمت اور حسنِ اخلاق کا سبق ازبر کرایا۔ والدین کی اطاعت و تکریم کے حیرت انگیز واقعات ان کے سوانح نگاروں نے بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام معاملات و مسائل میں اقبال اپنی رائے، ارادے اور مرضی کو اپنے والدین کی رضا و ایما پر قربان کر دیتے تھے غیرت مند خود دار اور قناعت پسند خاندان کے اوصاف قطرہ قطرہ ان کے وجود میں جذب ہوتے رہے جن کی بدولت وہ آگے چل کر اپنے نرالے اور انوکھے فلسفہ خودی کے علمبردار بنے اور اہلِ مشرق کو یہ پیغام دیا کہ ایسے لقمہ سے انسان کو پرہیز کرنا چاہیئے جو اسکی عزت و وقار کو نیلام کرنے کا سبب بنے ؂

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ نان جس سے جاتی رہے اس کی آب

تصوّف کا مذاق ان کی فطرت میں ان کے والدین کی بدولت رچ بس گیا اور بقول پروفیسر افتخار احمد صدیقی اگرچہ عمر بھر عجمی تصوف کے فلسفیانہ رجحانات کے خلاف جہاد کرتے رہے لیکن درحقیقت اپنے قلندرانہ مزاج کی سادگی و بے ریائی جذب و مستی، فقر و استغنا نیز اپنے طرز فکر و احساس کے اعتبار سے عمر بھر صوفی رہے، اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں ؂

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ   ہے اس کی نہاد کافرانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو   ہے اس کا مذاق عارفانہ

اقبال نے ایک جرمن سیاح کے پوچھنے پر کہ آپ کیا تعلیم دیتے ہیں، فرمایا کہ میرے آبا و اجداد برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی عمر اسی سوچ میں گزاری کہ خدا کیا ہے۔ میں اپنی عمر اسی سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔

اقبال خوش قسمت تھے کہ اپنے تعلیمی سفر کا آغاز سید میر حسن

جیسے ذی علم استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے کیا جن کی روشن ضمیری کے سر سید احمد خاں بھی معترف تھے۔ عربی و فارسی میں دست گاہ اقبال کو انھیں کی بدولت حاصل ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آئے تو یہ شہر ان کے لیے تبریز و شیراز ثابت ہوا۔ یہاں بیٹھ کر انھوں نے تاریخ انسانی کے علم و تہذیب کا صدیوں کا سفر چند برسوں میں طے کر لیا۔ مشیت نے آرنلڈ جیسے روشن خیال اور شفیق استاد تک ان کی رہنمائی کی۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے کر کے اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر بن گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد کے فرائض انجام دیئے۔ ۲ سال کی یہ معلمی اقبال کے لیے بے حد فیض بخش رہی اور اسی دور میں مشرق و مغرب کے علم و فلسفہ اور شعر و ادب کا بحر ذخار انھوں نے اپنے سینے میں اتار لینے کی کوشش کی۔ لاہور اس زمانے میں آریہ سماجی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا اور اورینٹل کالج کے شعبہ سنسکرت میں خاصی چہل پہل تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر اور دیگر ذی علم مستشرقین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اقبال نے بھی سنسکرت سیکھی اور ویدک فلسفہ کا مطالعہ کیا، اس مرحلے میں ان کے دوست سوامی رام تیرتھ کافی معاون ثابت ہوئے جو وجودی صوفیوں کی طرح وسیع المشرب درویش صفت تھے۔ سوامی وویکا نند کی طرح انھوں نے بھی امریکا کا تبلیغی دورہ کیا تھا۔ وہ مندروں میں جا کر وید کی اور مسجد میں قرآن کی تشریح کرتے۔ حافظ شیرازی اور شمس تبریز کے اشعار ورد زبان تھے۔ خود ان کا یہ شعر ان کے مسلک کا ترجمان ہے ؎

نہ ہندوم نہ مسلماں نہ کافرم نہ یہود
بہ حیرتم کہ سرانجام من چہ خواہی بود

اقبال کے ابتدائی عہد کے کلام میں یہ وسیع المشربی جھلکتی ہے۔ مسلم صوفیا و مفکرین کے ساتھ وہ شنکر اچاریہ کے ویدانتی فلسفے کے مثبت پہلوؤں، تسلیم و رضا، احساسِ خودی اور شانِ بے نیازی سے متاثر تھے خاص طور پر شنکر کے انسان دوستی اور انسانی وحدت کے تصوّر کے قدردان تھے جن کا یہ قول تھا،

" ساری دنیا میرا وطن ہے اور سب کی خدمت میرا مذہب، بس محبت کی تجلّی کے سوا کچھ نہیں میں سب سے یکساں پیار کرتا ہوں۔"

اقبال کے مردِ مومن میں بھی شاہانہ تمکنت اور ادائے بے نیازی کے ساتھ پوری انسانیت کے لیے سراپا خیر و رحمت بننے کا جذبہ موجود ہے۔ اقبال اس عہد میں ایسا بھی نہیں کہ فقط کرم کتابی بن کر رہ گئے ہوں اور فلسفہ ما ورائیت کی خلاؤں میں پرواز کرتے رہے ہوں بلکہ وہ گرد و پیش کے ماحول کی آنچ کو بھی شدّت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ ماحول سے گہری وابستگی نے ان کے سماجی شعور کو بالیدہ بنایا اور وہ اپنی ابتدائی عمر کی شاعری کی ان منزلوں سے جلد آگے نکل گئے جہاں وہ ایک اوسط درجے کے موزوں طبع نوجوان نظر آتے ہیں جو داغ سے نیاز مندی کے ساتھ زبان و فن کے رموز سیکھ رہا تھا۔ اقبال کا یہ ذہنی سفر خدانخواستہ رک جاتا تو اُردو شاعری ایک آفاق گیر شاعر سے محروم ہو جاتی اور ظ انصاری کے الفاظ میں ہزار برس کی فارسی شاعری اور چار سو سال کی اُردو شاعری اپنی تمام رنگا رنگ لطافت اور شدّت کے ساتھ اس عظیم فن کار کے کلام میں جلوہ گر نہ ہو سکتی۔

اقبال کا فکری سفر سیالکوٹ سے لاہور اور پھر لاہور سے کیمبرج اور میونخ تک جاری رہا۔ **الحکمۃ ضالۃ المومن** کے مطابق وہ علم و حکمت کو مومن کا گم شدہ سرمایہ سمجھ کر مشرق و مغرب میں تلاش کرتے رہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی شاید یہی ہے کہ ان کے یہاں ذہنی جمود نہیں بلکہ مسلسل فکری ارتقا نظر آتا ہے اور آخر آخر وہ ایک ایسا بحرِ بے کنار بن جاتے ہیں جس کے قریب پہونچ کر ہم عالمی ادب، عالمی فلسفہ، عالمی مسائل، عالمی تاریخ اور عالمی تہذیب و اقدار کے گہرہائے آبدار سے ہم کنار ہوتے ہیں ؎

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ تھا ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

چناں چہ اقبال نے قرآن حکیم اور اقوالِ پیغمبر کے ساتھ اپنشد گیتا بدھ مت، رامائن، وشوامتر اور بھرتری ہری سب سے حق و خیر کی جستجو میں استفادہ کیا اور بالآخر اسلام کو ان ساری صداقتوں کا سرچشمہ اور ایک منظم و مرتب نظام فکر و عمل کی حیثیت سے اپنے آخری

درد کے کلام میں پیش کیا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال کے قیام یورپ اور وہاں کے اہلِ فکر سے استفادہ اور مغربی تہذیب کے مثبت و منفی پہلوؤں کے بچشم خود مشاہدہ نے ان کے فکر و خیال کو عالمگیر وسعت عطا کی۔ اب ان کی کمند تنقید کی زد میں مغرب کے فکر و خیال کی وہ بلند فصیلیں بھی تھیں جن کے تصور سے غلام مشرق تھراتا تھا۔ انھوں نے مغرب میں تجربہ و مشاہدہ، تحقیق و انکشاف، آزادیٔ فکر اور بلندیٔ نگاہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ہر چیز پر تجسس کی نظر ڈالنے، تقلید کے بندھنوں اور ذہنی غلامی سے آزاد ہونے اور روایتوں کی اندھی پرستش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پیغام وہ مشرق تک لے کر گئے۔ کیمبرج میں فلسفہ کے استاد میک ٹیگرٹ، فارسی ادب کے مورخ براؤن اور نکلسن سے وہ بہت قریب تھے جس نے ان کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس عہد میں اقبال نے جرمن اور فرانسیسی ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ خاص طور پر جرمن قوم کی قوتِ عمل، نفاست پسندی اور ذکاوت سے بہت متاثر ہوئے لیکن یورپ کی ظاہری و مادی چمک دمک ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکی۔ تصنع اور سطحیت کے تمام مظاہر پر انھوں نے کھل کر تنقید کی اور مغرب کی اخلاق بیزاری اور روحانیت کے گداز سے محرومی پر شکوہ سنج ہوئے ؎

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گذر

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال کو شدید احساس تھا کہ مغرب نے اپنی سائنسی ترقی اور تجربہ و مشاہدہ کا یہ ذوق خود مشرق سے حاصل کیا ہے، خاص طور سے اسلامی عہد کے اندلس کے علمی، تحقیقی اور ثقافتی و فنی کارناموں کی انھوں نے جگر سوز لہجے میں یاد دلائی ہے ؎

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں بر داشتند

ایں پری از شیشۂ اسلاف ماست
باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

یہ موتی علم و حکمت کے کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو لندن میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یورپ سے وطن لوٹنے کے بعد اقبال ایک حکیم و صاحبِ نظر فن کار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے جسے بقول ظ۔ انصاری "ہماری زبان کا سب سے زیادہ باشعور و بیدار فن کار کہا جا سکتا ہے جس کی بدولت بیسویں صدی میں اُردو و فارسی ادبیات نے کم از کم ایک صدی کا فاصلہ طے کیا اور وہ عالمی پیمانے پر مسائل حاضرہ سے دو بدو بات کرنے کے قابل ہوئی۔" اس شاعر کی گہری سوچ اور باخبری پر یقیناً حیرت ہوتی ہے جس کے فکر و فن میں جمود نہیں مسلسل حرکت، مسلسل جستجو اور خوب سے خوب تر کے حصول کی پیہم جدوجہد نظر آتی ہے۔ وہ صرف ایک فن کار نہیں بلکہ اپنی قوم و ملک کے سیاسی وقار و معاشی استحکام کی جدوجہد میں اپنے عہد کے دیگر مفکرین و مصلحین و قائدین کے شانہ بشانہ شامل نظر آتا ہے۔

۱۹۱۳ء میں مسجد کان پور کی فائرنگ کی تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے کان پور کا سفر کیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبر چنے گئے۔ اس سے قبل تحریک خلافت میں پوری دلچسپی لی۔ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کی۔ پھر جنوبی ہند کے متعدد شہروں کے سفر کیے اور علمی لیکچر دیے تاکہ مشرق اپنے گم شدہ خزانوں کی بازیافت کر سکے۔ اسی سفر میں وہ میسور میں سرنگا پٹم گئے اور شہید ٹیپو سلطان کے مزار پر حاضر ہوئے۔ اس موقع پر قوم کو اس عظیم شہید کے حوالے سے یہ پیغام دیا ؎

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں اقبال نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ کا سفر کیا۔ اس موقع پر پیرس میں نیپولین کے مزار پر گئے مشہور فلسفی برگساں سے ملاقات کی اور اندلس میں مسجد قرطبہ کی زیارت کی اور اس میں نماز ادا کی ۔ گاندھی جی کی سدیشی تحریک سے ۱۵ سال قبل اقبال کو یہ احساس تھا کہ جب تک ہندستان بدیسی مال کا محتاج ہے سر نہیں اٹھا سکتا۔ ان کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں ہندستان کی معاشی و سیاسی آزادی کے لئے ان کے دل کی تڑپ واشگاف ہوتی ہے۔

اقبال ایک سچے وطن دوست بلکہ وطن کی عظمت پر جان قربان کرنے والے ہندستانی شاعر تھے جن کا ترانۂ ہندی :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

آج بھی ہمارے لہو کی گردش تیز کر دیتا ہے خاص طور پر یہ شعر ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

لیکن اسی کے ساتھ اقبال مغرب کی جارحانہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے بھی سخت مخالف تھے۔ ان کی عالمگیر انسان دوستی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ انسانیت کو جغرافیائی حدود میں تقسیم کرکے ان کے درمیان تفریق و امتیاز کریں۔

اس وقت سماجی تبدیلی اور معاشرتی انقلاب کی ہر طرف آواز بلند ہو رہی ہے تاکہ رنگ و نسل اور ذات برادری کے بت ٹوٹ سکیں اور بنی نوع انسان میں حقیقی مساوات پیدا ہو سکے اقبال اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس صدی کے وسط میں جب کہ گھر گھر میں اقبال کے اشعار لوگوں کی نوک زبان پر تھے خود میرے گھر کے مہمان خانے میں خوش نما کتبوں کی شکل میں میرے والد نے اقبال کے یہ اشعار آویزاں کر رکھے تھے جو ہندستان کے بے شمار نوجوانوں کی طرح میرے دل میں بھی عجب ولولہ و سرمستی پیدا کر رہے تھے ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اقبال کا یہ کارنامہ یقیناً یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے ایک ایسے انسان کا آئیڈیل ہمارے سامنے رکھا جو ظ انصاری کے بقول مستقبل کے ترقی یافتہ دنیا بنانے اور سجانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اسے کہیں شاہیں یا طائر لاہوتی، کہیں مرد مومن یا مرد مسلماں، کبھی قلندر، کبھی وہ جس کی خودی فولاد ہو اور جو بیک وقت شعلہ و شبنم ہو" کی صورت میں نمایاں کرتے ہیں۔ اقبال سے زیادہ بہتر مستقبل کی امید و آرزو سے سرشار اور جہد و عمل کی تلقین کرنے والا کوئی اور شاعر ہندستانی ادبیات میں نظر نہیں آتا جو بار بار یہ تلقین کرتا ہو ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال انسان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے عشق فقر، صبر و شجاعت رزق حلال اور تخلیقی جد و جہد کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شخصیت کو برباد کرنے والے عناصر میں خوف، دوسروں کی کمائی پر گزر غلامی اور حسب نسب پر فخر جیسی مذموم باتیں شامل ہیں۔ آج جب کہ کردار کے زوال، شدید مادہ پرستی، اونچ نیچ، انسانیت کی تذلیل اور حقوق انسانی کی پامالی کا ایک طوفان دنیا میں آیا ہے' اقبال کے اشعار ہمارے سینے میں ایک نئی صبح کی بشارت بن کر گونجتے ہیں ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

□□

افسانہ

بخان عزمی رُدولوی
ارسادنرلی رودولی ۔ ۲۲۵۴۱۱

بازگشت — خوشیوں کی

"پاپا! پاپا۔ !!" چھ سات سالہ سلام باہر سے بھاگتا ہوا آیا۔ اور عارف سے کہنے لگا:۔ "پاپا! باری چچا اسکوٹر لائے ہیں، چمچماتا ہوا بالکل نیا۔ اے وَن!"

"تو!— ہمیں کیا؟!"۔ نُور بانو چیخ اٹھیں اور ننھا سلام لرز کر رہ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ "ہمارے یہاں بھی تو لے دِن سائیکل ہے پُرانی۔ کھڑکھڑیہ!" نورُبانو کا ایڈہ رنگ چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔

عارف سویرے کا اخبار دیکھ رہے تھے، چائے کی پیالی سامنے رکھی تھی۔ انھوں نے اخبار ہٹاکر سلام کو دیکھا، اپنی بیگم نور بانو پر نظر ڈالی ان کے طنز سے چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر ٹھنڈی سانس بھر کر پھر اخبار دیکھنے لگے۔ یہ ان کی عادت تھی — وہ نُور بانو کو بہت چاہتے تھے، ان کے ہر معاملہ میں درگزر کرتے رہنا ان کی فطرت بن چکی تھی۔

"تمھارے باری چچا! اب ہائیڈل میں جونیئر انجینیئر ہیں"۔ نور بانو کو عارف کی خاموشی اور گراں گزری اور پھر گفتگو کا آغاز کیا۔ "کالونی کے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ وہ انجینیئر نہیں تھے تو وہ بھی سائیکل پر چلتے تھے اسی لحاظ سے کپڑے بھی پہنتے تھے — اور اب!— دن میں دو بار تھری پیس سُوٹ بدلتے ہیں— آدمی کو اپنے وقار کا لحاظ تو کرنا ہی پڑتا ہے"۔ نوُر بانو خود کلامی کے انداز میں بظاہر سلام سے مخاطب ہونے کے ساتھ ساتھ ناشتہ بھی تیار کرتی جارہی تھیں— "اور تمھارے پاپا!— بینک میں صرف آفیسر ہیں— اور وہ بھی صرف دس سال سے — لوگ چاند پر آجارہے ہیں۔ اور تمھارے پاپا!— ابھی تک سائیکل پر ہیں"— نور بانو سسک اٹھیں۔ "دوسروں کے سامنے شرم محسوس ہوتی ہے"۔ وہ رونے لگیں۔

سلام حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اتنی سی بات پر ممّی رونے کیوں لگیں — اور عارف پریشان ہوگئے کہ یہ سب کیا ہوگیا۔

"یہ —تم کیسی باتیں لے کر بیٹھ گئیں نُور!" عارف کی آواز جیسے بہت دُور سے آئی۔

"یہ کیسی باتیں ہیں؟ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ!— دوسروں کے سامنے سر اٹھاکے چلنے کے حق سے بھی مجھے محروم کردینگے مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ جب آپ سائیکل پر بیٹھ کر بینک جاتے ہیں تو سب مذاق اُڑاتے ہیں — اور میں سارا دن کڑھتی رہتی ہوں"— نورُبانو کی سانس جلد جلد اندر باہر ہورہی تھی، لگتا تھا کہ اس کرب انگیز بات کے کہنے میں انھوں نے سارا زور صرف کر دیا ہو۔

"اس میں بھلا مذاق اُڑانے کی کیا بات ہے۔ سب سے اچھا کھاتی ہو اچھا پہنتی ہو— زیورات میں کوئی کمی نہیں — پھر بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ تو اُڑانے دو— ان کی وجہ سے میں سائیکل پر نہ چلوں — یہ تو ناممکن ہے" عارف کا لہجہ قدرے تیز ہوگیا— "کیا مذاق ہے"۔ وہ اخبار پھینک کر کھڑے ہوگئے اور بغیر غسل کیے ہوئے کپڑے بدلنے لگے — "ہر آدمی کے سوچنے کا ڈھنگ جُدا ہوتا ہے۔ بجٹ دیکھنا پڑتا ہے"۔

ان کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح نُور بانو آکر انھیں روک لیں گی، دیوار بن کر راستے میں کھڑی ہوجائیں گی، مگر! یہ کیا؟۔ نُور بانو نے کوئی نوٹس نہیں لیا— جیسے وہ اجنبی ہوں۔ بالکل بدل گئی ہوں — وہ پھر تیار ہوکر بیٹھ گئے۔ شاید مصالحت ہوجائے۔

"آپ میرے سارے زیور بیچ دیجئے"۔ نُور بانو کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے" وہ جھلاّ کر کھڑے ہو گئے۔ "وہی احساس کمتری جس میں تم مبتلا ہو۔ مجھے سونپ دینا چاہتی ہو ــــ زندہ درگور کر دینا چاہتی ہو"؟

"آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں؟!" نُور بانو کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"میں بالکل سمجھ رہا ہوں" عارف نے فوراً جواب دیا۔

"تو پھر! ــــ میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی" نور بانو پھر مشتعل ہو گئیں۔

"مجھے بھی احساس ہی نہیں، یقین ہو رہا ہے ــــ لیکن! میں نے شادی کے لئے ہامی کے......"

"ہاتھ نہیں جوڑے تھے" نُور بانو نے عارف کا نامکمل جملہ پُورا کر دیا۔

اور ــــ نوُر بانو کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی ــــ وہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئیں۔ چاروں طرف جیسے اندھیرا چھا گیا۔ جیسے طوفان باد و باراں، گھنگھور گھٹاؤں کا شور، بجلی کی چمک ــــ نور بانو کی زبان میں قفل لگ گیا۔ عارف چلے گئے۔ نور بانو نے جلتی ہوئی آنکھوں سے سائیکل کو دیکھا، جسے عارف آج چھوڑ گئے تھے۔ نُور بانو کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اُٹھا اور آنکھوں سے بہنے لگا۔

ایسی ہی ایک طوفانی رات تھی، موسلا دھار بارش کے ساتھ ساتھ مسلسل بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے ــــ پانی میں شرابور اور سردی سے کپکپاتا ہوا ایک لڑکا نوُر بانو کے برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا کاندھے پر لٹکے ہوئے سفری بیگ کو بینچ پر رکھ کر اپنا دامن نچوڑنے کے بعد اس نے ارادہ ہی کیا تھا کہ جُھک کر اپنے بالوں اور چہرے کو خشک کرے کہ کمرے کا دروازہ کھلنے پر وہ چونک پڑا۔ برآمدے میں جیسے زیادہ طاقت کا ایک اور بلب روشن ہو گیا ــــ وہ جس حالت میں تھا ساکت و جامد ہو گیا۔ سنگِ مرمر کا تراشا ہوا حسین شاہکار، لباس زیب تن کیے ہوئے اس کے سامنے جلوہ فرما تھا۔ چھریرا لانبا قد، متناسب اعضا، روشن روشن چہرہ، سچے موتیوں جیسے دانت۔

"آئیے! ــ اندر آجائیے ــ!" گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ متحرک ہوئے، اور اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ اسے لگا جیسے وہ پتھر کا ہو گیا۔ صدیوں سے پتھرایا ہوا اسی حالت میں کھڑا ہے۔ لیکن یہ احساس زندہ تھا کہ لڑکی کی مترنم آواز اس کے کانوں سے گزرتی ہوئی دل میں اُتر گئی ہے ــــ اس کے ہونٹوں میں جنبش تو ہوئی مگر زبان ساتھ نہ دے سکی

"آجائیے نا! سردی بہت ہے"

"جی! میں ...."

"کیوں؟! اتنی رات گئے میں گھر میں اکیلی ہوں ــــ اس لیے آپ ڈر رہے ہیں۔؟"

"نہیں! نہیں!! ــــ" اس کا ہاتھ نفی میں گردش کرنے لگا "بھلا میں اتنی پیاری اور مہربان بہن سے کیوں ڈرنے لگا۔ جو اجنبی ہونے کے باوجود ....." اس نے ایک ہاتھ سے بینچ کا ہتھہ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے بائیں طرف سینے کو تیزی سے سہلانے لگا ــــ "خدا کے لیے اب ــ اب کچھ نہ کہیے گا ــ ورنہ میرا دم نکل جائے گا" اس کا روشن اور تابناک چہرہ دُھندلا گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور بینچ سے رگڑ کھاتا ہوا زمین پر گر گیا۔ گرتے وقت وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"بھیّا۔! خدا کے لیے جلدی آیئے ــ!!"

اور کمرے سے نور بانو کا بھائی شکیل بھاگ کر آیا تو حیران رہ گیا۔

"ارے!! یہ تو عارف ہے" شکیل پھٹی پھٹی آنکھوں سے عارف کو دیکھ رہا تھا۔

"کون عارف ــ!؟" نوُر بانو جیسے پاگل ہو گئی۔

"وہی عارف! جس نے، میں ڈوب رہا تھا تو اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی تھی ــ تم اور امّی کئی بار ضد کر چکی ہو کہ مجھے عارف سے ملوائیے۔ مگر میں جان بوجھ کر ساتھ نہیں لایا۔ صرف اس لیے کہ یہی حال ہوتا، جو تم دیکھ رہی ہو۔ کالج میں اس سے کوئی پیار محبت کی باتیں نہیں کرتا ہے ــــ اسی طرح رونے کا دَورہ پڑ جاتا ہے اور بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے"

"اللہ کرے! انھیں میری عمر لگ جائے" نوُر بانو کے منھ سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا۔ اور شکیل کی آنکھیں اپنے لیے بہن کی محبت کی

بلندیوں کا اندازہ کر کے بھیگ گئیں۔

"امّی! عارف سے ملیے گا۔؟" شکیل نے ماں سے پوچھا اور وہ اُچھل پڑیں ـــ

"کک کون عارف۔؟ وہی جس نے تمہاری ـــ" شکیل کی امّی نے سوال کیا۔

"جی ہاں! وہی عارف۔" نورؔ بانو نے اطمینان دلایا۔

"تم لوگ مجھے پریشان نہ کیا کرو۔" وہ پھر کام میں مشغول ہوگئیں۔

"اس آندھی پانی میں وہ کیسے آگیا۔؟"

"امّی یقین کیجیے۔ وہ کمرے میں ہے۔" شکیل نے کہا۔

"خدا کے لیے مجھے اس سے ملوادو۔ میں اسے اپنے کلیجے میں بٹھالوں ـ" وہ خوشی سے جیسے پاگل ہوگئیں۔

"مگر امّی! آپ کو میرے سر کی قسم ہے۔ اس سے کچھ نہ کہیئے گا۔ ورنہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"کیوں۔؟ آخر ایسا کیوں ہے؟!!" وہ حیرت زدہ ہوگئیں۔

"عارف کے گاؤں میں فساد ہوگیا تھا۔ فسادیوں نے اس کے گھر میں آگ لگادی اور اس کی بدقسمت ماں، چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کو گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ سب جل کر ختم ہوگئے ـــ جب کالج میں اس کو خبر ملی تو جیسے سکتہ ہوگیا۔ آنکھیں ریگستان کی طرح خشک ہوگئیں۔ بلا امتیاز مذہب وملت کالج کے سارے طلبا مشتعل ہوگئے اور گاؤں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ مگر عارف نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر گڑگڑانا شروع کردیا۔

"میں انتقام نہیں لینا چاہتا۔ فسادی پاگل ہوتے ہیں، جانور ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی دھرم یا مذہب نہیں ہوتا۔ للہ! اب کسی اور کی جان نہ لیجیے۔ کسی کی جان لینے سے میرے اپنے نہیں لوٹ سکتے۔"

یہ کہہ کر وہ رونے لگا اور ہم سب بھی اس سے لپٹ کر رونے لگے ـــ پھر کچھ دیر بعد وہ ہمارے ہاتھوں پر جھول گیا ـــ اور اب ....!" شکیل کی آواز بدل گئی ـــ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

عارف شکیل کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہنس ہنس کر شکیل سے باتیں کر رہا تھا کہ نورؔ بانو نے اطلاع دی کہ امی کھانے کے لیے بُلا رہی ہیں۔

"عارف! یہ میری بہنا نور بانو ہے اور تمھیں تو یہ معلوم ہی ہو چکا ہے کہ یہ عارف ہے ـــ عارف معاف کرنا یار۔ میں انجانے میں یہ سوالات نور بانو سے کروا رہا تھا۔ اگر جانتا کہ تم ہو تو.... آؤ چلو کھانا کھالیں۔" شکیل نے اُٹھتے ہوئے کہا تو عارف جھجکا مگر اس کی ایک نہ چلی۔

شکیل اور نور بانو دونوں ڈر رہے تھے کہ امّی جذبات میں آکر گڑبڑ نہ کردیں مگر عارف نے سلام کیا تو دُعائیں دے کر خاموشی سے اس کو دیکھتی رہیں ان کے باوقار اور شگفتہ چہرے پر امتنان وتشکر کے رنگ آتے جاتے رہے ان کے دل میں یقیناً اظہار پذیرائی اور ستائش کا طوفان موجزن تھا، کیونکہ ہونٹوں کے گوشے لرز رہے تھے، آنکھیں نگراں تھیں۔ نورؔ بانو نے اس سکوت کو توڑنے کے لئے مداخلت بھی کی، مگر اس کی امّی کی محویت ختم نہیں ہوئی۔ لیکن چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صبر وضبط کے لیے انتہائی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

"امّی شروع کیجیے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے ـ" نورؔ بانو نے ٹوکا۔

اب میں کیا ـــ نہیں نہیں!! تم لوگ کھاؤ۔ میں بعد میں کھالوں گی۔" امّی نے کہا اور شکیل سمجھ گیا کہ امّی کہنے جارہی تھیں کہ اب میں کیا کھاؤں ـــ عارف کو دیکھ کر میرا پیٹ بھر گیا ہے ـــ مگر وہ ٹال گئیں ـــ نورؔ بانو سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی کہ اگر امّی کو منع نہ کردیا گیا ہوتا تو ڈانٹ پھٹکار کر اور منت سماجت کر کے عارف کو اتنا کھلاتیں کہ وہ عاجز آجاتا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ اس کے ہر اقدام کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتی رہیں ـــ قربان ہوتی رہیں۔

مگر ـــ! برداشت کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ چنانچہ کھانا ختم ہوتے ہی انھوں نے ایسی قیامت ڈھائی کہ عارف کی دُنیا ہی بدل گئی۔

"تو! بیٹے!! ـــ تم عارف ہو؟" شکیل کی امّی نے اچانک سوال کردیا۔ شکیل اور نور بانو نے حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا

"جی امّی! ـــ" عارف پریشان ہوگیا۔

"اور ـــ تم نے شکیل کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ ؟!"

"جی! ـــ" عارف کے منہ سے سرسراہٹ نکلی۔

"اگر شکیل نہ بچتا۔ ڈوب جاتا تو ـــ ؟!" امّی نے پوچھا، اور

سب لرز گئے — شکیل بڑی دل چسپی سے اپنی امّی کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کیا کیوں کہہ رہی ہیں امّی" عارف کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے —

"امّی! — آپ ......" نور بانو چیخ پڑی۔

"خاموش رہو!" امّی نے نور بانو کو جھڑک دیا۔ "میں پوچھتی ہوں اگر شکیل ڈوب جاتا تو میں کیا کرلیتی —؟"

"پھر تو! — کوئی بھی — کچھ نہ کر پاتا —" عارف افسردہ ہو کر بولا۔

"یعنی ہم لوگ — یہی کہہ کر صبر کر لیتے کہ اللہ پاک کو یہی منظور تھا۔" امّی نے عارف سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔

"یقیناً! — اس کے سوا اور کیا کہتے —!" عارف نے جواب دیا۔

"تو بیٹے! — تم کو صبر کیوں نہیں ہوتا؟ تم پڑھے لکھے ہو — اتنا ضرور سمجھتے ہو گے کہ رونا الگ بات ہے۔ اور خدا کی مرضی پر سر جھکا دینا۔ صابر شاکر ہو جانا دوسری بات ہے — تمھارا خدا پر ایمان ہے نا —!؟" امّی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"بے شک!" عارف نے فوراً جواب دیا۔

"تو اس کی مشیت سمجھ کر، جو سانحہ تم پر گزرا ہے، اس کا مردانہ وار مقابلہ کرو — کوشش کرو کہ جو کچھ تمھارے ساتھ ہو چکا ہے — اب کسی کے ساتھ نہ ہو۔"

شکیل اور نور بانو حیرت سے اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ آواز جس نے انھیں سحر زدہ کر دیا تھا، بچپن سے آج تک کبھی نہیں سنی تھی — بارش اور طوفان کے خوف ناک شور کو پیچھے ڈھکیل کر پھر مقدس آواز ابھری:

"عارف! یہ سامنے تصویر دیکھ رہے ہو۔ یہ شکیل کے ابو ہیں۔ ۲۸ سال کی عمر میں ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اسکوٹر کے ساتھ ساتھ یہ بھی چکنا چور ہو گئے۔ زندگی کے دشوار گزار راستے پر مجھے دو بچوں کے ساتھ تنہا چھوڑ گئے — وہ لمحہ جب میں بکھر گئی تھی — جب میری چوڑیاں توڑی گئی تھیں — میرے ذہن اور میرے دل میں زخم بن کر اتنا تازہ ہے کہ جیسے وہ لمحہ مجھ پر کل گزرا ہو۔ مگر! میرے بچوں نے آج تک میری زبان سے ایک حرف نہیں سنا۔ صرف اس لیے کہ میرے بچے احساسِ محرومی کا شکار نہ ہوں۔ اگر تمھاری طرح میں ہمت ہار جاتی تو —"

"مگر امّی! —" عارف نے بے چین ہو کر ان کی بات کاٹ دی۔ "ان کے سروں پر آپ کا نرم، گداز اور شفیق سایہ تو قائم تھا —! اور میں"

"اور تم اکیلے تھے، ٹھیک ہے — مگر سایہ دار درخت کوئی امتیاز نہیں برتتے۔ ان کا سایہ سب کے لیے ہوتا ہے — تم نے کسی ماں کے ممتا بھرے دل کے دروازے پر دستک تو دی ہوتی — مگر یہ کیا۔ تمھاری آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔"

"امّی! خدا کی قسم یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ صرف خوشی کے۔" عارف نے امّی کی آغوش میں منھ چھپا لیا۔

"آج مجھے پھر میری ماں مل گئی ہے نا۔ مجھے اپنے آنچل میں چھپا لو ماں!" عارف کی درد بھری پکار نے نور بانو اور شکیل کو بے چین کر دیا۔

عارف کے لیے ان کی زندگی کا یہ واقعہ ایک پُر درد خواب بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اکثر اس سہانے خواب کو جاگتی آنکھوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اور اس منزل پر پہونچ کر ہمیشہ ان کا جی چاہتا تھا کہ دل کھول کر روئیں — اور اس وقت بھی وہ سسک اُٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی نے سارا طلسم توڑ دیا۔

"ہلو!!" عارف کی آواز الجھ کر رہ گئی۔

"ہلو! — پاپا!! — یہ آپ ہی ہیں نا!" سلام نے پوچھا۔

"ہاں! — ہاں بیٹے!! — میں بول رہا ہوں۔"

"پاپا! — یہ آپ کی آواز کو کیا ہوا؟" سلام نے کہا۔

"— کچھ بھی تو نہیں۔" عارف نے صفائی دی۔

"پاپا! — آپ رو رہے تھے کیا۔" سلام پریشان ہو گیا۔

"نہیں تو! — بالکل نہیں۔" عارف نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"پاپا! — آج آپ کے لنچ کا کیا ہوا؟"

"تم نے لنچ لے لیا۔ میرا مطلب ہے تمھاری ممی اور تم نے۔"

"پاپا —!!" سلام چیخ اُٹھا۔ عارف شرمسار ہو گئے۔

"آپ نے — ناشتہ کیا اور نہ چائے پی — تو! آپ یہ پوچھیں کہ ہم نے ناشتہ کیا تھا یا نہیں — اور پاپا! — ہلو!! آپ سن رہے ہیں نا؟"

"— ہاں ہاں!! — میں سن رہا ہوں۔" عارف آبدیدہ ہو گئے۔

"تو ۔ پاپا! کیا آپ ہیں ... ایسا ... سمجھتے ہیں۔" سلام رونے لگا۔ اور عارف نے فون کا رابطہ منقطع کر دیا۔ سلام نے جیسے ان کے دل کو مسل دیا تھا۔

عارف پھر ماضی کے سنہرے خوابوں میں گم ہو گئے ۔۔

"دیکھو عارف! تم نے مجھے ماں کہا ہے۔ تو ہمیشہ اپنے کہے کی لاج رکھنا۔ آج سے میرے تین بچے ہیں ۔ ایک یہ شکیل۔ جس کی تم نے جان بچائی ہے ۔۔ اور! ..... ٹھہرو میں ابھی آئی" کہہ کر امی اندر چلی گئیں اور کچھ دیر کے بعد جب واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ننھی سی سرخ مخمل کی ڈبیا تھی ۔

"عارف! میں نے تم سے تمہارا حسب و نسب تو دریافت نہیں کیا" وہ پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں "مگر اپنے متعلق بتا دینا چاہتی ہوں کہ ......"

"۔۔ مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ آپ میری پیاری سی امی ہیں" عارف نے زوردار احتجاج کرتے ہوئے اپنے کانوں کو بند کر لیا۔

"خیر!" انھوں نے مخملی ڈبیہ کھول لی، جڑاؤ انگوٹھی کے نگینوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں "یہ انگوٹھی! شکیل کے ابا نے ..... مجھے ..." ان کا گلا جیسے رُندھ سا گیا اور کچھ دیر توقف کے بعد کہا:

"اور اب! یہ انگوٹھی تم اپنی ویران زندگی کو سجانے کے لیے اسی وقت ۔۔۔ نور بانو کو پہنا دو"

دُور کہیں چمک کر بجلی گری اور بارش تیز ہو گئی اور "امی۔ی۔ی" کہتی ہوئی نور بانو سوکھے پتے کی طرح اندر کی طرف اُڑتی چلی گئی۔ اور شکیل اپنی امی سے لپٹ گیا۔

"امی! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اتنی عظیم اور اتنی بلند ہیں"

اور عارف دم بخود ۔۔ اس باعظمت اور مافوق الفطرت ہستی کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا جو بے حساب پیار و محبت لٹانے پر تلی ہوئی تھی۔ جس کے قرب اور جس کے لمس نے اس کے دل کی توانائی بڑھا دی تھی۔ آناً واحد میں اس کی تقدیر بدل دی تھی ۔۔ عارف کا دل چاہا کہ یہ لمحات طویل تر ہو جائیں اور وہ اپنائیت کے جانفزا آبشار کی ننھی ننھی بوندوں سے لطف اندوز ہوتا رہے۔

"نورُ بانو! ۔ مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے میں مدد کرو بیٹی"۔ امی نے آواز دی۔

"امی آپ بھی کمال کرتی ہیں ۔ میری گڑیا خود کیسے آ سکتی ہے ۔ کوئی لانے والا تو ہونا چاہیے" ۔۔ شکیل نے اُٹھتے ہوئے کہا

اور کچھ دیر کے بعد نور ۔۔ شرمائی، لجائی سی شکیل کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ امی نے اس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ عارف کی گرفت میں انگوٹھی کانپ رہی تھی۔ کیسا بھاری وقت پڑا تھا عارف پر ۔! لگتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے ۔ ۔ اتنے خوابیدہ لمحات تھے کہ عارف کو یہ بھی ہوش نہ رہا کہ اس نے کب اور کس طرح نور بانو کی حنائی اور مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی ۔

تلخ و ترش، شیریں اور جاں سوز یادوں نے عارف کو جیسے جکڑ رکھا تھا۔ وہ یادوں کے سمندر میں غوطہ زن تھے جب ان کی شادی ہوئی تو امی نے نورُ بانو کو نصیحت کی :

"بیٹی! ۔ عارف کو ہمیشہ میری دی ہوئی مقدس امانت سمجھنا۔ اس کے غم کو اپنا غم اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی جاننا۔ لڑکے بہت سرپھرے اور لاابالی ہوتے ہیں۔ اس کو بہت سنبھال کر رکھنا۔ دُنیا کی نظروں میں مجھے سربلند تم ہی رکھ سکتی ہو" اور نور بانو نے کئی بار اثبات میں سر ہلا کر ان کی آغوش میں منہ چھپا لیا تھا۔

" اور ۔۔ میں نے کیا کیا ؟!" عارف نے خود سے سوال کیا

"نور بانو نے میری ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دی' اور میں نور بانو کی ایک خواہش پوری نہ کر سکا ۔۔ صرف ایک حقیر سا اسکوٹر ۔"

وہ بے چین ہو گئے کہ کس طرح پر لگا کر نور بانو کے پاس پہنچ جائیں بے جھجک معافی مانگیں اور تکمیل خواہش کا مژدہ سنائیں ۔۔ کہ وہ اُچھل کر رہ گئے ۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی ۔۔ (باقی ص ۴۸ پر)

کہانی

نرمل ورما

ترجمہ: حیدر جعفری سید

پہاڑ

کیا اس بار ہم پہاڑوں پر جائیں گے۔؟

ہر رات سونے سے پہلے وہ ایک ہی سوال پوچھتا تھا ماں کی آنکھیں کھڑکی کے باہر اندھیرے میں ٹک جاتیں۔ ابو کی پنسل ۱۰۰ آدمی ٹکٹ ہتھے) کاغذ پر گھومتی ہوئی لمحہ بھر کے لیے ایک جگہ ٹھٹک کر...... پھر گھومنے لگتی۔

دونوں ہی شروع سے متذبذب تھے۔ ہر پت جھڑ کے موسم کے ساتھ پورا ایک برس نکل جاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑا ہوتا گیا تھا ابو ابھی جوان تھے اور ماں .... وہ اب بھی اپنے سرتاج کو چاہتی تھیں۔ سب مجھے سکھی میاں بیوی کو دیکھنا اچھا لگتا ہے اور جب وہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہوں، تو پراسرار معجزہ سا لگتا ہے۔

دونوں کی پرانی یادیں تھیں ـــ اور ایسی نہیں کہ ایک کی الگ اور دوسرے کی الگ، بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ـــ تاش کے گھر کی طرح، جس میں ایک پتہ دوسرے پتے سے جڑ کر ہی کھڑا رہ پاتا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایک ایک پتہ جڑتا گیا تھا اور اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون سا پتہ کس کا ہے، یا شروع میں کس کا تھا۔ پھر وہ بچہ بھی تھا۔

اکثر ہوتا یہ ہے کہ بچے کے آنے پر میاں بیوی اچانک ایک دوسرے سے تھوڑا سا الگ ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں ایک دوسرے کو، لیکن بچے کے توسط سے .... اور یہ شروعات ہوتی ہے اختتام ہونے کی۔

لیکن اس جوڑے کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ بڑا ہوتا گیا تھا ـــ دونوں کے بیچ نہیں .... بلکہ اپنے میں الگ۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتے تو انھیں ہلکا سا تعجب ہوتا۔ اس کا چہرہ البم میں لگے پرانے فوٹو کی طرح محسوس ہوتا جب وہ خود بہت چھوٹے تھے اور ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ انھیں یہ چیز بہت پراسرار معلوم ہوتی کہ کبھی ایسا بھی وقت رہا ہوگا، جب ان کی یادیں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنی تھیں ... اور وہ ایک دوسرے سے علاحدہ اپنے میں الگ جی رہے تھے۔ انھیں یہ ناممکن لگتا تھا اور وہ اس پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے۔ انھیں ان یادوں سے ہی اطمینان تھا، جو ان کی اپنی تھیں .... ان کے باہر جو کچھ تھا، وہ باہر تھا، اس میں جھانکنے کی ان میں کوئی خواہش نہیں تھی۔

ان یادوں میں ایک خاص جگہ بنا لی تھی ـــ پہاڑوں نے!

ہر رات سونے سے پہلے بچہ ان سے پوچھتا تھا، "کیا اس سال ہم وہاں جائیں گے؟"

وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے اور بچے کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہتیں۔

ایسے ہی ایک کے بعد ایک برس گزرتا گیا۔ پھر ایک سال اکتوبر کے مہینے میں، جب پتے جھڑنے لگتے ہیں.... وہ یہاں آئے تھے۔ دونوں کو یہ پہاڑی اسٹیشن بہت پسند تھا۔ شادی کے بعد کچھ دنوں کے لیے وہ یہاں آئے تھے ..... رج کی بنچ، لوئر بازار جانے والی پگڈنڈی، پرانے چرچ یارڈ کا کونہ، جہاں وہ اکثر بیٹھتے تھے.... ہوٹل پرانا جانا پہچانا تھا ان دنوں بہت سے کمرے خالی پڑے تھے، شاید خزاں کی وجہ سے بہت کم سیاح آئے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں وہ کمرہ بھی مل گیا تھا، جہاں عرصہ پہلے انھوں نے مسرت بخش راتیں ایک ساتھ گزاری تھیں۔

سفر کی تکان کے سبب وہ اس دن ہوٹل کے کمرے میں ہی رہے تھے، بچّہ سوتا رہا تھا۔ دونوں بے سُدھ سے لیٹے رہے تھے — ایک دوسرے کی بانہوں میں۔ شوہر بار بار اس کے ہونٹوں، اس کی آنکھوں، اس کے بالوں کو چومتا ہوا کہتا — "آخر ہم آگئے ہیں۔

باہر بیت جھڑ کا اُجالا تھا اور بکھر بکھرائے ہوئے پتوں کی بوجھل مہک جو ہوا میں ٹھہر گئی تھی۔

بچہ جو جاگ گیا تھا، چپ چاپ اپنے ماں باپ کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں بہت بڑی اور گہری تھیں اور جیسا کہ کچھ بچوں میں ہوتا ہے۔ ان آنکھوں کا بدن سے کوئی رشتہ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

تم جاگ گئے —؟ ماں نے پاس آکر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا.... اور وہ پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ماں ایک گڑیا ہو۔

"کیا آج ہم جائیں گے؟" اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"کہاں؟"

"پہاڑوں پر۔"

"پاگل! ہم آتو گئے۔ تم نے باہر دیکھا نہیں.... وہ یہاں ہر جگہ ہیں۔"

بچّہ گم صم سا باری باری اپنے ماں باپ کو دیکھتا رہا۔

"آج شام اوپر رِج کی طرف جائیں گے، وہاں سے تم انھیں دیکھ سکو گے۔"

اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ بچّے نے گود میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ پیدل ہی چل رہا تھا۔

تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ شروع جاڑے کے ہلکے بادل تھے اور وہ بہت سفید تھے — پورے پہاڑی شہر پر ایک پیلا سا سایہ اُتر آیا تھا۔ آخری دُھوپ کے دھبّے چیڑ کی سوئیوں پر لپٹ گئے تھے — سونے کے چھلّوں کی طرح — اور ہوا خاموش تھی۔

"کیا ہم آگئے —؟"

جواب میں ماں نے بچے کی طرف دیکھا اور ہنس دی

مال روڈ پار کرنے کے بعد لائبریری آئی، جو چرچ کے سامنے تھی۔ لائبریری کی لمبی کھڑکیوں پر پتوں کی بیل جھول رہی تھی۔ جب کبھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا آتا، ان کا سایہ کردشیے سے کاڑھے بیل بوٹوں سا دیوار پر متحرک ہو جاتا... سب ویسا ہی تھا، کچھ بھی نہیں بدلا۔

"کیا ہم آگئے؟" اس بار کوشش کے باوجود بچہ اپنا ہیجان نہیں دبا سکا۔ اتنی چڑھائی پیدل پار کرنے کے بعد اس کی آنکھیں بخار زدہ سی ہوگئی تھیں۔

"کیا تم دیکھتے نہیں۔" ابّو نے کہا۔ "ادھر وہ کیا ہیں —؟"

بچے کی آنکھیں ابّو کی اُنگلی کی سمت اُٹھ گئیں۔

بیچ میں نیلے جنگلوں کے جھرمٹ تھے۔ اور ان میں ہرے بادلوں کی سرمئی لکیر، موسم غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ ہوا کے ساتھ ساتھ دھوپ بھی موجود تھی..... چاقو کی دھار سی تیز... بیچ کے کونوں اور حاشیوں کو تراشتی ہوئی..... اور ان کے اوپر دُور — وہ کھڑے تھے ننگی برف میں لپٹے ہوئے خاموش اور خود اپنی خاموشی سے دہشت زدہ۔

بچے کی بخار زدہ آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکنے لگی تھیں۔

"کیا ہم وہاں جائیں گے؟"

اس پر ماں ہنس نہیں سکی۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سا پرایاپن تھا، جیسے دونوں نے پہچان لیا تھا۔

"تم کیسے ہو..... ہمیں یہیں تو آنا تھا۔" ابّو نے کہا۔ ان کی آواز میں ہلکی سی جھنجھلاہٹ تھی۔ پھر انھیں اپنی ہی جھنجھلاہٹ پر ہلکی سی شرم آئی اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں... ہمیں یہیں تک آنا تھا۔!" ماں نے کہا، جیسے وہ نیند میں بول رہی ہو۔

یہیں تک..... آگے پہاڑیاں تھیں دُھوپ کی سنہری جھلک میں رنگی ہوئی۔ خاموش اور مبہوت۔

چاروں طرف تھا رِج کا ہموار میدان اور پُرانا چرچ۔ کھڑکیوں کے اسٹین گلاس پر ایک ترچھی کرن آٹکی تھی... اور دُور سے لگتا تھا جیسے وہ ٹوٹے کانچ کی دراڑ ہو، جو صرف بھرم تھا اور کچھ نہیں۔

"تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی ؟" شوہر نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں" وہ گھبرا کے لیے کانپ گئی تھی اور شوہر نے اسے دیکھ لیا تھا۔

وہ رخ کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ سامنے ہوا گھر کی تیلیاں تھیں اور ان کے پرے لکڑی کا جنگلا تھا۔

نیچے گھاس کی ڈھلان تھی جہاں اکا دکا جگنو چمک جاتے تھے۔ سامنے بنچ تھی وہ خالی تھی اور اس پر ڈھیرے ڈھیرے دھول اور دھول کو پتے اکٹھا ہوتے گئے تھے۔ وہ معمولی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی کوئی اس پر بیٹھا ہو گا۔ لگتا تھا، مدت سے وہ ایسے ہی خالی پڑی ہے۔

کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتے رہے جیسے کسی بہت پرانی چیز کو پہچان لینے کی جد و جہد کر رہے ہوں .... اور نہ جانے کیوں چاہنے پر بھی وہ اس لمحہ ایک دوسرے کو چھونے کی ہمت نہیں کر سکے۔

بچہ بنچ پر سر جھکائے سو گیا تھا۔ سامنے پہاڑیاں تھیں۔ جو دھیرے دھیرے پت جھڑ کے نرم اور چمکیلے اندھیرے میں ڈوبنے لگی تھیں۔

شوہر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کانپ سی گئی اور اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ الگ کر دیا۔

"کیا بات ہے ؟" شوہر نے ذرا تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے، ہمیں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا"

اس نے بچے کی طرف دیکھا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں اندھیرے میں اس دور دراز دھبے پر اٹھ گئیں جہاں کچھ دیر پہلے پہاڑ تھے اور اب کچھ بھی نہیں۔

"ہمیں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا" اس نے کہا

"اوہ کچھ بھی نہیں۔ واپس ہوٹل جانے پر یہ سب کچھ بھول جائیگا۔"

"ہاں ... سب کچھ !"۔ بیوی نے کہا۔ لیکن شوہر نے اس کی آواز نہیں سنی۔ وہ بہت دھیمی رہی ہوگی۔ اس کا دھیان بھٹک گیا تھا اور وہ اپنے ہوٹل کے کمرے کے بارے میں سوچنے لگا تھا جہاں برسوں پہلے ان دونوں نے کچھ بہت خوشگوار راتیں گزاری تھیں — اچانک اس کا من پُرجوش سا ہو گیا۔

"دیکھو ! بدلا کچھ بھی نہیں"

— اور وہ جیسے آدھی نیند سے جاگ اٹھی ہو — "ہاں کچھ بھی نہیں ..." اس نے کہا۔

شوہر نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی ؟"

"نہیں .... میں ٹھیک ہوں"

شوہر نے مطمئن ہو کر لمبی سانس لی اور اسے پاس کھینچ کر دھیرے سے چوم لیا۔

مجھے کسی جوڑے کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ اور جب وہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہوں تو وہ ایک پُراسرار معجزہ سا لگتا ہے۔

□□

غزل

کچھ اس ادا سے اداکی ہے بندگی میں نے
زمینِ کوچۂ جاناں سنوار دی میں نے

جنونِ شوق میں پائی جو کچھ کمی میں نے
تو اختیار کی دانستہ خامشی میں نے

کسی کی چشمِ عنایت کا اعتبار نہ پوچھ
جو بات کہنا نہ چاہی وہی کہی میں نے

تم آگئے زہے قسمت، تمھاری عمر دراز
تمھارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

کسی کے جلوۂ رنگیں کی آڑ لے کے صدا
چراغِ طور کی دیکھی ہے روشنی میں نے

مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی
گولہ گنج۔ لکھنؤ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "سلاخوں کے پیچھے"
مصنف: سید خاور نقیب۔ قیمت: دس روپئے
ملنے کا پتہ: مائیکا ہاؤس، اڈیا بازار، کٹک
اڈیسہ

وہ مجاہدین آزادی جن کو بھلا دیا گیا ہے ان میں مولانا سید محمد اطہر کنکی (جو اپنے کو اطہر کٹکی ہی لکھنا پسند کرتے تھے) بھی شامل ہیں۔

سید خاور نقیب شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے جنگِ آزادی کے اس عظیم مجاہد کی جیل ڈائری مرتب کر کے نہ صرف ان کی یاد کو تازہ کرایا بلکہ نئی نسل کو ان کی بے مثال قربانیوں اور اعلیٰ نظریات سے بھی واقف ہونے کا موقع دیا۔

مولانا اطہر کٹکی نے شروع عمر ہی سے ملک کی آزادی کی تحریک میں حصّہ لیا، ہر طرح کی قربانیاں دیں اور نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک ملک کی آزادی، اتحاد، جمہوریت، سیکولرازم اور ترقی پسند نظریات کے لئے کام کرتے رہے۔ ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے سخت سے سخت حالات میں کام کیا اور ہر طرح کی غلط روی کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں تکلیفیں برداشت کیں مگر ان کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ جذباتیت کا کبھی شکار نہیں ہوئے انھوں نے جذباتی نعروں اور تشدد کو کبھی نہیں اپنایا۔ وہ پوری زندگی انصاف، آزادی اور قومی اتحاد کے لیے بے لوث جد و جہد کرتے رہے وہ عہدوں کے لیے کبھی نہیں بھاگے۔

جیسا کہ ان کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ اڑیسہ جیسے علاقے میں ایک مسلمان نوجوان وطن کی آزادی کے لیے کتنی تڑپ رکھتا تھا اور وطن کی محبت میں کیسا سرشار تھا۔ اس نے کس طرح دیوانہ وار وطن کی آزادی کی جد و جہد میں حصّہ لیا اور قربانیاں دیں۔ ان کی زندگی اور قربانیاں دیش واسیوں کو ہمیشہ حوصلہ دیتی رہیں گی اور نئی نسل کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

مولانا سیاسی رہنما ہونے کے علاوہ پرجوش صحافی اور ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ اڑیا مادری زبان ہونے کے باوجود اتنا اچھا اُردو ادیب اور انشا پرداز ہونا ان کی اہم خوبی تھی۔ مگر ان سب کمالات کے ساتھ ان کی زندگی کا سیاسی رُخ زیادہ تابناک تھا۔ وہ دنیا سے جلد رخصت ہو گئے ورنہ وہ ابھی ملک کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔

سید خاور نقیب کی کوشش قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے مولانا کی جیل ڈائری کو ترتیب دیا اور منظرِ عام پر لائے۔

—— اسحاق سنبھلی

نام کتاب: "سانپ اور رسّی" (ناول)
مصنف: راجہ راؤ۔ مترجم: بلراج کومل
قیمت: ۷۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
۱۱۰۰۰۱

کچھ برسوں سے ساہتیہ اکادمی، ایوارڈ یافتہ کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں شائع کر رہی ہے تاکہ جو لوگ ان کتابوں کی زبان سے ناآشنا ہیں وہ اپنی زبان میں ان تخلیقات کو پڑھ سکیں۔

اس سلسلے کی تازہ ترین کتاب مشہور انگریزی ناول نگار راجہ راؤ کا ناول The Serpent and the Rope کا اُردو ترجمہ "سانپ اور رسّی" ہے۔ راجہ راؤ ۱۹۳۸ء میں پہلے ناول "کانتا پورا" کی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی وقار حاصل کر چکے تھے۔

"سانپ اور رسّی" میں مغربی اور مشرقی تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے۔ ایک ہندستانی لڑکے اور فرانس یونیورسٹی میں ایک فرانسیسی لڑکی سے ملاقات آپسی گرویدگی اور آخر میں جُدائی اس ناول کا مرکزی موضوع ہے۔

راجہ راؤ نے قرب و رفاقت اور تضاد و توازن کی عکاسی سے انسانی رشتوں کی بے مثال تصویر پیش کی ہے۔

یہ قابلِ تحسین کاوش اُردو ترجمہ کی صورت میں بلراج کومل کی عنایت سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ حسبِ معمول اس کی کتابت، کاغذ اور

طباعت کا معیار ... قیمت نہایت مناسب ہے۔

... کاش ...

[illegible]

یہ کتاب بقول مصنف چند خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ چند ... افراد ہیں جو مصنف کے لیے تو باعث ... ہیں مگر عام قاری کے لیے ... بھی ہو سکتے ہیں۔ خاکہ نگاری اردو میں زیادہ ... اچھے خاکے خال خال ہی ملتے ہیں۔ موجودہ دور میں مجتبیٰ حسین نے خاکہ نگاری کو ایک نئے انداز و اسلوب سے سنوارا ہے۔

"یہ ... پڑھتے ہوئے کہیں بھی اندازہ نہیں ہوتا یہ خاکے ہیں کیونکہ یہ خاکہ نگاری کی پیروی نہیں کرتے بلکہ معمولی تاثراتی مضامین ہیں جو عزیز اندوری صاحب نے اپنے چند جانے پہچانے لوگوں کو اردو کے قارئین سے متعارف کرانے کے لیے لکھے ہیں۔ ہر مضمون میں جگہ جگہ کچھ مخصوص الفاظ اور جملوں کا استعمال کا انداز میں ہے جس سے عام قاری لطف اندوز نہیں ہو سکتا کیوں کہ ایسے الفاظ اور جملے تو آپس میں ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایسے خاکوں سے کیا فائدہ کہ ہر پڑھنے والا جن سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔!

عزیز اندوری اردو کے دانش ور اور استاد ہیں لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ ان کی کتاب اردو نثر کا ایک خوبصورت نمونہ تو کیا معیاری نمونہ بھی نہیں ہے۔

——— ایس اے رحمٰن

نام کتاب : پیتل کا آسمان (شعری مجموعہ)
شاعر : عبدالمتین نیاز ... قیمت : ... روپے
ناشر : ... نشان ... امین آباد لکھنؤ

عبدالمتین نیاز کو زمانے سے جو کچھ ملا ہے اسے انھوں نے تجاہل کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ دراصل یہی ایک شاعر کی پہچان ہے کہ جو کچھ اپنے معاشرے سے وہ حاصل کرے اسے ایمان داری کے ساتھ ... عطا کرے۔ اسی لیے نیاز صاحب نے باتوں کو کھل کر ... کہا ہے یہی بے باکی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

آئینہ ان کے یہاں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ان کی بیشتر غزلوں میں آئینہ علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے ؎

نہ پوچھو دشت نوردی میں ہم نے کیا دیکھا
ہر آئینے کو یہاں گرد میں اٹا دیکھا

ایسے ہی جدت سے اچھے اشعار ہیں جو ان کی کتاب "پیتل کا آسمان" میں شامل ہیں۔ اس میں نظمیں بھی ہیں مگر وہ یاد رفتگاں کے عنوان سے زیادہ تر تخلیقی ہیں۔

کتابت اور طباعت عمدہ ہونے کے ساتھ ساتھ قیمت نہایت مناسب ہے۔

——— فاطمہ وصیہ جائسی

مرتب : آغا شاعر قزلباش دہلوی : شخصیت اور شاعری
مصنف : سید فیضان حسن ۔ قیمت ۱۰۰ روپے
ملنے کے پتے : (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع مسجد دہلی ۶
(۲) ... پبلشنگ ہاؤس، ۵ کولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

آغا ظفر علی بیگ یعنی آغا شاعر قزلباش دہلوی ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں انتقال فرمایا۔ وہ دہلوی تہذیب کی علامت تھے اور اپنے عہد کی بے حد مقبول شخصیتوں میں سے ایک تھے وہ داغ کے شاگرد تھے اور ان کی غزلوں میں داغ کا رنگ پورے طور سے جھلکتا ہے۔ انھوں نے مرثیے، سلام اور رباعیات پر بھی طبع آزمائی کی۔ نثر میں ناول، انشائیے اور ڈرامے بھی لکھے۔ انھوں نے جہاں رباعیات عمر خیام کا ترجمہ کیا تھا وہیں قرآن شریف کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ سید فیضان حسن کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آغا شاعر

سے متعلق تمام واقعات کو صرف یکجا نہیں کیا بلکہ اس میں حسنِ ترتیب کا خاص طور سے لحاظ رکھا۔ چنانچہ آغا شاعر کے منظومات کا بہت اچھا رُخ سامنے آتا ہے

کتاب کے آغاز میں پروفیسر حنیف کیفی کا عالمانہ پیش لفظ ہے جو ایک نوجوان محقق کی بجا طور سے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ گرد پوش پر ڈاکٹر صادق کا یہ قول فیصل بھی درج ہے :

"نوجوان محقق سید فیضان حسن بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دہلی کے اس سپوت کی شخصیت اور شاعری پر ایک قابل قدر کتاب تصنیف کر کے وقت کی ایک ضرورت پوری کرنے کی ایک مخلصانہ سعی کی ہے اور دہلی کی ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی کو محفوظ کرنے کا کام انجام دیا ہے۔"

ڈاکٹر نہال احمد صدیقی

نام کتاب : "شجرِ ممنوعہ" (شعری مجموعہ)
مصنف : صدیق مجیبی قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : اُردو مرکز۔ عظیم آباد۔ پٹنہ (بہار)

اُردو مرکز عظیم آباد پٹنہ اس وجہ سے بھی مبارک باد کا مستحق ہے کہ اہم ادبی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ اس نے ادیبوں اور شعراء کو متعارف کرانے کا کام بھی انجام دیا ہے۔ اس سے قبل بھی اُردو مرکز سے اہم ادیبوں کی تخلیقات شائع ہو چکی ہیں اور اُردو کے ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ "شجرِ ممنوعہ" صدیق مجیبی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ صدیق مجیبی اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہیں کہ ان کے یہاں ہر قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ مشق اور لفظی مہارت کے ساتھ شعر کہتے ہیں نئے تجربہ کرنے والوں کی خام کاری ان کے کلام میں نہیں ہے۔ بحروں کے انتخاب میں وہ عموماً طویل بحروں میں شعر کہتے ہیں جس میں بھٹک جانے کے امکانات کافی ہوتے ہیں۔ ان کا تخیل نئے جہانوں کی تلاش کرتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ؎

پازیب باندھتی ہے قیامت جھکی ہوئی
دیکھ اے فلک یہ تیری دھنک کا جواب ہے

برسوں سے چشمِ شوق ہے خواب و خمار سے تہی
ایسے بچھڑ گئے روز و شب اس کا گمان بھی نہ تھا

اس مجموعہ کا نام بھی بے حد فکر انگیز ہے۔ حضرت آدم شجرِ ممنوعہ کے قریب گئے تو دنیا آباد ہوگئی۔ اس مجموعے کے قریب جانے سے شعر کی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری پر جابر حسین کا یہ تبصرہ قولِ فیصل ہے :

" ایک نمایاں وصف ان کا راست اظہار ہے ۔۔۔۔ ان کی غزلوں میں تشکیک و تجسس کا پہلو بھی قاری کو حد درجہ متاثر کرتا ہے۔"

اقبال اعجازی

نام رسالہ : غالب نامہ جنوری ۱۹۹۷ء
مدیر اعلیٰ : پروفیسر نذیر احمد قیمت ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

اُردو میں کسی ایک شاعر یا ادیب کے شعری و ادبی اکتسابات کی تشریح و ترجمانی کے لیے یک موضوعی رسالہ کی اشاعت کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کا مجلہ غالب نامہ اس ضمن میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس رسالہ کے مشمولات کا بنیادی حوالہ غالب اور ان کا عہد ہے اس طرح یہ مجلہ غالب فہمی کی ایک نئی روایت کا امین ہے۔ زیرِ تبصرہ شمارہ بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ غالب نامہ میں غالبیات کے علاوہ علمی و ادبی اور تحقیقی مقالے بھی اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، عبد القوی دسنوی، پروفیسر عبد الحق، ضیاء الدین اصلاحی اور ڈاکٹر عثمان غنی کے مضامین قابلِ ذکر ہیں۔

رسالہ میں شامل سبھی مضامین معیاری ہیں۔ اس کے بیشتر مضامین کی نوعیت تحقیقی ہے جن کی پذیرائی کرنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ غالب نامہ کا تازہ ترین شمارہ معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے قابل قدر ہے۔

——— نافع قدوائی

نام کتاب : "فیضِ بشارت" (شعری مجموعہ)
شاعر : شاغل ادیب قیمت : دس روپے
ملنے کا پتہ : نیو بک ادب پبلیکیشنز، صدیق نگر، مشیرآباد
حیدرآباد ۴۸

فیضِ بشارت شاغل ادیب کا چوتھا شعری مجموعہ کلام ہے اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

شاغل ادیب سنجیدہ ذوق رکھنے والے ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ کلاسیکی ادب پر ان کی نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فکری توانائی اور حسنِ بیان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ آسان لفظیات میں اپنے جذبات و احساسات کو اشعار کی صورت میں پیش کرنے والے شاغل ادیب کی نعتوں اور منقبتوں میں پاکیزگی بھی ہے اور عقیدت و الفت کی چاشنی بھی۔ شعر ملاحظہ ہوں ؎

دل کا سکون جان کی راحت، قرارِ زیست
کس لطف کی کمی ہے محمدؐ کے شہر میں

شاغل بہیں گے اشک ہمیشہ اس آنکھ سے
تا حشر کم نہ ہوگی عقیدت حسینؓ کی

چالیس صفحات پر مشتمل یہ حسین گلدستہ حمدیہ رباعیات، نعت، نعتیہ ہائیکو، قطعات اور منقبتوں سے مزین ہے۔ اس کی کتابت و طباعت صاف اور کاغذ عمدہ ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

——— محمد ارمان ندوی

بازگشت خوشیوں کی

صفحہ ۴۱ کا بقیہ

"پلیز! میرے پاپا کو بلا دیجئے ـــ میں سلام بول رہا ہوں۔" سلام ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔ عارف کو ہلو کہنے کا بھی موقع نہیں دیا۔

"میں! ـــ میں بول رہا ہوں۔ سلام بیٹے! کیا بات ہے؟" عارف کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

غضب ہو گیا پاپا! ـــ خون میں لت پت لاش "ـــ!! سلام سسک اٹھا۔

"ہاں ہاں ـ! بتاؤ بیٹے ـ کس کی لاش؟"

"باری چچا کی ـــ اسکوٹر کسی ٹرک سے ٹکرا گیا تھا۔"

عارف جیسے مر کر زندہ ہو گئے ـ کرسی کا سہارا لے کر پھر بیٹھ گئے گہرا لب ـ جیسے بکھرے ہوئے وجود کو یکجا کر رہے ہوں۔

"پاپا! آپ نے سن لیا نا ـــ آپ خاموش کیوں ہو گئے؟" سلام رک کر پھر بولنے لگا ـــ

"پاپا! ـــــ چچی کی چوڑیاں توڑی گئیں ـــ تو وہ بے ہوش ہو گئیں ـــ یہ چوڑیاں کیوں توڑتے ہیں ـ؟!"

"سلام! باتیں کم کرو بیٹے! یہ بتاؤ ممی کیا کر رہی ہیں؟" عارف نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"ممی؟! ـــ ممی رو رو کر اپنے آنچل سے ـ آپ کی سائیکل صاف کر رہی ہیں۔" سلام نے جواب دیا اور عارف نے ریسیور رکھ دیا۔

مگر اس کی مترنم آواز عارف کے کانوں سے گزرتی ہوئی دل میں اترتی چلی گئی اور خوشیوں کی بازگشت بن کر ان کے دل کو بہت دیر تک مسلتی رہی۔

□□

ماہنامہ
نیا دور

جلد (۵۲) نمبر (۲)

مئی ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
فون دفتر: ۲۱۳۴۷۸ * رہائش: ۲۷۲۴۸۲

— جوائنٹ ایڈیٹر —
نجیب انصاری

معاونین: محمد الیاس خاں ۔ مبین احمد صدیقی

پبلشر:
روہت نندن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس۔ لکھنؤ

— شائع کردہ —
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

زرِ سالانہ: — تیس روپے
عام شمارہ: — تین روپے

ترسیلِ زر کا پتہ:
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اترپردیش، لکھنؤ

— خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اترپردیش، لکھنؤ

کاتب و تزئین کار: حسن اختر

عنوانات

اپنی بات

ایک سو چالیس برس قبل شہید وطن منگل پانڈے کی بے نظیر قربانی کی شمع روشن کیے ہوئے ۱۰ مئی کو ہندستان نے برطانوی سامراج کو للکارا تھا اس وقت پورے اتر پردیش میں مجاہدوں کی ٹولیوں سے ہر قریہ اور دیہات چھلک اُٹھا تھا۔ گھر کی حفاظت کے لیے جن کے پاس جو کچھ اسلحہ تھا وہ لیکر میدانِ جنگ میں کود پڑا تھا۔ یہ اپنے انداز کی منفرد جنگ تھی، جس میں بخت خاں جیسے فوجی، تانتیا ٹوپے جیسے عوامی رہنما، مولوی احمد اللہ شاہ جیسے مذہبی قائد، منیر شکوہ آبادی جیسے شاعر، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے ثقہ عالم و فاضل شریک تھے۔ مشرقی روایات میں عورت کو چراغ خانہ سمجھا جاتا تھا میدانِ جنگ میں تلوار تھامنا اس کا کام نہیں تھا۔ مگر ۱۸۵۷ء میں ہندستان کی بہادر خواتین وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہوکر سر پہ کفن باندھے وطن کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں کود پڑی تھیں۔ ان میں صرف رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل ہی نہیں تھیں۔ مورخ نے لکھا ہے کہ سکندر باغ لکھنؤ کی لڑائی میں خواتین جنگلی بلیوں کی طرح لڑیں اور دشمن جیتے جی ان پر دسترس حاصل نہ کر سکا صرف ان کی لاشیں شمار کر سکا ——— دراصل ملکوں کی یہی تاریخ انھیں زندہ رکھتی ہے۔

بادشاہوں کی فتوحات، ملک گیری کی ہوس، انتظام سلطنت، عمارتیں یا خزانے زندگی نہیں بخشتے، ان پر فخر نہیں کیا جاسکتا اسلاف کے صرف وہی کارنامے یاد رکھے جاتے ہیں اور ان پر فخر کیا جاتا ہے جن کارناموں میں اعلاترین اصولوں اور مقاصد کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو، سرفروشی کی تمنا ہو، قربانی و ایثار کی تڑپ ہو ——— ایسے ہی کارناموں سے تاریخ زندہ رہتی ہے، ورنہ گزرے ہوئے واقعات ملبہ ہیں اور صفحات کاغذ کا پلندہ!

اس لیے اس مہینے میں اپنے اسلاف کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہوئے احساس فخر ہوتا ہے کہ ایسی چنگاریاں بھی اپنے خاکستر میں تھیں۔

آج جب ہم آزادی کی نصف صدی کی دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں اپنی تاریخ کے ان سنہرے اوراق کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے مئی ۱۸۵۷ء میں آج کے دور کی تاریخ آزادی مرتب کی تھی۔

اسی مہینے میں محرم بھی شروع ہو رہا ہے جو نئے ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ تمام مذاہب اور اقوام عالم کے لوگ نئے سال میں خوشی کا تہوار مناتے ہیں لیکن محرم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مہینہ غم کی یادگار ہے۔

یوں تو ساری دنیا میں واقعہ کربلا کی یادگار منائی جاتی ہے لیکن ہندستان کو اس اعتبار سے انفرادیت اور امتیاز حاصل ہے کہ یہاں محرم کا مہینہ قومی یک جہتی کا عدیم المثال نمونہ پیش کرتا ہے اور تمام مذاہب کے ماننے والے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور ان کی صداقت و انسانیت کی پاسداری کو اپنا کر پورے احترام و عقیدت کے ساتھ محرم مناتے ہیں۔ ہندستان کی تقریباً ہر زبان کے ادب پر واقعہ کربلا کے اثرات ملتے ہیں، لیکن اُردو کی یہ خصوصیت ہے اور اسے یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے ادب کا بیشتر سرمایہ واقعۂ کربلا سے متاثر ہے اور اُردو شاعری کا تو بہت بڑا حصہ واقعۂ کربلا کا رہینِ منت ہے۔

اِس مقدس مہینے میں آنسوؤں سے بھرا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے، ہماری دُعا ہے کہ اسی طرح گنگا سے فرات کی موجیں ہمکنار رہیں اور محرم کے مقدس مہینے کی برکتوں سے پُورا ملک بہرہ ور ہو۔

——— ایڈیٹر

وہ جس لمحہ تھا، محوِ گفتگو، صیدِ طلسمِ رنگ و بُو تھا میں
تسلسل لفظ و معنیٰ کا
عیاں ہونے کو تھا مجھ پر
دھنک کے دائمی منظر
حروف و صوت کے سب باہمی رشتے
رگ و پے میں سرایت کر رہے تھے، اور قربت کے
شفق زاروں میں وہ لمحہ کچھ ایسا تھا
پروں پر تتلیوں کے اڑ کے آتی نرم خوشبو منزلِ تکمیل کی جانب
قدم آگے بڑھانے کی مجھے ترغیب دیتی تھی۔
وہ لمحہ تھا مگر ریگِ رواں
مٹھی سے مری چھن کے
موجِ دشت سے ایسے ملا
میں نامکمل۔۔۔ نامکمل رہ گیا آخر

وہ محوِ گفتگو ہے، آج بھی سیلِ تکلّم سے
میں تصویرِ سکوتِ بے اماں ہوں، اب مگر ایسا وہ لمحہ ہوں
جو اپنی بیکرانی، بدگمانی میں
نہ کوئی خطرۂ تخریب ہوتا ہے
نہ کوئی وعدۂ تعمیر ہوتا ہے
نہ کوئی خواب، یا اس خواب کی تعبیر ہوتا ہے
نہ کوئی مُشتہر اعلان ہوتا ہے
اگر ہوتا بھی ہے کچھ تو فقط مبہم سا اک امکان ہوتا ہے

□□

بلراج کومل

مجروح سلطان پوری

تنگنائے غزل

اختلاف غزل کے باب میں آتی ہے جب تنگی داماں اور یا آشوب میں زندگی کے مسائل حیات کی متعدد شاخیں اور ان کی مسفری کی اہلیت غزل میں نہیں حقیقی عذاب تو اسے غیر فطری اور یہ حتمی کہنے والے بھی کم نہیں، یہ تنگ پھر بھی جو شخص صاحب اور ظہیر الدین احمد کے بیتادن کے منتشر تیائل سے آتی ہیں، تو انسانی دست حیات ہے کہ جب غالب جیسا شخص کہے کہ ع

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

تو پھر زندگی کی وسیع بحر موّاج کو ایک کوزے میں بند کرنے کی سعی ناشکو میں غزل کے حضرات کیوں سکتے ہوتے ہیں۔ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے تحملات اظہار شوق اور شدتِ فکر کی بنا پر ایسا کہا ہے کہ میرے اظہار فکر و جذبات کے لیے یہ پیمانہ ناکافی ہے۔ یہ محض ایک شاعرانہ اندازِ اظہار ہے، تنقیصِ غزل نہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ اس وقت زیادہ غزل گوئی کا جو رواج تھا، اس کے خلاف غالب کا یہ شعر بیزاری کا اظہار ہے۔ ان کا عہد اس وقت کے سماجی زوال کا عہد تھا اور اس سے بندھے ہوئے افراد کے لیے آج کی طرح نہ اتنے موضوعات تھے نہ یہ سیاسی اور طبقاتی شعور اور نہ ان میں جدوجہد عمل کی تاب ہی رہ گئی تھی۔ غزل میں انھیں گل و بلبل، زلف و رخسار، جلوہ و چلمن کے ذریعے موجودہ زوال پذیر حالات سے راہِ فرار ہاتھ آجاتی تھی۔

میں محسوس کرتا کہ اسی عہد کے دائرہ میں گرفتار میر و سودا کے غزلیہ اشعار میں، مصحفی کی بعض غزلوں میں — اور غالب کے اشعار میں اس وقت کے سیاسی اور طبقاتی شعور کے مضامین فراوانی سے ملتے ہیں صرف ان کے استعارات، رموز و کنایات کو سمجھنے اور تامل کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ حالی کا مرثیہ دلی بھی ایک غزل مسلسل ہی ہے۔ شبلی کی بعض غزلیں بسمل عظیم آبادی کی 'سرفروشی کی تمنا' الخ بھی غزل ہی ہے۔ یہ اس عہد کے ذخیرۂ غزل سے بعض چند مثالیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ مضامین غزلوں میں کسی نظم کی طرح تسلسل و فراوانی کے ساتھ نہیں ملتے جس طرح شہر آشوب، حالی کی مسدس وغیرہ وغیرہ۔

مدتوں پہلے ۱۹۵۰ء وغیرہ کی بات ہے کہ میں غالب کے کلیات فارسی مطبوعہ نول کشور کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ان کے ایک قصیدہ کے ایک شعر پر اچانک نظر حیرت و مسرت کے ساتھ ٹھہر گئی کہ یہاں بھی غالب نے پیمانۂ غزل کی طرح پیمانۂ نظم کو بھی اپنے شدتِ جذبہ و فکر کے لیے ناکافی کہا ہے ع

فسانۂ غم دل بے سر و بن افتادہ ست
سخن بہ نظم چہ اندازۂ بیان گیرد

وہاں غزل کی "تنگنائے" سے بیزار، یہاں "سخن بہ نظم" سے نامطمئن پھر تو انھیں نظم و غزل دونوں سے دست بردار ہو کر کسی اور کام میں لگ جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ تو نثر و لغت طرازی سے تھوڑا تھوڑا لطف لیتے ہوئے کثرت کے ساتھ غزلیں، قصیدے اور مثنویاں ہی لکھتے رہے جن میں غزلوں کی تعداد قصیدہ و مثنوی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ پھر تو بات وہیں ٹھہرتی ہے کہ تنگنائے غزل اور سخن بہ نظم ان کے ایک اندازِ بیاں سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ان کے نزدیک تو اعجازِ مسیحا، اورنگِ سلیماں اور یہ ساری دنیا بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں ہے۔ بس دشتِ امکاں میں بھی انھیں اپنا ایک ہی نقشِ قدم ملا، دوسرے کا پتہ خدا سے دریافت کرتے رہے۔ یوں دیکھیے تو اپنی ذات کی سمائی انھیں غزل میں ملتی ہے نہ نظم میں اور نہ اس وسیع و عریض کائنات میں۔ لہٰذا مدرسے کے ایک طالبِ علم کی طرح یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ زمین کو ایک نقشِ قدم اور آسمان کو بیضۂ قمری سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اس لیے ہمیں بھی کائنات

غزلیں

میں لاکھ ڈھونڈوں اسے ڈھونڈنے سے کیا ہوگا
مری تلاش میں وہ بھی تو کھو گیا ہوگا

جو میری یاد سرِ شام آگئی ہوگی
چراغ اُس نے جلا کر بجھا دیا ہوگا

مری وفا کا اگر تذکرا چھِڑا ہوگا
اک آہ بھر کے وہ خاموش ہو گیا ہوگا

میں دُور رہ کے بھی اس کو قریب پاتا ہوں
ضرور وہ مرے بارے میں سوچتا ہوگا

چراغ بزم کے بے نُور ہو گئے ہوں گے
نقاب رُخ سے جو اُس نے ہٹا دیا ہوگا

ستالیں ہم کو وہ جتنا بھی چاہے دُنیا میں
ہمارا اُن کا قیامت میں فیصلہ ہوگا

بچھڑ کے مجھ سے دُکھایا ہے جس نے دل مرا
مجھے یقین ہے اس کا بھی دل دُکھا ہوگا

بھُلا کے اس کو بہت خوش تو ہو مگر نوشاد
وہ اتفاق سے یاد آگیا تو کیا ہوگا

نوشاد
آشیانہ، کارٹر روڈ، باندرہ
ممبئی - ۴۰۰۰۵۰

کیا رہا ہے اور کیا رہنا ہے کیا رہ جائے گا
ذکر ہر انسان کا اچھا بُرا رہ جائے گا

زیست کی گمُراہ کُن تاریک راہوں میں فقط
جگمگاتا حق پرستی کا دیا رہ جائے گا

آئیں گے جب مسکراتے پھُول برساتے ہوئے
ہر کوئی محفل میں ان کو دیکھتا رہ جائے گا

دشمنوں سے بھی زیادہ ظلم یہ ڈھاتے رہے
دوستوں سے بس ہمیں اتنا گلا رہ جائے گا

اِک فِدائے عشق نے راہِ وفا میں جان دی
وقت کی دیوار پر لکھا ہوا رہ جائے گا

پھُول پژمردہ، فضا مغموم، پروانوں کی راکھ
صُبح ہوتے ہوتے اس محفل میں کیا رہ جائے گا

موج پھر طوفان آئیں گے اُٹھیں گی آندھیاں
جبکہ ساحل سے ذرا سا فاصلا رہ جائے گا

راجیندر بہادر موج
موتی مارگ - فتح گڑھ، یوپی
۲۰۹۶۰۱

علی جواد زیدی

یادوں کی رہگزر

(۱۰)

یونیورسٹی میں واپسی

کرہان کی مانوس اور پرسکون فضاؤں میں پہنچ کر حضرت میر عیشی کے تعمیر کردہ چار سو سال پرانے تالاب میں غوطہ لگا کر بہت سے پرانے غم بھول گیا اور نئے عزائم دل میں کروٹیں لینے لگے۔ ایل ایل بی کے آخری سال میں میعاد پوری کر کے پھر سے داخلہ لینا تھا۔

یونیورسٹی کھلنے کے دن قریب آ رہے تھے، اس لیے خیال کی رو خود بخود اسی شہر لکھنؤ کی سمت مڑنے لگی۔ میرے دونوں چھوٹے بھائی سید علی بنیاد اور سید علی اعتماد (جو اب ہمیشہ کے لیے مجھے تنہا چھوڑ گئے ہیں) پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے، کیوں کہ ان کے کالجوں میں پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں کس بے چینی اور محبت سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب ایکبار پھر حامد پارک کی بالائی منزل کا ایک گوشہ ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بننے والا تھا! جنگِ آزادی کی تیز رفتاری کی بدولت اس چھوٹے سے گوشے کی اندرونی اور بیرونی کیفیتوں میں نئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملنے والی تھیں۔!!

یوں تو اس علاقے میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا تھا۔ سٹی اسٹیشن کے مقابل سڑک کے ایک کونے میں آغا کی چائے کی دوکان بدستور ریس کورس کے شائقین اور ادب و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی موجودگی سے جگمگاتی تھی۔ کہیں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کون سا گھوڑا جیتے گا اور کہیں "واہ واہ، اور مکرر ارشاد" کا ماحول گونج رہا تھا۔ پاس ہی یوسف کا ہوٹل قرب و جوار کے طالب علموں اور بھولے بھٹکے ریل مسافروں کے طفیل زیادہ خوش حال دکھائی دینے لگا تھا۔ میرا تانگا اس علاقے میں داخل ہوا تو چند نئے چہروں اور نووارد مسافروں کے علاوہ کچھ بھی بدلا نظر نہیں آیا۔ بھائی تو اسٹیشن سے مجھے ساتھ ہی لائے تھے، پرانے ساتھیوں نے بڑھ کے استقبال کیا، گلے لگایا، میری ہمت و جرأت کی داد دی اور نئے آنے والوں سے تعارف کرایا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو متوسط طبقے کی طالب علمانہ پرتکلف چائے ملی۔

تیار ہو کر نیچے اترے تو سامنے ہی "تانگے والے نواب" صاحب ملے انھوں نے پُرخلوص مسرت آمیز استقبال کیا، اور میں ایک طالب علم ساتھی کے ہمراہ یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو گیا۔ روایت کا لحاظ کرتے ہوئے سب سے پہلے یونیورسٹی رسٹوراں کا رُخ کیا۔ ملنے والوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور رسٹوراں تک پہونچتے پہونچتے ایک مختصر سا مجمع ساتھ ہو گیا۔ میں ایک لمحے کے لیے یونیورسٹی یونین کے دفتر کی طرف مڑا تو قدرت صاحب حسبِ دستور مسکراتے، دفتر کے کام سنبھالے نظر آئے۔ بڑھ کے زوردار "آداب عرض" سے مخاطب اور بغل گیر ہوئے۔ ہم جلدی میں تھے کہ داخلے کی کارروائیاں پوری کرنی تھیں۔ رسٹوراں میں زیادہ تر جانے پہچانے لوگ تھے، نئے چہروں سے سرسری تعارف ہوا، کرسیاں اور میزیں ملا کر ایک مختصر سی چائے پارٹی بن گئی۔ استفسارات اور مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ تیزی سے چائے ختم کر کے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ نئے فارم بھرنے تھے اور داخلے کی تمام رسمی منزلوں سے گزرنا تھا۔ جیل چلے جانے کی وجہ سے از سرِ نو داخلہ ہونا تھا۔

بغاوت کر کے جیل جانے کے بعد آسانی سے داخلہ چند برس پہلے تو ناممکنات سے تھا لیکن اب حالات بدل گئے تھے۔ یونیورسٹی میں طلبا کی تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی، حکومت کے رویے میں تھوڑی نرمی آئی تھی۔ جنگ کی وجہ سے وہ ہر طرح کی گڑبڑ سے بچنا چاہتی تھی۔ زیادہ تر سیاسی قیدی اب بھی جیلوں میں تھے۔ کچھ نئے عناصر اب بھی جیل جا رہے تھے۔ حکومت کی طرف سے

کسی مصالحانہ اقدام کی توقع نہ تھی لیکن یہ تاثر ضرور دیا جارہا تھا کہ وہ کچھ آگے بڑھنے کو تیار ہے۔ یہ کیفیت دو قدم آگے اور ایک قدم پیچھے ہٹنے کی تھی، یعنی حصول مقصد کی طرف پیش قدمی اتنی سستی سے ہو رہی تھی کہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہم نوجوانوں کے تصور میں کش مکشوں سے بھرا ہوا مستقبل اب بھی لہرا رہا تھا۔ اس کے باوجود یہ یقین تھا کہ داخلے میں کوئی اہم رکاوٹ نہیں پڑے گی۔

نوجوانوں اور طالب علموں میں بے چینی کی لہریں اونچی اٹھتی جارہی تھیں ہندستان سے جانی و مالی قربانیاں سمیٹنے کے باوجود کوئی بھی طبقہ ایسا نہیں تھا جو برطانیہ سے یہ امید لگائے ہوئے ہو کہ ان قربانیوں کے صلے میں ملک آزادی سے واضح طور پر قریب تر ہو جائے گا۔ کسی فیصلہ کن اقدام کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ گفتگو کے دروازے بند نہیں تھے بلکہ نرم رو سیاسی عناصر ملک اور بیرون ملک ہر جگہ سے کوشش کر رہے تھے کہ سامراج دیواروں پر لکھی ہوئی سرخ عبارتوں کو پڑھے اور اس انتباہ کو سمجھنے کی کوشش کرے جو عمل اظہار کے لیے کروٹیں لے رہا تھا میری زندانی مدت میں پرانے وائس چانسلر بدل گئے تھے اور سرمہاراج سنگھ وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ اساتذہ کی صفوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی، سب یونیورسٹی میں میرے داخلے کے منتظر تھے اور مختلف مراحل کے طے کرانے میں مدد بھی کر رہے تھے۔

یونیورسٹی کی عام فضا میں ظاہری اور رسمی تبدیلیاں آچکی تھیں، یہ کوئی جامد ادارہ نہیں ہے۔ ہر سال سیکڑوں نئے طلبا، دور دراز سے آجاتے ہیں اور سیکڑوں طالب علم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تاہم اچھی خاصی تعداد ایسے طلبا کی رہ جاتی ہے جو آگے پڑھائی جاری رکھنے والے ہوتے ہیں۔ میرے اپنے ساتھیوں میں زیادہ تر قانون کے آخری سال کا امتحان (جو قید ہو جانے کے باعث میں نہیں دے پایا تھا) پاس کر کے ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے رخصت ہو کر لکھنؤ سے بھی رخصت ہو چکے تھے۔ انھیں اپنے اپنے اضلاع میں صدر مقامات پر واپس جاکر قاعدے کے مطابق کم از کم چھ مہینے کسی سینیر ایڈوکیٹ کے ماتحت تربیت لینی تھی۔ چند ساتھی کسی وجہ سے اسی درجے میں رہ گئے تھے باقی سال اول کا امتحان پاس کر کے اب میرے ہم جماعت ہو گئے تھے۔ یہی حال دوسری جماعتوں اور ہوسٹلوں کا بھی تھا۔ یہ تبدیلی فطری تھی۔ لکھنؤ آنے کے بعد پہلی نظم میں یہ کیفیت یوں ظاہر کی گئی تھی ؎

زندگی کے راستوں میں پیچ و خم کھاتا ہوا
آندھیوں کو چھیڑتا طوفاں سے ٹکراتا ہوا
اپنا دامن بجھ نئے کانٹوں سے الجھاتا ہوا
دل کو برماتا ہوا سینے کو گرماتا ہوا
آگیا پھر گھوم پھر کر جمع احباب میں
اپنی یونیورسٹی کے گلشن شاداب میں
نیم بیگانہ ہجوموں سے جو ہوتا ہے گزر
ملتے ہیں نیم آشنایانہ پرانے بام و در
کن تمناؤں کے مرکز کن امیدوں کے کھنڈر
اک دھواں سا نا چتا ہے وقت کے اسٹیج پر
وقت جو ہلکے دھندلکے کی طرح تاریک ہے
فکر مستقبل پہ گویا پردۂ تاریک ہے

اس دھندلکے کی زد میں ہم جماعت خاتون کا تصور بھی آگیا تھا۔ میرے جیل جانے تک یہ خاتون جدوجہد آزادی میں دوسرے طلبا اور طالبات کے ساتھ حصہ لیا کرتی تھیں اور ملک میں فرقہ پروری کی اٹھتی ہوئی رو سے بالکل متاثر نہیں تھیں بلکہ ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کرتی تھیں۔ یہ اس کے باوجود تھا کہ ان کے گھر کی جاگیردارانہ فضا میں لیگی اثرات در آئے تھے لیکن یہ شہر کی غیر فرقہ وارانہ روایتوں کو اپنائے ہوئے تھیں۔ واپسی پر پہلی خوش گوار خبر یہ ملی کہ یہ بھی گھر کی بدلی ہوئی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں بلکہ اسی ناگپور میں جہاں سال بھر پہلے میں جدوجہد آزادی کے سلسلے میں گرفتار کر کے زندانی بنا لیا گیا تھا، یہ خاتون سی پی کے چند مسلم طلبا کی جانب سے قائم کی ہوئی کانفرنس میں صدارت کرنے گئی تھیں۔ قوم پرور صفوں میں اس کے خلاف برہمی تھی۔ ہمارے شہر لکھنؤ کی سیکولر روایات اور قوم پروری کا دور دور تک شہرہ تھا۔ یہ چھوٹا سا واقعہ ایک انتباہ تھا۔ میں نے اپنا ردعمل یوں ظاہر کیا تھا ؎

یوں تو نظروں میں ہے اب تک عہد رفتہ کا سرور
ہو گئے لیکن وہ جاں افروز ساغر چور چور

آج یہ سننے میں آیا تو کسی تھی ناگ پور
جن کے بزم قدر مندوں کی سیہ آنکھوں کا نور

ہاں یہی وہ شہر ہے جس میں وہ شوق بلند
بان ہو چلے ہو تھا کہ یہ خانے میں بند

تیرے ... فضا میں جگمگایا تھا کبھی
قید کا فرمان پا کر مسکرایا تھا کبھی
عظمت طلاب کا نغمہ سنایا تھا کبھی
تجھ کو بھی تنہائیوں میں یاد آیا تھا کبھی

اب یہیں سے قید خانے کے سکوت شام میں
شعر کی لذت ملی مجھ کو جفا کے جام میں

لیکن دوستانہ تعلقات کی حدیں ہیں اور میرا مزاج ایسا ہے کہ ؏
فرض ہستی کو محبت پر فدا کرتا نہیں

اس لیے اپنے ہی لفظوں میں ؏ کل کی ان زندگیوں سے آج کتنا دُور ہو گیا تھا
اب اتنے دنوں کے بعد جب میں دوبارہ یونین کی طرف سے گزر رہا تھا تو
ایک گوشے میں یکایک یہ خاتون چند نئے طلبا کے ساتھ نمایاں ہوئیں اور ؏
خفل رجعت سے اُٹھے فاتحانہ قہقہے

دُور سے سلام کرتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ وقت نے آگے چل کر ثابت
کر دیا کہ وہ قہقہے کتنے بے محل تھے، فتح تو ترقی پسندوں کی ہوئی تھی کہ ان لوگوں
کو لکھنؤ میں اجتماع منعقد کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہاں دُور ناگپور میں ایک
مختصر سا جلسہ کرنا پڑا۔

اس سلسلے میں اس کانفرنس کا ذکر ضروری ہے جس میں فرقہ پرستی کو
واضح شکست ہوئی تھی۔

طلباء میں تفرقہ

اس کا ذکر طلبا کی تحریک کی تاریخوں اور تحریک کے قائدین کی یادداشتوں
میں ضمنی اختلافات کے ساتھ آ چکا ہے۔ مختصر لفظوں میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس
کانفرنس کے انعقاد کے بعد جس میں جواہرلال نہرو اور محمد علی جناح
دونوں ہی شریک تھے، سامراجی حلقوں میں یہ تشویش شروع ہوئی کہ طالب علموں
کا اتحاد سیاسی طور پر شدید درد سر بن سکتا ہے، اس اتحاد کو فرقہ وارانہ خطوط
پر منقسم کرنے کے لیے انھوں نے مسلم طلبا کانفرنس کے منصوبے بنانے
شروع کیے۔ سب سے پہلے یہ تحریک کلکتہ میں اٹھائی گئی جہاں فضل الحق کی حکومت
تھی۔ وہی جناح صاحب سال بھر پہلے لکھنؤ میں متحدہ تحریک طلبا کی پہلی
کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے اب قائد اعظم بن گئے تھے اور مسلم اسٹوڈنٹس
کانفرنس کے صدر بنائے جا رہے تھے اور خبریں گشت کر رہی تھیں کہ شاید
وہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ تمام قوم پرور طلبا
نے فیصلہ کیا کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ قوم پرور عناصر میں انصار
ہروانی، ضمیر احمد صدیقی، صدیق احمد صدیقی، ایم۔ این۔ ایم بدیع الدین
عبد، حامد زبیری، جلیل عباسی وغیرہ نمایاں تھے۔ ضمیر احمد صدیقی اور
عبد حامد زبیری اچھے جرنلسٹ تھے جو بعد میں پاکستان چلے گئے۔
نیہران حضرات نے مل کر کلکتہ کا سفر کیا اور وہاں پروفیسر ہمایوں کبیر کی مدد
اور سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس کی رہنمائی میں قوم پرور
مسلم طلبا کی ایک متوازی کانفرنس کا منصوبہ بنایا۔ پہلے مولانا آزاد کی صدارت
میں اجلاس کرنے کا خیال تھا لیکن مولانا نے اس موقع پر اپنی جلدی
میں نعف آرائی کے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ قوم پرور طلبا اپنے جوش
میں عواقب پر غور کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ البرٹ ہال میں یہ اجلاس
بھی دھوم دھام سے ہوا جس کا افتتاح بنگال کے مشہور آزادی نواز
شاعر قاضی نذرالاسلام نے کیا اور پروفیسر ہمایوں کبیر نے صدارت کی۔
جلسے نے متفقہ طور سے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے اپنی وابستگی
کا اعلان کیا۔ اسی کے متوازی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا بھی جلسہ الگ ہوا
لیکن اخباروں میں قوم پرور مسلم طلبا کے اجلاس ہی کا چرچا رہا لیکن طلبا
کی صفوں میں انتشار ختم ہو گیا۔ لیگی حلقوں میں قوم پرور مسلم طلبا کے اجتماع
سے بے اطمینانی ہوئی اور لکھنؤ میں ایک اجلاس بہت خفیہ طور سے بلایا
گیا۔ اس میں بیشتر مسلم یونیورسٹی کے طلبا آ گئے تھے۔ اس کے انتظام
میں دماغ چودھری خلیق الزماں کا اور سرمایہ راجہ محمود آباد کا تھا۔ اس کا
انصرام علی گڑھ کے نعمان زبیری کے سپرد لکھنؤ میں ہوا۔ صرف مسلم کالجوں
سے چند منتخب طلبا بلا لیے گئے تھے اور ان کے قیام و طعام کا انتظام
وکٹوریہ پارک و یو ہوٹل امین آباد میں کیا گیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے
مسلم قوم پرور طلبا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چنانچہ انصار ہروانی، جلیل عباسی وغیرہ
بھی آ گئے اور نعمان زبیری کے مہمان ہوئے۔ اس اجلاس کی صدارت

کے لیے بشر حسین قدوائی کو منتخب کیا گیا تھا، وہ پان اسلامی تھے۔ اب ایم۔ این۔ ایم بدیع الدین نے لنکا کا قومی لباس زیب تن کیا اور کچھ اور لنکائی طلبا کو ساتھ لے کر بشر صاحب کے پاس پہونچ گئے کہ ہم تو آپ کو عالمی سطح کا قائد مانتے ہیں۔ آپ اس مقامی فرقہ واریت میں کہاں آ پھنسے؟ بشر صاحب نے اپنا خطبہ میرے رفیق فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی کے حوالے کیا اور خود صدارت نہیں کی۔ فرحت اللہ بے حد ذہین طلبا میں تھے۔ بعد میں یوپی کے محکمۂ اطلاعات میں شامل ہوئے۔ برسوں ان کا خوب ساتھ رہا ہے۔ انھوں نے خطبہ سناتے وقت فرقہ واریت کے خلاف فی البدیہہ تقریر کر ڈالی۔ پہلے ہی سے مولانا جمال میاں فرنگی محلی سے شرکت اور کانفرنس کو خطاب کرنے کا وعدہ لیا جا چکا تھا۔ انھوں نے حضرت مولانا عبدالباری کی وراثت نبھائی اور آخر میں یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہو گئی کہ مسلم طلبا کی الگ سے کوئی تنظیم بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان دو ناکامیوں کے بعد ناگ پور میں ایک محدود اجلاس بلایا گیا اور تزئین حبیب اللہ اس کی صدر منتخب ہوئی تھیں۔ ناگ پور اس زمانے میں فرقہ وارانہ سیاست کا مرکز تھا اس لیے وہاں ایسی کانفرنس کے انعقاد پر تعجب نہیں، لیکن اس پر تعجب اور افسوس ہوا کہ ایسی ذہین خاتون کے یہاں یہ ذہنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی۔ جو سبب بھی رہا ہو لیکن سننے میں آیا کہ وہ پاکستان پہونچنے کے بعد بھی اپنی آزادہ روی کو محفوظ کیے رہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں کی سیاست میں بھی گرفتار ہوئیں لیکن بنیادی طور پر وہ وہاں بھی ترقی پسند رہی ہیں۔ اس فضا میں اتنا بھی بہت ہے۔

دوسرا افتراق

ناگ پور میں اس سے زیادہ افسوسناک واقعہ دراصل کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستہ طلبا کی علاحدگی تھی۔ طلبا کی تحریک اب تک کل جماعتی رہی ہے اور اس میں کمیونسٹ پارٹی، گاندھیائی، سوشلسٹ، کانگرس سوشلسٹ، رولیوشنری کمیونسٹ، رولیوشنری سوشلسٹ سے لے کر جگانتر اور انوشیلانگ تک اور سبھاش چندر بوس کی قیادت میں قائم ہونے والے فارورڈ بلاک تک سبھی شامل تھے، اور وہاں رائسٹ بھی تھے۔ اتنے مختلف الخیال نوجوان پرجوش اور آزادی پسند عناصر کو ساتھ لے کر چلنا ایک مرحلہ تھا۔ کسی ادارے میں مختلف الخیال افراد کو ایک ساتھ لے کر چلنا کتنا مشکل ہے۔ اس کو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جنھیں ایسے اداروں کو چلانے کا کبھی سابقہ پڑ چکا ہو۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن ایک پلیٹ فارم یعنی مختلف خیالات رکھنے والے طلبا کا مجموعہ تھا۔ ہمارے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ اختلافات میں باہمی تبادلہ اور صلح و مصالحت سے ایک مشترک پروگرام بنا کر چلایا جائے۔ جہاں طلبا کے ذاتی مفاد کا سوال ہو وہاں سب ایک ہو جائیں اور قومی سطح پر جہاں سامراج سے ٹکراؤ پیدا ہو یا تفرقہ پردازوں اور فرقہ پرستوں سے مقابلہ ہو وہاں متحدہ محاذ بنا لیں۔ اسی راہ پر برابر چلتے رہے اور مخالفتوں کے باوجود راہوں کو ہموار کرتے چلے گئے۔ ناگ پور اجلاس کے پہلے کچھ یہ محسوس ہونے لگا کہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ حضرات نے طے کر لیا ہے کہ یا تو وہ الگ فیڈریشن بنا لیں گے یا فیڈریشن پر کسی طرح قبضہ کر لیں گے یعنی Capture کر (زبردستی قبضے) کی سن گن بھی مل گئی تھی۔ یہ کہانی ناگ پور میں سامنے آئی لیکن میں تو فوراً ہی جیل چلا گیا، اور اب جو نکلا تو دو فیڈریشن کام کر رہے تھے۔ دونوں ہی اپنے کو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کہتے تھے۔ اخبار والوں نے بالآخر ایک کو کمیونسٹ اور دوسرے کو نیشنلسٹ یا سوشلسٹ لکھنا شروع کر دیا۔ بڑا اور متنوع حلقہ وہی تھا جس میں تمام دوسرے عناصر یکجا تھے اور جس کے سکریٹری ایم ایل شاہ تھے۔ وہ بحمدہ اب بھی موجود ہیں اور بمبئی میں رہتے ہیں اور بڑے تاجروں میں شمار ہوتے ہیں۔

یہاں کہانی کو مختصر کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اگلا اجلاس دسمبر ۱۹۴۰ء میں پٹنہ میں ہونا طے پایا۔ کمیونسٹ حضرات نے میاں افتخار الدین کو لاہور سے صدارت کے لیے بلایا اور متحدہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے مشہور اور جواں سال سوشلسٹ لیڈر یوسف مہر علی کو بمبئی سے طلب کیا۔ دونوں اجلاس ہوئے اور عام تاثر یہی تھا کہ متحدہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پلہ بھاری رہا۔ اگرچہ کمیونسٹ نے بھی اپنے کو متحدہ کہنا چاہا اور کچھ دوسرے عناصر کو بھی ساتھ لیا لیکن نوجوان طالب علم اس سے بخوبی واقف تھے کہ کون کیا ہے۔؟

جنرل سکریٹری

متحدہ کانفرنس نے اتفاق رائے سے مجھے جنرل سکریٹری منتخب کیا اور "کامریڈ زیدی زندہ باد" کے نعرے بلند کیے۔ کہاں یہ حقیر فقیر

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

انکشاف

دلکشیِ وقتِ ستم ہے مجھے معلوم نہ تھا
حسن پروردۂ غم ہے مجھے معلوم نہ تھا

جگمگاتے ہوئے رخ پر ہے شفق کی سرخی
دل مگر مخزنِ غم ہے مجھے معلوم نہ تھا

اے غمِ دہر چمن کو بھی نہ چھوڑا تو نے
آنکھ نرگس کی بھی نم ہے مجھے معلوم نہ تھا

لبِ نازک پہ مچلتا ہوا دل کش نغمہ
واقفِ رنج و الم ہے مجھے معلوم نہ تھا

میں بھٹکتا رہا خود ساختہ ویرانوں میں
ملحقِ باغِ ارم ہے مجھے معلوم نہ تھا

میری خاطر یہ تری چشمِ عنایت اے دوست
تحفۂ ساغرِ جم ہے مجھے معلوم نہ تھا

ایک پروردۂ ماحولِ طرب کے دل میں
حرمتِ لوح و قلم ہے مجھے معلوم نہ تھا

فکر و احساس کے صحرا پہ تبسم بن کر
بارشِ ابرِ کرم ہے مجھے معلوم نہ تھا

دلِ نازک میں ہے احساسِ محبت اب تک
لب پہ ماہر کی قسم ہے مجھے معلوم نہ تھا

اقبال ماہر
محلہ کٹرہ
الہ آباد

ایک مژدہ

ہمارے شہر کے اہلِ قلم سنو مژدہ
نقیبِ وقت صدا دے رہا ہے ہم سب کو
ہمارے شہر میں اک شخص آنے والا ہے
جٹائیں جس کی جھکی ہوں گی اس کے قدموں تک
نگاہیں شمس کی مانند شعلہ بار ہوں گی
وہ جس کے ماتھے پہ انگاروں کی چمک ہوگی
وہ جس کے لب سے لہو قطرہ قطرہ ٹپکے گا
وہ جب بھی آئے گا طوفان ساتھ لائے گا
زمیں کی کوکھ کو قدموں تلے کچل دے گا
سیاہ حاشیے کھینچے گا آسمانوں میں
ستارے توڑ کے دریاؤں میں بہائے گا
کمند پھینکے گا وہ آفتاب پر ایسے
کہ کھینچ لائے گا اس کو زمیں کی چھاتی پر
تمام پیڑ جھلس جائیں گے
زمیں تب کر پناہ مانگے گی
روئے گی،
گڑگڑائے گی:
"مرے خدا! مرے ربّ الکریم!
گناہ معاف
مجھے سزا تجھے دینی ہے دے مگر اتنی
کہ اپنی باہوں میں سب کچھ سمیٹ کر اب میں
وشال پھیلے سمندر میں جذب ہو جاؤں"

مگر وہ شخص
جٹائیں ہیں جس کی قدموں تک
جب آئے گا تو زمیں کچھ بھی کہہ نہ پائے گی
پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے صرف دیکھے گی
اسی لیے مرے اہلِ قلم اب ایسا کرو
زمیں کے گرد اک ایسا حصار کھینچ دو تم
وہ شخص
جس کے لبوں سے لہو ٹپکتا ہے
جب آئے اس کے قدم خاک و خوں کی بارش میں
کچھ اس طرح سے ملوث ہوں ہل نہ پائے وہ
ہتھیلیوں میں جلن ہو
نگاہیں پژمردہ
کمند پھینک نہ پائے وہ آسمانوں پہ
ستارے توڑ کے دریاؤں میں بہا نہ سکے
زمیں کی کوکھ کو قدموں تلے کچل نہ سکے
تمھاری کاوش و عزم و عمل کی یہ دولت
زمیں کو ایک نئی زندگی عطا کر کے
نئے ستارے نئے آفتاب دے گی تمھیں

□□

شعیب شمس
معرفت عرفان الدین صاحب
آل انڈیا ریڈیو
فریزر روڈ پٹنہ
۸۰۰۰۰۱

خود نوشت

سید ضمیر حسن دہلوی
۶۸، سیکٹر ۲۶، نوئیڈا
یو۔پی

میری کہانی میری زبانی

میری پیدائش مارچ ۱۹۴۰ء کی ہے، اس لیے مجھے دوسری جنگِ عظیم کے ہولناک تاثرات کی ٹھٹھری ہوئی پیداوار سمجھیے میرا شعور گھٹنیوں چلنے لگا تو اس نے تقسیم وطن کے بعد ہونے والے فسادات کا نظارہ کیا۔ چنانچہ میرے مزاج میں بچپن ہی سے کم حوصلگی اور بے دلی سما گئی۔ میں خاصتاً بزدل واقع ہوا ہوں اور اس بزدلی کو چھپاتا نہیں ہوں کہ یہ میرے احساس کی تندی اور تیزی کی دلیل ہے۔ ۱۲ برس کی عمر سے میں اپنے گردوپیش سے پوری طرح باخبر ہوں۔ اتنا باخبر کہ اگر چاہتا تو شعر بھی کہہ سکتا تھا مگر یہاں میری کم حوصلگی اور تن آسانی رکاوٹ بن گئی۔ میں بنیادی طور پر جذباتی آدمی ہوں، مگر میری محرومی دیکھیے کہ زندگی بھر کوئی جذباتی قدم اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا۔ عقل کی چنّاں و چنیں کا شکار رہا۔ خدا کی بزرگی اور برتری کا دل سے قائل ہوں۔ اس کی حکمتوں، تجروائیوں پر نکتہ چینی کرنا میرے نزدیک عین کفر ہے اس لیے نہ دل کی بے بضاعتی اور غم کی فراوانی پر تعجب ہوتا ہے نہ اس طرفگی پر کڑھتا ہوں۔ کچھ نباہ سا کرلیا ہے۔ معیشت کے لیے کاروبار وہ اختیار کیا جس میں مشقت مقرری کم ہے اور آسائشیں حتی المقدور۔ تعلیمی زندگی سائنس اور سوشل سائنس کے میدان سر کرتی ہوئی رفتہ رفتہ مادری زبان تک آ کے رک گئی۔ تخلیقی ذوق پیدا ہوا تو اس کی تسکین کا بھی سہل راستہ ڈھونڈھ نکالا۔

میں نے عرض کیا نا کہ میں "تھڑ دلا" ہوں۔ یہ دلی کا محاورہ ہے۔ دشواریوں سے ڈر جاتا ہوں۔ بھاری پتھر چوما اور چھوڑ دیا۔ شاعری اس لیے نہ کر سکا کہ یہ مشکل کام ہے۔ میر، سودا، درد اور غالب کو پڑھ کے ہوش جاتے رہے۔ اللہ اللہ! آدمی اس سے زیادہ اور کہہ ہی کیا سکتا ہے؟ نا بھائی! میں تو وہاں تک سوچ بھی نہیں سکتا جہاں تک یہ اساتذہ کہہ کر چلے گئے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے۔ چلیے، چھٹی ہوئی ایک دروازہ تو بند ہی ہو گیا۔ پھر نثر کا مطالعہ کیا۔ اس صنف میں افسانہ بہت پسند آیا۔ پریم چند اور ان کے ساتھیوں کو پڑھتا ہوا ترقی پسند افسانہ نگاروں کے گروہ تک جا پہنچا۔ یہ لوگ اُن دنوں بڑے بدنام تھے ان کو پڑھنا میرے گھریلو ماحول میں عیب سمجھا جاتا تھا۔ والد صاحب فرماتے تھے بس نذیر احمد کی تصانیف پڑھا کرو۔ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ اور والدہ فقط راشد الخیری کا نام لیتی تھیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ قہرِ درویش برجانِ درویش۔ ان دونوں کو پڑھا اور خوب پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محاوراتی اسلوب اور دلی کا روزمرہ اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ آگے جو کچھ ہے سب اسی کی کارفرمائی ہے۔

یہ میری عمر کا وہ حصہ تھا جب آدمی اخلاقی مضامین اور پند و وعظ کے نام سے چڑتا ہے۔ مگر بغاوت تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بزدل تھا، کم حوصلہ تھا اس لیے ہزاروں صفحات نصیحتوں کے پی گیا اور ڈکار تک نہیں لی۔ اس کے بعد چھپ چھپ کر افسانے پڑھنے شروع کیے۔ منٹو کے مجموعے لایا، بیدی کے مجموعے لایا، کرشن چندر کے مجموعے لایا اور ان پر اخلاقی کتابوں کے گردپوش چڑھا دیئے۔ کرشن چندر اچھے لگے، ان کا رومان بہت پسند آیا۔ بیدی بالکل نہ بھائے مجھے حسیاتی کیف کی ضرورت تھی اور بیدی ذرا ٹھنڈے لگے۔ منٹو دل میں گھر کر گئے۔ انھیں پڑھا تو کان گرم رہنے لگے۔ سردی کی راتوں میں پیر لحاف سے باہر نکالنے پڑے۔ بڑا مزا آیا۔ بلوغ کو پہنچتے وقت اور بھلا چاہیے بھی کیا تھا۔ میں ان کا دیوانہ ہو گیا۔ کل مجموعے پڑھ ڈالے

ضبط شدہ بھی کہیں نہ کہیں سے حاصل کیے اور رات کے اندھیرے میں بیٹری جلاکر ان کا مطالعہ کیا۔ منٹو کے بعد عصمت پر نظر پڑی۔ انھیں چھوڑا تو ہاجرہ مسرور کو پکڑا۔ خدیجہ ذرا سنجیدہ تھیں اور ہاجرہ کے نقاشے بھی سنجیدہ۔ اس لیے ان کا ساتھ زیادہ دیر نہ دے سکا۔ مفتی اور عسکری زیادہ اچھے لگے۔ قرۃ العین حیدر ان دنوں کچھ زیادہ مشہور نہ تھیں۔ اشفاق میں نے بہت بعد پڑھا اور پسند آئیں۔ وہ بہت دقت سمجھنے کے لیے۔ البتہ اسلوب ان کا بھی چھا چھایا تھا۔ افسانہ نگاری کے اس لمبے چوڑے جہان کی سیر نے میرا خاصا وقت الٹ لیا۔ ابھی میں گریجویٹ نہیں ہوا تھا انٹرمیڈیٹ ہی کر رہا تھا۔ مضمون سائنس تھا۔ اردو زبان و ادب تو نہیں تھی لکھنے کا تجربہ تھا۔ پھر گریجویشن کیا تو باقاعدہ ایک مضمون کی شکل میں اردو بھی پڑھی۔ اس میں خرابی کا یہ پہلو نکل آیا کہ اساتذہ شعراے اردو کی طرح افسانہ نگاروں کے برگزیدہ گروہ سے بھی مرعوب ہوگیا۔ میں جس سے مرعوب ہو جاتا ہوں اس کا سامنا کرنے سے کترانے لگتا ہوں۔ اردو پڑھی افسانہ نگاروں کا حقیقی مقام سمجھ میں آیا تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

تعلیمی سرگرمیوں سے فارغ ہوا اور تدریسی ملازمت ملی تو بڑی شدت سے جی چاہا کہ تخلیقی کام بھی کیا جائے۔ افسانے اور شعر سے تو ڈر ہی چکا تھا۔ انشائیے کا مطالعہ کیا۔ مزاح نگاروں کو پڑھا، طبیعت ذرا سنبھلی۔ یہ کام نسبتاً آسان لگا۔ آہستہ آہستہ لکھنا بھی شروع کیا۔ محنت سے زیادہ داد ملنے لگی۔ انشائیے کے ذیل میں آثار دلی کی مخصوص نثر بھی سامنے آئی۔ روزمرّہ تو بچپن سے کان میں پڑی تھی۔ دلی کے روڑے تھے۔ جی چاہا کہ اس زبان میں بھی کچھ لکھا جائے۔ گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔ لکھنا شروع کیا تو بس اسی کے ہو گئے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، شاہد احمد دہلوی، ملّا واحدی، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع، مرزا محمود بیگ اور نہ جانے کن کن کو پڑھا۔ سب کی نثر یکساں تھی۔ بات ایک تھی۔ دلّی کا رونا۔ لب و لہجہ ایک تھا۔ میٹھا اور نَدھرا یسا کہ پڑھتے جائیے سیری نہیں ہوتی تھی۔ خود بھی دلّی کی زبان میں انشائیے لکھے، خاکے لکھے، رپورتاژ لکھے اور بزعم خود 'صنف بن گئے'، اوڑھنی چادر ہونے برابر میں بھی سوکی خالہ ہوں۔ افسانے لکھ نہ سکے مگر افسانے لکھنے کی تمنا ضرور رہی۔ دو ایک ناکام کوششیں بھی کیں۔ دلی سے دلّی تک، محبت وہم یا حقیقت

دو افسانے پاکستانی جرائد میں شائع بھی ہوئے مگر کچھ بات بنی نہیں۔

یہ بات ساتویں دہائی کی ہے جب مجھے بی۔ اے آنرز کو افسانہ اور اس کی تکنیک پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ افسانے کی تاریخ کا پھر ایک مرتبہ باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑا۔ ہیئت اور تکنیک سے بھی کماحقہٗ واقفیت حاصل ہوئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ عربوں کی کہاوت " اگلوں نے پچھلوں کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے" غلط نہیں۔ کرشن چندر کی اسلوب پرستی کا سحر کھلا۔ بیدی کے افسانوں کی دھیمی آنچ کا لطف اٹھایا۔ منٹو کی ہنگامہ خیزی اور چونکا دینے کی کوشش نظر سے گزری۔ عصمت کی زبان کا جادو سر چڑھ کے بولا۔ مفتی کی نفسیاتی تحلیل سے آگاہی ہوئی اور عسکری کی تکنیکی گتھیاں سلجھانے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں انتظار حسین، اشفاق احمد، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، نوید انجم اور لئیق حمید کو پڑھنے کا موقع ملا۔ سب کے یہاں پختگی نظر آئی۔ سب کے یہاں خامیاں ملیں۔ حسینی کو پڑھا اچھے لگے مگر کہانی پن ان کے یہاں کچھ زیادہ پایا۔

غلام عباس کا آنندی دیکھا تو جی خوش ہوگیا۔ معلوم ہوا فنی بصیرت رکھنے والا افسانہ نگار زندگی کے غیر افسانوی حقائق سے کس طرح کام لے سکتا ہے۔ مطالعہ کا شوق تو ہمیشہ سے تھا ہی۔ زندگی کو جس قدر دیکھا تھا شعور اور لاشعور میں محفوظ تھی۔ بصارت و بصیرت بڑھی تو حقائق و مشاہدات کو کہانیوں میں بدلنے کا سلیقہ بھی آگیا۔ بیدی اور ندیم پر نظر خاص پڑی پھر یہ سلیقہ فنی آگہی میں بدلنے لگا۔ موہنا لکھا تو ایک کبوتر اور تشنہ کام معمّر خاتون' دو خاکوں سے ایک نفسیاتی پلاٹ پیدا کیا۔ الحاق ذات کی کہانی بنی "تنگی واقفیت بڑا کام دے گئی" "نقوش" میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کو بنظر غور دیکھا جائے تو اس میں فنی اکتساب کا بڑا واضح پتہ ملتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے یہ کہانی چھپنے بھیجی۔ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ دو خاکوں کی پیوند کاری ہے۔ مگر توقع سے زیادہ داد ملی۔ رام لعل کا حوصلہ افزا خط ملا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے کمر تھپتھپائی۔ اگلے افسانے کے لیے آمادہ کیا۔ میری کچھ ہمت بندھی۔ ستوان شہزادہ لکھی۔ یہ کہانی موہنا کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئی۔ "سیپ" کے افسانہ نمبر اور لکھنؤ کے "کتاب" میں شائع ہوئی۔ دلّی کی تہذیبی اور ثقافتی معلومات کام دیتی رہی۔ جنسی کجروی اس کہانی کا مرکزی خیال تھی۔ پس منظر میں

چالیس پچاس سال پہلے کی دلی تھی۔ اب کچھ کچھ اعتماد ہو چلا تھا۔ تیسری کہانی مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میرے لاشعور کی پیداوار تھی "میں نے ایک عورت دیکھی" یہ بھی پاکستان اور ہندستان دونوں جگہ چھپی، ادارہ پرستی کے خلاف احتجاجی کہانی تھی۔ موجودہ دور کی سماجی افراتفری اس کا بنیادی خیال تھا۔ یہ کہانی بھی کافی پسند کی گئی۔ اپنے پس منظر کے اعتبار سے یہ جاگیردارانہ سماج میں عورت کا استحصال کی کہانی تھی۔ اسے میں پہلی کہانی سمجھتا ہوں جسے تکنک کی جانب شعوری توجہ کیے بغیر مکمل کیا گیا۔ اس کے بعد "فاحشہ" لکھی۔ فاحشہ ایک جرائم پیشہ مرد کی کہانی ہے۔ اسے کتاب کے افسانہ نمبر میں جگہ ملی۔ مجرموں کی نفسیات اس کا موضوع ہے۔ میں نے اکثر کہانیاں نفسیاتی تحلیل اور تجزیہ کی مدد سے لکھی ہیں، اس لیے خود کو منٹو اور بیدی کا شاگرد سمجھتا ہوں۔ مختصر سی کائنات سے چند کہانیاں لکھ سکا ہوں۔ ہواؤ کھل گیا تو مزید کچھ لکھنے کا ارادہ ہے ورنہ جب صلبی اولادیں صرف دو ہو سکتی ہیں تو معنوی اولادیں بھی چند ہوں تو کیا مضائقہ ہے۔

اُردو کہانی آج کل ایک تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ میری ناقص رائے میں اس کا معیار پچھلے بیس پچیس سال کے مقابلے میں گر گیا ہے تجربہ کرنا زندگی میں کچھ سیکھنے کے لیے بُری چیز نہیں مگر صرف تجربات کی حد تک زندگی کو محدود کر دینا بُری بات ہے۔ ہیئت کی تبدیلی بھی کوئی خاص قیامت نہیں مگر اسے منطقی اعتبار سے پختہ ہونا چاہیے۔ تجریدی فن کا بھی میں مخالف نہیں ہوں۔ مگر تجرید کے نام پر مہملات یقیناً مذموم ہیں میں خود نو سکھیا ہوں، کوئی وقیع رائے دینے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا مگر چونکہ افسانے پڑھتا ہوں اس لیے موجودہ افسانے کے بارے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتا ہوں۔ زبان کی معنویت کا احساس بہت دھندلا گیا ہے مجھے دلی کی نثر کے مطالعے نے اس ضمن میں بڑا حساس بنا دیا ہے۔ غلط زبان پڑھ کے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ زبان کہانی لکھنے کا اوزار ہے آج کل زندگی کے ہر شعبہ میں روا روی ہے۔ کاتا اور لے دوڑی کا رواج ہے۔ پبلشر مل جاتے ہیں۔ جرائد میں جگہ پانا بھی مشکل کام نہیں اس لیے زبان کی نوک پلک پر توجہ کرنا دقیانوسی حرکت سمجھی جاتی ہے۔ میں فخر سے کہتا ہوں کہ میں دقیانوسی ہوں۔ خراب زبان میرے حلق سے نہیں اُترتی —

کرشن چندر اور عصمت مجھے اس لیے پسند ہیں کہ وہ خوب زبان لکھتے ہیں۔ مجھے کہانی میں اچھے کردار کی تخلیق مرغوب ہے۔ کالو بھنگی، موذیل، منگو کوچوان، کچرا بابا، پھوپھی، پریشد سنگھ، بابو گوپی ناتھ وغیرہ میرے پسندیدہ افسانے ہیں۔ میں کردار کی تخلیق میں افسانویت سے کام لیتا ہوں اور واقعات کی ترتیب میں حقائق سے مدد لیتا ہوں۔ مجھے انسانی نفسیات سے غیر معمولی دلچسپی ہے مگر میں نفسیات کو درسی مضمون کی طرح پیش کرنے کا قائل نہیں۔ کہانی بنیادی طور پر کہانی ہونی چاہئے اور پھر خواہ کچھ بھی ہو۔ آجکل مختصر کہانی مجھے قاضی عبدالستار کی زبان سے اچھی لگتی ہے۔ انتظار حسین مجھے اس وجہ سے پسند ہیں کہ انھیں کہانی سنانی آتی ہے۔ کہانی میں داستانوی عنصر اس حد تک ہونا چاہیے کہ اسے سنا جا سکے۔

جدید کہانی سے نہ مجھے بغض للّٰہی ہے نہ رغبت، پڑھ لیتا ہوں۔ اپنے خالی اوقات میں۔ ابھی تک یہ مجھے بحیثیت مجموعی متاثر نہیں کر پائی ہے۔ ممکن ہے آئندہ کرے، اگر خرد برد زمانہ سے بچ سکی تو۔ اس لیے میں اس سے بھی رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ ترقی پسند افسانہ نگار مجھے جدید کہانی کاروں سے زیادہ پسند ہیں مگر یہ ذاتی پسند کا معاملہ ہے، تنقیدی بیان نہیں۔ مجھے آج کل لکھی جانے والی ہندی کہانیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ ان میں کہانی کار ماحول یا فضا اچھی پیدا کر لیتے ہیں۔ کہانی کے لیے تہذیبی فضا کا سازگار ہونا ضروری ہے، وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں پیدا ہوتی ہے، اس اعتبار سے ہندی کہانی کو فروغ ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسی رفتار سے ترقی کرتی رہی تو ہندی کہانی اُردو کہانی کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔ خدا نہ کرے جو ایسا ہو۔ اسی وجہ سے میں افسانے کے لیے تہذیبی رچاؤ اور عصری آگہی کو ضروری سمجھتا ہوں اور افسانہ نگار اس سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے صرف دلّی کے تہذیبی ماحول میں جینے کا موقع ملا ہے اسی لیے میں صرف اسی پس منظر میں کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو کچھ لکھا ہے وہ تجربے کے طور پر ہے۔ دیکھئے آگے کیا رہتا ہے۔ دلّی مٹ گئی۔ دلی کی زبان قصۂ پارینہ ہوئی۔ اب اس کے سمجھنے والے بھی کم رہ گئے ہیں۔ بتائیے کس کے لیے لکھوں۔

دلی میرے نزدیک ایک شہر یا انسانوں کی ایک بستی نہیں ہے

ہندوستان کی ثقافتی، اخلاقی، فنی، معاشرتی اور علاوہ انسانی قدروں کی حقیقی معنوں میں عمدہ تصویر ہے۔ میں نے اس کے دھندلے نقوش سے اپنے ذہن میں بیٹھے ہوئے اور انھیں اپنے شعور و لاشعور کی تفتیش اور ذہنی ہم آہنگی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ دلی کا ماحول میں اپنے خاکوں، انشائیوں، مضامین اور رپورتاژ وغیرہ میں بھی لکھتا رہا ہوں البتہ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو ذہن میں ہمیشہ کھٹکتی رہیں جن کا اظہار براہ راست کرنے میں ہماری تہذیبی قدریں مانع آتی تھیں۔ ان کے لیے ایک ایسے اظہار کی ضرورت تھی کہ بات بھی کہی جائے، دل بھی ہلکا ہو اور خاکے یا کسی کی آبرو پر بھی حرف نہ آسکے۔ کہانیاں لکھنے کی ضرورت اسی لیے پیش آئی۔ رمز و ایمائیت، اشاریت، اسلوب کی شائستگی آپ میرے افسانوں میں پاتے ہیں وہ اسی سبب خاص کی مرہون منت ہے۔

انسانی جذبے اپنی تسکین کے لیے مناسب راستوں کی ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ایک اچھے نظام زندگی کا فرض منصبی ہے لیکن ایسا ہوتا بہت کم ہے۔ تہذیبی روایات کچھ اس ڈھنگ سے زندگی پر قبضہ جمالیتی ہیں کہ آدمی کو سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے دلی کی تہذیب میں بھی انسانی مجبوریوں کا پتہ ملتا ہے اور پھر ان مجبوریوں سے تنگ آکر جو ٹیڑھی سیدھی راہیں نکالی جاتی ہیں ان سے بعض نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوکر زندگی کو کچھ سے کچھ بنادیتی ہیں۔ مہذب لوگ تشنہ کامیوں پر نہ آنسو بہاتے ہیں اور نہ اپنی تمناؤں کی تکمیل کے لیے غیر مہذب رویّے اپناتے ہیں۔ ان کے نکالے ہوئے راستے جذبوں کو اپنی سطح سے مرتفع کرکے ایسے ہر عمل میں ڈھالتے ہیں جو بدنما نہ دکھائی دے یہی بڑی تہذیبوں کا کمال ہے اور یہی ان کا عیب بھی۔ عیب بینی شرفا کے نزدیک کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ صرف ان کے خلاف چشم سخن سے اشارہ کرنا کافی ہے یہ بھی احتجاج کی ایک صورت ہے۔

میں نے اکثر کہانیوں میں نفسیاتی کجرویوں کے خلاف کنایاتی احتجاج سے کام لیا ہے۔ اتنا سنبھل کے کہانی لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لیے کہانی کے میدان میں میری تخلیقات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ بہر حال اچھا برا جو کچھ لکھا ہے اس لیے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ مجھے خود پر نہ سہی، دلی پر پھر پورا اعتماد ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں دلی کی زبان لکھتا ہوں، خدا جانے صحیح یا غلط۔ البتہ دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ زبان و بیان کا یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہے۔ نئی نسل زبان سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ اسی لیے اس کے سامنے ٹوٹی پھوٹی زبان کا نمونہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اسے مزید فروغ دیں۔ تعصبات کا زمانہ ختم ہوا۔ اردو اب ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ ہر جگہ اس کا اپنا بیانیہ ہے۔ مقامی اسلوب ہے۔ رنگا رنگی ہے، بوقلمونی ہے۔ اسی سے اردو کا وقار، اردو کی عظمت اور اس کی مقبولیت قائم ہے۔ میں اردو کے اس رنگارنگ اظہار بیان کو تسلیم کرتا ہوں، اس کی اہمیت سے واقف ہوں لیکن ساتھ ساتھ یہ تمنا بھی رکھتا ہوں کہ زبان کا جمہوری طرز جسے دلی والوں نے اپنایا تھا آگے بھی برقرار رہے۔ اس کے محاوراتی اسلوب، گفتگو کے انداز، سادہ اور سہل طرز بیان کی بھی آبیاری ہو تاکہ اجڑے دیار کی روایت تاریخ کے صفحات پر ہی نہیں ہمارے آپ کے دلوں میں بھی زندہ و پائندہ رہے۔

جگ میں ضمیر تمھارے دم سے اجڑے دیار کا چرچا ہے
ورنہ اس کے چاہنے والے کب کے قبرستان گئے

□□

سلام بحضور امام حسینؑ

ہر ظلم کے خلاف صف آرا حسین ہیں
ہر انقلاب کے پس پردہ حسین ہیں
کچھ یہ بھی مصلحت ہے جو تشنہ حسین ہیں
ورنہ فرات قطرہ ہے دریا حسین ہیں
اجڑا یزید معرکۂ کربلا کے ساتھ
لیکن شہید ہو کے بھی زندہ حسین ہیں
ذات حسین جسم نہیں ہے اصول ہے
انساں کی عظمتوں کا سراپا حسین ہیں
جب چاہے دیکھ لے انھیں دل سے پکار کر
اے قوم اب بھی تیرا سہارا حسین ہیں
افسر غم حسین میں کاٹی ہے زندگی
میرا تو حال و ماضی و فردا حسین ہیں

خورشید افسر بسوانی

بسواں ضلع سیتاپور

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
اے ۵۵۔ وجیہت نگر، صاحب آباد
غازی آباد ۲۰۱۰۰۵

عروض معروض

ہر شخص کو اپنے نظریات پر، وہ درست ہوں یا نادرست قائم رہنے کا بھی حق ہے اور غلطی کا احساس، خود سے یا دوسروں کے توجہ دلانے سے ہو جائے تو نظریات میں ترمیم کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ زار علامی کا تعلق پہلے گروہ سے ہے اور میرا دوسرے گروہ سے، موصوف نے جولائی ۱۹۹۳ء کے 'تعمیر ہریانہ' میں میری کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ کسی کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور اس کو راہ راست کی طرف لانے کی کوشش، دونوں لائق ستائش کام ہیں۔ آیئے، زار علامی کی ان کاوشوں پر ایک نظر ڈالی جائے۔ ص ۱۴ پر یہ تحریر لائق توجہ ہے:

"حشو دوم کے مفعولن کے بعد آنے والا رکن حرف فع ہی رہ جاتا ہے۔ صدیقی صاحب نے اس فع کو ابتر: اخرم محذوف بتایا ہے۔ زحاف بتر کو 'خرم + حذف + حذف' بتانا صدیقی صاحب کی عروض دانی کا کمال ہی ہوسکتا ہے۔ خرم مختص بصدر و ابتدا ہے' اور حذف مختص بعروض و ضرب۔ ان کا اجتماع ازروئے عروض قطعاً غلط۔ یہ اجتماع صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ زحاف خرم کو عام، یا مختص بعروض وضرب مان لیا جاتا۔ بتر دراصل جبّ + قطع ہے۔"

زار کی تحریر، جو اقتباس کی گئی، اسے پڑھ کر اردو قواعد اور عروض دونوں زار زار رو رہے ہوں گے۔ امید ہے موصوف آئندہ عروض پر لکھتے ہوئے ایہام اور ضلع جگت سے کام نہ لیں گے۔ حالاں کہ عروض سے زیادہ وہ ایہام اور ضلع جگت کے فن پر شاید زیادہ دست رس رکھتے ہیں۔ میرے نام کے ساتھ اپنے اس مضمون میں ایک سے زیادہ بار کھلواڑ کی ہے میں اس سے لطف اندوز ہوا۔ موصوف کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ زار کے معنی ضعیف، خوار اور نالاں وغیرہ بھی ہیں اور ان کو بھی لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کیے جاسکتے ہیں۔

موصوف نے فع کو حرف بتایا ہے۔ کیا ان کے استاد نے، جن کے وہ جانشین بھی ہیں، ان کو عروض میں یہی درس دیا تھا کہ فع حرف ہے! کیا ہائے مختفی کی طرح انھوں نے ع مختفی بھی اسی طرح ایجاد کی ہے جس طرح صدر میں فاعلن اور ضرب سے پہلے ابتدا مفاعلن رکھ کر رباعی کے نام نہاد اوزان؟ موصوف عروض کی مبادیات سے کیا واقفیت رکھتے ہوں گے، یہ بات اسی طرح واضح ہے کہ فع کو حرف تصور فرماتے ہیں:

یہ بیان بھی کچھ کم عبرت ناک نہیں کہ "زحاف بتر کو خرم + حذف بتانا صدیقی صاحب کی عروض دانی کا کمال ہی ہوسکتا ہے۔" زار کا یہ بیان نہ صرف مطالعہ کی قلت بلکہ فقدان کا ثبوت ہے، بلکہ جان بوجھکر انھوں نے میرے بیان میں، جو نقل فرمایا ہے اور میرے موقف میں جو نقل نہیں فرمایا ہے، تحریف کی ہے۔ میں مذمت نہیں کروں گا کیونکہ حقیقت حال سے واقف ہونے کے بعد یہ کام قارئین کا ہے۔

رباعی اہل ایران کی ایجاد ہے۔ یہ آہنگ ایران میں موجود رہا ہوگا۔ جب رباعی میں منضبط ہوا، اس وقت تسکین / تخنیق کا زحاف وضع نہیں ہوا تھا۔ چوں کہ اہل فارس نے عربی عروض اپنائی تھی، اسلیے اپنے آہنگوں کو اس عروض کے سانچے میں لانے کے لیے انھوں نے تیرہ زحاف وضع کیے۔ یہ اہل ایران کے زحاف ہیں۔ جبّ، ہتم، زلل، بتر (اہل عرب کے زحاف بتر سے مختلف ہیں)۔ یہ چار زحاف رباعی کی ضربوں سے متعلق ہیں۔ جدع اور نحر، یہ دو زحاف ان مزاحف

[illegible] بحور کے عروض و ضرب سے متعلق ہیں جن کا آخری رکن
[illegible] مفعولات ہوتا ہے۔ یہ زحافات حذف [illegible] اور
[illegible] قاعدے میں تفصیل سے [illegible] مثالوں سے حاصل ہونے
والے [illegible] عروض و ضرب سے مخصوص ہیں۔ زحافات [illegible] اور
طی [illegible] مستفعلن، مفتعلن [illegible] عروض و ضرب کے لیے خاص ہیں
یعنی یہ دونوں زحافات [illegible] مستفعلن، مفتعلن، اور
مفعولات [illegible] ان میں دو اسباب خفیف ہیں۔ پہلا سبب خفیف
ساقط ہوتا ہے [illegible] ابتدا و حشو میں
آتا ہے، عروض و ضرب [illegible] کے لیے خاص نہیں ہے۔ تفصیل
سید محمود کے رسالے منتہی العروض اور نجم الغنی کی کتاب
بحر الفصاحت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مارچ ۱۹۹۱ء کے ایوان اردو
دہلی میں رباعی پر میرا جو مضمون [illegible] کے عنوان سے شائع
ہوا تھا، اس سے ادھورا اقتباس دے کر میرے نظریے کو غلط پیش
کیا گیا۔ اور یہ ایک طرح سے تحریف ہے۔ ص ۹ پر میں نے لکھا تھا:

"رباعی کے آہنگ کی وجہ سے آخری رکن کے لیے
اہل فارس نے چار زحاف وضع کیے: ہتم، جبت، بتر
(یہ عربی کے بتر سے مختلف ہے) اور زلل۔ یہ چاروں رکن
مفاعیلن کے لیے ہیں۔

مزاحف پر زحاف نہیں لگتے۔ لیکن مجبوری تھی
اس وجہ سے کہ اصطلاحیں اور زحافات کے عمل کا نظام
تازی عروض سے لیا گیا تھا، اس لیے ان نئے زحافات
کا عمل بھی عربی زحافات کے عمل کی روشنی میں بیان
کیا گیا۔

ہتم: مفاعیلن آخری سبب خفیف کے ساقط ہونے اور
ماقبل کے سبب خفیف کے ساکن کے ساقط ہونے اور
متحرک کے ساکن ہونے سے مفاعْ رہ جاتا ہے، جسے
فعولْ سے بدل لیتے ہیں۔ اس کو حذف و قصر کا مرکب کہا گیا،
اس لیے کہ اہل عرب اس کے عمل کو سمجھ سکیں، اور وہ ایرانی
بھی جو تازی عروض پر کاربند تھے۔

جبت: مفاعیلن کے دونوں اسباب خفیف کے ساقط ہونے
کے بعد مَفَا رہ گیا۔ اسے فعَل سے بدل لیا۔ اس کو دوبارہ
حذف کا عمل بتایا گیا، یعنی یہ مزاحف اہل عرب کے لیے
محذوف محذوف کہا گیا۔ یہ ایرانیوں کے لیے بھی یہ
زیادہ قابل فہم تھا کیوں کہ انھوں نے عربی عروض اپنایا
تھا۔

زلل: ہتم کے ساتھ خرم کا عمل بھی شامل ہوا۔ فاعْ بچا۔
اہل عرب کے لیے یہ اخرم محذوف مقصور ہے۔ عربی
عروض اپنانے والے ایرانیوں کے لیے بھی۔

بتر: جبت کے ساتھ خرم کا عمل بھی شامل ہوا۔ فا بچا،
جسے فع سے بدل لیا۔ اہل عرب کے لیے یہ اخرم محذوف
محذوف تھا۔ اس وقت ایران کے عروضیوں کے لیے بھی
ان زحافات کی یہی تعریفیں اردو عروض کی کتابوں میں
نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔"

مجھ ننگ عروض نے نئی تعریفیں عروض اور آہنگ (ترقی اردو بیورو ایڈیشن)
میں تجویز کی ہیں جن کی وجہ سے ہتم و جبت بالترتیب محذوف مقصور
اور محذوف محذوف، مرکب زحاف نہیں، بلکہ مفرد زحاف ہو جاتے ہیں
اور اردو نظام عروض سے وہ بے ضابطگی دور ہو جاتی ہے، جو اہل عرب
کی تفہیم کے لیے اہل ایران نے روا رکھی تھیں تاکہ رباعی میں ضربوں
کے زحاف اور مزاحف سمجھ میں آ سکیں۔

رسالہ منتہی العروض (اترپردیش اردو اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۴ء)
میں بھی ان زحافات کی کم و بیش یہی تعریفیں ہیں۔

جناب ناز علامی اپنے اس مضمون میں ارشاد فرماتے ہیں: "حضرت کمال صدیقی
جو ایک عدد عروضی کتاب کے مصنف بھی ہیں۔۔۔" موصوف اچھی طرح جانتے
ہیں کہ ۱۹۴۸ء سے اب تک میری کتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔۔۔
موصوف یہ بات تو بخوبی جانتے ہیں کہ عروض کے موضوع پر میری دو
کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دونوں ۱۹۸۹ء میں: "آہنگ اور عروض"
ترقی اردو بیورو سے اور "عروض معروض" انجمن ترقی اردو ہند سے۔
پھر بھی "ایک عدد" لکھ کر تحقیر مقصود تھی۔

زارؔ علامی کے اس مضمون کا مقصد میری تحقیر اور اپنی تشہیر تھا۔ یہ دکھانا تھا کہ محقق طوسی سے لے کر اب تک جتنوں نے عروض پر لکھا ہے ان سے کم از کم رُباعی کے سلسلے میں صرف خطائیں سرزد ہوئی ہیں اور صرف سحرؔ عشق آبادی اور ان کے جانشین یعنی موصوف نے حکم معاقبہ اور مزاحف کے مقامات کو سمجھا ہے۔ اسی لیے سحرؔ نے رُباعی کا تیسرا رکن بھی مفاعلن رکھا اور موصوف نے صدر میں اشتر فاعلن رکھا۔ اور اس طرح رُباعی کے اوزان میں اضافے ہوئے۔ رودکی کے تئیں بھی زارؔ کا رویّہ تحقیر آمیز ہے، لکھتے ہیں:

"رودکی نے حشو اوّل میں معاقبہ کا عمل کیا مگر حشو ثانی میں اس عمل سے پرہیز کیا، جبکہ وہاں بھی اس عمل سے رُباعی کے کسی قانون میں کسی قسم کا خبط پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا سب سے پہلے استاذی حضرت علّامہ عشق آبادی نے اس جانب توجہ فرمائی، اور حشو دوم پر بھی حکم معاقبہ لاگو فرما کر اس مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کو دور کرتے ہوئے مندرجہ ذیل چار اوزانِ رُباعی ایجاد فرمائے۔"

جو شخص معاقبہ کے معنی تک سے واقف نہ ہو، وہ رودکی کے لیے "مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی" جیسے الفاظ استعمال کرے تو اسے کمال بے ادبی اور گستاخی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں، پیش رو عروضیوں کے لیے بھی زارؔ نے 'مسلماتِ فن' میں ص ۳۸ پر یہی الفاظ استعمال کیے ہیں:

"عروضیوں نے مکفوف ماقبل پر عملِ معاقبہ کیا ہے۔ یعنی مفاعیل اوّل کی جگہ رکن مفاعلن مقبوض لائے ہیں۔ لیکن مابعد مفاعیل کی جگہ مفاعلن رکھنے سے احتراز کیا ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں بیان کی، جب کہ مفاعلن اور مفاعیلُ عام زحافات سے ہیں۔ خاتم العروض حضرت علّامہ عشق آبادی ..... آنجہانی نے عروضیوں کی اس مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کو شدّت سے محسوس کیا، اور وہ رُباعی کے قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے، دو وزن اس طرح قائم کیے:

۱۔ مفعول مفاعیل مفاعلن فعل / فعول

۲۔ مفعول مفاعلن مفاعلن فعل / فعول"

معاقبہ کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مقبوض مفاعلن کی جگہ مکفوف مفاعیل اور مکفوف مفاعیل کی جگہ مقبوض مفاعلن رکھنا جائز ہے، یا مخبون مفاعلن (رجز میں) مطوی مفتعلن کی جگہ رکھنا معاقبہ ہے۔ معاقبہ کے حکم کے معنی یہ ہیں کہ دو متّصل اسبابِ خفیف رکن سالم میں ہوں، تو وہ ثابت تو رکھے جا سکتے ہیں لیکن دونوں ایک ساتھ گرائے نہیں جا سکتے۔ دونوں میں سے صرف ایک ہی گرایا جا سکتا ہے۔ معاقبہ ان بحروں میں ہے: ہزج، رمل، مجتث، منسرح، طویل، مدید، وافر (عصب کے بعد سبب ثقیل سبب خفیف ہو جاتا ہے)۔ کامل (اضمار کے بعد سبب ثقیل سبب خفیف ہو جاتا ہے) اور خفیف، دو ارکان کے ساتھ ہوں اور ایک کے آخر اور دوسرے کے شروع میں سبب خفیف پڑے اور معاقبہ ہو، یہ حکم وہاں بھی ہے۔

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو اگور کا قصہ سب دُہراتے آئے ہیں۔ انھوں نے بھی دہرایا۔ میں نے بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رُباعی کا آہنگ ایران میں موجود تھا۔ اور اسے عروضی اساس دینے کے لیے رکن آخر میں معاقبہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنا پڑی۔ یہ بات ناممکنات میں سے نہیں کہ ہزج میں اور پھر متقارب میں بھی آہنگوں کو عروض کے دائرے میں لانے کے لیے خرم، جو صدر و مطلع سے مخصوص تھا، عام زحاف کیا گیا۔ خرم کا عمل ہزج میں یہی نام رکھتا ہے۔ متقارب میں ثلم اور وافر میں عضب ہے۔ ہزج میں خرم مرکب خرب اور شتر زحافوں کا حصہ ہے اور متقارب میں خرم بھی ثرم کے عمل کا ایک جزو اپنے اندر رکھتا ہے۔

زارؔ صاحب ان نکتوں پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔

الف۔ ہزج میں صدر و مطلع اخرب کے بعد مفاعلن رُباعی کے علاوہ صرف دو آہنگوں میں ہے۔

۱۔ مفعول مفاعلن فعولن / فعولان (۲ بار)

۲۔ مفعول مفاعلن مفاعلن

۳۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن / مفاعیلان (۲ بار)

۴۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن / فع / فاع "

اور یہ آہنگ رباعی سے بہت قریب کے ہیں اور ان میں تخنیق اسی طرح روا اور رائج ہے۔

ب۔ صدر و مطلع اخرب کے مفاعیل کے ساتھ یہ آہنگ ہیں۔

۱۔ مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیلن مفاعیلان
۲۔ مفعول مفاعیلن مفاعیلان
۳۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن فعولان
۴۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعل فعول
۵۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فاعیلن
۶۔ مفعول مفاعیل فعولن فعولان
۷۔ مفعول مفاعیل فعل فعول
۸۔ مفعول مفاعیلن مفعول فعولن فعل

ان آہنگوں میں بھی حقیقت کے ویسے ہی امکانات ہیں لیکن تازہ ہی اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مفعول مفاعیلن مفاعیلان کا آہنگ ۸ نثر میں موجود ہے۔ اسی کو فراق صاحب نے اور حافظ اور دوسرے شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ آہنگ ۱ کو حشوین سے دونوں مفاعیل مفاعیلن مفعول بنانے کی کاریگری اپنے لیے چنداں قدرت نہیں۔ آہنگ ۲ کو چھوڑ کر باقی سب رباعی کے آہنگ سے قریب ہیں اور آہنگ ۶ اور ۸ رباعی ہی کا آہنگ ہے۔

رودکی کے زمانے میں تسکین و تخنیق کا زحاف تھا ہی نہیں۔ نثار صاحب نے جو یہ رودکی سے رباعی کی چوبیس ترتیبیں تخنیق سے وضع کرائی ہیں، کیا اس کے لیے وہ کوئی معتبر شہادت، دستاویزی شہادت پیش کر سکتے ہیں؟ کتابیں پڑھنا ان کی کمزوری نہیں۔ جو مقدمہ انھوں نے قائم کیا ہے، شاید اس کے لیے کوئی شہادت تلاش کرنے کے لیے کچھ پڑھیں۔ یہ اتنی بڑی بات جو انھوں نے لکھ دی ہے، تو اپنے ماخذ کی نشان دہی کریں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اسے تو انھوں نے میری قیاس آرائی قرار دیا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا وہ حقیقت آرائی ہے؟ میں عروض کے ایک طالب علم کی حیثیت سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنا ماخذ عام کریں تاکہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

رباعی کی ابتدا کے بارے میں صرف اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ ٹھوس شہادتیں قریب قریب مفقود ہیں، اس لیے قیاس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن اتنی بات بڑی حد تک قابلِ قبول ہے کہ اس عہد کی شاعری میں، خاص طور سے ہزج میں مفاعیلن، مفاعیل اور مفاعلن کا خلط روا تھا، اور یہ عربی شاعری اور عروض کے اثر سے تھا۔ صدر و ابتدا میں سے ایک رکن سالم (موفور) اور دوسرا اخرم (مفعولن) بھی روا تھا۔ لیکن صدر و مطلع میں اخرم اور اشتر کا خلط نہیں ہوا۔ رباعی کی ابتدا کے بارے میں جو تصور اس وقت رائج ہیں، ان میں شاید بنیادی تبدیلی کرنا ہے۔ علی حیدر نظم طباطبائی جید عالم تھے۔ عربی اور فارسی پر واقعی عبور رکھتے تھے اور اہلِ زبان کی طرح نہ صرف ان زبانوں سے آشنا تھے بلکہ لکھتے بھی تھے۔ عربی شاعری کے سارے ذخیرے کو کھنگالے ہوئے تھے اور خرم کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے[۸] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر عروض میں صاحب معیار الاشعار کی نظر سے گہری تھی اور انھوں نے معیار الاشعار میں پیش کیے گئے نظریوں پر تنقید کی ہے۔

طباطبائی رباعی کا بنیادی وزن مفعول مفاعیل مفاعیل فعل، فعول نہیں مانتے۔ اسے وہ الحاقی وزن کہتے ہیں۔ اصل وزن ان کے نزدیک مفعول مفاعلن مفاعیل فعل، فعول ہے[۹]

ان کے الفاظ میں ہے:

"مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول ایک ہزج کا وزن ہے کہ وہ مفعول مفاعلن مفاعیل فعول سے بہت شباہت رکھتا ہے یعنی دوسرے رکن میں ایک جگہ علن ہے اور دوسری جگہ عیلُ ہے۔ اسی شباہت کے سبب سے شعرا نے ان دونوں میں کچھ امتیاز نہیں کیا۔ دونوں کو ایک ہی سمجھا اور اس سبب سے کہ اس میں تین جگہ تین متحرک جمع ہیں، اس الحاقی وزن سے انھیں دونوں قاعدوں کے بموجب ۱۲ وزن اور نکلے .... عروضیوں نے یہ بیکار ۲۴ وزن گنواتے ہیں، اور ایک شجرہ مفعول کا اور ایک مفعولن کا فضول بنایا۔ مگر کسی بزرگ نے یہ نہ بتایا کہ ان اوزان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ ایک وزن اصلی اور ایک وزن الحاقی ہے اور اسی سے یہ ۲۴ وزن تخنیق اور ساکن دوم کے گرنے سے نکلے ہیں۔"

سحر عشق آبادی، طباطبائی کے نظریے سے واقف نہیں تھے۔ ان کے جانشین زار علامی بھی، اور زار کے حاشیہ نشین عنوان چشتی بھی اس سے واقف نہیں کہ طباطبائی کے خیالات کیا تھے۔ بظاہر ان اقتباسات سے ان تینوں کی بعض تحریروں کی مطابقت ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے کیوں کہ یہ حضرات صدر اور ضرب کے درمیان مفاعیل مفاعیل کو بنیادی وزن بتاتے ہیں۔ حکم معاقبہ کے جو مطلب ہیں، اس کا یہ تینوں حضرات بہرہ نہیں رکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صدر کے بعد مفاعیل کی جگہ مفاعلن حکم معاقبہ کے تحت رکھا گیا۔

طباطبائی نے جو بات کہی ہے وہ سنجیدہ فکر، توجہ اور تحقیق کی متقاضی ہے۔ تحقیق کے لیے یہ ایک نئی راہ کھولتی ہے۔ جب تک تحقیق نہ کی جائے، اسے بھی مصدقہ حقیقت نہیں مانا جا سکتا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ سحر نے حشو دوم پر حکم معاقبہ لاگو فرما کر اس مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کو دور کیا اور مفاعیل کی جگہ مفاعلن رکھا۔ — تو ایسی غیر علمی بات صرف ایسے عروض ناشناس کے قلم سے ہی نکل سکتی ہے، جس نے رودکی سے عرفی تک کے کلام پر سرسری نظر بھی نہ ڈالی ہو۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، معاقبہ وہ نہیں ہے جو زار اور ہیچمدان قسم کے عروض نویس اپنی کتابوں اور مضامین میں بتاتے ہیں۔ زار ان نکتوں پر غور فرمائیں اور روشنی ڈالیں:

(۱) رباعی جب صنف کی حیثیت سے وجود میں آئی تو جسے ہم آج مصرع کہتے ہیں وہ معقد بیت تھی۔ معقّد بیت اگر چار ارکان پر مشتمل ہو تو ضرب سے پہلے جو رکن ہے وہ دوسرا حشو نہیں، ابتدا یا مطلع کہلاتا ہے۔ رباعی میں کوئی حشو ہوتا ہی نہیں۔ جو چار ارکان ہیں، وہ ہیں: صدر، عروض، مطلع اور ضرب۔ انھیں رکن اوّل، رکن دوم، رکن سوم اور رکن چہارم تو کہہ سکتے ہیں — لیکن اگر کوئی شخص رکن سوم کو حشو دوم کہے تو وہ عروضی تو کیا، عروض سے ناآشنائے محض بھی مشکل سے کہا جا سکے گا۔

اس بات کے امکان بھی قوی ہیں کہ صنف کی حیثیت سے رباعی کے وجود میں آنے سے پہلے نہ صرف ایران کے لوک گیتوں میں یہ آہنگ رہا ہو، بلکہ شعراء نے ان آہنگوں میں طبع آزمائی بھی کی ہو۔

عربی میں رجز مشطور اور معقد بیتوں کا رواج تھا۔ صاحب معیار الاشعار کا خیال ہے کہ اسی وضع پر اہل فارس نے ہزج میں معقد بیتیں مربع، یعنی چار ارکان کی کہیں جن میں عروض ناپدید تھا۔ کچھ مصرع اولی میں شامل، اور کچھ مصرع ثانی میں داخل۔ جن چار معقد بیتوں کی مثالیں دی ہیں، وہ مارچ ۱۹۹۲ء کے ایوانِ اردو میں چھپے مضمون (عروض معروض: رباعی) میں نقل کر دی گئی ہیں۔ قارئین کی آسانی کے لیے دوبارہ نقل کی جاتی ہیں:[۱۱]

"کث: جائیکہ عروض پدید نبود و ضرب اثلم یعنی فعول برینگونہ شعر:

یکبارہ چنیں جاہل و خونخوارہ مباش

کا: عروض ہماں و ضرب مجبوب برینگونہ بیت:

دانی کہ دل از تو نشود سیر مرا

کب: عروض ہمچناں و ضرب فاع و ماقبلش سالم برینگونہ بیت:

مشتاب برفتن صنما لختے باش

کج: عروض ہمچناں و ضرب نع برینگونہ بیت:

دانی کہ دلم از سر تو کے گردد

و ایں ہمہ چہار یک وزن است، بروزن یک مصراع ترانہ پس بحقیقت اوزان مربعات چہار است و آنچہ ازیں و زنہا مانند یک مصراع مثمن ست...."

اب تقطیع بھی ان چار شعروں کی (چار مصرعوں کی نہیں) دیکھ لیں:

۱۔ یکبار (مفعول) چنیں جاہ (مفاعیل) ل خونخوار (مفاعیل) مباش (فعول)

ملاحظہ فرمایا، جاہل کا جاہ عروض میں ہے اور ل ابتدا میں۔ اسی کو معقد بیت کہتے ہیں۔

۲۔ دانی کہ (مفعول) دلز تو ن (مفاعیل) شود سیر (مفاعیل) مرا (فعل)۔

نشود کا نون عروض کا حصہ ہے اور شود ابتدا میں ہے۔ یہ معقد بیت ہے۔

۳۔ مشتاب (مفعول) برفتن ص (مفاعیل) نما لختے (مفاعیلن) باش (فاع)

مفاعلن کے بعد پر [illegible] ختم ہوتا ہے اور تمامت ابتدا کا آغاز ہوتا ہے۔

[illegible] مفعول [illegible] مفاعیل) تو [illegible] مفاعیلن،

[illegible]

[illegible] کا آہنگ [illegible] مقصد بیت [illegible]

[illegible] مفاعیل [illegible] مفاعیلن

[illegible] ہوتے ہیں اور [illegible] بھی [illegible] سے [illegible]

سے مفاعیلن [illegible] فعل [illegible] مفاعیلن

[illegible] حاصل ہوتے

[illegible] ہزار سال سے [illegible] بعد تک رباعیوں کی چاروں مصرعیں عروض

تو ایک ہی تھے۔ مقصد [illegible] ہونے کی وجہ سے مقفی ہوتے تھے خواہ

رباعیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب رباعی چار بیتی ہوئی کوئی

سانحہ بلکہ [illegible] نے فاش کیں۔ رباعی کے آغاز کے بارے میں

[illegible] بھی [illegible] حاصل کی ہو ایسی غیر عالمانہ اور غیر عاقلانہ بات نہیں

البتہ [illegible] رودکی نے رباعی کے شعر اول میں معاقبہ کا عمل کیا، مگر شعر

ثانی میں اس سے پرہیز کیا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، رباعی چار عنصر

شعروں کا مجموعہ تھی۔ مفرد شعر میں حشو ہوتا ہی نہیں، اگر وہ چار ارکان پر مشتمل ہو یعنی مربع ہو۔ رودکی پر مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کا الزام لگانا حماقت ہے۔ مفاعلن کی جگہ مفاعیل یا مفاعیل کی جگہ مفاعلن رکھنا معاقبہ نہیں ہے۔ اسے ارکان کا خلط کہتے ہیں معاقبہ نہیں۔ زار علامی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں تو وہ اپنا اخذ دکھائیں۔ !

اب آیئے، دو باتیں دوبارہ مفاعلن یا مفاعیل مفاعلن نہ رکھنے کے بارے میں ہو جائیں:

(۱) رباعی جب صنف کی حیثیت سے فارسی میں ارتقا پذیر ہوئی، تو اس وقت تک فارسی عروض کے قاعدے منضبط نہیں ہوئے تھے فارسی شعرا نے عربی عروض ہی کی پابندی کی۔

(۲) عربی میں ہزج مربع تھی، مسدس کے لیے ہزج نہیں بلکہ وافر کا استعمال کرتے تھے۔ مفاعلتن کا معصوب مفاعیلن ہے۔ مفاعیلن کے ساتھ مفاعلتن کا خلط بھی جائز ہے لازمی نہیں ہے۔[۱۳]

(۳) جب رباعی ارتقا پذیر ہو رہی تھی تو فارسی شعرا نے ہزج مربع اور

مثمن کے بجائے مُربع مضاعف استعمال کی۔

(۴) مقالات طباطبائی اس وقت فراہم نہیں ہیں۔ ذہن میں یہ بات ہے کہ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اہل عرب مفاعیلن اور مفاعیل کو سالم جز میں روا رکھتے تھے لیکن یہ بات بھی انھوں نے شاید لکھی تھی کہ اردو والوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خلط کریں اگر مفاعیلن کہیں رکھا ہے تو اسی کو قائم رکھیں اور دوسرے مصرعوں میں مفاعیل نہ لائیں۔ اسی طرح مفاعیل رکھا ہے تو اسے مفاعیلن سے نہ بدلیں۔ اگر میری یادداشت نے مجھے دھوکا دیا ہے تو میں پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ علمی بحث ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ قارئین اس بیان کو مقالات طباطبائی سے ملائیں۔ اگر درست پائیں تو قبول کریں، ورنہ مسترد کریں۔ اگر یہ درست نہیں ہے اور آپ میں سے کوئی اس عبارت کی فوٹو کاپی مجھے بھیجے تو شکر گزار رہوں گا۔

یہ یقیناً تحقیق نہیں ہے قیاس ہے جو درست بھی ہو سکتا ہے۔ ہزج مثمن کا ایک وزن تھا: مفاعیلُ مفاعیلُ ہے مفاعیلُ مفاعیلُ۔ مثال یہ شعر ہے:

بدستان دل من برد یکے ترک پری زاد

ایک اور وزن تھا مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن۔ مثال یہ شعر ہے:

آں چشم سیہ مست آں کاکل خم دار

مفاعیلُ مکفوف ہے اور صدر و مطلع میں جو آتا ہے کہ کف عام زحاف ہے۔ اگر مفاعیلن پر خرم اور کف دونوں کا عمل ہو تو مفعولُ حاصل ہوتا ہے۔ اخرم مکفوف جو موسوم بہ اخرب ہے۔

اخرب صدر پہلے مصرع میں اور مکفوف ابتدا دوسرے مصرع میں رکھنے سے حاصل ہوا: مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیل۔ مفاعیل لام ساکن سے مقصور ہے۔ اگر عروض میں لام متحرک ہو تو یہ رکن مقصور کے بجائے مکفوف ہو جاتا ہے۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ۔

ایران کے ایک ترانے کا آہنگ لوک سنگیت میں رائج ہوگا جو اس وزن کی ضربوں کو مفا اور مفاع (فعل اور فعول) کرنے سے حاصل ہوتا ہوگا۔ چنانچہ مفاعیلن پر دوبارہ حذف کے عمل سے مفا اور حذف و قصر سے مفاع حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ایک بار پھر عرض کر دیا جائے کہ یہ تحقیق نہیں ہے — ایک قیاس ہے اور اس زاویے سے بھی تحقیق ہو سکتی ہے

یہاں، اس مقام پر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ایک اصطلاح عروض میں موفور بھی ہے۔ وہ رکن جس میں خرم کیا جا سکے اور خرم سے محفوظ رہے، اسے موفور کہتے ہیں۔ مفاعیل میں صرف کف کی کارروائی مفاعیلن پر ہوئی۔ ساتھ میں خرم کی بھی ہو سکتی تھی۔ مفعول کے مقابل مفاعیل موفور ہے۔

جن لوگوں نے عروض کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ صنف رباعی کے وجود میں آنے کا جو عہد تھا، اس میں بحر میں صدر و مطلع کے زحافات خاص طور سے وتد مجموع سے شروع ہونے والی بحروں میں مقرر تھے۔ ان کے متبادل بہت محدود تھے۔ مثلاً رمل سالم میں فاعلاتن کے علاوہ کوئی اور رکن نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن رمل مخبون میں فعلاتن کے بجائے فاعلاتن بھی لایا جا سکتا تھا۔ جن بحور مرکبہ میں مخبون فعلاتن پہلا رکن تھا، ان میں بھی اس کی اجازت عام طور سے تھی رجز مطوی میں مفتعلن کی جگہ مخبون اور رکن سالم مستفعلن لانے کی چھوٹ تھی لیکن بے آہنگی کے احساس سے بچنے کے لیے اس کا فائدہ کم ہی اٹھایا گیا سب بحروں کی بات کریں تو ایک دفتر کھل جائے گا۔ اس لیے آیئے صرف ہزج پر گفتگو ہو۔ صدر و ابتدا میں رکن سالم ہو تو مفاعیلن کی جگہ اخرم مفعولن لانے کی اجازت تھی۔ لیکن حافظ کے یہاں ہمیں ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ فارسی کا مزاج ہند ایرانی زبان ہونے کی وجہ سے سامی زبان عربی سے مختلف تھا اور ہے۔ اسی طرح صدر میں مفاعیل کے بدلے اخرب (اخرم مکفوف) لانے کی بھی اجازت تھی۔ حشو اعشوین میں مفاعیل کی جگہ مفاعیلن لایا جا سکتا تھا۔ البتہ عروض میں ضرب میں مفاعیلن، مفاعلن مفاعیلُ (فعولان) اور فعولن (بالترتیب سالم، مقبوض، مقصور اور محذوف) کا خلط روا تھا۔ ہزج میں بھی اور بحر طویل میں بھی۔ لیکن ایسا صرف عربی شاعری میں ہوا۔ تلخیص عروض وقافیہ میں کچھ اشارے طباطبائی نے ص ۹۶ پر کیے ہیں اور اہل عرب کی ہزج کے مزاحف آہنگ کے بارے میں زرکامل عیار ترجمہ معیار الاشعار میں خواجہ محقق طوسی سے یہ عبارت منسوب ہے:

"دیگر ارکان بطریق زحاف مقبوض و مکفوف بکار دارند
و خلط کنند، و عروض ہم مکفوف و مقبوض استعمال کنند
و میان یا دونون معاقبہ باشد، و صدر اخرم و اشتر و اخرب
بکار دارند"

مطلب یہ ہے کہ (عروض و ضرب کے علاوہ) مقبوض مفاعلن اور مکفوف مفاعیل استعمال کرتے ہیں اور ان کا خلط درج کرتے ہیں (اور صرف) عروض مقبوض مفاعلن یا مکفوف مفاعیل ہوتا ہے۔ واضح ہے ضرب میں مقبوض نہیں ہوتا اور صدر اخرم (مفعولن) اشتر (فاعلن) یا اخرب (مفعول) ہوتا ہے۔ شاید یہاں کچھ عبارت لکھنے سے رہ گئی ہے۔ صدر ہی کے ارکان مطلع کے بھی ہوں گے۔

ہزج فارسی میں، معیار الاشعار میں، مقبوض اور مکفوف کے خلط کے بارے میں کچھ نہیں ہے، صرف وہ اوزان بعد میں ہیں جو پہلے مثالوں کے ساتھ نقل کیے جا چکے ہیں۔

اس زمانے میں عربی عروض کی گرفت فارسی شعرا پر بہت سخت تھی اور پھر رُباعی کا آہنگ اغلب ہے کہ لوک گیتوں اور لوک سنگیت میں رہا ہوگا۔ ہزج مربع مکفوف اخرم / مجبوب کی ترتیب اُبھر کر سامنے آئی۔ صدر میں کف کے ساتھ ساتھ خرم بھی ہوا اور عروض میں مقبوض مفاعلن کا خلط بھی ہوا۔

مفعولن اور فاعلن (اخرم اور اشتر) مزاحف صدر میں رکھ کر بھی شعر کہے گئے ہوں گے۔ لیکن فاعلن مفاعیلن کے علاوہ کوئی آہنگ اتنی لمبی عمر نہ پا سکا کہ تاریخ ادبِ فارسی میں اس کا ذکر ہوتا۔ متاخرین ہی نہیں متوسطین کے یہاں بھی صدر و ابتدا میں اشتر فاعلن کے ساتھ کوئی اور آہنگ نہیں ملتا۔ فاعلن مفاعلن اور صرف مفاعلن کی تکرار کا آہنگ بھی زیادہ استعمال نہیں ہوا۔

رباعی چار مربع شعر تھے، اس لیے یہ بات سمجھ میں آنا چاہیے کہ مفاعیل اور مفاعلن میں سے کوئی بھی حشو نہیں ہے۔ یہ جو سحر عشق آبادی، زار علامی اور ان کے حاشیہ نشینوں نے رودکی پر "مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی" کا الزام لگایا ہے کہ اس نے دوسرے حشو میں مفاعلن نہیں رکھا، تو یہ ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے کیونکہ رودکی کے عہد میں رباعی میں نہ پہلا حشو تھا اور نہ دوسرا حشو۔

اگر رودکی اور قطان پر بار بار بہتان لگانے والوں میں عزتِ نفس ہے تو اپنی غلطی کا اعتراف کر کے عروض کے طالب علموں کا اعتبار حاصل کریں۔

[illegible] رباعی کے اوزان تسکین اوسط [illegible]
[illegible]
[illegible] خوش نویسی [illegible]

"چوں کہ ہم فن کتابت سے بالکل بے بہرہ ہیں لہٰذا فن کتابت اور خوشنویسی سے متعلق تمام خامیوں کے لیے ماہرین فن سے معذرت خواہ ہیں ۔ ہمارے بچوں کی بھی یہ خواہش تھی کہ ہم یہ کتاب اپنے ہی قلم سے لکھیں ۔"

فن کتابت کے بعد فن عروض کا بھی اضافہ کر دیتے تو نہایت مناسب بات ہوتی ۔ صرف دو اقتباسات 'مسلمات فن' سے :

۱۔ " رودکی کے زمانے میں چوں کہ زحاف 'تسکین' منصۂ شہود پر تھا ہی نہیں لہٰذا اس وزن کے قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یاد رہے کہ زحاف تسکین رودکی کے بعد کی ایجاد ہے ۔"

(ص ۴۷ سطر ۷-۱۰)

۲۔ " چوں کہ رودکی کے زمانے میں زحاف 'تخنیق' موجود تھا لہٰذا اس نے اس وزن کے بطن سے بذریعہ تخنیق دیگر اوزان رباعی حاصل کیے ۔ "

(ص ۵۰ سطر ۲۳-۲۴)

کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ص۴۷ پر ایک بیان اور ص۵۰ پر متضاد بیان!

قاعدے سے ان معروضات کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ یہ نقطۂ عروج ہے لیکن بعض اوقات زندگی میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جن میں ایک نہیں کئی کلائمکس ہوتے ہیں اور دو کلائمکس کے درمیان ایک اینٹی کلائمکس بھی ہوتا ہے ۔ ایسی ہی کچھ بات یہاں بھی آن پڑی ہے ۔ مثلاً :

معاقبہ کی غلط تعریف ' عطائی کی نان خطائی کی طرح ' کچھ اس طرح موصوف کے ذہن میں سرایت کر گئی ہے کہ کہنہ مرض کی طرح موقع پاتے ہی ان کے ذہن کو دبوچ لیتی ہے اور ان کا قلم حرکت میں آجاتا ہے لکھتے ہیں :

" یہی صدر و ابتدا میں فاعلن ٹھونکنے کی بات .... میں زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف یہ عرض کروں گا کہ صدر و ابتدا میں رکن اخرب (مفعول) اور رکن اشتر (فاعلن) باجماع ازروئے معاقبہ نمد فی صدا اس لیے درست ہے کہ رکن مکفوف (مفاعیل) اور رکن مقبوض (مفاعلن) ازروئے حکم معاقبہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں ۔ زحاف شتر = خرم + قبض ہے اور زحاف خرب = خرم + کف ہے جب رکن مقبوض مفاعلن اور رکن مکفوف مفاعیل پر حکم معاقبہ لاگو ہو سکتا ہے تو رکن اشتر اور رکن اخرب پر بھی حکم معاقبہ لاگو ہونے میں کسی قسم کی قباحت نہیں لہٰذا رباعی کے جواز ان فاعلن / اشتر کو صدر و ابتدا میں رکھ کر حاصل کیے گئے ہیں وہ آئین عروض کے عین مطابق ہیں ۔"

یہ بار بار صدر و ابتدا کی بات رباعی کے سلسلے میں فاضل نراز موصوف نے جو کی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عروض سے ان کی آشنائی تو کیا ، شناسائی بھی نہیں ہے ۔

۱۔ معاقبہ وہ نہیں ہے جو موصوف سمجھتے ہیں ۔ کیا وہ کوئی سند ، کوئی نظیر پیش کریں گے ۔ ان کی ، ان کے اساتذہ اور ہم جو قسم کے نوکاؤ نام نہاد عروض نویسوں کے حوالے دینے کی زحمت نہ فرمائیں ۔

۲۔ موصوف صاف اور واضح الفاظ میں بتائیں کہ جب فارسی میں رباعی کی صنف وجود میں آئی ، تو جسے آج مصرع کہتے ہیں وہ معقد شعر تھا یا نہیں ؟

۳۔ بقول موصوف کے حکم معاقبہ کے تحت (معاقبہ کا وہ تصور نہیں جو عروض میں ہے بلکہ جو تصور موصوف اور ان کے ہمنواؤں کے ذہنوں میں ہے) اگر صدر و ابتدا میں اخرب مفعول اور اشتر فاعلن کا غلط جائز ہے تو فارسی اور اردو کے مستند اساتذہ مثلاً خاقانی ، سعدی ، امیر خسرو ، کمال اسمٰعیل ، خواجہ ، فیضی ، ناصر خسرو ، قرۃ العین طاہرہ ، عرفی ، نظیری ، قاآنی ، بیدل ، حزیں ، کلیم ، غالب وغیرہ

کے کلام سے کچھ نظیریں پیش فرمانے کی زحمت کریں۔

۴۔ اس بات سے بھی آگاہ فرمائیں کہ جب رُباعی کی صنف وجود میں آئی، اس وقت تسکین اوسط کا زحاف نہیں تھا، اس لیے تخنیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس عہد میں فاعلن اگر حشو میں آتا تھا تو اس کو اشتر نہیں تو اور کیا کہہ سکتے تھے؟ مفعولن کو اخرم، مفعول کو اخرب اور مفاعیلن کو رکنِ سالم نہیں تو اور کیا کہتے تھے۔؟ فعل، فعول، فع، اور فاع زحاف صرف رُباعی کی ضربوں کے لئے تراشے گئے۔ فعل اور فعول کے نام کو آپ اور آپ کے ہمنوا تسلیم کرتے ہیں لیکن فع اور فاع کو صرف ان کے مخنق ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ جب تخنیق تھی ہی نہیں تو ان کو ابتر اور ازل نہیں تو پھر کیا کہتے تھے۔ ہزج میں حکم معاقبہ کا ہے۔ یعنی سببین کے دونوں ساکن ثابت تو رکھے جا سکتے ہیں، دونوں ایک ساتھ ساقط نہیں کیے جا سکتے۔ ایک کا باقی رکھنا لازمی ہے۔ صرف رُباعی کی ضربوں کے لیے فعل، فعول، فع اور فاع مزاحف تراشے گئے ہیں، صرف رُباعی کی ضربوں کو معاقبے سے چھوٹ دی گئی۔ اگر فع اور فاع اس وقت آزادانہ طور پر رُباعی کی ضربوں کے لیے نہیں تھے تو یہ تراشے کیوں گئے؟

زار علامی نے ایک طرف رودکی پر اوزان رُباعی کے سلسلے میں مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کا اتہام لگایا ہے اور دوسری طرف اسی مضمون میں یہ عالمانہ انکشاف بھی فرمایا ہے کہ ان دو بنیادی اوزان (۱) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل / فعول، (۲) مفعول، مفاعلن مفاعیل فعل / فعول سے رباعی ۲۴ ترتیبیں تخنیق سے ایجاد کرادی ہیں۔

موصوف نے اتنا بڑا تحقیقی کارنامہ، رودکی کی رباعیوں پر ایک نظر ڈالے بغیر، انجام دے دیا۔ شعر العجم کی پہلی جلد میں ۲۰ رودکی کا بیان چند صفحات پر ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر رُباعی صرف ایک ہے۔ ۲۱

چوں کارِ دلم زلفِ او ماند کرد   در برگ جاں صد آرزو ماند کرد
امید زگریہ بود افسوس افسوس   کانہم شبِ وصل در گلو ماند کرد

شبلی نعمانی کے عالم ہونے میں کیا شک ہے۔ لیکن انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے کہ دیوان رودکی کا کون سا نسخہ ان کے سامنے تھا رودکی کا بیان اتنا مختصر ہے کہ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ رودکی کا سارا کلام ان کی نظروں سے نہیں گزرا تھا ورنہ سعدی، خسرو، حافظ، فیضی ہی نہیں کمال اسمٰعیل، خواجہ فرید عطار اور خاجو کرمانی وغیرہ کے بارے میں بھی انھوں نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ رودکی کے ترجمے میں مثالیں دال میں کیا آٹے میں نمک سے بھی کم ہیں اور سارا بیان پڑھنے کے بعد ذہن میں صرف ایک نکتہ سرایت کرتا ہے کہ رودکی مادر زاد نابینا تھا، یونانی شاعر ہومر کی طرح۔ یہ بھی کچھ بہت مفید معلومات نہیں کیوں کہ رودکی پر تحقیق کرنے والوں نے اندرونی شہادتوں سے یہ استخراج کیا ہے کہ وہ نابینا نہیں تھا۔ اگر شبلی نعمانی نے رودکی کا سارا کلام پڑھا ہوتا، تو شاید وہ بھی اسی نتیجے پر پہونچتے۔

"فرہنگ ادبیاتِ فارسی و دری" (زہرائے خانلری) سے اقتباس لائقِ توجہ ہے: ۱۸

"ابو عبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے نزدیک قریۂ رودک میں پیدا ہوا۔ بعض اسے مادر زاد اندھا بتلاتے ہیں، لیکن اس کے بعض اشعار اسے بینا ثابت کرتے ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں اس نے قرآن حفظ کر لیا تھا، خوش آواز اور بربط بجانے کا ماہر تھا۔ امیر نصر سامانی اور صفاری حکمران اور امرا، اس کے سرپرست تھے۔ اس نے "کلیلہ و دمنہ" ۱۹ نظم کیا تھا۔ رودکی نے ایک لاکھ کے قریب شعر کہے، جن میں سے بہت تھوڑے باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے موجودہ دیوان میں غلطی سے قطران کے قطعات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ رودکی: وفات ۳۲۹ ہجری / قطران وفات ۴۶۵ ہجری۔۔۔۔"

تہران میں چھپے ہوئے دیوانِ رودکی میں رباعی کا متن اس سے قدرے مختلف ہے جو شبلی نعمانی نے شعر العجم میں درج کیا ہے۔ ص ۱۱۴ پر متن یہ ہے:

چوں کار دلم زلفِ او ماندہ گرہ   در ہر رگِ جاں صد آرزو ماندہ گرہ

ایں گریہ بود و افسوس افسوس — کاں ہم شب وصل در گلو ماندہ گرہ

ارکان درج ذیل ہیں۔

مفعول مفاعلن مفاعیلُ فعل — مفعول مفاعلن مفاعیلُ فعل

مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع — مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

شبلی نے جو متن شعر العجم میں دیا ہے اس کی قرأت مختلف ہے اور ارکان بھی مختلف ہیں

مفعول مفاعیلن مفعولن فاع — مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع — مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

اختلاف نسخ کی وجہ سے ارکان میں کیا فرق ہے۔ شعر العجم میں درج متن کے لیے چوں کہ کسی معروف نسخے کا حوالہ نہیں ہے اس لیے مدوّن نسخے کا متن مرجح ہے۔

اب باقی پانچ رباعیوں کے ارکان۔ لیکن پہلے یہ عرض کر دیا جائے کہ ایک عالم اور محقق اور فارسی کے ایک استاد کی حیثیت سے پروفیسر نیّر مسعود نے مختلف مقامات پر ابراہیم بن علی آملی کے مطبوعہ نسخے میں جن تبدیلیوں کو قابلِ غور رکھا ہے میری نظر میں وہ صائب ہیں اور ذیل میں وہی متن ہے :

با آنکہ دلم از غم ہجرت خون است — مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع

شادی بغم توام ز غم افزون است — مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فاع

اندیشہ کنم ہر شب و گویم یارب — مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع

ہجرانش چنیں است و صالش چون است — مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع

ص ۱۰۸

چشم ز غمت بہر عقیقے کہ بسفت — مفعولُ مفاعیل مفاعیل فعُول

بر چہرہ ہزار گلُ ز رازم[۲۰] شگفت — مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعولُ

رازے[۲۲] کہ دلم ز جاں ہمی داشت نہفت — ایضاً

اشکم بزبانِ حال با خلق بگفت — ایضاً

ص ۱۰۹ - ۱۰۸

ہاں تشنہ جگر مجوی زیں باغِ ثمر — مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعَل

بیدستانیست[۲۳] ایں ریاض بدو در — مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعَل

بیہودہ مماں کہ باغبانت بقضاست — مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول

چوں خاک نشستہ گیر چوں باد گذر — مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

ص ۱۰۹

چوں تشنہ بیتم[۲۴] ام و لب کردہ فراز — مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول

در جان تہی قالب فرسودہ باز — مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول

بر بالینم نشستہ میگوی نیاز — مفعولُ فاعلن مفاعیلُ فعول

کی کشتہ ترا من و پشیماں شدہ باز — مفعول مفاعلن مفاعیلُ فعول[۲۵]

ص ۱۱۰

اے از گل سرخ رنگ بربودہ و بو — مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

رنگ از پی رو ربودہ بو از پی مو — ایضاً

گلگوں گردد چو روی شوئی ہمہ جو — مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعل

مشکیں گردد چو موفشانی ہمہ کو — ایضاً

ص ۱۱۴

رودکی کی جو بھی رباعیاں امتداد زمانہ سے بچیں اور ہم تک پہونچیں اور اوپر درج کی گئیں، ان میں ارکان کی یہ ترتیبیں ہیں :

۱۔ مفعولُ مفاعیل مفاعیل فعل / فعول
۲۔ مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعل / فعول
۳۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع / فع
۴۔ مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فاع
۵۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فعل / فعول

کل نو ترتیبیں رودکی نے رباعی میں استعمال کی ہیں۔ نار علامی اور ان کے استاد کا یہ کہنا کہ رودکی نے دو بنیادی ترتیبوں سے (جن میں فعل اور فعول کا خلط تھا۔ یعنی چار ترتیبوں سے) ۲۴ اوزان رباعی کے وضع کیے خلاف واقعہ ہے۔ انھوں نے چوں کہ دعویٰ کیا ہے اس لیے دلیل کے طور پر نظیریں پیش کرنا ان پر واجب ہے۔

اجازت لینے سے پہلے ایک بار پھر میں پروفیسر نیر مسعود کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے رودکی کی ساری رباعیوں کی نقل فراہم کی اور میں یہ معروضات پیش کر سکا۔

□□

حواشی :

[۱] مراجعہ سہو کتابت سے چھوٹ گیا ہے۔


का
उद्घाटन
माननीया सुश्री मायावती
मुख्यमंत्री, उत्तर प्रदेश

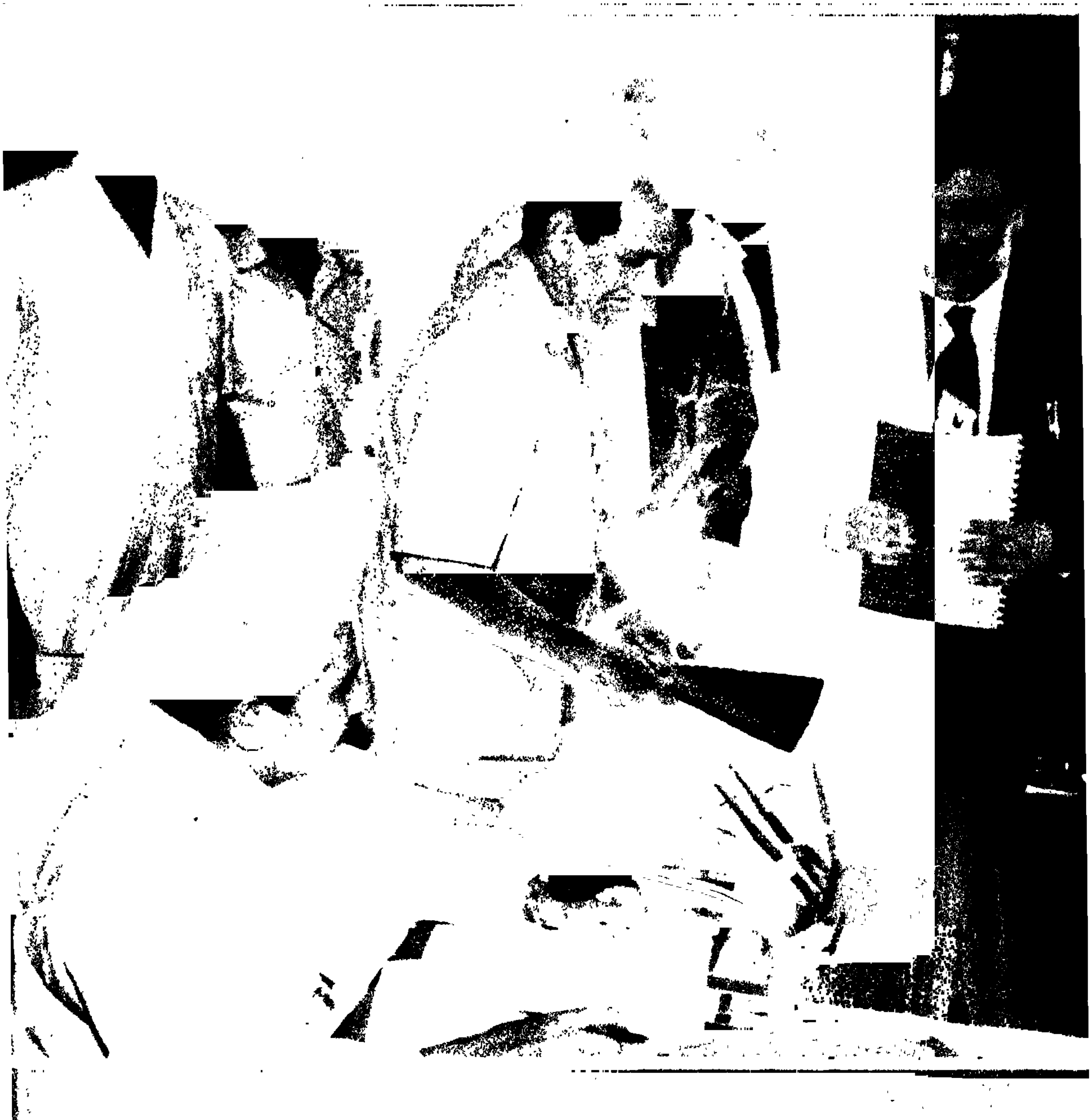












۲ بحرالفصاحت میں ص ۱۴۴ پر ہتم کے بارے میں لکھا ہے: ...مراد ہے اجتماعِ حذف و قصر سے۔

۳ بحرالفصاحت ص ۱۴۴: بعض جبّ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ رکن مفاعیلن میں دو مرتبہ حذف کو عمل میں لانا۔

۴ بحرالفصاحت ص ۱۴۵: اجتماعِ خرم و ہتم کو کہتے ہیں۔

۵ بحرالفصاحت ص ۱۴۵: اصطلاح میں مراد اجتماعِ خرم و جبّ سے ہے۔

۶ شکر کا مقام ہے کہ موصوف نے سحر عشق آبادی کو خاتم العروضین نہیں لکھا ہے بلکہ خاتم العروض لکھا، جس کے معنی ہیں عروض کو ختم کرنے والے یعنی عروض کو چوپٹ کرنے والے۔ البتہ طور پر انھوں نے جو لکھا ہے اس کی تصدیق انھیں (یعنی جانشینِ سحر) کی تحریروں سے ہوتی ہے۔

۷ ملاحظہ فرمائیں تلخیص عروض و قافیہ (مرتبہ ڈاکٹر اشرف رفیع) ص ۵۹ تا ۶۶

۸ یہ اصطلاح طباطبائی کی ہے ص ۴۰

۹ ایضاً ص ۳۹ ۱۰ ایضاً ص ۳۹ تا ۴۱

۱۱ زر کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار ص ۱۴۹ ص ۱۵۰

۱۲ شعر العجم میں شبلی نے رودکی کی صرف ایک رباعی نقل کی ہے جو غلط ہے دیوان رودکی نایاب تو نہیں، کم یاب ہے۔ میں پروفیسر نیر مسعود صاحب کا بے حد شکرگزار ہوں کہ دیوانِ رودکی کے مدوّن اور نقد نسخے سے انھوں نے رباعیات اور "تحت رباعیات" کی نقل فراہم کی۔ ان میں سے صرف چھ رباعیاں ہیں، باقی کو قطعات سمجھنا چاہیے۔ پروفیسر نیر مسعود نے ایک اور کرم بھی فرمایا کہ تدوینِ متن میں سہو یا غلط کتابت کی وجہ سے کئی مقامات پریشان کن تھے۔ ان اغلاط کو بھی انھوں نے درست کیا۔ قیاسی اصلاح سے نہیں۔ یہ اغلاط تحریف کی نہیں، تصحیف کی تھیں۔ عبارت کو درست پڑھنا ان کے علم و فضل کی دلیل ہے۔ جو استفادہ میں نے اس سے کیا ہے اسے قارئین تک پہنچا رہا ہوں خصّی رباعی کا رودکی کے دیوان میں ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۳ حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیں تلخیص عروض و قافیہ (طباطبائی) ص ۳۲

۱۴ کوئی نوکار عروض نویس یہ اعتراض نہ کریں کہ مزاحف فعولان ہے۔ ابھی پچھلی صدی تک مفاعیل ہی لکھتے تھے جیسے فاعلان کو پہلے فاعلات کہتے اور لکھتے تھے۔

۱۵ سہو کاتب یا سہو مصنّف سے رکن اخرب۔ دو لفظ لکھنے سے رہ گئے۔

۱۶ طبع نہم ۱۹۸۸ء ۱۷ ایضاً ص ۳۹

۱۸ بشکریہ پروفیسر نیر مسعود ۱۹ ترجمہ پنج تنتر

۲۰ دیوان حکیم رودکی بخارائی: مرتبہ و معنویہ ابراہیم بن محمد بن علی آملی ملقب بہ صدرالکتّاب۔ رجب ۱۳۱۵ھ (بشکریہ پروفیسر نیر مسعود)

۲۱ دیوان میں زہرآزم ہے

۲۲ دیوان میں روزی ہے

۲۳ دیوان میں ہندستانیت ہے، جو واضح تصحیف ہے۔

۲۴ دیوان میں بہ ہتم۔ تصحیف واضح ہے

۲۵ دوسرا رکن مفاعلن کے بجائے مفاعیل ہو تو بھی تقطیع درست ہے۔

غزل

جو مزاجِ گلستاں سمجھا کیے
وہ قفس کو آشیاں سمجھا کیے

عقل والوں کو نہ جانے کیا ہوا
زیست کو بارِ گراں سمجھا کیے

سوئے منزل میں اکیلا چل پڑا
وہ شریکِ کارواں سمجھا کیے

اور کچھ سمجھے نہ ساری زندگی
ہم مزاجِ دوستاں سمجھا کیے

وائے ناکامی کہ اپنا ہر قدم
کامیاب و کامراں سمجھا کیے

اُس نے گویا ہم کو رُسوا کر دیا
جس کو اپنا رازداں سمجھا کیے

سردار کرتار سنگھ گیانی گویا

۱۱۷/۳۰۔ ایسٹ کاٹ بنگلہ دی مال
کان پور ۲۰۸۰۰۱

غزلیں

ہر اک ذرہ نظر آتا ہے منت کش تبسم کا
میں سمجھی نقشِ پا ہوں جبینِ شوق کے سجدہ

دکھا کر اک تجلیات پر گرا دے اپنے جلوے کو
ترے جلوے نے دنیا بے گرفتِ ناز سے ہو کر

یہ دنیا دیکھنے آئی کہ یا میری تمنا آگاہی ہے
سمندر سے میں نکلا ہوں گراں مایہ گہر ہو کر

عجب انداز ہے کم ظرف دنیا کے پرکھنے کا
میں اک نااہل ثابت ہو رہا ہوں با ہنر ہو کر

وہ میرے پاس ہوں یا دور ہوں کچھ غم نہیں شاعر
انھیں میں دیکھ لیتا ہوں گزرتا ہوں جدھر ہو کر

شاعر فتحپوری

۸۹/۸۸ - نگر اکادمی
چمن گنج
کانپور

کبھی مقتل کبھی دار و رسن کی آزمائش ہے
مسلسل شہرِ غم میں جان و تن کی آزمائش ہے

خزاں میں جو رہا ثابت قدم وہ سرخرو ہوگا
کہ پت جھڑ میں نگہبانِ چمن کی آزمائش ہے

تم اس کے طنز پر مت چھوڑ دینا صبر کا دامن
اسے منظور تہذیبِ سخن کی آزمائش ہے

کھلاؤ شاعری میں پھول سب کا ذہن مہکاؤ
یہ مت سوچو تمہارے فکر و فن کی آزمائش ہے

وطن کو لوٹنے والے وطن کے لال ہی نکلے
نیاز اس کشمکش میں اب وطن کی آزمائش ہے

عبدالمتین نیاز

یہاں پہ لطفِ محبت نہیں ہے اب گویا
مرا وجود ہے دنیا میں بے سبب گویا

میں اس مقام سے بھی زندگی میں گزرا ہوں
جہاں کے لوگ بڑے محترم ہیں سب گویا

مری زبان کا لہجہ بدل نہیں پایا
مرے ہی ذہن میں پلتا رہا ادب گویا

عجیب کیف سا محسوس کرتا رہتا ہوں
کسی نے رکھ دیا ہونٹوں پہ میرے لب گویا

نہ جانے کیوں مجھے مجرم خیال آتا ہے
میں اپنے دور کا شاعر ہوں منتخب گویا

مجرم عابدی

ڈسٹرکٹ سپلائی افسر
بارہ بنکی
(یوپی)

ایرانی افسانہ

منوچہر خسروشاہی
ترجمہ: نسیمہ مسعود

مرگ

بہار آتے ہی وہ نمودار ہوگئے تھے۔ شروع شروع میں کچھ بہت زیادہ نہیں تھے۔ بس کہیں کہیں دکھائی دے جاتے تھے کہ خود کو ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر گھسیٹ کر لے جارہے ہیں، اور اس میں کوئی کوئی ہلکان ہوکر زمین پر ٹپک پڑتا۔ تم اس کے قریب جاتے تو دیکھتے کہ وہ کس طرح بڑے بڑے بل کھا رہا ہے اور اتنی اتنی سی ٹانگیں ہوا میں چلا رہا ہے۔ میں ان دنوں درخت پر بہت چڑھا کرتا تھا اور ان میں سے جو زمین پر آرہتے تھے ان کو روز دیکھتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں دیر دیر تک کسی ایک کے قریب کھڑا اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کا تماشا دیکھتا رہتا۔ اس کی جدوجہد بیکار جاتی اور اُسے سنبھلنا نصیب نہ ہوتا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ جو بھی نیچے ٹپکتا، پہلے تو بڑا زور لگاتا، بل کھاتا، ہاتھ پاؤں پھینکتا، لیکن رفتہ رفتہ سست پڑنے لگتا اور آخر اپنی جگہ پر سیدھا سیدھا لیٹ جاتا۔ اور ٹھیک اسی وقت چیونٹیوں کی پہلی کھیپ آپہونچتی، اور میں دیکھتا کہ کس طرح وہ اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے سینگوں سے چھو چھو کر اس کی جسامت کا اندازہ کررہی ہیں۔ اُن کے پہلے لمس سے اُس کے نڈھال بدن میں دوبارہ جان سی پڑ جاتی، وہ سنبھالا لیتا اور پھر سے بل کھانے لگتا۔ کئی بار اُس کی ٹانگوں کو جھٹکے لگتے، لیکن اب مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چیونٹیاں کسی ان دیکھے مرکز سے اُبلتی چلی آرہی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیتیں اور سب اسے اپنی اپنی طرف کھینچتیں، اس کا ایک ایک ریزہ نوچ کر لے جاتیں پھر اس بے ہیئت وجود میں نمی کی جو دو ایک بوندیں رہ جاتیں انھیں چوس لیتیں اور تھوڑی دیر بعد تم دیکھتے کہ کس طرح وہ سوکھا اور سیاہ اونچا کھچا درخت کے نیچے پڑا رہ گیا ہے۔

چیونٹیاں بڑی پھرتی سے اپنا کام کرتی تھیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے چھٹی کردیتیں، اور ان کچلے اور سوکھے ہوئے جسموں میں سے چند ٹیڑھی میڑھی اور ٹوٹی پھوٹی ٹانگوں کے سوا کچھ نہ رہ جاتا۔

ہاں، یہی ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں جب بھی دیکھتا کہ ان میں سے کوئی نیچے ٹپکا ہے تو اس کے قریب پہونچ جاتا اور اس کھیل کو آخر تک دیکھتا رہتا۔ لیکن اس کے بعد ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ اگر دنیا بھر کی چیونٹیاں اکٹھا ہوجائیں تو بھی ان کو ٹھکانے نہیں لگا سکتی تھیں۔

کبھی کبھی، جب رات کو میری نیند اُڑی ہوئی ہوتی، میں بستر میں بیٹھا کان لگائے رہتا —

ٹپ ..... لو ... ایک اور ....

- - - -

اس کے بعد مجھے رات رات بھر جاگتے گزرنے لگی، اس لیے کہ یہ آواز مستقل میرے کانوں میں آتی رہتی تھی۔

ایک رات میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے ماں کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے سامنے بار بار روئی تھی۔ میں ان کا رونا پہچانتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ہچکیاں، اور بین جو سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جیسے اپنے آپ کو مرثیہ سنا رہی ہو۔ اس رات میں نے اس کا رونا سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے کوئی شے چیخ کر الگ ہوگئی۔ میں کپکپا کر رہ گیا اور مجھ کو ساری دنیا گریہ کرتی معلوم ہوئی۔ ماں کی ہچکیوں کی آواز فضا میں پیچ کھاتی اور پھر اُن کی ٹپ ٹپ کی آواز میں مل کر ایک ہوجاتی۔ وہ لگاتار ٹپک رہے تھے اور ماں رو رہی تھی، روئے جارہی تھی۔

میں چیخیں مارتا ہوا کمرے سے باہر لپکا، اور ٹھیک اُس وقت

لگا ہوا تھا۔

دو آدمی گڑھے کے اندر کھڑے تھے۔ میت لائی گئی تو انھوں نے اسے ہاتھوں پہ سنبھال کے نیچے رکھ دیا۔ سب نے درود پڑھا۔ عورتوں کے بین اور بلند ہوگئے اور مردوں کے شانے زیادہ زور زور سے ہلنے لگے۔ ایک ہٹی کٹی عورت ماں کو چھاپ بیٹھی اور اسے تسلی دینے لگی۔ ماں اس کی توند کے نیچے دبی ہوئی کسی چوزے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اب سب میرے باپ کو مٹی دینے لگے۔ وہ گٹھری کی طرح سمٹ کر چھوٹا سا رہ گیا تھا۔

مٹی کے نیچے کہیں کہیں اس گٹھری کی سفیدی نظر آرہی تھی لیکن یہ سفید دھبے دھیرے دھیرے غائب ہو رہے تھے اور ان پر مٹی کی تہہ چڑھتی جارہی تھی۔ رونے پیٹنے کی آوازیں بڑے آہنگ اور باقاعدگی کے ساتھ اونچی ہوتی جاتیں، پھر نیچے آتیں، پھر رفتہ رفتہ اونچی ہوجاتیں کوئی کوئی آواز ایسی بھی تھی کہ لمحہ بھر کو کان سے ٹکراتی اور دوسرے لمحے غائب ہوجاتی۔ معلوم ہوتا تھا مدتوں اس کی مشق کی گئی ہے۔

گڑھا پاٹا جاچکا تھا۔ اور اب اینٹیں اور کیڑے اور آدمی بھاگتے پھر رہے تھے۔ صحن کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا گیا تھا اور درخت کو باہر گھسیٹا جارہا تھا۔ اور صحن میں کیڑوں کے گچھے کے گچھے پڑے رہ گئے تھے۔ درخت ہر طرف بیجوں کی طرح کیڑے چھڑکتا جارہا تھا۔ اسے چھکڑے پر لادا گیا تو اس کی جڑ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور شاخیں زمین پر رگڑ کھارہی تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں سے سر نکلے ہوئے تھے جیسے مٹی کی دیواروں پر پھول دار میخیں ٹھونک دی گئی ہوں۔

میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے کمرے میں بیٹھ رہا۔ ماں بید کی طرح تھر تھرا رہی تھی۔ آپ ہی آپ بل کھارہی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ہٹی کٹی عورت نے اسے چھاپ کر اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ باہر سے کیڑے اور چیونٹیاں کمروں کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ چیونٹیاں پہلے پہونچیں اور دیواروں اور کھڑکیوں پر ہوتی ہوئی اوپر چڑھنے لگیں۔

اچانک میں نے دیکھا صحن کے بیچ میں، جہاں پر درخت تھا جہاں پر اب اینٹیں چن دی گئی تھیں، جہاں پر زمین تھوڑی اونچی ہوگئی تھی، ٹھیک اس جگہ، میں نے بڑے میاں کو دیکھا۔ وہ سلاخ کی طرح سیدھے کھڑے تھے اور انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے اور ان کے سارے بدن پر کیڑے رینگ رہے تھے، اور میں نے پھر وہی جہنمی آواز سنی:

ٹپ..... ٹپ.... ٹپ۔

درخت جاچکا تھا اور اپنی جگہ کیڑے اور چیونٹیاں چھوڑ گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا مکان گرنے ہی والا ہے۔ اس کی ایک ایک تیز بوسیدہ ہوتی جارہی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کیڑے اس کے کھمبوں کے نیچے سے اور نیو کے اندر سے کلبلاتے ہوئے اوپر آرہے ہیں۔ دیواروں میں، چھتوں میں، کھڑکیوں میں، ہر جگہ کیڑے بجبجا رہے تھے مکان گرنے ہی والا تھا، بکھرنے والا تھا، ریزہ ریزہ ہونے والا تھا وہ ہٹی کٹی عورت، جس کے نیچے میری ماں چوزے کی طرح لرز رہی تھی اور چیخ رہی تھی، اس کو بھی کیڑے اندر ہی اندر کھائے جارہے تھے میں بھی اور میری ماں بھی، دونوں ریزہ ریزہ بکھرے جارہے تھے۔

ہم سب کیڑوں کے مل جانے سے بنے تھے، اور اب کیڑے الگ ہورہے تھے اور باہر ٹپک رہے تھے اور چیونٹیاں انھیں کھینچے لیے جارہی تھیں۔ اور آخر ہم بھی اسی درخت کی طرح چیونٹیوں کے گوداموں میں ذرہ ذرہ انبار ہورہے تھے۔ ہمارا گھر اپنی تمام یادوں سمیت تمام قہقہوں، سسکیوں، الجھنوں، کڑوی باتوں، میٹھے بولوں کی نامحسوس جھلکیوں سمیت، اپنی تنہائی بھری فضا سمیت چلا جارہا تھا، ہاتھ سے نکلا چلا جارہا تھا۔

مجھے خیال ہوا میں نے بیکار ہی دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں، وہ آکے رہیں گے، وہ کمروں کے اندر ہی موجود ہیں، وہ ہماری رگ رگ میں اتر چکے ہیں۔ وہ ہم کو آہستہ آہستہ، ذرہ ذرہ کھا رہے ہیں۔ میں اٹھا۔ میں نے کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے کھڑکی پر دے ماری اور خود کو کمرے سے باہر ٹپکا دیا۔

□□

عابد سہیل
نصیر باغ، امین آباد، لکھنؤ

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

راجیش شرما : کچھ یادیں، کچھ باتیں

راجیش شرما اتر پردیش کے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے جوائنٹ ڈائرکٹر، ہندی کے مشہور شاعر، اُردو شاعری کے عاشق، کالم نویس ایسے کہ خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھتے تھے، موسیقی اور خاص طور سے کلاسیکی موسیقی کے ایسے رسیا کہ شاید ہر اچھے گانے اور غزل کے ٹیپ ریکارڈ ان کے پاس موجود تھے۔ نوشاد کی بنائی ہوئی ایک ایک دُھن اور بیگم اختر کی گائی ہوئی ایک ایک غزل انھیں یاد تھی۔ افسر تھے، خاصے بڑے افسر، لیکن افسری کی خُوبُو نام کو نہ تھی۔ خوش پوش، خود آشنا، خوشی آشنا اور ان سب سے زیادہ غم آشنا تھے ــــ اپنا ہو یا دوسروں کا۔

یہ ساری خصوصیات کسی ایک شخصیت میں جمع کر دی جائیں تو ایک ہیولا سا بن جاتا ہے۔ پھر اس میں کسی قدر تیز لیکن نپی تلی چال ہنستے ہنستے غم کے سمندر میں ڈوب جاتے اور یکایک مسکرا دینے والی آنکھیں اور ــــــ

" ہلو! ــــ ارے یہ آپ ہیں، بڑی رسیلی آواز ہے۔ بھابی صاحبہ چائے میں کیا گھول کر پلاتی ہیں۔؟"

ــــ ایسے جملے جوڑ دیجیے تو یہ ہیولا کچھ کچھ واضح شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ اب اس میں الہ آباد کی باتیں، کرشن چندر کی کہانیوں کے پلاٹ، کرداروں کے مکالمے، ان افسانوں کے موڑ، اختتام، ندا فاضلی کی نظموں کے بند "جو ہُوا سو ہُوا" کی تکرار، چپراسی اور ڈرائیور تک سے " آپ " " کر دیجیے "، " آجائیے " بھی شامل کر دیجیے تو اس ہیولے میں کچھ اور رنگ بھر جاتا ہے، لیکن ہے یہ تصویر اب بھی نامکمل۔ انھیں جاننے، سمجھنے اور پہچاننے کے لیے اس میں خود اُن کو، وہ جو اندر سے تھے، ان ساری خوشیوں کو، جن کی آرزو سے وہ اپنا دل و دماغ روشن رکھتے تھے، ان تمام غموں کو، جنھیں وہ چوری کے مال کی طرح چھپائے رکھتے تھے، شامل کر دیجیے تب کہیں جا کر ان کی تصویر مکمل ہوگی۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

راجیش شرما سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی بالکل یاد نہیں۔ "کافی ہاؤس، کوئی ادبی جلسہ یا پھر خود محکمۂ اطلاعات"، کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ پھر یکایک احساس ہوا کہ ہم دونوں کے ادبی دوست مشترک ہیں مدرا راکھشس، کامتا ناتھ، شکیل صدیقی، راکیش، ویریندر یادو، نریش سکسینہ، لیلادھر جگوڑی وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک دن احساس ہوا کہ سوچنے سمجھنے، چیزوں کو دیکھنے اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے انداز میں بھی ہم دونوں کے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔ ایک دن اپنے ہی دفتر میں ایک صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ایسے الفاظ میں کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ فوراً سمجھ گئے، مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے:

"کیا آپ کو تھوڑی دیر کے لیے اسی دفتر میں اپنے کسی دوست سے ملنا نہیں ہے۔ میں اِن سے کھل کر باتیں تو کر سکوں۔"

میں نے کہا: "بہت ہو چکا، اب تھوڑا سچ بھی بول دیجیے۔"

ایک دم ہنس پڑے ــ " اچھا بھائی یہ بہت خراب آدمی ہیں۔ بالکل پڑھے لکھے نہیں ہیں ــ میں اب تک جھوٹ بول رہا تھا ــــ اب تو آپ باہر نہیں جائیں گے ــ چلیے اسی بات پر ایک پیالی چائے

اور بھی۔ دفتر کے اپنے قریب ترین دوست راجیو دکشت کی طرف دیکھا
شرارت سے مسکرائے۔ دکشت جی کے والد میرے کلاس فیلو تھے۔
ایک دن انھوں نے یونیورسٹی کے دنوں کے چند دوستوں کی ایک چھوٹی سی
تصویر دکھائی۔ تصویر میں ایک دوست نے ایک کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
پاس میں راجیو کے والد تھے۔ وہ ایک اور دوست تھے۔ اسی وقت دکشت جی
اٹھ کر کسی کام سے باہر چلے گئے۔ میں تصویر دیکھ کر دفعتہً آواز دینے
کی کوشش کر رہا تھا۔ انھوں نے میری جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ
میں نے تصویر ان کی طرف بڑھا دی۔ تصویر کبھی مجھے دیکھا، پھر تصویر دیکھی
اور بولے: "تصویریں دیکھ کر تباہی کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔"
پھر خوب ہنسے اور کہا: "اسی عمر کی اپنی بھی تصویر دکھاؤں گا۔ اب تو لگتا
ہے کہ اس حشر میں ہمارے آپ کے ایسے سارے لوگ ایک ہی طرح
کے ہوتے ہیں۔"

وہ تصویر دکھانے کی نوبت کبھی نہیں آئی جب اصل سامنے ہو تو
تصویر کے پیچھے کون بھاگے۔ انھوں نے سوچا ہوگا۔ میں نے بھی یہی سوچ کر
یاد دہانی نہ کرائی ہوگی۔

اتر پردیش نے سدبھاؤنا انک میں لگے تو دن رات ایک کر دیئے
کام تمام تا قدرت معلوم ہوا کہ بے حد مصروف ہیں۔ ایک آدھ بار ملاقات کرنے کا
جی چاہا لیکن ٹال گیا۔ "بہت مصروف ہوں گے"، یہ سوچ کر۔ پھر شاہنواز قریشی
سے ایک دن پیغام ملا۔ چند کتابوں کی ضرورت تھی۔ ان کے ایڈیشن ختم ہوئے
برسوں ہو گئے تھے۔ میرے پاس اتفاق سے چاروں کتابیں تھیں۔ لے جا کر
پیش کر دیں۔ بہت خوش ہوئے، بولے:

"پورے ایک مہینے سے پریشان تھا۔ کس کس سے نہیں کہا۔ آپ نے
بڑا کام کیا۔" یہ الفاظ ان کے نہیں ہیں۔ ان کے الفاظ تو بہت گہرے
تھے، بالکل دل سے نکلے ہوئے۔

سچ پوچھیے تو یہ انتہائی قربت کا آغاز تھا۔ پھر نہ جانے کیسے سارے
تکلفات ختم ہو گئے۔ ایک بے روزگار اور ایک افسر کے درمیان کے سارے
فرق مٹ گئے۔ میں نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن انھیں سب کچھ معلوم
تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اس سلسلے میں کبھی کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔
ایک دن میں گیا تو یہ شمارہ شائع ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں انھیں کیسے معلوم
ہو گیا تھا کہ میں آنے والا ہوں۔ شاید طبیعت خراب تھی۔ دفتر نہیں آئے
تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا کمرہ بند رہتا تھا۔ لیکن تالا کھول کر مجھے بٹھایا
گیا۔ سدبھاؤنا انک دکھایا گیا۔ وہ صفحہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا
گیا جس میں تعاون کے لیے میرا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ شکریہ کس چیز کا۔؟
میں نے کیا تعاون کیا تھا؟ کتابیں۔ سو واپس مل گئی تھیں۔ لکھا ایک
جملہ نہیں تھا، ہاں مشوروں میں ضرور شامل رہا تھا۔ ترتیب میں بھی تھوڑا
سا، بہت تھوڑا سا تعاون دیا تھا۔ وہ نہیں تھے لیکن کمرہ ان کی خوشبو
سے بسا ہوا تھا۔

پھر ایک دن تقریباً ڈیڑھ سال بعد اپنے گھر آنے کی دعوت
دی۔ کچھ اس طرح کہ کسی معذرت سے کام نہ چلا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو
پتہ بھی نہ چلا کہ کب ایک بج گیا۔ مجھے بتائے بغیر گھر فون کر دیا ___
"میرا بھی سہیل پر کچھ حق ہے۔ ہم لوگوں کو دل بھر کے باتیں کر لینے
دیجئے۔" تھوڑی دیر بعد میرے گھر سے فون آیا تو راز کھلا۔

سجا سجایا کمرہ ایک ایک چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ خاموش کم گو بھابھی
صاحبہ سے ملایا۔ بیٹی اُن دنوں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اس سے ملایا تو خوب
باتیں ہوئیں۔

کمرے میں بہترین غزلوں اور گانوں کے کیسٹوں کی ایک درجن قطاریں
تو ہوں گی۔ کئی غزلیں سنوائیں، دنیا بھر کی باتیں کیں۔ رات کو شاید دو بجے یا
اس کے بعد کھانا کھایا گیا۔ میں بھی خوش خوراک نہیں۔ لیکن ان کے
مقابلہ میں تو بسیار خور قرار پاؤں گا۔ دو آنچ چھوٹی چھوٹی روٹیاں کر ان پر
روٹی کی تہمت لگانا بھی مشکل ہے، اور تین چار چمچے ترکاری۔ بہت تھوڑا
سا نمکین دہی۔ یہ تھی ان کی ایک وقت کی خوراک۔

ان کا شعری مجموعہ "جو سنا تو کہنا ضرور" چھپ کر آیا تو ایک
کاپی مجھے بھی عنایت کی۔ اندر کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا:

"عابد سہیل کو ایک بیش قیمتی رات اور بیش قیمتی بات کے لیے،
پیار سے۔ راجیش۔"

بولتے تھے بیش قیمت، لکھتے تھے بیش قیمتی۔ میں نے ایک دن
ٹوکا تو بولے: "بیش قیمتی کی بات ہی اور ہے۔ وہ تو تمہارے ڈر سے
بیش قیمت کہتا ہوں۔" میرا اور ڈر ___ ! پیار کی بھی حد ہوتی ہے ___

بیش قیمت رات تو معلوم ہے لیکن وہ کون سی معولی بات تھی راجیش! جسے تمھارے حُسنِ سماعت نے بیش قیمت بنادیا تھا۔ کم سے کم یہ تو بتا جاتے۔ راجیش! تم سے یہ اُمید نہ تھی!

ایک دن فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف راجیش تھے۔ بغیر کسی تمہید کے بولے۔ "کچھ معلوم ہے، دو مہینے سے ملاقات نہیں ہوئی۔" میں نے دس بجے دن سے تین چار بجے رات کی مصروفیات بتادیں۔

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تمھارے دوست کیا کریں۔ مجھے تین چار بجے رات کے بعد ہی تھوڑا سا وقت دے دو۔"

پہلی بار انھوں نے مجھے "تمھارے" اور "دے دو" سے خطاب کیا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دیتا۔ ٹیلی فون خاموش ہو چکا تھا۔

ایک دن قبل شاہ نواز قریشی نے کچھ ذکر کیا تھا۔ "شعبۂ اطلاعات میں تو کام لگے ہی رہتے ہیں۔ میں کہاں تک خود کو پھنساؤں اور پھر مجھے ہندی بھی نہیں آتی۔" میں نے سوچا تھا لیکن اس فون نے یہ ساری دلیلیں بے معنی کردی تھیں۔ میں اگلے دن گیا تو مسکرائے۔

"مجھے معلوم تھا۔" انھوں نے کہا۔

کمرہ کیا تھا، میز کے علاوہ ایک ایک کونا کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ پہلا احساس یہی ہوا۔ سنو فائلیں تو ضرور رہی ہوں گی، ادھر ادھر بکھری ہوئیں۔ پھر "پہچان — اتر پردیش" کا خاکہ بتایا۔ خاصی تفصیل سے۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ ایک آدھ تجویز بھی رکھی۔ میں نے رخصت ہونا چاہا تو ایک ایسی ذمّہ داری مجھے سونپ دی جس کا میں قطعاً اہل نہیں۔ میں نے معذرت کی تو بولے۔

"اب تو فیصلہ ہو چکا ہے۔"

تقریبًا ہر دوسرے دن فون کرتے۔ پوچھتے "مضمون کتنا ہو گیا۔" انیس سے بات ہوتی تو کہتے، "زیادہ کام نہ کرنے دیجیے۔ ان کی صحت کا خیال رکھیے۔" کسی نہ کسی طرح تین مہینوں میں مضمون مکمل کرسکا تو — "اولڈ انڈیا کافی ہاؤس" پر ایک چھوٹے سے مضمون کی فرمائش کردی۔ جو میں نے زیادہ سے زیادہ دو دن میں لکھ دیا۔

"بعد کا صفحہ آپ بڑھادیں۔" میں نے کہا۔

"اور کیا۔ نامکمل تھوڑی چھاپوں گا۔" انھوں نے کہا۔ بعد میں ایک دن بولے: "اس میں کچھ جوڑا نہیں جاسکتا۔ ایک پورے عہد کی تصویر ہے۔" اس کے بعد ایک ایسا توصیفی جملہ کہا کہ وہ ہوتے تو دُہرا دیتا۔ اب ایسا جوہری کہاں جو حذف ریزہ کو بھی ہیرا کہے۔

تقریبًا چھ مہینوں تک وہ اور "پہچان — اتر پردیش" ایک جان دو قالب بنے رہے۔ اس دوران جانے کن کن شہروں کے سفر کیے۔ نوشاد اور سردار جعفری سے لمبے لمبے انٹرویو لیے۔ الہ آباد، بنارس اور ریاست کے سارے ہی دوسرے ثقافتی مراکز کے دورے کیے۔ تقریبًا سات آٹھ سو صفحات کے مضامین جمع کرلیے۔ چند دوبارہ لکھوائے۔ پھر انھیں ایڈٹ کیا، سیکڑوں تصویریں کھنچوائیں جن میں سے تقریبًا دو درجن کا انتخاب کیا، اور سارے مواد کو چار سو صفحات میں سمیٹ دیا۔ تین بار پروف پڑھے گئے، دو بار پریس کے حوالے کرنے سے قبل، ایک بار اس کے بعد۔ اب یہ سب کتابی صورت اختیار کر چکا ہوگا اور جب پڑھنے والوں تک پہونچے گا تو اندازہ ہوگا کہ راجیش شرما میں کام کرنے کی کتنی لگن اور صلاحیت تھی۔ منصوبہ اسے اُردو اور انگریزی میں شائع کرنے کا بھی تھا اب خدا جانے اس کی نوبت کب آئے گی۔

ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف وہ چپکے چپکے زندگی سے رشتہ توڑنے کی تیاریوں میں لگے تھے۔ لیکن جو کام انھوں نے ہاتھ میں لیا تھا اسے پورا کیے بغیر انھیں مرنا بھی گوارا نہ تھا۔

معمول سے کچھ پہلے دفتر آئے۔ سارے ضروری کام نپٹائے اپنے اسٹینو کو حضرت گنج کی ایک مخصوص دکان سے ٹوتھ پیسٹ خریدنے بھیجا، کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے آفس پیڈ پر دو تحریریں تیار کیں، مختصر لیکن ایسی کہ ان کی ساری شخصیت اُبھر آتی ہے —

"کچھ مہینوں سے مجھے زندگی میں کوئی دل چسپی نہیں، چنانچہ میں نے اس مسلسل ادب سے رشتہ توڑ لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"...

دوسری تحریر اپنی اہلیہ محترمہ لیلا کے لیے تھی، بے حد مختصر:

"میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت کشٹ آئے گا۔" —

ڈرائیور کو بلایا۔ اپنی پرانی قیام گاہ او،سی،آر بلڈنگ گئے۔ اسے رخصت

کردیا اور مضبوط قدموں سے ، انفرلو عمارت میں داخل ہوتے ہی لفٹ سے اوپر، بہت اوپر جاکر چھلانگ لگادی اور ذرا کی ذرا میں "ہیں" سے "تھے" ہوگئے۔

ٹھیک اسی وقت یا دو چار منٹ آگے پیچھے ریکارڈنگ کراکے میں ریڈیو اسٹیشن کے بیرونی گیٹ کے سامنے ایک منٹ رکا۔ سوچتا رہاکہ دائیں جاؤں یا بائیں۔ کام دونوں ہی جانب تھے۔ پھر سڑک پار کی اور سیدھے گھر لوٹ آیا۔ بمشکل دو گھنٹے بعد کاتا ناقد نے بتایا——

"راجیش شرما نہیں رہے"!!

مرنے والے کو کس نے روکا ہے؟ پھر بھی سوچتا ہوں کہ اگر ادھر سے آر بلڈنگ کی طرف چلا جاتا تو شاید اسی سڑک سے گزرتے ہوئے ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی۔ شاید ایک منٹ کے لیے کار رکوا لیتے، شاید میں ان کے دل کی بات جان جاتا، شاید وہ میری بات مان جاتے۔ شاید۔ شاید۔

لیکن انھوں نے دل میں کچھ اور ہی ٹھان رکھا تھا۔ اسے کوئی "شاید" بدل نہ سکتا تھا۔ میری کیا حیثیت۔

راجیش شرما اب ہم میں نہیں۔ ایک دو دن اخباروں کی زینت بننے کے بعد دنیا بظاہر ایسی ہوگئی جیسے کچھ ہوا ہی ہو۔ لیکن ایسا ہے نہیں اور نہ کبھی ایسا ہوگا۔ جب تک ایک ایسا شخص بھی زندہ ہے جو ان کے قریب رہ چکا ہے۔ ان کے لیے جو انھیں قریب سے جانتے تھے، دنیا ایک لمحہ کے لیے ٹھہر سی جائے گی جب ان کی یاد، ان کی مسکراہٹ اور زندگی کرنے کی ان کی ادائیں ان کے چاہنے والوں کو یاد آئیں گی۔

□□

یادوں کی رہ گزر

صفحہ ۹ کا بقیہ

اور کہاں تمام جماعتوں سے وابستہ ہندستان بھر کے طلبا کی نمائندہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سکریٹری چن لیا جانا۔ کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا لیکن جب خدائے بخشندہ بخشنے پر آتا ہے تو ابر رحمت سرسبز میدانوں کے ساتھ ساتھ بے برگ و گیاہ ریگستانوں پر بھی برستا ہے اور جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ تصدیق کریں گے کہ کبھی کبھی وہاں بھی جل تھل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

غزل

درد کے سائباں غم کے دیوار و در
زندگی ہوگئی دوپہر کا سفر
سیل غم کتنے راہوں میں آئے مگر
ڈوبنا تھا مجھے بس ترے نام پر
شام کے سب دھندلکے ہیں میرے لیے
صبح کا ہے اجالا ترے نام پر
ریت پر جو بنائے تھے سب مٹ گئے
لہر آئی گئی اب گھروندے نہ گھر
نیند ہے اور نہ ہیں یاد کے قافلے
کتنی ویران ہے خواب کی رہ گزر

ملکہ نسیم

چار املی
بھوپال ۴۶۲۰۱۶

قطعہ

عاشور کے دن جو تھا علمدارِ حسینیؑ
اب تک ہے وہی قافلہ سالارِ حسینیؑ
بیعت کے تقاضوں پہ ہے اک ضربِ مسلسل
تاریخ بناتا ہوا انکارِ حسینیؑ

فاطمہ وصیّہ جائسی

رشاد گنج، لکھنؤ

افسانہ

عطیہ پروین
موضع و ڈاک خانہ سید پور
زدولی ضلع بارہ بنکی

ہے وصل سے زیادہ مزا ....

زبیدہ خالہ خوبصورت اور خوب سیرت تو تھیں ہی لیکن ایک صفت ان کے اندر اور بھی ایسی تھی جس کی وجہ سے میں ان کی دیوانی تھی ——— !

وہ بڑی اچھی شاعرہ تھیں۔

نہ صرف شاعرہ بلکہ کہانیاں بھی بہت پیاری پیاری لکھا کرتی تھیں جو بھی نئی کہانی وہ لکھتیں مجھے سناتیں۔ جو بھی غزل یا نظم کہتیں اس پر میری رائے اور مشورہ لیا کرتیں جبکہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ ان کے سامنے بالکل طفلِ نوزائیدہ۔! مگر — ان کو مجھ سے اچھا سننے والا، مشورہ دینے والا اور ان کی خوبصورت تخلیقات پر سر دھننے والا اور کوئی تھا بھی نہیں۔

سارے خاندان میں ایک میں تھی جو ان کے شوق کی ساتھی اور رازدار تھی، باقی سب تو یوں ہی تھے۔ وہی کھانے پینے، پہننے اوڑھنے والے، صرف باتوں کے شوقین۔ لڑکیاں ڈھیروں مگر وہی محدود شوق۔ اچھے کپڑے، فیشن، سوئی دھاگہ، چولھا چکی، آئندہ زندگی کے خواب اور کوئی ان خوابوں کا شہزادہ جو مستقبل میں گھر والا بننے والا ہوتا۔!

زبیدہ خالہ ان سب سے کچھ ہٹ کر نظر آتیں۔ ان کو جھاڑو کی سرسراہٹ میں بھی شعر گنگناتے محسوس ہوتے تھے۔ مزے دار سالن کی ہنڈیا تیار کرتے کرتے وہ ایک حسین کہانی تیار کر لیا کرتیں۔ کپڑے سیتے ہوئے مشین کی آواز میں ان کی غزل پوری ہو جاتی۔ برتن دھوتے پلیٹوں کی کھنکھناہٹ میں یا پھر — دھلی ہوئی اسٹیل کی تھالی میں اپنے چاند سے چہرے کے عکس کو دیکھ کر ان کی ایک نظم مکمل ہو کر ان کے سامنے آکھڑی ہوتی۔!

بے تاب سی ہو کر وہ مجھے چپکے سے پکارتیں،

"شنّو۔! اے شنّو۔! ذرا سننا تو — دوڑ کے آنا ...."

میں جہاں بھی ہوتی، سچ مچ اس طرح دوڑتی کہ گرتے گرتے بچتی — لوگوں سے ٹکرا جاتی۔ دروازے سے سر پھوڑ لیتی، دیوار سے ماتھا ٹکرا دیتی، کبھی پاؤں کا انگوٹھا زخمی، تو کبھی ہاتھ لہولہان! مگر زبیدہ خالہ کی غزل سننے کے لیے یہ سارے دکھ درد بھولی ہوئی۔

بڑی خوبصورت غزل ہوئی ہے"۔ وہ خوشی سے گلنار ہو کر کہتیں، سنو گی تو پھڑک جاؤ گی"۔

" اللہ"۔ میں غش کھاتے کھاتے بچتی — " اِتّی جلدی آپ نے ایک اور غزل لکھ ڈالی — صبح ہی تو آپ نے ایک کہانی لکھی تھی ...."

" اور کیا" وہ مسکراتیں۔ "کیا سمجھتی ہو مجھے۔ ابھی اس غزل کو پورا کیا ہے اور دماغ میں ایک نظم کا تانا بانا تیار ہو رہا ہے"۔

" اچھا تو پھر جلدی سے سناؤ ابلیے۔ کہیں وہ نظم اور یہ غزل گڈ مڈ نہ ہو جائیں"۔

" ارے گڈ مڈ کیسے ہوں گی۔ میں اس کا انتظام رکھتی ہوں۔ کیا سمجھتی ہو مجھے"۔

وہ سنک کی دیوار پر جلدی جلدی لکھا ہوا کوئی شعر مجھے سناتیں پھر برتنوں کی الماری کے کواڑ پر لکھا کوئی شعر سناتیں، پھر آٹے کے کنستر پر نوٹ کیا ہوا کوئی شعر دستیاب کرتیں، پھر روٹی کے پڑے کو اوندھا کر کے اس کے بیچوں بیچ تحریر کیا ہوا شعر حاصل کرتیں پھر —

پورے کچن کو کھنگالنے کے بعد ان کی غزل مکمل صورت میں سامنے آتی تو سچ مچ میں پھڑک اٹھتی۔ سادے سادے الفاظ، سادی سادی بحر

معصوم معصوم خیالات سادگی سے بھرپور انداز مگر۔۔! بڑے بڑے اُستادوں کے ہوش اُڑا دینے والی۔

افسوس تو یہی تھا ان کی قدر کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مذاق اُڑانے اور ہنسنے والے سب ہی تھے۔ اُن کے بھائی بہن، بھابی، آس پاس کے لوگ، برابر کی لڑکیاں ــــ

"اُف خود شاعرہ صاحبہ! کیسے۔ کتنی غزلیں ہوئیں ــــ کتنے افسانے لکھے گئے۔"

"اخاہ ــ محترمہ فن کارہ! کتنے فن پارے تخلیق ہوئے کھانا پکاتے اور جھاڑو لگاتے ہوئے۔"

"کیسے جناب! کب دیوان چھپ رہا ہے آپ کا۔؟"

اور ــــ وہ صرف مسکرا دیتیں۔ کسی کی بات کا بُرا نہ مانتیں اور اپنا کام کیے جاتیں۔ بڑی خاموشی، بڑی لگن کے ساتھ۔

دھیرے دھیرے ان کی ساری غزلیں میری کاپی میں لکھ گئی تھیں، کتنی ہی نظموں کے تراشے میرے پاس خزانے کی طرح محفوظ تھے اور نہ جانے کتنی کہانیاں اِدھر اُدھر پڑے ردّی کاغذوں پر بکھری ہوئی کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہی تھیں مگر شاید ــ وہ وقت آنے والا نہیں تھا۔

مجھے افسوس ہوتا مگر ــ زبیدہ خالہ کو کوئی افسوس نہیں تھا۔ میرے کہنے پر بھی وہ ہنس پڑتیں۔

"ارے چھوڑو۔ جانے دو۔ کیا ضرورت ہے مشہور ہونے یا چھپنے کی۔ میرے اندر کی یہ ساری گدگدیاں باہر نکلنے کے لیے بیتاب ہوتی ہیں تو انگلیاں قلم تھام لیتی ہیں، مجھے سکون مل جاتا ہے بس اور کیا چاہیے۔"

میں ان کی ساتھی بھی تھی اور ہمراز بھی۔ اور واحد سامع بھی ــ!

ان کا صرف قلم ہی نہیں چلتا تھا۔ حسن اور جادو بھی جگاتا تھا۔ سلیقہ ہی نہیں بولتا تھا، ان کا وہ گلا بھی غضب کا تھا جس کو شاعرانہ انداز میں صراحی دار گردن کہا جا سکتا تھا۔ کس قدر ملائم اور سُریلی آواز تھی اُن کی، مت پوچھو جانے کہاں کہاں سے ایسی پیاری پیاری دُھنیں لاتی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی۔ اپنی ہر غزل کو وہ ایک نئی دُھن میں مجھے سُناتیں اور میں دل تھام کر سر دُھن دُھن کر سنتی اور تعریف و تحسین کے پھول ان پر نچھاور کرتی تھی۔

زبیدہ خالہ ــ جو رشتے میں میری خالہ تھیں اور عمر میں مجھ سے دو ایک برس بڑی ہونے کے باوجود میری بہترین سہیلی تھیں، وہ اپنے دل کا سارا حال میرے سامنے کسی کتاب کی طرح کھول کر رکھ دیتی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ ان کی سب سے پہلی غزل کب کہی گئی تھی ــ اس وقت جب اچانک انھوں نے قیصر ماموں کو دیکھا تھا۔

قیصر ماموں جو برسوں کے بعد اپنے وطن آئے تھے۔ اپنے عزیزوں سے ملنے اور اپنا پُرانا خاندانی مکان دیکھنے کے لیے ــ وہ ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں ہی دُبئی چلے گئے تھے۔ وہاں ان کے بہنوئی کا بہت بڑا بزنس تھا۔ وطن میں گلی گلی کی خاک چھاننے والے قیصر ماموں، جن کو کوئی کوڑیوں مول نہ پوچھتا تھا، دُبئی جا کر وہ قیمتی نگینہ بن گئے جس کو حاصل کرنے کے لیے سارے خاندان کی لڑکیوں کے والدین میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ ان کی ترقی اور کامیابی کی مثال دینے لگے۔ کل لوگ ان کو اپنی دہلیز پر دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے، آج دن پھرنے پر ان کو اپنی دہلیز پر بلانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے لگے تھے۔!

برسوں کے بعد!

جب قیصر ماموں اپنے وطن آئے تو ایسا لگا کوئی شہزادہ آگیا ہے۔ ان کی دبی کچلی شخصیت آج چودھویں کا چاند بن گئی تھی۔ زبیدہ خالہ کی خوبصورت گہری آنکھوں میں ــــ یہ چاند پورے کا پورا اُتر آیا تھا

اس راز کو صرف میں جانتی تھی۔ قیصر ماموں تک کو نہیں معلوم تھا کہ انھوں نے زبیدہ خالہ جیسی خوبصورت لڑکی کو راتوں میں جاگنے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ زبیدہ خالہ سے متاثر ضرور ہوئے تھے، ان کے ہاتھ کا بہترین کھانا کھا کر چٹخارے بھی لگائے تھے ان کے سلیقے کو بھی سراہا تھا لیکن ــــ دیوانے نہیں ہوئے تھے۔ ــــ دیوانے کیوں ہوتے کہ ہزاروں حسینائیں۔ ان کی دیوانی ہو رہی تھیں وہ تو خود ہی گلفام تھے۔ ان کو فرصت کب تھی کہ اپنے دل کو کسی کے حوالے کرتے۔!

مگر ــ! زبیدہ خالہ نے انھیں اپنے دل میں بسا لیا تھا، اپنی آنکھوں میں چھپا لیا تھا۔ وہ قیصر ماموں کے تصوّر میں گم رہتیں۔ ان کے عکس کو دیکھ کر بہترین غزلیں لکھتیں اور لکھ لکھ کر اپنے بکس میں چھپانے کے بعد

گنگناتی رہتیں ۔ ایک دن میں نے ان کی ایک غزل یاد کر دی یعنی مطلب یہ کہ ان سے چھپا کر ایک غزل کا کاغذ اٹھا لیا ۔ یہ غزل پوری کی پوری قیصر ماموں پر تھی ۔ بڑی بڑی گہری آنکھوں اور سنہرے بالوں والا اونچا شاندار شہزادہ جو ہنستا تھا تو بجلیاں گرتی تھیں اور چلتا تھا تو زمین کا سینہ دہل جاتا تھا بولتا تھا تو اس کی آواز کانوں کے راستے دل میں اتر جاتی تھی اور خاموش رہتا تھا تو کسی یونانی دیوتا کا مجسمہ محسوس ہوتا تھا ۔

میں نے وہ غزل چوری کی اور قیصر ماموں کے ہاتھ میں تھما دی ۔

"یہ کیا ہے گڑیا ۔ ؟" قیصر ماموں نے حیرت سے پوچھا ۔

"یہ پڑھ کر دیکھیے ۔" میں نے کہا ۔

انھوں نے کاغذ کھولا اور مسکرائے ۔

"ارے ۔ یہ تو کوئی غزل وزل لگتی ہے ۔"

"وزل نہیں ۔ غزل ..... پڑھ کر بتائیے کیسی ہے ۔"!

"ارے بھائی ... میں کیا بتاؤں .... مجھے تو ان سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ صاف بات ہے ۔"

"جی ہاں ! میں جانتی ہوں ۔ آپ کو دلچسپی صرف اپنی پاس بک سے ہے ، اسی کو آپ غور سے دیکھتے ہیں اور ہندسے بڑھاتے رہتے ہیں .... پھر بھی پڑھ کر تو دیکھیے ۔ اور یہ اندازہ لگائیے کس پر لکھی گئی ہے ، کس کو مخاطب کیا گیا ہے ۔ آپ اتنا تو جانتے ہی ہوں گے غزل کا مطلب کیا ہوتا ہے ..."

"اوہ ۔" وہ زور سے ہنس پڑے اور میرے سر پر چپت لگائی ۔

"میری گڑیا رانی تو ماشاء اللہ کافی بڑی اور سمجھ دار ہو گئی ہے ۔ ہاں جانتا ہوں غزل کا مطلب کیا ہوتا ہے ۔"

"پڑھیے اور بتائیے کہ اس غزل میں محبوب کون ہے ۔ یعنی شاعرہ کا ۔"!

وہ ہنستے مسکراتے ہوئے غزل پڑھنے لگے ۔ پڑھتے پڑھتے چہرے کا رنگ بدلنے لگا ۔ پہلے کنکھیوں سے مجھے دیکھا پھر ۔ غور سے دیکھا مسکراہٹ پورے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی ۔ شریر انداز میں کھنکارے اور بولے ۔

"یہ شاعرہ ..... وہ خوبصورت سی نیلی آنکھوں والی لڑکی تو نہیں جس کا نام ....."

"زبیدہ ہے" ۔ میرے منھ سے بے اختیار نکل گیا ۔ اگرچہ میں اتنی جلدی تھو لنے والی نہیں تھی ۔

"ہاں ۔ زبیدہ ..." ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور آنکھوں میں بڑی ہی خوبصورت چمک لہرانے لگی ۔

"بہت خوبصورت شخصیت ہے ..."

میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا ۔

"مانتے ہیں نا آپ ۔ ؟"

"مانتا ہوں ...." انھوں نے غزل کا ایک خوبصورت شعر پڑھا اور میری طرف دیکھا ۔

"اور ۔ ان کے .... محبوب کو بھی جان گیا ہوں ۔"

"جان گئے ہیں نا ۔ ؛ میں نے ایک نعرہ مارا اور کاغذ ان کے ہاتھ سے جھپٹ کر بھاگی ۔

"ارے ۔ ارے ۔" وہ میرے پیچھے لپکے ۔ "سنو تو ۔ سنو تو ۔"

میں کہاں سننے والی تھی ۔ سیدھی پہونچی زبیدہ خالہ کے پاس اور ان کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا ۔

"خدا خیر کرے ۔" وہ ہنس پڑیں ۔ "اتنی محبت کیوں آرہی ہے ۔"

ساتھ ہی ان کی نظر میرے ہاتھ میں تھمے کاغذ پر پڑی ۔

"ارے ۔ یہ میری غزل ؟"

"چوری کی تھی ۔" میں نے ان کو زور سے دبایا ۔ "اور چوری ہی سے اس شخص کو دکھائی تھی جس کی شان میں یہ لکھی گئی ہے ۔ !

"کیا مطلب ؟" زبیدہ خالہ مجسم سوال بن گئیں ۔

میں نے جلدی جلدی ان کو پوری بات بتا دی ۔

اُف ۔ ان کے چہرے کا وہ گلابی رنگ ۔ آنکھوں کی وہ شرمیلی چمک گھنیری پلکوں کی جھالروں کا اٹھنا اور گرنا ۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے لبوں کا کپکپانا ۔ ! آج بھی یاد ہے بھول نہیں پائی ہوں ۔

"ہائے ری آفت کی پڑیا ۔" ان کے لہجے میں انار چھوٹ رہے تھے ۔ "تو نے انھیں دکھا دی غزل ۔ ؟"

"اور کیا ۔" میں اترائی ۔ "نہ صرف غزل دکھائی ۔ پڑھا بھی دی

اور اس ہیرو کو ان سے ملا بھی دیا جس کو مخاطب کرکے یہ غزل کہی گئی تھی ۔ کہاں تک برداشت کرتی ؟ آپ تو زندگی بھر اپنے دل کا حال ظاہر نہیں کرپاتیں ۔ بس تڑپ تڑپ کر غزلیں ہی لکھا کرتیں ۔

" ٹھیک کہتی ہو تم ۔" وہ بولیں ۔" اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مرجاتی ، مگر ... دل کی بات قلم کے علاوہ ..... اور کسی سے نہ کہہ پاتی ۔"

" وہ کام میں نے کر دکھایا جو آپ سے نہ ہو سکا ۔" میں نے زبیدہ خالہ کی چاند سی پیشانی چوم لی ۔" بس اب ... آپ کے خوابوں کے شہزادے اور آپ کی غزلوں کی روح کو آپ کے آنچل تلے لا کے چھپانا ہے ۔"

زبیدہ خالہ ہنستے ہنستے لوٹ گئیں ۔۔

" اُف توہ ری بقراط ! کیا لمبی لمبی ہانکنے لگی ہے ۔ اچھا تو دادی اماں ! آپ میرے خوابوں کے شہزادے کو میرے آنچل تلے چھپانے کا عزم کرکے بیٹھی ہیں ۔ ؟ "

" جی ہاں ! " میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکایا ۔" جی ہاں ۔۔ زبیدہ بی بی ! زندگی میں یہی ایک نیک کام کر جاؤں گی ' باقی کا اللہ مالک ہے ۔"

میں نے واقعی جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا ' اسے پورا کرکے دکھادیا قیصر ماموں کو ایسا شیشے میں اُتارا کہ انھوں نے کسی اور کی طرف دیکھنا تو کیا کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا ۔۔ ان کی سوچوں کا مرکز صرف اور صرف زبیدہ خالہ بن گئیں ۔

زبیدہ خالہ کی غزلوں میں اور بھی خوبصورتی اور بھی نکھار آتا رہا ! قیصر ماموں اور وہ ۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے زبیدہ خالہ ہر وقت مسکراتی اور گنگناتی نظر آنے لگیں اور پھر چار چھ ماہ بعد دونوں کی شادی ہوگئی ۔

میں خوشی سے پھولی نہ سمائی ۔ میری کوششیں آخر کار رنگ لے آئیں ۔۔ کس قدر خوبصورت جوڑی تھی ان دونوں کی ۔

مثالی جوڑی ۔

جو دیکھتا تھا ، دیکھتا ہی رہ جاتا ۔

زبیدہ خالہ بے حد خوش تھیں ۔ ان کے خواب پورے ہوگئے تھے ۔ قیصر ماموں بھی بہت مسرور و مطمئن تھے ۔ ان کو ایک بہترین شریک زندگی مل گئی تھی ۔

میرا خیال تھا کہ زبیدہ خالہ کی شاعری پر شباب آئے گا ۔ ان کی غزلیں اور بھی حسین ہوجائیں گی ۔

جن احساسات کو وہ صرف ۔۔ خیالوں میں محسوس کرتی تھیں وہ حقیقی روپ میں ان کے سامنے آکر ان کے اندر سما جائیں گے ۔ مگر نہیں ۔

افسوس تو یہی ہے کہ ایسا نہیں ہوا ۔

شروع کے کچھ دن تو خیر ۔۔ بڑے طوفانی قسم کے تھے ۔ ایک دوسرے کو دیکھنے پرکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا ۔۔ میں تیرے لیے تو میرے لیے ۔۔ والا معاملہ رہا ہوگا ۔۔ مگر جب یہ طوفان کچھ تھما ۔۔ تیرے میرے کے علاوہ کسی اور طرف بھی نظر اُٹھی تو مجھے ایسا لگا کہ زبیدہ خالہ نے سب کچھ حاصل کرکے کچھ کھو بھی دیا ہے ۔

ان کا خیالی محبوب ۔ ان کے خوابوں کا شہزادہ ۔ ٹھوس حقیقی روپ بن کر ان کے سامنے آیا تو جیسے ان کے سارے نازک احساسات پگھل کر رہ گئے ۔

اب میں انھیں اکساتی ۔۔۔۔۔۔

" زبیدہ خالہ ! اللہ آپ تو بالکل ٹھس ہو کر رہ گئیں ۔۔ بالکل عام سی عورتوں کی طرح ..... کچھ تو لکھیے ' کبھی تو قلم اٹھائیے ۔ ! "

وہ کھسیانی سی ہوکر ہنس دیتیں ۔۔۔

" کیا کروں شنو ۔ اب جیسے قلم مجھے بُلانا ہی بھول گیا ہے ۔ بہت چاہتی ہوں کچھ لکھوں .... لکھ ہی نہیں پاتی ۔"

ان کا قلم رک گیا تھا ، زندگی کے دوسرے کام زور و شور کے ساتھ چلنے لگے تھے ۔ وہ قیصر ماموں کے لیے وقف ہوکر رہ گئی تھیں ۔ ان کا سایہ بن گئی تھیں ۔ ان کی ضرورت بن گئی تھیں ۔ کیا مجال جو ان کو ایک گلاس پانی اُٹھاکر پینے دیں ۔

اِدھر آواز آئی ۔" پانی "

اُدھر وہ سب کام چھوڑ کر گلاس لیے حاضر ۔

کوٹ ' قمیص کے بٹن بند کرنے اور جوتے کی ڈوری باندھنے تک کی ذمہ داری زبیدہ خالہ نے سنبھال لی تھی ۔ تب پھر ۔ انھیں کہاں وقت ملتا غزل یا نظم لکھنے کا ، یا کسی کہانی کو بنانے کا ۔ !

مجھے شروع میں تو ان کا یہ دیوانہ پن اچھا لگا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی یہ دیوانگی دل جلانے لگی۔

اب ایسا بھی کیا فرض زوجیت کہ اپنا کوئی وجود ہی نہ رہا۔ کبھی کبھی میں غصے بھی کرتی ——

"توبہ ہے زبیدہ خالہ — آپ تو جیسے قیصر ماموں کی پرچھائیں بن کر رہ گئی ہیں۔"

وہ بس مسکرا دیتیں۔ جواب میں کچھ نہ کہتیں۔

شاعری دم توڑ چکی تھی ——

افسانہ نگاری بھولی بسری داستان بن گئی تھی۔

گنگنانا بھی ختم ہو چکا تھا —— اب تو بس ——

"ہاں جی!"

"آئی جی۔"

"سن لیا جی۔"

"اچھا جی۔"

جیسی تک بندی ہی رہ گئی تھی — میں نے ایک بات پر اور بھی غور کیا۔

قیصر ماموں بھی جیسے ان کی طرف سے کچھ بے زار سے، کچھ بد دل سے یا یوں کہوں "بور" سے ہو گئے تھے۔

پہلے "زبیدہ" کہتے ہوئے یوں لگتا جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔ شہد کی دھاریں بہہ رہی ہوں — اب پکارتے تو یوں لگتا سوکھی لکڑی چٹ سے توڑ کر ہاتھ میں تھما دی ہو۔ چوں کہ ان کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا تھا اس لیے قدم قدم پر انہیں پکارنا اور بلانا ضروری تھا لیکن کام ہی بھر کا — نہ کوئی جوش نہ ولولہ — نہ لہک، نہ چہک —!

مجھے کبھی کبھی پچھتاوا ہونے لگتا — خواہ مخواہ دونوں کو ایک ڈور سے بندھوا دیا — دونوں ہی کی گرم جوشی ختم ہو گئی — دونوں ہی پتھر جیسے ٹھس اور بے جان ہو گئے — کوئی ترکیب ایسی سمجھ میں نہ آئی کہ وہ دونوں ایک بار پھر جوش اور ولولے سے بھر جائیں — ایک بار پھر ——

زبیدہ خالہ قیصر ماموں کی ہر آہٹ پر چونک اٹھیں، ان کی آواز پر گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہو کر کھل جائیں — ان کا نام سنتے ہی دھیرے دھیرے گنگنانے لگیں۔

اور قیصر ماموں — قیصر ماموں بھی متلاشی نگاہوں سے گھر کا کونہ کونہ دیکھنے لگیں۔ دروازے کے ہلکورے لیتے پردے پر نظریں جما کر بیٹھ جائیں — زبیدہ خالہ کی ایک جھلک پا کر سورج کی کرنوں سے جگمگاتی ہوئی پیتل کی تھالی کی طرح جگمگا اٹھیں۔ ان کی مدھم مدھم گنگناہٹ سن کر مسکراتے نہ تھکیں۔

کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ حالات نے اچانک کروٹ بدلی۔ ہوا یوں کہ قیصر ماموں دبئی کی جس فرم سے الگ کر دیئے جانے پر وطن واپس آ گئے تھے اور یہاں آ کر اپنا بزنس کرنے لگے تھے وہاں سے ان کا بلاوا پھر آ گیا۔ اس بار تنخواہ بھی زیادہ تھی اور سہولتیں بھی پہلے سے کہیں زیادہ مل رہی تھیں۔ ان کو اس بار اپنی فیملی ساتھ رکھنے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔

میں نے زبیدہ خالہ سے پوچھا ——

"خالہ! آپ جائیں گی قیصر ماموں کے ساتھ؟"

فوراً جواب ملا — "نہیں شنو — میں یہاں اتنا سب چھوڑ کر اتنی جلدی کیسے چلی جاؤں۔ ابھی وہ وہاں جا کر کچھ دن رہ لیں پھر مجھے بلا لیں گے۔"

یہی قیصر ماموں نے کہا ——

"پہلے میں وہاں کے حالات دیکھ لوں پھر زبیدہ کو بلواؤں گا۔"

جھٹ پٹ انتظام ہوا، اور قیصر ماموں دبئی روانہ ہو گئے۔

زبیدہ خالہ اکیلی رہ گئیں!

میں نے سوچا — نہیں رہ پائیں گی بے چاری — روئیں گی۔ سسکیں گی۔ قیصر ماموں کی یاد میں آہیں بھریں گی — ہنسنا بولنا بھول جائیں گی۔ ایک دن کے لیے تو دونوں الگ نہیں ہوئے تھے — اتنی لمبی جدائی کیسے سہ سکیں گے —!

مگر نہیں۔

زبیدہ خالہ نہ روئیں، نہ سسکیں، نہ آہیں بھریں۔

انھوں نے اپنا پرانا ٹرنک کھولا — کپڑوں کے نیچے دبی ہوئی اپنی پرانی ڈائری نکالی، پرانی کاپیاں نکالیں، اپنا قلم اٹھایا۔ نئی روشنائی

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

غزلیں

یہاں میرا کوئی اپنا نہیں ہے
چلو اچھا ہے کچھ خطرہ نہیں ہے
وفا کے تذکرے کرتو رہے ہو
اب ان باتوں میں کچھ رکھا نہیں ہے
اثر انداز جس پہ مصلحت ہو
محبت ایسا تو رشتہ نہیں ہے
بڑے بے خوف ہو کر سو رہے ہیں
ہمارے گھر میں دروازہ نہیں ہے
جھجر کر اس سے طارق جی تو لو گے
مگر یہ فیصلہ اچھا نہیں ہے

طارق قمر

محلہ حکمت زرو مقدا اشرفا ئی چ
سنبھل ۲۴۴۳۰۲

طاقوں پہ خواب کی طرح رکھا گیا ہوں میں
اکثر کسی کی آنکھ میں دیکھا گیا ہوں میں
اک لفظ نے بدل دیا تحریر کا مزاج
دل سے نہیں دماغ سے سوچا گیا ہوں میں
آہٹ مرے وجود میں تھی انقلاب کی
سولی پہ بار بار چڑھایا گیا ہوں میں
ہنگامۂ حیات کے ہمراہ بھیڑ تھی
خاموش بستیوں میں اکیلا گیا ہوں میں
احسنؔ نہیں ہے مجھ کو کسی غیر سے گلہ
اپنوں کی محفلوں ہی میں لوٹا گیا ہوں میں

نواب احسن

۲۵۱/۲۲۶ بخشی بازار
الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

نیتِ شوق پہ موقوف ہے ہجرت کرنا
دل نہ ہو گرم تقاضا تو سفر مت کرنا
یوکلپٹس پہ کہیں چاند کا اُگنا سرِ شام
نرم شاخوں کا ہواؤں میں شرارت کرنا
دیکھنا دُور تلک اٹھتی ہوئی گردِ نجوم
بھیگتی رات کا مہتاب کو رخصت کرنا
سر اُٹھانا کسی طوفان کا خاموشی سے
آرزوؤں کا اصولوں سے بغاوت کرنا
بالارادہ مری آنکھوں سے چُرانا نیندیں
بے ارادہ مرے ہر خواب میں شرکت کرنا

(ڈاکٹر) عامر ریاض

لینگویج سیکشن (اردو) سکریٹریٹ لکھنؤ

آنکھ میں کیا کھلے منظر کوئی
چاند، سبزہ نہ سمندر کوئی
ٹوٹے تختے پہ سفر پانی کا
بادباں، کشتی نہ لنگر کوئی
آگ ہی آگ ہے ہر سمت یہاں
زد سے اس کے نہیں باہر کوئی
سامنے دُشمن لشکر میرے
ہاتھ میں تیغ نہ خنجر کوئی
میں ظفرؔ خوں میں نہاتا ہی رہا
وار کرتا رہا مجھ پر کوئی

ظفر اقبال ظفر

۱۵۱ - تحصیلدار
فتحپور

بدگمانی اس لیے دونوں طرف آئی نہیں
وہ بھی ہرجائی نہیں اور میں بھی ہرجائی نہیں
آج دروازے پہ میرے کون دستک دے گیا
آج تو بادِ صبا بھی اس طرف آئی نہیں
ٹوٹ جاتا زندگانی کے سفر کا سلسلہ
وہ تو یہ کہیئے طبیعت اپنی گھبرائی نہیں
آئینے کے سامنے جانے سے گھبراتے ہو کیوں
آئینہ تو خود تماشہ ہے تماشائی نہیں
میں بھی پروانہؔ غزل سے توڑ لوں گا رابطہ
دوستوں میں جب شعورِ ہمت افزائی نہیں

منظور پروانہ

نظیر آباد
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

ڈاکٹر کرشن لال
سرو ۵ آوس، کھرا جنگی سیتاپور روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۲۰

رام: اُردو شعراء کی نظر میں

اُردو زبان کا تعلق سرزمین ہند سے ہونے کے باعث یہاں کی بلند مرتبت ہستیوں کے کرداروں کا بیان اُردو شاعری میں ہونا فطری ہے اودھ کی اہم زبان ہونے کی وجہ سے عظیم المرتبت انسان رام کا تذکرہ اُردو زبان میں نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ اس ضمن میں رام کی عظمت و وقار کی مصوری جن اُردو شعراء نے کی ہے اس کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے۔

اُردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال نے رام کو ہندستان کی شان سمجھتے ہوئے ان کی عظمت کا اظہار اپنے طور پر کیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

ہے رام کے وجود پہ ہندستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

علامہ اقبال رام کی شجاعت، دلیری، پاکیزگی نیز دیگر صفات کا بیان مندرجہ ذیل شعر میں اس طرح کرتے ہیں ؎

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

مندرجہ بالا شعر میں بتایا گیا ہے کہ مصیبت میں بھی رام ہمیں عزم و ہمت اور استقلال عطا کرتے ہیں۔ شاعر کا اسلوب قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

اعجاز اس چراغِ ہدایت سے ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

یہ رام کی شخصیت کا اعجاز ہے کہ ان کی گوناگوں صفات سے انسان اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ اسے ہر شے میں رام کا ہی عکس نظر آنے لگتا ہے ایسی عظیم المرتبت شخصیت کو اُردو شعراء نے اپنی شاعری میں ایک مخصوص مقام دیا ہے۔ ایسے شعراء میں ایک نام ہے ظفر علی خاں کا۔ وہ تو ایک ہی نظر میں رام کے مُرید ہوگئے۔ انھیں ہر سمت رام ہی رام نظر آنے لگے۔ رام کے سوا ان کا کوئی ہے ہی نہیں۔ ان کے اسی جذبات کی عکاسی ان اشعار میں نظر آتی ہے ؎

میں ترے شیوۂ تسلیم پہ سر دُھنتا ہوں
کہ یہ اک دَور کی نسبت مجھے اسلام سے ہے
ہو وہ چھوٹوں کی اطاعت کہ بڑوں کی شفقت
زندہ دونوں کی حقیقت ترے پیغام سے ہے

مشہور و معروف صحافی اور شاعر ظفر علی خاں کی نگاہ میں رام نے ایک ایسی تہذیب کی تعمیر کی ہے اور ایک ایسا روشن ولافانی پیغام دنیا کو دیا ہے جس سے سبھی کی فلاح و بہبود ہو سکتی ہے، سبھی کو ایک آئیڈیل مل سکتا ہے اور یہ سبھی کے لیے قابلِ تقلید ہے ؎

تیری تعلیم ہوئی نذرِ خرافاتِ فرنگ
برہمن کو یہ گلہ گردشِ ایام سے ہے
نقشِ تہذیبِ ہنود اب بھی نمایاں ہے اگر
تو وہ سیتا سے ہے لچھمن سے ہے اور رام سے ہے

رام کے سراپا، ان کی رُوحانیت و پاکیزگی کو دیکھ کر کس کا دل اس میں ضم ہو جانے کو نہیں چاہے گا۔ اس بات کو اُردو کے مشہور شاعر ساغر نظامی نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ؎

ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مٹ نہیں سکتی قیامت تک حکومت رام کی

اسی کے ساتھ ساغر نظامی رام کو روحانیت کے پیکر کے طور پر بھی دیکھتے ہیں ؎

زندگی کی رُوح تھا رُوحانیت کی شان تھا
وہ مجسّم روپ میں انسان کے عرفان تھا

(باقی ص ۴۸ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب۔ **جوش کی منظری شاعری**

مصنف: ڈاکٹر محمد کوثر اعظم قیمت: ۱۲۵ روپے

ملنے کا پتہ۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸ کوچہ پنڈت

لال کنواں، دہلی ۶

ڈاکٹر محمد کوثر اعظم کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ ان کے تنقیدی مقالے اور انشائیے مختلف رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں چھ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا باب منظری شاعری پر ایک آفاقی نظریہ پیش کرتا ہے۔ دوسرا باب "اُردو شاعری میں منظر نگاری کی روایت" سے متعلق ہے۔ اس باب میں بڑی فاضلانہ بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُردو شاعری میں منظر نگاری کا آغاز دکن سے ہوتا ہے۔ تیسرے باب میں جوش کی منظری شاعری کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے جوش کی نظموں، غزلوں، مرثیوں اور رباعیوں سے وافر مثالیں دی گئی ہیں۔ چوتھے باب میں جوش کی منظری شاعری کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ اُردو کی ابتدائی شاعری میں منظر نگاری کا جو نقدان تھا اسے دُور کرنے میں جدید شعرا کی کوششیں سامنے لائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر کوثر اعظم حالی، سرور، چکبست، اسماعیل، اکبر، نظیر، انیس اور اقبال کی منظر نگاری کی تعریف کرتے ہیں، مگر ان کا یہ خیال درست ہے کہ جوش کی منظر نگاری میں جو نکھار، رچاؤ اور والہانہ پن جھلکتا ہے وہ بات کسی میں نہیں ہے۔

پانچویں باب میں نتیجہ نکلتا ہے اور جوش منظر نگار شعرا کی جماعت کے امام ٹھہرتے ہیں۔ چھٹے باب میں کتابیات کی فہرست دی گئی ہے جس سے مصنف کی کد و کاوش، چھان بین اور عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

جوش کی منظری شاعری پر یہ ایک جامع کتاب ہے اور ذخیرۂ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

—— (ڈاکٹر) سید مسعود حسن رضوی ردولوی

نام کتاب: **"بُت خانۂ خلیل"**

(ملک محمد جائسی کی پدماوت کا منظوم ترجمہ)

مرتب: ڈاکٹر علی احمد جلیلی۔ قیمت: ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ: علی احمد جلیلی، جلیل منزل۔ ۱/۲۲۳/۶-۱-۲۲ سلطان پورہ

حیدرآباد - ۲۴

پدماوت ملک محمد جائسی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس پر کبھی وقت کی گرد نہیں پڑ سکی۔ جائسی کو قدرت نے حسنِ صورت تو نہیں عطا کیا تھا لیکن خوبصورت ذہن اور حسین قلم سے نوازا تھا۔ آج اس کا ادبی شاہکار پدماوت ہندستانی ادب کے تاج کا جگمگاتا ہیرا ہے۔ تصوف کی یہ داستان تمثیل اور علامت نگاری کا شاہکار ہے۔ اس میں چتوڑ تن کی علامت ہے، رتن سین رُوح کی اور پدماوت محبوبِ حقیقی اور طوطا مرشد ہے۔ علاءالدین ہوا و ہوس ہے اور معنی کی سطح برابر سے دو ہے پروفیسر گیان چند کے لفظوں میں موجِ تہہ نشین کی طرح معنی پوشیدہ ہیں۔

"بُت خانۂ خلیل" اُردو میں پدماوت کا منظوم مگر آزاد ترجمہ ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پدماوت کے قصہ سے متاثر ہو کر اور اس سے بیشتر خیالات مستعار لے کر خلیل نے اسے نظم کر دیا ہے۔ بہت سے حصے بُت خانۂ خلیل میں نہیں ہیں جو پدماوت میں ہیں۔ خصوصاً اس کا معرفت کا پہلو یا جذبات نگاری میں رُت ورنن (بارہ ماسہ) نہیں ہے لیکن اس سے قطع نظر یہ مثنوی اپنے شعری محاسن کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کا ایک گم شدہ ورق تھی جس کی بازیافت کا سہرا ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے سر بندھتا ہے۔ خلیل حسن خاں خلیل حضرت جلیل مانک پوری کے بڑے بھائی تھے یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ان کی سسرال جائس میں تھی ان کی مثنویوں کا مجموعہ "پنجۂ نگاریں" کے نام سے معروف ہے جس میں بُت خانۂ خلیل پہلی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کو ملک محمد جائسی کے تعارف، پدماوت کے فارسی، دکنی اور شمالی ہند میں ترجموں اور پھر

پیماوت اور مبتجانہ غلیل پر سیر حاصل مقدمہ صـ۵ سے صـ۱۳۰ تک پھیلا ہوا ہے۔ تقابلی مطالعہ میں شمع پروانہ، گلزار نسیم اور سحر البیان شامل ہیں۔ ڈاکٹر جلیلی نے اپنے مخصوص تجزیاتی انداز میں معروضی انداز نظر سے غلیل کی شعری کاوشوں کا تجزیہ کیا ہے اور اس کے محاسن اُجاگر کیے ہیں یہ مثنوی لکھنؤ اسکول کے مخصوص شعری رجحان کی نمائندگی کرتی ہے لیکن شاعر کا انداز بیان گلزار نسیم کے بجائے سحر البیان سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے۔

دو ہزار دو سو بیالیس اشعار کی یہ مثنوی ایک سو پچاس صفحات پر محیط ہے اور ایک سو بتیس ۱۳۲ صفحات میں ڈاکٹر جلیلی کی تحقیق اور تنقیدی بحث ملتی ہے۔

—— ڈاکٹر محمد بیگ احساس

نام کتاب: "انشاء" نیاز فتحپوری نمبر"
مدیر: س. ف. اعجاز   قیمت: ۲۰۰/- روپیے
ملنے کا پتہ: انشاء پبلیکیشنز، بی-۲۵، ذکریا اسٹریٹ
کلکتہ

ماہنامہ "انشاء" کلکتہ سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر جناب ف. س. اعجاز ہیں۔ رہنماؤں میں احمد سعید ملیح آبادی اور ڈاکٹر قمر رئیس ہیں۔ اس کا نیاز فتحپوری نمبر شائع ہوا ہے۔

نیاز فتحپوری نے "نگار" کے ذریعہ اُردو ادب کو ایک جہت اور سمت عطا کی تھی اُردو ادیبوں کی رہنمائی کی تھی، انھیں حوصلہ نظر بخشا تھا اور اپنے احتساب سے بڑے بڑے ادیبوں کے ہوش و حواس بھی دُرست کر دیے تھے۔ نیاز صاحب کا مزاج یہ رہا کہ ہمیشہ چونکا دینے والی تحریروں کا سہارا لے کر خود کو مرکز توجہ رکھا، اپنے کو دہریہ ثابت کرنے کی کوشش کی "خدا نمبر" نکالا، جسے پڑھیے تو شیخ سلیم احمد کے اس فقرہ سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ وہ خدا پرست دہریہ تھے۔

انشاء کے اس خصوصی نمبر میں نیاز صاحب کی رنگارنگ ادبی، علمی اور صحافتی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تالیف اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ نیاز فتحپوری پر تحقیق کرنے والوں کو انشاء کے اس شمارے میں ہر زاویے سے ان کی شخصیت کی پرکھ مل جائے گی۔ یوں تو تمام مضامین اعلا پائے کے ہیں لیکن ڈاکٹر تنویر علوی کا مضمون "خدا نمبر اور قدیم مذاہب کی روایت"، ڈاکٹر خلیق انجم کا مضمون "اُردو نثر کی ہمہ گیر شخصیت"، "نیاز فتحپوری کی تنقید نگاری" پر پروفیسر عنوان چشتی کا اظہار خیال خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نیاز صاحب کے ترک وطن کا جواز تلاش کرتے ہوئے دفاعی مضمون لکھا ہے لیکن اس سے مطمئن ہونا مشکل ہے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے "نیاز فتحپوری: لسانی مزاج اور تشکیل اسلوب" میں محققانہ انداز سے صوتی، نحوی، جزوی ساختی متوازیت اور تماثلیت کے عنوانات کے تحت نیاز صاحب کے اسلوب کا بھرپور تجزیہ کیا ہے اور بے حد تکنیکی موضوع کو انتہائی سہل، دل نشین اور متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے۔

اس شمارے کی ایک خصوصیت اس کا حسنِ ترتیب ہے۔ نیاز کی تصاویر کے ساتھ ان خطوط کا عکس بھی اس میں شامل ہے جو پروفیسر نارنگ کو انھوں نے تحریر کیے تھے۔ ان میں ایک خط کے القاب ہیں: "صدیق یک رنگ نارنگ"

اس شمارے میں نیاز صاحب کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔ "سازِ صد آہنگ" کے عنوان سے نفضا ابن فیضی اور "سارے اصنافِ ادب میں تیرے جوہر بے مثال" کے عنوان سے م. افلاق کی نظمیں شامل ہیں۔

—— ڈاکٹر رضوان حیدر

نام کتاب: "مت سہل ہمیں جانو"
مصنف: انور ظہیر خاں   قیمت: ۱۲۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر
نئی دہلی

"مت سہل ہمیں جانو" انور ظہیر خاں (استاد شعبۂ اُردو مہاراشٹر کالج ممبئی) کے خاکوں کا مجموعہ ہے جو فہرست کے اعتبار سے سات شخصیتوں پر مشتمل ہے جن میں سے ظ. انصاری، حسن نعیم، عزیز قیسی

اور اختر الایمان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور سردار جعفری، باقر مہدی، ندا فاضلی بمبئی کی برق رفتار فضا میں ادب کی خوشبو پھیلا تے ہوئے ہیں۔

انور ظہیر خاں عروس البلاد بمبئی کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اس طرح انھوں نے ان شخصیتوں کو قریب سے دیکھا ہی نہیں پرکھا بھی ہے۔ ان خاکوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاکے نہیں بلکہ شخصیت شناسی کی بہترین مثال ہیں بلکہ بقول مصنف 'خاکہ کسی بھی شخصیت کا پُنر جنم ہے' اس لیے زیر مطالعہ خاکوں پر تاثراتی یا نفسیاتی لیبل نہیں لگایا جا سکتا کیوں کہ ان خاکوں میں شخصیت کی پرکھ، ڈرامائیت، مکالمے، تذکرہ نویسی، ماجرا نویسی سبھی کچھ ہے اور ان کے کرداروں کے فکر و نظر، رجحان اور نیچر سے خاص سروکار رکھا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ خاکے خاکہ نگاری کے فریم سے باہر نکلے ہوئے ہیں لیکن ان کی شخصیات خاکے کے فریم سے باہر نہیں۔ مصنف نے ان شخصیتوں پر خاکہ لکھنے کا سبب یہ بیان کیا ہے:

"سارے فن کار ذہانت کی مثال ہیں، وسیع المطالعہ ہیں...

..... فن کاری کی آگ سے سینے دہک رہے ہیں"۔

کتاب کا نام میر کے مشہور شعر سے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سے لیا گیا ہے' نیز کسی روایتی تقریظ کا سہارا نہ لے کر مصنف نے ایک اچھا اقدام کیا ہے جس کے لیے وہ لائق مبارک باد ہیں۔ کمپیوٹر کی یکساں کتابت عمدہ کاغذ اور طباعت معیاری ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب آسانی سے حلقۂ قارئین میں اضافہ کرلے گی۔

——— عابد حسین حیدری

نام کتاب: "پروانۂ نجات" شاعر: مہدی علی
مُرتب: جابر حسین قیمت: سَو رو پئے
ملنے کا پتہ: اُردو مرکز۔ عظیم آباد، پٹنہ (بہار)

اُردو مرکز عظیم آباد مستحق مبارکباد ہے کہ بے حد قلیل عرصہ میں اس نے ایسی معیاری ادبی تخلیقات پیش کی ہیں جو اعلیٰ ادبی اقدار کے ساتھ صوری خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔

"پروانۂ نجات" رثائی شاعری کی صنفِ نوحہ سے متعلق ہے۔ یہ صنف دکن سے چلی ہے۔ اس صنف کی بہت سی ذیلی اصناف رہی ہیں گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس صنف کی مقبولیت کا سبب یہ بھی تھا کہ پیغام کربلا کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یہ عوامی ذریعۂ ابلاغ تھی۔ عہدِ قدیم کے نوحے صرف رثا کا پیکر ہوتے تھے۔ لیکن دورِ حاضر میں ان میں حسینیت کی تبلیغ اور مقصدِ شہادت کی اشاعت کا تصور بھی شامل ہو گیا ہے۔ پوری نظم ماتمی دُھن پر ہے اور رثا کے ساتھ امام عالی مقام کی شہادت کے رموز و نکات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض نوحے مخصوص مدار رکھتے ہیں۔ مثلاً آگ پر ماتم کے ساتھ نوحے کی کیا کیفیت اور کس طرح کے جذبات کی تخلیق ہوگی، اس سے شاعر باخبر ہے ؎

یہ تو اے لوگو! خلیل اللہ کی تعلیم ہے
یہ مقدس آگ بھی گلزارِ ابراہیم ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ نالہ پابندِ نَے نہیں ہوتا لیکن مہدی علی نے بتایا کہ نَے بھی ہوتی ہے اور "بے رنگ فریادِ بلبل" کا شیوہ ہے باعظمت مقصد کے لیے اگر نوحہ و فریاد ہے تو اس میں خونِ جگر کا رنگ بھی شامل ہوتا ہے وہ بے رنگ نہیں ہوتی۔

مہدی علی نے نوحے کی صنف کو اپنی شاعری کا ہیولیٰ دیا ہے اور نجم آفندی اور فضل نقوی کی روایات کی توسیع کی ہے اور اسے آگے بڑھایا ہے۔

——— محمد سبطین

نام کتاب: علمی و ادبی مجلہ (بسلسلۂ جشنِ سیمیں بزمِ اُردو)
مُدیرہ: صبیحہ ناز لاری زیرِ اہتمام: "بزمِ اُردو"
ملنے کا پتہ: مقبول لاری منزل۔ سٹی اسٹیشن لکھنؤ

بزمِ اُردو خواتین کی وہ واحد تنظیم ہے جس نے شمالی ہند میں زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا ہے

۱۴ر جنوری ۱۹۷۰ء کو محترمہ زیبا صلاح الدین کی قیادت میں اس کی بنا پڑی۔ ہر دو ماہ بعد پابندی کے ساتھ کسی نہ کسی عنوان سے جلسے کرتے رہنا آسان کام نہیں، جب کہ نہ جانے کتنی ادبی تنظیمیں دیکھتے ہی دیکھتے یا تو مرحوم ہوگئیں یا صرف کاغذ پر رہ گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان وادب پر ادھر بڑا زوال آیا ہے۔ حرف شناسی کا تناسب گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گیا۔ اسی کے ساتھ غیر معیاری ادب نے تیزی سے اپنے قدم جما لیے۔ مگر چاند ستاروں والے خواتین کے اس جھرمٹ نے جدوجہد، تحریک وعمل اور ذوق و وجدان سے ماحول میں جو اُجالا بکھیرا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ کبھی دوکانوں پر لگے سائن بورڈوں پر اُردو دکھلانے کی مہم چل رہی ہے۔ کبھی ڈرائنگ روم میں بچوں کے اردو کلاس لگ رہے ہیں۔ غرض چوتھائی صدی کا یہ سفر اراکینِ بزم کے عزائم کی روداد اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جس کا آئینہ یہ مجلّہ ہے جو جشنِ سیمیں کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔

انتہائی خوبصورت، دل کش اور مواد کے اعتبار سے بھاری بھرکم یہ مجلّہ اُردو والوں کو دعوتِ فکر ونظر دے رہا ہے۔ بانو داراب وفا، سرور جہاں عائشہ صدیقی، فاطمہ وصیہ جائسی، صبیحہ انور، یاد دہلوی، اُم ہانی کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ فرحت شرف الدین، صفیہ ظفر، نسیم اقتدار علی، زیبا صلاح الدین اور صبیحہ ناز لاری کے مضامین نے اسے یادگار ادبی مجلّہ بنا دیا ہے۔ مدیرہ نے جو اداریہ سپردِ قلم کیا ہے وہ بار بار پڑھنے کی چیز ہے پھر "حرف آخر" کے عنوان سے ان کی معجزانہ تحریر کی داد نہ دینا بددیانتی ہوگی۔ اراکینِ بزم اُردو کے حوالے سے مجھے اچانک "ارغنوں" کا خیال آگیا، پرواز کے وقت جس کے پروں سے نغمہ پھوٹتا ہے اور وہ فضا کی بلندیوں میں کیف بکھیرتا چلا جاتا ہے۔

——— جاوید حیدی

نام کتاب: "ایک تمنا ایک خواب"
مصنف: گیجو بھائی بدھیکا۔ ترجمہ: طاہرہ حسن
قیمت: ۳۱/- روپے
ملنے کا پتہ: نیشنل بک ٹرسٹ۔ نئی دھلی

"ایک تمنا ایک خواب" گیجو بھائی بدھیکا کی تخلیق 'دیوا سپنا' کا اُردو ترجمہ ہے جو بنیادی طور پر گجراتی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کے ذریعے مصنف نے تعلیم اور نصابِ تعلیم کے روایتی انداز کو نشانہ بنایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بچوں کے نفسیاتی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی انھیں صحیح تعلیم دی جاسکتی ہے۔ بچوں کے جسمانی اور ذہنی ارتقار کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود اور ثقافتی پروگرام بھی ضروری ہیں تبھی بچوں کی پوری طرح سے ذہنی نشو ونما ہوسکتی ہے۔ ننھے منے بچوں کو ان کی خواہش کے مطابق کھیل کھیل ہی میں تعلیم دیا جانا زیادہ موثر اور بہتر ہوتا ہے اور یہ بھی سچائی ہے کہ بنیادی تعلیم پر ہی بچوں کا مستقبل منحصر ہوتا ہے۔

'دیوا سپنا' ایک ایسے ٹیچر کی کہانی ہے جو پرانی تعلیمی تہذیب کو رَد کرتی ہے، وہ ایک عملی تجربے کے تحت محکمہ تعلیم کے افسر سے ملاقات کر کے درخواست کرتا ہے کہ اسے پرائمری اسکول کی ایک کلاس سونپ دی جائے بالآخر اسے چوتھی کلاس کو پڑھانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ یہ تجربہ چار حصوں میں کیا گیا ہے۔ تجربے کے دوران وہ تعلیم کے روایتی طریقوں اور نصابی کتابوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتا ہے۔ اس کے تجربوں کا بنیادی پس منظر مانٹیسری کا طریقہ ہے۔ تجربے کو عملی جامہ پہنانے میں اسے قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ اپنے محکم ارادہ پر قائم رہتے ہوئے اپنے مشن میں کامیاب ہوتا ہے۔

مصنف نے "ایک تمنا ایک خواب" کے ذریعے ملک کے اساتذہ کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ بچوں میں جاننے کی خواہش پیدا کرنا بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اسکولوں میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں جس سے بچے اپنی خواہش کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کرسکیں۔

افسانوی انداز میں لکھی گئی اس کتاب میں قاری کا تجسس بڑھتا ہی جاتا ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔ پوری کتاب میں کہیں پر یہ گمان نہیں ہوتا ہے کہ یہ تخلیق نہیں ترجمہ ہے جس کے لئے ترجمہ نگار مبارکباد کی مستحق ہیں۔

——— ماہناز فاطمہ

□□

اترپردیش اُردو اکادمی اور آل انڈیا میر اکادمی سرگرمِ عمل

اُردو کے مُمتاز ادیبوں اور شاعروں کو اعزازات و انعامات

اترپردیش اُردو اکادمی

اترپردیش اُردو اکادمی نہ صرف ریاست میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں کوشاں ہے بلکہ اس کا دائرہ کار ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ بچوں کو وظائف اور بزرگ و بیمار شاعروں و ادیبوں کو مالی امداد دیتی ہے تو دوسری طرف سیمنار اور مشاعرے منعقد کراتی ہے نیز اُردو لائبریریوں کی مالی اعانت بھی کرتی ہے۔ اکادمی ہر سال شائع ہونے والی کتابوں پر انعامات بھی دیتی ہے جن میں سے ایک انعام مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے منسوب ہے جو ایک لاکھ گیارہ ہزار روپئے پر مشتمل ہے۔ اکیاون اکیاون ہزار روپئے کے دو انعامات مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیے جاتے ہیں۔

اُردو اکادمی نے ابھی حال میں ۱۹۹۶ء کے انعامات کا اعلان کیا ہے ابوالکلام آزاد ایوارڈ جناب حسن کمال کو اور مجموعی ادبی خدمات کے سلسلے میں جناب خورشید افسر بسوانی اور جناب انیس انصاری کو انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

حسن کمال ممتاز شاعر اور صحافی ہیں اور ایک زمانے سے فلمی دُنیا سے وابستہ ہیں۔ خورشید افسر بسوانی مشہور شاعر و ادیب ہیں، ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انیس انصاری (آئی اے ایس) خوش گو شاعر ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اس کے علاوہ جناب وجاہت علی سندیلوی مرحوم، ندا فاضلی، فیاض رفعت اور ڈاکٹر انیس اشفاق کی کتابوں پر اکادمی نے پانچ پانچ ہزار روپئے کا انعام دیا ہے۔ وجاہت علی سندیلوی مرحوم بزرگ شاعر و ادیب تھے۔ ندا فاضلی اپنے نوکیلے لہجے اور فنی بصیرت سے ادب میں مقبول و معروف ہو چکے ہیں۔ فیاض رفعت نے فکری اساس و صلاحیت کی بنا پر ادبی دُنیا میں اپنی پہچان بنائی ہے، اور ڈاکٹر انیس اشفاق جدید شاعر و ناقد کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ ادارہ نیا دور ان تمام حضرات کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہے۔

آل انڈیا میر اکادمی

شاعرِ اعظم خدائے سخن میر تقی میر کی آخری آرام گاہ لاری منزل سے قریب ہے۔ شیدائے میر مقبول احمد لاری صاحب نے ۱۹۶۳ء میں میر کے نام پر "میر اکادمی" کی بنا ڈالی جس کے سائے میں اُردو زبان و ادب کے فروغ کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ اردو ادب کی خدمات کے اعتراف میں جناب مقبول احمد لاری صاحب نے اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو افتخار میر۔ نوائے میر۔ امتیاز میر اور میر قلم جیسے اعزازات دیئے۔

۶ر اپریل ۱۹۹۷ء کو مقبول لاری منزل میں منعقد ہونے والی تقریب میں جن دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو اعزازات دیے گئے ان کے ناموں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

افتخار میر

رشید حسن خاں، شاہ جہاں پور۔ پروفیسر عقیل رضوی، الٰہ آباد۔ پروفیسر نظام الدین گوریکر، ممبئی۔ پروفیسر یوسف سرمست، حیدرآباد۔ پروفیسر مغنی تبسم، حیدرآباد۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، لکھنؤ۔ رام لعل (پس ازمرگ)۔ وجاہت علی سندیلوی (پس ازمرگ)۔

میر قلم

احمد سعید ملیح آبادی کلکتہ، عشرت علی صدیقی، لکھنؤ۔ حفیظ نعمانی، لکھنؤ۔ پروانہ ردولوی، دہلی۔ احمد ابراہیم علوی، لکھنؤ۔

نوائے میر: پروفیسر مجاور حسین رضوی، الٰہ آباد۔ پروفیسر ممتاز احمد

پٹنہ۔ پروفیسر سید فضل امام، الہ آباد۔ پروفیسر نجم الہدیٰ، مظفر پور۔ پروفیسر مظفر اقبال، بھاگلپور۔ علیم صبا نویدی، مدراس۔ پروفیسر شیام لال کالرا عابد پشاوری، جموں۔ نذیر بنارسی (پس از مرگ)۔ ڈاکٹر سید عبدالباری سلطان پور۔ پروفیسر محمود الحسن، لکھنؤ۔ پروفیسر ثمینہ شوکت، حیدر آباد۔ شجاعت علی سندیلوی (پس از مرگ)۔ ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی، دہلی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی، بمبئی۔ پروفیسر سیدہ جعفر، حیدر آباد۔ پروفیسر عبدالحق، دہلی۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم، بمبئی۔ پروفیسر شمیم احمد، پٹنہ۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، لکھنؤ۔ ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی، لکھنؤ۔ عنبر بہرائچی، علی گڑھ۔ ابن فرید، رام پور۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگل پور۔ ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڑھ۔ پروفیسر یونس نگرامی، لکھنؤ۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں لکھنؤ۔ فیاض رفعت، لکھنؤ۔ بیکل اتساہی، بلرامپور۔ تسنیم فاروقی، لکھنؤ۔ والی آسی، لکھنؤ۔ خورشید افسر بسوانی، سیتاپور۔ مضطر لکھنوی، لکھنؤ۔ پروفیسر رشید کوثر فاروقی، لکھنؤ۔ کرشن بہاری نور، لکھنؤ۔ مسلم انصاری، گورکھپور۔ احمر گورکھپوری (پس از مرگ)۔ نور گورکھپوری، گورکھپور۔ انیس انصاری لکھنؤ۔ ظہور الدین ظہور بسوانی، سیتاپور۔ ڈاکٹر سید سلیمان حسین، لکھنؤ۔ پروفیسر حامدی کشمیری، سری نگر۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، لکھنؤ۔ ملک زادہ جاوید، نوئیڈا۔ شمس کنول (پس از مرگ)۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، علی گڑھ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ۔ عزیز بارہ بنکوی، بارہ بنکی۔ شاہ کوکب کوبخ۔ ڈاکٹر مسعود انور علوی، علی گڑھ۔

امتیاز میر

فیروز عابد، کلکتہ۔ رباب رشیدی، شاہجہاں پور۔ ڈاکٹر عبیداللہ چودھری، گورکھپور۔ اسلم واحدی، لکھنؤ۔ ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی ناگور (راجستھان)۔ اطہر نبی، لکھنؤ۔ مسیح الحسن رضوی، لکھنؤ۔ ڈاکٹر منور انجم سوناتھ بھنجن۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، اعظم گڑھ۔ ڈاکٹر محمد احمد انصاری گورکھپور۔ غلام مرتضیٰ راہی، فتح پور۔ ڈاکٹر قمر جہاں، بھاگل پور۔ سید امجد حسین، لکھنؤ۔ ڈاکٹر ہارون ایوب، چنڈی گڑھ۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ، دہلی۔ ڈاکٹر شمیم نکہت، دہلی۔ ڈاکٹر شہناز انجم، دہلی۔ عظمت اللہ خاں قانی، لاہ۔ ڈاکٹر نسیم نکہت، لکھنؤ۔ ڈاکٹر فہمیدہ کبیر، رامپور۔ سید محی الدین قادری ہادی، حیدر آباد۔ ڈاکٹر رضیہ حامد، نوئیڈا۔ فاطمہ تاج حیدر آباد۔ بشریٰ رام بہتہ الفت، لکھنؤ۔ ڈاکٹر طیب انصاری، گلبرگہ۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ناگپور۔ بیگم ہاجرہ نازلی، علی گڑھ۔ بیگم سیدہ فرحت، علی گڑھ۔ بیگم آصف اظہار علی، علی گڑھ۔ بیگم قمر جمال، حیدر آباد شاہ نواز قریشی، لکھنؤ۔ سید اختر خلش، گونڈہ۔ پی پی سریواستو رند، نوئیڈا ڈاکٹر شیو پرشاد بھٹناگر، لکھنؤ (پس از مرگ)۔ شبر امام، دہلی۔ حکیم ظل الرحمٰن علی گڑھ۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی، الہ آباد۔ بیگم انجم وہاب شمسی، رامپور فضیلت شاہ خاں، رامپور۔ سلمان علی خاں، لکھنؤ۔ بیگم صبا مصطفےٰ مدراس۔ شفق طاہری، میراں پور کٹرہ (شاہجہاں پور)۔ بیگم شہناز ہاشمی علی گڑھ۔ رفعت سروش، نوئیڈا۔ لئیق صدیقی، لکھنؤ۔ ثریا آن قدلائی لکھنؤ۔ طاہر تلہری، شاہجہاں پور۔ بیگم ہما جمال رضوی لکھنؤ۔ ڈاکٹر جہاں آرا سلیم، لکھنؤ۔ بیگم حامدہ مسعود، علی گڑھ۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی، حیدر آباد۔ تسنیم کوثر، پٹنہ۔ ڈاکٹر ذاکرہ غوث، مدراس۔ ڈاکٹر محمد شاہد حسین دہلی۔ نامی انصاری، کان پور۔ پروفیسر ایچ، ایم، طاہر علی رشانتی نکیتن ڈاکٹر صابر سنبھلی، مراد آباد۔ پروفیسر معراج احمد، لکھنؤ۔ اسلم بارہ بنکوی لکھنؤ۔ م۔ م۔ راجندر، دہلی۔ ناظمہ عالم علی، حیدر آباد۔ بیگم حبیب الرحمٰن، کان پور۔ حیات لکھنوی، دہلی۔ اسعد بدایونی، علی گڑھ۔ اظہار عثمانی، دہلی۔ پروفیسر سالم قدوائی، علی گڑھ۔ راہی فدائی، کڈپہ۔

میر ایوارڈ

اوم پرکاش راحت، فرید آباد۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ۔ سید محمد حسن، بمبئی۔ راشد آذر، حیدر آباد۔ مہدی پرتاپ گڑھی، پرتاپ گڑھ وصی محمد وصی، میرٹھ۔ نذیر فتحپوری، پونہ۔ عشرت ظفر، کان پور۔ فضا ابن فیضی مئوناتھ بھنجن۔ آنند لہر، جموں۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی، رامپور۔ راز عظیم کلکتہ۔ گوہر شیخ پوری، بنارس۔ پروفیسر احسن رضوی، لکھنؤ۔ اشفاق احمد ناگ پور۔ ڈاکٹر آصفہ زمانی، لکھنؤ۔ ڈاکٹر شیار رضوی، لکھنؤ۔ شاہدہ صدیقی لکھنؤ۔ مومنہ کشور واحدی، کان پور۔ سطوت عظمیٰ اقبال، پونے۔ ڈاکٹر شمس تبریز خاں، لکھنؤ۔ کبیر احمد جائسی، علی گڑھ۔ ف۔ س۔ اعجاز، کلکتہ وقار خلیل، حیدر آباد۔ سید بشارت علی، حیدر آباد۔ ڈاکٹر محمد علی اثر حیدر آباد۔ ایم، حبیب خاں، علی گڑھ۔ شہیر رسول، علی گڑھ۔ تسکین زیدی، کان پور۔ عشرت بیتاب، آسنول۔ ڈاکٹر نجمہ عسکری، لکھنؤ۔

ڈاکٹر فریدہ زین، حیدرآباد۔ ڈاکٹر شہناز نبی، کلکتہ۔ فیروز سلطانہ، لکھنؤ۔ بانو طاہر سعید، حیدرآباد۔

نشان مہر

حید عباس حسینی۔ اختر عمر اختر۔ ڈاکٹر بیکہ جعفری۔ ڈاکٹر جبیب پرویز۔ عامر قدوائی۔ یاور حسین۔ ذوالنورین، اکبر، مسٹر لکھنوی کاشف لکھنوی۔ سرور حسین۔ عامر بارہ بنکوی۔ قیصر لکھنوی۔ گلشن بریلوی۔ بیگم نظر لکھنوی۔ حکیم جمیل لکھنوی۔

□□

ھے وصل سے زیادہ مزہ .....

صفحہ ۲۹ کا بقیہ

منگائی اور پھر سے غزلیں کہنے اور کہانیاں لکھنے میں جٹ گئیں!!

ان کی شاعری میں ایسا نکھار آیا، ایسا شباب آیا کہ مت پوچھو۔ کہانیوں کے اندر وہ کسک، وہ تڑپ اور وہ درد تھا کہ بیان سے باہر --- اب وہ پھر گنگنانے لگی تھیں۔

ان کا کھویا ہوا، بچھڑا ہوا ہیرا انھیں پھر مل گیا تھا ---

اونچا --- شان دار --- سنہرے بالوں اور جھیل جیسی گہری آنکھوں والا --- ہو بہو قیصر ماموں --- بلکہ صرف اور صرف قیصر ماموں --!!

□□

۴۲: اُردو شعرا کی نظر میں

صہ ۴۱ کا بقیہ

زندگی کی رفعتوں سے منزلوں اونچا تھا وہ
آسمانِ معرفت کا ایک سیارہ تھا وہ

رام نے پوری زندگی اخلاقی قدروں کی پاسداری کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان سبھی تباہ کن مادی قوتوں کا خاتمہ کیا تھا جس کے باعث آج ہر انسان ان کا قصیدہ پڑھ رہا ہے۔ اس ضمن میں ساغر نظامی کے جذبات ملاحظہ ہوں ؎

سامنے جس کے لرز اُٹھا شکوہ سروری
وہ بہادر جس نے باطل کو شکست فاش دی
جس کا ہر جلوہ شعاعِ حق کا مظہر ہو گیا
ذرہ ذرہ جس کے پرتو سے منور ہو گیا

اُردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم نے رام کی عظمت کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

موہنی مورت تری دل کے صنم خانے میں ہے
تو ہے دل میں یا چراغ نور کاشانے میں ہے
یا کتاب پاک ذکر خیر ہے جس میں ترا
گنجِ راحت گویا وہ دنیا کے ویرانے میں ہے

رام کی عظمت اور ان کی عظیم داستان کا تذکرہ اُردو کے مشہور شاعر بشیشور پرشاد منور نے اس طرح پیش کیا ہے ؎

کون کہتا ہے کہ متعلق ہے ذکر پاک رام
آج تک عظمت کا جن کی ہے ہر اک دل میں قیام
تذکرہ ان کا رہا کرتا ہے گھر گھر صبح و شام
کارنامے جن کے ہیں وردِ زبانِ خاص و عام

رام چندر جی کا مثالی کردار ہندی شاعری کی طرح اُردو شاعری میں بھی ملتا ہے۔ رام کے پاک کردار کے تذکرے سے اُردو شاعری سُرخ رو ہو گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اس سے ہر بشر کو بھائی چارہ اور قومی یک جہتی کا پیغام بھی ملا ہے اور یہی ایک اچھے اور ممتاز ادب کا مقصد بھی ہے، جس کو اُردو شاعری نے بھرپور طریقے سے انجام دیا ہے۔

□□

صحافت کے محبوب کو الوداع یہ خبر بے حد اندوہناک ہے کہ روزنامہ سیاست حیدرآباد کے جوائنٹ ایڈیٹر محترم محبوب حسین جگر نے اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ موصوف نے تقریباً ۴۹ برس قبل عابد علی خاں مرحوم کے ساتھ "سیاست" کی بنیاد ڈالی تھی اور اسے مستحکم و مضبوط بنیادیں عطا کرنے میں عابد علی خاں کے ساتھ جگر صاحب کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ مرحوم جگر صاحب نے اپنی اس غیر معمولی صحافتی زندگی میں کئی نسلوں کی سرپرستی کی، ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی اور ایک اعلیٰ معیارِ صحافت پیش کیا۔ مرحوم ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۹۷ء کو جب انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا تو پوری اُردو دنیا کو سوگوار کر گئے۔ ادارہ نیا دور ان کے پسماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

عنوانات

ماہنامہ نیا دور

جلد (۵۲) نمبر (۳)

جون سنہ ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

دفتر: ۲۱۳۳۴۸ * رہائش: ۲۶۲۲۸۲

— جائنٹ ایڈیٹر —

عجیب انصاری

معاونین: محمد الیاس خان، شمیم احمد صدیقی

پبلشر

روہت نندن

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

مطبوعہ: یونائیٹیڈ ایک پریس لکھنؤ

— شائع کردہ —

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

قیمت سالانہ — تیس روپے

فی شمارہ — تین روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات

[illegible]

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے [illegible]

اپنی بات

وقت دروازے پر دستک دے رہا ہے اور دھیرے دھیرے وہ لمحہ نزدیک آرہا ہے جب آزاد ہندستان اپنی آزادی کے پچاس سال مکمل کر لے گا۔

ان پچاس برسوں میں اُردو نے اپنا کردار کس طرح ادا کیا، اس کا جائزہ دراصل ہندستان کی سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ دار ہوگا۔ دراصل اُردو کے اس کردار پر گفتگو کرتے ہوئے اُردو کا ماضی بھی ذہن نشین ہونا چاہیے اسلئے کہ تقریباً ۲۰۰ برس کی جو تاریخ رہی ہے اس میں اُردو نے ایک زندہ، فعال اور انقلابی زبان کا کردار ادا کیا تھا۔ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو اپنے ہی ساتھیوں کی غداری کی وجہ سے شکست ہوئی تھی اور اسی تاریخ سے اُردو نے بیرونی تسلط کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ یہ تاریخ کا روشن ترین باب ہے کہ سراج الدولہ کی شہادت پر رام نرائن موزوں نے اپنا سارا درد و کرب سمیٹ کر یہ شعر پڑھا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

اور یہ بھی تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا کہ پلاسی کی لڑائی میں موہن لعل اور میر مدن کا خون ایک ساتھ بہا تھا اور اُردو کے شاعر نے ہی یہ کہہ کر اس طرف متوجہ کیا تھا کہ ؎

للکاریں وہ گونجتے رن کی
موہن لعل اور میر مدن کی

جنگِ آزادی میں اُردو کے کردار کے بارے میں سرسری طور سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا تھا مگر سچ یہ ہے کہ یہ نعرہ اس عظیم سمندر کی ایک بوند ہے جو جنگِ آزادی میں اُردو ادیبوں اور شاعروں کے یہاں ابل پڑا تھا اور مصحفی سے لے کر غالب تک اور جرأت سے لے کر آغا جو شرف تک شاعروں کا ایک قافلہ ہے جو آزادی کا پرچم سنبھالے ادب کے میدان میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد چکبست، اقبال، درگا سہائے سرور، جہان آبادی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے نام زبان زد ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں جنھوں نے غلامی کی شب تاریک کو سحر میں بدلا۔

اِسی لئے ——

پندرہ اگست ۱۹۹۷ء —— رات کے بارہ بجے۔ ہندستان نے جو مقدس عہد کیا تھا اس کے پچاس برس پورے ہو رہے ہیں اور اس زندۂ جاوید لمحے کو تحریری صورت میں یادگار بنانے کا ادارہ نیا دور نے عزمِ مصمم کیا ہے اور انشاء اللہ اگست کا شمارہ آزادی کے پچاس سال کی تکمیل کا خصوصی مجلہ ہوگا۔

نیا دور نے گزشتہ چھ برس میں اپنے خاص نمبروں کی جو روایت بنائی ہے انشاء اللہ یہ نمبر بھی ادبی تاریخ کی ایک اہم دستاویز کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ آپ کے تعاون —— آپ کی دعاؤں سے ہماری ہر کوشش کامیاب ہوتی ہے —— اور ہم ان دونوں کے منتظر ہیں۔

—— ایڈیٹر

غزل

بیتے دنوں میں لوٹ کے دیکھا خواب محل آباد ملا
اے دل تیرے دلداروں میں شاہ ملے شاہزاد ملا

درباروں میں جن کے سروں پہ پگڑی تھی، دستاریں تھیں
آج انھیں ننگے سر دیکھا، شہرِ ستم ایجاد ملا

چاند سے بازی گر سے ہم نے ہر شب بازی جیتی تھی
آج ہمیں کنگال سا پاکر چاند بہت دل شاد مِلا

جن ہاتھوں نے موتی بانٹے، جن ہاتھوں میں جگنو تھے
اُن ہاتھوں کو خالی دیکھا، جو کچھ تھا برباد ملا

بیتے دنوں میں شہر ہی سارا جگمگ جگمگ کرتا تھا
آج وہ سارا شہرِ تمنّا کتنا غیر آباد ملا

وہ شاہزادہ سرو قدوں میں، دھوم تھی جس کے قامت کی
آج نہ ویسا سرو قدوں میں شمشیر و شمشاد ملا

زبیر رضوی
فلیٹ نمبر ۴۰۵، سموا اپارٹمنٹ، ۱۳۰، آئی پی ایکسٹنشن ۱۳
ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

علی جواد زیدی
۹۹/۳، وشواس کھنڈ ۲، گومتی نگر
لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

— ۱۱ —

کسی ادارے کا کُل ہند جنرل سکریٹری منتخب کرلیا جانا یقیناً باعثِ افتخار تھا لیکن اس شورانگیز دور میں ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی تھی۔ جنگ پورے زور شور سے چل رہی تھی۔ برطانوی سامراج نے مصالحت کی جو کوششیں شروع کرائی تھیں وہ اتنی بے لچک تھیں کہ بالآخر کانگرس نے مجبور ہوکر صوبائی وزارتوں سے کنارہ کشی کرلی۔ پھر انفرادی ستیہ گرہ کے نظام کے تحت، سارے وزیر اعلا، وزیر، کانگریس کے ریاستی صدر اور سکریٹری وغیرہ یکے بعد دیگرے اسیرِ زنداں ہوئے اس محدود احتجاج کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ قومی سیاست مسلسل ایک واضح ٹکراؤ کی راہ پر چل پڑی تھی۔ قیادت پوری ذمہ داری سے یہ محسوس کررہی تھی کہ عالمی جمہوری طاقتوں کو سرنگوں نہ ہونے دینا چاہیے لیکن اسی ذمہ داری کے ساتھ یہ بھی محسوس کررہی تھی کہ ہندستان، ایشیا اور افریقہ کے کروروں انسانوں کو آزادی اور جمہوریت کا حق ملنا چاہیے صرف کل کے وعدوں پر بات ٹالی نہیں جاسکتی تھی۔ جرمنی نے روس پر حملہ کرکے معاملات کو الجھادیا تھا۔ فسطائیت اور نازیت کا خاتمہ ضروری تھا ہی، لیکن جنگی کوششوں میں شرکت کرکے سامراج کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا بے چین عوام کو مشورہ نہیں دیا جاسکتا تھا۔

اسی منزل پر جنگ کی نوعیت کے بارے میں بحث چل پڑی اور اس بحث میں طلباء کے دونوں ادارے بھی الجھ پڑے۔ ایک کہتا کہ روس پر حملے کے بعد جنگ کی نوعیت عوامی ہوگئی۔ دوسرا کہتا کہ جنگ بدستور سامراجی بلکہ شدید تر شکل میں سامراجی ہوگئی ہے۔ ایک پہلو یہ نکلا کہ روس اور چین میں جنگ عوامی ہوسکتی ہے لیکن ہندستان اور دوسرے گرفتارِ استحصال، غلام ملکوں میں یہ جنگ اپنے نتائج کے اعتبار سے سراسر سامراجی ہے۔ اس پر یہ دلیل دی جاتی کہ جنگ ناقابلِ تقسیم ہے۔ اگر دُنیا کے اہم حصے میں جنگ کی نوعیت عوامی ہوگئی ہے اور ساری دنیا میں اس نے عوامی حیثیت حاصل کرلی ہے اس کے جواب میں کہا جاتا کہ جنگ کے ناقابلِ تقسیم ہونے کی صورت میں یہ ہر جگہ سامراجی بن گئی ہے۔ روس پر جرمنی کا حملہ سامراجی نوعیت کا ہے، عوامی نوعیت کا نہیں ہے۔ اس نظریاتی بحثا بحثی میں ایک بات ابھر کر سامنے آگئی کہ ملک کی بڑی اکثریت کی طرح، طلباء کی بڑی اکثریت بھی یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ یہی وقت جدوجہد آزادی کے تیز تر کرنے کا ہے۔ انھیں دنوں نیتاجی سبھاش چندر بوس نے پوشیدہ طور سے ہندستان سے باہر جاکر جرمنی اور جاپان کو ایک مرکزِ عمل بنایا اور ہندستان کی جدوجہد آزادی کو ایک نئی شکل دے دی۔ جرمنی حملے سے جرمن و جاپان کے فسطائی عزائم کا خطرہ ابھر آیا تھا۔ پھر بھی جذباتی طور پر ملک میں برطانی سامراج کے خلاف شدید جذبہ شدید تر ہوگیا تھا۔ ذراسی چنگاری زبردست آگ کو بھڑکا سکتی تھی۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں جو کارکن حضرات مختلف صوبوں اور اپنے صوبے میں مختلف ضلعوں سے آتے وہ سب برہم تھے کہ ہم جدوجہد کو اور تیز کیوں نہیں کرتے اور برطانیہ کو مجبور کیوں نہیں کرتے کہ وہ آزادی کی طرف ایک قدم اور بڑھائے اور کھل کر اعلانِ آزادی کرے چپکے چپکے نوجوان اور طالب علم راست کارروائیوں کی تیاریاں کررہے تھے۔ ہندستانی فوج کے بعض عناصر کھل کر مخالفت میں سامنے آجانے کی خبریں افواہوں کی شکل میں گاؤں گاؤں میں گشت کررہی تھیں۔ ایسے میں جنگ کے عوامی ہونے کی بات نظریاتی

سطح پر اپنا جواز نور رکھتی تھی، لیکن علی العموم حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ غرض فضا میں عجب ہلچل تھی۔ میرا ادارہ جو متحدہ ادارہ تھا اور جس کا مقصد واضح تھا، وہ اس دباؤ کو بڑی شدّت سے محسوس کر رہا تھا اور ان جذبات کو حدود میں رکھنے کا کام بے حد اہم ہو گیا تھا کہ غیر منظم اور جذباتی طور پر کام کر کے نوجوانوں کی طاقت کو منتشر ہونے سے بچایا جائے

قاضی جلیل عباسی جیل سے رہائی کے بعد کمیونسٹ دوستوں کے ساتھ ہو گئے تھے لیکن متحدہ محاذ سے بھی روابط رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے عمومی شدّتِ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ طلبا کے سی۔ پی۔ آئی بازو کے رہنما چیتن سنگھ نے کہا کہ طلبا ہم کو "غدار" کہنے لگے ہیں اور کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ (دیکھیے قاضی جلیل عباسی کی کتاب "کیا دن تھے")۔

اس سے زیادہ تفصیل میں جانا یادوں کی حدست گزر کر مختصر "تاریخ نویسی کے حدود میں داخل ہونے کے مترادف ہوگا۔ اس منظر نامے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میں دل و دماغ کی پوری طاقت کو یکجا کر کے صورتِ حال کی پیچیدگی کا اچھی طرح احاطہ کر رہا تھا۔ کبھی یہ سوچتا کہ میرے مقامی صوبائی اور ملکی ساتھی شدید احتجاج کا پروگرام بنانے کا جو مطالبہ کر رہے ہیں اس کو منظم کرنا ضروری ہے۔ میں نے مختلف مقامات کے دورے کیے یا وہاں کے مقامی نمایاں اور ذمہ دار عناصر سے رابطہ قائم کر کے سیاسی اقدامات کی نوعیت اور مقامی انتظامات کی کیفیت پر تبادلۂ خیال کیا۔ حکومت کو نوجوانوں سے خطرات تھے اور مرکزی دفتر میں اطلاعات آ رہی تھیں کہ ہمارے رفیقوں کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔ مقامی مسائل کو لے کر بعض جگہ کچھ مظاہرے ہوئے اور حکومت نے روک تھام کے اقدامات کیے، اس سے یہ خطرہ سامنے آیا کہ اگر سارے باعمل کارکن اخراج یا اسیری کا نشانہ بن گئے تو کوئی متبادل لائحۂ عمل بن جانا چاہیے۔ کئی جگہ اسٹڈی سرکل کا قیام عمل میں آیا اور ہم خیال اساتذہ اور دانش وروں کی حمایت حاصل کی گئی۔ اس سلسلے میں کشمیر تک کا سفر کیا۔ بمبئی اور کلکتہ گیا۔ ناگ پور اور مدراس کا سفر بھی ہوا۔ بڑے مرکزوں میں طلبا کی صفوں میں گروہ بندیاں ہونے لگی تھیں ہماری جماعت میں مختلف الخیال عناصر کی موجودگی سے باہمی تال میل قائم رکھنا اور خطوطِ عمل کا طے کیا جانا بھی ضروری تھا۔ اس کام میں سید محمد جعفر، صدیق احمد صدیقی، چندر موہن اوستھی، ایم۔ ایل۔ شاہ، عبدالستار پارکھ، جوشی، چندر کانت، اروند بوس، پینیہ پریہ داس گپتا، انصار ہروانی، بلرام سنگھ، رامیشور پرشاد مصر، دھرتری گنگولی، سروجنی ہتھی سنگھ وغیرہ ساتھ دیتے رہے۔

طلبا کے اخبار

دوستوں اور رفیقوں کے علاوہ عام طلبا سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے "اسٹوڈنٹ فرنٹ" کے نام سے ایک پندرہ روزہ پہلے سے شائع ہوتا تھا، لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کے شمارے ناغہ ہو جاتے تھے۔ کاغذ ایم ایل۔ شاہ اپنی کاغذ کی دکان سے بھجوا دیتے تھے، کچھ مقامی خرید بھی ہوتی تھی۔ یکے بعد دیگرے پریس بدلتے رہتے تھے، دفتر کے پاس اپنا کوئی فنڈ نہیں تھا اور کسی مخصوص پارٹی سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بیرونی مالی امداد کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ چندے مانگ مانگ کر کہاں تک اخبار چلایا جا سکتا تھا۔ یہ اخبار میری اور انصار ہروانی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ویسے تو مدیروں میں بلرام سنگھ اور دو ایک دوسرے رفقا کے نام بھی تھے لیکن کام ہمیں دو کرتے تھے۔ صوبائی اور ضلعی خبریں رفقائے کار بھیجتے تھے اور وہی مقامی طور پر اخبار کی فروخت کا کام بھی کرتے تھے۔ سب کام رضاکارانہ چلتا تھا۔ نوجوانوں میں جوش اور امنگ ایسی تھی کہ پریس تک مواد (میٹر) لے جانے اور وہاں سے واپس لانے کا کام بھی وہی کرتے۔ لیکن مالی دشواریوں کے علاوہ ہم لوگوں کے جیل چلے جانے سے یہ سلسلہ رک گیا۔ کچھ دنوں بعد ایم۔ ایل۔ شاہ نے "اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالا لیکن وہ بھی نہ چلا۔ یہ رسالہ بمبئی سے نکلتا تھا لیکن ادارت میں میرا نام بھی تھا اور میں اس میں برابر لکھتا رہتا تھا۔ اخبار کی کمی کو گشتی سائیکلو اسٹائل خبریں پورا کرتی تھیں۔ پوسٹر وغیرہ بھی چھپتے تھے لیکن زیادہ تر کام اسٹڈی سرکلوں میں ہوتا تھا جو بنارس، لکھنؤ، بمبئی اور کلکتہ میں زیادہ فعال تھیں۔

ساتھیوں کی گرفتاری کا سلسلہ جاری تھا۔ گرفتار ہو جانے کے بعد مقامی طور پر کوئی کام سنبھال لیتا تھا جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ہی

کوئی پرجوش کارکن ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مقامی قیادت بطور خود بہت کچھ کرنے لگی تھی۔ فارورڈ بلاک، سوشلسٹ پارٹی، ریوولیوشنری کمیونسٹ پارٹی کانگرس کے مقابلے میں زیادہ فعال کردار ادا کر رہی تھیں۔

لکھنؤ میں جعفر اور ادستی زیادہ تجربہ کار کارکن تھے، ان کے بھی جیل چلے جانے سے ایک خلا پیدا ہوگیا تھا جسے طلبا کے جوش و خروش نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا۔ وقتاً فوقتاً جلسے ہوتے اور جلوس نکلتے۔ لیکن اب تحریک ایسے احتجاجوں تک محدود نہیں رہ گئی تھی اور توڑ پھوڑ کے اکا دکا واقعات بھی سامنے آئے تھے۔ طلبا جلد مشتعل ہو جاتے تھے لیکن اس حال میں بھی ابھی تک حالات قابو سے باہر نہیں ہونے پائے تھے اور یہی بڑی بات تھی اور تنظیمی کامیابی تھی

پیپر مل کی ہڑتال

یادوں کے اس تاریخی تسلسل کو توڑے بغیر یہ تاثر قائم ہونے کا ڈر ہے کہ یہ یادیں یک رخی تاریخی نوعیت کی ہیں۔ آیئے تھوڑی دیر کے لیے ذرا ڈگر سے ہٹ کر بھی چلیں۔ جیل جانے سے پہلے ایک دن خبر ملی کہ لکھنؤ کی پیپر مل (کاغذ بنانے کے کارخانے) میں ہڑتال چل رہی ہے۔ ہم نے مل جل کر فیصلہ کیا کہ وہاں جاکر مزدوروں سے اپنی عملی اور جذباتی ہمدردی کا اظہار کریں۔ مزدور پہلے سے اکٹھا تھے۔ ہمارے ساتھ مجازؔ، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری اور ہریش تیواری بھی تھے۔ مزدور ساتھیوں نے جب یہ سنا کہ آنے والوں میں شاعر بھی ہیں تو ان میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ فوراً ایک عارضی پلیٹ فارم بن گیا۔ ہم سب نے مزدوروں کے مطالبات کی حمایت کی اور مل مالکوں کو دھمکی دی کہ اگر مطالبات منظور نہ کیے گئے تو نتائج خراب ہوں گے۔ ہریش تیواری طالب علم ہوتے ہوئے بھی بجلی مزدوروں کے لیڈر تھے۔ یہاں انھوں نے نظامت کا کام سنبھالا، اور ایک ایک کرکے ہماری مختصر تقریریں ہوئیں اور بعد میں کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ مزدوروں نے خاموشی سے سُنا۔ آخر میں تالیوں سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اختتام سے پہلے میں نے مزدور بھائیوں سے بھی کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے استعجاب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا یہ کہنا چاہتے ہوں کہ آپ کی طرح ہم شاعری نہیں کرتے بلکہ صنعتی محاذ پر کام کرتے ہیں۔ پھر آپس میں اشارے ہوئے اور ایک نوجوان مزدور نے اپنی بھرپور آواز میں گانا شروع کیا ؎

لہنگا تورا گھوم گھموا، چولی توری تنگ
کمسِن تورہارے نیرے لکھنؤ چلو ہمارے سنگ
آؤ ہولی کھیلیں!

پورا مجمع وجد میں آگیا اور رقص کرنے لگا۔ محنت مزدوری کی تخلیقی قوتیں سامنے آگئیں۔ اس ایک گیت سے ہماری پرجوش، ترقی پسند نظمیں، جن میں ہمت، ولولہ اور جوش کا اظہار تھا پھیکی پڑ گئیں۔ نظمیں انھوں نے خموشی سے سُنی تھیں، پسند کی تھیں جو اُن کی تالیوں سے ظاہر تھا لیکن یہ گیت ان کے دل کو چھو گیا تھا اور انھوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ ہڑتال کی مشکلوں کے باوجود ان پر خوف کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے۔ ہڑتال کے شدائد میں بھی وہ خوش تھے۔

عبد الحامد زبیری کی موت

میرٹھ میں عبد الحامد زبیری ہمارے فعال کارکن تھے، بے حد بزلہ سنج اور گرم جوش! ایک صبح کو اخباروں سے یہ اطلاع ملی کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ بے حد صدمہ ہوا۔ جلدی سے ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا اور تعزیتی رزولیوشن پاس ہوا۔ ساتھ ہی یہ طے کیا گیا کہ "اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کا ایک چار صفحات کا خصوصی شمارہ نکالا جائے۔ بلرام سنگھ اور انصار ہروانی نے میرے ساتھ مل بیٹھ کر مندرجات کا نقشہ بنایا اور فوری طور پر چندہ کرکے ابتدائی ضروری اخراجات کا انتظام کیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ ان کا پتہ وغیرہ دریافت کرکے بغرضِ تعزیت میرٹھ چلا جائے۔

—— رات کے آٹھ بجے زبیری کا فون آیا کہ خبر جھوٹی ہے ؏
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی!

مزید تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت اپنے ساتھ ایسی دشمنیاں کرلیا کرتے ہیں۔ بڑے باغ و بہار انسان ہیں۔ ختم تعلیم کے بعد دلّی چلے گئے اور وہاں ساہنی کے انگریزی اخبار "انڈین نیوز" کے ادارے میں شامل ہوگئے تھے۔

پھر مدتوں کچھ خبر نہ ملی۔ ان کی باغ و بہار شخصیت اور تحریک طلبا سے گہری وابستگی، قومی عزائم سے ہم آہنگی اور تحریک کے نزدیکی

حلقوں میں ان کا نمایاں کردار کبھی کبھی یاد آجاتا تھا۔ مختلف لوگوں سے پوچھا سُراغ نہ ملا۔ صبر کرلیا، اس یقین کے ساتھ کہ وہ جہاں بھی ہوں گے شاد و آباد ہوں گے!

کوئی چالیس برس کے بعد ۱۹۸۲ء میں کراچی جانا ہوا۔ دو چار قریبی عزیزوں کے سوا جن کے یہاں شادی میں شریک ہونا تھا اور کسی کو اطلاع نہیں دی تھی۔ ہوائی اڈے سے باہر آتے ہی ان عزیزوں نے گھیر لیا، گلدستوں اور محبتوں سے۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا مسکراتا چہرہ، میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا ـــــ

"پہچانتے ہو؟"

میں نے جلدی سے حافظہ ٹٹولا، انداز گفتگو اور آواز آشنا معلوم ہوئی ـــــ

"ٹھیک سے یاد تو نہیں آرہا ہے، حامد زبیری تو نہیں ہو؟"

بغل گیر ہوگئے۔ دوسرے عزیز اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

میں نے کہا کہ عزیزہ کی شادی میں آیا ہوں۔ پھر جائے قیام کا پتہ پوچھا اور جلد ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ جہاز دیر سے آیا تھا۔ اعزا انتظار کرتے کرتے گھبرا گئے تھے اور مجھے جلدی سے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ غیر متوقع طور پر ملنے اور اس قدر عجلت میں رخصت ہونے سے ملاقات اور تفصیلی ملاقات کی پیاس بڑھ گئی۔

دوسرے دن صبح کو اخبار "ڈان" اور "جنگ" میں میری آمد کی خبر اور جائے قیام کی نامکمل تفصیل شائع ہوگئی۔ یہ انھیں کا کرشمہ تھا۔ وہ اس وقت تک "ڈان" کے اسٹاف میں تھے۔ پھر وہ تفصیل سے ملے۔

دوسری بار غالباً ۱۹۸۶ء میں ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ خدا رکھے چند ماہ قبل انھوں نے اپنی شادی کا جشن طلائی منایا تھا۔ اس موقع پر جو رقعہ تقسیم کیا اس میں شادی کو "قید دوامی" سے تعبیر کیا تھا۔ یاد آگیا کہ جنگ آزادی کے زمانے میں مجاہدین جیل کو "سسرال" کہا کرتے تھے۔

موت کی جھوٹی خبر سے اس داستان کا آغاز ہوا تھا۔ انھیں ماشاء اللہ خوش و خرم دیکھ کر اس جھوٹی خبر کی یاد آگئی۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور خوش ہیں۔

پاکستان میں کئی اور مجاہدین آزادی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دوسرے صحافی ضمیر احمد صدیقی تھے۔ وہ بھی وظیفہ یاب ہوچکے تھے۔ ایک اور ہمسفر مگر جواں تر محمد علی صدیقی سے بھی وہیں ملاقات ہوگئی۔ "ڈان" میں ادبی کالم لکھتے تھے، پھر کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ صحافیات وغیرہ سے منسلک ہوئے ـــــ صفِ اوّل کے ناقدوں میں شمار ہوتے ہیں۔

وائس چانسلر کی دعوت

سفر کا مزا بدلنے کے لیے پُرانے واقعات بھی درمیان میں آگئے، سلسلۂ کلام پھر پیچھے کی طرف لوٹا رہا ہوں کیوں کہ پٹنہ کانفرنس کے بعد کچھ واقعات ایسے پیش آگئے کہ ان کا بیان کرنے کو جی چاہتا ہے

پٹنہ میں ہمارے قیام کا انتظام لا کالج ہوسٹل میں کیا گیا تھا۔ ایک روز رات کے کھانے کے بعد دو ہم مشرب ساتھی یعنی بلرام سنگھ اور انصار ہروانی کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ بتائے بغیر لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اور ساتھ ہی ہم دونوں کے۔ جعفر کے اور میرے ـــ ریلوے ٹکٹ بھی لیتے گئے اور ہمارے طالب علمانہ سرمائے کا ایک حصّہ بھی! اسٹیشن سے اپنی روانگی کی اطلاع بھجوادی۔ غالباً اسٹیشن پر ہم مشربیت کا حق ادا کرتے کرتے وہ کسی اور عالم میں پہونچ چکے تھے اور تعلقات دُنیاوی سے کنارہ کشی اختیار کرچکے تھے۔ مہمانی کے دن ختم ہوچکے تھے جعفر اور میں، فوری مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارے میزبان خاص ٹھاکر پرمیشوری نندن سنگھ نے یونیورسٹی سے واپسی پر یہ مژدہ سنایا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سچیدا نند سنہا نے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ میں اس اعزاز پر محوِ حیرت تھا۔ ٹھاکر صاحب نے بتایا کہ اخبار میں میری تقریر پڑھ کر موصوف کو بلانے کا خیال آیا۔

سنہا صاحب شہر ہی کی نہیں بلکہ ملک کی بھی اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ انگریزی کے ایک رسالے کے مدیر تھے اور سیاست میں بھی دخیل تھے اور مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو وغیرہ سے ان کے روابط تھے۔ وائس چانسلر تو تھے ہی، اچھے مقرر، صحافی اور دانش ور تھے۔ ان کی دعوت سے بڑی خوشی ہوئی۔ بڑے سلیقے کے لوگوں میں تھے، خوش پوشاک، خوش خوراک اور خوش مزاج دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ میں کھادی اور جواہر واسکٹ میں ٹھاکر صاحب کے ساتھ وہاں گیا۔ مل کر خوش ہوئے۔ میں نے ان کے اس

بزرگانہ برتاؤ کا شکریہ ادا کیا۔ ہم پہلے اسٹڈی میں بیٹھے۔ انھوں نے میرا پورا نام پوچھا۔ اس زمانے میں سیاسی حلقوں میں میں ایس جے زیدی کے نام سے متعارف تھا۔ پھر یکایک یہ سوال کیا کہ آپ شاعر بھی ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ "یوں ہی سا"۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بڑے میز کی دراز سے ایک رسالہ نکالا، جو لکھنؤ یونیورسٹی کا ترجمان "ونگس (WINGS)" تھا۔ اس کا ایک حصہ ہندی میں بھی شائع ہوتا تھا۔ اس حصے کی ادارت اُس وقت موجودہ صدر ہندستان پنڈت شنکر دیال شرما جی کرتے تھے، میرے ہی شعبۂ قانون سے وابستہ تھا۔ سنہا صاحب نے اس رسالے کا ایک ورق اُلٹتے ہوئے مجھے دکھایا کہ "یہ نظم آپ ہی کی ہے نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ میری نظم کا عنوان تھا: "میری راہ میں"۔ اس میں ہر بند کے بعد تضمین کے طور پر یہ سوال دُہرایا جاتا تھا:

"تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟"

اس نظم کی انھوں نے تعریف کی۔ میرا دل اس تعریف کی گرمی کو یاد کر کے ان کے خلوص سے آج بھی مسرور ہو جاتا ہے۔ یہ نظم یونیورسٹی میں اور طلباء کے اجتماعات میں بہت مشہور تھی۔ جہدِ آزادی کے ان لمحوں میں بہت سے دل اپنے جذبات کی دھڑکنیں محسوس کرتے تھے۔ یہ اس دور کا دردِ مشترک تھا! اس ابتدائی تعارف کے بعد کھانا ہوا۔

کھانے سے فراغت پا کے سنہا صاحب نے اپنے بیش قیمت کتب خانے کی سیر کرائی۔ بڑا اچھا ذخیرہ انھوں نے یکجا کر لیا تھا اور سب کتابیں سلیقے سے الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ الماریاں درجہ بدرجہ سہ منزلہ سجی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر والی منزل کی طرف خصوصی توجہ دلاتے ہوئے معزز میزبان نے بتایا کہ "اس میں ضبط شدہ کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ جب کوئی گورنر آتا ہے تو میں اسے کھانے پر بلاتا ہوں اور خاص کر یہ الماریاں دکھاتا ہوں جن میں حکومت کے ضبط کیے ہوئے مطبوعات سجے ہوئے ہیں"۔ یقین ہے کہ یہ ذخیرہ اب بھی محفوظ ہوگا اور ریسرچ کرنے والوں کی نظر اس پر ضرور پڑی ہوگی۔

اس موقع پر انھوں نے کئی لطائف سُنائے۔ اُن میں سے ایک خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ ایک بار گاندھی جی وائسرے سے ملاقات کو جانے والے تھے ان کے ہمراہیوں میں جواہر لال نہرو کے علاوہ پنڈت مدن موہن مالویہ بھی تھے۔ سنہا کو علم ہوا تو وہ بھی وقت معینہ سے پہلے باضابطہ لباس پہن کر پہونچ گئے کہ باپو کو سلام کر لیں۔ اس وقت کوئی اور ہستی مدعو نہیں تھی۔ گاندھی جی نے دیکھ کر استفسار کیا کہ کیسے آنا ہوا؟ انھوں نے بڑی سادگی اور بے باکی مگر احترام سے کہا کہ "مجھے خوف تھا کہ مالویہ جی حسبِ عادت دیر سے آئیں گے۔ آپ مقررہ وقت کے بعد ایک لمحہ بھی انتظار کرنا پسند نہ فرمائیں گے۔ ممکن ہے کہ کسی اور ہمراہی کی ضرورت ہو تو بندہ پوری طرح تیار ہے۔ وہ نہ آئے تو آپ کی زیارت کی سعادت تو حاصل ہو ہی جائے گی"۔ حسنِ اتفاق سے مالویہ جی وقت پر نہیں آئے اور گاندھی جی نے سنہا سے اشارہ کیا کہ "اچھا تو تم ہی آ جاؤ"۔ میں نے قدم چومے اور ساتھ ہو لیا۔

بہت دنوں کے بعد پٹنہ ایک بار پھر جانا ہوا۔ اس وقت میں یوپی کے محکمۂ اطلاعات میں آ چکا تھا۔ سلام کرنے حاضر ہوا۔ محکمہ کا انگریزی رسالہ U.P. Information خصوصی نمبر نکالنے والا تھا۔ سوچا ان سے مضمون کی استدعا کروں۔ وہ ان دنوں بیمار تھے، چلتی کرسی پر آئے تھوڑی دیر حالات پوچھے۔ میں نے مضمون کی فرمائش کی۔ کہنے لگے "حال دیکھ رہے ہو۔ پھر بھی کوشش کروں گا"۔ انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا۔

سن بیالیس کے اندولن کی شام کی شفق پھول رہی تھی۔ آنے والی صبحیں طوفان برپا کرنے والی تھیں۔ میرے لکھنؤ کے قیام کا زمانہ خاتمے کے قریب تھا۔ وکالت کی تعلیم مکمل کر کے اعظم گڑھ جانے اور وہاں کے مشہور وکیل اور شاعر اقبال احمد سہیل سے ایڈووکیسی کی تربیت لینا تھی۔ حالات کا عام رُخ بدلنے والا تھا لیکن اب کوئی آنے والے طوفان کو روک نہیں سکتا تھا۔

جہان آباد کانفرنس

اُس دور کے حالات پر پردہ گرنے سے پہلے جہان آباد (بہار) کی طلبا کانفرنس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کانفرنس کے منعقد کرنے والوں میں سوشلسٹ آگے آگے تھے۔ رام برکش بینی پوری

اور بساون سنگھ وغیرہ قیادت کا بار سنبھالے ہوئے تھے۔ مجھے کانفرنس کی صدارت کا شرف بخشا گیا تھا۔ وہاں میرے لیے ایک بگھی (وکٹوریہ) مہیا کی گئی اور میرے استقبال میں اچھا خاصا جلوس مرتب کیا گیا۔ میرے ہم سن اور کم عمر طلباء کے ساتھ ساتھ سیاسی معززین بھی ہمراہ تھے۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس عمر میں اور طلباء کی تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے ایسا اعزاز پیار اور خلوص کا پیامی تو تھا لیکن کچھ اٹپٹا سا لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی دل کہتا کہ بس اب اُتر ہی پڑو۔ اپنے بغل میں بیٹھے ہوئے نوجوان نیتا سے میں نے کہا کہ بھائی بہت بہت شکریہ۔ میں بہت چھوٹا انسان ہوں۔ آپ ہی کی طرح نوجوان ہوں، اتنی اہمیت کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن ایک نہ مانی گئی اور مجھے اسی عالم میں جلسہ گاہ تک لے جایا گیا۔ یہ اعزاز میرے لیے نہیں تھا۔ میں تھا ہی کون؟ بلکہ یہ اعزاز تھا تحریک کے لیے، جنگِ آزادی و اتحاد کے لیے۔ جلسے میں میرے بارے میں محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا گیا اور میری ایسی ستائش کی گئی کہ میں خود اپنی نگاہ میں اجنبی معلوم ہونے لگا۔

جب میں خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوا، تالیوں اور نعروں کی گونج میں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میں رَو میں تقریر کیے جا رہا تھا اور مجمع ہمہ تن گوش سُن ہی نہیں رہا تھا بلکہ تالیوں اور نعروں سے دل بھی بڑھا رہا تھا۔ میں نے اس خطرے سے آگاہ کیا جو سامراجی طاقتیں ہمارے قومی اتحاد کو منتشر کرنے کے لیے کر رہی تھیں۔ "ہم ایک ہیں اور ایک رہیں گے، بڑھتے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" جو بزرگ ہمیں آہستہ روی کا مشورہ دے رہے تھے، ان کے بارے میں میں نے فی البدیہہ کہا تھا

ہر قدم پر روکنے والوں کے نام
تن چلوں کو ٹوکنے والوں کے نام

دوستو! ہم آج پیمانہ اُٹھائیں
مسکرائیں اور ان کو بھول جائیں

خود جو رُک جائیں تو چنداں غم نہیں
کارواں لے چلنے والے کم نہیں

اُس عمر میں یہ تجربہ ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ میری تقریر اخباروں میں شاہ سرخیوں میں چھپی تھی۔ فرقہ وارانہ زہر کے خلاف اور سست روی کی پالیسی کے خلاف یہ بھرپور وار تھا جو بہار کی فضا میں جادو جگا گیا تھا۔ نوجوانوں نے میرا بڑا دل بڑھایا۔ میری جنرل سکریٹری شپ کے دوران یہ پہلا کامیاب اور بیداری کے جذبات سے مملو عملی اجتماع تھا اور ایسے ہی دوسرے اجتماعات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

(جاری ہے)

غزل

وہ مجھ سے بچھڑا تو کچھ نہ بولا، جلال اندر، عتاب باہر
خموش میں بھی وہیں کھڑا تھا، ملال اندر، حجاب باہر

میں سوچتا تھا مری طرح وہ بھی موسمِ ہجر سے ڈرے گا
مگر وہ اوسر زمین نکلا، نہال اندر، خراب باہر

وہ پیار کرنے کے بعد گر ایسے زخم دیتا تو ٹھیک لگتا
مگر وہ پہلے ہی بدگماں تھا، سوال اندر، حساب باہر

مری جبیں اس کے سنگِ در کو لہو سے گلنار کر چکی تھی
وہ سنگ بے چشمِ نم سے گزرا، خیال اندر نہ خواب باہر

میں آخری وقت تک یہ سوچا کیا کہ شاید پلٹ کے آئے
مگر وہ ضد میں کچھ ایسا الجھا، سوال اندر، جواب باہر

مجھے یقیں ہے کہ ایک دن مجھ کو یاد کر کے وہ رو پڑیگا
مگر مرا پھر پتہ نہ ہوگا خیال اندر نہ تاب باہر

انیسؔ کیسا یہ سانحہ تھا کہ روتے روتے گزر گئی شب
وہ جو نہی لوٹا میں سو چکا تھا نڈھال اندر، حباب باہر

انیس انصاری
۲۰ ٹائپ VI ڈالی باغ، لکھنؤ

غزل

رستے میں گاؤں کے جو پرانے شجر ملے
ہم اپنے بچپنے سے بہت ٹوٹ کر ملے

یادوں کے بادبان کھلے پانیوں پہ تھے
اپنوں کے جب خطوط مجھے میز پر ملے

یادوں کا لمس، دردِ محبت، غبارِ شب
یہ غم گسار جب بھی ملے معتبر ملے

حق گوئی کے سفر میں کئی باضمیر لوگ
نیزے پہ بھی اٹھائے ہوئے اپنا سر ملے

قسمت ہماری ڈھونڈ رہی تھی رہِ فرار
کچھ سلسلے زوال کے جب منتشر ملے

یوں خندقوں سے جھانک رہا تھا غبارِ شب
اس خوف سے نہ اس کو نمودِ سحر ملے

تنہائیاں تو رِند لہو چاٹتی رہیں
لمحاتِ انتظار گلے سے مگر ملے

پی پی سریواستو رِند
آر - ۱۶ سیکٹر ۱۱
نوئیڈا
۲۰۱۳۰۱

جدھر ہوا کی ضرورت نہیں ہوا ہے وہاں
جنھیں خدا کی ضرورت نہیں خدا ہے وہاں

زمیں پہ رہتے ہوئے بھی خلا میں ہیں ہم لوگ
جہاں خلا کی ضرورت نہیں خلا ہے وہاں

بس ایک عالمِ ہُو سا دلوں کے اندر ہے
جدھر صدا کی ضرورت نہیں صدا ہے وہاں

سخن کی سوکھی ہوئی کھیتیوں سے کافی دور
جہاں غنا کی ضرورت نہیں غنا ہے وہاں

یہ رینگتی ہوئی مخلوق مثلِ مور و ملخ!
جسے وبا کی ضرورت نہیں وبا ہے وہاں

خدائے بندۂ بیچارگاں سے پوچھے کون
جہاں نوا کی ضرورت نہیں نوا ہے وہاں

ڈاکٹر اسعد بدایونی
شعبۂ اردو
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

میری آنکھوں میں کرچیاں رکھ دے
ریت کے گھر میں آندھیاں رکھ دے

یا کوئی خواب دے نگاہوں کو
یا دریچے پہ انگلیاں رکھ دے

ایک جھونکا ہوا کا یوں آئے
کھول کر ساری کھڑکیاں رکھ دے

آنے والے مسافروں کے لئے
راستے میں نشانیاں رکھ دے

میرے ہونٹوں پہ خامشی ہے بہت
ان گلابوں پہ تتلیاں رکھ دے

شکیل اعظمی
۱۸۰۸/۵ - ہیرا اسٹورس
سید پورہ مین روڈ
سورت ۳۹۵۰۰۲

خودنوشت

جوگندر پال
۲۰۴- مندا کنی انکلیو، نئی دہلی



اعترافات

اِس وقت مجھے یاد نہیں آرہا، میں نے کہاں لکھا تھا کہ کسی اور نے آپ کو پکڑ رکھا ہو تو فرار کی راہ کٹھن ہو جاتی ہے۔ مگر خود آپ نے اپنی کلائی کو کتنی ہی مضبوطی سے کیوں نہ پکڑ رکھا ہو، آپ بڑے مزے سے جب اور جہاں چاہیں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی بڑا سکندر کیوں نہ ہو بس ایک اپنی ہی گرفت میں نہیں آپاتا ـــ میں کس گنتی میں ہوں؟

جس شخص کو اپنے آپ سے اتنی محبت رہی ہو جتنی مجھے مجھ سے ہے، وہ بے چارہ اپنے آپ کو اور دنیا کو بھی کیا سمجھ پایا ہوگا؟ ـــ کہ میں کتنا اچھا ہوں! ـــ کہ مجھ سے ہر کوئی کتنا پیار کرتا ہے ـــ! سب کے سب ہیرے سپنے ہیں ـــــ ہہ ہہ ہا ـــ لائیے، لالی پاپ مجھے بہت پسند ہے ـــ لائیے، جیب میں پیسے ہیں تو دو دو پیسے میں سارے ہیرے سپنے خرید لیجیے ـــــ ہہ ہا ہہ! ـــــ ہنس کیوں رہا ہوں؟ ہنسنے ہی کی تو بات ہے۔ کون کس سے محبت کرتا ہے؟ سبھی اپنے اپنے گن گانے کے لیے ایک دوسرے کے گن گاتے ہیں مگر کب تک؟ جھنکا کھا کر آدمی خدا کا نام بھی اسے للکارنے کے انداز میں لیتا ہے۔ غم و غصہ نہ ہو تو خوابیدہ محبت ہڑبڑا کر جاگے گی کیونکر؟ اور جاگے گی نہیں تو پھر سوئی پڑی کی باہیں اپنے گلے میں ڈال کر اس کے ساتھ آنکھیں موندے لیٹے رہیے۔ میری زندگی کا سارا اوائل اسی مانند آنکھیں موندے بیتا ہے۔ میں شاید اتنا برا بھی نہ تھا، مگر یہ کیا تک ہوئی کہ کوئی اپنی اچھائی پر کچھ اس انداز سے اتراتا رہے جیسے خود سے یکسر ناواقف ہو۔ کوئی اتنا خود پارسا، اتنا احمق اور اتنا فراڈ ہو سکتا ہے کہ سوجھ بوجھ کا زمانہ بھی احمقوں کی جنت میں جھولا جھولتے اور انگوٹھا چوستے بتادے۔ ایک بیوقوف وہ ہوتے ہیں جو ہوں ہی نرے پرے بیوقوف ایسے لوگ بھی بھلے لگتے ہیں ـــ میں؟ ـــ میں نے تو اپنی حماقتوں کو بیساکھیاں بنا رکھا تھا، تاکہ لنگڑا ہونے کے باوجود بھاگتا بھٹکتا رہوں اور کہیں کوئی پکڑ نہ پائے کہ میں تو محض میں ہوں، جو بھی ہوں پر میں ہی ہوں۔

لنگڑا جی ہی جی میں سب سے تیز دوڑ رہا ہوتا ہے اور ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلہ طے کر کے سمجھنے لگتا ہے کہ دنیا کے انتہائی کنارے پر آ کھڑا ہوا ہے۔ مجھے یہی کچھ پیش آتا رہا ـــ نہیں، میری آنکھیں صحیح سلامت تھیں اور مجھے وہاں تک صاف نظر آتا تھا جہاں تک اپنی دو آنکھوں سے، یعنی صرف یہاں سے وہاں تک، مگر حد تو یہ ہے کہ بس اتنے کو ہی میں نے دنیا کا انتہائی کنارہ سمجھ لیا۔ ـــــ نہیں! ـــ ٹھہریئے، یہاں سے وہاں تک بھی سارے کا سارا مجھے کہاں نظر آتا؟ اتنے میں بھی میں وہی کچھ دیکھتا جو دیکھنا چاہتا تھا اکثر تو یہ ہوتا کہ جو کچھ وہاں موجود نہ ہوتا وہ بھی میں اپنی دانست میں صاف دیکھ رہا ہوتا ـــ تو پھر کیا میں نے غلط کہا ہے کہ میری آنکھیں سلامت تھیں؟ ـــــ ہاں، شاید! ـــــ نہیں، یقیناً یوں ہی ہے۔ میں ـــ کنوئیں کا مینڈک ـــــ اپنی دو آنکھوں کے سامنے سانپ کے منہ میں بھی اپنی خوراک کی جھلک پا کر پھدک جاتا اور جب سانپ مجھے نگل رہا ہوتا تو میں اس کے حلق میں پاؤں مار مار کر اپنی خوراک کا کوئی ریزہ ٹٹول پانے کا جتن کر رہا ہوتا۔

کتابوں میں اکثر موت کی بے پایاں وسعت کا ذکر آتا ہے۔ اپنی زندگی میں بار بار موت کی واردات سے دوچار ہونے کے بعد میرا تو تجربہ ہے کہ موت بے نہایت تنگ ہے، اتنی کہ مرنے والے

کو اپنے بدن کی تنگ مکانیت بھی نصیب نہیں رہتی ـــــ نہیں، مجھے معلوم نہیں کہ ایسی موت مجھے کتنی بار پیش آئی۔ جس شخص کو قدم قدم پر ذلتوں کا سامنا رہا اور جس کی سلامتی کا انحصار مر کے کسی نئی زندگی کا ٹھکانہ کرنے پر تھا وہ اپنی ہر نئی موت کا حساب رکھتا یا نئی زندگی کی ذلتوں سے سرخروئی کا سامان کرتا ـــــ نہیں، زندگی موت کے خاتمے سے نہیں، موت کو بھی جیسے جانے سے عبارت ہے۔ جیسے جانے کی خواہش ـــ خود کو نہیں تو کسی اور کو جینے کی خواہش عین فطری ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کوئی بھی ذی جان از خود اد رہے سرد کار نہیں جی پاتا اور خالصتاً خود کو جیسے جانے کا دعوے دار بھی دراصل انجانے میں اپنے سارے آس پاس، آس پاس کے مکینوں ـــ دوستوں اور دشمنوں کو جی جی کر خود کو جی پا رہا ہوتا ہے۔ اس سیاق میں پرائیوٹ لائف کے حرکات کا تصور بھی پبلک لائف کے تصور کے بغیر ممکن نہیں چنانچہ کوئی ایک کہیں کچھ کرتا ہے تو انہی حالات میں کسی اور سے بھی کہیں اور عین وہی سرزد ہو سکتا ہے۔ مجھے بڑی اذیت ناک آہستگی سے اپنی ذات کی زیریں لہروں میں اجتماع کی نیکیوں اور بدیوں کی یکساں کارکردگی کا احساس ہونے لگا اور اس طرح ہوتے ہوتے میں باقاعدہ (بے قاعدہ) کہانی کار بن گیا اور اس بنیادی حقیقت پر باور کرنا میرے لیے مشکل نہ رہا کہ جہاں تہاں کسی سے جو گناہ بھی سرزد ہوتا ہے وہ مجھ سے ہی سرزد ہوتا ہے، میں ہی گناہگار ہوں اور میرے لیے کہانیوں میں اس اعتراف کو کالیاں سی ہنرمندی کے جُست اظہار سے ٹالنے سے بہتر ہوگا کہ میں سرے سے کہانیاں ہی نہ لکھوں۔

کسی کہانی کار کو ـــــ اکثر اوقات خود کو بھی اپنی کسی کہانی پر اتراتے ہوئے پا کر میں ہنسنے لگتا ہوں۔ کوئی اچھی کہانی لکھ کر تو ہمیں گویا اپنے ہی کیے کے اقبال پر شرمندہ ہو جانا چاہیے، چہ جائیکہ ہم اسے اپنی تحسین و توصیف کے اسباب میں شمار کریں۔ کہانی تو بہر حال کسی شر یا خوف کے تناؤ میں کسی شخص کا بالواسطہ اعتراف ہے جس کی شائستگی معمولاً اس شخص کی ندامت سے وابستہ ہونی چاہیے۔

کئی بار تو ایسا ہوا ہے کہ اپنے آپ میں بلاواسطہ اعتراف کی جرأت نہ پا کر میں راست اپنا ہی کیا اپنے کسی کردار کے سر منڈھ دیتا ہوں اور یوں اپنی شرمندگی کا یہ محفوظ اقدام کر کے اپنی پیٹھ تھپکنے لگتا ہوں۔ لیکن وہ کردار اگر واقعی میری آپ کی طرح ذی جان ہے تو سے تو یہ زیادتی ہی، کہ کروں میں اور بھگتے وہ۔ لیکن سچ بتا رہا ہوں کہ ایسے کئی کردار میری کتابوں سے نکل کر مجھے آ لیتے ہیں اور جو ذرا اکھڑے ہوتے ہیں وہ تو مار پیٹ پر بھی اتر آتے ہیں۔

ابھی پچھلے ہفتے ہی میرے افسانے "گرین ہاؤس" کا مولو نامعلوم کہاں کہاں سے میرا پتہ پوچھ کر میرے سر پر آ سوار ہوا۔ سلام، نہ دعا آتے ہی گرجنے لگا:

"تم ہوتے کون ہو؟ ـ اے میر سکنڈ لائز! ـــــ میں تم پر دس لاکھ ڈالر کی ہتک کا دعویٰ دائر کروں گا۔"

"تمہاری عزت کی قیمت صرف دس لاکھ ڈالر ہے۔؟" معاملے کی نزاکت کے باوجود میں ہنس پڑا۔

"ارے بیٹھو بھائی۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔"

میں نے اسے بڑی مشکل سے بیٹھنے پر رضامند کیا۔ آپ بھی اس کی شراب کی کمزوری سے واقف ہیں۔ میں نے اسکاچ وہسکی سے اس کی خاطر داری کی اور وہ ذرا ڈھیلا ہوا تو اس سے گویا ہوا:

"تم اتنے چوکس ہو مسٹر مولو۔ تم سے لیپا پوتی کرنے سے کیا حاصل؟ میں اقبال کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں۔"

"تو پھر سیدھے سیدھے اسے آپ بیتی کہو، کہانی کیوں کہتے ہو؟" اس نے ہونٹوں پر زہر خند پھیلا کر کہا۔ "مگر تم لوگوں کو آپ بیتی بھی لکھنا آتی ہو تو لکھو ـ وہ تو تم اول تا آخر اپنی آرتی اتارتے ہوئے ہی پوری کر دیتے ہو۔"

"ارے بھائی، معاف کر دو ـ میں کہہ چکا ہوں نا، وہ میں ہی ہوں، مگر سچ بتاؤ۔" میں نے آواز کو بڑا ڈرامائی کر کے چھوڑ دیا ـــ "کیا وہ تم بھی نہیں ہو ـــ؟"

اس نے مجھے ٹوکنا چاہا۔

"نہیں۔" میں نے اسے روک دیا۔ "کسی تیکھے جملے سے کام نہیں چلے گا۔ ذرا سوچو، اگر وہ تم بھی نہیں ہو تو مجھے ہو بہو سوجھ کیسے گئے۔؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "ارے ہاں! ہوں تو وہی، جو ہو گیا ہوں۔" وہ ہنستا چلا گیا۔ "چلو چھوڑو۔ اگر مجھے اپنا جہنم جیسے جانا ہے تو لاؤ، ایک اور ڈبل وہسکی ڈالو۔"

میرے کردار اکثر میرے پاس آنکلتے ہیں۔ اور تو اور 'گنگا رام' کا مکئی گیٹ کے قبرستان کا وہ بزرگوار کتا گنگا رام بھی ــ وہ مجھے یہاں دلّی میں میرے گھر کی چوکھٹ پر اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر بیٹھا مل گیا۔ میں تو اسے پہچان نہ پایا مگر وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے تپاک سے بھونکنے لگا۔

"ارے تم؟ کتنے بوڑھے ہو گئے ہو گنگا رام! جھرّیوں میں کہیں دکھتے ہی نہیں۔"

"اب کچھ رہا ہی نہیں تو دکھوں گا کیسے؟"

"مگر تم کہانی سے باہر کیسے نکل آئے؟" مجھے اس کی حالت پر رحم آنے لگا ــ "اپنی کیا دشا بنالی ہے۔ وہاں تو سارے محلے کے چودھری بنے بیٹھے تھے۔"

گنگا رام جواب دینے سے پہلے اپنی سانسوں کو مجتمع کرنے کے لیے بھونکنے لگا۔

"بوڑھا تو میں انہی دنوں ہو چکا تھا بابو، اتنے سال بعد مجھے کوئی جوان ہو جانا تھا؟ ــــ ہُوں! ــ ہُوں! ــ محلّے میں اب رہ کون گیا ہے جو چودھری بنا پھرتا ــ؟" بوڑھے کتّے نے پھر اپنی سانسیں اکٹھی کرنے کی کوشش کی۔ "پنڈت رام رکھّا نے بیماری اور بڑھاپے سے تنگ آکر اپنے بیل کسی کے ہاتھ بیچ دیئے اور پھر روتے روتے آپ بھی پرلوک سدھار گیا ــــ ہُوں! ــــ سید امجد علی بھی اپنی بیٹی شنّو کی شادی کر کے ....."

شنّو کا نام سن کر میرا تجسس اچانک ہڑبڑا کر جاگ پڑا ــ "شنّو کی شادی ہو گئی؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو بابو؟ کنواری لڑکی کو کون ساری عمر گھر میں بٹھائے رکھتا ہے ــ؟"

میرا چہرہ لٹک گیا۔ مگر بابا سیال مرحوم یاد آجانے پر میں خود کو اسے ٹوکنے سے روک نہ سکا ــ "بابا سیال کیا ویسے ہی قبر سے اُٹھ کر کرنل جے رام کے پاس آبیٹھتا ہے ــ؟"

"کرنل شراب سے دُھت پڑا رہتا تھا، کب تک ٹک ٹک کیے جاتا؟ وہ چل بسا تو بابا بھی قبر میں روپوش ہو گیا۔"

میں سب کچھ بھول کر اپنے فلیٹ کی چوکھٹ پر گنگا رام سے ہمکلام تھا۔ اب اسے اپنے ساتھ اندر لے جانے کی سوچی تو خیال آیا کہ یہ فلیٹ کوئی اورنگ آباد کے مکئی گیٹ کا پارک والا تو ہے نہیں۔ چھوٹا سا فلیٹ ہے جس کی مُٹھی سی مکانیت کے بارے میں میرے بہو بیٹا پہلے ہی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ان کے بچّوں کے پڑھنے کے لیے کوئی علاحدہ کمرہ بھی نہیں، اور میں یہی سوچتا رہ جاتا ہوں کہ میں اور کتنے دن زندہ رہوں گا؟ میرے اُٹھ جانے پر ہی ان کا یہ کام ہو پائے گا۔

آپ کو معلوم ہے، گزشتہ دنوں کیا ہوا؟ ــ ہمارے ہی گھر میں گنگا دئی گھر کا سارا کام کاج سنبھالے ہوئے تھی، پر مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ یہ تو وہی ہے، میری ایک پُرانی کہانی "جادو" کی بھابو! ــ کیا ہوا کہ ایک دن میں نے گنگا دئی کو بھابو ہی کی طرح رسوئی خانے میں اکیلے برتنوں سے باتیں کرتے سُن لیا ــ

"ارے بھابو! یہ بہروپ بھرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم تو تم ہی ہو، اور ادھر مجھے دیکھو، تم اتنے دنوں سے ہمارے یہاں کام کر رہی ہو اور میں تمھیں پہچان ہی نہ پایا۔" وہ مجھے کوئی جواب دینے کے بجائے ویسے ہی چپ چاپ کھڑی رہی جیسے کہانی میں ــــ "اری کچھ تو بولو ــ کیا تمھارا وہ بھگوڑا بیٹا ــــ؟"

"اس کا ذکر مت کرو بابو ــ اس کا مونچھوں بھرا چہرہ موری آنکھوں میں گھومتا ہے تو لگتا ہے اس کا بلات کاری باپ موا موری ترپھ بڑھا آرہا ہے ــــ"

میری کہانیوں میں بسے بسے یہ لوگ تو بالعموم جہاں بھی جاتے ہیں رات بتانے کے لیے وہاں سے کہانیوں میں لوٹ آتے ہیں، مگر میری ادھر کی ایک واردات میں، میں نے اپنے کسی تعصب کی بنا پر جو ہیرو اور ہیروئن کی شادی نہ ہونے دی تو وہ دونوں میری آنکھوں میں خاک جھونک کر ناول سے فرار ہو گئے۔ میں نے ان کی تلاش میں

سارا ناول چھان مارا۔ انھیں اُن کے ناموں کی اوٹ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بے حال ہوگیا مگر وہ وہاں ہوتے تو ملتے۔ میں تھک ہار کر پڑ گیا۔ پھر کئی سال بعد وہ دونوں اچانک مجھے اپنے ہی شہر میں مل گئے۔ وہ مجھ سے بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے اور بتایا کہ ناول سے فرار ہوتے ہی انھوں نے نکاح پڑھوالیا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے جہاں وہ اپنے دو پھول سے بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی بسر کر رہے تھے۔ مجھے اپنے ناول کی ویرانی کا خیال آیا مگر انھیں اس قدر بسا ہوا دیکھ کر مجھے حوصلہ ہی نہ ہوا کہ انھیں واپسی کے لیے کہتا۔

اپنے بھانت بھانت کے کرداروں کی سالہا سال کی رفاقت کے باعث وہ مجھے سچ مچ کے لوگ معلوم ہوتے ہیں، اور سچ مچ کے لوگ مانو کہانیوں کے، شاید اس لیے کہ انھیں مجھے کہانیوں کی سچائی میں بجنسہٖ برتنا ہوتا ہے اور انھیں سہولتاً۔ سہولتوں کا پاس بھی کوئی غیر شعوری عمل نہیں۔ تاہم اس پاس میں بسا اوقات کئی مفروضے بھی راہ پا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی مجھے مفروضوں کے شکنجے کے مانند پیش آتی رہی ہے مگر کہانیاں؟ —— انھیں تو مجھے عین بعین سینا پرونا ہوتا ہے، کرنا ہوتا ہے۔ مفروضوں کو کام میں لا کے کسی کہانی کے پیر اس کے کندھوں پر کاڑھ دوں اور کندھے اس کے پیروں پر۔ تو وہ بے چاری توڑھیر کی ڈھیر پڑی رہ جائے گی سو مسئلہ دراصل یہ ہے، کسی کو واقعتاً زندگی کرنا ہوتی ہے یا کہانی؟ میری یہ واردات اگر آپ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں تو آئیے! ذرا اور غور کرلیں۔ زندگی بھی جتنی اور جیسی ہے وہ ہمارے گمان میں ہی ہے وگرنہ ہر روز بیسیوں لوگوں کو اپنی دو آنکھوں کے سامنے سڑکوں، بسوں اور ریل کے ڈبوں میں دیکھتے ہوئے بھی ہم ان کی موجودگی سے بے خبر کیوں ہوتے ہیں؟ ہمارا ذہن انھیں رجسٹر کیوں نہیں کرتا؟ انھیں بھی چھوڑیئے۔ کیسوں کے ساتھ تو پوری زندگی گزار کر بھی ہم انھیں قطعاً نہیں جانتے۔ جاننا بھی نہیں چاہتے، تو پھر بات تو یہی ہوئی کہ جو جیسے بھی ہے، یا نہیں ہے، وہ گمان میں ہی ہے۔ اسی اعتبار سے لوگ میری کہانیوں کے منطقوں کی پرچھائیوں میں سچ مچ کے لوگ منڈلا رہے ہوتے ہیں، اور میری زندگی کی نمایاں تفصیلات انھیں کے ساتھ انجام پاتی ہیں۔

آپ شاید مجھ پر ترس کھا رہے ہیں کہ میں نے کہانی کا رسنے کے بھرم میں خواہ مخواہ اپنی نجی زندگی کو قربان گاہ پر چڑھا دیا۔ مگر میں ہوں ہی کیا، جو واقعی کچھ ہوتا؟ تخلیق کار کے لیے چارۂ سوا اس کی تخلیق ہی تخلیق ہوتی ہے۔ وہ خود آپ نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے تو اپنی کتھاؤں کا ہی ایک پاتر۔ ہر کمینہ، ہر رذیل، ہر ظالم، ایک وہی، اور ایک اسی کی کمینگی، اسی کی رذالت اور اسی کے ظلم سے یہاں، وہاں اور نامعلوم کہاں —— جہاں جہاں بھی انسانی دکھ کے اسباب رونما ہوتے ہیں وہ انھیں محسوس کرکے، اپنے تاسف کی تاب نہ لاکر اپنی کہانیاں رچانے میں اتنا کھویا ہوتا ہے کہ کسی کو نظر ہی نہیں آپاتا۔ کہیں ہوتا ہی نہیں تو نظر کیسے آئے؟ یا پھر نظر آ بھی جائے تو وہ کوئی اور ہو۔

اس کے باوجود میرے احباب اکثر مجھ سے تقاضا کرتے ہیں کہ اب آپ بیتی بھی لکھ ڈالو۔ جگ بیتی ہی تو میری آپ بیتی ہے۔ آپ جس کسی سے جب جو بھی کرنے —— دھوکا دینے یا دھوکا کھانے —— جا رہے ہوتے ہیں آپ میرے پاس ہی آ رہے ہوتے ہیں۔ بلا تامل آتے جایئے۔ میں ہوں نا!

غزل

کیوں مخالف ہے زمانہ میرا
اتنا آساں ہے مٹانا میرا!
بے کرانہ ہے حقیقت اس کی
مختصر سا ہے فسانہ میرا
کس سے دشمن کا گلہ کرتا میں
دوست نے درد نہ جانا میرا
وقت کے قدموں کا کانٹا ہی سہی
نہیں آسان بھلانا میرا
حضرتِ آدم کا ہوں فرزند رئیس
ساری دنیا ہے گھرانہ میرا

رئیس النساء

منزل

منزل کتنی دور ہے کہاں پڑے گی رات
کانپے مرے سوال پر کوچوان کے ہات

جانے کتنے ہی گگن اُڑ کر کیے عبور
لیکن ہم جتنا بڑھے، منزل اُتنی دور

بہت چلے برسوں چلے، بیٹھ گئے تھک ہار
تھے منزل کی راہ میں، چوراہے دیوار

دیکھ دھری پہ گھومتا، چوراہا اعجاز
راہی اپنی جادھی، رستے بھی ناراض

کرلی دل سے دوستی، بدھی سے تکرار
ہم منزل کی راہ میں، آپ ہوئے دیوار

طے ہوجاتے فاصلے، منزل ملتی کاش
رات میں کرلیتے اگر، سایہ ترا تلاش

ملی نہیں منزل انھیں، جنھیں بہت تھا ناز
جو دھن کے پکے رہے، سپھل رہے اعجاز

من کو منزل چاہیے، دل کو لیا تراش
اب سوچو اعجاز کیوں، رہبر کرے تلاش

منزل سائے کی طرح، پیچھے پیچھے جائے
کھٹے کواڑوں جب کوئی، اپنا در کھٹکائے

بھگوان داس اعجاز
ڈی ۵۱ء ۔ بلجیت نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

تہذیبِ نو

اِک نئی تہذیب کو پروان چڑھتا
دیکھنے کی آرزو میں
ڈال کر چہروں پہ اپنے
عصرِ حاضر کے تقاضوں کا لبادہ
چڑھ رہے ہیں لوگ پیہم
اِرتقا کی سیڑھیاں
ہر قدم پر
بہرِ استقبال ہیں گمراہیاں
عقل، دولت، شان، رتبہ سب میسّر
ہاں، فقط اِنسانیت روٹھی ہوئی ہے
جس سے کوسوں دور رہ کر
جاگتے رہنے کی باتیں کر رہے ہیں
اک نئی تہذیب کا دم بھر رہے ہیں

نسیم عزیزی
۳۱۲، بلیلیس روڈ، ہوڑہ۔ ۷۱۱۱۰۱
(مغربی بنگال)

پس و پیش

میں جس راستے پر
سفر کر رہا ہوں
وہ دو مختلف رہگذاروں میں
اب منقسم ہوگیا ہے،
یہ اک راستہ
مندروں، مسجدوں
اور کلیساؤں سے جاکے ملتا ہے شاید
تو یہ دوسرا راستہ
اس علاقے میں جاتا ہے شاید
جہاں گمرہی کی ہے تاریک خندق
(غلط ہو بھی سکتا ہے میرا قیاس)
حقیقت میں
ان راستوں سے میں ناآشنا ہوں

شروعِ سفر ہو
مگر کون سے راستے پر
عجب مخمصے میں پڑا ہوں

مرا عہد
پیغمبروں، دیوتاؤں
فقیروں سے خالی،
کوئی بھی نہیں ہے
مجھے راہ دکھلانے والا!

شاہد کلیم
دودھ کٹورا۔ آرہ۔
۸۰۲۳۰۱
(بہار)

ڈاکٹر اکبر حمیدی کشمیری
سری نگر ۱۹۰۰۱۰

ڈاکٹر اقبال اور رشید احمد صدیقی

(سہیل علی گڑھ کے آئینے میں)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات مختصراً بیان کئے جائیں۔ اقبال کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ یہاں کے اساتذہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور وہ بھی ان کے قدرداں تھے۔ موصوف پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء اور آخری بار ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری لینے کے لئے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ بیچ میں بھی کئی مرتبہ گئے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کو اقبال سے گہری عقیدت تھی۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ صدیقی صاحب ۱۹۲۴ء میں اقبال سے ملنے کے لئے لاہور گئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۲۴ء میں ذیل کی خبر چھپی تھی۔

"مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلّیٰ کے سکریٹری مولوی رشید احمد صدیقی۔ ایم اے سر ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک مبسوط تذکرہ لکھ رہے ہیں جن کے ضمن میں انہیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا اور بعض متعلقہ امور کی نسبت استفسار کرنا ضروری تھا چنانچہ مولوی صاحب موصوف لاہور گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہاں کے اسلامیہ کالج کے منتظمین کی خواہش پر ۲۵ نومبر ۱۹۲۴ء کو زبان اردو پر لکچر دیا۔ واپسی میں ۲۷ نومبر ۱۹۲۴ء کو دہلی یونیورسٹی میں اردو زبان کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اس کو یہاں کی انجمن اردوئے معلّیٰ کے لائحہ عمل کو واضح کیا۔ یہ دونوں لکچر دلچسپی سے سنے گئے:"

صدیقی صاحب ڈاکٹر اقبال کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں:

"غالباً دن کے دس بجے ہوں گے۔ میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا کپڑے پہن کر کسی مقدمے کی پیروی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔ گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے۔

"آپ ہیں ہی صدیقی صاحب!"

اب تک رشید احمد صدیقی صاحب کے نام اقبال کا صرف ایک خط دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط عرصہ ہوا بشیر احمد ڈار مرحوم نے اپنی کتاب "انوار اقبال" صفحہ ۲۰۲، ۲۰۳ میں شائع کیا تھا۔ اصل خط مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ محفوظ ہے۔ اس کا عکس سالنامہ نقوش لاہور شمارہ نمبر ۱۲۹ صفحہ ۶۵۳ میں درج ہے:-

۷ دسمبر ۱۹۲۹ء

جناب صدیقی صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ میری ناقص رائے میں خواجہ حافظ کے شعر میں لفظ "باد پیمائی" ہے پہلے مصرع میں۔ "ایں جا" سے مراد دریں بادیہ ہے مفہوم شعر کا یہ ہے کہ اس دشت میں سیکڑوں ہوائیں بے سلسلہ (یعنی بے زنجیر آزادانہ) رقص کر رہی ہیں اور یہی ہوائیں اے دل تری رفیق (حریف یعنی رفیق) جب تک تو بادپایہ پیما ہے یا

ان کا رقص اس غرض سے ہے کہ تو آسانی اور اطمینان سے
اس صحرا کو طے کرنے شاعر کا مقصد اپنے آپ کو تسکین دینا ہے
کہ تو بادیہ گردی میں تنہا نہیں ہے بلکہ عالم کا ہر ذرہ تیری ہی خاطر
حالت رقص میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلا مصرعہ بہت بلند
ہے اور کسی اور مضمون کا متقاضی ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج
بخیر ہوگا۔ والسلام۔ محمد اقبال "

—— حافظ کا اصل شعر یہ ہے ؎

صد باد صبا اینجا بے سلسلہ می رقصند
اینست حریف اے دل تا بادیہ پیمائی

اقبال ۱۹۳۲ء میں صدیقی صاحب کی ریڈر شپ کے لیے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ایکسپرٹ مقرر کئے گئے تھے۔ اس زمانے میں سر سید راس مسعود یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار تھے۔ موخر الذکر نے اقبال کو ریڈر شپ اور لیکچرر شپ کی اسامیوں کے لیے امیدواروں کے کاغذات (BIODATA) تقرری کے لیے بھیجے تھے۔ اقبال نے رجسٹرار کے نام ایک انگریزی خط مورخہ ۱ اگست میں رشید احمد صدیقی کے لیے زبردست سفارش لکھی تھی۔ خط کا عکس نقوش لاہور سالنامہ شمارہ نمبر ۱۳۹ میں چھپا ہے۔ ذیل میں اس کے ترجمے کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

" ریڈر شپ کے لیے میں وثوق کے ساتھ رشید احمد صدیقی کے حق میں رائے دیتا ہوں۔ ایک ہونہار نثر نگار اور نقاد کی حیثیت سے انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ ان کی نثر میں ایک خاموش مزاح اور تازگی کا احساس ہوتا ہے جو ان کے ہمعصر لکھنے والوں میں مفقود ہے۔ یہ فیصلہ رشید احمد صدیقی کے حق میں میری ذاتی معلومات کی بنا پر ہے۔ میرے خیال میں کوئی دوسرا امیدواران کی برابری نہیں کر سکتا۔"

یہ صدیقی صاحب ہی تھے جنھوں نے اقبال کے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کے لیے ایک جرمن خاتون کی سفارش کی تھی۔ رشید احمد صدیقی نے اردو کا ایک سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ انجمن اردوئے معلّی کی طرف سے اپریل ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا۔ رسالہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کی ضخامت اچھی خاصی اور کتابت، طباعت، کاغذ بہت عمدہ ہوتا تھا۔ پہلے شمارے میں جن لوگوں کے مضامین ہیں ان میں ڈاکٹر اقبال، صاحبزادہ آفتاب احمد اور عبداللہ چغتائی قابل ذکر ہیں۔

صفحہ ۲ میں "علوم اسلامیہ" کے عنوان سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کا مضمون ہے۔ صاحبزادہ یونیورسٹی میں اسلامیات کا شعبہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ صفحہ ۵ سے ۹ تک اقبال کا ایک خط مقالے کی صورت میں صاحبزادہ موصوف کے نام ہے اس میں ان سے یونیورسٹی کے نصاب اور بعض امور کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ صفحہ ۱۵ تا ۲۰ اقبال کا ایک اور مقالہ نما خط ترکی کے مشہور ادیب اور شاعر خالد خلیل کے ایک سوال کے جواب میں ہے۔

سہیل کے شمارہ اول کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اقبال کے مضمون "اسلامیات" سے پہلے رشید احمد صدیقی نے اپنی طرف سے جو نوٹ لکھا ہے اس مضمون کی غیر معمولی افادیت سامنے آجاتی ہے۔ نوٹ یہ ہے کہ۔

" یورپ نے علم و فن میں جو ترقی کی ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں لیکن حقیقت واقعتاً عبرتناک ہے کہ ہم نے خود اپنی حالتوں کے اندازہ کرنے میں اپنے اسلاف کے کارناموں کی اہمیت بالکل نظر انداز ہی نہیں کر دی ہے بلکہ ان کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا بھی باعث خجالت خیال کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یورپ کا حال مسلمانوں کے ماضی کا رہین منت ہے لیکن عام طور پر مسلمانوں کی آجکل جو حالت ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے بعض خیر اندیش اور اعتدال پسند طبائع بھی اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ اس وقت ہمارا خضر طریقت صرف یورپ بن سکتا ہے۔ بہرحال کسی طویل اور مفصل بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ بعض ارباب نظر نے تمام امور پر نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہم کو اپنے اسلاف کے علم و فضل، مذہب، اخلاق اور طباعت اور ادب سے دنیا کو روشناس کرانے میں جدید طریقوں کو عمل میں لانا چاہئے۔ ان امور کو مدنظر رکھ کر علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کا ایک شعبہ مسلم یونیورسٹی میں قائم کیا گیا ہے۔ اپنی مخصوص ضرورت اور نوعیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت محتاج نہیں ہے۔ اسلامک اسٹڈیز کا لفظ

کہا جاتا ہے کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا وضع کیا ہوا ہے۔ مختلف درسگاہوں میں اس کے نفاذ کا موقع آیا تو ایک دلچسپ بحث یہ اٹھائی گئی کہ اس کے حدود کیا ہیں اور اس کی ابتدا کس اصول اور کس نوعیت کے ساتھ کی جائے۔ نظر بر آں شعبۂ اسلامیہ اختصاصین کا ایک جلسہ طلب کیا گیا جس میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی (جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) بھی شریک ہوئے تھے علمائے کرام نے نہایت دل سوزی اور عرق ریزی کے بعد اس مسئلہ کے تمام علمی و عملی پہلو پر نظر رکھ کر نصاب تیار کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ سال سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا۔ یہ جلسہ کئی اعتبار سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے ہم کو اس رپورٹ کا انتظار ہے بشرطیکہ امکان۔ انشاء اللہ "سہیل" کی آئندہ اشاعت میں ہم اس کو شائع کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں بعض آزاد افکار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

جمہوریہ ترکیہ نے قسطنطنیہ یونیورسٹی میں بھی اس نوع کی ایک چیئر (ادارہ) قائم کیا ہے جس کے معلّم اعلیٰ مشہور ترکی ادیب خالد بے قرار پائے ہیں۔ علوم اسلامیہ کے علاوہ اسلامی علم الانساب (جس کی چیئر قسطنطنیہ میں قائم ہوئی ہے) محترم سید سجاد حیدر یلدرم (رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے ایما سے علامہ سر اقبال نے جس فاضلانہ اور مجتہدانہ انداز سے تبصرہ کیا ہے وہ اپنا آپ نظیر ہے اور اسی عنوان کے تحت آئندہ صفحات پر آئے گا۔" سہیل جلد دوم نمبر ا صفحہ ۴۳ جنوری تا مارچ ۱۹۲۷ء

پیام مشرق کے بعد اقبال کے ایک اور شعری مجموعہ "زبور عجم" کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ صدیقی صاحب نے زیر نظر "سہیل" کے شمارے میں "زبور عجم" کی چند آیات۔ علامہ سر اقبال کے تازہ ترین افکار کا مجموعہ" کے عنوان سے زبور عجم کے ۱۴ چیدہ چیدہ شعر کا انتخاب پیش کیا۔ یہ اشعار زبور عجم کی اشاعت سے پہلے ہی غالباً اقبال نے ارسال کئے تھے۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہیں۔ ؎

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام
خون حسینؓ باز دہ کوفہ و شام خویش را

خوش تر ز طریق پارسائی
گامے بطریق آشنائی

سہیل۔ جلد دوم نمبر ۲ صفحہ ۸۰، اپریل تا جون ۱۹۲۷ء

اس شمارے میں "غالب اور اقبال" کے عنوان سے دو الگ الگ نظمیں غالب اور اقبال کے تحت چھپی ہیں۔ دونوں نظمیں "زبور عجم" کے پہلے ایڈیشن سے لی گئی ہیں۔ غالب والی نظم زبور عجم کے دوسرے اور اس کے بعد تمام ایڈیشنوں سے حذف کر دی گئی۔ اقبال والی نظم بغیر کسی عنوان کے صرف چھ شعروں شامل کی گئی۔ اور یہ اشعار "زبور عجم صفحہ ۹۶" میں نمبر ۱۱ کے تحت ملتے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

ہم ذیل میں سہیل کے زیر نظر شمارہ سے دونوں یادگار نظمیں جوں کی توں درج کرتے ہیں۔

"غالب اور اقبال"

"غالب"

بہ پایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہد وفا نابستہ دادم دلستانے را
اجازت داد چشش یک دو حرف از درد دل گفتم
پس از دیرے کہ برخود عرضہ دادم دلستانے را
نہ دارم تاب ضبط راز و می ترسم ز رسوائی
مگر جویم ز بہر ہم زبانی بے زبانے را
بیاد گلشن بختم کہ در ہر گوشہ بینایم
ز جوشش لالہ و گل در خیابانے خزانے را
دلم بر رنج نابرداری فرہاد می سوزد
خداوندا بیامرز آں شہید امتحانے را
نشاط لذت آزار را نازم کہ در مستی
ہلاک فتنہ دارد ذوق مرگ ناگہانے را

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

غزلیں

خیال و خواب کی پرچھائیوں کے شہر میں ہوں
میں پست ہو کے بھی اونچائیوں کے شہر میں ہوں

بہت دنوں سے میں رسوائیوں کی قید میں تھا
چھٹا جو قید سے تنہائیوں کے شہر میں ہوں

محاربوں کا ہے ہر سنگ میل آئینہ
عجیب معرکہ آرائیوں کے شہر میں ہوں

ہے زخم زخم مسرت کا وہ ہجوم کہ بس!
میں خوش نصیب سگے بھائیوں کے شہر میں ہوں

ہر ایک جسمِ غزل کے لباس میں ہے نہاں
تو کیا میں میر کے شیدائیوں کے شہر میں ہوں

ڈاکٹر سلمان عباسی
ای ۴/۲۳، پیپر مل کالونی
لکھنؤ-۲۲۶۰۰۶

آپ اپنا جواب ہوتے ہیں
لمحے بھر کے حباب ہوتے ہیں

اپنے احساس زندگی کی طرح
بڑے نازک گلاب ہوتے ہیں

جو تری یاد کے بغیر کٹیں
دن وہی تو عذاب ہوتے ہیں

بات چھپتی نہیں چھپائے سے
چہرے دل کی کتاب ہوتے ہیں

ہار جاتے ہیں دل یہاں جو بھی
وہی خانہ خراب ہوتے ہیں

ڈاکٹر بانو سرتاج
مقابل آکاش وانی۔ سول لائنس
چندرپور - ۴۴۲۴۰۱ (ایم. ایس)

خوش رہ کے یہاں جینے کا امکان کہاں ہے
دنیا پہ مرے غم کی نزاکت بھی گراں ہے

احساس کا زنداں ہے قفس ہو کہ نشیمن
آزادیِ فطرت نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

سب اپنے نشیمن کے سجانے میں لگے ہیں
تعمیر گلستاں تو فقط وہم و گماں ہے

آہیں تو گھٹا دیتی ہیں معصومیتِ درد
غم میں ہو صداقت تو خموشی ہی فغاں ہے

قاسم دلِ شاعر ہی میں ہے رازِ حقیقت
شاعر ہی کا دل کعبۂ صاحب نظراں ہے

قاسم شبیر نقوی نصیرآبادی
نصیرآباد
ضلع رائے بریلی

کالی داس گپتا رضا
۴۴ ساحل - تیل بلڈنگ، نیپئین سی روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

چند کوائفِ ذوق

نیز ہم عہد اخباروں، تالیفوں اور تذکروں میں کلامِ ذوق

بہادر شاہ ظفر کے پانچ استادوں کا پتہ ملتا ہے۔ ان کے سب سے بڑے استاد ذوق کے بھی شاعری میں کم از کم دو استاد ضرور رہے پہلے حافظ غلام رسُول شوق (جن کے تخلص پر ذوق تخلص رکھا گیا) دوسرے شاہ نصیر۔

حافظ غلام رسُول شوق :

شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ حافظ قرآن تھے "حضرت ولی عہد" کی وساطت سے کابلی دروازے کی عزیز آبادی مسجد میں امامت کرتے تھے اور بچوں کو بھی پڑھاتے تھے، یہی ان کی روزی روٹی کا ذریعہ تھا۔ مسجد ذوق کے گھر کے پاس تھی۔ وہیں پڑھائی کے ساتھ محلے کے دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی ذوق ان سے اصلاح لینے لگے۔ "گلستانِ سخن" (۱۲۷۱ھ) میں درج ہے کہ "سنین عمر ستر کے قریب پہنچ گیا ہے۔" اگر گلستان سخن کی تصنیف کا آغاز سال تکمیل سے دو سال پہلے مان لیا جائے اور "ستر کے قریب" کو بھی ۶۹ سال تسلیم کر لیا جائے تو شوق کا سال ولادت ۱۲۰۰ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود ذوق ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح شوق، ذوق سے محض تین ہی سال بڑے ہوئے۔ ہو سکتا ہے صاحب گلستانِ سخن نے قیاساً لکھ دیا ہو اور شوق چھ سال بڑے ہوں۔ خم خانۂ جاوید میں سالِ وفات ۱۲۷۲ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) درج ہے۔

کلام شوق میں اور کوئی خوبی نہ سہی، وہ محاورات اور روزمرّہ کے استعمال کے رسیا معلوم ہوتے ہیں اور اس فن میں ایک حد تک ماہر بھی۔ پھر شاہ نصیر کی اصلاح سونے پر سہاگا ہو گئی۔ ذوق کو محاوروں اور روزمرّہ کا چسکا شاید یہیں سے لگا۔ شوق کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ٹھہرا ہے دل کا تجھ سے کیا زلفِ یار سودا
اپنی تو وہ مثل ہے اک سر ہزار سودا

نہیں بہتر ستانا اے فلک اتنا غریبوں کا
کہیں کیا تیری بے رحمی کو ہم، لکھا نصیبوں کا

اُلجھ رہے ہیں وہ زلفوں کے تار دل سے مرے
گرہ کو مانے ہیں اپنے یہ بانکے کیا

غربت میں سُنا کوہکن و وامق و مجنوں
بھائی مرے اے عشق یہ ہیں بگڑی بدل مین

مالا جپے ہے اشک مسلسل کی چشمِ نم
تسبیح بھی ہوئی ہے کہیں بن امام کی

پھر چاند بات کی نہیں اس سے کر مجھ سے شوق
کھا کر قسم میں کہتا ہوں تیسوں کلام کی

آزاد نے لکھا ہے کہ ذوق "جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسُول" کے یہاں محلہ کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھا دیے گئے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ چھ سات سال کی عمر ہوگی۔ شاید ۱۱ یا ۱۲ سال کی عمر میں شوق سے اصلاح بھی لینے لگے ہوں گے۔

ذوق کے ایک ہم عصر اور ہم محلہ لڑکے کاظم حسین بے قرار بھی اسی مسجد میں پڑھتے تھے اور شاعری میں شوق سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے ایک دن ایک پھڑکتی ہوئی غزل سنائی۔ ذوق نے جب یکایک اتنا اچھا کلام کہنے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اب کے ان کی یہ غزل شاہ نصیر نے بنائی ہے۔ اس طرح بے قرار کی وساطت سے ذوق بھی شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ یہ بات قیاساً آخر ۱۲۱۷ھ یا شروع ۱۲۱۸ھ کی ہوگی۔ ذوق نے اس طرح کم از کم ۳ سال یعنی شروع ۱۲۲۱ھ تک شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ شاہ نصیر یقیناً ۶ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء سے پہلے اور شروع ۱۲۲۱ھ مطابق فروری ۱۸۰۶ء کے بعد عازم دکن ہوئے ہوں گے کیوں کہ ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے اور ظفر ولی عہد مقرر ہوئے تھے۔ اگر ظفر کے ولی عہد مقرر ہونے تک شاہ نصیر ظفر کے استاد رہتے تو یقین ہے کہ وہ دکن جانے کا ارادہ نہ کرتے۔ ۱۲۲۱ھ سے پہلے وہ یقیناً دکن نہیں گئے کیونکہ مجموعۂ نغز کی تکمیل (۱۲۲۱ھ) کے وقت شاہ نصیر کا دہلی میں موجود ہونا ثابت ہے۔

شاہ نصیر کے ۱۲۲۱ھ میں دکن چلے جانے اور پھر کسی وجہ سے ۱۲۲۲ھ میں میر عزت اللہ عشق سے اصلاح کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد ولی عہد ظفر نے میر کاظم حسین بے قرار سے جو کہ ان کے "ملازم خاص تھے" اصلاح لینی شروع کی۔ آزاد نے بے قرار کے ذہن کو بھی تیزی اور براقی میں لاجواب" کہا ہے۔ چنانچہ عجب نہیں کہ ذوق (جو اس عمر میں بھی ہر طرف اپنی صلاحیتوں کا سکہ منوا رہے تھے) اور بے قرار باہمی مشورہ کرتے رہے ہوں۔ بے قرار ۱۲۲۲ھ میں (شاید ۱۸۰۷ء کے آخر تک) جان الفنسٹن کے میر منشی ہو کر سندھ چلے گئے اور ۱۲۲۳ھ (مطابق ۱۸۰۸ء) میں ولی عہد ظفر نے ذوق سے اصلاح لینی شروع کر دی۔ اس پر ذوق کا ستارہ ایسا چمکا کہ وہ ان کی موت کے دن (۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء) ہی کو ماند ہوا۔

مندرجہ بالا سطور سے محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ خواجہ غلام رسول شوق اور شاہ نصیر دونوں استادوں سے ذوق نے ۶، ۷ سال سے زیادہ مدت تک اصلاح نہیں لی اور جب ولی عہد ظفر نے ان سے اصلاح لینی شروع کی ہے اس وقت یعنی انیس بیس سال کی عمر تک، ذوق، دہلی کے ابھرتے ہوئے شعرا میں اپنا مقام نمایاں کر چکے تھے۔

عمدۂ منتخبہ میں ذوق کو شاگرد غلام رسول شوق" در غزل گوئی ممتاز" اور" در ریختہ گوئی رسا" لکھا ہے۔ یہ اندراج شروع ۱۲۱۸ھ یا اس سے کچھ پہلے کا ہوگا۔

مجموعۂ نغز میں نومشق لکھا ہے اور کہا ہے کہ" از شاگردان محمد نصیر الدین نصیر" ہے اور کبھی کبھی" مجلس شعرا" میں حاضر ہو کر غزل طرحی" بھی کہتا ہے۔ دو شعر درج کیے جاتے ہیں۔ یہ اندراج ۱۲۲۱ھ یا اس سے کچھ پہلے کا ہے۔

عیار الشعرا میں لکھا ہے کہ اکثر مجلس مراختہ میں وارد ہوتا ہے اور" فوائد قواعد شعریہ"۔" میاں نصیر الدین نصیر" سے سیکھا ہے۔

یہ ترجمہ آخر ۱۲۲۱ھ میں داخل کیا گیا ہوگا کیوں کہ ۱۱ شعروں میں سے پہلے دو شعر وہی ہیں جو مجموعۂ نغز میں ہیں، اور باقی ۹ شعر عمدۂ منتخبہ میں شامل انتخاب سے منتخب کیے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کا ترجمہ سب سے پہلے عمدۂ منتخبہ میں درج کیا گیا کیوں کہ اس میں ذوق کو غلام رسول شوق کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد مجموعۂ نغز میں کیوں کہ اس میں ذوق کو شاہ نصیر کا شاگرد لکھا ہے اور دو شعر دیئے ہیں جو قطعی نئے ہیں۔ پھر عیار الشعرا میں۔ اس میں مجموعۂ نغز کے ۲ شعروں کے علاوہ ۹ شعر عمدۂ منتخبہ سے انتخاب کر کے لکھے ہیں جو عمدۂ منتخبہ کے ۹۱ اشعار کے انتخاب کے شروع کے ۲ شعروں اور آخری ۷ شعروں پر مبنی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عمدۂ منتخبہ کے تمام اشعار آخر ۱۲۲۱ھ جنوری/ فروری ۱۸۰۷ء) کے پہلے کے فکر کردہ تسلیم کرنا چاہیے۔

ذوق کی زندگی میں انھیں شہنشاہ شعرا سمجھا جاتا تھا اور وہ ایسے مقام پر فائز تھے کہ غالب اور مومن بھی ان کے برابر نہیں تلے۔ مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ذوق کا کوئی مجموعۂ کلام ان کے جیتے جی شائع نہیں ہوا۔ دیوان مرتبہ ویران، ظہیر اور انور، نگارستان سخن مرتبہ ظہیر اور دیوان مرتبہ آزاد، تینوں کو مستند ہونا چاہیے تھا،

کیوں کہ یہ تینوں دیوان ذوق کے شاگردوں نے ترتیب دیتے تھے مگر اس کا کیا جائے کہ ان تینوں دیوانوں میں شامل کلام ذوق کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دیوان مرتبہ ویران کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ذوق کے علاوہ کئی شاعروں کا کلام (مطلعے) شامل ہو گیا ہے۔ چوں کہ یہ سب کلام محض حافظے کی مدد سے جمع کیا گیا تھا اس لیے ایسی غلطیاں در آنا ناگزیر ہیں۔ پھر یہ ذوق کا مکمل کلام بھی نہیں۔

نگارستان سخن مرتبہ ظہیر دہلوی میں درج کلام بھی شک وشبہ سے بالا نہیں اور

دیوان مرتبہ آزاد: خود آزاد کی تحریفات اور اصطلاحات نے صد درجہ غیر معتبر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ جو کلام ذوق خود ذوق کی زندگی میں اخباروں، تالیفوں اور تذکروں میں شامل رہا ہو محض اسی کو مستند ترین مان کر شائع کیا جائے۔ اس سے کلام ذوق کی جو بھی تصویر ابھرے اسی کو بہر حال تسلیم کیا جائے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

بعد قافِ عشق تھا جو، درس مکتب خانہ تھا
کافِ کُن کے ماسبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا

کٹے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو، پیے لہو میرا

نہیں مژگانِ پُرخوں، خارِ غم تھے دل نشیں نکلے
جنوں! یہ نیشتر کیسے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدہ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

شکر پردے ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

کاسۂ چرخ رہے کیوں نہ زمیں پر اُلٹا
ہم نے یہ جام دوا عشق کی پی کر اُلٹا

عبث تم اپنا دکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مُسکراتے ہو

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ، خارِ دشت! پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بل ہے استغنا کہ وہ واں آتے آتے تھم گئے
اُف ری بے تابی کہ دل یاں دم بدم گھبرائے ہے

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے میں

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تودہ تودہ حسرت ہے

بل بے غرورِ حسن زمیں پر رکھے نہ پاؤں
مانندِ آفتاب وہ بے نقش پا چلے

کل جہاں سے کہ اٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دل بے تاب مجھے

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں کبھی ہمیشہ خط میں
قبلہ وکعبہ لکھا کرتا ہے القاب مجھے

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پسِ جامِ شراب
لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جامِ شراب

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جزو میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو
کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہم کو

سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

اب بھی گریہ سے نہیں فرصت مجھے فوّارہ وار
گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے شب اے رشکِ گلشن آب میں

بُلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی اُن کا
تسلّی آ کے مجھے وقتِ اضطراب تو دے

وادیِ ظلمت میں اپنی دخل ہے کب نور کا
مہر اک شعلہ سا ہے سو بھی چراغِ دور کا

حق تو یوں ہے یہ انانیّت عجب غمّاز ہے
قصّہ پہنچا یا زبانِ دار پر منصور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبّت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام اک مزدور کا

شمع نازاں نہ ہو اک رات بہا آنسو گرم
برسوں یاں چشم سے ٹپکا ہے برے لوہو گرم

گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل گاہ ہجومِ حسرت میں
ہے یہ مردِ سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے

میں ہجر سے مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پر آ پہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسّف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں
ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

اُس در پہ شوقِ سجدہ سے فرشِ زمیں ہوں میں
مانند سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھو نہ تمنّائے رنگ و بُو کرتے

یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش
اٹھیں گے خواب سے ساقی! سبو سبو کرتے

نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا
مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

کشادِ کارِ ہستم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا
خرد کے ناخنوں کو ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

ہم وہ مجنوں ہیں کہ گردِ رمِ آہو کی طرح
بھاگے ہے دور ہی سے دیکھ کے صحرا ہم کو

اور ہمدرد کہاں ہو نہ ہو اے حضرتِ دل
درد اب تم کو ہمارا ہو تمھارا ہم کو

ہم گئے جس کی طرف جوں گُلِ بازی اس نے
پاس آنے نہ دیا دُور ہی پھینکا ہم کو

رشک تھا اپنے نوشتے میں کہ اس نوخط نے
خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو

کر دیا گریہ نے آخر سبک ایسا ہم کو
لے گئے اشک بہا جوں کفِ دریا ہم کو

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اس کو ہوئی تھی جو تمنّا ہم کو

ہم وہ ہیں گرم رہِ راہِ وفا جوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لبِ دریا ہم کو

تو کبھی ہنس کے نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر
مار ہی ڈالے گا بس رشک ہمارا ہم کو

گرمیِ تپ سے ہوا سوزِ دروں جو افشا
آگیا مارے خجالت کے پسینا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کرلے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

واہ قسامِ ازل! صدقے ہم اس قسمت کے
جامِ عشرت اسے اور داغِ تمنا ہم کو

تیر اس نے جو کی تیغِ ستم اور زیادہ
مشتاقِ شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

سر کٹ کے سرافراز ہیں ہم اور زیادہ
جوں شاخ بڑھے ہو کے قلم اور زیادہ

ہستیِ تنک مایہ نے کچھ پھونکا ہے ایسا
ابھرے ہے حبابِ لبِ یم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا اُن پہ بھرم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور سے جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

اے تیغِ ستم گار نہ برش میں کمی کر
ہاں تجھ کو مرے سر کی قسم اور زیادہ

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رکے ہے
اتنا ہی اسے چاہیں ہیں ہم اور زیادہ

جہاں میں عرصۂ عشرت سے سوا دہ چند ہے غم کا
کہ ہوئے عید کا اک دن تو عشرہ ہو محرم کا

ترے عاشق کو ہے یوں خوش گوار آبِ دمِ خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آبِ زمزم کا

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے لپٹے ہیں جولانیوں میں ہم
پاکوبیوں کو مژدہ ہو، زنداں کو ہو نوید
پھر ہیں جنوں کی سلسلہ جنبانیوں میں ہم

دم بھی نہیں جگر پہ رہی اس قدر لٹے
سرگرم سوزِ عشق کی مہمانیوں میں ہم

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمار سے کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے
غنچہ موجِ تبسم سے ترے گل چمن میں ہیں جگر افگار سے

کرتا ہے دستۂ جنوں جب کشمکش
جی الجھتا ہے نفس کے تار سے

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا
دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا کہ حیراں ہی رہا

مدتوں دل اور پیکاں دونوں سینے میں رہے
آخرش دل بہہ گیا خوں ہو کے، پیکاں ہی رہا

ہے جو غنچے کا چٹکنا انگلیوں کی سی چٹک
یہ بلائیں کس کی باغ اے باغباں لینے لگا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس مہجور کا
دل نہ اٹکا دے کہیں اللہ رے مقدور کا

کھنچ گیا میری طرف سے اور اس دلبر کا دل
واہ وا جذبِ محبت کا اثر اچھا ہوا

کام یہ تیرا ہی تھا، رحمت سے ہے اے ابرِ کرم
ورنہ جاوے داغِ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر!

جس کو ہو لذت اٹھانی زخمِ تیغِ عشق کی
کب وہ مرہم داں کو ڈھونڈے ہے نمکداں چھوڑ کر

ساغرِ دل بیچتا آیا ہوں کھو مت ہاتھ سے
چوکتا ہے کیوں یہ جنسِ دستِ گرداں چھوڑ کر

میں وہ ہوں گمنام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیِ قدرت جگہ واں چھوڑ کر

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سروِ خراماں چھوڑ کر

بازگشت اپنی ہے یوں جانبِ قسامِ ازل
جیسے ساقی کی طرف بازپس جامِ شراب

دستِ بدمست سے کی ٹوٹ کے فریاد بہت
نہ ہوا کوئی بھی فریاد رسِ جامِ شراب

محتسب شعلۂ آواز سے جل جائے گا
گرچہ ٹوٹا دلِ آتش نفسِ جامِ شراب

رات مے خانے میں ساقی جو نشے میں بہکا
غس شیشہ کو لگا کہنے خسِ جامِ شراب

بے خبر تا فلکِ عیش گزر جاتا ہے
بے زباں ہے جو دہانِ جرسِ جامِ شراب

میری خاکستر اُڑی تھی اس سے گردوں سب بنے
اس میں کچھ انگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے

عشق، تعلیم نیاز و ناز یک جا کیونکے ہو
گر نہ مجنوں آن کر لیلیٰ کا ہم مکتب بنے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا
دلِ بے تاب کو میں اور دلِ بے تاب مجھے

میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِّ نظر عشق کا آداب مجھے

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے، کیا آئے کیا چلے

کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اُڑانے اُڑا چلے

لے جائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے، آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبّت! آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراشِ دل میں خوں
سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کہہ دو قاصد سے کہ جائے کچھ بہانے سے وہاں
گر نہیں آتا بہانہ کوئی ہم سے سیکھ جائے

مال جب اس نے بہت ردّ و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

مر گئے پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
زور یاروں نے بہت ذوقؔ غزل میں مارا

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے نہیں یہ بھی معلوم، ہے یا نہیں ہے
وہ ہے پاس ہی، پر مری بدگمانی لیے پھرتی مجھ کو کہیں سے کہیں ہے

وبالِ دوش تھا اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مذکورہ ماخذوں سے حاصل کیے ہوئے اشعار بڑی تعداد میں ہیں وہ ایک مضمون میں نہیں سما سکتے، اس لیے محض نمونۂ اشعار ہی دیے گئے ہیں۔ مکمل اشعار "مستند دیوانِ ذوق" میں شامل کر کے جلد ہی نذرِ احباب کیے جائیں گے۔

□□

حواشی:

لہ اُستاد نمبر ۱، شاہ نصیر تقریباً ۱۲۲۰ھ (فروری ۱۸۰۹ء تک)

" نمبر ۲، حکیم عزت اللہ عشق ۱۲۲۱ھ (تقریباً فروری ۱۸۰۶ء تا بعد از ۱۹ / نومبر ۱۸۰۹ء)۔ مجموعۂ نغز میں عشق کے ترجمے میں ظفر کی

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

سلامت رضوی
قومی آواز، لکھنؤ

منجھو صاحب سوز خوان

گویا ہو یا سوز خوان، دونوں کی اساس موسیقی ہے۔ سُر اور تال میں دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی ڈگر پہ گامزن رہتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر ان کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ سوز خوان اپنے اوپر کچھ قیود عائد کر کے گویّے کے زمرے سے الگ ہو جاتا ہے۔

اسلام نے موسیقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ اس کے نزدیک یہ لہو و لعب ہے جو اسلام میں منع ہے۔

تاہم اسلام کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو "لحن و غنا" کو مستحسن سمجھتا ہے۔ اس طبقے کا کہنا ہے کہ حضرت داؤد پیغمبر زبور کو، جو منظوم تھی، اکتارہ پر ایک خاص لحن میں سُناتے تھے جو سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ اسی لیے "لحنِ داؤدی" مشہور ہے اور اسی "لحن و غنا" نے سماع کی محفلوں میں بھی رنگ جمایا۔

"لحن و غنا" شعر و شاعری کی آمیزش کے بغیر ممکن نہیں۔ شاعروں کی جہاں "وَيَتَّبِعُونَ الْغَاوُونَ" کہہ کر مذمت کی گئی ہے وہیں "تلامیذ الرحمٰن" کہہ کر تعریف بھی۔ مذمت اور تعریف کی خانہ بندی کی جائے تو غزل، مثنوی، واسوخت وغیرہ کے شاعر "غاوُن" کے زمرے میں آئیں گے، اور مرثیہ، سلام، نعت و منقبت وغیرہ کے شاعر "تلامیذ الرحمٰن" کے زمرے میں۔

بالکل یہی ترتیب گویّے اور سوز خوان کی ہے۔ موسیقی کی تانیں لگانے والا اور راگ سے راگ پیدا کرنے والا گویّا ہے۔ یہ غزل بھی گاتا ہے اور عشقِ مجازی میں فراق و وصال کے گیت بھی۔ جبکہ سوز خوان مرثیہ، نعت اور منقبت کے ذریعہ اپنی خدا ترسی اور مذہب پرستی کے ترانے الاپتا ہے اور اس طرح اپنے رثائی فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔

شاہانِ اودھ پر ایک طبقہ نے جو بے شمار الزامات عاید کیے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ "وہ عیاش طبع تھے۔ یہ عیاشی ہی تھی جس کی وجہ سے آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ بسایا۔ یہ لوگ رات دن رقص و موسیقی اور دوسرے لہو و لعب میں مصروف رہتے تھے اور چوں کہ ایامِ عزا میں ان کو رقص و موسیقی والی غذا نہیں ملتی تھی اس لیے انھوں نے "سوز خوانی" کی داغ بیل ڈالی۔"

شاہانِ اودھ کی صفائی پیش کرنا چوں کہ میرا موضوع نہیں ہے اس لیے اس پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ فعل عبث ہے۔ البتہ سوز خوانی کی داغ بیل والی بات بالکل غلط اور مبنی بر جہل ہے۔

بیان کو غلط ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شیعیت، عزاداری، مجالس اور سوز خوانی کا تذکرہ (لکھنؤ سے پہلے) سلاطین عادل شاہی و قطب شاہی وغیرہ کا کیا جائے۔

دکن میں بہمنی سلطنت شروع ہوئی تو اس وقت احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں ایرانیوں کا زور تھا۔ وہ اپنے معتقدات و خیالات میں کٹر تھے اور ایک جگہ بیٹھ کر واقعۂ شہادت سنتے تھے۔ گویا یہ مجالس کے انعقاد کا ابتدائی دور تھا۔

عزاداری صرف شیعہ فرقے کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ امام حسینؑ کی حقانیت کے بارے میں سارے مسلمان متفق تھے اس لیے جب ایرانی اثرات کے تحت عزاداری کا رواج ہوا تو تمام مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا اور پھر جب اس نے ثقافتی قوت حاصل کر لی تو غیر مسلم بھی اچھی خاصی تعداد میں حصہ لینے لگے۔

دکنی ریاستوں میں عادل شاہی سب سے زیادہ طاقت ور اور منظم ریاست تھی۔ ایران کی طرح اذان میں حضرت علی کا نام سب سے پہلے یہاں داخل ہوا۔ یہاں مرزا نامی شاعر سب سے زیادہ نامور تھے۔ ساری عمر صرف

لغت، منقبت اور مرثیے کہے۔

اور جب بیجاپور کے فرماں روا علی عادل شاہ ثانی نے ان سے اپنی شان میں قصیدہ کہنے کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا کہ "جو زبان بزرگانِ دین کے تذکرہ کے لیے وقف ہو چکی ہے، اب میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

غرض عادل شاہی زمانے میں انھیں انیس جیسی شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے مرثیہ میں رزم داخل کی اور حضرت حُرؓ، قاسمؑ، علی اکبرؑ، علی اصغرؑ اور پسرانِ مُسلمؑ کے حال میں الگ الگ مرثیے کہے۔

دہلی میں میر عبداللہ ایک سوزخوان تھے جو موسیقی کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس خوبی سے سوزخوانی کسی نے نہیں کی بمصرع ختم نہیں ہوتا تھا کہ مجمع میں رونے کا شور مچ جاتا تھا اور آسمان کے کان بہرے ہونے لگتے تھے۔

بہادر شاہ اول اور فرخ سیر کے عہد میں قلعہ معلیٰ کے اندر عزاداری شروع ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ۱۷۳۸ء میں دہلی میں بیسیوں عاشور خانے، مرثیہ گو، مرثیہ خواں اور سوزخوان موجود تھے۔

گجرات کے علاقوں میں بھی کربل کتھا اور مقاتل کی دوسری منظوم تصنیفات سوزوگداز سے پڑھی جاتی ہیں۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ خود راقم الحروف نے بھاؤنگر کی متعدد مجلسوں میں یہ سوز سُنے ہیں، جو قدیم زبان میں تھے۔

اور جب ۱۷۲۴ء میں برہان الملک سعادت خاں نے اودھ کی صوبیداری کا چارج لیا اس زمانے میں جون پور شیعوں سے چھلک رہا تھا۔ یہاں بھی اس وقت زیادہ تر سوزخوانی اور روضہ خوانی کا دستور تھا۔

اس مختصر تبصرہ کے بعد یہ بات صاف ہو گئی کہ "سوزخوانی" کی ایجاد رقص و موسیقی کی تشنگی دُور کرنے کے لیے شاہانِ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع نہیں تھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں حیدری خاں، میر علی، ناصر خاں، علی حسن بندہ حسن بہت اچھے اور نامور سوزخوان تھے۔ ان کی مجلسوں میں بڑے بڑے موسیقی داں اُس وقت شرکت کرتے تھے۔

لکھنؤ کے سوزخوانوں میں میر علی اور حیدری خاں عظیم سوزخواں گزرے ہیں۔ میر علی مرحوم عہد سعادت علی خاں کے وہی مشہور سوزخوان ہیں جن کو انشا نے سلطنت اودھ کی "نعمۃ" سے تعبیر کیا ہے اور حیدری خاں مجذوب قسم کے سوزخوان تھے جن کو عبدالحلیم شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں گویا لکھا ہے وہ اصلی سوزخوان تھے (اور یہ ان کے سوز ہی کا کمال تھا کہ انھوں نے شاہ غازی الدین حیدر کو صرف ۵ منٹ کے اندر رُلا دیا تھا۔ (پورا واقعہ "گزشتہ لکھنؤ" میں درج ہے۔)

پھر اس کے بعد شہر میں ایک اور عظیم سوزخوان نے اپنا کلمہ پڑھوایا، وہ تھے میر علی محمد سوزخوان۔ میر علی محمد نے آخری دور میں میر انیس کی طرح مجلسیں پڑھنا ترک کر دی تھیں۔ مرشد آباد سے ان کا ساٹھ روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر تھا۔ اسی وظیفے پر وہ اپنی ایک بیٹی کے ساتھ فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔

منجھو صاحب سوزخوان کا اصل نام سید محمد حسین عرف منجھو صاحب تھا۔ وہ میر پناہ علی کے اکلوتے بیٹے تھے اور امام باڑہ الماس، سرائے معالی خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔

منجھو صاحب کی والدہ میر علی محمد صاحب کی قریبی رشتہ کی بہن تھیں۔ میر صاحب کبھی کبھی اپنی بہن سے ملنے امام باڑہ الماس علی خاں واقع سرائے معالی خاں آیا جایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جب بہن کے گھر پر ان کی فینس آکر رُکی تو انھوں نے کسی کو بہت اچھی آواز میں غزل کا یہ مطلع ترنم سے پڑھتے ہوئے سُنا ؎

ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا
یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا

اور جب فینس سے اتر کر انھوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ منجھو صاحب ہیں یعنی ان کے بھانجے۔ میر علی محمد کی کوئی اُولاد نرینہ نہیں تھی اور انھیں اس کی تمنا تھی کہ کوئی ایسا ہوتا جو ان کے فن میں ان کا جانشین بن سکتا۔ بھانجے کی سُریلی آواز سُن کر گویا ان کی دلی مُراد بر آئی۔ بہن سے ملے اور فرمائش کی کہ اپنے لڑکے کو میرے حوالے کر دو۔ میں اس کو اپنا فن بھی سکھاؤں گا اور اپنا جانشین بھی بناؤں گا۔ لوگ میر علی صاحب کی شاگردی کی تمنا کیا کرتے تھے۔ یہاں یہ عالم کہ خود استاد شاگرد بنانے کی تمنا کر رہا ہے۔ ماں باپ نے یہ درخواست منظور کر لی اور پھر ایک دن منجھو صاحب

کو ان کے ماموں جان کے گھر واقع محلہ مہدی گنج پہنچا دیا گیا۔

میر علی محمد صاحب شر بیورہ کے سلسلے میں بہت سخت تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل استاد سے موسیقی کا علم حاصل نہیں کرتے اور سُر وغیرہ ٹھیک نہیں کر لیتے ان کو بد آواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے اور پھر بقول شخصے "تا ثریا می رود دیوار کج" اسلیے اگر ابتدا خراب ہو گئی تو استادِ کامل کی کوششیں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔

پھر ان کو محلہ شاہ گنج کے ایک بہت بڑے استادِ موسیقی کے پاس بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے کامل چار سال ریاض کیا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ دو گھنٹے کے ریاض کے بعد انھیں پسینہ آجاتا تھا۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ لڑکے کی تعلیم میری مرضی کے مطابق ہو گئی تو میر علی محمد صاحب نے اب انھیں اپنے پاس بلایا اور سب سے پہلے ان سے یہ عہد اور میثاق لیا کہ وہ اپنی زبان کھولیں گے تو صرف مدحِ رسولؐ اور آلِ رسولؐ نیز ذکرِ سید الشہدا میں، کبھی کوئی ایسا کلام نہیں گائیں گے جو خلافِ تعلیماتِ اسلام ہو۔ پھر انھوں نے سوز، سلام اور مرثیے پڑھنے کے ڈھنگ، آدابِ مجلس اور سوز خوانی کے قاعدوں سے آگاہ کیا۔ ایک سال کی محنت کے بعد انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ لکھنؤ کے مشہور و معروف سوز خوانوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اس زمانے میں مفتی گنج میں مرزا محسن صاحب محدث کے گھر پر سال میں ایک مرتبہ سوز خوانی کی ایک بہت بڑی مجلس ہوا کرتی تھی۔ مجلس کیا ہوتی تھی، سوز خوانوں کا دنگل ہوا کرتا تھا۔ اچھے صاحب، قادر رضا صاحب، میر زندے رضا صاحب اور بہت سے نامی گرامی سوز خوان اس دنگل میں اترتے تھے۔ موسیقی کے ماہرین کی ایک کمیٹی یہ فیصلہ کرتی تھی کہ اس سال کا سب سے بہتر سوز خوان کون ہے۔ منجھو صاحب بھی اس مجلس میں جاتے تھے لیکن صرف سامع کی حیثیت سے۔ استاد کی طرف سے مقابلہ میں اترنے کی اجازت نہیں تھی۔ کئی سال تک جاتے اور مجلس میں اپنے جوہر دکھانے کے لیے بے چین رہتے۔ غرض دو تین سال کے بعد استاد نے اجازت دے دی کہ اس مرتبہ تم بھی شرکت کرنا۔ اور جب وہ دن آیا تو منجھو صاحب انگرکھا، ٹوپی، شانوں پر شال اور اپنے بازوؤں کو لیکر مفتی گنج پہونچے۔ سارے شہر میں شہرہ تھا کہ آج میر علی محمد صاحب شہر کے نامی گرامی سوز خوانوں کے مقابلے میں اپنا "پٹھا" اتار رہے ہیں۔

یہ مجلس ہمیشہ شام ۴ بجے شروع ہوتی اور رات کو ۱۲ بجے ختم ہوتی تھی لاؤڈ اسپیکر وغیرہ تو تھے نہیں اس لیے موسیقی اور سوز خوانی کے متوالے گھر کے کوٹھوں پر بھی جمع ہو جاتے تھے۔ منجھو صاحب میں کچھ باتیں خداداد تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بڑے خوبرو اور گبرو جوان تھے، اور انتہائی جامہ زیب تھے۔ ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ پڑھتے وقت خصوصاً تان لیتے وقت دیگر سوز خوانوں کی طرح منہ نہیں بناتے تھے۔ غرض پہلے ہی دن جب انھوں نے میر انیس کا یہ سلام ؎

شبیہِ امامِ زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویرِ جاں کھینچتے ہیں

کچھ اس انداز سے پڑھا کہ سارا مجمع کبھی وجد کے عالم میں کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی فرطِ گریہ سے سر زانو پیٹنے لگتا تھا۔ مجلس اتنی کامیاب ہوئی کہ منجھو صاحب نے جھنڈے گاڑ دیے اور اتفاق رائے سے اس سال کے سب سے اچھے سوز خوان کہلائے اور پھر کئی سال تک کوئی دوسرا سوز خوان ان سے پیش نہیں پا سکا۔

وہ جو اک مثل ہے۔ "ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی" منجھو صاحب کی شہرت منجھو صاحب سے آگے چلنے لگی۔ آج محمود آباد بلائے گئے، کل رام پور اور پرسوں حیدر آباد۔ بعد میں ان تینوں ریاستوں سے ان کے وظیفے مقرر ہو گئے۔ شہر میں جب نکلتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی شہزادہ چلا آرہا ہے۔ یوں تو وہ شہر میں متعدد مجلسیں پڑھتے تھے، لیکن نظیرن کے امامباڑے واقع سر کٹا نالہ کی مجلس بڑی مشہور مجلس تھی۔ اس مجلس کے موقع پر چوک کی گانے والیاں اپنا کاروبار دو گھنٹے کے لیے بند کر کے منجھو صاحب کو سننے آتی تھیں۔ امامباڑے کا ایک حصہ چلمنیں وغیرہ ڈال کر ان کے لیے مخصوص کر دیا جاتا تھا۔

میر علی محمد صاحب نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر دی تھی جن سے ایک اولاد نرینہ تھی۔ منجھو صاحب کی زندگی میں اگر کسی بات پر اعتراض کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ کہ وہ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ زیادہ دن بسر نہیں کر سکے۔ ملال ہو گیا۔ نتیجے میں دونوں میاں بیوی الگ الگ رہنے لگے۔

منجھو صاحب نے اپنے اُستاد، اپنے ماموں اور اپنے خسر معظم سے جو عہد کیا تھا کہ زبان کو ذکرِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا اور کے ذکر سے آلودہ نہیں کروں گا اس پر ساری زندگی قائم رہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حیدر آباد میں نظام دکن نے ان سے یہ فرمائش کی کہ نظام کی ایک غزل طبلے کی تھاپ پر گائیں، تو انھوں نے برجستہ جواب دیا:

"حضور عالی تعالی! اس ناچیز نے یہ فن اختیار کرتے وقت اپنے استاد محترم کے سامنے یہ قسم کھائی تھی کہ مدحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا کسی اور کلام سے اپنی زبان کو آلودہ نہ کرے گا۔ لہذا حضور یا تو غزل کے بجائے مجھے سلام عنایت فرمادیں یا پھر یہ حکم دیں کہ میں اپنی قسم توڑ دوں"

نظام اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ "نکو، نکو" کہا اور سلام دینے کا وعدہ کیا۔

منجھو صاحب سے ہماری رشتہ داری تھی۔ ان کے بیٹے کبھی کبھی ہمارے یہاں آتے جاتے تھے۔ ان کے نانا (میر علی محمد صاحب) کی کچھ زمینداری کٹرا مانک پور میں تھی وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں بمبئی چلا گیا۔ پھر اس خاندان کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

منجھو صاحب نے ۱۰ر جنوری ۱۹۴۲ء مطابق ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ انتقال کیا اور کربلائے تال کٹورہ میں تدفین ہوئی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

□□

اقبالؔ اور رشید احمد صدیقی صفحہ ۱۸ کا بقیہ

اقبال

برحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را
ز مشتاقاں اگر تاب سخن بردی نمی دانی
محبت می کند گویا نگاہِ بے زبانے را
کجا نورے کہ غیر از قاصدے چیزے نمی داند
کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را
اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزہ وجودِ من
بہ ایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را
من اے دریائے بے پایاں بموجِ تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نمی جویم کرانے را
ازاں معنیٰ کہ چوں شبنم بجان من فرو ریزی
جہانِ تازہ پیدا کردہ ام عرضِ فغانے را

□□

چند کوائفِ ذوق ۔۔۔ صفحہ ۲۵ کا بقیہ

ولی عہدی کا ذکر ہے۔ یہ عہد اکبر شاہ ثانی کے انتقال ۱۹ر نومبر ۱۸۰۶ء سے شروع ہوتا ہے۔

نمبر ۳۔ میر کاظم حسین بے قرار ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء)۔ شاید ۱۸۰۷ء کے آخر تک وہ بقول آزاد، جان الفنسٹن کے میر منشی مقرر ہو کر شکارپور (سندھ) چلے گئے۔ اس تقرری کے لیے بے قرار کی سفارش بھی ولی عہد ظفر ہی نے کی تھی۔

نمبر ۴: ذوقؔ ۱۲۲۳ھ تا ۲۴ر صفر ۱۲۷۱ھ (۱۸۰۸ء تا ۱۹ر نومبر ۱۸۵۴ء)

نمبر ۵۔ غالبؔ ۱۸۵۴ء تا مئی ۱۸۵۷ء

شاہ نصیر شہزادہ ظفر کے استاد تھے۔ عشق شہزادہ ظفر اور پھر ایک سال تک ظفر ولی عہد سلطنت کے استاد رہے۔ بے قرار ولی عہد ظفر کے اُستاد تھے۔ ذوقؔ ۲۹ سال ولی عہد ظفر کے، ۱۷ سال شاہ ظفر کے اُستاد رہے۔ غالبؔ شاہ ظفر کے فقط تین ہی سال استاد رہ سکے۔

۲ عمدۂ منتخبہ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰-۱ء) تا ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ء)

۳ مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶-۷ء)

۴ عیار الشعراء ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸-۹۹ء) تا ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲-۳۳ء) اس تذکرہ کی معلومات کلیتاً ذوقؔ: سوانح اور انتقاد ص ۶۵-۶۶ از تنویر احمد علوی سے لی گئی ہیں۔

□□

غزلیں

پلک جھپکتے ہی دیوار و در سمیٹ لیے
ذرا سی آگ نے کتنے ہی گھر سمیٹ لیے

نہ جانے کیا ہوا سورج غروب ہوتے ہی
فضا میں اڑتے پرندوں نے پر سمیٹ لیے

بچھڑ گئے تھے جو مقتل میں اپنے جسموں سے
قریب شام وہ بیزروں نے سر سمیٹ لیے

پناہ دے نہ سکے جب گھنے درخت انھیں
مسافروں نے نظر میں شجر سمیٹ لیے

سبیلِ تشنہ لبی کیا کریں گے یہ دریا
سمندروں نے بھی بازو اگر سمیٹ لیے

اکبر نوری

۱۴۱/۹۷/۴۴۔ مہر منزل شیش محل حسین آباد لکھنؤ

کبھی ملیں گے ذرا دل میں حوصلہ رکھنا
کچھ آنسوؤں کو ہمارے لیے بچا رکھنا

خراب ہوتی ہے حد سے زیادہ چاہت بھی
کسی سے پیار بھی کرنا تو فاصلہ رکھنا

تم اپنے خط سے نہ رکھنا کبھی ہمیں محروم
ہمیشہ یوں ہی محبت کا سلسلہ رکھنا

نہ دن کو چین ملے گا نہ رات کو آرام
غلط ہے جیب میں تصویر بے وفا رکھنا

جدا بھی ہوں تو جدائی کا غم نہ ہو خورشید
کسی سے رکھنا تو بس اتنا واسطہ رکھنا

خورشید ھلوری

۵ بکٹ راے کالونی۔ لکھنؤ

نظریں تو جھکی ہوں گی، چہرا تو کھلا ہوگا
جب شدتِ الفت میں منھ چوم لیا ہوگا

کیوں چاند کے چہرے پر یہ پھیل گئی زردی
سورج کے قریں کوئی انسان گیا ہوگا

یہ جذبۂ نصرت ہے احساسِ محبت کا
جب شمع جلی ہوگی، پروانہ جلا ہوگا

لو ہوش و خرد ہم نے سب کچھ تو لٹا ڈالے
تم نے تو کبھی یونہی دیوانہ کہا ہوگا

آدابِ محبت کے کچھ اور تقاضے ہیں
حق جان کے دینے سے پیکر نہ ادا ہوگا

ڈاکٹر پیکر جعفری امروہوی

۱۲۲/۳۹۲(۱)، میدان ایلچ خان لکھنؤ

مدتوں کوئی پاس نہیں ہوتا ہے
پھر بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا ہے

روشنی کا بھی تصور نہیں رہتا ہے وہاں
دل میں جب سلسلۂ آس نہیں ہوتا ہے

زندگی ہے تو برتنے کا سلیقہ جانو
اس قدر کوئی بھی حاس نہیں ہوتا ہے

دولتِ علم و ہنر جس کو ملے قسمت سے
اس کو ہرگز غمِ افلاس نہیں ہوتا ہے

یہ بھی معلوم ہے اے زیست پہ نازاں مخمور
معتبر رشتۂ انفاس نہیں ہوتا ہے

ڈاکٹر مخمور کاکوروی

۶۸۔ چودھری محلہ۔ کاکوری لکھنؤ

ڈاکٹر نسیم اقتدار علی
۲۱۔ نیو بیری روڈ، لکھنؤ

ایک اہم تذکرہ

سخنورانِ شاہجہانپور لکھ کر جناب مبارک شمیم نے وہ فرض کفایہ ادا کر دیا جو اگر نہ ادا کیا جاتا تو شاہ جہاں پور کے تمام صاحبان قلم اپنے بزرگوں کی روحوں اور اپنے معاصرین سے نہ صرف شرمندہ ہوتے بلکہ جواب دہ بھی ہوتے۔

یہ کتاب چھپنے کے فوراً بعد ہی مجھے لکھنؤ میں مل گئی تھی لیکن اس زمانے میں اپنی ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے میں ایسی ٹوٹی ہوئی تھی کہ پڑھنے لکھنے تو کیا دنیا ہی سے دل اچاٹ تھا۔ وطن عزیز کے واسطے سے کھنچے ہوئے رنجور جذبۂ شوق کی مہمیز کے باوجود کتاب پڑھنے کی نوبت نہ آئی۔

اوائل جون میں شاہ جہاں پور حاضری ہوئی اور یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ اس کتاب کی رسم اجرا ۹ جون کو ہونا ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس پر ایک مضمون لکھوں۔ میں نے معذرت چاہی لیکن پھر جناب رشید حسن خاں صاحب کے کہنے پر یہ مختصر سا تعارفی مضمون سپردِ قلم کیا۔ مجھے امید ہے کہ جب اس کتاب کی علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی تو یقیناً اس پر سیر حاصل تبصرے لکھے جائیں گے۔

کتاب سے ہٹ کر لیکن اسی واسطے سے دو ایک باتیں اور کہنے کو دل چاہتا ہے۔ جب یہ کتاب ترتیب دی جا رہی تھی تو رباب صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے چند اشعار اور حالاتِ زندگی لکھ دوں تاکہ وہ بھی اس میں شامل کر دیے جائیں۔ لیکن لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کو میرا دل نہ چاہا۔ یہاں ایک اور واقعہ کا بیان دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ خواتین لکھنؤ کی ایک ادبی محفل میں خاکسار نے کچھ تک بندی کی۔ ماجرہ آپا یعنی کامریڈ ڈاکٹر زیڈ، اے، احمد کی بیگم صاحبہ بھی موجود تھیں، کہنے لگیں ــــ

"تم شعر بھی کہتی ہو یہ مجھے نہیں معلوم تھا، لیکن خیر سن کر مجھے کچھ تعجب بھی نہ ہوا، اس لیے کہ میں بھی رام پور کی ہوں اور پٹھان کا خمیر ہی شاعری اور عشق سے اٹھا ہے۔"

سخنورانِ شاہجہانپور میں دو سو اٹھائیس شعراء کی چیدہ فہرست اس حقیقت کی غماز ہے۔ گو کہ اس میں کچھ لائق احترام سید صاحبان شامل ہیں نیز بعض دوسرے مذاہب اور اقوام کے شعراء بھی ہیں لیکن پانی تو سب نے گرّا اور کھنوت ہی کا پیا ہے اور سب کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا ہے۔

شاہ جہاں پور کے جس ماحول میں ہم لوگوں کی پرورش و پرداخت ہوئی وہاں گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی ہماری پوری دنیا آباد تھی، اور یہی حال شرفا کے تقریباً ہر گھر کا تھا۔ جو گھر تعلیم سے روشناس ہو گئے تھے وہاں کتب نصابی یا اخبار کے علاوہ کسی دوسری کتاب یا جریدہ کو ہاتھ لگانا گویا جلتا ہوا انگارہ چھونا تھا۔ حالاں کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم نے اکثر یہ انگارے چھو کر اپنے ہاتھ جلائے تھے۔ بہرحال بارہویں درجے تک، دور نہ جاتے ہوئے اپنے شہر کے ہم عصر ادیبوں شاعروں اور ان کی تخلیقات سے محرومی رہی۔ علی گڑھ پہونچ کر جہانِ معنی کا دروازہ کھلا اور ادیبوں و شاعروں کے ناموں سے تعارف ہوا۔ ڈاکٹر قمر رئیس اس زمانے میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے اور پھر ابھی تقریباً چھ سال قبل لندن میں جب مبارک شمیم صاحب کی ایک صاحبزادی شگفتہ سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنا تعارف اپنے والد صاحب کے حوالے سے کرایا، پھر اپنے چچا ڈاکٹر قمر رئیس کا نام لیا تو میں سمجھ گئی کہ

این خانہ ہمہ آفتاب است

اس کے بعد ایک روز مبارک شمیم صاحب لکھنؤ میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ رسمی گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ان کے دو شعری مجموعے 'نقشِ نوا' اور 'آب و ہوا' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں لیکن تاریخ سے بھی انھیں خصوصی دل چسپی ہے۔ خصوصاً

روہیل کھنڈ کی تہذیبی تاریخ ان کے مطالعہ اور تحریر و تصنیف کا موضوع رہی ہے۔ اس سلسلے میں ریڈیو پر ان کی تقریروں کے علاوہ اردو اور ہندی میں ان کے کئی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف بھی اسی شاعرانہ تاریخ داں مزاج کی کاوشوں کا ثمرہ ہے جس میں تحقیقی توازن بھی شامل ہے۔

سخنورانِ شاہجہاں پور ۳۵۸ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں فہرست شعراء اور کتابیات کے دو صفحے بھی شامل ہیں۔ مصنف کا تحریر کردہ ۲۲ صفحات کا مقدمہ کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے یوں تو وہ محرکات بیان کیے ہیں جو اس کی وجہ تصنیف و تدوین بنے لیکن اس میں سب سے اہم بات ان چند نادر کتابوں کا ذکر ہے جو اگر چھپ کر نظرِ عام پر آ گئی ہوتیں تو شاہجہاں پور کا علمی، ادبی نیز تہذیبی پس منظر پوری طرح اُجاگر ہو کر اہلِ علم و فن کے سامنے آتا اور موجودہ ادبی، سیاسی اور سماجی منظرنامہ میں شاہجہاں پور کا مقام کچھ اور ہی ہوتا۔ یہ کتابیں ہیں: **تاریخِ صبیح** مولفہ مولوی صبیح الدین مرحوم۔ **تاریخِ مظفری**، از خواجہ مولوی ظفر سلیمانی شاہ آبادی۔ علاوہ ازیں خان بہادر ڈپٹی مطیع اللہ خاں صاحب نے **تاریخِ مطیع** کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں شاہجہاں پور کی تاریخ مکمل کی۔ ان تاریخوں کے ماسوا ایک تاریخ انسانی بھی ہے جس کو منشی احسان علی خاں احسان مختار نے تصنیف و تالیف کیا۔ یہ بھی تین جلدوں میں تھی۔ مبارک شمیم کے الفاظ میں:

> پہلی اور تیسری جلد کا اب تک پتہ نہیں، دوسری جلد راقم نے دیکھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی وہ وسیلہ خاص ہے جس سے سخنورانِ شاہ جہاں پور کی ترتیب کے خیال کو تقویت پہنچی۔ اس میں شعراء کا تذکرہ کہیں زیادہ ہے۔ میں نے اس کتاب سے کما حقہ، استفادہ کیا اور شعراء کے حالات یا تو مِن وعَن نقل کر دیے یا پھر غیر ضروری حصّے نکال کر ان کے احوال کو مختصر کر دیا...... اگر تاریخ صبیح مطبوعہ دستیاب نہ ہوتی تو سخنورانِ شاہجہاں پور کسی طور مکمل نہ ہوتی تو کم از کم اس تعداد میں شعراء کے حالات اس کتاب میں اکٹھا نہ کیے جا سکتے تھے۔" ؎۲

مقدمہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے شاہجہاں پور کا تاریخی پس منظر ابتدا سے پیش کیا ہے اور اس میں بعض ادبی و دینی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور پھر جس طرح ہندستان کے بعض دوسرے نامُراد شہر اور پُرانی بستیاں پُر آشوب ہنگاموں میں غارت ہوئے اسی طرح یہ شہر بھی تین بار تاخت و تاراج ہوا۔ مصنف کے الفاظ میں:

> " شاہجہاں پور کے ادبی خزانے جو ۱۸۵۷ء کے شعلوں سے محفوظ رہے تھے وہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے جگہ جگہ جلتے الاؤ میں جل کر راکھ ہو گئے اور اُردو مخالف ہواؤں کے ساتھ کہیں دُور چلے گئے۔ وہ شہر جو علم و فن کا زم زم، سرد و شیریں چشمہ تھا، یکایک خشک ہو گیا اور اس کی گزرگاہیں بھی گردِ ناقدری کی تہوں میں معدوم و بے نشان ہو گئیں۔" ؎۳

جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، اس کتاب میں قدیم و جدید کو ملا کر کُل ۲۲۸ شعراء کا احوال مع نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ شعرائے قدیم کی فہرست میں ۰۰ مشاہیر شامل ہیں جن میں کوئی خاتون نہیں ہے۔ شعراء کے باقی ناموں کا شمار بیسویں صدی کے شعراء میں کیا گیا ہے اور ان میں سرفہرست ہیں حکیم مولوی ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری، جو بیسویں صدی کے شعراء میں ایک معتبر اور اہم نام ہے۔ اس فہرست میں چھ شاعرات کے نام بھی شامل ہیں۔ پہلا نام انور جہاں بیگم حجاب کا ہے۔ یہ شاعرہ اس لحاظ سے بے حد اہم اور توجہ طلب ہیں کہ ان کی ولادت انیسویں صدی کے اواخر یعنی ۱۸۸۸ء میں ہوئی اور ان کے کلام کے جو تین نمونے رسالہ یا گلدستہ 'ارمغان' سے اخذ کر کے پیش کیے گئے ہیں ان پر اشاعت کی یہ تین تاریخیں بالترتیب پڑی ہیں: ارمغان بابت ماہ اپریل ۱۸۹۷ء۔ ارمغان بابت ماہ مئی ۱۸۹۷ء اور ارمغان بابت ماہ فروری اس پر سنہ نہیں پڑا ہے جو غالباً سہوِ کتابت ہے؎۴ گویا ۹ سال کی عمر میں ان شاعرہ کا کلام قبولِ عام حاصل کر کے شائع ہونے لگا تھا۔ حجاب صاحبہ کے حالاتِ زندگی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دَور میں شہر کی تہذیبی و معاشرتی صورت حال شاید کچھ مختلف رہی ہو۔ یعنی حجاب صاحبہ کا مشاعروں میں شرکت کرنا اور اس کے لیے دوسرے شہروں کا سفر بھی اختیار کرنا نیز اپنے گھر پر مشاعرے منعقد کرنا

اور اساتذہ حضرات سے تبادلۂ خیال کرنا وغیرہ ہم۔ ہماری عمر کے لوگوں نے اپنے بچپن میں یعنی بیسویں صدی کے نصف سے کچھ قبل شہر کا جو عمومی معاشرتی اور تہذیبی مزاج دیکھا ہے جس میں لڑکیوں کو حرف آشنا تو ضرور کرادیا جاتا تھا لیکن قلم آشنا نہیں کرایا جاتا تھا، اسے دیکھتے ہوئے تو ہم یہی کہیں گے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں یہ شہر بہت ہی وسیع الذہن اور وسیع النظر رہا ہوگا۔ اہلِ علم اور صاحبانِ نقد و نظر پر لازم ہے کہ ان گوشوں پر مزید روشنی ڈالیں اور تحقیق سے یہ بات ثابت کریں کہ آیا حجاب صاحبہ کی یہ ایک انفرادی شخصیت تھی یا اس عہد میں گھر پر ہی سہی دستورِ زمانہ کے مطابق عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔

سخنورانِ شاہجہانپور کا شمار تذکرے کی صنف میں ہوگا۔ ادب میں تذکرے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی وہ مواخذ ہیں، جن کے ذریعہ ہمیں اپنے اسلاف کے حالات کا علم ہوتا ہے اور ان کے ادبی کارناموں سے ہم روشناس ہوتے ہیں ساتھ ہی اس عہد کے ادبی، سیاسی اور سماجی عوامل بھی پس منظر میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے یہ تذکرے مشعل راہ ہیں، مستقبل میں جب اردو ادب کا جائزہ لیا جائے گا تو یقیناً اس کتاب کی ایک اہم دستاویزی حیثیت ہوگی۔

مبارک شمیم صاحب نے جس محنت اور کاوش سے شاہجہاں پور کے قدیم اور جدید شعرا کا احوال اور نمونۂ کلام یکجا کیا ہے وہ کسی طرح کوئی آسان کام نہ تھا، خود ان کے الفاظ میں:

"... یہ ذمہ داری اوڑھ لینے کے بعد خبر ہوئی کہ میں جان لیوا خوش فہمی کا شکار تھا۔ کام آسان نہیں، جسم و جان تحلیل ہو جانے کے امکانات بھی تھے۔"[5]

تحقیق کے رہ نورد کو قدم قدم پر آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، اور سنگریزوں و جواہر پاروں کو پرکھ کر ایک دوسرے سے الگ کرنا ہوتا ہے۔ اس چھان بین کے بعد بھی اکثر میزانِ نقد کے پلڑے برابر نہیں رہ پاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے جو شعرا حضرات اس کتاب کی رونق ہیں اُن میں ایک بات ذرا سی کھٹکتی ہے کہ بعض ایسے حضرات کو شعرا کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جن کا کوئی مطبوعہ کلام کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ خیر! کلام کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونا شاعری کی شرط نہیں ہے لیکن ان کے متعلقین کو ان کی گوناگوں بیش بہا صلاحیتوں کا علم تو ضرور رہے لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ اسی طرح بعض صاحب دیوان شعرا کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے جس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض جگہ کچھ شعرا کے سنینِ ولادت اور وفات کو ادھورا چھوڑ دیا گیا ہے جو رواں اور شگفتہ طرزِ نگارش پر بار ہے، پڑھنے والا اٹکتا ہے اور محقق کے لیے تو یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہوگا۔

زبان و بیان اور مواد کے اعتبار سے سخنورانِ شاہجہاں پور کا شمار صفِ اوّل کے کلاسیکی ادب میں ہونا چاہیے۔ شعرا کے انتخابِ کلام میں بھی مؤلف نے بڑے ذوق اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ ذکر شعرا حضرات کا اور بیان مبارک شمیم صاحب کا۔ مندرجہ بالا سطور کو پڑھ کر یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ہو گئی رقیب وہ اس لیے نہیں کہ میں کسی کی رازداں نہیں ہوں۔

سخنورانِ شاہجہاں پور کا کاغذی پیرہن بھی خوب ہے۔ اچھی سے اچھی کتاب پڑھنے کے لیے اٹھایئے لیکن اگر اس کا کاغذ ردی، متن اغلاط سے پُر اور طباعت موزوں نہ ہو تو اسے پڑھنا بارِ خاطر ہو جاتا ہے۔ سخنورانِ شاہجہاں پور کی روشن شمع (سرورق کی مناسبت سے) ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ آخر میں ایک بات اور عرض کرتی چلوں کہ یہ کتاب توصیفی تبصروں اور تعریفوں سے بھی مبرّا ہے۔ آجکل جو کتابیں چھپ رہی ہیں نثری اور شعری دونوں میں تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے تعارفی نوٹ شامل ہوتے ہیں، لکھنے والا کتاب پر شاید اتنی محنت نہیں کرتا ہے جتنی بھاگ دوڑ ان مضامین کو اکٹھا کرنے میں کرتا ہے۔

□□

حواشی:

1۔ شاہ جہاں پور کی دو ندیاں جن کے درمیان یہ شہر آباد ہے۔

2۔ سخنورانِ شاہجہاں پور ص ۱۶

3۔ " " ص ۲۲

4۔ " " ص ۶۶

5۔ " " ص ۱۶

مختار ٹونکی

راجستھانی زبان میں دوہے کی روایت

دوہا ہندستان کی تہذیبی میراث اور ادبی شناخت ہے جس طرح دوسرے بوقلموں تہذیبی عناصر نے شاعری کی مختلف اصناف کو دھنک رنگ عطا کیے ہیں اسی طرح دوہے نے بھی اپنی فنی خصوصیات اور کلاسیکی روایات سے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔ بلاشبہ شعر و سخن کی دنیا میں دوہا ایک پسندیدہ اور مقبول صنف رہا ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر دور حاضر تک جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی عظمت و وقعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایجاز و اختصار کے ساتھ مگر پُراثر انداز سے پیش کرنے کے لیے یہ چھند لاجواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں کویوں نے وقتاً فوقتاً اس میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اس طرح اپنے شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں۔

راجستھان کے تناظر میں اگر دوہے کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا تاریخی اور روایتی سلسلہ ہمیں بہت دور تک لے جائے گا بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دوہا نگاری میں راجستھان کو اولیت و فوقیت حاصل ہے اور یہ دوہے کی دولتِ وافر سے مالا مال نظر آتا ہے۔ گیت کی طرح دوہا عوامی ادب کی ایک بہترین صنف ہے اس لیے راجستھانی زبان کے چارن کویوں اور ڈنگل شاعروں کا محبوب و مرغوب چھند رہا ہے۔ راجستھانی زبان و ادب کے غائر مطالعے سے بھی اس کی ہردلعزیزی اور مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے ڈاکٹر گووردھن شرما نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ،

> "راجستھان بذاتِ خود دوہے کا دیش ہے۔ دوہا یہاں
> چھندوں کا راجا ہے۔ بہت سے کوی تو صرف دوہا کوی
> ہیں...... اسی طرح بہت سے گرنتھ بھی دوہا گرنتھ
> ہی ہیں"

اور اس جامع و مانع قول کو بہر صورت ثابت کیا جا سکتا ہے۔ 'دھرتی دھوراں ری موٹا منگراں ری' کے "ڈھولا ماروا دوہا"۔ راجیا را دوہا، اوجلی جیٹھولے را دوہا، اور بہاری، بانکی داس، کرپا رام وغیرہ کے شعری کارنامے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ دوہے کی کہانی یہاں حکایت لذیذ کا درجہ رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں دوہے کی قسمیں؛ رنگ دوہا، ہری جا دوہا، سندھو دوہا وغیرہ بھی بتاتی ہیں کہ یہ صنف لوک گیت "مانڈ" کی مانند کویوں کی نمائندہ و پسندیدہ چیز رہی ہے۔ بیانہ کے باشندے اور معروف دوہا نگار دارحمن نے اپنا نام "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز" میں کچھ یوں ہی نہیں لکھایا ہے بلکہ دس ہزار دوہے لکھ کر یہ سرفرازی حاصل کی ہے یہ بات بھی راجستھان میں دوہے کی عظیم الشان روایت میں چار چاند لگاتی ہے۔ اسی لیے تو اردو کے معتبر شاعر شاہد میر نے کہا ہے

> دوہے راجستھان کے جلتا ہوا الاؤ!
> جو بھی چاہے سینک لے اپنے تن کے گھاؤ

راجستھانی بھاشا میں دوہے کی ابتدا کے برعکس ڈاکٹر نامور سنگھ امیر خسرو (۱۳۲۵ھ - ۱۲۵۳ھ) کو 'ہندی انداز' کے دوہے لکھنے کا موجد گردانتے ہیں اور ہندی روایت کے سلسلے میں ان کا مندرجہ ذیل دوہا بھی بطور ثبوت پیش کرتے ہیں ؎

> گوری سووے سیج پہ، مکھ پہ ڈالے کیس
> چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی چہوں دیس

مگر امیر خسرو سے بہت پہلے راجستھان کی سرزمین پر ہندوی انداز کے دوہوں کا آغاز ہو چکا تھا اور دوہا باقاعدہ طور پر اظہار کا وسیلہ بن چکا تھا صوفی شیخ حمید الدین ناگوری (۱۲۷۴ھ - ۱۱۹۳ء) کا ایک دوہا مثال کے

طور پر یہاں درج ہے جو انھوں نے ناگور ضلع کے ایک پرگنے ڈیہہ کی یاد میں کہا تھا ے

میرا ہیوڑا ڈھوڑ ہا، جی جانے ڈیہہ جاوَں
ساگر پھونک، کریلا کھا خالق سے نیہہ لگاؤں

'ڈھولا مارو' کی تخلیق بھی امیر خسرو سے قبل معرض وجود میں آ چکی تھی۔ فرانسیسی محقق ووڈے ولے کے مطابق ریاست دھول پور کا بانی راجہ ڈھولن (دھول کنور۔ گیارھویں صدی) ہی ڈھولا ماورادوہا کا نایک ہے اور پنڈت موتی لال مینار یا کی نظر میں اس کی تخلیق کا زمانہ وکرم سمبت ۱۰۰۰ کے آس پاس ہے۔ اس میں اس طرح کے دوہے بکثرت ملتے ہیں:

پریتم آیو ہے سکھی، جیاں جی جوتی باٹ
گھرنا چے، تھانبا ہنسے کھیلن لاگی کھاٹ

واضح ہو کہ 'راجستھانی ادب' کی ابتدا، وارتقا کا عہد ۷۷۸ء سے لیکر ۱۱۹۳ء کے درمیان تسلیم کیا گیا ہے۔ کسی بھی ادب میں تاریخی حیثیت سے ادوار کی تقسیم متعلقہ ادب کے رجحانات کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ جہاں تک دوہا چھند کا سوال ہے، یہ تاریخی حقیقت اور مسلمہ صداقت ہے کہ راجستھانی ادبیات کے آغاز کے ساتھ ہی دوہا نگاری سخن وروں کا وسیلۂ اظہار بن گئی تھی۔ معلوم اور غیر معلوم شعرا نے دوہوں پر خوب خوب طبع آزمائی کی ہے اور بے شمار دوہے ہر دور میں کہے گئے ہیں۔

دوہا نگاری اس لیے ادب میں کوئی خاص جگہ نہیں بنا سکی ہے کہ اس کا کوئی باقاعدہ تاریخی جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی دانش وروں نے ایمان داری سے انھیں تالیف کیا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بہترین دوہے عوام کی زبان پر تھرکتے رہے اور انھیں اخلاقیات کا درس دیتے رہے جبکہ ان کے تخلیق کار شعرا نامعلوم رہے ہیں۔ راجستھانی ادب کے ابتدائی دور کی کچھ تصانیف ایسی ہیں جن کے بارے میں متضاد اور متنازعہ خیالات ہیں۔ ایسی کتابوں میں ڈھولا مارورا دوہا، جیٹھوے را دوہا، بیسل دے راس، پرتھوی راج راسو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱. ڈھولا مارورا دوہا

ایک جمالیاتی شعری کارنامہ ہے۔ اس کے مرتبوں نے اسے 'بیلیڈ' مانا ہے۔ بیلیڈ عوامی ادب میں مروج ایسی شعریات کو کہا جاتا ہے جو نغمگی (جسے گایا جائے) ہوتا ہے اور جس کا 'کرتا' اکثر نامعلوم ہو لیکن مندرجہ ذیل دوہے کے مطابق ڈھولا مارورا دوہا، کا کرتا (خالق) کلّول تسلیم کر لیا گیا ہے۔

گاہا گوڈھا گیت رس، کوت۔ کتھا کلّول
چتّر تنا من ریجھوے، کہیا کوی کلّول

۲. اوجلی جیٹھوے رادوہا

راجستھان اور گجرات دونوں صوبوں میں مقبول و مروج ہیں 'جیٹھوا' بارھویں صدی میں پوربندر کا راجا مانا گیا ہے لیکن پنڈت موتی لال مینار یا نے ان دوہوں کا عہد تصنیف سمبت ۱۱۰۰ متعین کیا ہے۔ اوجلی جیٹھوا کی کہانی شری جگ جیون رام پاٹھک نے ۱۹۱۵ء میں گجراتی کے دیوالی نمبر میں شائع کرائی تھی۔ یہ بھی ایک رومان پرور بیانیہ ہے۔ اوجلی چارن پتری تھی جس کے ہجر و فراق پر مبنی سورٹھیا دوہے زمانہ قدیم سے گائے جاتے رہے ہیں ے

درسن ہوا نہ دیو، بھیو بھونا بھٹکیا
سونا مندر سیو، جنم گیا و جیٹھوا

۳۔ بیسل دے راس

بیسل دیو راسو بھی ایک عاشقانہ شعری بیانیہ ہے جس میں اجمیر کے بیسل دے چوہان اور راجہ بھوج پرمار کی بیٹی راج متی کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس کا کرتا نرپتی نالہ ہے۔ اس کے زمانۂ تخلیق کے بارے میں بھی مختلف آرا پیش کی گئی ہیں۔ راسو کے ایک نسخے میں بتایا گیا ہے کہ:

بارہ سے بہوتراں ہاں منجھاری، جیٹھ وری نومی بدھ واری
نالہ رسایں آرم بھی، سارداتو ٹھن برہم کماری

اس کا اصل نسخہ محفوظ نہیں رہ سکا تاہم اسے سترھویں صدی میں قلم بند کر دیا گیا ہے ے

موتی کا آشا کیا کوں کوں چندن پاکا پان
الی سکی آرتی، جائ بدھیری دیو بلان

۴۔ پرتھوی راج راسو

مہاکوی چند بردائی کی اس شعری تصنیف میں پرتھوی راج چوہان سے متعلق دوہے ملتے ہیں۔ محقق موتی لال مینار یا کا کہنا ہے کہ اس کے

سات نسخے اب تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ اس میں چند کوی خود ایک کردار ہے۔ آچاریہ ہزاری پرساد دویدی کے مطابق اصل راسو کی تخلیق شک شکی مکالمہ کے روپ میں ہونی چاہیے۔ اس کے ۶۹ ابواب میں پرتھوی راج کی عالی حوصلگی کے بارے میں ایک لاکھ چھند ہیں۔ اس کا تخلیقی زمانہ وکرم سمبت ۱۲۵۰ کے لگ بھگ مانا گیا ہے۔ ایک دوسرے کوی میدناتھ نے اس کے لیے کہا ہے ؎

ایک لاکھ راسو کیو سہس پنچ پری مان
پرتھوی راج نرپ کو سجس جا ہر سکل جہان

۵. راجیا را دوہا

اس کے خالق چارن کوی کرپارام تھے جو سیکر کے راؤ راجا دیوی سنگھ کے دربار سے منسلک تھے۔ راجیا ان کا سیوک تھا، اسی کو مخاطب کرکے انھوں نے ان دوہوں کی تخلیق کی۔ کہتے ہیں کہ راجیا نے کرپارام کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا، اس لیے خوش ہو کر اس کو ادبی حیثیت سے زندہ رکھنے کے لیے یہ دوہے لکھے گئے۔ راجیا کے دوہوں نے راجستھانی ادب میں اپنا مخصوص مقام بنایا۔ اگرچہ حقیقت میں دیکھیں تو یہ دوہے نہیں بلکہ سورٹھے ہیں تاہم انھیں سورٹھیا دوہا کے نام سے مقبولیت ملی۔ راجستھان کے عوام میں انھیں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سادگی اور سلاست ان کی خصوصیات ہیں۔

اپجاوے انوراگ، کومل من ہر کہت کرے
کڑوو لاگے کاگ، رسنا راگن راجیا

یہ تو وہ شعری تصانیف ہیں جو مشہور و معروف ہو کر اہمیت کی حامل ٹھہریں۔ راجستھان کے گاؤں گاؤں اور ڈھانی ڈھانی میں قدیم زمانے سے دوہے اس کی فضاؤں میں گونجتے رہے ہیں اور پیڑھی در پیڑھی منتقل ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا انمول خزانہ ہے جو تحریری شکل میں 'غیر محفوظ' ہونے پر بھی ایک روایت کی طرح محفوظ رہا ہے۔ ایسے بے شمار دوہے ہیں جن کے خالق کے بارے میں واقفیت حاصل نہیں ہوتی لیکن جو آج بھی کانوں کو بھلے لگتے ہیں اور دلوں کو متاثر کرتے ہیں نیز ذہنوں پر نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ رنگ برنگے دوہے اتنے لاجواب ہیں کہ ان کا نفس مضمون اور طرز ادا دیکھ کر متحیر ہونا پڑتا ہے۔ پند و نصائح، اخلاق و آداب، ہجر و وصال، طنز و مزاح اور مجلسی زندگی کے مختلف تجربات ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ مختلف النوع دوہے ملاحظہ ہوں مگر ملحوظ رہے کہ مندرجہ ذیل دوہا، ہر دوہے کا مصداق ہے ؎

ست سئی یا کے دوہرے، جیوں ناوک کے تیر
دیکھن میں چھوٹے لگے، گھاؤ کرے گمبھیر

دادو ان سنسار سوں مکھ نہ کیجو نیہہ
جامن مرن آورن چھن چھن دا جھے دیہہ

—— دادو دیال ۱۶۶۰-۱۶۰۱ وکرم سمبت

سُر نہ پوچھے ٹیپ نو، شگن نہ دیکھے نور
مرناں نو منگل گنے، سمر چڑھے مکھ نور

—— بانکی داس (۱۸۳۸ء و. س)

کارڈ تو کتو پھرے ہر کینے کہ تاک
جاں ری دسے دہی نے کہے ہیے لفافو راکھ

—— چتر سنگھ (۱۹۳۳-۸۶ و س)

رن کرکر رج رج رنگے، ردی ڈھکے رجپوت
رج جیتی دھرنیہہ دیسے، رج رج دسے رجپوت

—— ناتھو دان (۱۹۴۸ء وکرم سمبت)

کہہ موتی سُن کانکڑا، مہہ تی کیو ساتھ
ہوں سا دھوں کنچن سرس، تی کھل کو نکے سر ہاتھ

—— ہیر کلش (۱۹۹۵ و. س)

یہ تو وہ دوہے ہیں جن کے تخلیق کار معلوم ہیں۔ اب مشتے نمونہ از خروارے ان دوہوں سے لطف اندوز ہوں جو بنجاروں کی طرح بے نام و نشان ہو کر بھی زندہ ہیں اور جنھوں نے راجستھان کی بے گیاہ زندگی کو آب و رنگ دیے ہیں،

ہردی جردی نہ تجے، کھٹ رس تجے نہ آم
اصلی گن کوں نا تجے گن کوں تجے گلام

موت، مقدمو، ماندگی، دیرا، میہمان
شٹ مّا پاچھے پڑیا، نیچے تج دیے پران

عشق، مشک، ماشوک، مشک کپیر کھوں دبان
چھپ یا ایتا نہ رہے پرگٹ ہوت ندان

تن چوکھا من اوجلا بھیتر راکھے بھاؤ
کن کا بُرا نہ چیتوے تاکوں رنگ چڑھاؤ

دُرجن ری کرپا بری بھلی سجن ری تراس
جد سورج گرمی کرے جد برسن ری آس

دھرم گھٹایاں دھن گھٹے، دھن گھٹ من گھٹ جائے
من گھٹیاں مہما گھٹے گھٹت گھٹت گھٹ جائے

جھونٹے کی کچھ پت نہیں، ساجن جھونٹ نہ بول
لاکھ پتی کا جھونٹ سے، دوکوڑی کا مول

ماکھی بیٹھی شہد پر پنکھ گیا لپٹائے
پانکھ ہلاوے سر گھنے، لالچ بری بلائے

چندن ری چٹکی بھلی گاڈو بھلو نہ کاٹھ
چاتر تو ایکو بھلو مورکھ بھلا نہ ساٹھ

اکل سریا اوپجے دوں نہ آوے سیکھ
اَن مانگیا موتی ملے مانگی ملے نہ بھیکھ

سیسے پے بندنا لگے جب تے پوٹا جائے
دل پوٹا نہ جڑسے، اُدے کوٹک کرواُپائے

متر ایسا کیجیے، جیسا سر کے بال
کٹی کٹادے پیر کٹے تو نے نہ چھوڑے کال

ان دوہوں کے کوی نامعلوم سہی لیکن ان آوارہ دوہوں کا جہان معنی غور و فکر پر مجبور کردیتا ہے۔ ان دوہوں کے لکھنے، کہنے والے چارن کوی ہوں یا سنت سمپردائے کے سادھو مہاتما، ان کی قدر و قیمت بہر طور مسلم ہے۔ راجستھانی دوہوں کی یہ روایت ہر دور میں ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی ہے۔ راجستھانی کوی بجا طور پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دوہوں کی دُنیا میں گراں قدر اضافے کیے ہیں جس کے طفیل آج دوہا ہندستان کی پندرہ زبانوں میں رواج پذیر ہو کر شعرا کا منظورِ نظر بنا ہوا ہے۔

□□

غزل

ازل سے ہے وہی دَورِ جہاں وہی کا وہی
زمیں وہی کی وہی آسماں وہی کا وہی

ہمارے چارہ گروں نے کیا علاج بہت
مگر ہے دَردِ دلِ ناتواں وہی کا وہی

ہر ایک چیز کو حالات نے بدل ڈالا
جمالِ یار! ہے تیرا سماں وہی کا وہی

ایاغ بدلے سبُو بدلے بادہ کش بدلے
اگرچہ رہ گیا پیرِ مُغاں وہی کا وہی

گھٹا نہ آج بھی رضواں کے شعر کا معیار
زباں وہی کی وہی ہے بیاں وہی کا وہی

رضوان بنارسی
سائے ۱۵/۱ بھدونی بنارس ۲۲۱۰۰۱

قمر احسن

دہلی

بجیا کے افسانے

بہت زمانہ ہوا کہ کہانی ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئی۔ نرم گرم بستر پر سنی ہوئی کہانی، چاندنی بھرے آنگن میں چاندی جیسے سفید بستر پر کہی گئی یا سنائی ہوئی کہانی، خوف سے جھرجھری آجائے، حیرت سے چُپ لگ جائے اور صدمے سے آنکھیں ڈبڈبا جائیں۔ اب نہ ایسی کہانیاں سنانے والے ہیں اور نہ سننے والے۔

بقراطیت نے دوطرفہ وار کیا ہے۔ کہانی سنانے والا بھی قرۃ العین حیدر کے خیال کے مطابق بقراط ہو گیا ہے اور کہانی سننے والا بھی اس کا شکار ہو کر سوال کرنے لگتا ہے کہ "پاپا! ڈبل بیڈ میں چاندی کے پائے کہاں لگتے ہیں۔؟"

خدا بھلا کرے انتظار حسین کا، جو کبھی کبھی ان بھولی بسری کہانیوں کی یاد دلا دیتے ہیں کبھی اسطور اور تلمیح سے اور کبھی جاتک کتھاؤں اور پنچ تنتر سے وہ کہانی کا کوئی حصہ اٹھا کر ہمارے بالکل سامنے رکھ دیتے ہیں ــــ!!

جب معاشرے میں کساد بازاری آتی ہے تو قوت خرید خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ ایسی ادبی کساد بازاری میں اگر ادب اور معاملاتِ ادب سے بے توجہی بڑھ گئی تو حیرت کی کیا بات ہے۔ اگر لوگوں نے ادب لکھنا، ادب پڑھنا اور ادبی تخلیق پر بات کرنا چھوڑ دیا ہے تو حیرانی کیسی؟ اب تو ہم سب اس کے عادی ہو چکے ہیں اور عادت کا کیا۔؟

ایسے میں بہت سے رسالوں اور کاغذات میں دبی ہوئی بجیا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کاپی ملی جیسی اسکولی بچوں کی کاپیاں ہوتی ہیں اور بس یونہی ان سے چھپا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا تو لگا جیسے بجیا ہم سب بھائی بہنوں سے ابھی تک اپنے کو چھپا لے گئیں۔ بڑی حیرت ہوئی کہ بجیا ایسا کیوں کر کر سکیں؟ ہم سب تو ہر لمحہ ان کے ساتھ رہے ہیں، وہ ہر وقت ہم سب میں شریک رہی ہیں۔ ایسا کب ہوا، اور کیسے ہوا۔؟

پوچھنے پر بجیا گھبرا کر ہنس پڑیں۔ "ارے کیا بے وقوفی ہے یہ کوئی تحریر تھوڑی ہے۔ یہ تو بس یونہی...... ارے جب تم لوگ نہیں ہوتے ہو تو اپنے سے باتیں کرنے لگتی ہوں اور جو کچھ چھوٹ گیا ہے اسے یاد کرنے لگتی ہوں، تو سارا بچپن۔ اس کے توسط سے ماضی کا کوئی کوئی ورق جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ میں گھبرا کر اسے جلدی جلدی لکھنے لگتی ہوں پھر چھپا کر رکھ دیتی ہوں۔"

"بجیا! اتنی رازداری کیوں۔؟ آپ نے ہمیں شریک کیوں نہیں کیا۔؟"

"تم لوگ بڑی بڑی اور موٹی موٹی باتیں کرتے ہو۔ تم لوگ اسے شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو بڑی بچکانہ سی ہیں ــ بڑی۔ بس یونہی بے مصرف یادوں کا جھمگٹا۔ جن سے صرف میری یادیں وابستہ ہیں۔ میں ان میں کسی کو شریک کرنا بھی نہیں چاہتی۔"

لیکن زوالِ دانش اور زوالِ ادب کے اس دور میں کیا بجیا ــــ امینہ رضوی ــ کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ان تحریروں کو چھپا کر رکھ دیں، یا انھیں ضائع کر دیں۔ ٹھیک ہے ہم انھیں شیئر نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا واقعی اب ہماری نسل اسے شیئر کرنے سے قاصر بھی ہے۔

سنا ہے بجیا نے لوک کہانیوں کو آج کا استعارہ مان کر کچھ اور بھی لکھا ہے۔ کچھ کہانیوں کو اپنے جیتے جاگتے عصر سے جوڑ دیا ہے لیکن ابھی تک مجھے وہ کاغذات نہیں ملے ہیں۔ کسی دن چرا لاؤں گا۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

افسانہ

(پروفیسر) حاجی شمس الدین
۱۵۰/ب [illegible] رائے پور
۴۹۲۰۰۱

پیاسا تالاب

ہماوریا نسوانی خوبصورتی کا بے مثال شاہکار تھی۔ سرخ وسپید رنگ نازک اور تیکھے نقوش، چودھویں کے چاند کی طرح روشن چہرے والی اس حسینہ کی آنکھوں میں کسی بیاکل ہرنی کی آنکھوں کی طرح تڑپ اور شباب کی سوالی چمک تھی۔ گلاب کی نازک پنکھڑیوں کی طرح سرخ وملائم ہونٹ شب دیجور کی طرح سیاہ وملائم لمبے بال اور گھنی پلکوں والی یہ ماہ جبیں راجہ اندر کے دربار کی روایتی اپسرا لگتی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ خوب سیرت بھی تھی۔ اوائل عمر میں ہی اس کو معاشرے کی پرانی تہذیب کا سبق پڑھا دیا گیا تھا۔ عصمت وعزت اور شرافت اس کا مقصدِ حیات تھا۔

اس کے والدین غریب ضرور تھے لیکن عزت وخودداری ان کا شیوہ تھا۔ وہ لوگ مالوہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کو اپنے اعلیٰ حسب نسب پر ناز تھا۔ ان کا آبائی پیشہ تالاب اور کنویں کھودنا تھا۔ بچپن میں روپا کسی آزاد پرندے کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہی۔ لوگ اس کے حسن سے متاثر ہوتے اور اپنی حقیقی اولاد کی طرح پیار کرنے لگتے۔ عہدِ شباب میں قدم رکھتے ہی اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور اس کے لئے انھوں نے کسی لائق شوہر کی تلاش شروع کر دی۔

وقت گذرنے لگا۔ ساتھ ہی والدین بوڑھے ہوتے گئے۔ ان میں کام کرنے کی زیادہ طاقت بھی نہیں رہ گئی اور گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا۔ روپا ایک سمجھدار اور دوراندیش لڑکی تھی۔ اس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کو باہر جاکر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے کئی بار اس بات کا اظہار کیا کہ اسے کام کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ گھر کا کچھ بوجھ ہلکا ہو سکے لیکن اس کو کبھی اجازت نہیں ملی۔ اس کے باپ نے ہمیشہ پیار سے ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنی اکلوتی چہیتی بیٹی کو کام کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ایک دن شام کے وقت روپا اپنے گھر کے برآمدے میں خاموش بیٹھی تھی اس کے چہرے پر فکر اور اداسی کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کا باپ سات دن سے بسترِ علالت پر پڑا تھا۔ ماں تیمارداری میں لگی ہوئی تھی اور آج گھر کا آخری دانہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اب کل کیا ہوگا؟ باپ کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی اور گھر میں پیسے بھی نہیں تھے کہ دوا لائی جا سکے۔

دداّ او دداّ کسی نے باہر سے آواز دی۔ وہ چونک کر اٹھی اور آنے والے کے بارے میں ماں کو بتانے اندر چلی گئی۔ ماں باہر آئی اور آنے والے جوان کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی وہ تکم تھا جس کی ماتحتی میں بہت سے مزدور گاؤں کے اندر اور گاؤں کے باہر کام کرتے تھے۔ روپا کے والدین چونکہ کئی دن سے کام پر نہیں گئے تھے اس لئے وہ غیر حاضری کی وجہ معلوم کرنے آیا تھا۔ روپا کی والدہ نے شوہر کی علالت کے بارے میں تفصیل سے بتا کر کہا کہ ان کے ایک ہی بیٹی ہے لیکن اس کے باپ کا حکم نہیں ہے کہ وہ کام پر جائے کیونکہ اب وہ جوان ہو گئی ہے۔ تکم نے ہر بات کو خاموشی سے سنا پھر روپا کے والد کے پاس جاکر خیریت پوچھی۔ دورانِ گفتگو میں اس نے روپا کو کام پر بھیجنے کی صلاح دی کیونکہ بہت سے نئے کنویں کھودے جانے تھے۔ مزدوروں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کا باپ ہچکچایا لیکن تکم نے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا پورا یقین دلایا۔ روپا کے باپ نے صاف طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اس پر غور کرے گا۔ تکم خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

روپا جو ساری باتوں کو سن رہی تھی برداشت نہ کر سکی۔ وہ دوڑ کر

باپ کے بستر کے قریب پہنچی اور بڑی منت سے کام پہ جانے کی اجازت مانگی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی عمر کی دوسری لڑکیاں بھی تو کام پر جاتی ہیں۔ میں انھیں کے ساتھ جاؤں گی۔ اس کے باپ کا دل بھر آیا اس نے خاموشی سے آنکھیں بند کرلیں۔

روپا نے اپنی ماں سے منت کی۔ وہ بھی خاموش رہی لیکن جب اسے علم ہوا کہ گھر میں ایک دانہ بھی نہیں ہے تو اس نے مجبوراً اجازت دے دی۔

دوسرے دن روپا بہت سویرے اپنی ایک سہیلی کے گھر سے تھوڑے چاول مانگ لائی اس کو پکاکر تھوڑا کھایا اور کام پر چل دی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ سیدھی تکم کے پاس پہنچی۔ اور نگاہیں جھکاکر کھڑی ہوگئی۔

تکم نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسن وجمال کے اس مجسمے کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اس نے روپا کو کام بتا دیا اور وہ خاموشی سے کام پر لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب تکم معائنے پر آیا تو اس کو اندازہ ہوا کہ روپا ہزاروں لڑکیوں میں ایک ہے۔ وہ اپنی ہر عادت سے ہزاروں میں پہچانی جاسکتی ہے۔ دوسری لڑکیاں آرام کرنے کے بہانے ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتیں لیکن روپا صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی۔ اسے دنیا جہان کی کوئی خبر نہ رہتی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے ایک باعصمت مخلص اور بلند خیال لڑکی نظر آئی تھی۔ شام کے وقت کام کرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں گل لالہ پر شبنم کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں جب مزدوری بٹ گئی تو وہ خاموشی سے مزدوری لے کر گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

اسی طرح روپا معمول کے مطابق کام پر آتی۔ شام کے وقت خاموشی سے چلی جاتی حالانکہ وہ ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کرتی تھی اسے اپنے مالکوں اور آقاؤں کے خاموش اشاروں کا احساس بھی ہوگیا تھا لیکن وہ اپنی محنت پر خوش تھی اور عزت وخودداری کے ساتھ کام کرتی رہتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بذاتِ خود تکم نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا لیکن اس کی سنجیدگی اور وقار کی وجہ سے اسکی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ روپا سے بات کرسکے۔ ایک دن اس نے سوچا کہ وہ روپا کے والد کی خیریت پوچھنے کے بہانے اس سے بات کرے گا لیکن پورا دن گذرنے کے بعد بھی اسے موقع نہ مل سکا کہ بات کرسکتا۔ ایک دن اس کو ایک سنہرا موقع ہاتھ آگیا افسر اعلا کے معائنے کی وجہ سے شام کے وقت مزدوری تقسیم کرنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ اندھیرا ہوگیا تھا۔ روپا اپنی جگہ خاموشی سے کھڑی رہی۔ یکے بعد دیگرے سارے مزدوروں کو محنتانہ تقسیم کردیا گیا سب سے آخر میں روپا کی باری آئی اس نے مزدوری لی اور دوڑتی ہوئی دیگر لڑکیوں کی جانب تیزی سے گھومی اسی وقت تکم نے پوچھا؟

تمہارے والد کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

اب وہ ٹھیک ہو رہے ہیں" روپا نے جلدی سے جواب دیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ہی تکم نے دوسرا سوال کیا۔ "کس کا علاج ہو رہا ہے"

میں نام تو نہیں جانتی لیکن ماں نے بتایا تھا کہ وہ کسی وید سے دوا لائی ہے جو گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ روپا نے جواب دیا۔

اس سے کوئی فائدہ ہے" تکم نے دوبارہ پوچھا۔

جی ہاں، اب ان کو بخار نہیں رہتا۔ لیکن نقاہت کی وجہ سے ابھی ان کو آرام کی ضرورت ہے:" کچھ لمحے کے وقفہ کے بعد روپا نے پوچھا۔

اب میں جاؤں" شاید میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں گی۔ کافی اندھیرا ہوگیا ہے:

تکم کرسی سے کھڑا ہوگیا اور روپا کے سامنے آکر بولا۔ شاید وہ لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر رکو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں تاکہ تم کو گھر تک پہنچا دوں۔ میں خود ہی تمہارے گھر تمہارے والد کی خیریت پوچھنے جانے والا تھا۔

روپا دوڑ کر اپنی سہیلیوں کو پکڑ لینا چاہتی تھی لیکن تکم کی تجویز پر وہ پریشان سی ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ اس وقت تکم نے حساب ختم کیا اور ہر چیز رکھ کر گھر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ گھر پر ماں بے چینی سے منتظر تھی۔ روپا اندر چلی گئی۔ تکم بہت دیر تک اس کے والد کے پاس بیٹھ کر یقین دلاتا رہا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے فکرمند نہ ہوا کرے۔ وہ سب سے بہتر کام کرتی ہے۔

تکم روپا کی پاکدامنی اور بلند اخلاقی سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن جب روپا کے باپ نے روپا کے لیے کسی لڑکے کو ڈھونڈنے کی بات کہی تو تکم نے خود کو پیش کردیا۔ دونوں کی شادی دھوم دھام سے ہوگئی تکم نے ایک باعصمت اور بے مثال بیوی پائی اور روپا کو بھی ایک مثال شوہر

حاصل ہوگیا۔ روپا دل کی گہرائیوں سے تکم کو پیار کرتی اور اس کی خدمت کرتی رہتی تھی۔ تکم نے بھی روپا کو اپنی ساری خوشیوں کا مرکز بنا لیا۔ دونوں کی ازدواجی زندگی بڑی پُرمسرت اور خوشیوں کے سائے میں گذر رہی تھی۔

اچانک ایک دن مشرقی گجرات میں واقع ایک ریاست کے مہاراج کا پیغام آیا کہ وہ اپنے شہر میں ایک بڑا تالاب بنوانا چاہتے ہیں جس کی کھدائی کے لیے مالوہ سے ہزاروں مزدور درکار ہیں۔ تکم فوراً راضی ہوگیا۔ اس نے جلدی سے ایک ہزار مزدور جمع کئے اور وہاں جانے کی تیاری کرنے لگا

روپا بھی اس کے ساتھ ہی گئی۔ کام شروع ہوگیا۔ ان دونوں کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ ہر مزدور ان کو دل و جان سے چاہنے لگا۔ وہ لوگ ان دونوں کو اپنا محافظ اور سرپرست سمجھتے۔ کام کے دوران مہاراج بذاتِ خود معائنے پر آتے رہتے۔ ایک دن جب وہ تالاب کے کنارے کرسی پر بیٹھے کام دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر روپا پر پڑی اور اس کی ہلکی سی جھلک نے ان کو اس کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ کام کرتے وقت جب وہ ان کے قریب سے گذری تو ان کی نگاہیں اسی پر جم گئیں اور جس وقت روپا نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھنے کی کوشش کی تو مہاراج نے اس کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ جس طرح ساون کی گھٹاؤں میں اچانک بجلی چمک جاتی ہے اسی طرح میلے اور گرد آلود کپڑوں میں روپا کا حسن و جمال چمک رہا تھا راجہ اس بے پناہ خوبصورتی کو دیکھ کر کھو سا گیا۔ اس کے جذبات میں طوفان اٹھنے لگے وہ اس خوبصورتی کو اپنی باہوں میں لینے کے لئے بے تاب ہو گیا اس نے روپا کو کئی بار اشارہ کیا، پکارا لیکن ایک باعصمت عورت کی طرح اس نے ان کی جانب دیکھا تک نہیں۔

اس بات سے مہاراجہ کی انا کو ٹھیس پہنچی۔ اس کے خیال میں ریاست کا مالک کسی مزدور کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ روپا دوسری مٹی سے بنی ہے حالانکہ اس کی عمر ابھی زیادہ نہیں تھی لیکن پاکدامنی اور عقلمندی کا سبق اسے اوائل عمر ہی سے دیا جا چکا تھا۔ اس کے والدین کی تعلیم اس کی رگوں میں رچی بسی تھی۔ کسی لالچ سے اس کے قدم پھسل نہیں سکتے تھے وہ ایک جوہرِ بے بہا تھی جس کی بنا پر لوگ تکم کی زندگی پر رشک کرتے تھے۔

روپا کا انداز دیکھ کر اس وقت تو راجا خاموش ہوگیا لیکن روپا کے حسن نے اس کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی۔ اس کی خلش اور سوزش نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ہر وقت روپا کو حاصل کرنے کے بارے میں ہی وہ سوچتا رہتا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی جس کے ذریعہ بغیر قوت و طاقت کا استعمال کئے ہی روپا حاصل ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ روپا ایک معمولی مزدور ہونے کی وجہ سے جواہرات، قیمتی کپڑوں اور آرائشوں کی خواہاں ہوگی۔ اس طرح کے لالچ سے وہ پھسل سکتی ہے دوسرے دن اس نے ایک آدمی کے ذریعہ روپا کے پاس پیغام بھیجا۔ پیغام لے جانے والا روپا کے قریب گیا اور آہستہ سے بولا۔ تم مزدوروں کے افسرِ اعلیٰ کی بیوی ہو۔ مٹی سے بھرا ٹوکرا تمہارے سر پر اچھا نہیں لگتا۔

اس میں شرم کی کیا بات ہے روپا نے سختی سے جواب دیا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم لوگ مزدور ہیں یہ تو ہمارا فرض ہے۔

لیکن تم سے اس طرح کا کام لینا بے انصافی ہے۔ اس نے دوبارہ کہا۔ تم ایسی حسین و جمیل عورت کو تو شاہی محل کی رانی ہونا چاہئے تھا"

تم میری قسمت کے بارے میں باتیں کرنے والے کون ہوتے ہو۔ اس نے تلخی سے کہا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ میرا جھونپڑا محل سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔

خیر یہ سب باتیں چھوڑ دو اور سنو۔ مہاراجا نے کہلایا ہے کہ کسی دن ان کے محل میں آکر پُرسکون اور پُرآسائش زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ جاؤ اس کے بعد شاید تم کبھی محل چھوڑنا بھی پسند نہ کرو گی۔ اس آدمی نے ہمت کر کے سب کچھ کہہ دیا۔

کیا تو نے مجھے بدکردار عورت سمجھا ہے۔ میں ایک باعزت شخص کی پتنی ہوں جاؤ اپنے راجا سے کہہ دو مجھے محل کی خواہش نہیں ہے۔ روپا نے تیز لہجہ میں جواب دیا۔ اور ٹوکری رکھ کر آگے بڑھ گئی۔

وہ شخص بدحواس ہو کر بھاگا اور جاکر راجا کو ساری تفصیل بتائی راجا نے بڑی خاموشی سے پوری بات سنی اور ایک بار پھر کسی خیال میں کھو گیا۔ اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ روپا کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کسی لالچ کا شکار نہیں بن سکتی۔ ان خیالوں نے روپا کو بھلانے کے بجائے اس سے اور قریب کر دیا۔ دوسرے دن وہ خود روپا کے پاس گیا اور بولا! یہ سب کام تمہارے

کرنے سے قاصر ہیں۔ تمہارے خوبصورت ہاتھ مٹی اور کیچڑ سے گندے ہو جاتے ہیں۔ چاندنی جیسی حسین تمہارا چہرہ گرد و غبار میں دھندلا جاتا ہے تمہارے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ تم کو تو شاہی محل کی زینت ہونا چاہئے میرے محل میں چلو جہاں دنیا کی ساری لذتیں اور آسائشیں تمہاری منتظر ہیں؟

روپا نے نہایت نرمی سے جواب دیا مہاراج میری محنت و عصمت پر کیچڑ مت اچھالئے۔ میرا غریب شوہر میرا سرتاج ہے جس کی خدمت کرنا ہی میرا فرض اولین ہے۔ میرا چھوٹا سا جھونپڑا کسی جنت سے کم نہیں ہے مجھے آپ کے شاہی محل کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن روپا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس خوشی و مسرت سے کہیں زیادہ تم کو سکون دوں گا۔ تم کو رانی بناؤں گا جو پوری ریاست پر حکمرانی کرے گی۔ میں تمہارا غلام بن جاؤں گا۔

بہت ہو چکا۔ روپا نے چیخ کر کہا۔ اس بکواس کو ختم کیجئے۔ آپ ایک راجا ہیں جسے اپنی رعایا کی حفاظت کرنی چاہیے۔ کسی عورت سے ایسی باتیں کرتے آپ کو شرم نہیں آتی آپ ایک ریاست کے حکمراں ضرور ہیں لیکن اس بات کو یاد رکھئے کہ میں ایک باعزت شخص کی بیوی ہوں میرا جسم، دماغ، روح اس مقدس رشتے کے تحت صرف شوہر کا ہے۔ آپ ایک راجا ہیں مجھے قتل کرا سکتے ہیں لیکن زندگی کی آخری سانس تک مجھے میرے شوہر سے جدا نہیں کر سکتے۔ میں اس کی پرستش کرتی ہوں صرف اس زندگی میں نہیں بلکہ جتنی بار بھی زندگی ملے گی میں اس کی پرستش کروں گی۔

راجا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کچھ کہہ سکے۔ اس نے خاموشی سے نگاہیں جھکائیں اور بوجھل قدموں سے محل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کا شاہی غرور ایک معمولی عورت نے پاش پاش کر دیا تھا۔ اس نے ایک وفادار پرانے دیوان کو بلایا اور کچھ سمجھایا۔ اس کو ابھی تک امید تھی کہ اگر روپا اس جگہ کسی طرح سے آ جائے تو وہ راضی ہو جائے گی۔ وفادار دیوان نے راجا کو بہت سمجھایا کیونکہ اس طرح راجا کی عزت پر آنچ آنے کا خطرہ تھا لیکن راجا نے ایک نہیں سنی۔

ادھر روپا نے ساری باتیں تکم سے بتا دیں اور اسے اس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا کیونکہ خطرہ سامنے تھا۔ تکم غصے میں آگ بگولا ہو گیا لیکن اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ راجا کو جواب دے سکتا۔ روپا ایک لمحہ ٹھہرنے کے لیے راضی نہیں تھی۔ تکم نے مزدوروں کو تیزی سے تیار کیا اور اندھیرے ہی میں فرار ہو گیا۔ سویرا ہوتے ہی ان لوگوں کے فرار کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ راجا کو اس کی اطلاع ملی۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر راجہ نے کچھ سواروں کو لیا اور تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ ان لوگوں کو پکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے مسلح سپاہی مزدوروں کی اس چھوٹی غیر مسلح جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ زیادہ تر مزدور قتل کر دیے گئے۔ تکم نے راجا پر حملہ کیا لیکن وہ تنہا تھا۔ شدید زخم کھا کر اسی جگہ گر گیا۔ اس کو گرتا دیکھ کر روپا تیزی سے قریب آئی تھیلے سے خنجر نکال کر اس نے اپنے سینے پر مار لیا اور شوہر کے پہلو ہی میں گر گئی۔ ایک کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ملعون شخص! تو اپنے ناپاک اور گندے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہوں گی۔ اسی کے ساتھ سورگ جا رہی ہوں لیکن اس بات کو یاد رکھنا۔ کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو۔ تیرا تالاب ہمیشہ پیاسا ہی رہے گا۔ اس میں پانی کبھی رک نہ سکے گا۔ اتنا کہتے کہتے اس کی سانسیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں اور اس سے پہلے کہ راجا روپا کے قریب پہنچ کر اس کے جسم کو ہاتھ لگاتا موت کے آہنی پنجے نے سدا کے لیے اس کو دبوچ لیا۔

□□

بھیا کے افسانے

صہ ۳۸ کا بقیہ

یہ دونوں کہانیاں ہمارے بھولے ہوئے بے قدر ماضی کی بازیافت ہیں۔ شاید اگلی کہانیاں خود بھولے ہوئے لوگوں کی کہانیاں ہوں خدا بھیا کو ہمت اور سکون دے۔ انھوں نے اکیلے کیلے کتنے دکھ سمیٹے ہیں اور کیسے کیسے زخم ہیں ان کے دل میں جن سے ہم بے خبر تھے۔ اب شاید ان کا قاری بھی ان کے دکھ درد اور زخموں کی ٹیس میں شریک ہو جائے۔ قمر احسن کو چھوڑیئے — حیدر مہدی کو بھی چھوڑیئے — خود قاری کی بات کیجئے — جوان کی ایک کہانی "بالکونی" اگست ۱۹۹۲ء کے ماہنامہ آجکل میں پڑھ چکا ہے۔

□□

اقلیتوں کی ہمہ جہت ترقی کے لئے

نئی حکومت کے عزائم

اترپردیش کی پہلی دلت خاتون اور دوسری خاتون وزیراعلا ہونے کا فخر محترمہ مایاوتی کو حاصل ہے جنھوں نے اپنے عہدے کی حلف برداری کے بعد ہی اس اعلان کے ساتھ اقتدار سنبھالا کہ ان کی حکومت میں ظلم و جبر اور کرپشن کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ ان کی حکومت بلا لحاظ ذات، مذہب، فرقہ اور طبقہ سبھی کی پوری حفاظت کرے گی اور ان کے حقوق کا تحفظ کرے گی۔ ——— دلتوں، پسماندہ طبقوں خواتین اور اقلیتی طبقے کی حفاظت، ترقی اور فلاح و بہبود ان کی حکومت کی اولیں ترجیحات میں شامل ہیں۔

اقتدار کی باگ ڈور دوسری بار سنبھالنے والی وزیراعلا محترمہ مایاوتی اس میں یقین رکھتی ہیں کہ جب تک ریاست کے کمزور طبقے کی ترقی نہیں ہوگی نیز ان کا سماجی، اقتصادی اور تعلیمی معیار بلند نہیں ہوگا، اس وقت تک سماجی تبدیلی کا خواب پورا نہ ہوگا ان طبقات کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے حکومت نے کئی فیصلے کیے ہیں۔

ریاستی حکومت نے معاشرے کے دوسرے طبقوں کی طرح اقلیتوں کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کو محسوس کیا ہے۔ وزیراعلا نے بار بار اعلان کیا ہے کہ ان کی حکومت اقلیتوں کو ان کا پورا حق دلانے کے لیے پُرعزم ہے۔ انھوں نے اقلیتوں کے لیے مختلف اسکیمیں اور پروگرام شروع کر کے اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔

اقلیتوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے حکومت نے کئی اہم فیصلے کیے ہیں۔ واضح ہو کہ اترپردیش میں پہلی مرتبہ اقلیتی طبقے کے طالب علموں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی غرض سے وزیراعلا نے وظیفہ دیئے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری بار حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد انھوں نے طالب علموں کو دی جانے والی وظیفہ کی رقم کو بڑھا کر دوگنا کر دیا ہے۔ اس فیصلے سے اقلیتی طبقہ کے ۳۹ لاکھ طلبا، مستفید ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ان طلبا، و طالبات کو دیئے جانے والے وظیفہ کی رقم کی ادائیگی کے طریقۂ کار کو آسان بنانے کے لیے بھی ہدایت جاری کی گئی ہے تاکہ طلبا کسی دشواری کے بغیر آسانی سے وظیفہ کی رقم حاصل کر سکیں۔

اقلیتی طبقے کے طالب علموں کو دیئے جانے والے وظیفے کی رقم کو بینکوں میں طالب علموں کا اکاؤنٹ کھلوا کر ان کے اکاؤنٹ میں منتقل کر کے پاس بک کے ذریعہ تقسیم کرانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ حکومت نے سخت ہدایت کی ہے کہ اب کسی صورت میں بھی وظیفہ کی تقسیم کیش یا چیک کے ذریعے نہیں کی جائے۔

اقلیتی طبقے کے وظیفہ کے لیے درجہ ایک سے آٹھ تک کے طالب علموں کے لیے آمدنی سرٹیفکیٹ کی پابندی کو محکمہ سماجی بہبود کی طرح ہی ختم کرنے کے احکام جلد ہی جاری کر دیئے جائیں گے۔ ساتھ ہی ضلع اقلیتی بہبود افسران کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ وظیفے سے مستفید ہونے والے طلبا کی فہرست کی اشاعت کر کے ضلع مجسٹریٹ اور ضلع انفارمیشن افسر کے دفتروں پر مہیا کرائیں۔

موجودہ حکومت کی کوشش کے نتیجے میں ریاست کے ۶۰ مدرسوں میں کمپیوٹر کی تعلیم شروع کیے جانے کے لیے مرکزی حکومت نے اپنی منظوری دے دی ہے۔ پہلی بار شروع کی گئی اس اسکیم کے تحت سکنڈری سطح کے ان ۵۰ مدرسوں میں ۵۰ مراکز کھولے جائیں گے۔ ریاستی حکومت مدرسوں میں کمپیوٹر مراکز کھولنے کے لیے تجاویز ضلع اقلیتی بہبود افسران کے توسط سے یکجا کر رہی ہے۔

موجودہ حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی سنی وقف بورڈ کو ۲۶ لاکھ روپئے اور شیعہ وقف بورڈ کو ۸٫۵۷ لاکھ روپے کی گرانٹ

منظور کی گرانٹ کی رقم حاصل ہونے سے وقف بورڈوں کی مالی حالت بلا شبہ مستحکم ہوگی۔ وزیر اعلا نے وقف جائیداد پر موثر نگرانی اور وقف کی آمدنی بڑھانے کی ہدایت بھی دی ہے۔ اسی طرح وقف ڈپارٹمنٹ کی اسکیموں کو زیادہ فعال اور کارآمد بنانے کی غرض سے انجینیرنگ ڈویژن کی منظوری دی گئی ہے۔

اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے چلائے جا رہے پروگراموں کی کارکردگی اور ان کی مشکلات نیز شکایتوں کے حل کے لیے ریاست میں تشکیل شدہ اقلیتی کمیشن کے چیرمین کے عہدے پر جناب طاہر اشرفی کی تقرری کی گئی ہے۔ اقلیتی کمیشن کو موثر بنانے کے لیے کمیشن کے ممبران کو کافی سہولیات مہیا کرانے کی خاطر پرسنل اسسٹنٹ نیز چپراسی کی تقرری کے لیے اسامیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔

قومی اقلیتی کمیشن کے چیرمین پروفیسر طاہر محمود نے حال ہی میں وزیر اعلا سے ملاقات کرکے اقلیتوں کے مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی اور وزیر اعلا نے ان پر فوری کارروائی کی ہدایت بھی جاری کردی۔ اس میں اردو میڈیم اسکولوں کو تسلیم کیا جانا، اضلاع میں اقلیتی فلاح و بہبود افسروں کی تقرری اور اردو اساتذہ کی تقرری کے معاملات شامل ہیں۔ وزیر اعلا نے قومی اقلیتی کمیشن کے چیرمین کو یقین دلایا کہ کمیشن کے ذریعہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق مشوروں پر ریاستی حکومت عمل کرے گی۔

وزیر اعلا محترمہ مایاوتی نے اپنی گزشتہ حکومت کے دوران اترپردیش میں پہلی بار اقلیتی فلاح و بہبود کا ایک الگ محکمہ قائم کیا تھا۔ دوسری بار حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی وہ بذات خود اس محکمہ کو موثر اور فعال بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس محکمہ کے توسط سے اقلیتوں سے متعلق سبھی معاملات پوری سنجیدگی سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس محکمہ میں اقلیتوں سے متعلق سبھی اداروں اور کئی دوسرے محکموں کے کچھ حصوں کو ایک ہی جگہ یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ اس طبقہ کے لوگوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اس محکمہ کے ذریعہ چلائے جانے والے پروگراموں اور اسکیموں سے وہ پورے طور پر مستفید ہو سکیں۔

حکومت نے ریاست کے تھانوں میں اقلیتی طبقے کے ۸ فیصد تھانہ انچارج تعینات کیے جانے سے متعلق اپنے گزشتہ فیصلے کے تحت، اسے عملی جامہ پہناتے ہوئے ——— پولیس محکمہ کو سختی سے احکام جاری کیے ہیں کہ اقلیتی طبقے پر ہونے والے مظالم کو فوری طور پر روکا جائے اور ایسے بندوبست کیے جائیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔

ریاست کی وزیر اعلا نے اقلیتوں کی ترقی کے لیے اپنی دلچسپی جس طرح دکھائی ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس طبقے کے لیے فکرمند ہیں۔ اس قلیل مدت میں ان کے اقدامات سے اقلیتوں کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔ وزیر اعلا نے بار بار اعلان کیا ہے کہ ان کی حکومت اقلیتوں کو ان کا پورا حق دلانے کے لیے پرعزم ہے۔

——— خورشید ظفر

مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ نیا دور میں اُن کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا تھا۔ گزشتہ ۱۲ر مئی ۱۹۹۰ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ نیا دور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ ——— ایڈیٹر

آشیاں ایسے بھی گلشن میں جلا کرتے ہیں
تذکرے جن کے زمانے میں ہوا کرتے ہیں
سرفروشانِ محبت تو سرِ دار و رسن
درسِ ایثار زمانے کو دیا کرتے ہیں
لذتِ دردِ محبت کوئی ہم سے پوچھے
ہم تو مر مر کے محبت میں جیا کرتے ہیں
خون میں ڈوب کے کردار کے آئینے پر
سرفروشانِ محبت ہی جلا کرتے ہیں
جب پپیہے کی صدا آتی ہے کانوں میں صدا
ہم انھیں چونک کے آواز دیا کرتے ہیں

——— مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ" (منظوم)
شاعر : عنبر بہرائچی قیمت : سو روپے
ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

عنبر بہرائچی کے نام اور کام سے اہلِ نظر نا آشنا نہیں۔ اس سے پہلے گوتم بدھ سے متعلق ان کی کتاب "مہابھنشکرمن" اہلِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر چکی ہے، جس میں عنبر صاحب نے گوتم بدھ کی زندگی کے اہم واقعات کو اور ان کے فلسفے کو منظوم شکل میں پیش کیا تھا۔ یہ طویل منظومہ اُردو شاعری میں اپنے انداز کی ایک منفرد روایت کا اضافہ تھا۔ نئی چیزیں جو روایتی انداز سے مختلف ہوں، اپنی طرف توجہ کو کچھ دیر میں منعطف کر پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو ذرا دیر میں قبولیت کی روشنی حاصل ہوئی۔ ایسی چیزیں عام لوگوں کے ذوق کی تو ویسے کبھی نہیں ہوتیں، خواص کے مختصر دائرے میں ان کی خوبیوں کا اعتراف ہو سکتا ہے اور خواص کا احوال یہ ہے کہ وہ کچھ دیر میں رائے قائم کر پاتے ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے۔ فکر اور تامل کو اپنی صورت گری کے لیے وقت تو درکار ہوگا۔ سنجیدگی اور غور و فکر کے بعد رائے قائم کرنا فوری ردِ عمل سے ہمیشہ مختلف رہے گا، دونوں کا انداز ایک نہیں ہو سکتا۔

اب ان کی نئی کتاب "لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ" سامنے آئی ہے۔ یہ بھی طویل منظومہ ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اہم واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عنبر صاحب نے اپنے خاصے مفصل دیباچے میں اس کتاب کے سلسلے میں یہ وضاحت کی ہے، جس سے کتاب کے مشتملات کے ساتھ ساتھ اُن کے اندازِ بیان کے اہم عناصر بھی واضح ہو جاتے ہیں:

"میں نے "مہابھنشکرمن" کی طرح اس نظم کی ظاہری ہیئت کے لیے بھی قصیدے اور غزل کے ظاہری عناصر کی آمیزش کی ہے، لیکن اس کے اجزائے ترکیبی کے لیے سنسکرت کے رزمیے سے مدد لی ہے۔ ایک عظیم ترین شخصیت، اس کے ساتھیوں کی کردار نگاری، منظر نگاری، بہادری، رحم، حیرت، اطمینان وغیرہ رسوں کا استعمال، زندگی کے کثیر الجہت پہلوؤں کی عکاسی، مختلف ابواب میں پوری نظم کی تقسیم، ایک ہی بحر کا استعمال اور تاریخی اعتبار سے سچے واقعات پر شاعرانہ اظہار میں نے سنسکرت رزمیہ سے اخذ کیا ہے۔ میں نے اس نظم میں اعلانِ نبوت سے فتحِ مکہ تک کے واقعات کا احاطہ کیا ہے، کیوں کہ حیاتِ طیبہ کا یہ حصہ آپ ﷺ کی عظیم تگ و دو سے بھرا ہوا ہے۔"

کتاب کا نام مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی ایک مشہور نعت کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ، مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

اُردو میں مکمل رزمیے کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں۔ یہاں شاید مرثیوں کا نام لیا جائے، (یعنی میر انیس کے مرثیوں کا ذخیرہ، مرزا دبیر کے مرثیے بھی ہیں) مگر ان کا احوال کسی بہت بڑے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں جیسا ہے جن میں مختلف مناظر اور بیانات کے بکھرے ہوئے عکس محفوظ ہوں۔ اس تہی دامنی میں شاید ہمارے اُس مزاج کو بھی دخل رہا ہے جو غزل کی اختصار پسندی کا خوگر ہو کر رہ گیا ہے۔ قطرے میں دجلے اور جُز میں کُل کا تماشا دیکھنا دیدہ وری کی پہچان رہا ہے، اور چاول کے ایک دانے پر پوری قُل ہُو اللہ لکھ دینا فن کاری کا کمال رہا ہے (اس اندازِ نظر کے فروغ میں اس عجمی فلسفے کو بھی بہت دخل رہا ہے جس نے تصوّف کے نظر فریب نام سے

... پایا جاتا ہے۔ عنبر صاحب کی اس کتاب کو بھی رزمیہ تو بہ مشکل ہی کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وسعت بیان اور مناسب حد ... مناسب تجزیہ ... ایک ... کتاب ... اور ہر روز چھپنے والے شعری مجموعوں میں اپنے ... امتیاز کی قابل قدر خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے۔

میں اس مجموعے کو اس لحاظ سے قابل ذکر اور قابل قدر سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری میں یہ ایک ایسے خلا کو پُر کرنے کی صدق دلانہ کوشش ہے جس کا احساس اہل نقد و نظر کو ہمیشہ رہا ہے۔ زبان رواں اور شستہ ہے اور سنجیدگی بیان کی بھی کمی نہیں۔ بیان میں شعری محاسن ہیں اور زبان میں ایسی شیرینی ہے جو تغزل سے قریب ہو جاتی ہے۔ مکمل رزمیہ کی زبان اور بیان میں تغزل کے عناصر کو نہ ہونے کے برابر ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں فردوسی کے شاہنامے کو ہمارے سامنے رہنا چاہیے جس میں زبان کی سطح میں شفافی کم ہے، مگر دل آویزی کم نہیں اور روانی اس سے بھی کم ہے: رکتا ہوا سا انداز ہے جس نے آہنگ میں توانائی پیدا کی ہے اور مناسب مقامات پر اس کھردرے پن کو بھی برقرار رکھا ہے جس کے بغیر طاقت اور اجزائے معرض بیان میں اچھی طرح نہیں آ سکتے۔

اردو کے خوش ذوق اور صاحب نظر قارئین کا وہ حلقہ جو شاعری میں عظمت کی ترجمانی کو قابل قدر سمجھتا ہے اور مسلسل طویل نظموں کی اہمیت کا قائل ہے اور ساتھ ہی اردو میں ان کی کمی کا اسے شدید احساس ہے، ایسے ارباب نظر اس مجموعے کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اس کے شعری محاسن کا اعتراف کریں گے اور عنبر صاحب کی اس کوشش کی اہمیت کا اعتراف کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ عنبر صاحب سنسکرت شعریات پر اردو میں ایک مفصل کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ مجھے اور دوسرے ادب دوستوں کو اس کا ابھی سے انتظار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح ان کے اس منظومے نے اردو نظم میں ایک بڑی کمی کو بہ وجہ احسن پورا کیا ہے، اسی طرح وہ کتاب ہمارے ذخیرۂ شعریات میں اہم اضافہ ثابت ہوگی اور اردو والے سنسکرت شعریات سے واقف ہو سکیں گے جس کی بڑی ضرورت ہے

—— رشید حسن خاں

نام کتاب : **بیتی رُتوں کا منظر نامہ**
شاعر : فیاض رفعت — قیمت : سو روپیے
ملنے کا پتہ : کے ۲۰۳ ۔ تاج انکلیو، لنک روڈ
گیتا کالونی ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۳۱

"رت ورنن" کا نقطہ آغاز جائسی ہیں جن کی پدماوت سے ادبی تخلیقات میں موسموں کا تذکرہ جذبات سے ہم آہنگ ہو کر شروع ہوا۔ عشق کی ارضیت اور مادی لذتوں کا شعری اظہار اردو میں محمد قلی قطب شاہ کا کارنامہ ہے —— فیاض رفعت نے اردو کی شعری روایات کے ان دو گوشوں کو ایک بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی شعری جمالیات میں برف باری اور جسم کی آنچ دونوں ایک نظر آتے ہیں۔

"وقت" کا تصور فلسفیوں کے یہاں ہمیشہ پیچیدہ رہا ہے —— فیاض رفعت کا خیال یہ ہے کہ زمانہ صرف "ماضی" ہے، حال کا کوئی وجود نہیں اس لیے کہ وقت بہاؤ ہے، لمحہ گزرا اور ماضی کی گود میں پہنچ گیا۔ مستقبل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا اس لیے اس کا وجود بھی غیر معتبر ہے —— اس لیے صرف ماضی کا وجود حقیقی ہے۔ اور اس طرح بیتے ہوئے دنوں کی یاد ہی حقیقی ہے —— وہ رُت جو بیت گئی، وہ موسم جو گزر گیا اس کا منظر نامہ کیا ہے۔؟

وہ منظر نامہ ہے خوبانِ کشمیر کا —— چنار کی گھنیری چھاؤں کا۔ چنار جو صرف ایک درخت ہی نہیں ہے۔ مغلوں کی تہذیب کے جمالیاتی احساس کا بھی نام ہے۔ وسط ایشیا میں تو یہ بہت چھوٹا سا تھا۔ مگر جب کشمیر آیا تو برگد کی طرح چھتنار ہو گیا —— اور کشمیریوں کے خونِ جگر کی سرخی نے اسے ادبی اور تہذیبی علامت بنا دیا۔ اور اسی چنار کی گھنیری چھاؤں میں نئی کونپلوں اور سُرمئی آسمان کے پس منظر میں جب بدن دہکنے لگتے ہیں اور سلگتے ہوئے ہونٹ اور عارضوں پر دہکتی ہوئی سرخی کہانیاں بننے لگتی ہے تو حیات کی ارضیت ادبی پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اس میں جنسی پہلو غالب رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنس شجر ممنوعہ نہیں ہے اگر اس میں فکری رفعت اور وہ طہارت ہے جس

شجرِ حیات میں برگ و بار آنے لگتے ہیں اور ان میں تازگی و نفاست نمایاں ہونے لگتی ہے۔

اس مجموعے کا موضوع بیشتر ایسی ہی نظمیں ہیں۔ انسانی نفسیات کا وہ پہلو بیشتر نظموں میں ملتا ہے کہ اگر سکت نہیں رہ جاتی تو بھی خواہش نہیں مرتی۔ کسی بھی فرد کے اگر پیر کاٹ دیے جائیں تو اس کے اندر چلنے کی خواہش برقرار رہے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ جو کبھی چلتا تھا صرف انھیں یادوں کے سہارے بیتی رتوں کا منظرنامہ سجاتا اور سنوارتا ہے اور یہی فیاض رفعت کی زیادہ تر نظموں کا مرکزی تصوّر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سب نظمیں جنسی موضوع سے ہی متعلق ہیں بلکہ "مکالمہ"۔ "دانش گہِ رشد و ہدایت"، "نوحہ"، "شہرِ افسوس"، "خدارا تم بھی" جیسی نظمیں بھی ہیں، جن کی فکر انگیزی، دل میں چھپا ہوا سماجی درد، جن میں دہشت گردوں کے خلاف صدائے احتجاج اور کشمیر کی عظیم تہذیبی اور دانش مندانہ روایت کا تذکرہ ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ کچھ عرصے تک کشمیر میں رہے ہیں۔ اس لیے میں ان کا درد سمجھتا ہوں، اس کرب کو محسوس کرسکتا ہوں جو ان کے وجود میں رہ کر کشمیر کی یاد کے ساتھ دھیرے دھیرے اُبھرتا ہے۔

حسیاتی شاعری کا یہ نادر نمونہ اپنی کچھ تراکیب اور استعاروں کی وجہ سے خصوصی ادبی توجہ کا مستحق ہے جیسے 'برف باری کی بھاپ' 'بدن کا سرگم'۔ 'زوال کا پرندہ'، 'جسم کا سنّاٹا'۔ 'لفظوں کا آکسیجن' 'وحشی خواب'، 'کنول جھیل چہرہ'۔ 'بدن کی پنچم'۔ 'سُرتانیں' 'عاصی خواہش'، 'جسم کی زبان'، 'بوسیدہ پاکیزگی'، وغیرہ۔

یوں تو مجھے ان نظموں کی ہیئت کے بارے میں بلاتکلّف حالی کا اتباع کرنا ہے کہ شعر کے لیے قافیہ ضروری نہیں ہوتا۔ یہ بحر کی شاعری نہیں ہے بلکہ لحن یعنی cadence کی شاعری ہے یہاں الفاظ کے ترنّم کے بجائے خیال کی موسیقی اور نغمگی پر زیادہ زور ہے۔ بعض جگہ پر نغمگی روایتی شاعری کے آہنگ میں بدل گئی ہے۔ ان کی خوبصورت نظم "موڈ" میں ایک آزاد نظم کے سارے آداب ملتے ہیں انھیں 'نثم' کہنے میں مجھے تامل ہے یہ اس اعتبار سے نظمیں ہیں کہ ان میں تخیل کے جمالیاتی پیکر، احساس کی شدّت اور اظہار کا خلوص نظر آتا ہے کہیں کہیں گیتوں کا وہ روپ بھی ملتا ہے جہاں رقص کرتی ہوئی حسیناؤں کے پازیب کی جھنکار سُنائی دیتی ہے ؎

میں تو بھول گئی چترائی
بدریا ساون کی گھر آئی
باغوں میں پڑے جھولے
آموں پہ چڑھی امرائی
سکھیوں نے لہرا باندھا
کوئل نے کوک مچائی

اس طرح کی شاعری جذبات کی آنچ کو تیز تر کرتی ہے۔ انھیں آتش نفس اور شعلگی بدوش بنا دیتی ہے۔

اس مجموعے میں تقریباً ۸۹ نظمیں ہیں۔ پیش لفظ پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے۔ زبیر رضوی، عرفان صدیقی اور شاہد ماہلی نے توصیفی کلمات کے ساتھ فیاض رفعت کے فنی محاسن پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ طباعت و کتابت اعلیٰ اور معیاری ہیں۔

——— پروفیسر جعفر رضا

نام کتاب: "حرفِ مکرّر" (شعری مجموعہ)
شاعر: غلام مرتضیٰ راہی قیمت: ۷۵/- روپے
ملنے کا پتہ: راہی منزل، ۱۳۵۔ پیں، فتح پور (یوپی)

——— ۲۱۲۶۰۱ ———

نئی غزل کے اُفق پر غلام مرتضیٰ راہی کا نام تقریباً ۳۰ برسوں سے ضوفشاں ہے، وہ نئی غزل کے ان پیش روؤں میں ہیں جن کے افکار سے ایک نسل نے اکتساب کیا ہے، مطالعاتی بھی اور ذہنی بھی۔ ان کی غزل کا اپنا ایک مزاج ہے، وہ مزاج جو ان کے اپنے معاصرین میں منفرد ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدید غزل کے افق پر ابھرنے والوں میں ان کا مقام بے حد نمایاں ہے ان کے دو شعری مجموعے "لامکاں" اور "لاریب" آٹھویں دہائی میں طبع ہوکر مقبول ہو سکے تھے۔ "حرفِ مکرّر" مذکورہ بالا مجموعوں کا مشترکہ نیا ایڈیشن ہے جو نہایت خوش گوار ترمیم، تخفیف اور

اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ راہی نے 'حرفِ مکرر' کو متشکل کرنے میں لفظی و معنوی تبدیلیاں کر کے شگفتگی کا ایک نیا منظر نامہ مرتب کیا ہے۔ راہی جدید غزل کے ایوان میں اپنی آواز کی عیرفانی قندیل روشن کر چکے ہیں۔ اور اسے مزید جاوداں بنانے کے لیے وہ اپنے آفتابِ فکر کا پرتو برابر اس پر ڈالتے رہتے ہیں۔ 'حرفِ مکرر' ہر اعتبار سے بے حد خوبصورت کتاب ہے، مشاہیرِ ادب کی گراں قدر آرا سے مزین ہے۔ اس کے مطالعہ سے راہی کے فکر و فن کی بنیادوں تک آسانی سے رسائی ممکن ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ؎

بے تحاشہ جئے ہم لوگ، ہمیں ہوش نہیں
وقت آرام سے گزرا کہ پریشانی سے
میں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کے چلتا ہوں
اب اس سے بڑھ کے کوئی اور مجھ سے کیا لے گا

اُمید ہے کہ 'حرفِ مکرر' کا مطالعہ خاص طور پر نئی نسل کے لئے راہی کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگا۔

عشرت ظفر ——————

نام کتاب: "ناگ پور کا مسلم معاشرہ"
مُصنّف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل قیمت/۷۵ روپئے
ملنے کا پتہ: رحیم اسٹورس، حیدری روڈ۔ مومن پورہ
ناگ پور

اس سلسلے کی پہلی کتاب ۱۹۹۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے مسلم معاشرے کا جائزہ لیا گیا ہے نیز اس دور کی تجارتی، سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بڑے سلیقے سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ بیک نظر ہم وہاں بسنے والے مسلمانوں کی صنعت و حرفت اور تہذیب و معاشرت سے واقف ہو جاتے ہیں جو تلاشِ معاش میں دُور دُور سے آئے۔ مذکورہ کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس کے ذریعہ ہم قومی سطح پر ابھرنے اور سنورنے کی آزمائشی کوششوں کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ اُردو زبان کی حفاظت کیلئے جو عمل جد و جہد یہاں شروع کی گئی تھی اسی کے نتیجے میں وہ خوش گوار ماحول بنا کر ناگ پور میں اُردو کلچر شاداب و شگفتہ نظر آتا ہے۔ سولہ (۱۶) ابواب پر مشتمل یہ تصنیف واقعی ایک مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل ایک متحرک و فعال شخصیت کے مالک ہیں اور ہمیشہ تعمیری کاموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ کاش اس طرح کا کام دوسرے شہروں میں بھی شروع ہو جائے تاکہ ہمیں ماضی و حال سے آگاہی حاصل ہو اور مستقبل کے لیے کچھ فکر دامن گیر ہو۔ بہر نوع یہ تصنیف قابلِ قدر ہے جو اُردو والوں سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے حاصل کیا جائے اور اپنے کتب خانوں کی زینت بنایا جائے۔

سہیل احمد ——————

نام کتاب: سفر ستارہ (شعری مجموعہ)
شاعر: پرکاش فکری قیمت: ۵۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: اُردو مرکز، عظیم آباد۔ پٹنہ
(بہار)

ادبی رسالوں کے قارئین کے لیے پرکاش فکری معروف نام ہے ان کا کلام برابر شائع ہوتا رہا ہے مگر ان کا شعری مجموعہ پہلی بار شائع کرنے کا فریضہ اُردو مرکز کے روحِ رواں جناب جابر حسین نے انجام دیا ہے اور ادارے کی روایت کے مطابق خوب انجام دیا ہے۔

پرکاش فکری کا اصل نام ظہیر الحق اور مقامِ ولادت انبالہ (ہریانہ) ہے مگر کارگاہِ حیات رانچی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کی زبان پر اُردو کے کسی مخصوص خطے کی چھاپ دکھائی نہیں دیتی، اس لیے زبان کے معاملے میں وہ ادبی و معیاری ہیں۔ شاعری کے حوالے سے ان کی غزل گوئی کو ترقی پسندی اور جدیدیت کی درمیانی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے اسی لیے ممکن ہے کہ بعض غزلوں یا اشعار پر کوئی مہر آسانی سے لگا دی جائے۔ مجموعے کا عنوان اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

رستوں کی جو خبر دے تاریک جنگلوں میں
ایسا کوئی ستارہ میرے لیے نہیں ہے

ایک سو غزلوں پر مشتمل مجموعہ سلیقے سے پیش کیا گیا ہے عام طور پر ۵ یا ۶ شعر ہی منتخب کیے گئے ہیں۔ بحریں چھوٹی اور مترنم ہیں جن سے قاری کو مزید لطف حاصل ہوتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی وفا ——————

ماہنامہ نیا دور

جلد ۵۲ نمبر ۷-۹

جولائی ستمبر ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر

سید امجد حسین

دفتر: ۲۱۳۳۲۸ رہائش: ۳۶۲۲۸۲

جوائنٹ ایڈیٹر

عجیب انصاری

معاونین: مرزا الیاس خاں۔ متین احمد صدیقی

پبلشر

رومت منزل

عنوانات

اپنی بات

۱۹۹۷ء آزادی کی یادگار کا سال ہے۔

اس لیے کہ اس برس آزادی کے پچاس سال پورے ہوجائیں گے۔ یوں تو ملکوں اور قوموں کی زندگی میں پچاس سال کا عرصہ بہت مختصر ہوتا ہے لیکن ہندستان نے اس نصف صدی کی مختصر سی مدت میں صدیوں کا فاصلہ طے کیا ہے اس سال ہم سب کو یہ جائزہ لینا ہے کہ ہمارے عزائم کے مطابق ہماری کامیابیاں کیا رہیں؟ زندگی کے ہر شعبے میں، وہ چاہے صنعت ہو تجارت ہو، معیشت ہو، سماجی اور تہذیبی زندگی ہو یا پھر ادب کی رنگا رنگ دنیا ہو ـــــ ہر شعبے میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کے سہارے ایک ارتقا پذیر معاشرہ وجود میں آیا ہے اور اس بنا پر یادگار سال کو پورا ملک ایک تقریب کے طور پر منا رہا ہے۔

ادارہ نیا دور بھی اس تقریب کو شاندار طریقے سے پیش کرنے کا عزم رکھتا ہے اور ہماری کوشش ہوگی کہ گزشتہ نصف صدی نمبر میں جو موضوعات تشنہ رہ گئے تھے وہ تشنگی اس یادگار آزادی نمبر میں دور ہوجائے۔ نصف صدی نمبر بھی پچاس برسوں کی تہذیبی دستاویز تھا۔ اب ۱۵ اگست، ۱۹۹۷ء کو آزادی کے پچاس برس پورے ہونے پر بہت سارے موضوعات اور مسائل نئے زاویۂ نظر کے ساتھ پیش کیے جائیں گے۔

اس لیے آئندہ شمارہ آزادی کے پچاس برسوں کی تکمیل کے موقع پر **یادگار آزادی نمبر** ہوگا، اور نیا دور کی روایات کے مطابق ہماری آزادی کی عظمتوں کا امین ہوگا۔

اس مہینے میں عید میلادالنبیؐ کی مبارک و مسعود تقریب ساری دنیا کے لیے سلامتی و رحمت کا پیغام ہے اور یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں بھی یہ تقریب مل جل کر منائی جاتی ہے اور ساری دنیا کے لیے یہ انوکھی مثال ہے کہ بال مکند عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، بشیشور پرشاد منور لکھنوی وغیرہ نے بھی حضورؐ کی مدح میں نعت لکھی ہے ـــ

آیا جو نام پاک محمدؐ زبان پر
صلِ علیٰ کا شور اٹھا آسمان پر

اور یہ نعت بھی غیر مسلم شاعر کی ہے، نعت لکھنے والوں اور حضور اکرمؐ پر سلام بھیجنے والوں میں اردو کے تہذیبی مزاج کے مطابق مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی پیش پیش رہے ہیں اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ صرف جلسوں یا جلوسوں میں ہی ہماری ہم آہنگی نظر نہیں آتی بلکہ اعلا فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ایسی ہم آہنگی ہے جو ساری دنیا کے لیے وسیع النظری، باہمی احترام اور رواداری کی شاندار مثال بن جاتی ہے۔ اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ہندستان کی عظیم سنہری روایات کے مطابق یہ تقریب ساری دنیا کے لیے امن اور بھائی چارے کا پیغام بھی ہے ـــــ اس لیے آیئے! مل کر منائیں عید میلادالنبیؐ۔

ـــــــــــ ایڈیٹر

سلام بحضور سرکار رسالتمآبؐ

سلام اُس پر کہ جس نے بے نواؤں کو نوا بخشی
مریض انسانیت کو زندگی بخشی شفا بخشی

سلامؐ اُس پر کہ جس نے فطرتِ انساں بدل ڈالی — بنائے آدمیت حسبِ پیمانِ ازل ڈالی
سلامؐ اُس پر کہ جس نے بندگی کو خواجگی بخشی — براہیمیؑ گلستاں کو نئی اک تازگی بخشی
سلام اُس پر کہ جس نے آمنہؓ کی گود روشن کی — منوّر جس سے دُنیا ہو گئی بطحا و ایمن کی
سلام اُس پر جو بن کر آدمیت کا وقار آیا — سلام اس پر جو بن کر رحمتِ پروردگار آیا
سلام اُس پر جو بن کر حسنِ ربُّ المشرقین آیا — سلام اس پر جو بن کر عشقِ ربِّ المغربین آیا
سلام اُس پر جو موجودات کا حق کی امیں ٹھہرا — سلام اس پر جو کل عالم میں ختم المرسلیںؐ ٹھہرا
سلام اُس پر جو ہو کے حق کا لطفِ تازہ تر آیا — سلام اس پر جو بن کر آخری پیغامبرؐ آیا
سلام اے رحمتِ عالم محمّد مصطفےٰؐ تجھ پر — سلام اے پیشوائے مرسلانِ مجتبےٰؐ تجھ پر

محمّد مصطفےٰؐ، ختمِ رسل، شاہِ عرب سُن لے — برہمن زادۂ کشمیر کی فریادِ لب سُن لے

رہے اُردو چراغِ نور کی مانند بھارت میں
دُعا گلزار کی اتنی ہے دربارِ رسالت میں

ڈاکٹر اے ایم، زتشی گلزار دہلوی
بانی ناظم عمومی انجمن تعمیر اُردو دہلی

خود نوشت

اصغر علی انجینئر
رائیہ پاپنشن فلیٹ ۹ بی ونگ فرسٹ فلور
[illegible]

جہدِ مسلسل ہے زندگی

میری پیدائش راجستھان کے ایک گاؤں سلومبر میں ۱۹۳۹ء میں ایک ممتاز بوہرہ عالم خاندان میں ہوئی۔ میرے دادا اور ان کے والد نہ صرف ممتاز عالم تھے بلکہ حافظِ قرآن بھی تھے۔ میرے خاندان کا تعلق مدھیہ پردیش کے ایک شہر مندسور سے تھا۔ میرے پردادا شیخ یوسف علی کے علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کے زہد و تقویٰ کا بھی لوگوں میں چرچا تھا۔ ان کے عالمانہ وقار کا لحاظ خود ان کے دور کے داعی المطلق سیدنا عبداللہ بدرالدین بھی کرتے تھے اور علمی معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ خود میرے والد بھی جنھوں نے اپنے دادا کے علم و فضل سے فیض اٹھایا تھا، ایک ممتاز عالم تھے اور بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ مجھے بھی ایک حد تک ان کے علم و فضل سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ بچپن میں ہی میرے والد محترم نے مجھے تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیا۔ میں جب تک ان کے ساتھ رہا ان کے حلقۂ درس میں برابر شرکت کرتا رہا۔ محرم الحرام میں بھی میں ان کے وعظوں میں شریک رہا۔ وہ ان وعظوں میں علم کے دریا بہاتے اور میں اس سے خوب مستفیض ہوتا۔ آج میری دین سے تھوڑی بہت واقفیت والد ہی کی بدولت ہے۔ یہ ان کا مجھ ناچیز پر عظیم احسان ہے۔

حالاں کہ میرے والد محترم اتنے بڑے عالم دین تھے لیکن تنگ نظری ان سے کوسوں دور تھی۔ وہ بڑے وسیع المشرب انسان تھے۔ تمام مذاہب کے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ بچپن میں ایک پنڈت جی ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور والد صاحب سے ان کی گھنٹوں مذہبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ وہ ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ یہ ان کی وسیع المشربی ہی تھی کہ ایک طرف انھوں نے میری دینی تعلیم کا انتظام کیا اور اپنی زیرِ نگرانی مجھے دینی تعلیم دلوائی اور میں جب اسکول جانے کے قابل ہوا تو مجھے سرکاری اسکول میں دنیوی تعلیم کے حصول کے لیے بھرتی کرا دیا۔ ان پر حالانکہ بوہرہ مذہبی پیشوا سیدنا طاہر سیف الدین کی طرف سے کافی دباؤ تھا کہ مجھے اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے سورت میں واقع سیفی درس میں بھیجا جائے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے سے مجھے سورت بھیجنے سے انکار کرتے رہے۔

میرے والد ایک بوہرہ عامل (مقامی مذہبی پیشوا) تھے اور ان کا مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے مجھے بھی کسی ایک جگہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے سب سے پہلے ہوشنگ آباد میں اسکول میں داخلہ لیا۔ وہاں دوسری جماعت تک تعلیم حاصل کر پایا تھا کہ والد صاحب کا تبادلہ وردھا ہو گیا۔ جب ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا قتل ہوا تو میں وردھا ہی میں تھا۔ وردھا میں میں تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کر پایا تھا کہ والد صاحب کا تبادلہ اندور سے قریب دیواس ہو گیا۔ دیواس میں قدرے سکون میسر آیا اور میں نے وہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس درمیان میں والد صاحب کے علم و فضل سے مستفید ہونے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہا۔ یوں میری تعلیم میں دین و دنیا کا تال میل بنا رہا۔

دیواس میں خوش قسمتی سے مجھے اردو کے بڑے باذوق استاد مل گئے جو شمع تخلص کرتے تھے، انھوں نے ہم طلبا کے اندر اردو ادب کا اچھا ذوق پیدا کر دیا۔ مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا ان کے دل میں بڑا ولولہ تھا اور وہ ہمیں ہمیشہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے

رہتے۔ ان کی کوششوں سے اُن دنوں دیواس میں جامعہ اُردو کا مرکز قائم ہوگیا تھا اور شمع صاحب کی ترغیب سے میں نے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کیے۔ یوں تو میری مادری زبان گجراتی تھی لیکن والد صاحب نے شروع ہی سے اردو اسکول میں داخلہ دلوایا اور ادھر شمع صاحب کی ترغیب سے اُردو زبان و ادب سے کافی شغف پیدا ہوگیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک ایسا تجربہ ہوا جس نے میری زندگی کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ یوں تو والد صاحب اندر ہی اندر سیدنا صاحب کے زیر سایہ ہوتے ہوئے مذہب کے نام پر استحصال سے سخت نالاں تھے لیکن بہرحال ان کی ملازمت میں تھے اور کچھ کرنے سے مجبور تھے۔ میں جب میٹرک میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوا تو والد صاحب مجھے بوہروں کے دستور کے مطابق سیدنا صاحب کی قدم بوسی کے لیے لے جانے پر مجبور تھے۔ وہ مجھے دیواس سے لے کر سیدنا صاحب کی خدمت میں بمبئی پہونچے۔ بمبئی میں بدری محل میں سیدنا صاحب کا آفس ہے۔

بدری محل میں میں نے زندگی میں پہلی بار عجیب منظر دیکھا۔ سبھی بوہرے سیدنا صاحب کو سجدہ کرنے پر مجبور تھے۔ ہر بوہرے کو سیدنا صاحب کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کر اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے جانا ہوتا ہے اور سیدنا صاحب پر نظر پڑتے ہی سجدے میں گر پڑنا لازمی ہے۔ میں مجبوراً ہاتھ جوڑے ہوئے گھٹنوں کے بل چلتا ہوا تو گیا لیکن سجدہ نہیں کیا۔ وہیں قریب میں مارشل کھڑا تھا۔ اس نے میری گردن پکڑ کر پیشانی زمین سے لگادی اور کہنے لگا:

"شیطان کہیں کا! اپنے آقا و مولا کو سجدہ نہیں کرتا، جہنم رسید ہوگا"

میں اور والد صاحب باہر آئے۔ میں غصے میں بھرا ہوا تھا میں نے والد صاحب سے کہا کہ آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ سجدہ ماسوا اللہ کے حرام ہے اور یہاں ایک انسان کو سجدہ کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے یہ سراسر غیر اسلامی حرکت ہے۔ میں اس در پر دوبارہ نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ نے مجبور کیا تو میں آپ کی نافرمانی کا مرتکب ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا"

والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگے "بیٹا! تو میری مجبوری نہیں سمجھتا۔ میں تجھے اپنی خوشی سے نہیں لایا ہوں"

بہرحال میں اس در پر دوبارہ نہیں گیا۔ میں نے وہاں ہر چیز اسلامی تعلیمات کے خلاف پائی۔ اسلام مساوات کی اور عدل کی تعلیم دیتا ہے اور یہاں اسلام کا نام لے کر ظلم، جبر، استحصال اور غلامی کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ مومنین اور مومنات کے ساتھ غلاموں اور لونڈیوں کا سا سلوک کیا جارہا ہے۔ ہر مرد اپنے کو عبد سیدنا (سیدنا کا غلام) اور ہر عورت امتِ سیدنا (سیدنا کی لونڈی) لکھنے پر مجبور ہے۔ ایسے مذہبی پیشوا کا بھلا اسلام سے کیا تعلق؟

والد صاحب نے مجھے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا حوصلہ دیا اور کسی طرح میں نے ۱۹۶۲ء میں اندور سے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور بمبئی آکر میونسپل کارپوریشن میں ملازمت کرلی۔ والد صاحب کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بڑی دقتیں پیش آئیں اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی۔ لیکن ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے کہیں نہ کہیں سے اسکالرشپ کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔ ادھر والد صاحب بھی سیدنا کی غلامی سے سخت بیزار تھے اور چاہتے تھے کہ میں انجینئر بن کر انھیں اس غلامی سے آزادی دلاؤں۔ میں نے جیسے ہی انجینئرنگ کا امتحان پاس کرکے ملازمت کی، والد صاحب نے سیدنا کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۶۲ء میں جبل پور میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا جس نے سارے ملک کو ہلاکر رکھ دیا۔ میں بھی بے چین ہو اُٹھا اور طے کرلیا کہ فرقہ واریت کی لعنت کے خلاف جدوجہد کرتا رہوں گا۔ جبل پور کے فساد کے بعد فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ رانچی، راوڑکیلا اور جمشید پور میں بھی بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ میں نے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر آواز برادران کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے باقاعدہ کام شروع کردیا۔ بمبئی کے کونے کونے میں میٹنگیں کیں اور بمبئی سے باہر جہاں بھی ممکن ہوسکا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے میٹنگیں کرتے رہے۔ یہ گویا زندگی

کا ایک مشن بن گیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب تک اس مشن پر قائم ہوں۔ اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

ادھر بمبئی آکر میں نے پہلے پہل اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون عقلیت پسند فلسفی اسپینوزا پر لکھا اور ظ انصاری صاحب کے رسالے "آئینہ" میں چھپنے کے لیے بھیجا۔ اسی مضمون کے ذریعے ظ۔ انصاری صاحب سے دوستی ہوئی اور وہ جب تک زندہ رہے پورے خلوص کے ساتھ قائم رہی۔ بڑے علم دوست اور مخلص انسان تھے۔ ظ۔ صاحب کا "آئینہ" تو بند ہو گیا مگر مغربی فلسفے پر میرے مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں سے کچھ مضامین کانٹ۔ ہیگل وغیرہ پر "آج کل" میں چھپے۔ ادھر مارکسی لٹریچر پڑھنے کی رغبت ہوئی اور مارکسزم پر کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مارکسی ادب کے مطالعے سے ایک حد تک ذہن متاثر بھی ہوا، لیکن یہ محض ذہنی رجحان ہی رہا۔ اس سے میرا ذہن ترقی پسند ادب کی طرف مائل ہوا

اب ذہن ادب کے مطالعے کی طرف مائل ہوا چنانچہ اُردو، انگریزی اور فرینچ ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور نظریاتی تنقید پر کئی مضامین لکھ ڈالے جن میں سے بعض مضامین مارکسی جمالیات کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے شروعات میں عرب، اسرائیل جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں تیل کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا اور تیل کے اس انقلاب کا عالم اسلام کی سیاست پر زبردست اثر ہوا۔ میں نے ان تبدیلیوں پر قلم اٹھایا اور کئی مضامین لکھ ڈالے جو "عالم اسلام" کے عنوان سے دہلی سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ دراصل یہ مضامین قمر رئیس کی تحریک پر ان کے رسالے "عصری آگہی" کے لیے لکھے گئے تھے۔ ستر کے دہے کے اواخر میں پریم چند صدی کے موقع پر پریم چند پر بھی ایک کتاب لکھی جو دلی سے شائع ہوئی۔ ایک کتاب میں نے مارکسی نقاد لوکاچ پر بھی لکھی جس میں اس کی نظریاتی تنقید اور ذہنی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اُردو میں لوکاچ پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔

۱۹۶۹ء میں احمد آباد میں اور پھر ۱۹۷۰ء میں بمبئی کے قریب بھیونڈی میں فرقہ وارانہ فساد اتنے بڑے پیمانے پر ہوئے کہ انسانیت کانپ اٹھی۔ میں نے اب باقاعدہ فسادات کے خلاف قلم اٹھایا اور ان کی تحقیقات کر کے ان کے سیاسی، معاشی، سماجی اور تاریخی اسباب پر روشنی ڈالنا شروع کی اور کئی مضامین قلم بند کیے۔ اب جہاں بھی فساد ہوتا میں بذاتِ خود جاتا اور تحقیق کر کے فساد کے اسباب وعوامل پر تفصیلی روشنی ڈالتا۔ میں نے فرقہ واریت پر نظریاتی اعتبار سے بھی تحقیق کی اور اس موضوع پر میری انگریزی میں اب تک پندرہ سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔

اُدھر ۱۹۷۳ء میں اُدے پور میں سیدنا صاحب کے خلاف بڑے پیمانے پر بغاوت ہو گئی۔ بوہرہ مذہبی پیشوا کی مطلق العنانیت سے تنگ آکر اُدے پور کے بوہروں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ بوہرہ تاریخ میں یہ بڑی ہی انہونی بات تھی۔ بغاوت تو کجا، سیدنا کی معمولی سی نافرمانی بھی تصور میں لانا ناممکنات میں سے تھا لیکن اُدے پور کے بوہروں نے واقعی بوہرہ تاریخ کا رخ موڑ دیا اور بوہرہ مذہبی پیشوا کے جابرانہ نظام کو ایک زبردست چنوتی دی۔ اُدے پور کی عورتوں کا رول واقعی سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میں بھی اس تحریک میں کود پڑا۔ حالاں کہ والد صاحب اس دارفانی سے کوچ فرما چکے تھے، لیکن جیتے جی ان کی دلی خواہش تھی کہ سیدنا صاحب کے مظالم کو کوئی چنوتی دے۔ میں نے دل وجان سے اس مقصد کو سینے سے لگا لیا اور اس مشن میں جُٹ گیا۔ میرے خاندان پر سیدنا صاحب کے عتاب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میرے تمام رشتہ داروں نے مجھ سے ناتا توڑ لیا اور میری ماں کو بھی مجھ سے جدا ہونا پڑا۔ بوہرہ دوستوں نے منھ موڑ لیا۔ میرے بڑے بھائی صاحب کا، جنھوں نے میری ہمیشہ ہر طرح سے مدد کی تھی، انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اگر میں نے جنازے میں شرکت کی کوشش کی تو ان کے جنازے کو قبرستان سے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا جس کے تصور ہی سے میں کانپ گیا اور گریہ کناں گھر لوٹ گیا۔ سوشل بائیکاٹ کی اسی مجبوری کی وجہ سے بھائی کے یتیم بچوں کی شادی میں بھی شریک نہیں ہو سکا۔ اب میرا میرے تمام عزیز واقارب سے اور (اصلاح پسند حضرات کے علاوہ) دیگر تمام بوہرہ حضرات سے رشتہ

ٹوٹ چکا تھا۔ لوگ فون کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ میں کسی کو فون بھی کرتا تو نام سنتے ہی فون نیچے رکھ دیا جاتا۔

اسی دوران مجھ پر چار مرتبہ جان لیوا حملے ہوئے۔ ایک بار کلکتہ میں دو بار حیدرآباد میں اور چوتھی مرتبہ قاہرہ میں۔ ویسے حملے تو سبھی مار ڈالنے کی غرض سے ہوئے تھے لیکن قاہرہ میں کیا گیا حملہ نہایت شدید تھا۔ میں حکومتِ مصر کی دعوت پر قاہرہ میں فلسطین پر ہونے والی کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ نجمہ ہبت اللہ اور سبط رضی بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ حملہ قاہرہ کی ایک مسجد جامع الحاکم میں سبط رضی کی موجودگی میں ہوا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ نے کسی طرح جان بچالی۔ قاہرہ سے میرا زندہ لوٹنا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کے بعد کئی سال پولیس کی حفاظت میں رہنا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان حملوں نے دل میں کسی قسم کا خوف پیدا کیا اور نہ ہی ہمت پسپا ہوئی۔ میں آج بھی پوری تندہی سے اسی جد و جہد میں لگا ہوا ہوں۔

سیمنار اور کانفرنسوں کے سلسلے میں کئی بار انگلینڈ، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، میکسیکو، امریکہ، کینیڈا، افریقہ، یمن، ملیشیا، انڈونیشیا، ہانگ کانگ، فلپائن، تھائی لینڈ، جاپان وغیرہ جانا ہوا۔ ان ممالک میں کئی یونیورسٹیوں میں لیکچرز ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے کمیونل ہارمنی پر میرے کام کے پیش نظر مجھے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

میں کمیونل ہارمنی کے علاوہ اسلام پر بھی تصنیف و تالیف کا کام کرتا رہا۔ اسلام پر تحقیق و اشاعت کے کام کے لیے ہم نے ۱۹۸۰ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ آج بھی کام کر رہا ہے۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر میری بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کل ملا کر اب تک میری ۴۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اسلام کو دورِ حاضر کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہم نے سنہ ۶۰ء کے دہے میں "ایکتا" نام کی تنظیم قائم کی تھی اور اس تنظیم کے ذریعے ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پیغام دنیا تک پہنچاتے رہے لیکن ۹۳-۱۹۹۲ء کے ممبئی کے فسادات کے بعد ہم نے ایک اور ادارہ قائم کیا "سنٹر فار اسٹڈیز آف سوسائٹی اینڈ سیکولرازم" جو نہ صرف کمیونل ہارمنی کے پرچار کا بلکہ اس موضوع پر تحقیق و اشاعت کا کام بھی کر رہا ہے۔

فرقہ واریت کے خلاف جد و جہد اب بھی جاری ہے۔

□□

قوم تجھ کو بھلا نہیں سکتی

(سبھاش چندر بوس کی یاد میں)

ذکر کس کا زباں پہ آیا ہے
جینتی کس کی ہم مناتے ہیں
کون ہے دل کے آئینے کے قریب
جیسے نغمات گنگناتے ہیں

وہ غلامی کو موت کہتا تھا
اس کے دل میں تھی حریت کی لگن
خوف کھاتے تھے حکمراں اس سے
ایک شعلہ تھا اس کا طرزِ سخن

جان دے کر وطن کی چاہت میں
سب کی نظروں سے ہو گیا اوجھل
ہاں مگر اے عروسِ آزادی
تیری آنکھوں کا بن گیا کاجل

جو وطن پر نثار ہوتا ہے
موت اس کو مٹا نہیں سکتی
ہم عقیدت سے سر جھکاتے ہیں
قوم تجھ کو بھلا نہیں سکتی

متین عمادی
خانقاہ عمادیہ
منگل تالاب۔ پٹنہ-۸

نعتیں

گرچہ نام و نسب سے ہندو ہوں
کملی والے میں تیرا سادھو ہوں

تیری خوشبو ترا پیامِ حق !
تیری خوشبو سے میں بھی خوش خو ہوں

یہ بھی مجھ پر تری نوازش ہے
شاعرِ دل نوازِ اُردو ہوں

میری پرواز کو نواز کہ میں
تیرے آکاش کا پکھیرو ہوں

کرشن موہن ہے کرم گستر
میں ترے راستے کا بھکشو ہوں

کرشن موہن
۱۵۸ - پشپانجلی
دھلی ۱۱۰۰۹۲

خیالِ مصطفےٰ دل میں زباں پر اُن کا کلمہ ہے
محبت کا تقاضہ ہے مودّت کا قرینہ ہے

مرا اوج و شرف اللہ اکبر کتنا اونچا ہے
نظر میں گنبدِ خضریٰ ہے یا عرشِ معلّٰی ہے

یہ ہست و بود کا عالم یہ آب و گل کی دُنیا کیا
تمھارے حُسن کا اللہ نے صدقہ اُتارا ہے

محامد اور محاسن کے بھلا الفاظ کیا ڈھونڈیں
خدا ہی جانتا ہے جو مرے آقا کا رُتبہ ہے

غمِ عشقِ نبیؐ سے رُوح نے آسُودگی پائی
سکونِ قلب ہے اس سے نگاہوں میں اُجالا ہے

محمدؐ اسمِ اعظم ہے بس اتنا جانتا ہوں میں
حقیقت ہے کہ یہ لاکھوں سہاروں کا سہارا ہے

سرورِ جاوداں پایا عقیلِ ہاشمی نے یوں
کہ ہر تارِ نفس میں دیکھئے ان کا ترانہ ہے

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
صدر شعبۂ اردو - عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
۵۰۰۰۰۷

پروفیسر محمد حسن
ڈی ۔ ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی
۱۱۰۰۰۹

رشید احمد صدیقی : فن اور شخصیت

رشید احمد صدیقی اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی تحریریں آج بھی ان کی یاد دلانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ تحریریں نصف صدی کا قصہ سُناتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مُدت کا اور اس دوران جو کچھ تہذیب و تاریخ پر گزری ہے یا تہذیب و تاریخ نے جو ہم پر گزاری ہے اس کا حال احوال جستہ جستہ بیان کرتی ہیں اس اعتبار سے فیض کے لفظوں میں ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے ؎

جو ہم پہ گزری سو گزری پہ اے شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

اشکوں نے تو یہ کام بہت کیا ہے اور یہ فریضہ ان سے بہ جبر بھی ادا کرایا گیا ہے مگر خندۂ زیرلبی اور مسکراہٹ کی تہوں میں دبے آنسوؤں سے یہ کام شاید ہی کسی نے اس انداز اور اس تیور سے لیا ہو ع

کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

رشید صاحب کو مزاح نگار کی حیثیت سے بڑی شہرت ملی لیکن ان کی مسکراہٹوں کے پیچھے کتنی اور کیسی دردمندیاں تھیں کتنے شکستہ خواب کتنے اور کیسے بکھرے ہوئے افسوں اور کتنی ادھوری تمنائیں تھیں ـــــ اس کا اندازہ لگانے والے کتنے ہیں۔؛

ایک ماحول وہ تھا جب در و دیوار شناسا تھے اور دُنیا جیسے اپنوں سے آباد تھی، گل منزل کی تحریریں ہوں یا اس زمانے کے علی گڑھ کالج کی شناسائیاں ـــ گویا چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہیں کہ دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے یہ کائنات علی گڑھ کالج سے آباد اور کالج کے جانے پہچانے کرداروں سے بھری پڑی تھی۔ ہر طرف ذوق و شوق کا عالم۔ ہر جگہ سرمستی و نشاط کا نشہ جو چاروں طرف کی زندگی کی کج ادائیوں کو بھی جی سے بھلائے رکھتی تھی اس سے زیادہ کچھ اور درکار تھا تو تھوڑی سی مستی اور قلندری جس کا وافر خزانہ زمانے نے ان کی گود میں لاڈالا تھا۔

ہر چہرہ چاند اور ہر لمحہ نشاط۔ یہ مولانا سلیمان اشرف کا حجرہ ہے جہاں رند باصفا اور زاہد باوضع کا سنگم تھا۔ یہ ہوسٹل کا کمرہ ہے جو اقبال سہیل کی فطانت اور ذاکر صاحب کی ذہانت سے آباد تھا۔ یہ جناب فاروق دیوانہ ہیں جو اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور یہ قاضی جلال الدین جن کی تھی بات بات میں ایک بات اور پھر ایک طرف ٹینس کورٹ کی دل چسپیاں تھیں تو دوسری طرف یونین کے مذاکرے ـــ بیچ بیچ میں مشاعرے کی محفلیں تھیں جن میں فانی، اصغر، حسرت موہانی اور بعد کو جگر مرادآبادی کی آوازیں گونجتی تھیں یا پھر یونین کے الیکشن کی رونقیں یا سیاست کی وہ کروٹیں جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور کچھ اس انداز سے ڈالی کہ

ع بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

کا منظر سامنے آگیا۔

آج اس وقت کا خیال کیجیے تو رشید صاحب کے مزاج، منہاج اور اسلوب پر روشنی پڑے گی کہ ان کا حال اس دورِ ابتلا میں کچھ اس طرح کا تھا کہ دریا میں رہیں اور دامن تر نہ ہو۔ وہ نہ تو سرکاری حلقے میں تھے نہ درباریوں میں، نہ باغیوں میں، نہ مجاہدوں میں۔ البتہ تماشائیوں کے اس مجمع میں ضرور شامل تھے، جن پر فراق گورکھپوری کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
مگر اس انجمنِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

رشید صاحب علی گڑھ پر عاشق اور علی گڑھ کے اربابِ انتظام ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے دلدادہ و شیدا۔ اس دور کی لغت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور ادھر رشید صاحب کا گھر تھا کہ اپنوں پرایوں دونوں سے آباد رہتا تھا اور ان میں ایسے اپنے بھی شامل تھے جنھیں علی گڑھ کے اربابِ انتظام پرایوں میں گنتے تھے۔ رشید صاحب نے گو کبھی زرہ نہیں پہنی اور مقابل صفِ اعدا کے باوجود کبھی ان کے مقابلے پر نہیں آئے پھر بھی ان کے رشتے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے حمایتوں سے زیادہ ان کے نکتہ چینوں سے رہے۔ اس کی گواہیاں اب تو ان کے مکاتب سے بھی مل جائیں گی کہ ابھی حال میں کئی مجموعے ان کی وصیتوں کے علی الرغم چھپے ہیں۔ یہی انداز ــ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں ــ رشید صاحب کو ہمیشہ عزیز رہا سیاست میں بھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ہمدردیاں کسی نہ کسی طرح کہیں اور نہ یہی، کم سے کم ان کے خطوں میں ضرور ظاہر ہو جاتی ہیں، شاید اسی بنا پر ان کو اپنے خطوں کے شائع ہونے پر اتنا اعتراض بھی رہا اور احتراز بھی۔

وجہ اس کی ایک یہ بھی تھی کہ رشید صاحب نے اپنا دائرہ کار قطعی طور پر طے کر رکھا تھا ــ ادب اور صرف ادب، حلقۂ فکر اور محض حلقۂ فکر ــ اور ان دائروں سے باہر انھوں نے کبھی قدم نہیں رکھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ان دائروں سے آگے قدم بڑھانے کی ضرورت ہوئی رشید صاحب نے کوئی نہ کوئی راہِ فرار اختیار کی اور وہ بھی ایسی راہِ فرار جو انھیں ان کی محبوب فضاؤں میں واپس لے آئے اور تو اور اقبال کے ساتھ بھی ان کا طرزِ عمل کچھ اسی طرز کا ہے جیسا خود اقبال کا اپنی طرف اور اپنے افکار کی طرف تھا کہ افکار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا اور شاید اسی بنا پر اقبال کو خود رشید صاحب نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب کے دیباچے میں نئے علم الکلام کے حوالے سے پہچانا ہے۔

زمانے نے پلٹا کھایا، تقسیمِ ہند کا حادثہ پیش آیا اور تقسیمِ ہند کے اس عمل کے دوران کافی مدت تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مستقبل غیر یقینی صورتِ حال کا شکار رہا۔ یونیورسٹی قائم رہے گی بھی یا نہیں؟ اور رہے گی تو موجودہ شکل میں اور موجودہ نام اور کردار کے ساتھ قائم رہے گی یا نہیں؟ مدتوں یہ سوال ذہنوں میں گونجتے رہے۔ رشید صاحب کے فکر و فن کی دنیا ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کی اقامتی زندگی تھی اس لیے ان کے لیے ان سوالوں کی حیثیت مرکزی تھی۔

بالآخر ابوالکلام آزاد کی وزارتِ تعلیم نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری میں اس کا حل تلاش کر لیا۔ واقعات کا ذکر بیکار ہے، مگر ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا دور رشید صاحب کے لیے علی گڑھ کی بازیافت بلکہ لمحاتِ بازپسیں کا دور تھا۔ گو یہ بازیافت بالآخر بہت سے سوالات ادھورے چھوڑ گئی۔ ان سوالوں کی تلخی مدتوں فضا میں بکھرتی رہی اور رشید صاحب کی تحریروں میں اپنے رنگ و آہنگ کا جادو جگاتی رہی۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات بھی نئے استفہامیے قائم کر رہے تھے اور محبتوں کے ساتھ منافرتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا اور پورے ملک کے سامنے سب سے بڑا سوال اس فکر و احساس کو زندہ رکھنے کا تھا جس کے رشتے مشترک ادبی اور تہذیبی میراث تک پھیلے ہوئے تھے۔

رشید صاحب نے اس ماحول میں پھر قلم اٹھایا مگر کسی قدر مختلف انداز سے۔ اب بھی ان کی تحریروں میں طنز و مزاح سے کام لیا جاتا تھا، طنز سے کم، مزاح سے زیادہ۔ مگر اب مزاح کا رخ ایک ماہرانہ بلکہ شاطرانہ حکمتِ عملی کی طرف تھا۔ "سلام ہو نجد پر" سے جو سلسلہ شروع ہوا تو آخر زمانے تک جاری رہا۔ "عزیزانِ علی گڑھ" اور "عزیزانِ ندوہ کے نام" میں یہ تخاطب زیادہ برملا اور کھلا ڈلا ہے۔ دراصل یہ دور علی گڑھ کے لیے ہی نہیں ہندستان کی تہذیبی زندگی کے لیے تھا بھی بہت نازک دور اور اس دور میں دونوں ہاتھوں سے بھی دستار سنبھالنا بہت دشوار ہو گیا تھا ــ شاید اب بھی ہے۔

اس درمیان بہت کچھ ہوا۔ ذاکر صاحب ہی کے زمانے میں رشید صاحب پروفیسر ہوئے اور اس دور کے دستور کے مطابق انھوں نے

پروفیسر ہونے پر اپنا توسیعی خطبہ "جدید اُردو غزل" پیش کیا۔ یہ اُن کی پہلی تنقیدی کاوش نہیں تھی، اس سے پہلے بھی باقیاتِ فانی پر ان کا طویل دیباچہ شائع ہو چکا تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کا خطبۂ صدارت پیش کیا جا چکا تھا۔ اس توسیعی خطبے میں بھی وہی تاثراتی انداز تھا جس میں تنقید کا ایک نیا رنگ تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں کوندے کی طرح لپکتے ہوئے جملے تھے جو ایک لمحہ میں پورے پس منظر کو جگمگا دیتے تھے اور غور و فکر کے نئے زاویے چھوڑ جاتے تھے۔ یہ تنقید تخلیقی فن کار کی جودت، ذہانت اور وسعتِ نظر کی کارفرمائی تھی، بعد کو اسی اسلوب کی جھلکیاں "اُردو کا بنیادی اسلوب"۔ "دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے" اور سب سے زیادہ مربوط انداز میں "غالب: شخصیت اور فن" میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان جھلکیوں کو یکجا کر لیا جائے تو رشید صاحب کا تنقیدی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے، جس کی وضاحت اور صراحت کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔

اسی ضمن میں ان کے شخصی مرقعوں کا تذکرہ بھی لازمی ہے جس میں ہم نفسانِ رفتہ۔ گنج ہائے گراں مایہ۔ ذاکر صاحب۔ شیخ نیازی شامل ہیں۔ جن کا ذکر ہے ان سب سے وہ ذاتی طور پر واقف نہ تھے۔ رشید صاحب یوں بھی خاصے خلوت پسند تھے اور خلوت میں بھی وہ اپنی اس خصوصیت سے غافل نہیں رہے یوں بھی ہوا ہے کہ انھوں نے اکثر اپنے قریبی دوستوں پر کچھ نہیں لکھا اور مولانا محمّد علی سے لے کر ابوالکلام آزاد تک پر شخصی مرقعے لکھ ڈالے۔ محمد علی کے شخصی مرقعے میں یہ سطریں قابلِ توجّہ ہیں: ——————

"مردِ غازی کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی، طرب انگیزی، برگستواں کی زینت، مالِ یغما اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی رُوح اور دمکتے ہوئے چہرے اور ڈوبتے ہوئے سُورج سے"!

افسوس یہ ہے کہ رشید صاحب نے مرقعے لکھے تو ان ڈوبتے سورجوں کو یاد نہیں رکھا جو ان کی نظروں کے سامنے غروب ہو رہے تھے اور اپنے مرقعوں کو صرف چڑھتے ہوئے سُورجوں تک ہی محدود رکھا۔ یہاں بھی وہی احتیاط ملحوظ رہی جو علی گڑھ کی زندگی میں انھوں نے ہر لمحہ برتی ہے کہ دامن تر مکن ہشیار باش۔

اِس احتیاط کا دامن چھوٹا ہے تو ان تہذیبی اور نیم سیاسی مضامین میں جو آخر دور میں انھوں نے سپردِ قلم کیے۔ یہاں وہ جذبۂ قومی سے بے اختیار دکھائی دیتے ہیں مگر ان کا دُکھ درد قومی کردار کے انحطاط پر ہے کچھ زمانے کی بے انصافی پر بھی ہے جس نے بقول حسرتؔ "خرد کا نام جنوں رکھ دیا" ہے۔ ایک مرتبہ دہلی جانے کے بعد علی گڑھ میں نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا اور یہ زمانہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل کا تھا جن مضامین کے لکھنے کا ارادہ تھا انھوں نے صرف دو مضامین کا ذکر کیا تھا، ایک کا مجوزہ عنوان تھا "جوکر کیا نہ کرتا" اور دوسرے کا موضوع تھا "دربارِ خداوندی میں اپنا دفاع"۔ پہلے مضمون میں اس اعتراض کا جواب مقصود تھا کہ مزاح نگار ہو کر ملک اور قوم کے مخمصوں میں پڑنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور تہذیبی اور نیم سیاسی قسم کے مضامین کیوں لکھنے لگے۔ استدلال یہ تھا کہ جب تاش کی بازی میں ساری نادری کٹ جائے (شاید اس سے ذاکر صاحب کی طرف بھی اشارہ تھا) تو جوکر ہی کو اپنا فرض ادا کرنا پڑتا ہے مزاح نگار بھی جوکر ہی کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اسے بھی قومی اور تہذیبی مسائل کی طرف رجوع کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسرے مضمون میں گویا دربارِ خداوندی میں پیش ہونے پر اس استفسار کا جواب تھا کہ دنیا میں بھیجے جانے پر آخر اپنے فرائض کس طرح ادا کیے یا کوتاہیاں ہوئیں تو کیوں؟ اور جو صلاحیتیں اور مواقع ملے تھے ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے۔

یہ مضامین تو غالباً لکھے نہیں گئے، مگر ان سے رشید صاحب کے نظریۂ فن کی وضاحت ہوتی ہے، خاص طور پر اس نظریے کی جس کے تحت آخری دور کے 'تہذیبی' مضامین لکھے گئے ان میں ان کا تصورِ حیات ابھر کر سامنے آ گیا ہے وہ ہندستان کی ملواں تہذیب کے شیدائی تھے جسے بعض لوگوں نے مبتذل ملائی تہذیب بھی قرار دیا ہے اور ان مضامین میں اس تہذیب کو درپیش خطرات ہی کا تذکرہ ہے۔

اقتباس تو کسی اور موقع کا ہے مگر اس سے ان کے تہذیبی موقف پر روشنی پڑتی ہے :

"جب کسی کانووکیشن سے واپس گھر جاتا تھا، راستے میں نالے پر سے گزرتے ہوئے یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ نالے میں بہتا ہوا شفاف پانی اگر میرے باغیچے کو ملتا تو کیسے کیسے گلاب کھلتے۔ اس بار جب نالے پر سے گزرا تو اس کے گندے اور کیچڑ بھرے پانی کو دیکھ کر اس کا شکر ادا کیا کہ میرا باغیچہ اس گندے پانی سے محفوظ ہے۔"

اقدار اعلیٰ کا جو بھی تصور رشید صاحب کو عزیز رہا ہو یہ اسی تصور کی حفاظت کی مثال ہے۔

۱۸۹۰ء میں مریاہو ضلع جون پور (اتر پردیش) میں آنکھیں کھولنے والے اور ۱۹۷۷ء میں وفات پانے والے رشید صاحب نے ایک نہیں کئی ادوار کے نشیب و فراز کو دیکھا اور جھیلا تھا۔ پھر مقامی مندر کے مدرسے میں تعلیم حاصل کر کے الٰہ آباد بورڈ کے تحت امتیاز کے ساتھ ہائی اسکول پاس کرنے والے نوجوان نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ اقامتی زندگی میں ساتھی ملے تو ذاکر صاحب، اقبال سہیل اور فاروق دیوانہ جیسے، اور زمانہ ملا تو ایسا پر آشوب کہ ملک کے ساتھ علی گڑھ نے بھی برطانوی سامراج سے سرتابی سیکھی تھی اور اسی سرتابی کی کوشش میں ٹوٹ کر ایک حصہ جامعہ ملیہ اسلامیہ بن گیا تھا۔ اسی علی گڑھ میں پہلے علی گڑھ منتھلی کے مدیر کی حیثیت سے اور بعد کو بعض دوسرے رسالوں کے مدیر کی حیثیت سے امتیاز پایا اور اسی امتیاز کی بدولت علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے متعلق ہوئے جس کی خاطر ان کی پہلی تصنیف 'طنزیات و مضحکات' شائع ہوئی تھی۔ اور جب اس شعبے کی صدارت اور پروفیسر شپ کا مسئلہ سامنے آیا تو رشید صاحب نہ صرف مزاح نگار کی حیثیت سے مقبول اور مستند ہو چکے تھے بلکہ تنقید میں بھی اپنا راستہ بنا چکے تھے یہ راستہ تنقیدی سے زیادہ تخلیقی تھا کہ یہاں بھی ان کی انفرادیت اور انوکھاپن ہی رہنما تھا۔

علاوہ بریں ان کے وہ مرقعے ہیں جو انھوں نے اپنے ہم عصروں کی شخصیت سے سجائے ہیں ان میں مروّت اور محبت کا رنگ نمایاں ہے اور 'کندن'، 'چپراسی' کے مرقع سمیت سبھی میں رشید صاحب کی اپنی شخصیت کے مختلف گوشے مختلف ناموں اور چہروں کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں یہاں سارا کا سارا پہلو یکتا نظر آتا ہے کہ ایک ہی شخصیت پارہ پارہ ہو کر مختلف ناموں سے پیش کی گئی ہے۔

پھر ان کے خطوط ہیں جن کے مجموعے ان کے انتقال کے بعد سے برابر شائع ہو رہے ہیں اور ان کی وصیت اور ہدایت کے برخلاف۔ بعض ان میں محض رسمی خطوط ہیں بعض میں شوخی اور طرحداری ہے بعض میں ان کے اسلوب کی رنگینی اور شادابی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خطوط ہی میں نہیں شخصیت میں بھی رشید صاحب کو غالب سے کئی مماثلتیں ہیں۔ دونوں ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے دور میں پیدا ہوئے دونوں کے، ان میں اجتماعی رنگ و آہنگ سے خصوصی شغف تھا اور اسی کی تکمیل میں کبھی شوخی اور ظرافت کا سہارا لیا کبھی خطوں کے ذریعے دل بہلایا، کبھی گزرے ہوئے دنوں کا ماتم کہ ؏

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

کبھی خود پر ہنس لیے کبھی زمانے پر۔ اور انہی خصوصیات نے ان کے خطوں میں ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے کہ بقول سعادت یار رنگین ؎

یہ جو کچھ ہے جہاں میں اس کے بیش و کم کو دیکھا ہے
ہمیں کیا دیکھتے ہو ہم نے اک عالم کو دیکھا ہے

غرض رشید صاحب کی قاموسی شخصیت ایک شش جہت نگینے کی طرح ہے اور ان کا فیض ادب اور زندگی کے مختلف شعبوں کو ملا ہے ان کے خیالات و اقدار کی حیثیت زمانے کے ساتھ ساتھ محض تاریخی ہوتی جائے گی مگر ان کا اسلوب بہر حال اسی طرح شاداب و تر و تازہ رہے گا۔ جس طرح شطرنج کے ہر کھلاڑی کو پہلی چال اپنی مرضی سے چلنے کی آزادی ہوتی ہے اور بعد کی ہر چال خود اس کی اپنی اور اپنے حریف کی چالوں سے متعین ہوتی ہے اسی طرح رشید صاحب کے اسلوب کا ہر جزو بھی پہلے جملے سے آخر جملے تک متعین اور مقدر ہوتا ہے — ایک خیال سے دوسرا خیال جنم لیتا ہے اور ایک جملہ بلکہ لفظ سے

دوسرے جملے اور الفاظ غالباً اسی بنیاد پر رشید صاحب نے اپنے اسلوب کو سمفنی سے تشبیہ دی ہے۔

"کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا ہے جیسے یہ تمام کائنات جو ہمارے علم میں ہے یا علم کے باہر ہے جس میں ہم ملوث ہیں، اپنی جملہ تفصیلات، جزئیات اور تضاد و تطابق کے ساتھ ایک مکمل سمفنی یا سنگیت ہو جس کا کوئی نغمہ غیر از آہنگ نہ ہو۔ کائنات کو یہی صفت یا قدرت اس کے تمام مشمولات کو خواہ وہ کتنے ہی عظیم یا حقیر، معلوم یا نامعلوم کیوں نہ ہوں ایک دوسرے میں پیوست اور ایک دوسرے سے مربوط، مزین، مستحکم اور بامقصد رکھتی ہے یا قانون کی زبان میں تو لے اور سنبھالے رکھتی ہے۔

اس حقیقت یا استعارے کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ اخلاق ہو یا آرٹ، مذہب ہو یا زندگی ان کے بے شمار شیون کے اظہار میں لازم آتا ہے کہ ہم مذکورہ کائناتی یا الہیاتی سمفنی کا پورے طور پر لحاظ رکھیں جس سے وہ شہ پارہ ظہور میں آیا یا لایا گیا۔ اس میں نظم و نثر کی قید نہیں، قید صرف اتنی اور اس کی ہے کہ نظم ہو یا نثر، عبارت، اشارت اور ادا، کے اعتبار سے غیر از آہنگ یا بے سری نہ ہو بالفاظ دیگر اسلوب یا اظہار یا دونوں میں مناسب حال سمفنی کا ہونا ضروری ہے اس لیے ہر اظہار یا اسلوب کائناتی سمفنی کا جزو ہوتا ہے — نہیں ہوتا ہے تو ہونا چاہیے۔ اخلاق فاضلہ ہوں یا فنون لطیفہ یا زندگی کے دوسرے اہم مسالک و معاملات موزوں اسلوب و اظہار کے بغیر وہ ہمیشہ کم عیار قرار پائیں گے۔"

ان کا آرٹ استقامت کی تلاش ہے اور استقامت کی اسی تلاش میں انھوں نے اسلوب کو جہاز کے لنگر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کا ایک اور محبوب حربہ ہم صوتی مترادفات یا نیم مترادفات کا استعمال ہے اتنا اور ایسا کہ اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں، حشو و زوائد کے استعمال سے پرہیز کرتے ہوئے بھی وہ اکثر ایسے متعدد مترادفات کے جوڑے سجاتے بناتے رہتے ہیں جن سے اسلوب میں دل کشی اور تخیل میں تازگی کا احساس ہو۔ بظاہر ہم صورت الفاظ کی یکجائی سے خوش نمائی پیدا کرنا رشید صاحب کو قول محال اور ایجاز بیان کی طرف بھی لے جاتا ہے جس کی بنا پر بعض نقادوں نے ان کا رشتہ آسکر وائلڈ اور بعض نے سجاد انصاری سے اور بعض نے جارج برنارڈ شا سے جا ملایا ہے۔

یہ درست ہے کہ مزاجاً رشید صاحب وکٹورین ہیں ان کا قلعہ ان کا گھر ہے ان کا پائیں باغ ان کی سلطنت، لفظوں کو ہیروں کی طرح تراشنا اور ان کو نت نئے مرکبات میں سجا کر ان سے برقی رو پیدا کر لینا ان کا شغل ہے۔ مذہب اور اخلاق کی پاسداری، مروت اور وضعداری سے لگاؤ اور اس کے ساتھ ساتھ کائنات اور اس کی اقدار کو ایک ضابطے اور نظام کا پابند مان کر گردش زمین سے سیاروں کا نغمہ، Music of the Spheres سن لینے کی کاوش۔ سبھی کچھ وکٹورین ہے لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب لفظوں کا غلام نہیں، تہذیب اور معاشرت کو سجانے والے خیالات اور اقدار کا وسیلہ ہے اسی لیے الفاظ "ماورائے سخن بھی اک بات" کو ادا کرتے ہیں، محض بازی گری اور رعایت لفظی کا ذریعہ نہیں بنتے۔

الفاظ کی یہ مزاج دانی، ان کی آواز، سنگیت، تصویر اور کردار نگاری کی صلاحیت سے کام نکالنا دراصل رشید صاحب کی اس خوش ذاقی کی دلیل ہے جو ان کے نزدیک زندگی کی اصل روح ہے وہ کڑھے ہوئے ذوق سلیم کے قائل ہیں جہاں وہ زندگی کی اور لطافتوں کو عزیز رکھتے ہیں وہیں حسن بیان کے بھی قدر دان ہیں، مزاح انھیں اسی لیے عزیز ہے کہ وہ اجتماعی برکتوں کا ضامن ہے وہ جہاں کہیں کوئی بڑی بدنمائی دیکھتے ہیں اسے ہنسی ہنسی میں ٹوک ضرور دیتے ہیں تاکہ ضمیر تہذیب مجروح نہ ہو یہ محض خوش ذوقی نہیں اجتماعی ذمہ داری کا نشان ہے۔ اندرے ژید نے کہا تھا کہ ہر حال میں خوش رہنا محض طبعی احتیاج ہی نہیں اجتماعی ذمے داری ہے

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

گیت

سجنی! پھیکے پڑ گئے گیت
جیون ہے تو غم سے جیون
لاج کی زنجیروں کے بندھن
بنا جیوت کیا کرنا درشن
مکھ میں گیت نین میں ساون
بس دن کی یہ ریت
پیار میں کیا تقدیر کی آشا
نین کی آشا نیر کی آشا
چپ چپ اک تصویر کی آشا
کچھ ہے اگر تو پیر کی آشا
یاد ہی من کی میت
مانجھی کو پتوار کا ڈر ہے
طوفاں کو منجدھار کا ڈر ہے
کشتی کو اُس پار کا ڈر ہے
یار کو اپنے یار کا ڈر ہے
کتنی اُلٹی نیت
دُور کہیں کوئی پنچھی بولے
امرت کا رس جی میں گھولے
بیکل دھک دھک نیّا ڈولے
کہہ بھی رہا ہے پی کا ہولے
پریت کی ہار ہے جیت
سجنی! پھیکے پڑ گئے گیت

بیکل اُتساہی
سول لائن - بلرام پور
گونڈہ (یوپی) ۲۷۱۲۰۱

دکھی دکھی سی یہ تنہائیاں

ہمارے گاؤں میں اک سانپ
اک سپیرا تھا
اُبال پہ تھا کسی رات
باڑھ کا پانی
تمہارے شہر میں
پانی بہا کے لایا تھا!

اب اس کی بین میں جادو بھری صدا نہ رہی
اب اس کے زہر میں تریاقِ زندگی نہ رہا
خرید لیتے دکانوں سے وصل کا موسم
پہ اپنے جیب میں اب سکۂ خوشی نہ رہا

وہ دن وہ رات
وہ کٹیا وہ سونی پگڈنڈی
چہار سمت بنا دی گئیں
نئی سڑکیں!

دُکھی دُکھی سی یہ تنہائیاں کہاں جائیں
گھٹی گھٹی سی یہ شہنائیاں کہاں جائیں
اُداس پیڑ کی پُروائیاں کہاں جائیں

ہمارے گاؤں میں اک سانپ
اک سپیرا تھا
اُبال پہ تھا کسی رات
باڑھ کا پانی
تمہارے شہر میں پانی بہا کے لایا تھا!

ایم کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر "اشتراک"، قاضی پور خورد
گورکھ پور

پروفیسر سید محمود الحسن
لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

پنڈت آنند نرائن مُلّاؔ

پنڈت آنند نرائن مُلّاؔ کی موت سے اس عظیم شعری روایت کا خاتمہ ہوگیا جس کا سلسلہ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ، رتن ناتھ سرشارؔ اور برج نرائن چکبستؔ نے قائم کیا تھا اور بیسویں صدی کے لکھنوی شعرا کا وہ دور بھی ختم ہوگیا جس میں آرزوؔ، صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، یگانہؔ، اثرؔ، سراجؔ، سالکؔ — ہر ایک اپنے مخصوص و انفرادی رجحان کے زیرِ اثر اُردو شاعری کے سرمائے کو وسعت دے رہا تھا۔ البتّہ ان کی انفرادیت کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس میں قدیم مشرقی روایات کے ساتھ مغربی ادب کے اعلا عناصر بھی شامل تھے۔ یہ امتزاج ادبی قدروں کے علاوہ شخصیت میں بھی موجود تھا۔ البتّہ لکھنوی تہذیب و شرافت، کردار کی بلندی، دانشوری کے ساتھ انکساری علم کا وقار، ادیب کی خودداری، حق و انصاف اور اعلا تہذیبی تقاضوں کی اشاعت و تبلیغ کا جذبہ۔ ان میں یہ تمام ایسے عناصر بھی موجود تھے جس سے احساس ہوتا تھا کہ وہ جتنے بڑے فن کار ہیں اتنے ہی بڑے انسان۔ چنانچہ ان کی مقبولیت میں یہ دونوں اثرات شامل ہیں۔

پنڈت آنند نرائن ملّاؔ ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ کے معزز اور اعلا خاندان میں پیدا ہوئے اور جب ان کا شعور بیدار ہوا اس وقت ملک کی سیاسی، سماجی اور ادبی فضا میں مختلف اور متضاد قسم کے رجحانات پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف انھوں نے اودھ کے اس ماحول میں پرورش پائی جس کی تہذیبی زندگی اپنی عظمت کی قدیم روایات کو سینے سے لگائے تھی۔ دوسری طرف ہندستان کے عوام پستی، غلامی اور ذلت و حقارت سے اپنے کو باہر نکالنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں قومیت کا تصور پیدا ہونے لگا تھا۔ ان تمام عناصر سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے لیے ایک مخصوص انداز اپنا لینا شاعری کا بہت بڑا کمال ہے اور اسی چیز نے مُلّاؔ کے فن کو رفعت و عظمت تک پہنچا دیا۔

ملّاؔ نے ۱۹۲۶ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی، اس وقت ایک طرف حالیؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، سرورؔ جہان آبادی اور جوشؔ وغیرہ کی نظمیں مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔ دوسری طرف شاد عظیم آبادی حسرتؔ، فانیؔ کی غزل گوئی دلوں کو متاثر کیے ہوئے تھی اور اسی منزل پر لکھنؤ کے غزل گو شعرا میں صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ اور یگانہؔ قدیم روایات کو کسی نہ کسی شکل میں آگے بڑھا رہے تھے۔ مُلّاؔ کی انفرادیت اور ان کے شعور کی پختگی نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ محض ایک رجحان یا ایک شعری روایت تک اپنے کو محدود کرلینا مفید نہ ہوگا اور اسی احساس نے ان کو عظمت کی منزل تک پہنچا دیا۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول سے مُلّاؔ نے فنی تصوّر اپنایا اور سیاسی اور سماجی اثرات، بدلتے ہوئے حالات اور ادب کی اعلیٰ قدروں کے امتزاج سے اُردو شاعری کو گراں قدر سرمایہ دے دیا — ابھی ملّا کی شاعری کی ابتدا کو دس ہی سال گزرے تھے کہ ترقی پسند تحریک نے شعر و فن میں ایک مخصوص نظریے کی تبلیغ کی۔ ملّاؔ اس نظریے سے بھی متاثر ہوئے لیکن کسی جگہ اس کی شدّت کا شکار نہ ہوئے بلکہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر پر سختی سے قائم رہے۔ اس طرح جتنے بھی تجربات سامنے آئے انھوں نے اس کے صحت مند عناصر کو قبول کیا۔ لیکن جذباتی شکل میں کسی کو اپنے سے وابستہ نہ کیا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لیکن مختصراً اس طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ ان کے خیال میں شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ البتّہ اس میں افکار و ذہن کے عناصر کا

ساتھ بھی ہونا چاہیے ۔ وہ فن میں خلوص، مقصد کی بلندی اور فنی حسن کے قائل بھی ہیں اسی چیز کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

"میرا اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ جس ادب میں انسانی
درد کی آواز نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے
لیے سامان فراہم کر سکتا ہے لیکن دل و دماغ کی
تربیت نہیں کر سکتا ۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا
ہوتی ہے اور عظمت انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے"۔

اسی طرح انھوں نے شاعری میں پائندہ انسانی قدروں کے اظہار پر جگہ جگہ زور دیا ہے لیکن ان کے خیال میں اس سے نشاط و تسکین اور ذہنی و جذباتی آسودگی حاصل ہونا بھی ضروری ہے ۔ ایسا ہی ادب تمام نوع انسانی کے لیے ہو سکتا ہے لیکن ان تصورات کے باوجود ملا کسی نظریے کے اپنانے کو غیر صحت مند سمجھتے ہیں ۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اچھا ادب بنیادی طور پر بامقصد ہوتا ہے لیکن اگر کسی مقصد کو سامنے رکھ کر ادب پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش تخلیق ادب کے لیے غیر مفید ہوگی ۔ ان کے خیال میں :

فن کار جہاں نظریوں میں گھر جاتا ہے اس کے
دل کے سوتے محدود ہو کر خشک ہونے لگتے ہیں اور
اس کی قوتِ تخلیق اپنی معصومیت، حسن اور وسعت
کھونے لگتی ہے"۔

ملا نے مغربی شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا، فن کی اعلیٰ قدروں سے بخوبی واقف تھے ۔ جدید رجحانات پر ان کی گہری نظر تھی اور ان سب کے باوجود وہ کسی ایسی جدت کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے جو منفی پہلوؤں کا احساس دلائے ۔ وہ معنویت، حسن اظہار اور افکار و خیالات کی آمیزش فن کا لازمی جز سمجھتے ہیں اور ہر اس انداز کے شدید مخالف ہیں جو محض انفرادی جذبے کی ترجمانی کرے یا مبہم اور غیر واضح جذبات کا احساس دلائے اسی چیز کو انھوں نے بہت دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" میرے نزدیک یہ رجحان (رمزیہ انداز) غیر صالح
ہے اور گمراہ کن بھی ..... میری رائے میں نظم کو
معمہ بنا دینا کمال فن کار نہیں بلکہ عجز فن کار ہے ...
میرے نزدیک اس مکتبۂ خیال کے اندازِ فکر
میں جو بنیادی لغزش ہے وہ یہ ہے کہ شاعر اپنے
احساسات کو اپنے شعور سے جدا کر کے اپنے لاشعور
کی زبان میں پیش کرنا چاہتا ہے"۔

ان تصورات کو سامنے رکھ کر ملا نے جب شعری تخلیق کی طرف قدم اٹھایا تو نظم اور غزل دونوں میں توانائی اور نور و نکہت بھر دیا ۔ جوئے شیر ۔ کچھ ذرے کچھ تارے ۔ میری حدیث عمر گریزاں سیاہی کی ایک بوند ۔ ان کے تمام شعری مجموعوں میں یہ خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں ۔ ان کی نظموں میں وطن کی محبت کے ترانے بھی ہیں، قومی رہنماؤں کی عظمت کے گیت بھی، سماجی زندگی کی کش مکش بھی ملتی ہے اور رومان اور حسن کی پرکیف فضا بھی ۔ اور اس جذبہ اور فکر کے امتزاج نے ان کے مخصوص انداز کو ہر جگہ برقرار رکھا ہے ۔ "گنگا کے چراغ" ۔ "انسان" ۔ "تم مجھے بھول جاؤ گے" ۔ دوشیزہ کا راز ۔ "موتی لال نہرو" ۔ "جواہر لال نہرو" "جہاں میں ہوں" ۔ "زمین وطن" ۔ "تم" ۔ "ٹھنڈی کافی" ۔ "قحط کلکتہ" "جادہ امن" ۔ "گل کردو قمر کو" ۔ "گمراہ مسافر" وغیرہ نظموں میں انکی خصوصیات آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں ۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ملا بڑے نظم گو ہیں یا بڑے غزل گو ۔ وہ غزل کو اردو ادب کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ۔ اردو زبان کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر" سمجھتے ہیں اس خیال سے کبھی غافل نہ رہے ۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے پرکیف جذبات اور بلند خیالات کی ترجمانی سے اسلوب کی ندرت پیدا کر دی ۔ یہاں تک کہ ان کا لہجہ مخصوص رنگ اختیار کر گیا ۔ ان میں سیاسی تصورات، زمانے کے مسائل اور داخلی و خارجی کیفیات ان تمام عناصر کا دل کش امتزاج ملتا ہے ۔ انھوں نے اپنی شعری خصوصیات کی طرف ان اشعار میں خود اشارہ کر دیا ہے ؎

میری کوشش ہے کہ شعروں میں سمو دوں ملا
صبح کا ہوش بھی دیوانگی شام کے ساتھ

غزل اک نام تھا ناکامیوں پر سینہ کوبی کا
مرے پہلے یہ بانگ کاروانِ زندگی کب تھا

اور حقیقت یہ ہے کہ ملک کے نئے نئے مسائل، عمومیت اور عوام کے دُکھ درد شامل کر کے غزل کو گُل و بُلبُل اور حسن و عشق تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غیر معمولی وسعت بخش دی۔ چند اشعار کی مثالوں سے ان خصوصیات کو آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے۔

غمِ حیات، شریکِ غمِ محبّت ہے
ملا دیئے ہیں کچھ آنسو مری شراب کے ساتھ

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائیگاں کر دی
قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فُرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی نہ ملی

ان اشعار میں حسن و لطافت کے ساتھ زندگی کے مسائل اور فلسفیانہ خیالات کے جو پہلو ملتے ہیں اس نے اُردو غزل کو غیر معمولی وسعت بخش دی۔ مُلّا کو اُردو زبان سے عشق تھا۔ اس زبان کے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی تھی۔ وہ شدّت سے اس کے خلاف ہر جگہ آواز بلند کرتے تھے۔ نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے اُردو کا علم اٹھائے رکھا۔ اور زندگی کے آخری لمحہ تک اس کے قائل رہے کہ اس کے ذریعے قوم کو بقا اور تہذیبی زندگی کو استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کے جذبات کی بے چینی و بے قراری کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

مُلّا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اُردو زباں کبھی

لبِ مادر نے مُلّا لوریاں جس میں سُنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

غرضیکہ مُلّا کی نظم میں اور غزل میں ہر جگہ انسان کی عظمت حرکت، عمل اور جذبہ و احساس کے عناصر ملتے ہیں جس نے ان کی شاعری میں انفرادیت پیدا کر دی اور پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں:—

"مُلّا کی شاعری اکثر جذبہ و ذہن دونوں کو آسودگی بخشتی ہے ان کے صاف شفاف اور ذکی الحس اور انسانی دکھ درد کے تصوّر سے خون ہو جانے والے دل دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے اس رنگ میں ان کے حریف مشکل ہی سے ملیں گے۔"

مُلّا کی موت نے اُردو شاعری میں بھی خلا پیدا کر دیا ہے اور اُردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے جدّوجہد کرنے والوں کی صفوں میں بھی:

اک موت کا جشن منالیں تو چلیں
پھر اشک پونچھ کے مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مشقِ اُردو
اک آخری راگ اور گالیں تو چلیں

□□

نعت

بلا کے پیچ و خم تھے زندگی بچ کر چلی آئی
کہ بس قسمت ہے وہ سرکارؐ کے در پر چلی آئی

کہاں کی تشنگی جب اک کرن امیدِ فردا کی
مرے دل میں بنامِ ساقیِ کوثر چلی آئی

جو ذکرِ سیدِ کونینؐ سے سرشار رہتی ہے
وہ اک موجِ رواں میری طرف اکثر چلی آئی

دُعا بن کر خلیلؑ اللہ کی، مژدہ مسیحا کا
نبوّت آپ تک اے شافعِ محشر چلی آئی

کبھی تنہا تصوّر میں درِ اقدس نہ جا پایا
ہمیشہ چپکے چپکے میری چشمِ تر چلی آئی

خیال آیا جو شانِ رحمۃً للعالمینؐ کا
وہ اپنے ساتھ لے کر اَن گنت منظر چلی آئی

یقیں آیا کہ میری سمت ان کی چشمِ رحمت ہے
سنہری جالیوں کو فکر جب چھو کر چلی آئی

اندھیرے راہ میں حائل کبھی ہونے نہیں پائے
مدینے سے ہمیشہ روشنی بڑھ کر چلی آئی

دُرودِ پاک کا یہ مشغلہ بھی خوب کام آیا
کہ دنیا خیر و برکت کی ہمارے گھر چلی آئی

رباب رشیدی

۱۳۶ - تاری خانہ لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

غزل

وفا کے مہر و محبّت کے، دوستی کے چراغ
محاورے میں ہمارے یہی ہیں گمی کے چراغ

کیا گیا ہمیں تخلیق ہی اسی کے لئے
جلائیں دہر میں عرفان و آگہی کے چراغ

اس انجمن کو فروغِ حیات سے کیا کام
جہاں دلوں میں نہ روشن ہوں دوستی کے چراغ

وہی تو موت کی سرحد ہے جسم و جاں کے لئے
جہاں پہ بجھتے ہیں تہذیبِ زندگی کے چراغ

جہاں میں بس یہی معراجِ آدمیت ہے
قدم قدم پہ فروزاں ہوں آشتی کے چراغ

بصیرتوں کے خزانے کا راستہ تو سحر
دکھانے والے ہیں بس سیرتِ نبیؐ کے چراغ

سید احمد سحر

خلیل غربی۔ شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱

پروفیسر گیان چند
اندرا نگر۔ لکھنؤ

آہ! تاراچرن رستوگی

ہمارے دور میں ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کی زندگی کے آخری ایام بے کس پرسی کے عالم میں ان کی موت جتنی دردناک رہی ہے اس کی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ کئی ماہ تک اردو دنیا کو ان کے انتقال کی خبر ہی نہ مل سکی۔ میں سلسلے وار بیان کرتا ہوں:

وہ ۱۶ مئی ۱۹۱۰ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ رستوگی بنیوں کی ایک ذیلی ذات ہے۔ تاراچرن ۱۹۴۲ء کی 'ہندستان چھوڑو تحریک' میں سرگرمی سے فعال رہے یعنی چند دوستوں کے ساتھ مل کر بریلی کے محافظ خانے کو آگ لگادی۔ دو انگریز افسروں کو گولی سے مار دیا۔ دہلی سے مغل سرائے جانے والی ٹرین کو پٹری سے اتار دیا۔ اس کے باوجود مجاہدینِ آزادی کی پنشن کے لیے درخواست نہ دی۔ ڈاکٹر رستوگی چار مضامین: انگریزی تاریخ، معاشیات اور فارسی میں ایم، اے تھے۔ انگریزی میں ۱۹۶۷ء کے قریب پی ایچ. ڈی کی۔ موضوع تھا۔ اقبال پر مغربی اثرات۔ میں اُن کا ایک ممتحن تھا، جموں سے گوہاٹی جاکر ان کا زبانی امتحان لیا۔ وہ شاعری کرتے تھے، طاہر تخلص تھا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے شاگرد تھے، بہ حکمت کے صحبت یافتہ تھے۔ ڈاکٹر اقبال سے دوبار ملے' انھیں اپنی دو فارسی نظمیں اصلاح کے لیے بھیجیں، علامہ نے انھیں واپس کر دیا کہ اصلاح کی ضرورت نہیں۔

رستوگی آسام کالجیٹ سروس میں منتخب ہو گئے، جہاں کئی پوسٹ گریجویٹ کالجوں کے پرنسپل رہ کر جون ۱۹۷۰ء کو ریٹائر ہوئے گوہاٹی میں مکان بنا کر وہیں بس گئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء کو ایک غیر معمولی لیے سے دوچار ہوئے۔ مکان پہاڑی کی تلیٹی میں تھا۔ رات کو مٹی کا ایک ٹیلہ کھسک کر اس پر آگرا۔ دو تہائی مکان دب گیا اور گھر کے چار افراد جان سے جاتے رہے: ان کی بیوی (جو ایک کامیاب ڈاکٹر تھیں)، ایک بیٹا، ایک بیٹی اور بیٹے کی اہلیہ۔ ایک لڑکا بچا ہے جو مرگی کا مریض ہے اور آٹو رکشا چلاتا ہے۔

اس سانحے کے بعد سے رستوگی کی مالی حالت زار ہو گئی کار بک گئی، ٹیلیفون جاتا رہا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے اور اس پر ستم یہ کہ کینسر کا مرض لاحق ہو گیا جس نے بہت اذیت پہونچائی۔ کتابوں کی رائلٹی، بہی خواہوں کی اعانت اور اشیائے خانہ کو بیچنا، یہی ان کا وسیلۂ گزر اوقات تھا۔

انگریزی میں ان کی کئی کتابیں چھپی ہیں۔ اردو میں مضامین کا ایک مجموعہ "تنقید و تبصرہ" ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ وہ اقبالیات کے ماہر تھے۔ انگریزی، اردو، فارسی اور ہندی ادبیات نیز سوشالوجی، اینتھروپالوجی، پولیٹیکل سائنس، معاشیات، تاریخ، تقابلی مذہبیات اور تقابلی ادب پر لکھتے رہتے تھے۔ اسلامیات، بالخصوص تصوف میں ان کی گہری نظر تھی۔ اس موضوع پر انگریزی میں دو ایک کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے قبلہ علی میاں سے اچھے مراسم تھے جس کے سبب ندوہ لکھنؤ میں مہمان ہوتے تھے۔

میں نے ان کے لڑکے کو جوابی کارڈ لکھ کر ان کی تاریخ وفات اور وقت دریافت کیا۔ جواب کے مطابق ان کا انتقال ۵ فروری ۱۹۹۷ء کو دوپہر ڈھائی بجے ہوا۔ ۲۵ فروری کی تاریخ غلط ہے۔ میں اس تحریر کو ان کے ایک مکتوب بنام مقصود الٰہی شیخ، مدیر ''راوی'' بریڈفورڈ انگلستان مورخہ ۲۴ جون ۱۹۹۶ء کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

"... معالجے کے لیے اب کچھ باقی ہی نہیں بچا ہے اور ضروریات زندگی کی کفالت کے لیے جو کچھ فروخت کر سکتا تھا، کر ڈالا۔ نجی لائبریری ۲۴ ہزار کتابوں پر

(باقی ص [illegible] پر)

افسانہ

ڈاکٹر بشیشر پردیپ
اے ۵۵۵ - اندرا نگر لکھنؤ

دِل والے

اُن دونوں کو قلمی دوست بنے ایک برس ہو رہا تھا۔

اس ایک برس میں سرشانت نے میگھا کو صرف چھ خط لکھے تھے لیکن میگھا نے اسے بارہ سے بھی زیادہ لکھے تھے یعنی ہر مہینے میں ایک یا دو خط۔ ان خطوں کے ذریعہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان گئے تھے۔

بنارس کا رہنے والا سرشانت جب ایم اے فائنل ایر کا طالبعلم تھا تو اسے ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔ ایک بچے کو، جو سڑک کے بیچ میں آگیا تھا، ایک ٹرک کی زد سے بچاتے ہوئے اس کی اپنی ٹانگیں بُری طرح کچل گئی تھیں۔ اسپتال سے لوٹا تو اس کی ٹانگیں بے کار ہو چکی تھیں۔ لیکن زندگی میں کچھ کر گزرنے کی خواہش نے اس کی ہمت کو برقرار رکھا اور اس نے ایم اے کا امتحان بھی دے دیا اور اچھے نمبروں سے پاس بھی ہو گیا۔

اس نے پہیوں والی ایک اسٹریچر نما کرسی بنوالی، جس کی پشت کو لیور کی مدد سے تھوڑا سا پیچھے کر کے وہ اسے آرام دہ بنا لیتا اور جب چاہتا اسے چلا کر کہیں بھی لے جاتا، اور پھر وہاں اتر کر بیساکھیوں کا سہارا لے لیتا ـــــ کالج کے دنوں ہی میں اسے سماجی کاموں میں دل چسپی ہو گئی تھی۔ اب اس معذوری کی حالت میں بھی اس نے انہی سماجی کاموں میں اپنا دل لگایا ـــ اس کا سماجی کام شہر میں بھی تھا اور آس پاس کے گاؤں میں بھی ـــــ شہر میں وہ ایک ایسی انجمن کا سربراہ تھا جس کے تحت بے روزگار نوجوانوں کو دست کاری سکھائی جاتی تھی تاکہ وہ اپنا کوئی نجی کاروبار کر سکیں۔ اور اب تک تقریباً ایک ہزار نوجوان اس سے مستفید ہو چکے تھے ـــ گاؤں میں اس کا کام تھا بچوں کی تعلیم کا انتظام ـ وہاں کے لوگوں کو صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے روشناس کرانا۔ باڑھ یا کسی اور قدرتی آفت کے شکار لوگوں کی مدد کرنا۔

اس کے ماں باپ اسے بچپن ہی میں چھوڑ گئے تھے۔ اس کا سگا بھائی بہن بھی کوئی نہ تھا۔ تین کمرے کے ایک مکان کے علاوہ ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا بھی اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس نے وہ زمین بیچ دی اور کتابوں کی ایک دکان کھول لی۔ اور اسے چلانے کے لیے ملازم رکھ لیے۔ اول تو اسے سماجی کاموں سے فرصت ہی نہ ملتی ـ کبھی ملتی بھی تو اپنی دکان سے لائی ہوئی کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔

اور ایک دن سماج سیوا کے ساتھ ساتھ اسے ادب کی سیوا کا خیال آگیا ـ اگرچہ وہ خود ادیب نہ تھا، اس نے ایک ماہنامہ نکالا اور یہ طے کر لیا کہ اس کے پرچے میں چھپنے والے ہر شاعر یا ادیب کو معقول معاوضہ دیا جائے گا چاہے اس کا بوجھ اس کی جیب پر ہی کیوں نہ پڑے ـــــ اور رسالہ چل نکلا۔ اور اس سے معقول آمدنی بھی ہونے لگی ـ اپنے اسی رسالے میں اس نے قلمی دوستی کے کالم میں چھپا قلمی دوست بنانے کے لیے اشتہار پڑھا جو کان پور میں رہنے والی ایک جرنلسٹ لڑکی میگھا پانڈے کی طرف سے تھا۔

میگھا پانڈے کان پور ہی میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ گریجویشن کرنے کے بعد اس نے جرنلزم کا کورس کیا اور اب بہ حیثیت جرنلسٹ اپنی پہچان بنانا چاہتی تھی۔

سرشانت کے رسالے میں اس نے قلمی دوست بنانے کے لیے اشتہار پڑھے تو اس کے دل میں بھی قلمی دوست بنانے کی خواہش پیدا ہوئی اس سے پہلے اس نے کبھی کوئی قلمی دوست نہیں بنایا تھا

پہلے تو اس نے ارادہ کیا کہ کسی اشتہار کے جواب میں خط لکھ دے لیکن پھر سوچا کہ اس کا خط تو اشتہار دینے والے کے پاس جواب میں آئے ہوئے کئی خطوں میں سے ایک خط ہوگا۔ اشتہار دینے والا اس کے خط کو منتخب کرے یا نہ کرے اس کی مرضی ہوگی۔ اور اگر وہ خود اشتہار دے گی تو جواب میں اس کے پاس کئی خط آئیں گے اور ان میں سے وہ جن خطوں کو چاہے گی قلمی دوست بنانے کے لیے منتخب کر لے گی۔

اور جب میگھا پانڈے کو اپنے اشتہار کے جواب میں پورے دس خط ملے تو اس نے صرف سرشانت کا خط ہی منتخب کیا، جو نہایت مختصر تھا۔ سرشانت نے اپنے بارے میں لکھا تھا۔

" وہ ایم اے پاس ہے۔ عمر ۳۵ برس ہے۔ کتابوں کا اپنا کاروبار ہے لیکن سماج سیوا اس کی زندگی ہے۔ ایک حادثہ میں اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہو گئی ہیں۔ لیکن اس کی یہ معذوری اسے سماج سیوا سے روک نہیں سکی۔"

اس مختصر سے خط میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ میگھا نے اسے اپنا پن فرینڈ بنالیا۔ دوسرے ہر خط والے نے اپنی کسی ہابی کا ذکر کیا تھا۔ پینٹنگ، شاعری، افسانہ نگاری، اسپورٹس، ریڈنگ، فلمیں دیکھنا وغیرہ۔ سرشانت کا خط اسے دوسرے سب خطوں سے مختلف نظر آیا۔ اس وقت اس کے اندر ایک خواہش یہ بھی جاگی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ عمر والے شخص سے ہی دوستی کرے گی۔ اس کے تجربے کا فائدہ اٹھائے گی۔

میگھا نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ جرنلزم کے علاوہ اُسے شاعری سے بھی دلچسپی ہے اور دو چار نظمیں، دو چار غزلیں اُس نے کہی بھی ہیں۔ سرشانت نے اسے اپنی نظم بھیج دینے کے لیے لکھ دیا۔ اور پھر اس نے میگھا کی نظم کو رسالے کے ایڈیٹر کے حوالے کر دیا۔ نظم اچھی تھی۔ ایڈیٹر نے چھاپ دی، اور ساتھ میں اس کی تصویر بھی، جو میگھا نے سرشانت کو اپنے دوسرے خط کے ساتھ بھجوائی تھی۔ سرشانت نے وہ پرچہ ایڈیٹر کے خط کے ساتھ اسے بھجوا دیا۔ یہ اسکی پہلی نظم تھی جو رسالے میں چھپی تھی۔ اپنی نظم، اس کے اوپر اپنا نام اور ساتھ میں اپنی تصویر دیکھ کر اسے بے انتہا خوشی ہوئی۔ ساتھ میں ایڈیٹر کی طرف سے ایک اور نظم کی فرمائش بھی تھی۔ یعنی اب وہ شاعرہ بن گئی تھی۔!

جب میگھا نے سرشانت کو اپنی تصویر بھجوائی تھی تو جواب میں اس کی تصویر بھی منگوا بھیجی تھی۔ لیکن سرشانت نے اب تک اسے اپنی تصویر نہیں بھجوائی تھی۔ میگھا نے اسے کئی بار تصویر بھجوانے کے لیے لکھا، لیکن ہر بار سرشانت ٹال گیا۔ وہ جواب میں لکھ دیتا:

" دیکھو میگھا! میں سچ کہہ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے میں نے اپنی کوئی تصویر نہیں کھنچوائی، کسی نے تصویر دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی۔ اور میں خود اپنی تصویر آئینے میں دیکھ لیتا ہوں۔ کسی کی صحیح اور سچی تصویر آئینے سے زیادہ کون بتا سکتا ہے"۔

اور کبھی لکھ دیتا۔

" اچھا میگھا! اگر تم چاہتی ہو تو جلد ہی اپنی تصویر بھجوا دوں گا"۔

اور جب خط و کتابت کو ایک برس ہو گیا اور سرشانت نے اپنی تصویر نہ بھجوائی تو اس کے دل میں سرشانت کی تصویر دیکھنے کی خواہش اور بھی شدید ہو گئی۔

اس نے خط میں لکھ دیا۔

" آپ اپنی تصویر نہیں بھجواتے تو نہ بھجوایئے۔ میں اب تصویر کے لیے لکھوں گی ہی نہیں"۔

تو سرشانت نے اسٹریچر نما کرسی پر نیم دراز لیٹے، چند ساتھیوں سے گھرے اپنی ایک تصویر بھجوا دی جو حال ہی میں کسی اخبار میں چھپی تھی۔

میگھا نے جب تصویر دیکھی تو اس کی پہلی نظر سرشانت کے چہرے پر گئی جو یقیناً دلکش تھا۔ لیکن جب اس نے اسے اپنے ساتھیوں کے بیچ یوں نیم دراز لیٹے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ سرشانت نے تو اسے اپنے پہلے خط میں ہی اپنی ٹانگوں کے بارے میں لکھ دیا تھا لیکن اُس وقت اس نے اس بات کو اتنا محسوس نہیں کیا تھا جتنا کہ اب تصویر میں اس کی حالت دیکھنے کے بعد۔۔۔ اتنا خوش شکل انسان اور اتنا معذور! اُف!۔۔۔ اور جب وہ سنبھلی تو اس کی نم آلود آنکھوں میں سرشانت کے لیے عقیدت جھلک رہی تھی۔

سر شانت کی تصویر دیکھنے کے بعد اچانک اس کے دل میں اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور دوسرے ہی دن اس نے والدین کو بتایا کہ وہ بنارس جا رہی ہے اپنے ایک قلمی دوست سر شانت سے ملنے۔ دو تین دن رہے گی وہاں ــــ اُس کا اتہ پتہ پوچھنے کے بعد والدین نے اجازت دے دی۔

جب وہ بنارس پہونچی تو سر شانت نرسنگ ہوم میں داخل تھا۔ اُسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔

میگھا جب نرسنگ ہوم میں اس کے کمرے میں پہنچی تو اس وقت سر شانت اکیلا نہیں تھا۔ اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسیوں اور ایک بنچ پر اس کے کچھ ساتھی بیٹھے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو کسی گاؤں میں جانے کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا، جہاں پر کہ باڑھ آئی ہوئی تھی۔

میگھا اندر داخل ہوئی تو اس کے ایک ساتھی نے بنچ پر ذرا سا کھسک کر اس کے لیے جگہ بنا دی۔ سر شانت نے نہ تو اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور نہ ہی بنچ پر بیٹھتے۔ لیکن وہ جہاں پر بیٹھی تھی وہاں سے اسے سر شانت کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اسے بلا کی طمانیت، سکون اور ارادے کی پختگی نظر آئی۔ کبھی وہ سوچتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتا، اور ناک کے اوپر ماتھے کو انگلیوں سے سہلانے لگتا۔ کبھی سر پر ہاتھ پھیرنے لگتا اور کبھی اپنے ساتھیوں کو اس باڑھ سے گھرے گاؤں میں لے جانے والی مختلف چیزوں کے بارے میں تاکید کرنے لگتا۔ میگھا دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی جیسے وہ بھی اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرح اس سے ہدایات لے رہی ہو ــ! آدھے گھنٹے بیٹھنے کے بعد وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے اور میگھا اکیلی بیٹھی رہ گئی ــ جونہی وہ ہاتھ کے سہارے سے تھوڑی سی کروٹ بدلنے لگا، وہ غیر شعوری طور پر اٹھی اور کروٹ بدلنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

سر شانت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ ؟" اور پھر ایک دم پہچان کر بولا۔

"تم ـــ ؟ میگھا ـــ ؟ تم کب آئیں ـ ؟"

"بس ـ آدھا گھنٹہ پہلے۔"

"تو بتایا کیوں نہیں ـ ؟"

"آپ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے میں اتنے مصروف تھے کہ میری ہمت نہیں ہوئی آپ سے بات کرنے کی ـــ پہلی بار آپ سے ملی ہوں ـــ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ـ کیسے بات کروں ـ میں نے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔"

سر شانت مسکرا دیا۔

"کب آئیں بنارس ـ ؟"

"آج صبح کی گاڑی سے۔"

"یوں اچانک ـــ لکھا ہی نہیں۔"

"آپ کی تصویر ملی تو دل چاہا آپ سے مل آؤں۔"

"اوہو ـ تصویر سے میں مختلف تو نہیں لگا نا ـ ؟"

"لگتے ہیں ـــ کچھ کچھ ـــ تصویر سے میں یہ نہیں جان پائی تھی کہ آپ میں اس قدر قوّتِ ارادی ہے۔"

"اچھا ـــ تو محترمہ میری تعریف کرنے آئی ہیں ـ! چلو ایسے ہی سہی ـ کچھ کھایا پیا کہ نہیں ـ ؟"

"ارے آپ کے نوکر نے سب سے پہلے ناشتہ ہی تو کرایا ـ یہ بتانے کے بعد کہ آپ نرسنگ ہوم میں بھرتی ہیں، اس نے ناشتہ کروایا، اور پھر نرسنگ ہوم کا پتہ بتایا۔"

اور اس کے بعد میگھا نے سر شانت کو اسی وقت بتا دیا کہ وہ آئی تو تھی دو دن کے لیے لیکن اب وہ واپس تب ہی جائے گی جب اُسے نرسنگ ہوم سے چھٹی مل جائے گی ـــ سر شانت انکار نہ کر سکا، اور میگھا وہیں رُک گئی۔

میگھا جب ایک ہفتے کے بعد بھی گھر واپس نہیں گئی اور نہ ہی اس نے کوئی ٹیلیفون کیا یا خط لکھا ـــ تو اس کے پاپا بنارس پہونچ گئے۔ میگھا کے بتائے ہوئے سر شانت کے پتے پر ـــ جیسا کہ اُمید تھی، پہلے تو انھوں نے ناراضگی دکھائی ـــــ

"خط نہیں لکھ سکتی تھیں کیا ـ؟ ٹیلیفون ہی کر دیتیں۔"

"پاپا! میں بہت مصروف رہی ـ سچ ـ ہر روز سوچتی تھی ٹیلیفون

کرنے کے لیے یا خط لکھنے کے لیے۔ لیکن وقت ہی نہ ملتا تھا۔ آپ سرشانت سے ملیں گے نا تو آپ بھی جان جائیں گے۔"

اور پھر اس نے انھیں سرشانت کی حالت کے بارے میں بتایا اور وہ ازراہِ انسانیت اس کے ساتھ سرشانت کو دیکھنے کے لیے نرسنگ ہوم چلے آئے ۔۔ جب سرشانت کے کمرے میں پہونچے تو اس وقت بھی سرشانت کے دو ساتھی وہاں موجود تھے۔ میگھا نے ان کا سرشانت سے تعارف کرایا تو سرشانت نے لیٹے لیٹے ہی ذرا جھک کر انھیں پرنام کیا۔ اور ان کے بیٹھ جانے کے بعد اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

میگھا سرشانت کے لیے دلیا اور سوپ بنا کر لائی تھی۔ اس نے سرشانت کو تھوڑا سہارا دے کر بٹھایا۔ اور اس کی پیٹھ کے پیچھے تکیہ رکھ دیا۔ پھر تھرمس سے سوپ نکال کر اسے دیا اور جب وہ سوپ پی چکا تو اسے پیالے میں دلیا ڈال کر دیا۔ پاپا یہ سب دیکھتے رہے کبھی تو انھیں یہ سب اچھا لگتا اور کبھی انھیں یہ دیکھ کر بے چینی ہونے لگتی ۔۔ اتنی بھی کیا سیوا ایک پرائے مرد کی ۔۔!؟"

سرشانت سے پاپا کی بہت تھوڑی سی بات چیت ہوئی ۔ وہ بھی زیادہ تر سرشانت ہی نے جب کوئی بات کی ۔ جب تقریباً ایک گھنٹہ انھیں وہاں ٹھہرے ہو گیا تو یہ سمجھ کر کہ پاپا بور ہو رہے ہیں، میگھا انھیں گھر لے آئی ۔

" آپ نے دیکھا پاپا ۔ میں کتنی مصروف تھی ۔ ؟"

" وہ تو ہے لیکن ۔۔۔۔۔" ان کے دل کی بے چینی عود کر آئی تھی

" یہ بتاؤ کہ تم کب تک رہو گی یہاں ۔ ؟"

انھیں نرسنگ ہوم سے چھٹی تو مل جائے پاپا ۔"

اور پاپا شام کی گاڑی سے واپس چلے گئے ۔۔ لیکن وہ راستے بھر یہی سوچتے رہے کہ اب جلد ہی اس کی شادی کر دینی چاہیے ۔ جو دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں انھیں میں سے مناسب رشتہ دیکھ کر ۔۔

لیکن ۔۔۔ اُن کے وہاں پہونچنے کے پانچویں دن انھیں میگھا کا خط ملا ۔۔

" پیارے پاپا !

سرشانت کو نرسنگ ہوم سے چھٹی مل گئی ہے اس کا بخار بھی جاتا رہا ہے ۔ لیکن ڈاکٹروں نے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے لیے کہا ہے ۔ اس لیے میں ابھی تو نہیں آسکوں گی ۔۔ پاپا ! یہ تو آپ نے بھی دیکھا ہے نا کہ انھیں میری کتنی ضرورت ہے ۔ وہ کتنے عظیم ہیں کہ ایسی حالت میں بھی اپنا سارا وقت سماج سیوا میں لگا رہے ہیں ۔

پاپا ! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں جیون بھر ان کے ساتھ رہوں گی ۔۔ سرشانت تو نہیں مان رہے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میں انھیں منالوں گی ۔

امید ہے کہ آپ بھی میرے اس فیصلے سے متفق ہوں گے !

آپ کی،

میگھا "

□□

رشید احمد صدیقی

صفحہ ۱۳ کا بقیہ

رشید احمد صدیقی کو یاد کرنا اور یاد رکھنا ماضی کے اچھے دنوں اور اعلیٰ کارناموں ہی کو یاد کرنا نہیں ہے بلکہ اسلوب اظہار کی سدا بہار تازگی اور رنگینی سے اپنا دامن بھر لینے کے مترادف ہے۔ وہ اردو نثر کے ایسے ادا شناس ہیں جن سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور جنھوں نے انداز و اسلوب کے نئے پیرائے بخشے ہیں۔

زمانہ گزرتا جائے گا اور زمانے کے ساتھ اس کے تقاضے، ادبی معیار و مباحث بھی تبدیل ہوتے رہیں گے مگر اسلوب کی یہ شگفتگی، اور فکر کی یہ تازگی ایسی نعمتیں ہیں جنھیں زوال نہیں اور انہی کی بدولت مدتوں بعد رشید احمد صدیقی کی یاد زندہ اور تابندہ رہے گی بقول مجروح

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرمِ سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقش پا کہ دلیل راہ گزر نہ ہو

□□

مختصر افسانہ

شمامہ مبارک پوری
بنگلہ دیش

حکایت میں شکایت

مئے کہنہ جب نئے ساغر میں ڈھالی جاتی ہے تو اس کا نشہ دو آتشہ ہوتا ہے چنانچہ پرانی شراب کی بوتل پر نیا لیبل چسپاں کرنے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ باپ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کے ارد گرد پانچ بیٹے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ بچپن کا ایک دوست بھی قریب الموت باپ کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ اس جہانِ فانی میں جب وہ پیدا بھی نہ ہوا تھا تو اس کے والدین ان کے پڑوس میں آ کر بس گئے تھے۔ اس کا جسدِ خاکی یہاں کے آب و گل میں پروان چڑھا۔ وہ بچپن سے ہی پانچوں بھائیوں کے ساتھ کھیل کود اور غم و خوشی میں بھی برابر کا شریک تھا۔ اسکول سے یونیورسٹی تک کی تعلیم کا زمانہ ساتھ گزارا تھا۔ اس گھر میں اس کی حیثیت خاندان کے ایک فرد جیسی تھی۔

بیٹوں کے آپس کے جھگڑوں نے باپ کو قبل از وقت ضعیف اور بیمار کر دیا تھا۔ ان کی اخوت، بھائی چارگی، خلوص اور محبت کے فقدان سے باپ صاحبِ فراش ہو گیا تھا۔ خون کا رشتہ' بے کانگی کے دھاگے کی طرح کمزور سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ باپ کو بیٹوں کی نااتفاقی' سرد مہری' بے مروتی اور خود غرضی اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ تفکر کی شکنیں اس کی پیشانی پر دکھائی دے رہی تھیں۔

اس نے اپنے پانچوں بیٹوں کو اپنے سرہانے بلایا اور کہا:

"میرا چل چلاؤ ہے۔ تم لوگوں کی نااتفاقی سے عدم میں میری روح بے چین رہے گی ــــ میری آرزو ہے کہ تم متحد رہو۔ خوش و خرم اور آرام کی زندگی بسر کرو ــــ مگر تم لوگوں کے اختلاف نے مجھے فکر مند کر دیا ہے۔"

یہ کہہ کر باپ نقاہت سے کھانسنے لگا۔ جب سانس درست ہوا تو بیٹوں سے مخاطب ہوا ــــ

"تم لوگوں نے بچپن میں ایک حکایت پڑھی تھی کہ ایک باپ نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹوں کو ایک ایک دھاگا دے کر توڑنے کے لیے کہا۔ سبھوں نے ایک سکنڈ میں دھاگا توڑ دیا۔ پھر اس نے تمام دھاگوں کو یکجا کر کے توڑنے کے لیے کہا تو کوئی بھی نہ توڑ سکا۔ اس نے بیٹوں کو نصیحت کی کہ ان دھاگوں کی طرح ان کے باہمی اتحاد کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم لوگ باہم متحد رہو۔"

باپ نے بیٹوں کو نصیحت کر کے ان کے دوست سے کہا:

"تمہارا کیا خیال ہے؟ میری نصیحت ان لوگوں کے پلے پڑی یا نہیں کیوں کہ یقین' اتحاد اور عمل پیہم میں استحکام ہے۔"

دوست نے عجز و انکسار سے کہا۔ "آپ جیسے جہاں دیدہ' انصاف پرور' مخلص اور دانا لوگ اب اس دنیا میں کہاں ہیں۔ آپ کا فرمانا بجا ہے۔ میں بھی ان پانچوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور وہ بھی مجھے سگے بھائی کی طرح چاہتے ہیں۔ آپ کی نصیحت بلاشبہ سبق آموز ہے مگر آپ کی حکایت کے ساتھ میں بھی ایک چھوٹا سا قصہ سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"ضرور سناؤ' مجھے سن کر خوشی ہوگی۔" باپ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بکری کے تین میمنے تھے' بکری کو تینوں عزیز تھے۔ تھن میں دو بٹنیاں ہوتی ہیں۔ جب تھن دودھ سے بھر جاتا ہے تو بٹنیوں سے دودھ پیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے دو میمنے دونوں بٹنیوں میں منہ لگا کر خوب دودھ پیتے مگر تیسرے کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ وہ انھیں دودھ پیتا دیکھ کر خوشی میں اپنی دم ہلا ہلا کر صرف ناچتا رہتا تھا۔!!"

□□

ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ حیدری
گورنمنٹ لوہیا کالج۔ چورو
راجستھان

محمود سروش: آئینۂ فنِ شعر میں

محمود سروش کی غزل گوئی پر کسی قسم کی رائے ظاہر کرنے سے قبل اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مزاجاً سروش مضامین و کلام کی نشر و اشاعت اور نام و نمود سے مستغنی واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چالیس پینتالیس سال سے شعر و ادب کی خدمت میں مصروف رہنے اور کلام میں جدّت و ندرت و مہارت شعری کے باوجود کوئی مجموعہ مرتب کرنے کی آخر عمر تک کوشش نہیں کی اور نہ ہی اپنے ہم نواؤں کا کوئی گروہ تیار کیا۔ حالاں کہ وہ چاہتے تو احسن رضوی اور پرتو کی موجودگی میں ہی ایسا کر سکتے تھے مگر انھوں نے اس طرح کا کوئی کام نہیں کیا اس لیے کہ ان کے مزاج میں تملق اور کسی کی بات کو برداشت کرنے کا جذبہ ہی نہیں ہے، وہ برجستہ جملہ چیپاں کرنے اور جواب دینے کے عادی ہیں جس سے اکثر اوقات ان کے قریبی اعزا اور احباب ناراض ہو جاتے ہیں۔ علامہ آرزو کے شاگردوں میں محمود سروش فکری و فنی صلاحیت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں ہر چند کہ وہ علامہ آرزو کے پاس بہت آخر میں پہونچے تھے۔

سروش کے شاگرد ہو جانے کے بعد آرزو صاحب کا قیام بمبئی میں بمشکل تین سال رہا مگر اس مختصر سے عرصے میں سروش نے اپنی ذہانت و ذکاوت کے بل پر وہ مہارت و عبور حاصل کیا جو اکثر کو برسوں کے بعد بھی نصیب نہ ہو سکا اور اس تین سال کے عرصے میں بھی مشق والی غزلوں کے علاوہ طرحی مشاعروں کی غزل پر اصلاح کم ہی لی اور وہ بھی اس طرح کہ علامہ صاحب مصرعہ دے دیتے تھے۔ جب سروش غزل لکھ کر لاتے تو اسے دیکھے بغیر چاک کر کے کوڑے دان میں ڈال دیتے اور کہتے اب جو اشعار یاد ہوں انھیں تحریر کیجیے۔ اور جب سروش انھیں تحریر کر کے ان کے روبرو پیش کرتے تو جو اشعار فنی اعتبار سے بے نقص ہوتے اس کے مقابل ہ کے دو نشان بنا دیتے اور جس میں غلطی ہوتی اُسے دُرست کرتے اور بعد کو سبب بھی بتاتے۔

محمود سروش بلا کے ذہین واقع ہوئے ہیں ہر بات کو ذہن میں گرہ کی طرح باندھ لیتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی ابتدائے شاعری کے واقعات ان کے ذہن میں بالکل تازہ ہیں بہ طور ثبوت ان کے بیان کردہ سیکڑوں واقعات میں سے ایک واقعہ درج ہے:

محمود سروش نے ایک غزل کہی، پاسبانی بھی، ارغوانی بھی اور اسے اصلاح کے لیے علامہ آرزو کے روبرو پیش کیا۔ علامہ نے درج ذیل شعر قلم زد کر دیا ؎

ہوس کی چیرہ دستی سے بچایا ہے ترا دامن
اسی بیتاب دل نے کی ہے تری پاسبانی بھی

سروش کو اس شعر کے قلم زد ہونے پر صدمہ ہوا اور وہ بول اُٹھے
" استاد! اسے آپ نے کیوں کاٹ دیا۔؟ "

علامہ آرزو نے جواب دیا: یہ شعر سوقیانہ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" اس پر محمود سروش نے دبی زبان سے کہا:

" استاد! یہ شعر حقیقت واقعہ پر مبنی ہے۔"

جواب میں علامہ نے کہا۔ " جب دل بیتاب ہوگا تو ہوس کی چیرہ دستی سے دامن کیسے محفوظ رہے گا؟ اگر ہوس کی چیرہ دستی سے دامن محفوظ ہے تو دل بیتاب نہیں ہوگا۔ اس لیے اسے یوں کر لو:

ہوس کی چیرہ دستی سے بچایا ہے ترا دامن
اسی مشتاق دل نے کی ہے تیری پاسبانی بھی

بہر حال یہ تو محمود سروش کی یادداشت کا کمال ہے کہ انھوں نے اس

واقعہ کو یاد رکھتا اور یہ جرأت و ہمت کہ استاد کے سامنے عشقِ حقیقت کو ایک لفظ میں مختصراً بہت ہی پاکیزہ انداز سے بیان کردیا۔ سروش کی زندگی کا یہ پہلو نہایت پر پیچ ہے جس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ایک پہلو نہیں، ایسے کئی پہلو ہیں جو ہنوز تشنۂ تشریح ہیں۔

درج بالا بیانات سے یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ محمود سروش آرزو صاحب کے شاگرد ہیں۔ ان کا کلام زبان و بیان، تشبیہ و استعارہ، محاورہ و ضرب المثل وغیرہ کے محاسن سے مزین ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے مگر ان کی متاعِ شاعری اتنی قلیل نہیں۔ اگر انھوں نے علامہ آرزو کے تتبع پر خالص اردو میں دو درجن سے زائد غزلیں کہی ہیں تو جدید عہد کے تقاضوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے ہر موڑ اور ہر منزل کی تصویر موجود ہے جس کا انھیں خود بھی احساس ہے ؎

برتا تھا میں نے دنیا کو کچھ اس طرح سروش
ہر کیفیت کا ذکر مری شاعری میں تھا

"خالص اردو" علامہ آرزو کی جدت ہے جس میں عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہ ہوں۔ شعر گوئی میں اس قدر احتیاط برتنے کی جرأت و ہمت وہی کر سکتا ہے جس کو اصالت الفاظ سے کما حقہٗ واقفیت ہو اور لسانیات پر مکمل عبور حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں میں سروش کے علاوہ چند ہی نے اس طرز کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور وہ بھی جزوی طور پر۔

سروش کو لفظوں پر عبور حاصل ہے اور لسانیات سے خاص دل چسپی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں جن کے مطالعہ سے آپ کو خود ہی ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔

آج ہماری بات نہ مانو کل پھر آٹھ آٹھ آنسو رونا
مانجھی ابھی ہے پاس کنارا بیچ بھنور میں ناؤ ڈبونا
جی کا چین ہے کھوئی سوئی چھان رہا ہوں کونا کونا
جب دیکھو مرنے کی دھمکی
بھائی سروش اب مر بھی چکو نا

درج بالا غزل میں عربی و فارسی سے صرف نظر کرتے ہوئے خالص اردو کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور محاوروں کو اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ مصرعوں کی روانی و برجستگی علامہ آرزو کی یاد دلاتی ہے۔ اس قدر کمال و فنی پختگی کے بعد محمود سروش علامہ آرزو کے فن کا اعتراف جس طرح کرتے ہیں وہ ان کی استاد سے وابستگی و عقیدت کے ساتھ ساتھ آج کے دور کے نوجوانوں کے لیے ایک درس بھی ہے ؎

ہم نے سروش بڑی کوشش کی
آرزو جیسی بات نہ آئی

محمود سروش کا مشاہدہ بہت زبردست ہے اور فن پر مکمل عبور حاصل ہے اسی لیے وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو پیش کرتے وقت بندھے ٹکے اصولوں سے صرف نظر کرتے ہوئے موقع اور وقت کے اعتبار سے الفاظ و علامات کا استعمال کرتے ہیں اور ایسی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں جو ان کی جدتِ طبع کی نشاندہی کرتی ہیں۔

یاس و ہراس، امید و بیم، ظلم و ستم، غم و الم
حالتِ دل کیا بتاؤں، کانٹوں میں اک گلاب تھا

مایوسی، خوف، امید و ناامیدی اور ظلم و ستم کے درمیان دل کی حالت کو کانٹوں کے درمیان گلاب کہنا سروش کی ندرت ہے ؎

کم نارِ جہنم سے نہیں یاس کا شعلہ
اک بار بھڑک جائے تو وہ کم نہیں ہوتا

پہلے مصرعہ میں یاس کو نارِ جہنم کے مماثل قرار دینا بھی سروش کی اپنی اپج ہے یہ اپج صرف تخیل کے سہارے نہیں اختیار کی گئی ہے بلکہ دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت بھی قرآن و تاریخ کے حوالے سے فراہم کیا گیا ہے۔ یہ شعر بھی دیکھیں ؎

دل کا تھا ماجرا درد کا تذکرہ ان سے کہنا پڑا تو عجب حال تھا
جیسے نوخیز شاعر سنائے کوئی پیشِ اربابِ فن اپنی پہلی غزل

معشوق کے سامنے درد و الم اور دل کی کیفیات کے تذکرے کے وقت کی کیفیت کو اربابِ فن کے سامنے نوخیز شاعر کے پہلی غزل پڑھنے کی کیفیت سے تشبیہ دینا بھی سروش کی اپنی اختراع ہے جس کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

سروش اپنی ایجاد و اختراع کے سہارے اکثر اردو غزل کے پامال

موضوعات ومضامین میں بھی دل چسپی پیدا کر دیتے ہیں. مثلاً عشق کے موضوع پر ان کا یہ شعر دیکھیں ؎

موت کا ہے اک وقت معین عشق کا کوئی وقت نہیں
کیا جانے ان چیتے میں لگ جاتا ہو یہ تیر کہاں

سروش نے مصرعہ میں ایک لفظ "ان چیتے" رکھ کر جان پیدا کر دی ہے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ لسانیات سے خاصی دل چسپی رکھتے ہیں اور مباحث الفاظ ومعانی پر جب گفتگو کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماہر لسانیات مسائلِ الفاظ پر تحقیق وتدقیق کے گہرائے آبدار رول رہا ہے لیکن معاملہ صرف یہیں تک نہیں ہے. وہ شاعری میں بھی اکثر الفاظ کے معانی ومفاہیم، تذکیر وتانیث کے مسائل کا اظہار اس طرح کر گزرتے ہیں کہ شعریت مجروح نہیں ہونے پاتی.

لفظوں کے معنی بتانا ان کے مروجہ معانی سے الگ معنی کی نئی جہات سے آشنا کرانا اور لفظوں کے استعمال کا سلیقہ وشعور بتانا بھی ایک فن ہے جس کی طرف سب سے پہلے ناسخ نے متوجہ کرایا. انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ صرف لفظوں کے استعمال کا سلیقہ تذکیر وتانیث، معانی ومفاہیم کی دنیا سے ہمیں روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور ناسخ کے بعد یہ فن پوری طرح کسی شاعر کے یہاں واضح طور پر نمودار نہ ہو سکا ہرچند کہ دبستان ناسخ کے شعراء کے یہاں اس طرح کے اشعار ملیں گے. مگر انھوں نے کسی واضح رجحان کی صورت اختیار نہیں کی ہے.

محمود سروش کی شعر گوئی کا سلسلۂ نسب بھی ناسخ پر منتہی ہوتا ہے اس لیے انھوں نے بھی اس روایت کے تتبع کی شعوری کوشش کی ہے مگر انھیں ناسخ کا مقلد اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے یہاں ناسخ جیسی خشکی نہیں پیدا ہوتی ؎

خوبی ہے وقت کی ہمیں درس وفا دیں
جن کو دفا کے ذکر سے مس بھی نہیں رہا

باؤلے پن میں سیانا تھا سروش
اس کی گلیوں ہی میں پتّا پا گیا

یہ اشعار بطور ثبوت درج کیے گئے ہیں اگر آپ تلاش کریں تو اس طرح کے بے شمار اشعار ان کے یہاں بآسانی مل جائیں گے، ان کی ایک غزل ہے جس کی ردیف میں مزاح کا عنصر بہت نمایاں ہے مگر سروش نے اسے کس طرح نبھایا یہ ملاحظہ فرمائیں ؎

چشم مروت، شرم شرافت کل کے ہیں آثار میاں
راحت جس کے سائے میں تھی ڈھ گئی وہ دیوار میاں

داغِ دل بازارِ جہاں میں کس کو دکھانے آئے ہو
ان سکوں میں اب نہیں کرتا کوئی یہاں بیوپار میاں

یہ مت پوچھو جن کی کشتی ٹوٹی وہ کس گھاٹ لگے
وقت کی لہریں کر دیتی ہیں سب کا بیڑا پار میاں

ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی افواہوں کا زمانہ ہے
ہم تم کیا ہیں پیر پیمبر ہو جائیں گے خوار میاں

ردیف کو قافیے کے ساتھ کھپانا بھی ایک فن ہے اور ایسا مشکل فن جس سے بڑے بڑے شعراء بھی پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں بالخصوص اس طرح کی ردیفوں کا سنجیدہ غزل میں کھپانا بہت ہی مشکل ہے، مگر درج بالا اشعار کے مطالعے سے خود ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ جدید خیالات وتصورات کی ترجمانی کے باوصف شعریت، نغمگی، طنز وغیرہ مجروح نہیں ہوتے اور نہ ہی ردیف قافیہ سے علاحدہ معلوم ہوتی ہے جس سے سروش کی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے.

سروش کی شاعری کے سلسلے میں ابتداءً ہی یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ روایت سے رشتے استوار رکھنے کے باوصف جدید عہد کے تقاضوں سے صرف نظر نہیں کرتے اور کوئی حساس شاعر اپنے عہد کے تقاضوں سے صرف نظر کر بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ ایسی صورت میں وہ ضمیر کی آواز تلے ہمیشہ سسکتا رہے گا. سروش نہایت حساس انسان ہیں اس لیے وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے رمزیہ اسلوب کے قالب میں ڈھال کر نہایت خوبصورت انداز میں نظم کر دیتے ہیں.

عصر حاضر کا سب سے اہم اور لاینحل مسئلہ بیکاری اور بیروزگاری ہے جس کا سروش کو زبردست احساس ہے وہ اس مسئلہ کو جب اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس کرب سے

گزرے ہیں جس کی وجہ سے طنز کی لے بہت تیز ہو جاتی ہے ؎

اب مجھ سے کاروبار کی حالت نہ پوچھیے
آئینہ بیچتا ہوں میں اندھوں کے شہر میں

اور یہ بیکاری و بے روزگاری کا کرب ہی ہے جو انھیں اس منزل تک لے آیا ہے کہ وہ کہنے پر مجبور ہوئے ؎

دین و دل عقل و جنوں بکتے ہیں سب دام کے دام
ایک بازار غلامی ہے یہ دنیا کیا ہے

دنیا کو بازارِ غلامی کہنا آج کے معاشی اور اقتصادی نظام پر طنز ہونے کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ کو صدیوں پرانی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے جس سے سروش کی وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے چند شعر اور ملاحظہ فرمائیں جس میں سروش کا اندازِ بیان طنزیہ ہے ؎

ہاتھ خالی، دل ہے ویراں، فکرِ مفلس کا چراغ
کون سی دولت ہے جس کی پاسباں ہے زندگی

دشوار ہے پابندیٔ رسم و رہِ اسلاف
ہم سے وہی اچھا ہے جو بے نام و نسب ہے

تائید بے بہانہ، سفارش بغیر اجر
بکتا ہے شخصیت کا اثر بیچتے ہیں لوگ

وہ دن گئے کہ دل میں جگہ پانا سہل تھا
آئے ہیں اب وہ دن کہ یہ گھر بیچتے ہیں لوگ

ان اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر موجودہ سماجی، سیاسی اور معاشی قدروں سے مطمئن نہیں ہے اور وہ ان چیزوں کو پسند بھی نہیں کرتا اس لیے ان پر بھرپور طنز کر رہا ہے تاکہ نظام میں تبدیلی ہو۔ اخلاق، مروت اور شرافت جیسی اعلیٰ اخلاقی قدریں جو پس پشت چلی گئی ہیں اپنا جائز مقام پا سکیں۔

اردو غزل میں نئی علامتوں کی تشکیل کے رجحان نے موجودہ عہد میں ایک توانا اور پُر قوت میلان کی شکل اختیار کر لی ہے اور شعراء الفاظ و علامات کے ترک و اخراج توسیع و تشکیل کے عمل میں مصروف ہیں مگر انتہا پسندانہ نظریات کے سبب علامتوں کی توسیع و تشکیل سے زیادہ ترک و اخراج کا عمل جاری ہے جس سے ہماری غزل کی لفظیات کے ذخیرے میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے اور علامتیں وضع بہت کم ہو سکی ہیں اور جو وضع بھی ہوئی ہیں ان کو بھی استحکام نصیب نہیں ہو پا رہا ہے اس لیے کہ وہ اپنے متعلقات کے ساتھ وجود میں نہیں آ رہی ہیں۔

سروش بھی اس میلان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ انھوں نے قدیم علامتوں کے ترک و اخراج پر اتنا زور صرف نہیں کیا جتنا نئی معنویت کی تلاش و جستجو پر توجہ کی ہے اور بعض خوبصورت، بامعنی نئی تراکیب و علامات بھی وضع کی ہیں، ذیل میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں، جن میں سروش نے پرانی علامتوں میں نئے معنوی امکانات پیدا کیے ہیں اور بعض نئی علامتیں استعمال کی ہیں ؎

قیدِ قفس میں پائی ہے تعلیمِ حریت
دامِ بلا میں کوئی پھنسائے گا کیا مجھے

اوسر جیسا پھیلا آنگن یہ کیوں کر مہکائے گا
تنہا اک بیلے کا پودا کتنے پھول کھلائے گا

ہاتھوں سے اگر رنگِ حنا بن کے اٹھے ہیں
رن سے شفقِ کرب و بلا بن کے لٹے ہیں

شہادت کے لیے اوڑھی ہے ہم نے گرد کی چادر
غبارِ دشت سے لینا کفن ہم سے کوئی سیکھے

طوق کٹ گئے لیکن ہیں گلے پہ خط اب تک
سلسلہ اسیری کا یعنی اب بھی جاری ہے

سروش نے پہلے شعر میں ہندستان کی سماجی صورتِ حال کی علامتی انداز میں خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ دوسرے شعر میں آج کے

ہندستان کی معاشی صورتِ حال جس خوبصورتی سے پیش کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔

عصرِ حاضر کی غزل میں تنہائی، مایوسی، محرومی، سفر کی بے سمتی، ہجر اور رزق وغیرہ کے موضوعات عام ہیں جنھیں سرورش کے یہاں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ عصری حسیت سے بے تعلقی سرورش کا شیوہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ہر حال میں امید اور بہتر مستقبل کی تمناؤں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ نتیجے میں ان موضوعات کی پیش کش میں بھی ان کے یہاں یاسیت و قنوطیت کے بجائے رجائی انداز موجود ہے

بتا دیا مجھے ٹوٹے ہوئے ارادوں نے
تھا کوئی اور موثر فقط اثر میں تھا
مسافروں کو بجز سایہ کچھ بھی دے نہ سکا
کہ راہِ عام پہ اک نخل بے ثمر میں تھا

اپنی بے سمتی کا یہ احساس دنیا کو نہ تھا
کاروانِ زندگی ورنہ رواں پہلے بھی تھا

خوفِ تنہائی نہ پوچھو دل کی تسکیں کے لیے
سائے کو ساتھی سمجھ کر کارواں کہنا پڑا

جدید غزل گو شعراء کے یہاں عشق کا تصور بھی کلاسیکل شعراء سے کافی بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اب صرف معشوق کی بے وفائی، ظلم و ستم ہجر کا ذکر نہیں جدید غزل میں معشوق باوفا اور عاشق بے وفا ہو سکتا ہے ان تمام مواقع کی تصویر آپ کو سرورش کے یہاں بھی نظر آئے گی مگر رمزیہ پیرائے میں اس لیے کہ وہ جس عہد و جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس میں عشق کرنا جرم ہے چہ جائیکہ اس کا کھلے ڈلے انداز میں بیان۔ ملاحظہ ہوں چند شعر ؎

عشق اپنی طبیعت سے تو افسردہ تھا لیکن
اک شوخ نے اپنا کے اسے کر ہی دیا تیز

فکر ہے صرف نئے کھیلنے والوں کی سرورش
ہم تو سب ہار کے بیٹھے ہیں ہمارا کیا ہے

زمیں کا دل بھی یقیناً کسی نے توڑا ہے
بلا سبب تو یہ چشمے اُبل نہیں سکتے

نہ سطحِ آب تک پہنچی حرارت قعرِ دریا کی
تعجب کیا جو دل کا رُخ سے اندازہ نہیں ہوتا

مختصر یہ کہ سرورش کی غزل شاعری کا ایک ایسا افق ہے جہاں روایت و جدت کے عناصر گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی قوسِ قزح کے مختلف رنگوں سے دیکھنے والوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ان کی فرحت و انبساط کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

□□

غزل

مستقل سا کوئی محفوظ ٹھکانہ کر کے
خود وہ ٹھہرا مجھے صحرا کو روانہ کر کے

ہم سفر دھوپ بھی اب چھوڑ گئی ہے تنہا
میرے سائے کے تعاقب کا بہانہ کر کے

سوچ میں ہوں کہ اس آمد پہ ہنسوں یا رو دوں؟
وہ تو لوٹا ہے مگر مجھ کو پرانا کر کے

ہم نے خود کو یونہی بے سمت سفر میں رکھا
چلتے ہیں تیر بھی طے کوئی نشانہ کر کے

جل رہا ہوں میں کسی طاقِ فراموشی میں
وقت نے پھینک دیا کل کا فسانہ کر کے

مصلحت اپنے مراسم کی وہ خود ہی جانے
اس نے بیگانہ کیا سب کو یگانہ کر کے

مصوّر سبزواری
چودھری سرائے سنبھل
ضلع مراد آباد
۲۴۴۳۰۲

رباعیات

کچھ لوگ بیاضوں ہی میں ہیں محصور
کچھ لوگ ہیں شہرت کے نشے میں مخمور
آواز کی دولت سے کوئی ہے معمور
میں خوش ہوں کہ گمنامی ہے میرا ہی قصور

مقصد سے نزول کب ہے خالی میرا
بیکار نہیں وجودِ عالی میرا
اتری ہے زمیں پہ روح قیدی بن کر
دنیا کو بنا دیا سوالی میرا

دیتے ہیں دعا دعا بھی کب دیتے ہیں
بیمار کو ہم دوا بھی جب دیتے ہیں
مٹی کے بدن کی اتنی خاطر واللہ
کب روح کو ایسی تاب و تب دیتے ہیں

لوٹا ہے ہوس نے یوں خزانہ دل کا
آتا نہیں یاد بھی فسانہ دل کا
طائر کوئی بھول کر بھی کب آتا ہے
سنسان پڑا ہے آشیانہ دل کا

انیس امام
"امام منزل"
عالم گنج [illegible]
پٹنہ ۔۔۔۔۔۔

غزلیں

آبادیوں کے شور شرابے میں آگیا
صحرا سمٹ کے شہر کے نقشے میں آگیا

اے مرگِ ناگہاں تو کہیں اور جا کے مر
تیرا تو ہر مزا ہمیں جینے میں آگیا

کتنی ہی اب تلافیِ مافات کیجیے
وہ بال کیا مٹے گا جو شیشے میں آگیا

منڈلا رہا ہے ڈوبنے والے کے آس پاس
جانے کہاں کا حوصلہ تنکے میں آگیا

اس سے بھی ٹوٹ پایا نہ اپنی انا کا بت!
میرا غرور بھی مرے رستے میں آگیا

جب سے تمہارا ساتھ میسّر ہوا ہمیں
ہر کام زندگی کا سلیقے میں آگیا

پیہم ریاضِ فن کا ہے طاہر یہ ماحصل
اک خاص بانکپن مرے لہجے میں آگیا

طاہر تلہری
صدر بازار، قصبہ تلہر
شاہ جہاں پور

سناں نہ نیزہ نہ تلوار ساتھ لے جانا
ہمیشہ جنگ میں کردار ساتھ لے جانا

زمیں کی بات ہو یا بحث ہو عقائد کی
تم اپنا شیوۂ ایثار ساتھ لے جانا

گلو پہ تیر تبسم کی تیغ سے کاٹے
وہی عمل وہی گفتار ساتھ لے جانا

لہو کا آخری قطرہ بھی قوم کو دیدے
اک ایسا ہاشمی بیمار ساتھ لے جانا

کٹا کے ہاتھ رکھے سربلند پرچم کو
وہ ہر صدی کا علمدار ساتھ لے جانا

شکیب رضوی
لیکچرر کرافٹ ٹیچر انسٹی ٹیوٹ
کان پور

نافع قدوائی
۶۶۔ خاتون منزل۔ حیدر مرزا روڈ
گولا گنج۔ لکھنؤ

حکیم عبدالقوی دریابادی ▫ بلند پایہ صحافی، طبیب حاذق اور درویش صفت انسان

اودھ کا مردم خیز قصبہ دریاآباد (ضلع بارہ بنکی) محتاج تعارف نہیں ہے کیونکہ اس کا نام دنیا بھر کے علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں یکساں طور سے مشہور ہے۔ دنیا کے کسی بھی ادبی، علمی، دینی حلقے میں چلے جایئے اگر آپ نے اپنا وطن دریاآباد بتایا یا اس قصبہ سے اپنا کچھ بھی تعلق بتایا تو آپ کی آؤ بھگت میں اضافہ ہو جائے گا۔ قصبہ دریاآباد کو دنیا کے علمی و ادبی اور دینی حلقوں میں متعارف کرانے کا تمام تر سہرا عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مفسر قرآن "سچی باتیں" لکھنے والے عظیم ادیب و منفرد صحافی مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کو جاتا ہے جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ قصبہ کے نام کو جوڑ کر دریاآبادی لکھنا شروع کیا، اگرچہ مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کا تعلق ضلع بارہ بنکی کے مشہور ممتاز "قدوائی" خاندان سے تھا لیکن مولانا نے اپنے نام کے آگے شاید ایک ہی آدھ مرتبہ قدوائی لکھا ورنہ انھوں نے ہمیشہ دریاآبادی ہی لکھا۔ اسی قصبہ کے مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کے خانوادے کے ایک اور چشم و چراغ حکیم عبدالقوی دریاآبادی تھے جنھوں نے ایک طرف اپنے حقیقی چچا اور خسر مولانا دریاآبادیؒ کے وضع کردہ صحافت کے اعلا اصولوں کی پابندی کی بلکہ دوسری طرف انھوں نے مولانا دریاآبادی جو منفرد صحافی تھے ان کے طرز تحریر کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی، دوسری طرف حکیم عبدالقوی دریاآبادی نے اپنے نانا حکیم عبدالحبیب دریاآبادی جو محسن طب کہلاتے تھے ان کی حذاقت و مسیحائی کو بھی برقرار رکھا چنانچہ یہی وجہ تھی کہ حکیم عبدالقوی دریاآبادی کی حذاقت و مسیحائی کا اعتراف تمام بڑے اطبا کو تھا۔

حکیم عبدالقوی دریاآبادیؒ جنوری ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے ان کی تربیت مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ حکیم صاحب کے والد ڈپٹی عبدالمجید صاحب ڈپٹی کلکٹر مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کے حقیقی بڑے بھائی تھے اور ان دونوں بھائیوں کی آپسی محبت مثالی حیثیت رکھتی تھی، چونکہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی یہ خواہش تھی وہ اپنے اس ہونہار ذہین بھتیجے کو دینی تعلیم کی راہ پر لگائیں اس لیے ڈپٹی عبدالمجید صاحب خوشی خوشی اس پر رضامند ہو گئے۔ مولانا دریاآبادی نے پہلے حکیم عبدالقوی دریاآبادی کو حفظ قرآن کرایا چونکہ حکیم صاحب کا حافظہ زبردست تھا اس لیے انھوں نے بہت جلد قرآن مجید حفظ کر لیا۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حکیم عبدالقوی صاحب نے اس زمانہ میں حفظ قرآن کیا جب اس کی مثالیں بہت کم ملتی تھیں اور کسی مسلمان اعلا افسر کے گھر میں حفظ قرآن کی مثال تو بہت ہی شاذ تھی، حکیم صاحب نے دس برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے اور یہاں عربی اور پھر طب کی تعلیم حاصل کی۔ عربی انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نامور استاد مولانا خلیل عرب سے ان کے گھر پر جاکر پڑھی ان کے ہم درس مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ تھے۔ طب کی ابتدائی تعلیم حکیم صاحب نے محسن طب حکیم عبدالحبیب دریاآبادی، حکیم خواجہ شمس الدین اور مولانا علی میاں مدظلہٗ کے حقیقی بڑے بھائی حکیم و ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوی سے حاصل کی، اس کے بعد انھوں نے طبیہ کالج دہلی سے فاضل الطب والجراحت کی سند حاصل کی، طبیہ کالج میں حکیم کا شمار کالج کے ذہین و ہونہار طلبا میں کیا جاتا تھا ان کی غیر معمولی ذہانت اور خداداد لیاقت سے طبیہ کالج کے سینیئر اساتذہ تک متاثر تھے۔

حکیم صاحب نے منشی، کامل، فاضل، مولوی، عالم کی سند لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اگرچہ حکیم صاحب نے انگریزی ادب میں باقاعدہ ڈگری حاصل نہیں کی لیکن اپنے

وسیع مطالعہ کی بنا پر انگریزی میں اتنی استعداد ضرور حاصل کر لی تھی جس کی توقع کسی یونیورسٹی کے انگریزی ادب کے گریجویٹ سے کی جاسکتی تھی۔ حکیم صاحب نے ہمیشہ انگریزی کی اعلا معیاری کتب کا مطالعہ کیا۔

۱۹۳۶ء سے حکیم صاحب نے باقاعدہ حکیم کی حیثیت سے پریکٹس شروع کی، انھوں نے کچہری روڈ لکھنؤ میں ایک کرائے کے مکان کی نچلی منزل میں اپنا مطب شروع کیا اور یہ مطب کم و بیش پچاس برس تک چلتا رہا۔ چونکہ حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا تھی اس لیے ان کا شمار لکھنؤ کے حاذق طبیبوں میں ہونے لگا، ان کے اُستاد حکیم عبدالحبیب دریاآبادی کو بھی اپنے اس ہونہار و لائق شاگرد پر ناز تھا اور وہ اپنے شاگرد کی تشخیص کے بے حد قائل تھے اور بہت کم ایسے مواقع آتے جب شمس الطب حکیم عبدالحبیب دریاآبادی نے حکیم عبدالقوی صاحب کی تشخیص سے اختلاف کیا ہو یا ان کے نسخوں، دواؤں میں کوئی ترمیم کی ہو۔

حکیم عبدالقوی دریاآبادی اتنے حاذق طبیب تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے طبابت کے پیشے کو کبھی بھی مالی منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے اس پیشے کو خالص خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت اپنایا۔ مریضوں سے فیس لینا کیا معنی بسا اوقات مریضوں کو خود اپنے دواخانے سے مفت دوائیں تک دے دیتے تھے۔ نسخہ جو لکھتے تھے وہ بھی بہت سستا۔ آخر زمانہ میں بعض مریض خود ہی ان کو فیس کے نام پر کچھ رقم دینے لگے تھے جسے وہ بادلِ ناخواستہ قبول تو کر لیتے لیکن کبھی کسی مریض سے از خود فیس طلب نہیں کی۔

حکیم عبدالقوی صاحب نے خلافت و ترک موالات اور آزادی کی مختلف تحریکوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کا اثر بھی انھوں نے قبول کیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اپنے چچا مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کی تربیت میں کیا۔ لیکن انھوں نے صحافت کے پیشے میں بھی اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ وہ کبھی کسی اخبار کے ملازم نہیں ہوئے۔ مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ تنویر جس کی اشاعت کئی ہزار تھی اس میں انھوں نے اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیے۔ تنویر، حق، قائد، سیاست جدید (کانپور) ہفت روزہ ندائے ملت (لکھنؤ) میں بلامبالغہ سینکڑوں اداریے لکھ ڈالے لیکن بغیر اپنے نام کے اظہار کے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ مرحوم کے ہفت روزہ "صدق" اور "صدقِ جدید" کے نائب مدیر اور منیجر کی ذمہ داریاں بڑی خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے انتقال کے بعد بھی دس برس تک حکیم صاحب "صدق جدید" کو نکالتے رہے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا خاص وصف تھا۔ ان کے طرز تحریر پہ جابجا مولانا عبدالماجد دریاآبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے طرز تحریر کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھیں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر پورا عبور تھا۔ ان کا ادبی ذوق بلند پایہ کا تھا۔ اس وجہ سے حکیم صاحب کو اردو اور فارسی کے اشعار بکثرت یاد تھے جن کا برمحل استعمال کر کے بسا اوقات وہ اپنی تحریروں میں ندرت پیدا کر دیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کی تحریر میں عموماً سادہ اور آسان زبان میں ہوتی تھی۔ نہ جانے کتنی کتب پر مقدمے، تبصرے لکھ ڈالے۔

حکیم عبدالقوی صاحب کو جس قدر علم و ادب سے دلچسپی تھی اسی قدر انھیں کرکٹ سے دلچسپی تھی، زمانۂ طالب علمی سے نہ صرف یہ کہ کرکٹ کھیلے بلکہ لکھنؤ کے مارننگ اسٹار کلب کی قیادت بھی کی۔ حکیم صاحب جب طبیہ کالج (دہلی) میں زیرِ تعلیم تھے، کالج کی ٹیم کا ایک میچ لاہور کی ایک ٹیم سے پڑا۔ لاہور کی اس ٹیم میں ہندوستان کے اب تک کے واحد تیز رفتار بالر نثار بھی کھیل رہے تھے۔ نثار کی نپی تلی بولنگ اور ان کی تیز رفتاری کا حکیم صاحب کی ٹیم پر اس قدر خوف طاری تھا کہ ان کی پوری ٹیم صرف ۲۶ رن بنا کر آؤٹ ہو گئی، اس میچ میں حکیم صاحب نے نثار کی گیند پر چار رن ضرور بنائے لیکن نثار کی ایک تیز رفتار گیند ان کے ہاتھ پر لگی اور انگلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے حکیم صاحب نے دہلی، کلکتہ، بمبئی، بنگلور اور لاہور، کراچی تک کے سفر کیے۔ آخر عمر تک کرکٹ ٹسٹ میچ کی کمنٹری سننے کا شوق قائم رہا۔ اخبارات میں اسپورٹس کا کالم ان کا پسندیدہ کالم تھا کیونکہ انگریزی روزنامہ "اسٹیٹس مین" میں کھیل کی خبریں دیگر اخبارات کے مقابلے میں زیادہ ہوتی تھیں اس لیے حکیم صاحب پابندی کے ساتھ اسٹیٹسمین پڑھتے تھے۔ درجنوں مقامی میچوں میں حکیم صاحب نے امپائرنگ کے بھی فرائض انجام دیے۔

حکیم عبدالقوی صاحب سے جو واقف نہیں ہے وہ اندازہ بھی

نہیں کرسکتا کہ حکیم صاحب کیا تھے انھیں چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا قرار دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ انھیں تمام اہم واقعات ازبر تھے۔ حکیم صاحب ہر جمعہ کو لکھنؤ سے دریاآباد کا سفر کرتے تھے۔ مولانا دریاآبادی کی زندگی میں تو یہ سفر مولانا سے ملنے اور صدقِ جدید کے مضامین و دیگر امور پر گفتگو کرنے کی غرض سے کرتے تھے لیکن چونکہ حکیم صاحب حاذق طبیب بھی تھے اس لیے دریاآباد اور اس کے مضافات کے مریض حکیم صاحب کے دریاآباد پہنچنے سے قبل ہی ان کے مکان پر جمع ہو جاتے تھے اور متعدد مریض انھیں گھیر لیتے تھے۔ حکیم صاحب بغیر کسی ناگواری کے مریضوں کو وہیں دیکھنے لگتے اور کاغذ چاہے ردّی ہی کیوں نہ ہو اس پر نسخہ لکھ دیتے تھے۔ یکے اور کھڑکھڑے کی سواری پر بیٹھتے بیٹھتے ہی وہ نسخہ لکھ دیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے انتقال کے بعد بھی تقریباً بارہ چودہ برس تک بغیر کسی ناغہ کے جمعہ کے روز دریاآباد کا سفر کرتے رہے، آندھی آئے یا طوفان آئے ٹرین کتنی ہی لیٹ کیوں نہ ہو حکیم صاحب کا دریاآباد پہنچنا لازمی، پروگرام میں حکیم صاحب اتنے ہی سخت تھے جتنے کہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی تھے۔ موسم کوئی ہو حکیم صاحب ہمیشہ شیروانی پہنے رہتے تھے۔ شیروانی کی دونوں جیبوں میں خطوط اور ضروری کاغذات کے پلندے ہوتے تھے۔ سڑک پر چلتے تو ہمیشہ نظریں نیچی موسم چاہے جیسا ہو حکیم صاحب اپنی مخصوص چال سے ہی چلتے تھے۔ سڑک پر چلتے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی اخبار یا کتاب ہاتھ میں ہوتی راستے میں اگر کوئی مل گیا تو اس سے نہایت تپاک اور محبت سے ملے۔ لکھنؤ سے باہر کے سفر میں حکیم صاحب کے ساتھ ایک تھیلا ضرور ہوتا تھا جس میں حکیم صاحب سفر میں لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتے تھے۔ ٹرین میں جہاں جگہ مل گئی حکیم صاحب نے مطالعہ شروع کر دیا اور اکثر اخبارات کے مضامین، اداریے دورانِ سفر ہی لکھ ڈالتے تھے۔

راقم السطور کے تو حکیم صاحب حقیقی چچا تھے اور چچا بھی ایسے شفیق جس کی مثال ملنا مشکل۔ اپنے تمام بھتیجوں، بھتیجیوں، بھانجوں، بھانجیوں نواسے، نواسیوں، پوتے، پوتیوں سے یکساں محبت اور سب کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ۔ چھوٹے بچوں کو چھیڑنا اور پھر انھیں پیسے دینا یا ان کی پسندیدہ چیزیں دینا ان کا خاص شغلہ تھا۔ چائے تو چچا میاں کی کمزوری کہا جا سکتا تھا۔ صبح سویرے امین آباد کے انورٹی اسٹال میں جہاں اچھی پتی کی دم کی ہوئی چائے ملتی تھی، چائے پینا ان کے معمولات میں داخل تھا۔ اب انورٹی اسٹال ہی ختم ہو گیا ہے۔

چچا میاں جیسے درویش صفت انسان، بے لوث دبے پایاں شفقت کرنے والے، عزیز و اقارب کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے چچا میاں نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو جب اس دنیائے فانی سے کوچ کیا تو اس وقت اپنی محرومی کا شدید احساس ہوا کہ ایسی عظیم و شفیق ہستی کی، جو مجملاً چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا تھے، قدر نہیں کی اور اگر ان سے ذرّہ برابر بھی فیض حاصل کیا ہوتا تو آج سکون حاصل ہوتا ــــ اپنی اس محرومی کا زندگی بھر قلق رہے گا۔ □□

حالی کی انفرادیت

صفحہ ۲۰ کا بقیہ

سماج میں ان کو صحیح مقام دینے کی تلقین کی ہے۔ ان نظموں میں "مناجات بیوہ" جذبات نگاری کے ساتھ شاعرانہ فنکاری کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ غرض مولانا حالی نے اپنے عہد کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی نظموں بالخصوص مسدس کے ذریعہ اپنی عصری بصیرت اور احساس و ادراک کا جو ثبوت دیا اس نے اردو نظموں کی ترقی کی راہیں کھولی ہیں۔

حالی کے معاصرین میں شبلی اور اکبر الہ آبادی کے نام بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ شبلی کی توجہ نثری تخلیقات المامون، الفاروق، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر اور سیرت النبی کی تکمیل کی جانب اتنی زیادہ رہی کہ وہ طویل نظم کی جانب توجہ نہیں کر سکے۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی نے مغربی تعلیم و تہذیب کی مخالفت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس موضوع سے متعلق جو نظمیں انہوں نے لکھیں ان کو اکبر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حالی کے عہد کے نظم نگار بالخصوص مولانا اسمٰعیل میرٹھی اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی وغیرہ نے اُردو نظم کے خزانے کو اپنی گراں بہا منظومات سے مالامال کیا۔ مگر حالی نے مسدس مدوجزر اسلام تصنیف کر کے جدید نظم کی تاریخ میں اپنی انفرادیت کو تسلیم کرایا۔ اور ان کے بعد طویل نظم نگاری کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ اور اُردو نظم کو ایک مستقل انفرادی صنف سخن کی حیثیت حاصل ہوئی۔ □□

سیّد انور سعید
جی ایس او، جامعہ اُردو، علی گڑھ

حالی کی انفرادیت جدید نظم کے تاریخی پس منظر میں

اُردو ادب کی تاریخ میں حالی کا نام ایک ایسی تاریخ ساز، معتبر اور انفرادی شخصیت کا حامل ہے جس نے مادی طور پر اُردو نظم و نثر کو اپنی تخلیقات کے وہ گراں بہا اور بے مثال شہپارے عطا کیے جو آج بھی ارباب علم اور اہل ادب کے لیے مشعل راہ ہیں۔ نثر کے میدان میں ان کی گراں مایہ تصانیف میں "مقدمہ شعر و شاعری" کو جدید اُردو تنقید کا نقش اوّل تسلیم کیا جاتا ہے تو ان کی سوانحی تصانیف حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب کو سوانحی ادب کا رہبر و رہنما سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح میدان سخن میں ان کی مختصر موضوعاتی نظموں کو جدید اُردو شاعری کی بنیادی نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تو اُن کی معرکۃ الآرا تخلیق "مسدس مدوجزر اسلام" کو اُردو میں باقاعدہ اور شعوری طور پر طویل نظم نگاری کی تاریخ میں حرف آغاز کا درجہ دیا جاتا ہے۔

حالی ایک بلند مرتبہ ادیب اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک باشعور مفکر اور صاحب بصیرت دانشور بھی تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کا بحرانی دور بھی دیکھا تھا اور ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے خونی واقعات بھی ان کی نظروں کے سامنے سے گزرے تھے۔ اور اس کے بعد کا وہ دور بھی ان کے پیش نظر تھا جب مشرق و مغرب کی تہذیب کا تاثراتی ردعمل نظریاتی شکست و ریخت کے ساتھ اصلاحی، تعمیری اور ترقیاتی دور سے گزر رہا تھا۔ اور قومی تحریکات ابھر رہی تھیں۔ ان ہی میں سر سید کی وہ تحریک بھی شامل تھی جو بالخصوص مسلمانان ہند کو پسماندگی کے غار سے نکال کر اصلاح و ترقی کی دوڑ میں اقوام عالم کے شانہ بشانہ آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہی تھی اور جس کی تکمیل کے لیے سر سید نے بنیادی طور پر تعلیم کو اور بالخصوص جدید تعلیم کو وسیلہ بنایا تھا۔ حالی نے سر سید کی اس تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد اپنی شعری تخلیقات کو اصلاح قوم و ملت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ حالی کی شعری تخلیقات نے جہاں ایک طرف قوم و ملت کی خدمت انجام دی وہاں دوسری جانب نئی شاعری یا بالفاظ دیگر جدید اُردو شاعری اور بالخصوص جدید اُردو نظم کے میدان میں اپنی انفرادیت کا علم بلند کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں جب آہستہ آہستہ مغربی تعلیم و تہذیب کی روشنی پھیلتی گئی اور پسماندگی کی تاریکی کا پردہ نظروں کے سامنے سے ہٹنے لگا تو ہندستان کی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی ایک ایسا باشعور طبقہ ابھرنے لگا جس کے دل میں ہندستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ملک و ملت کی محبت کا جذبہ اور اجتماعی اصلاح و ترقی کا احساس موجزن تھا۔ ایسے طبقہ میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو انگریزی تعلیم و تہذیب کی چکاچوند میں اردو کی کلاسیکی شاعری اور بالخصوص غزل کو بے وقت کی راگنی تصور کرنے لگے تھے۔ اور غزل کی مخالفت میں آواز بلند کرنے لگے تھے۔ دوسری جانب وہ لوگ تھے جو شاعری کو ایک نئی آب و تاب کے ساتھ قومی اصلاح کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے ان دونوں طبقوں سے قطع نظر اساتذہ دہلی اور لکھنؤ کے نمائندہ اور برگزیدہ تلامذہ داغ و امیر اور ان کے معاصرین غزل کے کلاسیکی رنگ، زبان کی لطافت، بیان کے حسن، طرز ادا کی جاذبیت اور اس کی فنی خصوصیات رمزیت، اشاریت وغیرہ کو سینے سے لگائے ہوئے تمام ملک میں اس کی مقبولیت کو قائم رکھے ہوئے تھے۔ مگر عصری تقاضے جدید ذہنوں میں کروٹیں لے رہے تھے اور باشعور ذہنوں میں قومی اصلاح اور ترقی کے دریچے کھل رہے تھے۔ ایسا طبقہ شاعری سے متنفر نہیں تھا۔ مگر جو شاعری کو تفریح طبع کا ذریعہ بنائے رکھنے کے بجائے تبلیغ حیات کا وسیلہ بنا کر اور ادب کا زندگی سے ناطہ جوڑنا چاہتا تھا۔ اسی احساس نے اعتبار بڑے

زندگی کے نظریہ کو جنم دیا۔ اور شاعری کو ایک نئی فکر اور نیا ذہن عطا کیا۔ اور مسلمہ و مروجہ کلاسیکی اصناف سخن کے پہلو بہ پہلو ایک نئی شاعری کا چراغ روشن ہوا جسے ہم جدید شاعری کہتے ہیں۔ اس کا نقطۂ آغاز انجمن پنجاب کے اس پہلے جلسہ کو مانا جاتا ہے۔ جو ۹ر اپریل ۱۸۷۴ء کو لاہور میں منعقد کیا گیا تھا اور جس میں مولانا محمد حسین آزاد نے "شب قدر" کے عنوان سے اپنی نظم سنائی تھی اور اس جلسہ میں موضوعاتی نظموں پر مشتمل ایسے مشاعرے منعقد کرنے کی قرارداد منظور کی گئی تھی جن میں موضوعاتی نظمیں پیش کی جائیں اسی بنا پر ان مشاعروں کو مناظمہ کا نام دیا گیا تھا۔ اور آئندہ مناظمہ کے لیے "زمستاں" کا موضوع منتخب کیا گیا تھا۔ اس وقت تک ہندستان میں حکومت برطانیہ کے قیام کو پندرہ سولہ برس کا زمانہ گزر چکا تھا اور انگریزی تعلیم اپنے سفر کی تقریباً پون صدی کا عرصہ طے کر چکی تھی اس سلسلہ میں سن ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور اس کے بعد دہلی کالج کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور ان کے ذریعہ اُردو ادب کے فروغ کی راہیں کھلنے لگی تھیں۔ چنانچہ جہاں ایک طرف فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد اور ادیبوں نے تراجم و تالیفات کے ذریعہ اُردو نثر کو نئی سمت و رفتار سے روشناس کرایا وہیں دوسری جانب دہلی کالج کے اساتذہ مولوی امام بخش صہبائی اور پروفیسر رام چندر اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکا اللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ نے اُردو کے ذریعہ علوم جدید کی روشنی پھیلائی اور اس سے وہ لوگ بھی فیضیاب ہوئے جن کو کالج میں پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایسے حضرات میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔

انہوں نے شعوری طور ایک مکمل ترتیب و تسلسل اور فنی ربط و ضبط کے ساتھ مسدس کے ذریعہ اسلام کے عروج و زوال کی داستان بڑے درد بھرے لہجہ میں بیان کی اور قوم کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں اصلاح و ترقی کا احساس دلایا۔ اور اس کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔

حالی نے "مسدس مدوجزر اسلام" اس وقت لکھی تھی جب وہ لاہور سے واپس دہلی آکر اینگلو عربک اسکول میں مدرس ہو گئے تھے اور سر سید تحریک سے وابستہ ہو کر سر سید کو اپنا رہبر اور رہنما سمجھنے لگے تھے۔ اس سے قبل انہوں نے (حالی) لاہور میں محکمہ تعلیم میں ٹرانسلیٹر کی خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے انھیں عربی ادب اور فلسفہ کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ اسی دوران لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات حکومت پنجاب کی ایما پر نئے طرز کی شاعری کی ترویج کے لیے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ جس کے روح رواں دہلی کالج کے تعلیم یافتہ مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ ان مناظموں میں حالی اپنی موضوعاتی نظموں کے ذریعہ جدید شاعری کی ترقی کی راہیں ہموار کر چکے تھے ان مناظموں کے بارے میں حالی نے لکھا ہے کہ۔

> "لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی موضوع کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں میں نے بھی اس زمانے میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں" (دیباچہ مسدس حالی مطبوعہ راجہ رام کمار پریس لکھنؤ صفحہ نمبر ۱۱)۔

انجمن پنجاب کے مناظموں کی بالعموم جا بجا پذیرائی ہوئی۔ اخبار و رسائل میں ان کا تذکرہ کیا جانے لگا شعرا نے ان کی تقلید میں مناظمے کیے اور موضوعاتی نظمیں تخلیق کیں اگرچہ ان مناظموں میں مولانا آزاد نے پہلی نظم پیش کی مگر انہوں نے حالی کی طرح اپنی نظموں میں اصلاحی مقصد کے مقابلہ میں جدید شاعری کی ترویج اور فروغ کو زیادہ اہمیت دی اور اُردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکی۔ انہوں نے انگریزی نظموں کی طرز پر بھی بعض نظمیں لکھیں اور انگریزی ادب کے خیالات سے اُردو شاعری کو متعارف بھی کرانے کی کوشش کی ان کو جدید اُردو نظم کا معیار اور موسس کہنا غلط نہ ہوگا۔

آزاد اور حالی کے علاوہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور تلق میرٹھی کے نام بھی جدید اُردو نظم کے فروغ کے سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید اُردو شاعری کے ذریعہ اُردو میں بچوں کے ادب کو فروغ دیا اور شاعری میں نئے ہئیتی تجربے بھی کیے اور تلق میرٹھی نے انگریزی کی درسی نظموں کے منظوم اُردو ترجمے کر کے ایک نئے تجربہ سے اُردو شاعری کو

روشناس کرایا۔ مولانا حالی نے موضوعاتی نظموں کو اصلاح تہذیب و اخلاق کا وسیلہ ہی نہیں بنایا بلکہ مسدس تصنیف کرکے اُردو میں باقاعدہ نظم نگاری کی راہیں کھولیں اور شاعری کو با مقصد بنا کر ادب برائے زندگی کے نظریہ کو تقویت پہنچائی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید اصلاح قوم و ملت کے لیے اپنی تحریک شروع کر چکے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بامقصد شاعری کے بھرپور انداز کی حمایت کی۔ اور اس کو اپنے مشن کی تبلیغ کا وسیلہ بنانے کے لیے مولانا حالی کی نظم نگاری کو پسند کرتے ہوئے ان کو اصلاحی نظم لکھنے کا مشورہ دیا۔ سرسید کی خواہش کی تکمیل میں حالی نے مسدس تصنیف کی اور شعوری طور پر اپنی شاعری کو افادی رنگ میں رنگ دیا۔

حالی کو سرسید کی ہمنوائی میں ایسے لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو سرسید کے نظریات سے اختلاف کرتے تھے مگر حالی اس کی پرواہ کیے بغیر اپنی راہ پر گامزن رہے۔

اس مسدس میں انہوں نے طلوعِ اسلام سے قبل عرب کے زمانہ جاہلیت کی مرقع کشی کرتے ہوئے قبائلی تنازعات ظلم و ستم، دختر کشی، شراب نوشی، عیش کوشی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور پھر اسلام کی برکت سے ان کی بدلی ہوئی بہتر حالت اور اخلاقی عظمت کے ساتھ حفظ دین و ایمان کے لیے ان کے اعلا کارناموں کا تاریخی حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے اور مسلمانوں میں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے بعد مسلمانوں کو اپنے دینی و اخلاقی اصول سے انحراف اور تعلیم سے عدم رغبت کے باعث جس ذلت و خواری کا منہ دیکھنا پڑا اس کا اظہار بڑے درد بھرے انداز میں کرتے ہوئے خود افراد قوم کی بے حسی اور بالخصوص قوم کے اہل دل اور علما و شعرا کی قوم سے بے توجہی کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ اس کی بنا پر بھی خاص طور علمائے دین اور شعرا میں حالی کے نظریاتی اختلاف کے ساتھ ساتھ شخصی عناد پیدا ہو گیا۔

بھلا ان کی بے باکی پر علما و شعرا کیوں نہ بھڑکتے۔ وہ بھڑکے اور دل کھول کر بھڑکے مگر حالی نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہوں نے اشرافِ قوم کے تاریک مستقبل کی جو تصویر پیش کی تھی آج وہ ہمارے سامنے ہے حالی نے اس کے لیے والدین کے بچوں کی تعلیم و تربیت سے بے توجہی اور لاپرواہی کو قرار دیا ہے۔ ان کا یہ تصور آج حرف بحرف صحیح نظر آتا ہے۔

حالی نے قوم کے زوال کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم کی بدحالی اور پسماندگی پر آنسو ہی نہیں بہائے اس دلدل سے ابھرنے اور نکلنے کی راہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے۔ اقوام عالم کی ترقی سے سبق لینے کا مشورہ بھی دیا ہے اور ترقی کی جو راہیں کھلی ہیں ان پر چلنے کی تلقین بھی کی ہے اور ایک پرامید لہجہ میں اصلاح و ترقی کی رغبت دلاتے ہوئے کاہلی اور بے حسی کو چھوڑ کر کسب علم و ہنر پر زور دیا ہے۔ ساتھ ہی قومی ہمدردی کا احساس دلایا ہے اور دعا پر اس مسدس کو ختم کیا ہے۔

اگرچہ حالی کو خود احساس تھا کہ مسدس میں ان سے فروگزاشت ہو سکتی ہے اور اس کے لیے دیباچہ میں وہ معذرت خواہ بھی ہیں مگر حقیقت یہ ہے حالی کے خلوص اور قومی درد نے جو لہجہ اختیار کیا اس میں کہیں کہیں اتنی تلخی محسوس ہونے لگی کہ ارباب قوم اسے برداشت نہ کر سکے اور مسدس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حالی نے اس کو اپنی کامیابی تصور کیا۔ اور اسے قوم کی بیداری سے تعبیر کرتے ہوئے چھ سال بعد ایک نظم بطور ضمیمہ اس مسدس میں شامل کی اس نظم میں حالی پرامید نظر آتے ہیں۔ اور انہوں نے سوتوں کو جگانے کی جو کوشش کی تھی اس کا اثر دکھائی دینے لگا تھا۔

غرض "مسدس مدوجزر اسلام" اپنے تمام تر اعتراضات کے باوجود مسلمانوں کے قومی انحطاط کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں حالی کے قومی و ملی جذبات و احساسات کوٹ کوٹ کر بھرے محسوس ہوتے ہیں یہ نظم ہماری قوم کا مرثیہ ہی نہیں ایسا آئینہ بھی ہے جس میں قوم کی تصویر بے نقاب نظر آتی ہے۔ اس نظم میں شروع سے آخر تک اصلاحی مقصد چھپایا ہوا ہے۔ ایسی طویل اصلاحی نظم حالی سے پہلے کبھی اردو میں کسی شاعر نے نہیں لکھی اور اُردو نظم کی تاریخ میں بھی حالی کی انفرادیت ہے جس کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نظم کی تاریخ میں مسدس مدوجزر اسلام سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

حالی نے اور بھی نظمیں لکھیں ان میں انجمن پنجاب کے مناظموں میں پیش کی جانے والی نظموں کے علاوہ "چپ کی داد" "بیٹیوں کی نسبت" اور مناجات بیوہ" ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں عورتوں کے حقوق اور

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

غزلیں

جانے کیا کیا بکھر گیا میرا
وقت شاید گزر گیا میرا

آئینے میں بھی کوئی عکس نہیں
جیسے چہرہ ہی مر گیا میرا

آج میں ہوں کسی کھنڈر کی طرح
رنگ سارا اُتر گیا میرا

میں نے دشمن سے دوستی کر لی
لوگ کہتے ہیں سر گیا میرا

ایک مُدّت کے انتظار کے بعد
کوئی دامن تو بھر گیا میرا

مُشیر صدیقی
۹۹/۱۰۴ نالہ روڈ کانپور

پیامِ عشق و محبّت ہے ہر کسی کے لئے
اور ایک حد بھی ضروری ہے دوستی کے لئے

جو تیری یاد سے وابستہ ہو کے رہ جائے
وہ ایک شام ہی کافی ہے زندگی کے لئے

وہ ایک رات کی بیدار زندگی میری
ایک آئینہ ہے زمانے میں ہر صدی کے لئے

اُفق سے تا بہ اُفق خیمہ زن ہے تاریکی
کہاں تک آگ لگاؤ گے روشنی کے لئے

ہجومِ عیش و مسرّت کے باوجود آصف
شعورِ غم بھی ضروری ہے آدمی کے لئے

آصف لکھنوی
مُبارک کا احاطہ
مفتی گنج
لکھنؤ

سبق جُنوں کا رہِ عشق میں بُھلا نہ سکے
اسی لیے تو فریبِ خرد میں آ نہ سکے

وہ زیست کیا جو فنا کی نہ دے سکے تعلیم
وہ موت کیا جو حیاتِ دوام لا نہ سکے

دل و دماغ یہ دانائے عالمِ امکاں
فریبِ ہستیِ گل کا سُراغ پا نہ سکے

شکستِ غم پہ ہنسی آئی تھی زمانہ ہوا
پھر اس کے بعد تبسّم کا بار اُٹھا نہ سکے

فضائیں ہو گئیں مسموم اس قدر اشعر
کہ گل بھی کوششِ پیہم پہ مُسکرا نہ سکے

اشعر علیگ
۸/۵ شاد شاہ نگر کالونی
لکھنؤ

کر نہ دے آشکار دل کا راز
آپ کی کانپتی ہوئی آواز

سُونے سُونے سے گاؤں کے پنگھٹ
پائلیں گوریوں کی بے آواز

آپ کا چہرہ آئینہ دل کا
آپ کا لہجہ درد کا غمّاز

ہم نے چاہا ہے ٹوٹ کر اسکو
ہم نہیں جانتے نشیب و فراز

جاتے جاتے ذکی پلٹ آتا
آپ دے کر تو دیکھتے آواز

ذکی طارق
۵۶۴ - کیلا روڈ گوشالہ پھاٹک
غازی آباد ۲۰۱۰۰۹

میں ظلمتوں میں سویرا تلاش کرتا ہوں
بُرا ئے شہر میں اپنا تلاش کرتا ہوں

کسی وُجود کا سایہ تلاش کرتا ہوں
میں خشک دشت میں دریا تلاش کرتا ہوں

ہزاروں سال کی خوشیوں پہ جو رہا بھاری
وہ ایک پل وہ زمانا تلاش کرتا ہوں

کوئی کشش نہیں باقی ہے زندگی تجھ میں
میں ڈوب جانے کو دریا تلاش کرتا ہوں

کسی سے شکوے کا عزّت نہیں ہے حق تم کو
کوئی قصور میں اپنا تلاش کرتا ہوں

ڈاکٹر عزّت حسین
حسین آباد
لکھنؤ

اصفی جعفری
شیعہ پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج
لکھنؤ

مطالعۂ آبِ حیات

اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد (مصنف آبِ حیات) کے احوال و ادبی آثار جن کتابوں میں موجود و محفوظ ہیں ان میں درج ذیل مصادر شامل ہیں :

(۱) آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ : سید مسعود حسن رضوی ادیب ، (۲) محمد حسین آزاد (جلد اول) : ڈاکٹر اسلم فرخی (۳) ایضاً (جلد دوم) (۴) محمد حسین آزاد - جہاں بانو بیگم نقوی (۵) محمد حسین آزاد : مرتبہ ساحل احمد (۶) محمد حسین آزاد - بہ حیثیت محقق : قاضی عبدالودود (۷) دیوانِ ذوق : مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد . مطبع اسلامیہ لاہور . طبع اول (مطبوعہ قبل از ۱۴ راگست ۱۸۹۰ء) - (۸) "تلاش و تحقیق : کاظم علی خاں ص۱۵۹ تا ص۱۶۲) - (۹) مکاتیب آزاد : مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (۱۰) داستانِ تاریخِ اردو : حامد حسن قادری دہلی طبع ۱۹۹۶ء ص۴۴۸ تا ص۵۱۹ - (۱۱) مقالات و نشریات : کاظم علی خاں لکھنؤ ۱۹۹۳ء ص ۲۴۶ تا ص ۲۷۶ (۱۲) میر امّن سے عبدالحق تک : ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۳) افاداتِ مہدی : مہدی افادی (مرتبہ مہدی بیگم) - (۱۴) آبِ حیات : محمد حسین آزاد الٰہ آباد ۱۹۶۲ء (۱۵) گُلِ رعنا : حکیم عبدالحیٔ (۱۶) دہلی اردو اخبار : مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی -

مہد سے لحد تک مولانا محمد حسین آزاد (متولد دہلی و متوفی لاہور) کے سفرِ حیات کی مجموعی مدت ۱۰ جون ۱۸۳۰ء سے ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء تک تقریباً اسّی سال نکلتی ہے - ڈاکٹر اسلم فرخی نے آزاد کی ادبی زندگی کی مدت کم و بیش ساٹھ سال متعین کی ہے - مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز "ترجمہ رسالۂ نکاح" سے ہوا ، جو پہلی بار ۱۲۶۴ھ - (۴۸-۱۸۴۷ء) میں دہلی سے چھپا تھا - محمد حسین آزاد کی یہ پہلی کتاب دراصل ان کے والد مولوی محمد باقر دہلوی کے ایک فارسی رسالے کا اُردو ترجمہ تھی - مولانا آزاد کے والد مولوی محمد باقر پہلے تو دہلی کالج میں پڑھتے تھے پھر وہیں استاد بھی رہے تھے - آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں جو دہلی اُردو اخبار جاری کیا تھا اس سے مولانا محمد حسین آزاد بھی ۱۸۴۸ء سے وابستہ رہے تھے - دہلی اُردو اخبار نے ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادیٔ ہند میں برٹش سرکار کے خلاف مجاہدینِ آزادی کی ہم نوائی کی تھی جس کی پاداش میں مولوی محمد باقر کو برٹش سرکار نے موت کی سزا دی تھی اور محمد حسین آزاد کی گرفتاری کا حکم جاری کیا تھا -

- ———— محمد حسین آزاد : مرتبہ ساحل احمد ص ۳۲-۳۱

مولانا آزاد اپنے والد کی موت کا روح فرسا منظر دیکھ کر قیدِ فرنگ سے بچنے کے لیے اپنے گھر والوں کے ساتھ دہلی کو خیرباد کہہ کر ہندستان کے مختلف دیار و امصار میں برسوں دربدری کی مصیبت سے دوچار رہ کر آخر میں دیار لاہور میں جا بسے تھے - شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی زندگی کے آخری بیس سال سے زیادہ کی مدت دیوانگی کے عالم میں گزری اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو دیوانگی کی ہی حالت میں انھوں نے بمقام لاہور وفات پائی تھی - آزاد کی آخری آرام گاہ کربلا گامے شاہ لاہور میں واقع ہے -

———— مکاتیب آزاد - لاہور ۱۹۶۶ء ص۱۰

ہجری تقویم کے مطابق مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخ وفات ۹ محرم ۱۳۲۸ھ (شبِ عاشورہ) بیان کی جاتی ہے - آزاد کی زندگی کے اس المیے پر غالب کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں

آزاد کے المیہ حیات پر اختر انصاری دہلوی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

لطف لے لے کے پیے ہیں قدحِ غم کیا کیا
ہم نے فردوس بنائے ہیں جہنم کیا کیا

مولانا محمد حسین آزاد کے ادبی آثار میں یوں تو مختلف موضوعات پر مطبوعات کی ایک قابلِ لحاظ تعداد شامل ہے مگر ان کی ادبی زندگی کا شاہکار و یادگار کارنامہ کتاب 'آبِ حیات' ہے جو پہلی بار ۱۸۸۰ء کے اواخر میں وکٹوریا پریس لاہور سے چھپی تھی۔ آبِ حیات کی پہلی اشاعت کی ضخامت ۵۰۰ صفحات تھی۔ اس کا مسطر ۱۹ سطری تھا اور ہر سطر میں کم و بیش اٹھارہ الفاظ تھے (بحوالہ محمد حسین آزاد۔ جلد ۲ ڈاکٹر اسلم فرخی ص ۶ تا ۹)۔ آبِ حیات طبع اول جیسی ۵۰۰ صفحات کی ضخیم کتاب مولانا محمد حسین آزاد کی کم و بیش پندرہ برس کی محنت کا ثمرہ قرار دی جا سکتی ہے۔ آبِ حیات کا ایک ہزار ۵۰۰ جلدوں کا پہلا ایڈیشن تقریباً دو برس میں ختم ہو گیا اور مئی ۱۸۸۳ء میں ترمیم و اضافہ کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔ دوسری اشاعت میں اس کی جلدوں کی تعداد بڑھ کر دو ہزار ہو گئی۔ آبِ حیات کی اگلی اشاعتیں اسی دوسرے ایڈیشن پر مبنی ہیں۔

آبِ حیات کا آغاز تاریخِ زبانِ اُردو کی داستان سے ہوتا ہے (آبِ حیات۔ الہ آباد طبع ۱۹۶۲ء ص ۶ تا ۶۷)۔ آبِ حیات میں اُردو زبان کی تاریخ کی شمولیت لسانیات سے آزاد کے اس غیر معمولی ذوق کی مظہر ہے جو ان کی کتاب سخندانِ فارس میں بھی جلوہ گر ملتا ہے۔

تاریخِ زبانِ اُردو کے بعد آبِ حیات میں اُردو شعر و سخن کی تاریخ کا حال پانچ ادوار میں منقسم ملتا ہے۔ آزاد نے پانچوں ادوار کی ابتدا میں ہر دور کی زبان و شاعری کے بنیادی اوصاف بیان کرنے کا التزام کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب میں ہر دور کے اہم و نمائندہ شاعروں کے حالات اور ادبی کمالات کے ذکر میں آزاد نے جس تفصیل سے کام لیا ہے وہ آبِ حیات (۱۸۸۰ء) سے قبل لکھے جانے والے شعرائے اُردو کے درجنوں تذکروں میں مفقود (بلکہ کہیں کہیں تو معدوم) ملتی ہے۔

آزاد نے آبِ حیات میں اُردو شاعری کی تاریخ کے مختلف ادوار کے سخنوروں میں سے بعض شاعروں کے اتنے جاندار مرقعے پیش کیے ہیں جن کی بنیاد پر آزاد اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ کے ابتدائی دور کے اہم و کامیاب ترین خاکہ نگار کا مرتبہ اختیار کر چکے ہیں۔ اس طرح آبِ حیات اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں بھی ایک اہم ابتدائی باب ثابت ہوتی ہے اردو خاکہ نگاری کے ذوق کی آبیاری میں آبِ حیات کی یہ اہمیت ایک ناقابلِ فراموش یادگار کارنامہ ہے۔ بعد میں تحریر ہونے والے متعدد تذکروں میں اس ضمن میں آبِ حیات کے واضح و نمایاں اثرات کی جلوہ گری سے انکار کرنا آسان نہیں۔

اپنے ان اوصاف کی بدولت آبِ حیات اُردو شاعروں کا بے نظیر تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کی ایک قابلِ ذکر ابتدائی تاریخ بھی ثابت ہوتی ہے (دیکھیے کتاب میر امن سے عبدالحق تک ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۴۷، ۲)

آبِ حیات میں اُردو شاعروں کے حالات اور ادبی کمالات کے ساتھ ساتھ کسی حد تک ان عوامل و محرکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن کے زیرِ اثر ان کی شاعری پروان چڑھی تھی۔ آبِ حیات میں متعدد شاعروں کی ادبی تخلیقات میں ان کی زندگی اور زمانے کے اثرات کی کارفرمائی کے تجزیے کی کوشش وہ اہم و امتیازی وصف ہے جو اسے ایک تاریخ ساز و عہد آفریں کتاب کے درجے سے ہم کنار کراتا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے معیار و میزان: از ڈاکٹر مسیح الزماں۔ الہ آباد ۱۹۶۸ء ص ۱۹۸ تا ۲۰۰)۔

آبِ حیات جیسی ۱۸۸۰ء سے قبل لکھی جانے والی پارینہ کتاب کا یہ وصف اس کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد کے اس تنقیدی شعور کا شاہد و آئینہ دار ہے جس سے بعض اہلِ قلم نہ صرف ماضی بلکہ حال میں بھی انکار فرماتے رہے ہیں۔

آبِ حیات نے اُردو کے پُرانے شاعروں کو نئی زندگی بخشی۔ آبِ حیات انیسویں صدی عیسوی کے متعدد اُردو شاعروں کے لیے ایک اہم عصری ماخذ ہے۔ ان شاعروں کی فہرست میں درج ذیل نام شامل ہیں: میر ضمیر۔ مرزا فصیح۔ آتش۔ شاہ نصیر۔ مومن۔ شیفتہ۔ ذوق۔ مرزا غالب۔ مرزا دبیر اور میر انیس۔ یہ تمام شاعر مولانا محمد حسین آزاد کے ہم عصروں میں شامل رہے تھے۔

آب حیات نے اُردو کے قدیم شاعروں سے عام دلچسپی پیدا کر کے ادبی تحقیق کے ذوق کی آبیاری کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کی تاریخ لکھنے کے ذوق کو پروان چڑھایا۔

آب حیات کے بعد لکھی جانے والی متعدد کتابوں میں ہم آب حیات کے اثرات کی جلوہ گری محسوس کرتے ہیں۔ جلوۂ خضر، گلِ رعنا (از حکیم عبدالحیٔ) اور آبِ بقا جیسی کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اثبات ہوتا ہے۔

آب حیات نے اُردو نثر کو فارسی کی پُر تکلف، از کار رفتہ و فرسودہ انشا پردازی کے طلسماتی حصار و حدود سے باہر نکال کر ہندوستانی بھاشا کی سادہ و فکری انداز کی بو باس سے بسانے کی قابلِ ذکر کوشش کی۔ اُردو نثر کو ہندوستانی عناصر سے ہم کنار کرانے میں آبِ حیات کی یہ سعی اس کتاب کے اولیات میں شامل ہے۔

آب حیات (۱۸۸۰ء) میں اُردو شاعری کی اصلاح کے لیے مولانا آزاد نے مولانا حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) سے قبل آواز اٹھائی تھی۔ اُردو غزل کے نقائص بیان کرنے میں حالی جس افراط کا شکار ہوئے آزاد نے اس کام میں اعتدال سے کام لیا۔

آب حیات نے اُردو شاعری کو سماجی اصلاح کے لیے آلۂ کار بنانے کے تصور کو تقویت دی۔ علی گڑھ تحریک، ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر افادی ادب کا جو رجحان پروان چڑھا اس میں آب حیات کی آبیاری سے انکار کرنا حقیقت پسندی نہ ہوگی۔

آب حیات اُردو شاعری کی وہ ابتدائی ادبی تاریخ جو ۱۸۸۰ء سے قبل لکھی جا چکی تھی، ادبی تاریخوں میں اعلا و معیاری تحقیق کی توقع رکھنا ہمارے نزدیک وہ سعی لاحاصل ہے جسے انگریزی میں ——

"AN EXERCISE IN FUTILITY"

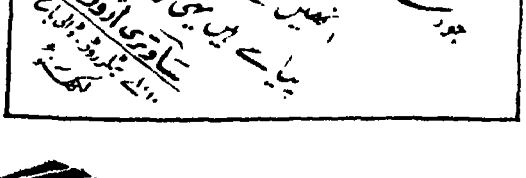
کہتے ہیں۔ آب حیات تو انیسویں صدی عیسوی کی ادبی تاریخ ہے، بیسویں صدی عیسوی میں آب حیات کے بعد تحریر ہونے والی کتنی ادبی تاریخوں میں اعلا و معیاری تحقیق کے نمونے ملتے ہیں یہ "عیاں راچہ بیاں" کی مثال ہے اور اس کی تفصیل کا بیان "تحصیل حاصل" ہے آب حیات جیسی انیسویں صدی عیسوی کی کتاب میں تحقیق کے بیسویں صدی عیسوی کے جدید طور طریقوں کو تلاش کرنا "حقیقت پسندی" سے زیادہ حماقت آبادی کی مثال ہوگی۔ آب حیات میں ابتدائی تحقیق کے نمونوں کی موجودگی سے انکار کرنا بھی درست نہ ہوگا۔ قاضی عبدالودود کی کتاب "محمد حسین آزاد بہ حیثیت محقق (پٹنہ ۱۹۸۴ء ص ۱ تا ۲۹) میں آب حیات" میں آزاد کی تحقیقی خامیوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مولانا حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری" اُردو تنقید کی اولین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" کی پہلی اشاعت ۱۸۹۳ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ آب حیات طبع اول (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) میں مقدمہ شعر و شاعری سے قبل اُردو تنقید کے نمونے موجود و محفوظ ملتے ہیں۔

آب حیات اسلوب نثر کے اعتبار سے مولانا محمد حسین آزاد کو ایک صاحب طرز نثر نگار کا درجہ دلواتی ہے۔ آب حیات آزاد کے اسلوب کی بدولت پرانے شاعروں کے حالات میں ایک بے جان و خشک کتاب نہ ہو کر ایک دلچسپ ادبی کتاب کی حیثیت سے یاد کی جاتی ہے۔ مخالفین آزاد "آب حیات" کے اسلوب میں افسانہ سرائی کے عیب کے شاکی ہیں مگر ہم اسلوب آزاد کے اس اعجاز سے انکار نہیں کر سکتے کہ اُردو کی کتابوں میں آب حیات کے حوالوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں دوسری کتابوں کے حوالوں کی تعداد کہیں کم ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد اپنی وفات جنوری ۱۹۱۰ء کے بعد آب حیات کی بدولت آج بھی زندہ و بہ قیدِ حیات ہیں۔

□□



ریاستی حکومت کی ترجیحات میں

اقلیتوں کے تعلیمی مسائل سر فہرست

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے نظریات اور ان کے مشن کو شرمندۂ تعبیر کرتی ہوئی اتر پردیش کی وزیر اعلا محترمہ مایاوتی نے ریاست میں سماجی و معاشی تفریق دور کرنے اور سماج کے دبے کچلے، کمزور، پسماندہ اور اقلیتی طبقہ کی ترقی و بہبودی کے لیے متعدد اہم فیصلے کیے ہیں۔ انھیں دوسری بار ریاست کی باگ ڈور سنبھالے ابھی تین ہی ماہ گزرے ہیں۔ اس مختصر سی مدت میں انھوں نے ان افراد کے مفاد میں کئی اہم فیصلے کیے ہیں۔

موجودہ حکومت اقلیتوں کی سماجی، معاشی اور بالخصوص تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر اعلا کا عہدہ سنبھالنے کے بعد محترمہ مایاوتی نے اپنی ترجیحات میں اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کو سر فہرست رکھا ہے۔

کوئی قوم اتنی ہی زیادہ ترقی کرتی ہے جس میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور اگر اس قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو اقلیتی طبقے کے تعلیمی معیار کا گراف کافی گرا ہوا ہے۔ حکومتیں آئیں اور گئیں لیکن اقلیتوں کو ترقی کے خاطر خواہ مواقع مہیا کرانے کی سمت میں کسی نے سنجیدگی سے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

ریاست کی موجودہ وزیر اعلا محترمہ مایاوتی نے ہی در اصل اس سمت میں سنجیدگی سے کارگر اقدام کیے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ جب تک اقلیتوں کا تعلیمی معیار بلند نہیں ہوگا تب تک حقیقی طور پر ان کی ترقی ممکن نہیں ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری بار ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد انھوں نے اقلیتی فرقہ کے طالب علموں کو دی جانے والی وظیفے کی رقم دوگنی کر دی ہے۔ اس سے قبل اس طبقے کے درجہ ۵ تک کے طالب علموں کو ۱۲ روپیہ ماہانہ، درجہ ۶ سے ۸ تک کے طالب علموں کو ۲۰ روپیہ ماہانہ اور درجہ ۹ سے ۱۰ تک کے طلباء کو ۴۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اب یہ رقوم دوگنی کر دی گئی ہیں۔ اس فیصلے سے ریاستی حکومت نے ۶۰ سے ۷۰ کروڑ روپئے سالانہ کا بار اپنے اوپر لیا ہے۔

حکومت نے ان وظیفوں کے تقسیم کے طریقہ کار کو بھی آسان بنایا ہے تاکہ بچوں کو کسی طرح کی پریشانی نہ اٹھانی پڑے اور وظیفہ کی رقم سیدھے ان کو حاصل ہو سکے۔ اب درجہ ایک سے پانچ تک کے بچوں کو نقد، درجہ ۵ سے ۸ تک کے بچوں کو بیرر چیک کے ذریعہ اور درجہ ۹ سے ۱۰ تک کے بچوں کے اکاؤنٹ بینک میں کھلوا کر وظیفے کی رقم ان کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی جائے گی۔ حکومت کے اس فیصلے سے مسلم طبقہ کے طالب علموں میں درمیان میں ہی اسکول چھوڑ دینے کے رجحان میں کمی آئے گی اور اسکول جانے نیز تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

حکومت نے اتر پردیش اقلیتی مالیاتی ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے انجینیرنگ اور میڈیکل کے داخلہ امتحانات میں شریک ہونے والے اقلیتی فرقہ کے امیدواروں کی خاطر مفت کوچنگ کا بندوبست کیا ہے۔ فی الحال ریاست کے ۸ اضلاع میرٹھ، مرادآباد، بریلی، لکھنؤ، کانپور، گورکھپور، وارانسی اور الٰہ آباد میں اس کوچنگ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کوچنگ سے ایسے طلباء مستفید ہوں گے جن کے سرپرستوں کی ماہانہ آمدنی پانچ ہزار روپیے سے زیادہ نہ ہو اور جنھوں نے یوپی بورڈ کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کم از کم ساٹھ فی صد اور دہلی بورڈ میں ۵۰ فی صد نمبر حاصل کیے ہوں۔

اترپردیش کی موجودہ حکومت نے مسلم فرقہ کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی غرض سے مسلم آبادی والے علاقوں میں جہاں اب تک تعلیم

کی سہولت نہیں مہیا کرائی جا سکی ہے، وہاں ترجیحی بنیادوں پر اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مرکزی حکومت کی اسکیم کے تحت ریاستی حکومت کے ذریعے اس اسکیم کو آخری شکل دی جا رہی ہے۔ اسی طرح مرکزی حکومت کی مدد سے اقلیتی نسواں ہائی اسکولوں میں خواتین ہاسٹل تعمیر کرانے کی بھی ایک اسکیم چلائی جا رہی ہے۔

ریاستی حکومت نے دینی تعلیم کو بھی فروغ دینے کی غرض سے عربی فارسی بورڈ کی تشکیل کی ہے۔ ریاست میں دینی مدارس کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو مسلم طبقے کی ابتدائی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم کیے جاتے ہیں۔ ریاستی حکومت نے ان میں سے ۴۵۱ مدرسوں کو بورڈ سے ملحق کر دیا ہے اور ان میں سے ۲۱ کو گرانٹ بھی دے رہی ہے۔ مالی سال ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۶ مزید مدرسوں کو گرانٹ دینے کی اسکیم ہے۔ مرکزی حکومت کی جانب سے مدرسوں کی جدید کاری اور ان میں پروفیشنل اور کمپیوٹر تعلیم دینے کی بھی اسکیم ہے۔

وزیر اعلا محترمہ مایاوتی نے اقلیتی طبقے کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے کئی پروگرام چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اقلیتی طبقے کے نوجوانوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے بھی حکومت نے کئی اسکیمیں چلائی ہیں۔

اسی سلسلے میں حکومت نے اتر پردیش اقلیتی مالیاتی ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعہ چلائی جانے والی ٹرم لون اسکیم اور مارجن منی لون اسکیم کو اور زیادہ موثر بنایا ہے۔ ٹرم لون اسکیم کے تحت دوسرے اور تیسرے مرحلے میں اب تک ریاست میں ۵۴۹۵ افراد کو ۴۶ء۳۲ کروڑ روپئے کی رقم مہیا کرائی جا چکی ہے۔ ریاست کے وزیر برائے اقلیتی بہبود و مسلم اوقاف جناب بنیاد حسین انصاری نے افسران کو ہدایت دی ہے کہ اہل امیدواروں ہی کو قرض دیا جائے تاکہ ریاست کے بے روزگار نوجوان روزگار حاصل کر سکیں۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ جن امیدواروں کی درخواستیں ابھی تک بینک میں پڑی ہوئی ہیں اور ان پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی ان کے لیے بہت جلد ایک اعلا سطحی میٹنگ کی جائے، تاکہ ان امیدواروں کو قرض حاصل ہو سکے۔ موجودہ مالی سال ۹۸-۱۹۹۷ء میں پانچ ہزار یونٹوں کو قرض دینے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

وزیر اعلا محترمہ مایاوتی وقف بورڈوں کو اور زیادہ مستحکم اور فعال بنانے کے لیے پرعزم ہیں۔ ان سے متعلق کئی اہم فیصلے جلد ہی کیے جائیں گے۔ ریاستی حکومت عنقریب ہی نئے وقف ایکٹ کے تحت وقف بورڈوں کی تشکیل کر دے گی۔ اس معاملہ میں ضوابط بنائے جا رہے ہیں۔ اس وقت اتر پردیش کے دونوں وقف بورڈ وقف ایکٹ ۱۹۶۰ء کے تحت کام کر رہے ہیں۔ لیکن نیا وقف ایکٹ یکم جنوری ۱۹۹۶ء سے نافذ ہو گیا ہے اور اس کے تحت نئے وقف بورڈوں کی تشکیل کی جا رہی ہے۔ نئے وقف بورڈوں میں بطور ممبر مسلم ممبران اسمبلی و پارلیمنٹ و کونسل میں سے چنا جائے گا۔ یہ ممبران پھر چیرمین کا انتخاب کریں گے۔

اقلیتوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے نیز وقف بورڈ کو مستحکم بنانے کے لیے ریاستی حکومت نے جو اقدام کیے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر اعلا اقلیتوں کی تعلیمی، معاشی اور سماجی پس ماندگی دور کرنے کے لیے پرعزم ہیں۔

—— ایس. سہیل احمد

غزل

میری فطرت کو جو کچھ چاہیئے تھا من وعن پایا
بہ فیضِ حضرتِ روح القدس ذوقِ سخن پایا

یہاں بھی چاند سورج اور ستارے اُگتے رہتے ہیں
زمیں کو آسماں ہم نے تہہِ چرخِ کہن پایا

سنائیں تو سنائیں کس طرح رُوداد حسرت کی
نہ پھولوں نے زباں پائی نہ غنچوں نے دہن پایا

وطن کی ایک چٹکی خاک بھی پائی تو ہم سمجھے
کہ ہم نے توتیائے چشم اور مشکِ ختن پایا

خدا بننے کی کوشش تو بہت عابد نے کی لیکن
یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ بندہ بھی نہ بن پایا

—— محمد رفیق عابدؔ زاہدی. کوتھ. ضلع بلیا

"خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا"

شکیل جمالی نے ۱۱ر جون ۱۹۹۷ء کی صبح ساڑھے سات بجے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

اگر آنسوؤں کو الفاظ کا لباس مل جاتا، یا ان ہزاروں سوگواروں کی سسکیاں مل جاتیں جنھوں نے ۱۱ر جون ۱۹۹۷ء کو ۹ بجے شب میں دھندلائی ہوئی چاندنی میں اپنے محبوب، ہر دلعزیز اور محترم جمال بھائی "ننھے بھیا" اور شکیل جمالی صاحب کو سپردِ خاک کیا تھا تو یہ شاید اس کے سانحۂ ارتحال کا صحیح بیان ہو سکتا۔

وہ زندگی میں بے پناہ عزت اور عوامی شہرت کے مالک رہے اور لمحۂ آخر تک ان کے چاہنے والے ان کے پرستار ان کے اعزا اور رفقا و احباب کا مجمع بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ انھیں الوداع کہنے کے لیے دیر رات تک موجود رہا۔ انھوں نے انعام و اعزازات بھی پائے۔ ان کی وفات پر ممتاز شخصیتوں کے ساتھ ہمارے صوبے کی وزیر اعلا محترمہ مایا وتی نے بھی تعزیتی پیغام بھیجا۔ ایران میں بھی ان سے محبت کرنے والوں نے ان کی وفات پر گہرے صدمے کا اظہار کیا۔

اُردو سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ اُردو کو وسیلۂ اظہار بنا کر اپنے دل کش طرزِ تحریر سے لوگوں میں اُردو کی ترویج و اشاعت کی اور اپنے حسنِ اخلاق سے لوگوں کے دل جیتے وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ احترام سے پیش آتے تھے، اپنے ساتھیوں سے محبت کا برتاؤ رکھتے تھے اور جو اُن سے چھوٹے تھے ان کے لیے بے پایاں شفقت اور سرپرستی تھی۔ بے شک انھوں نے اعزاز اور اکیڈمی ایوارڈ پائے اور بہت سی انجمنوں کی بنیاد ڈالی یا سرپرستی کی، لیکن وہ اس لیے بڑے آدمی تھے کہ انھوں نے اعلا مقاصدِ حیات کو پیشِ نظر رکھا اور خود ایک مثالی زندگی گزاری۔ وہ مذہبی آدمی تھے لیکن مذہب ہی سے انھوں نے محبت اور وسیع النظری کا درس حاصل کیا تھا اسی لیے ان کے پاس کسی کے لیے نفرت کبھی نہ تھی۔ ان کا امتیازی وصف مروّت اور حسنِ سلوک تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں ابنِ صفی، سلام مچھلی شہری نازش پرتاپ گڑھی، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، حسن واصف عثمانی اور افتخار اعظمی (مرحومین) جیسے شاعر و ادیب تھے اور ساتھ ہی ساتھ خان غفران زاہدی، حفیظ نعمانی اور مسیح الحسن رضوی جیسے نامور صحافی بھی تھے۔ وہ الٰہ آباد کی مجلسی و تہذیبی زندگی کی شناخت و پہچان تھے۔ جامہ زیبی، حسنِ اخلاق کے ساتھ وضعداری ان کا شیوہ رہی۔

مرحوم حسین حیدر، جو اپنے عہدِ شباب میں مشہور و مقبول ناول نگار تھے (جن کا تذکرہ علی عباس حسینی نے اُردو ناول کی تاریخ و تنقید میں کیا ہے) شکیل جمالی ان کے چھوٹے صاحبزادے تھے اور مرحوم عباس حسینی کے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے وراثت میں فنِ ناول نگاری پایا تھا ان کا اصل نام ابنِ حیدر تھا لیکن اپنے احباب کے علی الرغم انھوں نے پہلے نام جمال رضوی رکھا پھر ۱۹۵۳ء میں "جھلکے" کے عنوان سے ان کا پہلا ناول شکیل جمالی کے نام سے شائع ہوا۔ یوں تو ان کے سبھی ناولوں نے بے انتہا شہرت حاصل کی اور ان کا ایک ایک ایڈیشن تیس چالیس ہزار کا ہوا کرتا تھا لیکن ان میں فردوس نیلوفر، قرض اور فریب بہت مقبول ہوئے۔ وہ ادارۂ نکہت اور اس کے دوسرے سلسلوں جاسوسی دُنیا اور رُومانی دُنیا سے آخر تک وابستہ رہے۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے جس محفل میں وہ ہوتے اسے زعفران زار بنا کر اُٹھتے لیکن اب اس طرح اٹھے کہ سب کو سوگوار بنا دیا۔ ؎ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

ڈاکٹر نہال احمد صدیقی

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "دستاویز"
مرتب: شاہد حسن مرادآبادی قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ: شگفتہ بک ہاؤس، مغل پورہ دوم، پرنس روڈ،
مرادآباد

"دستاویز" مرادآباد کے ۴۸ موجود و معروف شعراء کے سوانح و کلام پر مشتمل تذکرہ ہے جسے شاہد حسن صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ تذکرے چھوٹے ہوں یا بڑے، مقامی ہوں یا علاقائی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ معاصر شعراء و ادبا کے تذکروں کو عموماً اہمیت نہیں دی جاتی کہ ان سے بیشتر شائقین شعر و ادب ذاتی طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب متذکرہ شخصیات نہیں رہتیں اور ان کے فن و شخصیت تک رسائی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں اہلِ قلم کو معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تب ایسے تذکروں کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "دستاویز" سے بھی موجودہ و آئندہ شائقین ادب کو استفادہ کا موقع ملے گا اور اس میں شامل شعراء کے بارے میں ضروری تفصیلات فراہم کرنے کے لیے دَر دَر بھٹکنا نہ پڑے گا۔

تذکرے کی افادیت کا دوسرا پہلو تاریخِ ادب کی تدوین میں اس کی خام مال اور حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت بھی ہے۔

مرتب کی یہ کاوش بہرحال لائقِ ستائش ہے۔

"دستاویز" شائقینِ شعر و ادب اور کتب خانوں کے لیے اچھا تحفہ ہے۔

—— عرفان عباسی

نام کتاب: "رنگ و بو کی سرزمین"
مصنف: شام بارک پوری۔ قیمت: چالیس روپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ
۲۱، بیچر پیلس، کھلنا، بنگلہ دیش۔

اردو میں سفرناموں کی روایت بہت پرانی ہے۔ البتہ پہلے کبھی ایک آدھ سفرنامہ منظر عام پر آتا تھا۔ اب سفر کی آسانیوں نے دور دراز کے فاصلوں کو سمیٹ کر وہ سہولت فراہم کردی ہے جو پہلے ممکن نہ تھی۔ قارئین گھر بیٹھے ان سفرناموں کے ذریعہ دنیا جہان کی سیر کر لیتے ہیں۔ شام بارک پوری کا یہ سفرنامہ یہی نہیں کہ ہمیں ان ملکوں کی سیر کراتا ہے بلکہ وہاں کی تہذیب و تمدن سے بھی روشناس کراتا ہے۔

اردو کا سب سے پہلا سفرنامہ "عجائباتِ فرنگ" یوسف کمبل پوش کی یادگار ہے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد ۱۸۳۶ء میں وہ بادشاہ سے اجازت لے کر انگلستان کے سفر کے لیے کلکتہ پہنچے اور ۱۸۳۷ء میں روانہ ہوئے۔ یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ ایک عام آدمی کی سیاحت اور اس کے تجربوں سے عبارت ہے۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ سچائی اور سادگی سے بیان کر دیا۔

شام بارک پوری کے سفرنامے "رنگ و بو کی سرزمین" میں بھی زندگی کی وہی سچائیاں ہیں جن کے رنگ عجائباتِ فرنگ میں گزرے ہوئے دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔

تھائی لینڈ، بنکاک، کوالالمپور اور سنگاپور کا یہ سفرنامہ ایسے دلچسپ انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت ہم خود اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں شام بارک پوری کے سامنے روشنیوں میں نہائے ہوئے شہر، خوبصورت ہوٹل، پارک اور نائٹ کلب قطار در قطار پھیلے ہوئے ہیں۔ پرسکون گاؤں، قدیم تاریخی عمارتیں، عبادت گاہیں اور لامتناہی سمندر کے دل کش مناظر ہمیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ مگر یہ سارا سفرنامہ صرف رنگینیوں میں ڈوبا ہوا نہیں ہے۔ ڈالرز کی خواہش اور اس کے حصول کے وہ گھناؤنے مناظر بھی ہیں جو اشتہار کی طرح ان گنت جسموں پر چسپاں ہیں۔

شام پارک پوری کا یہ سفرنامہ اُردو کے اچھے سفرناموں میں شمار کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑے دل کش انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ قارئین سے اُمید ہے کہ بنگلہ دیش کے اس مسافر کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے جو ہمارے لیے دور دیس سے رنگ و بو کی سرزمینیں سمیٹ لایا ہے۔

——— وقار ناصری

نامِ کتاب: "ارسطو سے ایلیٹ تک"
(مغربی تنقید کے شاہکار مضامین کا اُردو ترجمہ)
مرتّب و ترجمہ نگار: ڈاکٹر جمیل جالبی۔ قیمت: ۲۵۰/- روپئے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸۔ کوچہ پنڈت لال کنواں۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

اُردو تنقید کی دُنیا میں جمیل جالبی کا نام محتاجِ تعارف نہیں تقریباً چار دہائیوں سے وہ نقادوں کی اس گنتی میں شمار ہوتے ہیں جن کا نام ایک ہاتھ کی اُنگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور دو جلدوں میں انگلش، اُردو لغت ان کا معرکہ خیز کارنامہ ہے، نہایت ہی مستند اور جامع حیثیت رکھتی ہے۔

جالبی صاحب کے مطابق ارسطو کی بوطیقا سے ہی تنقید اور ادبی فکر کی بنیاد پڑی تھی۔ اس لیے انھوں نے تقریباً ڈھائی برس کا عرصہ اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ان کی نظر میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اس معیار کا آخری نقاد ہے۔ ۱۶ مزید نقاد جس میں دانتے۔ گوئٹے۔ کولرج۔ میتھیو آرنلڈ۔ ٹالسٹائی اور ایزرا پاؤنڈ نمایاں ہیں، ان کے مضامین شامل کیے ہیں۔ جن تبرک حیثیت کے ناقدین کو انھوں نے شامل نہیں کیا ان کا مختصر ذکر ایک طویل مقدمے میں کیا ہے۔

جالبی صاحب کا مقصد یہ بھی ہے کہ اُردو تنقید کے عمل کو تیزی عطا ہو اور اس رجحان کے پروان چڑھنے سے ایک ایسی فضا سازگار ہو کہ تخلیقی عمل مدلّل اور مکمل ہو سکے۔ اُردو ادب کے طالبِ علم، اساتذہ علماء اور تنقید نگار اس کتاب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

——— پرکاش چندر

نامِ کتاب: "خزانۂ معلومات عامّہ"
مؤلف: سیّد محمود حسن کامران۔ قیمت: ۱۵۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: ۱۸۷/۱۱۔ فراش خانہ۔ وزیر گنج لکھنؤ

اردو میں شعر و ادب کے سلسلے میں لاتعداد کتب موجود ہیں لیکن معلوماتِ عامّہ اور جدید ترین سائنسی تحقیقات، تکنیکی موضوعات اور تجارت و کاروبار کے سلسلے میں رہنمائی کرنے والی کتابیں بس خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں تمام علوم و فنون سے متعلق معلومات آسانی سے فراہم ہوں۔ افسوس ہے کہ اس طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ دی جانا چاہیے تھی۔

آج اُردو زبان کا چلن کم ہوتا جا رہا ہے روزمرّہ کی زندگی اور کاروبار میں اس کو بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں اس لیے اس کا خزانۂ معلومات کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ سید محمود حسن کامران نے اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کو دور کرنے کے لیے ایک قدم اٹھایا ہے انھوں نے تن تنہا تمام تر معلومات کو یکجا کر کے "خزانۂ معلومات عامّہ" کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ ان کا یہ کام قابلِ صد ستائش ہے اور باوجود اس کے کہ ان کی ترتیب دی ہوئی کتاب میں بہت کمی ہے یعنی کھیل کود سے متعلق معلومات بالکل نہیں ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ممتاز شخصیتوں کے نام اور ان کا ذکر نہیں ہے نیز اہم سیاسی معاہدوں، جیسے پنج شیل، میثاق تاشقند، وارسا پیکٹ وغیرہ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ پھر بھی یہ کتاب اس لیے مفید ہے کہ یہ نقشِ اوّل ہے اس سے بہتوں کو روشنی ملے گی، کتنے حوصلہ پائیں گے اور اس طرف پیش قدمی کریں گے جس سے یقیناً ایک بھرپور اور مکمل کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکے گی

جو لوگ مقابلے کے امتحانات میں شرکت کے خواہش مند ہوں ان کو "خزانۂ معلومات عامّہ" سے ضرور مدد ملے گی اس لیے انھیں یہ کتاب خریدنا چاہیے، اور پڑھنا چاہیے جس سے انھیں یہ معلومات ضرور ہو جائے گی کہ آئی۔ اے۔ ایس۔ پی۔ سی۔ ایس اور دوسرے تقابلی امتحانات میں کیا کچھ پوچھا جاتا ہے۔

امید ہے کہ محمود حسن کامران اپنی پہلی کوشش پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ اس میں برابر اضافے اور ترمیم و تنسیخ کی کوشش کرتے رہیں گے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب۔ غزلیاتِ جرم محمد آبادی
شاعر : جرم محمد آبادی مرتب : ڈاکٹر ... حیدری
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : (۱) ۱۹۶ باغ ... وزیر گنج لکھنؤ
(۲) حسن محمد آبادی۔ سید واڑہ۔ محمد آباد گوہنہ

جرم محمد آبادی کا شمار علامہ آرزو لکھنوی کے ان شاگردوں میں ہوتا ہے جو خود ان کی حیات میں ہی درجہ استاد پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کی غزلوں اور قصیدوں کے تین مجموعے شعلۂ رنگین۔ تیر نظر۔ فردوس سخن۔ اور صنف نظم کے مبادیات پر ایک کتاب رموز سخن کے نام سے جرم صاحب کی حیات میں شائع ہو کر خراج حاصل کر چکے ہیں۔

نشانِ منزل کے نام سے جرم محمد آبادی نے اپنے بقیہ کلام کو مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا مگر حیات نے وفا نہ کی۔ اس بکھرے کلام کو ڈاکٹر ای ... حیدری نے اپنے طور پر مکمل کرنے کا عزم کیا ہے اور غزلیاتِ جرم اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

جرم کی شاعری میں روایتی موضوعات کے دوش بدوش ایسے موضوعات بھی ہیں جو ان کی جدتِ فکر اور عصری آگہی کا نمونہ ہیں ؎

گرداب غم میں کشتی دل آ پھنسی ہے جرم
اندازۂ حیات کا طوفان ...

زور دے ہاتھوں کو اے جوشِ رہائی تو ہی
کھولنے کا نہیں آ کر درِ زنداں کوئی

کتابت، طباعت متوسط ہے۔ ۱۸۰ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعہ کی قیمت اس ہوش ربا گرانی کے زمانے میں معقول ہے۔

۔ فیدا حسین

نام کتاب : مصوّر سبزواری : فن اور شخصیت
مرتب : ڈاکٹر نسیم الظفر قیمت : ۱۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج
نئی دہلی

ڈاکٹر نسیم الظفر نے برصغیر کے نامور شاعر مصوّر سبزواری کی شاعری اور حیات کے بارے میں "مصوّر سبزواری : فن اور شخصیت" کے عنوان سے بڑی وقیع کتاب ترتیب دی ہے جس کے ذریعے مصوّر صاحب کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

اس کتاب میں شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، کرامت علی کرامت، حامدی کشمیری، ساجدہ زیدی، بلراج کومل، سلیمان اطہر جاوید، سید امین اشرف، تحسین تبریزی، سیف العباد، سلیم شہزاد، من موہن تلخ، رفعت اختر، احمد کمال پروازی، شاد نومی اور نسیم الظفر نے مصوّر صاحب کی شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور اس کے محاسن کو اجاگر کیا ہے۔

اس کے علاوہ قیوم راہی (پاکستان)، کشمیری لال ذاکر، علیم اللہ حالی اور عشرت ظفر نے ان کی ناول نگاری اور حنیف ترین اور نفیس احمد نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں مصوّر سبزواری کا لکھا ڈرامہ "گھاؤ ایک سمندر کے" اور کچھ غزلیں جو ملک اور بیرون ملک کے موقر جرائد میں شائع ہو چکی ہیں شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مصوّر صاحب کے بارے میں مختلف رائے رکھنے والے حضرات کی گراں قدر آرا کا حسین امتزاج ہے۔

مذکورہ کتاب میں مصوّر سبزواری کی چند غزلیں شامل ہیں جنھیں پڑھ کر ان کے چاروں شعری مجموعوں کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ غزلیں چاروں ہی مجموعوں سے منتخب کی گئی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ تیری پیاس نے دریاؤں ہی سے بیعت کی
نہ پانیوں پہ لکھا تیرا نام ختم ہوا

چلا بھی آ یونہی مجھ کو بھی کے ننگے تا دون تک
یہاں میں حادثہ نو ترکی کوشش میں ہوں

امید ہے کہ یہ کتاب مصوّر شناسی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کیفی سنبھلی

نام کتاب: کمپیوٹر کیا ہے؟
مصنف: عبدالرشید ندوی قیمت: ۱۵/- روپئے
ملنے کا پتہ: کمپیوٹر اُردو کتابت سنٹر، ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ

"کمپیوٹر کیا ہے؟" جناب محمد عبدالرشید ندوی کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں پرسنل کمپیوٹر کے متعلق ضروری معلومات مختصراً مگر جامع طور پر درج ہیں۔

آج کا عہد کمپیوٹر کا عہد ہے، زندگی کے ہر میدان میں آج کمپیوٹر کا استعمال ہو رہا ہے۔ میدانِ جنگ سے لے کر کارخانوں، اسکولوں دفاتر اور کھیل کے میدان تک کمپیوٹر کی کارفرمائی ہے اور تعجب نہیں کہ آنے والی صدی میں کمپیوٹر ہر شخص کی ضرورت بن جائے۔

چنانچہ دورِ حاضر کی اس اہم ایجاد اور ناگزیر ضرورت سے خاطر خواہ واقفیت کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اُردو داں طبقہ استفادہ کرتا۔ یہ کتاب اسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔

چالیس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کمپیوٹر کا تعارف، خصوصیات و فوائد، اُردو کمپیوٹر پروگرام اور دوسرے کمپیوٹر پروگرام بنانے والی کمپنیوں کا ذکر تو ہے ہی، ساتھ میں ڈاس (DOS) کے ضروری احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، جس سے اس کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ اُردو داں حلقے میں اس کتاب کو شرفِ قبولیت حاصل ہوگا اور مصنّف کی کوشش کو قدر و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

—— ڈاکٹر احمد صہیب

نام کتاب: "مشاہیر کے خطوط"
مرتبہ: انصاری اصغر جمیل۔ قیمت ۵۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: صالحہ بک ٹریڈرس اینڈ اسٹیشنرس، جامع مسجد مومن پورہ، ناگ پور ۴۴۰۰۱۸

زیرِ تبصرہ کتاب ممتاز ادیبوں، شاعروں کے ان مکاتیب پر مشتمل ہے جو جناب شرف الدین ساحل کے جوابات کے طور پر لکھے گئے۔ انھوں نے نظم و نثر پر متعدد کتب لکھیں۔ بالخصوص نثری سرمائے کی اہلِ نظر نے بڑی پذیرائی کی۔ اس کتاب میں کم و بیش ۵۵ حضرات کی تحریریں شامل ہیں جن میں عبدالماجد دریابادی، مالک رام، پروفیسر گیان چند، رشید حسن خاں، کالی داس گپتا رضا، عامر عثمانی اور پروفیسر محمود الٰہی جیسے ثقہ بزرگوں کے خطوط بھی ہیں۔ ادب کے حوالے سے بھی چھوٹے بڑے بہت سے مسئلے ان مکاتیب میں دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ بعض خطوط سے مشاہیر کے نجی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مختصر یہ کہ "مشاہیر کے خطوط" بڑے کام کی چیز ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب پسند کی جائے گی۔ کتابت و طباعت معیاری ہے۔

—— نشاط جاوید

تارا چرن رستوگی ـ صفحہ ۱۹ کا بقیہ

مشتمل تھی۔ اس کا بیشتر حصّہ نیشنل لائبریری کلکتہ کو ترسیل کر دیا ہے....

میرے پاس جو کچھ تھا، ارمان تھے، تمنّائیں تھیں، سب صیغۂ ماضی کے سپرد ہو چکا۔ جتنی جلد میرا آخری وقت آجائے، اچھا ہے۔ نفسیاتی، جسمانی اور اقتصادی پریشانیوں سے نجات تو ملے گی۔ میں ایک زندہ لاش ہوں، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ اب مجھ سے سب لوگ دُور دُور رہتے ہیں تاکہ انھیں کچھ دینا نہ پڑے۔ درآں حالیکہ میں نے کبھی دستِ طلب دراز نہیں کیا۔"

وفیات

ممتاز عالمِ دین مولانا محمد منظور نعمانی کی وفات

بین الاقوامی شہرت رکھنے والے عالم دین مبلغ و مفکر مولانا محمد منظور نعمانی صاحب ایک طویل مدت تک صاحب فراش رہ کر آخر کار ۴ مئی ۱۹۹۷ء کو ۸ بجے شب میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

ان کی شخصیت برصغیر میں ایک ماہر حدیث اور بلند پایہ خطیب کے ساتھ ساتھ روحانی عظمت کی بھی حامل تھی۔ انھوں نے تقریباً سو کتابیں لکھیں، جن میں "اسلام کیا ہے؟" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ مولانا نعمانی مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بانی ممبروں میں تھے نیز دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے اراکین میں بھی شامل تھے۔ مرحوم نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں خیر سگالی کے جذبے کو فروغ دینے میں بڑی حد تک جدوجہد کی، تاکہ ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھاوا ملے۔ ان کے پس ماندگان میں دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی تقریباً بیس برس سے برطانیہ میں اسلام اور دینی تعلیم کے فروغ میں سرگرم کار ہیں۔ دوسرے بیٹے حفیظ نعمانی "ان دنوں" کے چیف ایڈیٹر ہیں، تیسرے بیٹے حسان نعمانی "الفرقان" سے منسلک ہیں اور چوتھے بیٹے مولانا سجاد نعمانی رحمان فاؤنڈیشن کے چیئرمین ہیں۔ ادارہ نیا دور مولانا مرحوم کے پسماندگان سے تعزیت کرتا ہے اور اس عظیم سانحہ پر ان کے غم میں شریک ہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

—— ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا ۵ فروری ۱۹۹۷ء کو گوہاٹی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ وہ اقبالیات کے ماہر تھے۔ انھیں اردو، ہندی، انگریزی، فارسی ادبیات پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے "اقبال پر مغربی اثرات" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور طاہر تخلص کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی انگریزی میں ۷ اور اردو میں دو تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

ڈاکٹر رستوگی کی تخلیقات نیا دور میں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ انھیں اردو زبان و ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ ادارہ نیا دور اردو کے اس مشہور و ممتاز ادیب کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

مہدی عباس حسینی

—— مہدی عباس حسینی کی وفات سے اردو صحافت اور اردو ادب کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ایسے ادیب صحافی کم ہیں جنھوں نے اردو کو مغرب کی ادبی دنیا سے روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا ہو۔ مرزا ہادی رسوا کے مشہور ناول "امراؤ جان ادا" کا انگریزی میں ترجمہ آسان نہیں تھا، لیکن مہدی عباس نے انگریزی کے مشہور صحافی خوشونت سنگھ کے ساتھ مل کر بہت عمدہ ترجمہ کیا۔ یہ ناول یونیسکو کی طرف سے شائع ہو کر عالمی شہرت کا حامل ہوگیا۔ وہ ماہنامہ "آج کل" دہلی کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ اپنے والد علی عباس حسینی کے افسانوں کے انتخاب کی تدوین میں مصروف تھے۔ انھوں نے خود بھی کچھ ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں۔ ادارہ ان کے پس ماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہے۔

شفق شاہ چشتی

—— بزرگ شاعر سید شفق شاہ چشتی شاہانی اسی ماہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرحوم انتہائی مرنجاں مرنج اور شرافت و سادگی کا پیکر تھے۔ لکھنوی مزاج و آہنگ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے شاگرد اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ افسوس! غزل کا یہ شاعر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ ادارہ انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پسماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

□□

عنوانات

ماہنامہ نیا دور

جلد (۵۲) نمبر (۷)

اکتوبر ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر: نجیب انصاری

فون: ــــــ ۲۲۷۱۰۸

معاونین: محمد الیاس خاں، مبین احمد صدیقی

پبلشر: انیل سروپ
سکریٹری و ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش

مطبوعہ: یونائیٹڈ پرنٹرس، لکھنؤ

ــــ شائع کردہ ــــ

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش

زرِ سالانہ ــــ تیس روپے
عام شمارہ ــــ تین روپے

ترسیل زر کا پتہ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو۔

اپنی بات

اکتوبر کے مہینے کا تصور بڑا کیف آگیں ہے۔ نرم دھوپ والے دن، خنک شبنمی راتیں اور خوش گوار فضا، گلابی جاڑوں کی آمد آمد۔ کھلے کھلے رنگ، جیسے فطرت نے ہر طرف شگفتگی اور شادابی بکھیر دی ہو۔ مگر ہماری قومی زندگی میں اکتوبر کی اہمیت اور ہی کچھ ہے۔ یہ مہینہ عبارت ہے اہنسا سے، آزادی کی جدوجہد سے، سادگی و پرکاری سے اور وسیع المشربی سے کیونکہ ۲ اکتوبر بابائے قوم کا یوم ولادت ہے۔ وہ سادھو منش درویش صفت، دانشور، زیرک سیاست داں جسے زمانہ مہاتما گاندھی کے نام سے جانتا ہے۔ اس نے اپنی منفرد فکر سے سماج کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو اس طرح جوڑا کہ سارے ہندستانی عوام اپنے تمام اختلافات، افتراق بھلا کر سامراجی طاقت کے سامنے ایک آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے نتیجتہً غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور لال قلعہ پر ترنگا اپنی گنگا جمنی تہذیب کی قسم کھانے لگا۔

باپو نے اہنسا کے ذریعہ جو پیغام دیا اس میں انسانیت کے سارے جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ اگر اس کا چلن عام ہوجاتا تو انسانیت کی اتنی بے قدری و تباہی دیکھنے میں نہ ملتی۔ بہر نوع کوئی مانے یا نہ مانے اہنسا ہی آج کے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ چاہے وہ مسائل زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہمارے ملک پر باپو کے نظریات کی گہری چھاپ ہے اور ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ آزادی کے اس جشن طلائی کے موقع پر ہمیں آزادی سے پہلے اور بعد کے سارے مناظر یاد آرہے ہیں۔ اپنے قافلہ سالار کی خداداد ذہانت پر جس قدر بھی عقیدت کا اظہار کیا جائے کم ہے ——— عجب سالار تھا وہ کارواں کا۔

ایکتا کی ڈور میں بندھی ہوئی ریاست اتر پردیش تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ امن وامان کا یہ ماحول یقیناً حکومت کی پُرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ریاست کی ترقی کے لیے یہ بنیادی شرط ہے کہ یگانگت کی یہ فضا اسی طرح برقرار رہے تاکہ متحد ہو کر اتر پردیش کو خوش حالی سے ہمکنار کیا جا سکے اور بنیادی ضرورتوں سے وابستہ تمام مسائل جلد سے جلد سلجھائے جا سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سکھ چین کا یہ ماحول قیادت کی مستعدی سے بنا رہے گا۔

■ دکھی انسانیت کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے والی شفیق ماں کی رحلت نہ صرف ہمارے ملک کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ مدر ٹریسا نے جس طرح معذوروں، بیماروں، ضعیفوں اور غریبوں کی خدمت کی ہے، اس صدی کا وہ ایک عدیم المثال واقعہ ہے۔ ۵ر ستمبر ۱۹۹۷ء کو ان کے دائمی سفر پر پوری دنیا میں ایک سوگوارانہ فضا طاری ہوگئی۔ ہر ایک کو ایسا محسوس ہوا جیسے شفقت کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ اس بات نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ خدمتِ خلق سے بڑھ کر کوئی عبادت اللہ کو مرغوب نہیں۔ وہ نہ تو کسی ریاست کی سربراہ تھیں اور نہ جاہ و ثروت والی خاتون، مگر دنیا کا وہ کون سا اعزاز تھا جس نے ان کے دامن کو چھو کر خود پر فخر نہ کیا ہو۔ ہندستان میں باپو کے بعد وہ دوسری ہستی تھیں جو کسی سرکاری عہدے پر نہ رہتے ہوئے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ابدی آرام گاہ پہونچائی گئیں۔

■ موت العالِم موت العالَم! افسوس کہ پیکرِ لطف و کرم، دریائے رشد و ہدایت، سراپا اخلاق و سادگی، منکسر المزاج اور درویشانہ صفت کے مالک مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی ۲۸ر اگست ۱۹۹۷ء کو اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ علم کے ساتھ عمل، پھر صورت و سیرت میں ایسی کشش کہ قاری صاحب کی تشریف آوری کی خبر پاتے ہی عوام کا ہجوم۔ کسی کے غم کا مداوا، کسی کے چارہ ساز، کسی کے اضطراب کا سکون، کسی کی امیدوں کا محور ——— کیا کچھ نہیں تھے مرحوم!! ۔ اکابرین کہتے تھے کہ زندہ ولی دیکھنا ہو تو قاری صدیق صاحب کو دیکھو!۔ مرحوم تمام عمر خلق کی دلجوئی میں مصروف رہے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین!

——— ایڈیٹر

انکار سے اقرار تک

انکار

تو نے جسے بے رنگیِ ویراں سے سجایا
میں نے اسے پھولوں سے گلستاں سے سجایا
بے رنگ ہی بے رنگ تھا یہ عالمِ امکاں
میں نے ہی تو اس عالمِ امکاں کو سجایا
ایمان کی دولت تو ملی تجھ سے و لیکن
یہ کفر تھا جس نے ترے ایماں کو سجایا
دنیا کہ تھی آب و گِل و کوہ کی دنیا
میں نے ہی اسے قصر سے، ایواں سے سجایا
افسوس، کسی کو یہ حقیقت نہیں معلوم
ظلمات ہی نے مہرِ درخشاں کو سجایا
صحرا و بیاباں کو بنانا تھا ترا کام
کس نے ترے صحرا و بیاباں کو سجایا
باطل نہ ہو تو کچھ بھی نہیں حق کی حقیقت
باطل ہی نے اس جلوۂ پنہاں کو سجایا

اقرار

جس وقت تھا افلاس تفکر کا یہ عالم
تو نے ہی مرے فکر کو ایقاں سے سجایا
تمہید کہ ماں باپ نے تھی مجھ کو سکھائی
پھر اس نے ہی میرے دلِ ویراں کو سجایا
دل گُل کی مہک، عقل تھی ویران گلستاں
لی گُل سے مہک اور گلستاں کو سجایا
جب شمع کا جلنا بھی نہ آساں تھا تو میں نے
سورج سے کرن لے کے شبستاں کو سجایا
صدقے تری بے رنگیِ قدرت پہ کہ تو نے
سو رنگ سے اس عالمِ امکاں کو سجایا
پھر سینۂ ویراں ہے تری یاد کا مسکن
پھر جس نے مرے سینۂ ویراں کو سجایا
جو تو نے دیا غنچۂ و شبنم کی زبانی
میں نے اسی پیغام سے دیواں کو سجایا

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
اے ۲۵، گورنمنٹ کوارٹرز گاندھی نگر، جموں (کشمیر)

خود نوشت

یوسف ناظم



ایک ناگفتہ بہ آپ بیتی

نام: سید محمد یوسف ۔ تخلص ناظم

قلمی نام: یوسف ناظم

ولادت: ۷ نومبر ۱۹۲۱ء (سرکاری ریکارڈ میں ۱۹۱۸ء درج ہے)

وطن: جالنہ ۔ جو پہلے ریاست حیدرآباد کا ایک تعلقہ تھا، اب ریاست مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے (مرہٹواڑہ)

جالنہ ہائی اسکول سے میٹرک اور اورنگ آباد کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ایم اے کی سند حاصل کی اور ریاستی محکمۂ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز۔

ریاستوں کی تقسیم جدید کے بعد ریاست مہاراشٹر میں لیبر آفیسر کی حیثیت سے منتقل اور دسمبر ۱۹۷۶ء میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر آف لیبر وظیفے پر سبکدوشی۔ ڈپٹی لیبر کمشنر کے بھی فرائض انجام دیے۔

شاعری کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے۔ مزاح نگاری ۱۹۴۴ء سے شروع کی۔ کالم نگاری اور ترجمہ کے علاوہ تبصرہ نگاری، تالیف اور ادارت کا کام بھی ادبی مشاغل میں شامل ہے۔

پہلا قابلِ ذکر انعام: ۱۹۴۲ء میں بزم اقبال (حیدرآباد) کا مضمون نگاری (کل ریاستی مقابلہ میں) انعام اوّل۔

مہاراشٹر اسٹیٹ کے محکمۂ تعلیم کا ۱۹۷۲ء میں "زیرِ غور" پر انعام

آندھرا پردیش، اترپردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹر اسٹیٹ اور ریاست بہار کی اُردو اکادمیوں کے مختلف تصانیف پر انعامات۔

غالب ایوارڈ برائے طنز و مزاح ۱۹۸۴ء (غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی)

کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ ہریانہ اُردو اکادمی ۱۹۸۹ء

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی ۔ ممبر سکریٹری (چار سال)۔ انجمنِ زندہ دلانِ بمبئی صدر ۔ مہاراشٹر اسٹیٹ انجمن ترقی اُردو جنرل سکریٹری

مہاراشٹر اردو اکادمی کا ادبی خدمات کا ریاستی ایوارڈ۔

تصانیف

۱۔ کیف و کم	ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد	۱۹۶۲ء
	دوسرا ایڈیشن میرا اینڈ کمپنی دلّی	۱۹۹۲ء
۲۔ فٹ نوٹ	نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ	۱۹۶۴ء
۳۔ دیوار پیے	نقش کوکن پبلیکیشنز ممبئی	۱۹۷۱ء
۴۔ زیرِ غور	بنت حوا پبلی کیشنز ممبئی	۱۹۷۲ء
۵۔ سائے ہمسائے (خاکے)	شگوفہ حیدرآباد	۱۹۷۵ء
۶۔ فقط	مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۷۷ء
۷۔ البتّہ	شگوفہ حیدرآباد	۱۹۸۱ء
۸۔ ذکرِ خیر (خاکے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۸۲ء
۹۔ بالکلیات	ایضاً	۱۹۸۴ء
۱۰۔ فی الحال	"	۱۹۸۶ء
۱۱۔ فی الفور	"	۱۹۸۹ء
۱۲۔ فی الحقیقت	"	۱۹۹۰ء
۱۳۔ فی زمانہ	کارگ پبلیکیشنز (نیر دہلی) دہلی	۱۹۹۱ء
۱۴۔ فی البدیہہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۹۴ء
۱۵۔ امریکا میری عینک سے	شگوفہ حیدرآباد	۱۹۹۶ء
۱۶۔ منجلہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۹۶ء

تالیفات

کتاب نما وجد نمبر ۱۹۸۴ء

شگوفہ ہندوستانی مزاح نمبر ۱۹۸۵ء

سہ ماہی تکمیل شاد نمبر ۱۹۸۹ء
عزیز قیسی نمبر ۱۹۹۳ء

بچوں کے لیئے

۱. پلک نہ مارو	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۷۴ء
۲. مُرغی کی چار ٹانگیں	"	۱۹۸۲ء
۳. گاندھی جی جنوبی افریقہ میں	"	۱۹۸۳ء
۴. بکرے کی تعریف میں	"	۱۹۹۲ء
۵. الف سے یے تک		۱۹۹۲ء

منظوم ترجمے

۱. ارمغان سنسکرت (بھرتری ہری کی نظمیں) مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۵ء
۲. نوائے کبیر (کبیر کے دوہے اور گیت) ممبئی ۱۹۹۷ء

نوٹ: مُصنّف کے مضامین کا ایک انتخاب "زیرِ غور" کراچی سے بھی شائع ہوا۔

تمہید

خودنوشت سوانح درحقیقت ایک سانحہ ہوتی ہے اور میرے حساب سے سوانح سانحے کی ہی جمع ہے۔ خودنوشت لکھنے والا ہر شخص اپنی عیب جوئی نہیں کر سکتا۔ اُردو ادب دو سو قسم کے اعتراضات سے محفوظ ہے اور یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ انسان تو سب جگہ ایک سے ہوتے ہیں اس لیے اگر کسی کے گھر میں جھانکنا ہو جب کہ اس شخص نے خود ہی سارے دروازے اور دریچے کھول رکھے ہوں تو اُردو کے بجائے کسی دوسری زبان میں اور کسی دوسرے ملک میں لکھی ہوئی آپ بیتی پڑھ کر خوش ہو لینا چاہیئے۔ سفرناموں اور آپ بیتیوں میں جھوٹ کی چھوٹ ہوتی ہے جتنا چاہو جھوٹ لکھو۔ پہلے یہ جھوٹ کتاب ہی میں دفن رہتا تھا لیکن اب فوراً پکڑا جاتا ہے، کیونکہ سفر صرف ادیب ہی نہیں کرتے، قاری بھی کرتے ہیں بلکہ قاری ہی کرتے ہیں۔ ادیب تو 'دعوت' کا انتظار کرتے ہیں (بلکہ خود ہی اس کا اہتمام بھی کرنے کے موقف میں ہوتے ہیں)۔ پہلے صرف ادیب ذہین ہوا کرتے تھے (یا ایسا سمجھا جاتا ہے) اب قاری زیادہ ذہین ہو گئے ہیں، کسی کی بھی تصنیف پڑھ کر مطمئن نہیں ہوتے

دوسرا فرق یہ بھی سامنے آیا ہے کہ سیاست کی طرح تنقید بھی عام ہو گئی ہے اور جذبۂ تنقید ہر شخص میں سرایت کر گیا ہے۔ ایک تنقید نگار کی تنقید دوسرے تنقید نگار کو تو پسند نہ آنے کی بات سمجھ میں آتی ہے، قاریوں کو بھی ان کی تنقیدیں یا تو یک طرفہ دکھائی دیتی ہیں یا بے سمت۔ اس لیے چند ذہین قاری کسی دن شام کے وقت ایک مناسب جگہ پر سر جوڑ کر بیٹھتے اور کسی کی خودنوشت سوانح کے پُرزے اڑا دیتے ہیں (بخیے کا لفظ زیادہ موزوں ہے)۔ خودنوشت سوانح اکثر صورتوں میں اس وقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے جب سوائے راوی کے اہم واقعات کے سارے اہم کردار اپنا اپنا پارٹ ادا کرنے کے بعد اسٹیج سے رخصت ہو چکے ہوتے ہیں۔

خاکسار کو جہاں تک یاد ہے برسوں پہلے ایک آپ بیتی پڑھی تھی سر رضا علی کی تصنیف۔ نہایت شریفانہ۔ ادھر جو آپ بیتیاں شائع ہوئی ہیں ان میں ادا جعفری، بیگم اختر رائے پوری کی سوانح حیات نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ قابلِ قدر۔ ایک چھوٹی سی آپ بیتی، شاید صرف ۳، ۴ صفحوں پر مشتمل بیگم اختر کی بھی پڑھنے کو ملی تھی۔ صاف ستھری اور دلچسپ۔ نہ کسی پر چوٹ، نہ کوئی کھوٹ۔ تین چار صفحوں میں گنجائش ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر بات لکھنے والے کی نیت اور اس کے مزاج کی بھی ہوتی ہے۔ ن۔م راشد نشرگاہ کے سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے کیا تھے اس کا ادب سے کیا تعلق ہے کیا اکبر الٰہ آبادی اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے بارے میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے عدالتی فیصلے کس نوعیت کے لکھے اور خود ان کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی تھی یا انھیں غیر معمولی مراعات سے نوازا گیا تھا۔ اسی طرح کیا کسی قاری کے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا ہے اگر اُسے یہ نہ بتایا جائے کہ کسی پروفیسر کے انتخاب کے موقع پر ایک مخصوص ممتحن نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

کسی بھی آپ بیتی نویس کو یہ نہیں معلوم ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں آپ بیتیوں ہی کے ذریعے "تقررات" کی تفصیلات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ایک قاری کے دل پر کیا گزری۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ کوئی ادیب ایک قاری کی آپ بیتی ایک

ادیب کی زبانی ہی معرضِ تحریر میں لائے۔ یہ ہونا چاہیے اس لیے کہ کسی شناسا کے ذکر میں شریک ہونا اچھی بات ہے۔ خاکسار کی رائے یہ بھی ہے کہ آپ بیتی بھی 'غیبت' کی ایک قسم ہے جو تحریر کی شکل میں پیش کی جاتی ہے کہ اسے پڑھ کر بعد میں مصنف کی غیبت کی جائے۔ ویسے سے دیا یونہی جلتا رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ادب میں روشن خیال لوگوں نے جتنی تاریکی پھیلائی ہے اتنی معتدل مزاج و ذہن کے لوگ نہیں پھیلا سکے ہیں۔

ان ملکوں میں جہاں دولت کی اتنی افراط ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب روپیہ کس مد میں خرچ کیا جائے وہاں "اسکینڈل" پھیلانا ایک ہابی ہے۔ ایسی ہابی جس میں سب ہاتھ بٹاتے ہیں اور اسکینڈل نویس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں اس کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ہم بنیادی طور پر امن پسند لوگ ہیں اور ہماری ضرورتیں محدود ہیں۔ ادب میں جمود طاری رہے تو کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ یہ ہر حال میں کسی وبا سے بہتر ہوتا ہے۔

غبارِ خاطر آپ بیتی نہ ہوتے ہوئے بھی آپ بیتی ہی ہے لیکن ایسی آپ بیتی لکھنے کے لیے جیل جانا پڑتا ہے۔

ایک آپ بیتی پڑھنے کے بعد ایک صاحبِ طرز نقاد نے فرمایا تھا 'ارے یہ صاحب تو دودھ کے دھلے نکلے۔ لیکن یہ دودھ ہندستانی بھینس کا نہیں، نیوزی لینڈ کی بھینس کا معلوم ہوتا ہے"۔ یہ سن کر دوسرے صاحبِ طرز تنقید نگار نے فرمایا: "لیکن دودھ کی بو تو آپ کے منھ سے آرہی ہے"۔ — مجھے بہرحال کوئی خطرہ نہیں ہے کیوں کہ کسی بھی صاحبِ طرز تنقید نگار کو یہ آپ بیتی پڑھ کر اپنی عاقبت خراب نہیں کرنی ہے۔

اس تمہید کے ساتھ ایک ناگفتہ بہ آپ بیتی پیش کرتا ہوں (اسے نانوشتہ بہ کہنا مجھے عجیب معلوم ہوا۔ اور یوں بھی جب کہی جاتی ہے اور لکھی بھی تو ناگفتہ بہ کی ترکیب ہر لحاظ سے صحیح ہے)۔

اصل آپ بیتی

جیسا کہ قدرت کو منظور تھا' میں حسبِ نظام العمل ۷ر نومبر ۱۹۲۱ء کو ریاست حیدرآباد (مرحوم) کے جالنہ نام کے ایک تعلقے میں پیدا ہوگیا۔ یہ ماہ رمضان تھا۔ جالنہ ریاست حیدرآباد کے اورنگ آباد ضلع کا تعلقہ تھا اور تجارتی مقام تھا۔ اس زمانے میں اسے لوگ جالنہ سونے کا پالنا بھی کہا کرتے تھے۔ میری پیدائش کے بعد بھی جالنہ کی اس عرفیت کا سلسلہ باقی رہا۔ والد ماجد سید محمد ایوب صاحب جالنہ کے سربرآوردہ وکلا میں سے تھے۔ فرخ آباد سے حیدرآباد دکن ہوتے ہوئے جالنہ آئے تھے۔ یہ واقعہ ہوگا بیسویں صدی کے پہلے یا زیادہ سے زیادہ دوسرے دہے کا۔ والدہ صاحبہ ضلع فتح گڑھ کے موضع پتونجہ کی تھیں۔ والد صاحب نے حیدرآباد سے درجہ اوّل کی وکالت کا امتحان پاس کیا تھا اور جالنہ میں اپنی عملی زندگی کا آغاز۔ (ایڈووکیٹ وغیرہ تو بعد میں پیدا ہونے شروع ہوئے تھے) جو لوگ درجہ اول کے وکیل ہوتے تھے ان کے نام کے آگے وکیل درجہ اوّل خاص طور پر لکھا جاتا تھا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس درجے کے وکیل' عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) میں بھی پیروی کر سکتے ہیں۔

میں اپنے بھائی بہنوں میں' جن کی کل تعداد ۷ تھی' چوتھے نمبر پر تھا۔ مجھ سے پہلے ایک بھائی اور دو بہنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ بچپن میں بہت سخت بیمار رہا اور کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو تقریباً فوت ہو چکا تھا چیچک نکل آئی تھی، جو کسی انجانے راستے سے پیٹ میں اتر چکی تھی۔ قدرت کو شاید یہ بھی منظور تھا کہ میں آگے چل کر کچھ ادب وغیرہ میں دخل دوں (اسے دخل در معقولات بھی کہا جاتا ہے) اس لیے مجھے بِن کھلے مُرجھا جانے سے بچالیا گیا۔ جب میں مدرسہ جانے کے سنِ شعور کو پہنچا بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی مجھے جالنہ کے تحتانیہ اسکول میں داخل کرادیا گیا (وہ زمانہ تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ نام کے مدارس کا تھا اور تحتانیہ میں ایک جماعتِ صغیر بھی ہوتی تھی اور پہلی جماعت میں جانے سے پہلے اس تمہیدی جماعت کا فارغ التحصیل ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا)۔ مدرسے میں داخلے کے وقت پہلا کام ہوا کہ میری تاریخِ پیدائش غلط لکھا دی گئی۔ والد صاحب نے اپنے جن دوست کے ساتھ مجھے مدرسے بھیجا تھا وہ غالباً صرف ہجری مہینوں کا درک رکھتے تھے اور انھیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مدرسوں میں بچے کے نام، اس کے دین و مذہب اور ولدیت کے ساتھ ساتھ عمر بھی دریافت کی جاتی ہے۔ ان صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے فی البدیہہ میری عمر طے کی اور سنہ ولادت ۱۹۱۸ء لکھا دیا جو میرے وجود کا

جز و لاینفک اس لیے ہوگیا ہے کہ تعلیمی اسناد، سارے سرکاری دفاتر یعنی جہاں میں نے ملازمت کی اور راشن کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنے کے لیے درخواستیں دیں، یہی ۱۹۱۸ء حرفِ آخر کی طرح موجود رہا، اور نتیجتہً میں ہمیشہ 'سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر' کی طرح اپنی عمر سے آگے آگے چلتا رہا۔ اس لیے میں جتنا 'بزرگ' نظر آتا ہوں اس سے زیادہ ذاتِ بزرگ ہوں۔ یہ کوئی بہت اہم بات نہیں ہے لیکن کسی اور وجہ سے نہ سہی میں اپنی دانست میں اپنی پیدائش کی دو مختلف تاریخوں کی وجہ سے اپنے آپ کو ان بزرگانِ ادب کی فہرست میں شامل سمجھتا ہوں جن کی تاریخ پیدائش کے بارے میں لوگ (خواہ مخواہ) پریشان ہوتے اور اپنے ذاتی وقت کے علاوہ دوسروں کا وقت بھی، غیر ضروری کاموں میں استعمال کرتے ہیں (یہی میری کمائی ہوگی)۔

ان دنوں جالنہ میں برقی روشنی نہیں تھی اس لیے ہم نے جو کچھ بھی پڑھا، مٹی کے تیل سے جلنے اور چلنے والی قندیلوں کی روشنی میں پڑھا۔ شام ہی سے قندیلوں کے حجاب صاف کیے جاتے اور تیل میں ڈوبنے والی بتیوں کو تبدیل کیے جانے کے انتظامات شروع ہو جاتے۔ ہفتے میں ایک آدھ دن پٹرومیکس بھی جلایا جاتا۔

روایتی آپ بیتیوں کی طرح مجھے بھی لکھنا پڑ رہا ہے کہ ہمارا گھر کافی وسیع تھا، احاطہ پھیلا ہوا تھا۔ احاطے ہی میں ایک کنواں تھا، حوض تھا اور والد صاحب کو چوں کہ کھیت، خانہ باغ اور گھر کو سرسبز و شاداب رکھنے کا شوق تھا، اس لیے احاطے کے ایک حصے میں مکئی کی پیدائش کا انتظام تھا تو دوسرے حصے میں ترکاریوں کی افزائش کا۔ سامنے کے حصے میں اچھا خاصا باغ تھا۔ گھر ہی میں موٹھ چلتی تھی، بیل بندھے رہتے تھے۔ گھر میں ایک بہیلی بھی تھی اور بگھی بھی۔ والدہ صاحبہ کو مرغیوں اور بکریوں سے دل چسپی تھی اور صحن میں ہمیشہ شور ہوتا رہتا تھا۔ صحن ہی میں ہارسنگھار کا درخت تھا اور باہر موگرے اور بیلے کے پودے۔ پپیتے کے اور کچھ موسمی اور سنگتروں کے درخت۔ انجیر کے درخت میرے ذمے تھے اور انجیروں کو طوطوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ٹین کے بنے ہوئے ہوادار خود بروئے کار لائے جاتے تھے۔

اُس زمانے میں شاید کرنسی (کاغذ کے نوٹ) تھی ہی نہیں خالی سکہ چلتا تھا اور ٹوکروں میں سکے بھر دیے جاتے تھے جنھیں گننا نہیں پڑتا تھا۔ جتنے سکے بتائے جاتے، اتنے ہی ان ٹوکروں میں پائے جاتے۔

جالنہ میں 'مقدمہ بازی' کا اچھا خاصا چلن تھا اور خاص طور پر 'دیوانی' کے مقدمات کا بازار ہمیشہ گرم رہتا۔ حیدرآباد دکن میں اُس زمانے میں "دکن لا رپورٹ" شائع ہوتا تھا جو پابندی سے ہمارے یہاں آتا۔ اخباروں میں مدینہ (بجنور)، رسالوں میں کھلونا، تہذیبِ نسواں اور عصمت۔ والد صاحب کی اچھی خاصی لائبریری تھی۔ شبلی نعمانی کی تو ساری کتابیں موجود تھیں۔ میں تحتانیہ کی حد تک بہت اچھا طالب علم تھا چوتھی جماعت سے مجھے راست چھٹی جماعت میں ترقی دی گئی (جس کا نتیجہ برا نکلا)۔ وسطانیہ میں تو میں اچھا خاصا رہا لیکن فوقانی جماعتیں میری استطاعت سے ذرا زیادہ ثابت ہوئیں۔ میٹرک کا امتحان میں نے دو سال میں کامیاب کیا۔ کھیل کود میں کافی مصروف رہا۔ فٹ بال، ہاکی اور بیڈمنٹن کا تقریباً چیمپین تھا (فوقانی سطح تک)۔ اُس زمانے میں صوبائی ٹورنامنٹ اعلا پیمانے پر منعقد ہوتے تھے۔ اس میں جالنہ کی ٹیم اکثر فتحیاب ہوا کرتی تھی۔ جب کہ جالنہ تعلقہ تھا اور ٹیموں میں اضلاعی ٹیمیں بھی حصہ لیتی تھیں۔ صوبائی ٹورنامنٹ میں فتحیاب ہونے والی ٹیم کو ریاستی سطح پر کھیلنے کا موقع ملتا تھا اور ایک مرتبہ ہماری فٹ بال ٹیم صوبائی ٹورنامنٹ جیت کر حیدرآباد بھیجی گئی۔ شہر میں ہمارا جلوس نکالا گیا تھا۔ میں اس ٹیم میں شامل تھا جہاں تک مطالعے کا تعلق ہے، میرا مطالعہ ادبی، علمی اور دینی تھا ایک طرف راشد الخیری میرے بڑے پسندیدہ ادیب تھے تو دوسری طرف حجاب امتیاز علی کا میں پرستار تھا۔ امتیاز علی کا ڈرامہ 'انارکلی' مجھے تقریباً حفظ تھا۔ سیرت محمد علی اور 'الفاروق' کے علاوہ 'بانگ درا'، 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' دونوں مجھے حفظ تھے۔ انگریزی کی تقریریں بھی میں نے زبانی یاد کر لی تھیں، ان میں انطونی کی وہ مشہور تقریر بھی تھی جس میں وہ ہر دس جملوں کے بعد دُہراتا تھا —

"لیکن بروٹس تو معزز آدمی ہے۔"

میں تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتا تھا اور حد یہ ہوگئی کہ مسجدوں میں نماز کے بعد نمازیوں سے بھی مخاطب ہوتا تھا۔ میٹرک یعنی دسویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے ہی "شاعر" بھی بن چکا تھا۔ جالنہ گو کہ

'ادبی شہر' نہیں تھا لیکن مشاعرے تو بہرحال ہوتے ہی تھے۔ دو تین اساتذہ بھی موجود تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان میں سے ایک استاد شاعر نے اپنے ایک شعر میں لفظ 'اضمحال' استعمال کیا تھا یہ سمجھ کر کہ مضمحل کی یہ جائز اولاد ہے۔ جالنہ بھر میں دھوم مچ گئی تھی۔ میں نے غزل ہی سے اپنی شاعری شروع کی تھی اور اپنا ایک شعر بھی مجھے اس لیے یاد رہ گیا کہ دوسروں کو یاد تھا ؎

اللہ رے نزاکتِ طبعِ لطیفِ یار
نازک ہے اس قدر کہ نزاکت ہی بار ہے

حالانکہ اس زمانے میں 'یار' کسے کہتے ہیں' اس کا علم نہیں تھا۔ اس زمانے کی شاعری میں 'اضافتیں' بہت رائج تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے ادبی ماحول اورنگ آباد میں ملا۔ اورنگ آباد میں بھی اس وقت صرف انٹرمیڈیٹ کالج تھا اور اس کالج کی شہرت پورے ہندستان میں اس لیے تھی کہ وہاں مولوی عبدالحق اور وحیدالدین سلیم جیسے زعما موجود تھے۔ میں جب اورنگ آباد کالج میں شریک ہوا تو مولوی عبدالحق حیدرآباد جا چکے تھے۔ سکندر علی وجد اور اشفاق حسین بھی فارغ التحصیل ہو کر جامعہ عثمانیہ میں زیرِ تعلیم تھے لیکن شہر میں اچھا خاصا ادبی ماحول جاری و ساری تھا۔ مشاعرے تو ہر ماہ ہوتے ہی تھے۔ ایک مشاعرہ تو وہاں کا بہت مشہور ہے جس میں شاعروں کو جمع کر کے ان کی بیاضیں جلا دی گئی تھیں اور شاعری سے راہِ فرار اختیار کرنے والوں کا دور تک پیچھا کیا گیا تھا۔ کالج کے تین اساتذہ: ابراہیم صاحب، غلام طیب صاحب اور تقی صاحب بہت مشہور تھے۔ ابراہیم صاحب تاریخ پڑھاتے تھے، طیب صاحب اُردو اور تقی صاحب معاشیات۔ ذریعۂ تعلیم اُردو تھا اور گو کہ تقی صاحب صحیح اُردو میں لکچر دیتے تھے لیکن غلام طیب صاحب، جو شاعر بھی تھے' ان سے یہی کہا کرتے تھے کہ:

"میرے گھر کی بکری تم سے اچھی اُردو بولتی ہے۔"

طیب صاحب کی ایک نظم جو انھوں نے اپنی بیوی کی وفات پر لکھی تھی 'یادِ نشاط' بے حد مقبول تھی اور اس کی شہرت اورنگ آباد سے حیدرآباد تک پہونچ چکی تھی، مجھے بھی یاد تھی۔ "ہوا چلی اور میں گر گیا" اسی نظم کا مصرع تھا۔ گھر کا نام بھی انھوں نے "پریم کُنج" رکھا تھا ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے جوابی پرچے یونیورسٹی میں اب تک محفوظ ہیں۔

صبح سویرے ابراہیم صاحب کے گھر چلے جاتے تھے اور 'حالاتِ حاضرہ' سے مکمل طور پر لیس ہو کر ابراہیم صاحب سے پہلے کالج پہونچ کر اسٹاف روم میں سارے حالاتِ حاضرہ بیان کر کے اپنی سیاسی اور سماجی سوجھ بوجھ کی دھاک بٹھا دیتے تھے اور جب ابراہیم صاحب کالج پہونچتے تو انھیں پتہ چلتا کہ جو کچھ بھی انھوں نے گھر پر طیب صاحب کو بتایا تھا کہ وہ طشت از بام ہو چکا ہے۔ کرکٹ میچ کی کمنٹری سننے پر طالب علموں کو حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تھا اور فصیل سے لگے ہوئے میدان میں جسے عام خاص کا میدان کہا جاتا تھا، ہر ہفتے کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے جس کے کپتان یہی دو اساتذہ ہوتے اور ہارنے والی ٹیم کے کپتان کو ایک بکرا ہارنا پڑتا تھا۔

ہائی اسکول کے اساتذہ میں بھی کوکب صاحب، سروش صاحب بڑے شاعر تھے۔ یعقوب عثمانی بعد میں شامل ہو گئے تھے۔ صابر صاحب عربی اور دینیات پڑھاتے تھے اور بہت اچھے حکیم تھے۔ "یاقوتی" گھر پر تیار کرتے تھے جس میں خالص موتی بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ کالج کے احاطے میں ٹینس کورٹ بھی تھا اور سوئمنگ پول بھی۔ اس زمانے میں سارے مدرسوں اور کالجوں میں "ترانہ" ضرور پڑھایا جاتا تھا۔ ہم نے برسوں "تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھے" بآوازِ بلند مع ترنم پڑھا ہے اسی میں ایک شعر تھا ؎

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

(عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کا نام تھا اور نمازِ جمعہ کے خطبے میں یہ نام لیا جاتا تھا)۔ اورنگ آباد کالج کی عمارت دو منزلہ تھی۔ اوپر کی منزل میں کالج اور نیچے ہائی اسکول۔ انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کو وی آئی پی کا درجہ حاصل تھا اور ہائی اسکول کے طالب علم ہمیں غور سے دیکھا کرتے تھے۔ شہر میں طالب علموں کا بڑا رعب تھا۔ اضلاعی کالجوں میں یعنی گلبرگہ، رائچور، ورنگل اور اورنگ آباد کے چاروں کالجوں میں اس کالج کی حیثیت واقعی بہت بلند تھی۔ اساتذہ اور طلبا کی وجہ سے بھی اور مولوی

عبدالحق کی قائم ہوئی روایتوں کی وجہ سے بھی۔ اس کالج کے سالانہ جلسے تو یادگار جلسے ہوتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ کا مشاعرہ "دلی کا آخری مشاعرہ" بھی اسٹیج ہوتا تھا جس میں طالب علموں کے علاوہ کالج کے لکچرار بھی بحیثیت شاعر اسٹیج پر نمودار ہوتے تھے۔

ایک سالانہ جلسے میں شہزادہ معظم جاہ شجیع کی بیگم نیلوفر فرحت بھی انعامات تقسیم کرنے آئی تھیں اور انھیں دیکھنے پورا شہر ٹوٹ پڑا تھا۔ (مجھے اپنا انعام لینا یاد ہے)۔ کالج کے پرنسپل محی الدین صاحب تھے جن کے بھائی تقی الدین حیدر آباد میں معتمد کے اعلا عہدے پر فائز تھے، بہار کے تھے۔ جس بنگلے میں رہتے تھے اس کا نام دراصل "بہارستان" تھا، لیکن لوگ اسے بہارستان کہا کرتے تھے۔ اورنگ آباد کالج کے ایک سالانہ جلسے میں حفیظ جالندھری بھی شرکت کر چکے تھے۔ ایلورا، اجنتا دیکھنے کی غرض سے بڑے بڑے لوگ اورنگ آباد آیا کرتے تھے جنھیں کالج میں ضرور بلایا جاتا تھا۔ سر محمد یعقوب کا نام مجھے یاد ہے کیوں کہ مجھے ہی ان کی پیشوائی کے لیے اسٹیٹ ہوٹل بھیجا گیا تھا۔ یوں بھی علی گڑھ یا کسی دوسری یونیورسٹی کے طالب علموں کی جب بھی کوئی ٹیم بغرض تفریح اورنگ آباد آتی تو میں ان کے ایلورا اجنتا کے سفر میں ایک ناقص اور لاعلم گارڈ کی طرح ضرور شریک رہتا۔

۱۹۳۹ء میں جب جامعۂ عثمانیہ کے آرٹس کالج کے افتتاح کی تقریب منعقد ہوئی تو اضلاعی کالجوں سے بھی ایک ایک نمائندہ اس تقریب میں مدعو تھا۔ میں گو کہ فرسٹ ایر کا طالب علم تھا لیکن اس "اعزاز" کا مستحق میں ہی قرار پایا تھا کیوں کہ کالج کے تقریری مقابلے میں جو تقریریں ہوئی تھیں ان میں میری تقریر کم ناقص تھی۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ ابراہیم جلیس گلبرگہ کالج کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے)۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ حیدر آباد میں اضلاعی کالجوں کے نمائندوں کو جن کے سپرد کیا گیا تھا ان کا نام محبوب حسین جگر تھا، جو اب بھی بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ محبوب حسین جگر جیسا کہ سب جانتے ہیں ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی ہیں اور تاحال روزنامہ سیاست حیدرآباد کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں اور "پودے" کے مصنف تو ہیں ہی۔ مکتبہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آصف جاہ سابع نے بہ نفس نفیس انجام دیا اور سونے کا ایک وزنی تالا چاندی کی کنجی سے کھول کر یہ رسم انجام دی گئی۔ کیا شان دار تقریب تھی جس میں اعظم جاہ اور معظم جاہ بھی شریک تھے اور ریزیڈنٹ بھی۔ سارے طلبا نیلی شیروانیوں میں ملبوس تھے، کسی کو اپنی نشست پر ہلنے جلنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ تقریب کے دوسرے دن ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس کی صدارت معظم جاہ شجیع نے کی۔ اسی مشاعرے میں شعر پڑھتے ہوئے صاحبزادہ میکش (حیدرآبادی) غش کھا کر گر پڑے تھے۔ معظم جاہ گھر جلد چلے گئے تھے اور ان کے جاتے ہی اصلی مشاعرہ شروع ہوا، جس میں طالب علموں نے گاؤ تکیے اچھال کر شاعروں کو داد دی۔ ہمارے تقریری مقابلے میں شاید چھ یا سات تقریریں ہوئی تھیں۔ مجھے تقریر کے دوران ہی بٹھا دیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ آپ زیادہ زحمت نہ فرمائیں۔ سکندر علی وجد کی مشہور نظم "مزدوروں کا پیغام فرزندانِ جامعہ کے نام" اسی تقریب کے موقع کی پیداوار ہے جس کا ایک مصرع زبان زد خاص و عام ہے ؎

کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

اورنگ آباد کالج کا ایک رسالہ بھی شائع ہوتا تھا "نورس"۔ (میری کچھ نظمیں اب بھی نورس کے شماروں میں دیکھی جا سکتی ہیں اس لیے کہ اب وہ شمارے نایاب ہیں)۔

انٹرمیڈیٹ کالج کی فیس اُس وقت آٹھ رُوپیے سکۂ حالی تھی اور چونکہ میٹرک کے امتحان میں مجھے غیر ضروری طور پر اُردو کے پرچے میں زیادہ نمبر مل گئے تھے اس لیے مجھے سرکاری طور پر "برسری" بھی ملتی تھی۔ یہی صورت حال میرے ساتھ آگے بھی رہی یعنی جب میں اورنگ آباد سے ۱۹۳۹ء میں فارغ ہو کر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں شریک ہوا (تو شاید ۸ یا ۱۲ رُوپے کی ماہانہ برسری بی۔اے میں ملتی رہی (آنرز میں شان دار نشانات حاصل کرنے پر) اور ایم اے میں تو باضابطہ ۳۰ روپئے ماہانہ بطور وظیفۂ تعلیمی کامیں (اتفاقی طور پر) مستحق قرار پایا تھا اتفاقی طور پر اس لیے کہ ریاست میں اپنے مضمون میں اوّل آنے والے اسی مضمون میں ایم اے کرنے کے لیے یہ وظیفہ مقرر تھا لیکن رمنیر اکبر حسین (جو اوّل آئی تھیں اُردو کے بجائے فارسی میں ایم اے کرنے لگیں اس لیے قرعۂ فال میرے نام نکلا، جس کی خبر ایم اے میں داخلے کے کئی مہینے بعد ملی اور میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا)۔

حیدرآباد اُس زمانے میں علمی اور ادبی کارناموں کا مرکز تھا۔ جامعہ عثمانیہ تو اُردو ذریعہ تعلیم کی اولین اور واحد جامعہ تھی ہی دارالترجمہ بھی موجود تھا جس کی تصانیف، اصطلاحات پر مشتمل، آج بھی لوگوں کو مطلوب ہیں۔ حیدرآباد میں بڑے بڑے شاعر، انشا پرداز اور صحافی موجود تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ تو وہاں جج تھے، امجد حیدرآبادی، قاضی عبدالغفار، مرزا عصمت اللہ بیگ، علی اختر، ماہر القادری، حسرت ترمذی، فانی بدایونی، نجم آفندی، مخدوم محی الدین، میکش حیدرآبادی، شاہد صدیقی، بدر شکیب اور اس وقت کے نوجوان شاعروں میں نظر حیدرآبادی، سلیمان اریب، تحسین سروری (یہ چند نام بطور تبرک پیش ہیں) دکن ریڈیو (جو شروع شروع میں خانگی ادارہ تھا) موجود تھا جو نشر گاہ لاسلکی حیدرآباد کہلاتا تھا۔ ہندستان کے سارے بڑے بڑے شاعر حیدرآباد کے مشاعروں میں شرکت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کی فہرست نہیں، کہکشاں کہنا چاہیے۔ قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر، ریگلر رضی الدین صدیقی، خلیفہ عبدالحکیم، مناظر احسن گیلانی، ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر سجاد، ڈاکٹر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر نظام الدین (فارسی)، ڈاکٹر حمید اللہ (قانون) ڈاکٹر ٹوپے (تاریخ)، ڈاکٹر شمبھو پرشاد، پنڈت ونشی دھر (ہندی) ودیا لنکار (ہندی)، مولوی عبدالحق کے چہیتے شاگرد، ڈاکٹر اعجاز حسین (ڈاکٹر ذاکر حسین کے عزیز) معاشیات، پروفیسر گھوش، پروفیسر حسین علی خاں، پروفیسر ویرو مجمدار اور اسی قبیل کے دوسرے کئی اساتذہ نے جامعہ عثمانیہ کو ہندستان کی محبوب ترین جامعہ بنا دیا تھا۔ قاضی محمد حسین اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی تو وہ شہرت تھی کہ کلکتہ سے طالب علم آکر شعبۂ ریاضی میں داخلہ لیتے۔ اُردو یونیورسٹی ہونے کی وجہ سے اُردو تعلیم کا جو معیار تھا وہ تو تھا ہی۔ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی بھی اسی معیار کی پڑھائی جاتی تھی اور جامعہ عثمانیہ کے مقرر طالب علم الٰہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی زبان کے تقریری مقابلوں میں انعام حاصل کرتے رہے ہیں۔ فلسفے کے طالب علموں کا بھی یہی رویہ تھا۔ عالم خوندمیری کی بحیثیت طالب علم وہ شہرت تھی کہ ان پر استاد ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کی شہر میں بڑی عزت اور شان تھی۔ ہم سب لوگ اپنی نیلی شیروانی سے پہچانے جاتے تھے اور مجھ جیسے "ناچیز" طالب علم بھی کوئی چیز تھے۔ حیدرآباد کی علمی ادبی فضا نے اور جامعہ عثمانیہ کے شاعرانہ ماحول نے اس خاکسار کو بہت کچھ دیا۔

جامعہ عثمانیہ میں ایم۔ اے کا زبردست امتحان تو ہوتا تھا ہی لیکن مقالہ بھی لکھنا پڑتا تھا۔ میں نے جب اپنے مقالے کے لیے اُردو صحافت یا اُردو ظریفانہ ادب کے عنوان سے پیش کیے تو ارباب اقتدار نے مجھے سمجھایا کہ یہ تو ریسرچ اسکالر یا پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے موزوں عنوانات ہیں۔ بہرحال بڑی ردّ و قدح کے بعد مجھے ظریفانہ ادب پر مقالہ لکھنے کی اجازت مل گئی اور مجھے اپنی خود ستائی اور خود نمائی کے لیے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ میں نے کوئی پونے تین سو صفحات کا مقالہ لکھا جو شاید اس وقت کا سب سے دبیز مقالہ تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ میری بسیار نویسی کا آغاز ۴۴۔۱۹۴۳ء میں ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں میں نے مزاح نگاری میں دخل دینا شروع کیا۔ حیدرآباد سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا "میزان" جس کے ایڈیٹر اوج تھے جو بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے وہ مجھ پر بہت مہربان تھے اور میرے مضامین پابندی سے شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں مضمون نگار بننا تو مشکل نہیں تھا لیکن صاحب کتاب بننے کی اجازت یونہی نہیں مل جاتی تھی۔ میری پہلی کتاب ۱۱ سال کی مشق کے بعد چھپی۔ جبکہ آج دو یا زیادہ سے زیادہ تین سال لکھنے کے بعد اپنی کتاب نہ چھپوائی جائے تو لوگ بُرا مانتے ہیں۔ مجھے اپنی پہلی کتاب اس لیے بھی عزیز ہے کہ اس کتاب پر پاکستان میں عابد حسین نے تبصرہ کیا تھا۔ اس حادثے کو ۴۵ سال ہوگئے۔

جامعہ عثمانیہ میں اپنی ۴ سالہ تعلیم کے دوران میں 'اے' ہاسٹل میں رہا۔ 'بی'، 'سی' اور 'ڈی' ہاسٹل بھی تھے لیکن 'اے' کو اس لیے خصوصی اہمیت حاصل تھی کہ اس ہاسٹل میں بالعموم شہر کے یعنی بلدۂ حیدرآباد کے ساکنین رہائش پذیر ہوا کرتے تھے مجھے یہاں اس لیے جگہ ملی کہ میرے بڑے بھائی اس ہاسٹل میں رہ چکے تھے۔ میں نے شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کی بزم ادب کے سکریٹری ہونے کے ناطے شعبے میں تو کچھ نہ کچھ کیا ہی یونیورسٹی کیمپس میں بھی مشاعرے منعقد کیے۔ مخدوم محی الدین جو پہلے لکچرر (سٹی کالج حیدرآباد) اور بعد میں ٹریڈ یونین لیڈر ہوگئے تھے، ان شاعروں

میں بہ طور خاص شریک ہوتے تھے، شہر سے سائیکل پر بیٹھ کر یونیورسٹی کیمپس آتے اور مشاعرہ لوٹ کر واپس ہوتے تھے۔ سرِشام آجاتے اور اس وارننگ کے ساتھ کر ان کے لیے "بندوبست" کر دیا جائے ہاسٹل میں ان کے آنے سے "مہک" پھیل جاتی لیکن چونکہ وہ مخدوم محی الدین تھے اس لیے 'انتظامیہ' کو چُپ لگ جاتی تھی۔ میری 'شاعرانہ عظمت' سے مرعوب نہیں بلکہ مجوب ہو کر مخدوم محی الدین نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں آسمان سے اتر کر زمین پر آؤں اور تخیلی شاعری کرنے کے بجائے کچھ معقول شاعری کروں (اس کا میرے ذہن پر تو نہیں لیکن دل پر کافی اثر ہوا)۔ مخدوم مجھ سے کافی سینیر تھے جب میں جامعہ میں داخل ہوا تو وہ تھے ہی نہیں۔ بی۔اے کرنے کے بعد انھوں نے تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا تھا اور دو چار سال بعد ایم۔اے میں داخلہ لے کر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے' اس لیے آپ اندازہ لگائیے کہ وہ کتنے سینیر ہوں گے۔ ان کے ہم عصر سید اشفاق حسین تو ہاسٹل میں اس لیے تھے کہ ریسرچ اسکالر تھے وہ بھی چند دن۔ بعد میں وہ مکش، عاقل علی خاں دکن ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ان کے ساتھی میر حسن اور ظفر الحسن پہلے ہی سے نشرگاہ لاسلکی میں موجود تھے۔ مجھے انھی کی وجہ سے 'ریڈیو اسٹار' بننے کا موقع مل گیا یعنی طالب علمی ہی کے زمانے میں۔ اس وقت کا معاوضہ پانچ روپیے تھا جو آج کے پانچ سو سے بھی زیادہ تھا۔

میں نے اُردو میں ایم۔اے اپنی ضد کی بنا پر کیا تھا، ورنہ والدصاحب تو مجھے وکیل بنانا چاہتے تھے۔ خاندان میں سبھی وکیل تھے' میرے دو چچا وکیل' بڑے بھائی وکیل' بڑے بہنوئی وکیل۔ اسلیے میں نے اپنے لیے قانون کے پُر پیچ راستے کے بجائے ایم۔اے کا (وہ بھی اُردو) آسان راستہ پسند کیا۔ اور کیا عرض کروں اس زمانے میں یعنی آج سے نصف صدی سے بھی ۲، ۴ سال زائد ایم۔اے ہونا معرکے کی بات تھی اور میں تو اپنے وطن جالنہ کا پہلا ایم۔اے تھا (ویسے ایل ایل بی کئی تھے)۔

مارچ ۱۹۴۴ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد ملازمت تلاش کرنے کے لیے حیدرآباد ہی میں ٹھہرا رہا اور اتفاق دیکھیے کہ نومبر ۱۹۴۴ء میں مجھے محکمۂ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس وقت اس کا گریڈ تھا۔ ۸۰ تا ۱۲۰؛ ۱۴ روپیے گرانی الاؤنس کے ملتے تھے۔ اس ملازمت کا قصہ بھی دل چسپ ہے۔ میر ظفر الحسن چاہتے تھے کہ میں نشرگاہ لاسلکی سے منسلک ہو جاؤں۔ پتہ نہیں کیا چیز حارج ہوئی یا میں خود پس و پیش کرتا رہا۔ اتفاق سے "توپ کا سائچہ" (جو گن فاؤنڈری کا ترجمہ تھا) میں اسٹیٹ بینک کی عمارت کے باہر بے مقصد کھڑا تھا، کہ بینک سے لنچ کیلئے باہر آتے ہوئے بینک آفیسر باقر خاں کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ یہ 'اے' ہاسٹل میں مجھے دیکھ اور پرکھ چکے تھے۔ پوچھا:

"کیا کر رہے ہو؟"

"ملازمت ڈھونڈھ رہا ہوں۔"

"چلو میرے ساتھ۔"

اپنی سائیکل کے کیریر پر لاد کر مجھے وہ لیبر آفس لے گئے۔ مہدی علی مرزا سے ملایا جو اس وقت لیبر افسر تھے (یہی سب سے بڑے افسر تھے لیبر کمشنر کا عہدہ تو بعد میں قائم کیا گیا۔ تعارف ہوا جس کی ضرورت اسلیے نہیں تھی کہ موصوف اس عہدے پر فائز ہونے سے پہلے انسپکٹر آف فیکٹریز کی حیثیت سے جالنہ میں کام کر چکے تھے' مجھے انھوں نے پہچان لیا (چھوٹے شہر خواہ مخواہ معمولی درجے کے سمجھے جاتے ہیں حالاں کہ اس کے فوائد زیادہ ہوتے ہیں)۔ باقر خاں نے (جو آجکل کراچی میں مالیاتی مشیر کی حیثیت سے آزادانہ پریکٹس کر رہے ہیں) ان سے کہا کہ وہ میرا امتحان لے لیں کہ آیا میں مترجم کی خدمات کا اہل ہوں یا نہیں۔ مہدی علی مرزا نے کسی انگریزی کتاب کے دو صفحے میرے حوالے کر دیے کہ میں ان کا ترجمہ کر دوں — اور لنچ کھانے لگے۔ باقر خاں واپس ہو گئے' اور اس سے پہلے کہ مہدی علی مرزا صاحب اپنا لنچ ختم کرتے' میں نے ترجمہ کر کے رکھ دیا (پھر خود ستائی؟) ترجمہ انھوں نے دیکھا، پسند کیا یا نہیں' لیکن میرے تقرر کی سفارش' اوپر بھیج دی، یعنی معتمد محکمۂ اصلاحات و مال کے پاس۔ اسی وقت میری طلبی ہوئی۔ اس وقت یوسف یار جنگ محکمے کے معتمد کی حیثیت سے برسر کار تھے اور اورنگ آباد میں بحیثیت منصف کام کر چکے تھے۔ جب انھوں نے میرا بایو ڈاٹا (یہ اس زمانے میں رائج نہیں ہوا تھا) دریافت کیا تو فرمایا:

"آپ ایوب صاحب کے بیٹے ہیں۔ آپ کو ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔؟" میرا جواب سُن کر خوش ہو گئے ورنہ انھیں شبہ تھا کہ شاید والدصاحب مجھ سے ناراض ہو گئے ہوں گے اور میں گھر چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں —

ایک صفحہ املا کر دیا۔ یہ وہی یوسف یار جنگ تھے جن کے اورنگ آباد سے ترقی پا کر رخصت ہونے کے موقع پر وہاں کے ایک شاعر نے وداعی نظم کہی تھی جس کا ایک مصرع یہ تھا:

زلیخا بن کے دیوانی مرے یوسف کے گھر آئی

موصوف کا تقرر حیدرآباد میں ناظم عدالت دیوانی کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا۔ میرا لکھا ہوا صفحہ دیکھا جس میں ایک لفظ میں نے غلط لکھ دیا تھا انھوں نے لکھوایا تھا: "تنقید کا اندیشہ ہے" اور میں نے لکھ دیا تھا، "تلخی کا اندیشہ ہے"۔ فرمایا: "میں نے تنقید کہا تھا لیکن کوئی حرج نہیں۔ یہ لفظ بھی موزوں ہے"۔ اور میرے تقرر نامے پر دستخط کر دیئے۔ میں منٹوں میں سرکاری ملازم ہو گیا اور میری ملازمت تعطیل سے شروع ہوئی، وہ اس طرح کہ ریاست حیدرآباد میں محرم کی بارہ[۱۲] دن کی تعطیل ہوا کرتی تھی اور یہ تعطیل میرے تقرر کے دو دن بعد شروع ہوئی۔ (ممکن ہے اس ۱۲ دن کی تعطیل کو آپ تعطل کا نام دیں لیکن ریاست حیدرآباد میں اس قسم کے معاملات میں کفایت شعاری یا خست کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا تھا)۔ محکمۂ لیبر کی توسیع کے پروجکٹ میں لیبر آفیسر کے عہدے کو لیبر کمشنر کے عہدے میں تبدیل کر دیا گیا اور چند نئی (ماتحت) عہدے بھی ایجاد کی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے تھوڑے عرصے ہی میں منتظم اور پھر لیبر افسر کی خدمت پر ترقی دی گئی۔ میرے ذمّے جو کام تھا یعنی لیبر قوانین کو جو انگریزی میں تھے اُردو میں منتقل کرنا تھا وہ کام میں نے اپنی دانست میں بحسن و خوبی انجام دیا تھا۔ انہی دنوں "ترقی پسند مصنفین" کی ولادت عمل میں آئی جس سے ربط و ضبط رکھنا سرکاری ملازمین کے لیے منع تھا، لیکن میں اس انجمن کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک کی دھمک حیدرآباد میں سنائی دی تھی اور اندرونی طور پر "ملجل" کا آغاز ہو چکا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں لکھنا ہے لیکن دیسی ریاست کے باشندے (جنھیں اس زمانے میں نمک خوار بھی کہا جاتا تھا) دہرے انقلاب سے دوچار ہوئے اور جو اتھل پتھل اس وقت شروع ہوئی اس نے بڑے بڑے خیمے اکھاڑ دیئے۔ اس موضوع سے جو اب پامال ہو چکا ہے، صرفِ نظر کرنا ہر لحاظ سے مفید ہے اور یوں بھی میں کون سا دانشور ہوں جو ایک صاف ستھرے مسئلے کو نزاعی مسئلہ بنا کر پیش کرلوں

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ دل سے بجھی ہوئی شمع کی طرح دھواں اُٹھتا ہے لیکن اب تو یہ دھواں بھی ہواؤں میں تحلیل ہو چکا ہے یعنی ہوا شد۔

ایم اے کی جماعت میں ہم صرف تین طالبِ علم — خواجہ حمید الدین شاہد (جو سب رس کے ایڈیٹر تھے) ڈاکٹر زورؔ اور سب رس سے ان کی وفاداری بشرطِ استواری، کا یہ حال تھا کہ جب وہ کراچی منتقل ہوئے تو سب رس اپنے ساتھ لے گئے۔ اپنے گھر کا نام انھوں نے ایوانِ اردو رکھا (کیوں کہ ادارہ ادبیات اُردو کی عمارت 'ایوانِ اُردو' کے نام سے مشہور ہے)۔ 'سب رس' کراچی سے بھی شائع ہوتا ہے اور حیدرآباد سے بھی۔ حیدرآباد کے سب رس کے مدیر اب پروفیسر مغنی تبسم ہیں۔ دونوں جگہ سے پرچہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ دونوں پرچے پابندی سے مجھے مل رہے ہیں، پروفیسر حمید الدین شاہد کی عنایت سے اور پروفیسر مغنی تبسم کی غفلت سے۔ دوسرے طالب علم تھے محمد علی نیر۔ اچھے شاعر تھے۔ میرے نام کی تحذیف انھوں نے ہی کی۔ یہ مجلّہ عثمانیہ کے ایڈیٹر تھے۔ صرف میں ناکارہ تھا۔ اس لیے ڈاکٹر زورؔ کلاس میں مجھ سے ٹوٹوریل لکھایا کرتے تھے۔ (وہ دونوں نوادارییے لکھتے تھے یا وصول شدہ مضامین میں قطع برید)۔ ڈاکٹر زورؔ دکنی اُردو کے اُستاد تھے اور عبدالقادر سروری قصہ نظم کے معلّم۔ ڈاکٹر عبدالقیوم خاں باقیؔ کا اسی زمانے میں لکچرر کی حیثیت سے شعبے میں اندراج تھا۔ ڈاکٹر زورؔ میری نااہلی کی وجہ سے مجھ سے بالعموم ناراض رہتے تھے۔ ویسے بھی کسی بھی اُستاد کے پاس شفقتوں اور مہربانیوں کا اتنا خزانہ نہیں ہوتا کہ وہ تین طالب علموں میں تقسیم کیا جا سکے۔ ڈاکٹر سید سجاد نثر کے اُستاد تھے۔ میرے مقالے کے نگراں کار بھی موصوف ہی تھے لیکن انھوں نے مجھے باقی صاحب کے سپرد کر دیا تھا اور باقیؔ صاحب نے واقعی میری رہنمائی میں اپنے مشاغل (جن میں ستار بجانا شامل تھا) ترک کر دیئے تھے۔ انھوں نے گوئٹے کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا اور مجھے اپنے مقالے کی تیاری کے سلسلے میں ہر روز لائبریری ضرور بھیجا کرتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کا ایک اہم واقعہ طلباء کی عام ہڑتال تھی۔ ۱۹۴۲-۴۳ء میں جامعہ عثمانیہ کے چند طالب علموں کو ریلوے اسٹیشن پر ریلوے اسٹاف

نے مار پیٹا۔ دھوم مچ گئی۔ سارے مضافاتی اسٹیشنوں پر پولیس کا بندوبست کر دیا گیا۔ لیکن طالب علموں کی جو سبکی ہوئی اور جامعہ کے وقار کو جو دھکا پہنچا تھا وہ ایک اسٹرائک کے لیے معقول جواز تھا۔ ڈے اسکالرس اور اقامت خانوں کے تمام مقیم طلباء کا ایک جلوس یونیورسٹی کیمپس سے چانسلر کے گھر روانہ ہوا۔ اتنی منظم، مہذب اور شائستہ اسٹرائک شاید ہی کہیں اور منعقد ہوئی ہو۔ طالب علم میلوں کا فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے شہر کی سڑکوں سے گزرے لیکن کیا مجال جو کسی دکان، ہوٹل یا اسٹال کا کوئی نقصان ہوا ہو۔ آج کل اسٹرائک ہوتی ہے تو دکان دار سب سے پہلے اپنی دکانوں کے شٹر گرا لیتے ہیں۔ یہ بے آواز اور پُرسکون جلوس جب یونیورسٹی کے چانسلر سر اکبر حیدری کے بنگلے "دل کشا" کے قریب پہنچا (ریاست کا صدر المہام یعنی چیف منسٹر یونیورسٹی کا چانسلر ہوا کرتا تھا) تو پولیس فورس نے راستہ روک دیا لیکن ادھر جلوس نے 'طوفان' کی شکل اختیار کر لی جو کسی کے روکے نہیں رکتا ہے۔ لاٹھی چارج کا حکم دے دیا گیا اور پہلی صف کے طالب علم جو سینہ سپر ہو گئے تھے، زخمی ہو کر گر پڑے۔ پھر تو آگ بھڑک اُٹھی۔ انگریز کوتوال شہر پر پتھر بازی ہوئی جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کیا اور اس کی پیشانی لہولہان ہو گئی۔ دیسی ریاست میں ایک انگریز اعلا افسر کا خون؟ کمشنر ہالنس (Hollins) نے کنگ کوٹھی (آصف جاہ سابع کا محل) کا رُخ کیا اسی لہولہان حالت میں اور وہ فوراً باریاب بھی ہوا۔ آصف جاہ سابع کی پیشانی پر بَل پڑ گئے۔

اُدھر جلوس 'دل کشا' میں داخل ہو چکا تھا۔ جونہی رہبران قوم کو خبر ہوئی وہ موقعۂ واردات پر پہونچ گئے۔ ان میں نواب بہادر یار جنگ بھی تھے جنھوں نے کار کی چھت پر کھڑے ہو کر طلباء کو مخاطب کرنا چاہا لیکن چوں کہ یہ صرف مسلمان طلباء کا مجمع تھا اس لیے طلباء نے بہادر یار جنگ سے نہایت شائستہ انداز میں عرض کیا کہ نواب صاحب! یہ آپ کی جگہ نہیں ہے اور بہادر یار جنگ نے بطیب خاطر اس ادعا اور درخواست کو قبول کر لیا۔ تالیوں کی گونج میں واپس ہو گئے۔ بیرسٹر اکبر علی خان آئے (جو برسوں بعد یوپی کے گورنر ہوئے) اور طالب علموں کو تلقین کی کہ وہ کوئی اقدام نہ کریں اور یہ کہ انجمن طلبائے جامعہ عثمانیہ ان کے مقدمے کی پیروی کرے گی۔ اس اپیل کا خاصا اثر ہوا اور

اسی دوران خود اکبر حیدری نے باہر آ کر طلباء کو مخاطب کرنا بہتر سمجھا اور آتے ہی کہا:

"مائی چلڈرن!"

اس تخاطب ہی نے طالب علموں کو ڈھیر کر دیا اور لڑکے شاداں و فرحاں واپس ہونے لگے۔ سر اکبر حیدری نے اپنے کچن اور نعمت خانے کے دروازے سے پولیس ہٹادی اور جو جس کے ہاتھ لگا اس نے نوش کر لیا۔ وزیر اعظم کا کچن منٹوں میں 'کارنر واٹر گون' بن گیا۔ جب طلباء واپس ہوئے تو شہر کے سارے ہوٹلوں نے ان کی تواضع کی۔ مشہور ہوا کہ انجمن طلبائے جامعہ عثمانیہ نے عام اعلان کر دیا تھا کہ طالب علموں کے خورد و نوش پر جتنا بھی خرچ ہوگا وہ انجمن ادا کرے گی۔ لڑکوں کی بھوک تو کھل ہی چکی تھی، تواضع سے انصاف کیا گیا۔ ریلوے کے منیجر کے خلاف تو فوری کارروائی کی گئی لیکن انگریز کمشنر کوتوال شہر کے بہے خون کی قیمت یوں ادا کی گئی کہ زمان خسروی کے ذریعے انجمن طلبائے جامعہ عثمانیہ تحلیل کر دی گئی۔ اس اسٹرائک میں طالب علموں کا جلوس پہلے پرووائس چانسلر کے بنگلے پر بھی گیا تھا اور وہاں ان سب نے اپنی شیروانیاں نذرِ آتش کر دی تھیں۔ عملے نے یہ آگ تو فوراً بجھادی لیکن دلوں میں جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کا سدباب عملے کے بس میں نہیں تھا۔ حالات جب پرسکون ہوئے تو اساتذہ کی فرمائش پر جن طالب علموں سے ممکن ہوا وہ اپنی (یا کسی کی) شیروانی ڈھونڈھ لائے لیکن یہاں بھی پولنگ دس یا پندرہ فی صد سے زیادہ کی نہیں تھی۔

جامعہ عثمانیہ کے اس دور کو یادگار دَور کہا جا سکتا ہے (ویسے ہم سے سینیر طلباء بھی یہی کہتے رہے ہیں) اس کے چند سال بعد تو یونیورسٹی کا حلیہ ہی بدل گیا۔ جس کلچر کی نشو و نما اس یونیورسٹی میں ہوئی تھی وہ کلچر داستانِ پارینہ بن گیا اور لطف یہ ہے کہ جو اس کا شکوہ کرتے ہیں لوگ ان پر ہنستے ہیں کہ یہاں جان و مال کی حفاظت کی فکر میں ہم گھلے جا رہے ہیں اور انھیں کلچر یاد آ رہا ہے۔ ہونہہ! (میں کھلے دل سے اس "ہونہہ" کی تائید کرتا ہوں) جس زمان خسروی کا میں نے اوپر ذکر کیا اس میں مذکورہ اسٹرائک کو "واقعۂ فاجعہ" کہا گیا تھا۔ لوگ بہت دنوں تک 'فاجعہ' کے معنی ایک دوسرے سے پوچھتے رہے اور جب معنی معلوم ہو گئے تو عام تاثر افسردگی و بددلی کا تھا۔ جب ایک تشریح یہ کی گئی کہ

واقعہ فاجعہ کا اشارہ کوتوال شہر کے زخمی ہونے کی واردات کی طرف ہے اسٹرائک کی طرف نہیں تو طلبا، نے اطمینان کی سانس لی اور پڑھائی میں مشغول ہو گئے۔ (ریہ بھی ایک واقعہ ناجعہ ہی تھا یعنی پڑھائی میں مشغول ہونے کا)۔

ملازمت مل جانے اور چند ہی دنوں میں عملی طور پر ترقی یافتہ ہو جانے کے بعد دوسری تلاش شروع ہوئی یعنی رفیقہ حیات کی تلاش۔!

قسمت بہت مہربان تھی کہ ایک جگہ بات چیت طے ہو جانے کے بعد زلف سر نہ ہو سکی۔ قسمت کے مہربان ہونے کی بات میں نے اس لیے کہی کہ اس سلسلے میں آسمان پر جو فیصلہ ہوا تھا اس کی اطلاع بروقت مل گئی اور میرے سر جو سہرا باندھا گیا وہ صرف شادی کا نہیں شادکامی اور شادمانی کا تھا جو الحمد للہ ابھی تک بندھا ہوا ہے۔ اپنی تعریف اور خود ستائی کے علاوہ اپنی بیوی کی تعریف کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن یہی تو ایک موقع ہے جہاں میں سچ کہہ سکتا ہوں۔ عائشہ نمازوں اور وظائف کی تو ماہرین میں سے ہیں ہی لیکن تفاسیر اور دینی کتابیں بھی انھوں نے اتنی پڑھ لیں اور پڑھتی رہتی ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ "خانہ داری" میں بھی ان سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ میرے غیر ضروری مشاغل پر کبھی معترض نہیں ہوئیں۔ چار اولادیں ہیں۔ دو بیٹے جو اپنی دونوں بہنوں سے بڑے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی امریکا میں ہیں اور ایک بیٹا ایک بیٹی بمبئی میں۔ اور دادا بنے ہوئے مجھے زمانہ ہو گیا لیکن وہ دادا نہیں جو بمبئی میں بغیر شادی اور بغیر اولاد کے ہوتے ہیں۔ نانا بھی بن چکا ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل رہائش بمبئی ہی کی اختیار کی۔

بمبئی کی شہریت حاصل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۰ء میں جب میں بمبئی میں اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے منتقل ہوا تو ۱۹۸۶ء میں وظیفے پر سبک دوش ہونے تک میرا کوئی تبادلہ نہیں ہوا۔ اس کی دعائیں بھی ظاہر ہے عائشہ ہی نے مانگی ہوں گی۔ حیدرآباد کے زمانے میں مخدوم محی الدین اور راج بہادر گوڑ جیسے بغاوت پسند اور جیالے ٹریڈ یونین لیڈروں سے ربط و ضبط رہا۔ بمبئی میں جارج فرنانڈیز تک سے سابقہ رہا۔ بمبئی میں ملازمت کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا۔ یہاں کی ایک بات یہ بہت بھائی کہ دفتر کے کام میں کوتاہی نہ کرو تو پھر باقی اوقات میں کیا کرتے ہو کوئی فکر نہیں کرتا لیکن اضلاع میں معاملہ اس کے برعکس تھا کہ دفتر میں خواہ کچھ کرو یا نہ کرو لیکن باقی اوقات میں کیا کرتے ہو، اس پر نگرانی بہت ضروری ہے۔ اب یہ بات نہیں رہی۔ اس موضوع پر کتنا لکھا جا سکتا ہے سب جانتے ہیں لیکن میں نہیں لکھوں گا۔ اس لیے کہ بسیار نویسی کوئی سفر نہیں ہے منزل ہے اور میں اس منزل پر قیام کرنا چاہتا ہوں۔

رہی اپنے ادبی مشاغل کی بات تو اس کا سلسلہ کافی دراز رہا۔ حیدرآباد میں زندہ دلان حیدرآباد کے اجلاسوں میں تقریباً ہر سال شرکت کی پہلی کانفرنس جب ہوئی غالباً ۱۹۶۱ یا ۱۹۶۴ء میں تو کرشن چندر کو بمبئی سے منا کر حیدرآباد لے گیا تھا اور اس کانفرنس کی شان دار کامیابی نے زندہ دلان حیدرآباد کے جلسوں کی راہ متعین کی۔

یوں سمجھیے کہ صرف کنہیا لال کپور، باوجود وعدہ کرنے کے شرکت نہیں کر سکے اس وقت وہ موگا میں تھے ورنہ فرقت کاکوروی، فکر تونسوی احمد جمال پاشا سبھی حیدرآباد پہونچ گئے تھے۔ سلمیٰ صدیقی بھی پہلی مرتبہ اردو کے کسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں۔ دوسرے سال راجندر سنگھ بیدی نے صدارت کے فرائض انجام دیے اور جب میں دعوت دینے ان کے پاس گیا تو پہلا سوال انھوں نے یہی کیا کہ میں پچھلے سال تو مزاح نگار نہیں تھا اس سال کیسے بن گیا؟ میں نے ان سے کہا کہ اس کا جواب آپ کو حیدرآباد ہی میں ملے گا۔ لیکن ان جلسوں کی کامیابی کا سہرا میں اپنے سر نہیں باندھنا چاہتا (اور باندھنے بھی کون دے گا، اصل داعیان تو مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور حمایت اللہ تھے)۔

زندہ دلان حیدرآباد کے جلسوں کا شہرہ اتنا ہوا کہ تخلص بھوپالی نے جو "پاندان والی خالہ" کے مصنف تھے، اپنے وطن میں ایک جشنِ ظرافت کا اہتمام کیا جس میں مشاعرے کے ہیرو رضا نقوی واہی ثابت ہوئے شفیع مشہدی نے بھی یہیں پہلی مرتبہ ایک مزاحیہ مضمون سنایا اور خود بھی اتنے متاثر ہوئے کہ جب ان کا تبادلہ دلی سے پٹنہ ہوا تو وہاں انھوں نے پہلا معقول کام یہ کیا کہ پٹنہ میں نہایت ہی اعلا پیمانے پر "جشنِ ظرافت" کا اہتمام کیا جسے میں جشنِ ضیافت کہتا رہا۔ اس وقت کے وزیر زراعت محمد حسین آزاد بقیدِ حیات تھے اور انھوں نے

بنگلور سے محمد علی (مرحوم) کو بھی افتتاحی رسم ادا کرنے کے لیے بلوایا تھا اور سیتارام کیسری جی نے مشاعرے کا افتتاح کیا تھا۔ اس مشاعرے کے ہیرو سلیمان خطیب تھے (فرصت ہو تو میرا مضمون "جشنِ ظرافت پٹنہ کا کچا چٹھا" ضرور پڑھیے، اچھا مضمون ہے)۔ عتیق حنفی مرحوم جب لکھنؤ میں اسٹیشن ڈائرکٹر تھے تو انھوں نے ریڈیو پر مزاح نگاروں کے نہ نظر آنے کا اجتماع ترتیب دیا تھا، جو شاید ہولی کے موقع پر لکھنؤ کے کسی بہت بڑے ہال میں منعقد ہوا تھا۔ دلی ریڈیو اسٹیشن پر بھی وہ مزاحیہ مضامین سنانے کا آزمائشی مقابلہ منعقد کر چکے تھے۔ دلی اُردو اکادمی نے (جب شریف الحسن نقوی ڈائرکٹر تھے) مزاحیہ اجلاس منعقد کیا تھا جس کے ایک سشن کی صدارت کے فرائض میں نے انجام دیے تھے کیونکہ اصل صدر فکر تونسوی عین جلسے کے دن بیمار پڑ گئے تھے اور مجھے فی البدیہہ خطبۂ صدارت پیش کرنا پڑا تھا معین اعجاز کنوینر تھے اور چونکہ ظ۔ انصاری بھی وہاں آگئے تھے اسلیے انھوں نے بھی ایک تقریر کی تھی۔ قرۃ العین حیدر بھی سامعین میں موجود تھیں اور گجرال صاحب شہ نشین پر تشریف رکھتے تھے، اور تو اور مزاح نگاری کی وہ دھوم مچی کہ حیدرآباد میں "عالمی مزاحیہ کانفرنس" کا انعقاد ہوا وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام۔ اس کانفرنس کے سربراہ نریندر لوتھر تھے (موصوف اس وقت معتمد کے عہدے پر فائز تھے)۔ اس عالمی کانفرنس کے کنوینر طالب خوندمیری تھے۔ یہ کانفرنس سہ روزہ تھی۔

میں ان سب جلسوں میں موجود تھا۔ چنڈی گڑھ میں بھی ایک کانفرنس ہوئی تھی اور فکر تونسوی نے مجھے بتایا کہ میرا نام مدعوئین کی فہرست میں شامل تھا جو بعد میں حذف کر دیا گیا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ایک ادبی اجلاس منعقد ہو چکا ہے۔ خواجہ عبدالغفور مرحوم اس وقت اکادمی کے صدر رہے۔ اورنگ آباد میں مولانا آزاد کالج کے جشنِ سیمیں کے موقع پر بھی ظرافت کو فراموش نہیں کیا جا سکا۔ بمبئی میں جب سرسنگار سنسد کی سالانہ تقاریب کے انعقاد کا سلسلہ جاری تھا، ان تقاریب میں ایک شام، شامِ ظرافت کے لیے بھی طے تھی۔ ان جلسوں کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ یہ بھی میری آپ بیتی کا حصہ ہیں اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا ذکر غیر ضروری تھا تو ان فقروں کو فقرۂ معترضہ سمجھ کر نظر انداز کر دیجیے (جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ تو میں کہہ چکا)۔

ظرافت کے نثری اجلاسوں اور مزاحیہ مشاعروں (اب تو یہ عالمی سطح پر ہونے لگے ہیں) کی غیر معمولی مقبولیت نے مجھے اتنا گمراہ کر دیا ہے کہ ظرافت پسند اربابِ ادب اور احباب کی فرمائش اور مسلسل اصرار پر میں نے بمبئی میں بھی ایک انجمن "زندہ دلانِ بمبئی" کی تشکیل کا سہرا اپنے سر خود ہی باندھ لیا یہ انجمن جلدی اونگھنے لگی اور اپنے ایامِ شیر خواری، یا یوں کہیے رضاعت کے دنوں میں لوریاں سُن کر نیند کی آغوش میں چلی گئی لیکن اس کا افتتاحی جلسہ نہایت عالی شان پیمانے پر بمبئی کے برلا ماتوشری ہال میں منعقد ہوا جس کا دوسرا اڈیشن دوسرے دن مضافات میں (باندرہ ہائی اسکول) پیش کیا گیا انجمن کے زیرِ اہتمام ایک اور جلسہ (جو سنجیدگی کی بلندی پر تھا) صابو صدیق کے لطیفی ہال میں منعقد ہوا، جو غالب ایوارڈ پانے والے چار ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک استقبالیہ تھا۔ یہ چار حضرات تھے علی سردار جعفری اخترالایمان، مجروح سلطان پوری اور کالی داس گپتا رضا۔ انجمن کے سکریٹری فیاض احمد فیضی نے بڑھ کر اور کچھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اپنے جوہر دکھائے اور میری تجویز پر ان انعام یافتگان کی تصاویر، غالب کی تصویر کے ساتھ تیار کروائی گئیں (ناظرین متحیر، انعام یافتگان متعجب و مسرور ہو گئے)۔ اس انجمن کا ایک چھوٹا سا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انجمن کے سرپرستوں میں سے ایک سرپرست آنجہانی شیام کشن نگم نے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جس کے تحت مہاراشٹر کالج بمبئی میں ہر سال نگم ٹرافی تقریری مقابلے منعقد ہوتے ہیں اور اسی فنڈ سے انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس فنڈ کی جو رقم میرے مشورے سے شیام کشن نگم نے طے کی تھی اس میں مہاراشٹر کالج کی گورننگ باڈی کے صدر ڈاکٹر رفیق زکریا کی فرمائش پر مزید اضافے کے لیے صاحبِ فنڈ نے زیادہ رد و قدح نہیں کی۔

میں کوئی ۱۶ سال تک گورنمنٹ کالونی باندرہ (ایسٹ) کا باشندہ رہا اس صدی کے ساتویں دہے میں کالونی میں خاصی چہل پہل تھی۔ حیدرآباد اور ودربھ سے مہاراشٹر میں منتقل کیے جانے والے ملازمین سرکار کے لیے ہی اس کالونی کا وجود عمل میں آیا تھا۔ اُردو اور ہندی جاننے والوں کی بہتات تھی۔ یہیں پہلی مرتبہ ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اُردو سوسائٹی کے زیرِ اہتمام، جس کا نہ کوئی فنڈ تھا نہ دفتر۔ لیکن اس سوسائٹی سے محبت کرنے والے لاتعداد تھے۔ خواجہ احمد عباس نے اس یادگار مشاعرے

کا افتتاح کیا تھا اور زبردست خراجِ تحسین پیش کرنے میں حاتم طائی کی فراخدلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالونی میں ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور غریب خانے پر عصمت چغتائی، احتشام الایمان، راجندر سنگھ بیدی اور مجروح سلطان پوری کی صدارت میں مختلف موقعوں پر کئی ادبی نشستیں ہوئیں (ان کا ذکر یعقوب راہی نے اپنی ایک کتاب میں کیا جس سے یہ خاکسار بہت خوش ہوا)۔ کالونی کے بال مندر (ہال) میں بھی محفلیں منعقد ہوتی رہیں۔

تصانیف و تالیفات

اب میں خود سوچتا ہوں کہ میں نے سرکاری ملازمت میں رہ کر اتنا سارا کیسے لکھ ڈالا (حشو و زوائد کا حصہ ذرا زیادہ ہے) مزاحیہ مضامین کے مجموعوں کی تعداد ۱۶ ہے۔

۳ کتابیں بچوں کے لیے یعنی ادبِ اطفال (مزاحیہ ۲ اور سوانحی ایک: گاندھی جی جنوبی افریقہ میں)۔

ارمغانِ سنسکرت۔ بھرتری ہری کی منتخب نظموں کا منظوم ترجمہ۔

نوائے کبیر۔ (کبیر کے دوہوں اور گیتوں کو اردو نظم کا لباس)۔

شاعری بھی کی۔ کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا (کم سے کم اس پر تو خوش ہونا چاہیے)

تالیفات:

(۱) شگوفہ کا ہندستانی مزاح نمبر (پندرہ ہندستانی زبانوں کے مزاح کا انتخاب اور منتخب اردو مزاحیہ مضامین کے علاوہ چند تنقیدی مضامین ایک سوال نامہ۔ شمس الرحمٰن فاروقی، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، باقر مہدی اور وحید اختر وغیرہ کی اردو ظرافت نگاری سے متعلق رائیں)

(۲) کتاب نما کا وجد نمبر (۳) تکمیل ممبئی کا شاذ تمکنت نمبر (۴) تکمیل کا عزیز قیسی نمبر (۵) نیشنل بک ٹرسٹ کا اردو ظریفانہ ادب کا انتخاب انبساط زیرِ طبع۔

مقدمے اور تبصرے بھی لکھے (کچھ اپنی مرضی سے کچھ فرمائش پر)

انعامات:

غالب ایوارڈ ۱۹۸۴ء، مہاراشٹر اردو اکادمی کا ریاستی ایوارڈ، ہریانہ اردو اکادمی کا کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ کے علاوہ کتابوں پر ہندستان کی مختلف اکادمیوں کے انعامات۔

سفر:

(۱) پاکستان: کراچی میں منعقدہ پاکستان ہندستان ظرافت کانفرنس میں شرکت (کنوینر خواجہ حمید الدین شاہد)

(۲) امریکا: (شکاگو، کیلی فورنیا اور نیویورک)۔ یہ کسی ادبی انجمن کی دعوت کی بنا پر نہیں کیا گیا۔ لیکن شکاگو میں دو تین محفلیں منعقد ہوئیں جن میں سے ایک رضیہ فصیح احمد کے مکان اور ایک بیگم عذرا کے مکان پر (سفرنامہ امریکا میری عینک سے شائع ہوا)۔ اس سفر کی شانِ نزول یہ ہے کہ میری چھوٹی بیٹی اپنے بھائی ارشد سلمان سے ملنے کیلی فورنیا گئی اور وہاں سے شکاگو (اپنے ماموں اقبال بیگ کے پاس) وہیں اس کی نسبت طے ہوگئی۔ اس کی شادی کی تقریب میں ہم دونوں یعنی میں اور میری بیوی نے یہ سفر اختیار کیا جس کا سان و گمان بھی نہیں تھا۔

(۳) مسقط: ۱۹۹۵ء میں مسقط میں ایک ہند پاک ظرافت نگاروں کا جلسہ ہوا۔ ظفر مہدی کنوینر تھے۔ ہندستان سے مجتبیٰ حسین، دلیپ سنگھ اور میں۔ پاکستان سے منظر علی خاں۔ سفرنامہ سب رس میں شائع ہوا۔

جنوری ۱۹۹۵ء میں میرے ایک دوست سلطان علی خاں نے میری پچاس سالہ بسیار نویسی کا جشن منایا۔ دو اجلاسوں کی صدارت علی سردار جعفری اور سراج بہادر گوڑ نے کی۔ افتتاح ڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمایا۔ بنیاد کے یوسف ناظم نمبر کی رسم اجرا مجروح سلطان پوری نے انجام دی۔ حیدرآباد سے گوڑ صاحب کے علاوہ مصطفیٰ کمال اور رحمت یوسف زئی اور اورنگ آباد سے ڈاکٹر صفی الدین صدیقی نے شرکت کی اور سب نے مجھے ممنونِ احسان اور نادم کیا۔ اسی جلسے میں میری دو کتابیں فی البدیہہ اور امریکا میری عینک سے کی رونمائی کی رسم بھی ایک پنتھ دو کاج کے مطابق انجام پائی۔

اس کے بعد بھی اگر میں مطمئن نہیں ہوں تو ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ویسے بسیار نویسی کا سلسلہ جاری ہے۔ ہو سکتا ہے (کم سے کم) دو مجموعے اور بھی شائع ہو جائیں۔

□□

غزلیں

ہزار لفظوں پہ بھاری ہے بے کسی کب تک؟
زباں رکھتے ہو، بولو یہ خامشی کب تک؟

نہ خط لکھا ہے نہ آکر ملے ہو خوابوں میں
یہ دیکھنا ہے رہے گی یہ بے رُخی کب تک؟

برس کے خوف کے بادل نکل گئے شاید
اندھیری رات میں جگنو کی روشنی کب تک؟

بہت قرار ملا ٹھوکروں کے بعد ہمیں
کہاں سے آئی، رہے گی یہ بے خودی کب تک؟

بہت تلاش کیا کوئی ہم نوا نہ ملا
ہماری تم سے رہے گی یہ دوستی کب تک؟

نہ کوئی وارث و مونس، نہ کوئی دشمنِ جاں
بس اِک خلش کے سہارے یہ زندگی کب تک؟

ابھی تو تھوڑا سا شعروں میں سوز باقی ہے
گئی وہ عمر، رہے گی یہ نغمگی کب تک؟

باقر مہدی
ای/۱ - روی درشن، کارٹر روڈ - باندرہ (ویسٹ)
ممبئی - ۵۰

اس کو محسوس کیا ہے اسے دیکھا تو نہیں
یہ بھی اک اس کا کرم ہے کوئی دعویٰ تو نہیں

چاند، آئینہ، سحر، پھول، ستارے، خوشبو!
ہیں کئی رنگ مگر کوئی بھی تجھ سا تو نہیں

سُنتے کچھ اور ہیں، لیکن نظر آتا ہے کچھ اور
کوئی چہرا ذرا دیکھو پسِ چہرا تو نہیں

مرے ہونٹوں سے مرے لفظ اُڑا لیتا ہے
وہ مرے ذہن میں چھپ کر کہیں بیٹھا تو نہیں

آئے سچ بول کے، منصور کا رُتبہ پائے
اس بھرے شہر میں اک شخص بھی ایسا تو نہیں

پھول ہاتھوں میں ہے آنکھوں میں ہے خنجر کی چمک
میرا قاتل بھی کہیں میرا شناسا تو نہیں

خود کو جب دیکھا تو منظر یہی پہروں سوچا
کون ہے یہ کہیں اس شخص کو دیکھا تو نہیں

پروفیسر منظر اعظمی
جموں یونیورسٹی
جموں و کشمیر

وجاہت علی سندیلوی (مرحوم)

گاندھی جی : روشنی کا مینار

چودھری وجاہت علی سندیلوی مرحوم نے یہ مضمون اپنی حیات میں نیا دور میں اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا تھا ۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا ۔ اس مضمون میں بابائے قوم کو نہ صرف بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کے اصولوں اور نظریات کی بڑے خوبصورت انداز میں توضیح و تشریح بھی کی گئی ہے ۔

—— ایڈیٹر

مہاتما گاندھی کا شمار دنیا کے ان چند عظیم تاریخ ساز قومی رہنماؤں میں ہوتا ہے جو اپنے ملکوں کے سیاسی آفاق پر اس وقت نمودار ہوئے جب وہ افراتفری ، اختلافات اور مایوسی کا شکار تھے اور انھوں نے اپنی قیادت سے اپنی قوموں میں بیداری کی ایک ایسی روح پھونک دی جس سے تاریخ کے دھارے کے رخ پلٹ گئے ۔ مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ سے واپسی پر ہندستان کی سیاست میں جب داخل ہوئے تو اس سے بہت پہلے سے یہاں کے قوم پرور رہنما "آزادی اور سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے" کے نعرے بلند کر چکے تھے لیکن ان نعروں میں جوش اور جذبے کی فراوانی کے باوجود منصوبہ بند عمل کا فقدان تھا ۔ برطانی سامراج اپنی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی پر بڑی تندہی اور یکسوئی سے عامل تھا اور وہ ہندستانیوں کے خلاف کسی متحدہ محاذ بنائے جانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے ان کے درمیان انتشار اور افتراق پیدا کرنے کے طرح طرح کے شگوفے چھوڑتا رہتا ۔

مہاتما گاندھی کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے آزادی کے متوالوں کو ایک منتشر ہجوم سے ایک منظم کارواں میں تبدیل کر دیا اور اس میں وطن پروری خدمت ، ایثار اور قربانی کی برقی لہریں دوڑا دیں ۔ انھوں نے جنگ آزادی لڑنے کے لیے نہ صرف ایک لائحۂ عمل بنایا بلکہ اس میں استعمال کیے جانے کے لیے اپنے حربے بھی منتخب کر لیے یعنی عدم تعاون اور اہنسا ۔ تاریخ کے سب سے بڑے سامراجی نظام کے خلاف لڑنے کے واسطے یہ بڑے عجیب اور انوکھے ہتھیار تھے جن پر انگریزی حکومت کیا ، خود بہت سے ہندستانی ہنستے ۔ دوسروں کے اعتراض یا تمسخر کی بالکل فکر نہ کرتے ہوئے گاندھی جی اپنے لائحۂ عمل پر اٹل رہے ، اور بالآخر دنیا نے دیکھا کہ یہی حربے کارگر ثابت ہوئے اور انھوں نے ہندستان سے برطانی سامراج کی جڑیں کھود کر باہر پھینک دیں ۔ آج دوسرے ممالک دوسرے سامراجوں کے خلاف کامیابی سے یہ حربے استعمال کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں اور ان کے سلسلے میں ہر جگہ عزت اور احترام سے گاندھی جی کا نام لیا جاتا ہے ۔ جن ملکوں نے مسلح بغاوت کر کے اپنی آزادی حاصل کی وہ بعد میں خانہ جنگیوں اور ڈکٹیٹر شپ کا شکار ہو گئے ۔

مہاتما گاندھی کی قیادت میں جنگ آزادی قریب تین دہائیوں تک لڑی گئی ۔ اس نے بہت سے آتار چڑھاو دیکھے ۔ امید و بیم کی گھٹائیں بار بار چھاتی اور چھٹتی رہیں ۔ ملک اور قوم کو آزادی کی خاطر بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ۔ اکثر آگ اور خون کے طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن گاندھی جی کی قیادت میں وہ یہ سب امتحان ہمت اور پامردی سے جھیل گئے ۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی گاندھی جی روشنی کا ایک مینار بنے رہے ۔ ان کا عزم مستحکم کبھی متزلزل نہیں ہوا ۔ آخر میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان

غیر ملکی سامراج کے پنجوں سے آزاد ہوگیا۔ یہ صرف ایک ملک کی آزادی نہیں تھی بلکہ سارے عالم کے پسے ہوئے انسانوں کی بھی آزادی تھی۔ احسان مند قوم نے گاندھی جی کو راشٹر پتا کے لقب سے پکارا اور یہ سب سے بڑا اعزاز تھا جو کوئی ملک اپنے کسی سپوت کو دے سکتا تھا۔

عدم تعاون کی تحریک جو گاندھی جی کی قیادت میں طرح طرح سے بڑھتی اور پھیلتی رہی، مثلاً انگریزی مال اور خصوصاً کپڑوں کا بائیکاٹ، چرخا کھادی، شراب کی دکانوں پر دھرنا، انگریزوں کی ملازمت سے استعفا، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اخراج، مجالس قانون ساز کا مقاطعہ، نمک ستیہ گرہ، بھارت چھوڑو اندولن، 'کرو یا مرو' کا فیصلہ کن عہد وغیرہ۔ ان کی تفصیلات بیان کرنا یہاں مقصود نہیں۔ وہ اب تاریخ کا ایک درخشاں حصہ بن چکی ہیں۔ البتہ اس بات کی جانب ایک ہلکا سا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ گاندھی جی کا یہ بھی ایک کمال تھا کہ انھوں نے بہت سے مختلف الخیال اور انا پرور رہنماؤں کو اپنے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان کی ناقابل تسخیر ٹیم بنا دی تھی۔ لالہ لاجپت رائے، موتی لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، پنڈت جواہر لال نہرو، خان عبدالغفار خاں، بابو راجندر پرشاد، راج گوپال آچاریہ، آچاریہ کرپلانی، جے پرکاش نرائن وغیرہ اور ایسے سیکڑوں رہنما، جو ہر مسئلہ پر اپنی ایک ذاتی رائے رکھتے اور اکثر ایک دوسرے کے نظریات اور معتقدات سے اختلاف بھی کرتے، گاندھی جی کی تحریک میں کندھے سے کندھا ملا کر جٹے رہے۔ جے پرکاش نرائن نے ایک مرتبہ اپنی ایک تقریر میں صحیح کہا تھا کہ "اور رہنما صرف عوام کے رہنما تھے لیکن گاندھی جی عوام کے ساتھ رہنماؤں کے بھی رہنما تھے اور اسی لیے ہم انھیں باپو کہتے ہیں۔"

گاندھی جی کی تحریک آزادی کے سلسلے میں، ان کی قیادت پر بہت سے اعتراضات کیے گئے۔ پرجوش اور انقلاب پسند حلقے اُن کی تحریک کو سُست گام سمجھتے، اعتدال پسند حلقے ان کو ضرورت سے زیادہ تیز رو قرار دیتے۔ کچھ لوگ گاندھی جی کے سیاست میں روحانیت کو داخل کرنے کو عقلیت کے منافی قرار دیتے۔ کچھ حلقے عدم تشدد کو ایک پالیسی کے طور پر تو تسلیم کرتے لیکن گاندھی جی کی طرح اسے ایک عقیدے کی حیثیت سے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ بائیں بازو کی پارٹیاں گاندھی جی کی چھوٹی چھوٹی اصلاحی تحریکوں مثلاً کھادی، چرخا، دلت سدھار، چھوت چھات دور کرنا وغیرہ کو حقیقی جدوجہد آزادی سے روگردانی کے مترادف تصور کرتے۔ دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم کے متعلق گاندھی جی کے نظریات سوشلسٹ خیالات کے حامی دانشوروں کو بالکل ناقابل قبول تھے ان اعتراضات یا اسی قسم کے دوسرے اعتراضات کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کہ یہ سب غلط اور بے بنیاد تھے، انصاف کا تقاضا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ سمجھ لینا کہ یہ سب بجا اور درست تھے ایک بالکل یک طرفہ اور غیر متوازن بات ہوگی۔ اس موقع پر ان اعتراضات کا تجزیہ کرنا یا ان کے متعلق گاندھی جی کی جانب سے صفائی پیش کرنا اس مضمون کا موضوع نہیں ہے۔ ان اعتراضات کا تذکرہ کرنا محض یہ بتانے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ گاندھی جی کو برطانوی سامراج سے مقابلے کے دوران خود اپنے ہم وطنوں کے اختلافات اور تضادات سے بھی مورچہ لینا پڑا اور اکثر یہ تحریک آزادی کے لیے سدِ راہ ثابت ہوئے اور گاندھی جی کو بڑی مصیبتوں سے ان کے درمیان اپنا راستہ نکالنا پڑا۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مُسلم لیگ دونوں کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے اور دونوں کے درمیان مسلمانوں کے حقوق اور تحفظات کے متعلق ایک سمجھوتہ ہوگیا جو لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کی قیادت کرتے ہوئے گاندھی جی نے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے دوش بدوش تحریک خلافت میں حصہ لیا اور انگریزی حکومت کے خلاف اپنی عدم تعاون کی تحریک چھیڑ دی۔ فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی کے جو روح پرور نظارے ان تحریکوں کے درمیان دیکھنے میں آئے، ان کے لیے آج بھی آنکھیں ترستی ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب انگریزی حکومت سے عدم تشدد کے اصولوں پر عدم تعاون بائیکاٹ، دھرنوں اور جلوسوں کے ذریعے براہ راست مورچہ لیا گیا تھا۔ بہت سے رہنما جو صرف زبانی گفت و شنید کے قائل تھے، اس براہِ راست اقدام پر کانگریس چھوڑ کر چلے گئے اور گاندھی جی کے معترضین کی صفِ اول میں نظر آنے لگے۔

کانگریس نے نہرو رپورٹ کی سفارشات منظور کیں تو علی برادران

اور دوسرے اہم مسلم رہنماؤں نے گاندھی جی کی رفاقت چھوڑ دی۔ گول میز کانفرنس میں بھی گاندھی جی نے مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نشستوں کے بارے میں انھیں کانگریس کی جانب سے سادہ چیک دینے کا وعدہ کیا تو بہت سے ہندو رہنما ان سے ناراض ہو گئے اور ان پر مسلم نوازی کا الزام لگانے لگے۔ کانگریس نے برطانوی وزیر اعظم رمزے میکڈانلڈ کا فرقہ وارانہ ایوارڈ منظور کیا تو پنڈت مدن موہن مالوی، جو کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے، گاندھی جی کا ساتھ چھوڑ کر کانگریس سے باہر چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء کے فرقہ وارانہ ایوارڈ میں دلتوں کو نشستوں کی تعداد میں مراعات دینے کے علاوہ جداگانہ رائے دہندگی کا حق بھی دیا گیا تھا۔ یہ برطانوی سامراج کی ایک بڑی شاطرانہ چال تھی اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو ہندستان کی آزادی میں اور بھی لوہے لگ جاتے۔ ہندو، مسلم، اور دلتوں کے علاحدہ علاحدہ جداگانہ انتخابات ہوتے تو ملک کی وحدت اور سالمیت پارہ پارہ ہو جاتی اور دوسری اقلیتوں کے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کا بھی دروازہ کھل جاتا۔

گاندھی جی کو اس ایوارڈ سے بہت صدمہ پہنچا لیکن وہ اس کے خلاف کوئی تحریک نہیں شروع کر سکے اگر کرتے تو دلت یہ سمجھتے کہ گاندھی جی ان کو ملے ہوئے ایک قیمتی حق کو چھیننا چاہتے ہیں چنانچہ انھوں نے صرف اخلاقی دباؤ ڈالنا مناسب سمجھا۔ انھوں نے اس ایوارڈ کے خلاف ایک مرن برت رکھا۔ ان کا یہ حربہ کامیاب ہوا اور بالآخر دلتوں کے نمائندے ڈاکٹر امبیڈکر کچھ پہلے سے زیادہ نشستیں لے کر جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے۔ گاندھی جی اور ڈاکٹر امبیڈکر کا یہ سمجھوتہ پونا پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی حکمت عملی سے گاندھی جی نے ایک بڑی مہلک برطانی چال کو ناکام کر دیا۔

پونا پیکٹ کے سلسلے میں بہت سے عناصر گاندھی جی اور کانگریس سے ناراض ہو گئے۔ ہندو مہاسبھا کو شکایت تھی کہ سنھو بھرائی میں گاندھی جی نے دلتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ نشستیں دے دیں اور دوسری طرف بہت سے دلت رہنماؤں کو یہ شکایت تھی کہ گاندھی جی نے ان کو جداگانہ انتخاب کے حق سے محروم کر دیا۔

گاندھی جی زندگی بھر فرقہ وارانہ اتحاد، مفاہمت اور ہم آہنگی کے لیے ہر طرح سے کوششیں کرتے رہے اور ملک کے بنیادی مفاد کی خاطر انھوں نے کئی فرقہ وارانہ سمجھوتے کیے لیکن ہندستان جیسے وسیع اور کثیر آبادی والے ملک میں سبھی فرقہ وارانہ عناصر کو مطمئن کر دینا ایک ناممکن سی بات تھی اور انتہا پسند عناصر ہمیشہ ان کی مساعی جمیلہ میں کیڑے ڈالتے رہے۔ بہرکیف فرقہ وارانہ اتحاد اور استقلال کے متعلق ان کی خلوص نیت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا اور انھوں نے ملک کی سیاست کو جو سیکولر رُخ اور مزاج دیا اس سے بھی انکار ممکن نہیں۔

گاندھی جی نے ایک مرتبہ کہا تھا:

میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندو ہوں اور گائے کی پوجا کرنا اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے گائے کی قربانی از خود ترک کر دیں لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کی قربانی کرنے کا مسلمان بھائیوں کو پورا حق حاصل ہے اور اگر کسی نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر زبردستی اُن کو اس حق سے محروم کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے خلاف احتجاج اور جدوجہد کرنے والا پہلا شخص ہوں گا۔"

ان کا یہ مقولہ وسیع النظری، دوسروں کے حقوق کے احترام اور اعلا انسانی اقدار کی ایک درخشاں مثال ہے۔

گاندھی جی ملک کی تقسیم کے بڑی شدت سے مخالف تھے لیکن جب برطانی بازی گروں کی چالوں سے یہ بٹوارہ ناگزیر ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح بلا کشت و خون کیے ہندستان اور پاکستان تقسیم کر لینا چاہیے۔ بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء کی مسموم فضا میں ایسا نہیں ہو پایا فرقہ وارانہ فساد میں کروڑوں گھر لٹے، پھنکے اور برباد ہوئے اور لاکھوں انسانوں کی جانیں گئیں۔ گاندھی جی اور ان کے رفقا جن میں ہر مذہب و ملت کے افراد شامل تھے، اس ملک گیر طوفان میں بھی اپنے سیکولر نظریات پر کسی آہنی دیوار کی طرح جمے رہے اور ظلم، انتقام اور نفرت کے خلاف اپنی آوازیں بلند کرتے رہے۔ گاندھی جی نے زندگی بھر ستیہ، اہنسا کی تلقین کی تھی۔ ملک کی تقسیم کے وقت انھوں نے آگ اور خون کے دریا بہتے دیکھے تو انھیں بے حد صدمہ ہوا

اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ سے گئے۔ انھوں نے کہا کہ اتنی بڑی قیمت دینے کے بعد مجھے آزادی حاصل کرنے کی کوئی خوشی نہیں ہے اور اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔

فسادات کی آگ زیادہ تیز ہوئی اور انھوں نے اس کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو، جن میں خاص کر پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد قابلِ ذکر تھے، حکومت کی سطح پر ناکافی پایا تو انھوں نے پھر آخری مرتبہ اپنا اخلاقی حربہ استعمال کیا۔ انھوں نے دہلی میں ۷۸ سال کی عمر میں مرن برت رکھا اور ساری دنیا نے بڑی حیرت سے یہ چمتکار دیکھا کہ تین ہی ہفتوں میں پورے ملک میں فسادات ختم ہوگئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (آخری برطانی وائسرائے) نے ہندستان کی آزادی کے متعلق اپنی کتاب میں لکھا کہ "جو کام لاکھوں فوجی اور پولیس والے نہیں کرسکے وہ کام ایک نحیف و زار بوڑھے نے کر دکھایا۔"

ہندستان کی آزادی کے بعد اس کی دستور ساز اسمبلی نے اس کا آئین سیکولر اور جمہوری بنیادوں پر قائم کیا۔ ہر شہری کو نہ صرف مساوی حقوق دیے گئے بلکہ اس کے مذہب، کلچر اور زبان کو اس کے بنیادی حقوق تسلیم کرکے ان کا آئینی تحفظ بھی کیا گیا۔ اپنا آئین بنانے میں ہندستانی دانشوروں نے اور خاص طور پر ڈاکٹر امبیڈکر نے جس فہم و فراست اور بالغ نظری کا ثبوت دیا اسے دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی کہ ہندستان جو فرقہ وارانہ تنازعات، اختلافات اور تضادات کی آماجگاہ رہا کرتا تھا، جمہوریت، مساوات اور سیکولرازم کا گہوارہ کیسے بن گیا۔

دستور ساز اسمبلی میں خود گاندھی جی نہیں تھے، لیکن واقف کار جانتے ہیں کہ اس پر گاندھی جی کی گہری پرچھائیں پڑ رہی تھی اور اس کے بنائے ہوئے آئین میں ان کے بنیادی عقیدوں اور اصولوں جیسے فرقہ وارانہ اتحاد، مساوات، رواداری اور کمزور طبقوں کا تحفظ وغیرہ کی انمٹ چھاپ موجود ہے۔

آج گاندھی جی نہیں ہیں، لیکن اُن کے بتائے ہوئے اصول روشنی کے میناروں کی طرح ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اور ہم جب بھی بھٹکتے ہیں ان کی روشنی میں پھر راہِ راست پر آجاتے ہیں۔

□□

بابائے قوم

طالب ضیائی
۱۶۲- آزاد روڈ، شاہ ورد (مدھیہ پردیش)- ۴۵۱۱۱۱

تھی سکونِ خاطرِ ناشاد پر میری نظر
انجمن میں ماہ و انجم کی ہوا میرا گزر
کر رہے تھے گفتگو آپس میں یوں خورشید و ماہ
دیکھتے آئے تھے جس دھرتی کو کل ہوتے تباہ
آج وہ مانندِ گلشن سبز ہے، شاداب ہے
کیا خبر کس کا یہ پرتو ہے، یہ کس کا خواب ہے

میں نے چپکے سے کہا، ہاں! پرتوِ گاندھی ہے یہ
اس کی محنت اور کوشش پر فدا ہو جائیے
رشکِ جنت، غیرتِ فردوس ہندستان ہے
جس نے اس کو تازگی دی اس کا یہ فرمان ہے
تم ہو انساں، ہندو مسلم، سکھ عیسائی نہیں
یوں لڑو آپس میں یہ تعلیم مذہب کی نہیں
ملک کی عزت کا تم کو ہی تو رکھنا ہے خیال
ملک کی عظمت کا تم کو ہی تو رکھنا ہے خیال
ملک کی خاطر جیو اور ملک کی خاطر مرو
ہو وطن بدنام، ایسا کام کوئی کیوں کرو
مڑ کے پیچھے کی طرف کیوں دیکھو آگے ہی بڑھو
نظمِ عالم کو بدل دو، خوابِ غفلت سے اٹھو
کرکے جب پختہ ارادہ ایک ہو جاؤ گے تم
آسمانوں کی بلندی پر نظر آؤ گے تم
بھول کر تم سے اگر دشمن کبھی ٹکرائیں گے
دیکھتے ہی دیکھتے سب خاک میں مل جائیں گے
چاک ہے دامن وطن کا اس کو سینا ہے تمھیں
صرف شوکت سے نہیں، عزت سے جینا ہے تمھیں
اے عزیزانِ وطن، اے نوجوانانِ وطن!
ہو تمھیں عزت وطن کی، ہو تمھیں شانِ وطن

□□

ڈاکٹر سعید عارفی
عیدگاہ روڈ II سالار گنج
بہرائچ - ۲۷۱۸۰۱

تحریک آزادی کی ایک اہم نظم : "بھارت ماتا"

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو عوامی تحریک کی شکل عطا کرنے اور اسے عصری میلان و رجحان کے قالب میں ڈھالنے کے سلسلے میں تمام ہندوستانی زبانوں کے ادب کا نہایت اہم کردار رہا ہے۔ خصوصاً شاعری نے تحریک آزادی کے لیے جو کار نامے انجام دیئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ شاعری نے تحریک آزادی کو عوام کے دلوں، جذبات، احساسات اور افکار سے جوڑنے کا کام کیا۔ شاعری کے وسیلے سے ہندوستانی عوام کی رسائی تحریک آزادی کے فکری اور نظریاتی پہلوؤں اور اس کے خدوخال تک ہوئی اور اس پوری تحریک کا مقصد واضح طور پر سب کے سامنے آیا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادب کی شاعری میں تحریک آزادی سے متعلق بے شمار نظموں کی تخلیق ہوئی اور ان نظموں کو گاتے ہوئے بے شمار جاں نثاران وطن نے ہنستے، مسکراتے ہوئے انگریزی سامراجیت کے جبر و استبداد کے ہاتھوں آزادی، وطن کی خاطر شہادت کا جام پی لیا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

میں یہاں اور دوسری زبانوں کی نظموں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اپنی بات کو اردو زبان و ادب کی شاعری تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ یوں تو اردو زبان کے بے شمار شعراء نے تحریک آزادی کے اغراض و مقاصد، اس کی اہمیت، ضرورت اور جذبۂ حب الوطنی کو اپنا موضوع بنایا اور نظمیں تخلیق کیں۔ ان نظموں نے خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کیا، منجمد جسموں میں حرکت و حرارت پیدا کی اور دلوں کو عزم و حوصلہ بخشا۔ اس سلسلے کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جنھیں اردو شعر و ادب کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ مگر میں یہاں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اور نہ فہرست سازی کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اردو میں جن شعراء نے تحریک آزادی سے متعلق نظمیں کہی ہیں ان میں ایک اہم نام جمیل مظہری کا ہے۔ اور میرے خیال سے جمیل مظہری کی نظم "بھارت ماتا" ہر اعتبار سے اردو کے شعری ادب میں ایک اہم اور مخصوص مقام کی حامل ہے۔

جمیل مظہری کی نظم "بھارت ماتا" کی خوبی صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں سر زمین ہند کی کچھ اہم اور مقدس ہستیوں کے پیکر تراشے گئے ہیں جن کی ذات اقوام عالم کے لیے مینارہ، نور کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ جمیل مظہری نے اپنی اس نظم میں ہندوستان کے تہذیبی، معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور تاریخی نقوش کو بھی بہت واضح انداز میں ابھارا ہے۔ انھوں نے اس نظم میں ہندوستان کی ان خصوصیات اور خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے ہندوستان تاریخ عالم میں اپنا ایک الگ اور اہم مقام رکھتا ہے۔ جب حب الوطنی کا جذبہ رکھنے والوں کے دلوں میں اس نظم کا مطالعہ سرشاری اور لذت کی ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ احساسات کو متحرک کر دیتا ہے۔ اس نظم میں ہمیں ہندوستان اپنی مکمل اور حقیقی شکل و صورت میں موجود نظر آتا ہے۔ جمیل مظہری اپنی نظم "بھارت ماتا" کی ابتدا کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری کو ہر طرف فضا میں ہندوستان کے قدرتی ماحول کی خوشبو کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور مناظر کے عکس اپنی پوری رنگارنگی کے ساتھ نظر آنے لگتے ہیں۔

ماتا ماتا، پیاری ماتا
بچے تجھ پہ واری ماتا
او ماتا او بھارت ماتا
تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
سندری تو ہریالی تو ہے
دھانی آنچل والی تو ہے
پھول کھلائیں تیری گھٹائیں
بن برسائیں تیری ہوائیں

جمیل مظہری نے اپنی نظم "بھارت ماتا" میں ماں کی تمنا کے جو پیکر تراشے ہیں وہ نہایت ہی دل نواز اور پر اثر ہیں ۔اس نظم میں ماں کی ذات اور شخصیت اپنے پورے تقدس اور فطری تقاضوں کے ساتھ ابھرتی ہے ۔شاعر اس نظم میں ہندوستان کو ایک ماں کی شکل میں دیکھتا ہے اسے ہندوستان میں وہی روپ رنگ اور کیفیات نظر آتی ہیں جو اخلاقی طور پر کسی ماں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں اور ہر ماں اپنے بچوں کی پرورش، ان کی تربیت اور نشوونما کے سلسلے میں خصوصی توجہ کرتی ہے ۔اسے اس عمل میں جن مصائب، آلام اور مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے ان سے بڑی خوش اسلوبی اور سبک روی سے گذر جاتی ہے یہ دشوار مراحل اسے کسی بھی طرح ہراساں نہیں کرتے ۔جمیل مظہری اپنی اس نظم کے ذریعہ ہمیں اس بات کا یقین اور احساس دلاتے ہیں کہ بھارت ماتا اپنے اس فریضے کی ادائگی اور انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہیں لے رہی ہے بلکہ اس کا یہ عمل مکمل سپردگی کے ساتھ جاری ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی ماں اپنی اولاد کے لیے کرتی ہے ۔وہ کہتے ہیں۔

شہد کی نہریں دودھ کی دھاریں
گودی میں جنت کی بہاریں
میٹھے میٹھے پھل دیتی ہے
ان دیتی ہے جل دیتی ہے

اس طرح جمیل مظہری نے اپنی اس نظم میں بچوں کی پرورش کے مسائل کو بھی بڑی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ بچے ولادت کے بعد بھی کچھ مدت تک صرف ایسی چیزوں کا استعمال کرتے ہیں جو رقیق ہوتی ہیں اسی لیے انھوں نے اپنی اس نظم میں پہلے شہد اور دودھ کا ہی ذکر کیا ہے بچے پھل اور دوسری سخت اشیاء کا استعمال اس وقت کرتے ہیں جب ان کے دانت نکل آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایسی تمام چیزوں کا ذکر اس نظم کے بعد کے شعروں میں کیا گیا ہے۔

عمر کے تدریجی ارتقاء کے بعد بچپن کی منزلیں گذرتے ہی تبدیلیوں کا وہ عہد شروع ہوتا ہے جہاں رومان کے قدموں کی آہٹ سنائی پڑنے لگتی ہے ۔اور زندگی اپنی تمام تر سحر سامانیوں کے ساتھ انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے ۔"بھارت ماتا" میں جمیل مظہری نے اس کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے۔

کنگن اور چوڑی کی چھنا چھن
شاعر کے دل کی ہر دھڑکن
چاندنی راتوں کے جلوے میں
برندا بن کے سناٹے میں
جب تاروں کی سبھا سجتی ہے
ہردے کی بنسی بجتی ہے

عمر کے اس پڑاؤ کے آگے جو موڑ آتے ہیں وہاں زندگی میں ہر طرف رنگ، خوشبو، دلکشی، شوخی اور کشش کا ایک وسیع تر جہاں آباد ملتا ہے عمر کی یہی وہ منزل جب کوئل کی آواز کی نقل بھوڑ کر ہم اس کی آواز کے کیف، لذت اور شیرینی سے سرشار ہونے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں بلکہ اپنے وجود، جذبات اور دل کو ایک خاص کیفیت میں ڈبو دینے کی کوشش کرتے ہیں جمیل مظہری اپنی اس نظم میں عمر کی اس منزل کی نقش آرائی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

آدھی رات کو کالی کوئل
موسم کی متوالی کوئل
پھیلتی ہے جب آم کی خوشبو
گیت تیرا گاتی ہے کو، کو

ان مصروں میں قاری کو صرف کیف ونشاط کی لذت کا ہی احساس نہیں ہوتا بلکہ خوشبوؤں اور جذبوں کی ایک دھنک رنگ فضا میں وہ کھو کر رہ جاتا ہے ۔خوشبوؤں رنگوں اور جذبوں کے اسی اتصال کا نام نوجوانی ہے۔

جمیل مظہری کی یہ نظم تخلیقی اعتبار سے ادراک وعرفان کی ایک ایسی منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں انہیں خود بخود اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اب ملک کے نوجوانوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی قدیم روایات، تہذیبی اقدار اور تاریخی پس منظر کیا تھا کیوں کہ کوئی قوم اپنی روایات، تہذیب اور تاریخ سے کٹ کر عروج وارتقاء کی منزلیں نہیں طے کر سکتی ۔روایات، تہذیب اور تاریخ قوموں کی تعمیر میں اینٹ اور گارے کا کام کرتی ہیں انھیں سے قوموں کی اپنی شناخت بنتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جمیل مظہری اپنی اس نظم میں ہندوستان کے نوجوان نسل کا ہاتھ پکڑ کر اسے تاریخ، روایات اور تہذیب کی گلیوں میں لے جاتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کیا تھیں اور تاریخ کے مختلف مناظر کیا تھے۔

ہے مشہور تیری مہانی
پورب، پچھم تیری کہانی
تبریزی، طوسی، شیرازی
مصری، رومی اور حجازی
آرینی، چینی اور جاپانی
پی کر تیرا میٹھا پانی
ہو گئے سوجی جان سے تیرے
ڈال دیئے گنگا پر ڈیرے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ممتا کی کیفیات اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتیں۔ بچہ کہیں کا بھی ہو کہیں سے بھی آیا ہو اسے آغوش میں سمیٹ لینا، بانہوں میں بھر لینا اور شفقتیں نثار کرنا صرف انسانیت کا ہی نہیں بلکہ ممتا کے فراخدلانہ، بے لوث اور پرعظمت رویے کا مظہر ہے۔ "بھارت ماتا" نظم میں جمیل مظہری نے ہندوستان کو ماں کا ایک خوبصورت نادر اور مکمل مجسمہ قرار دیا ہے۔ وہ اس طرح اس تاریخی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے ممالک سے نہ جانے کتنی قومیں کارواں در کارواں ہندوستان میں آتی رہی مگر وہ تمام قومیں ہندوستانی زندگی، تہذیب، ثقافت اور معاشرت کا ایک جدا نہ ہونے والا حصہ بن کر رہ گئیں اور انھوں نے اس ملک عظیم کو ہی اپنا وطن بنالیا۔ ان کیفیات کا ذکر جمیل مظہری کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

گھر کو چھوڑا، در کو چھوڑا
تجھ سے اپنا ناتہ جوڑا
تو نے انھیں گودی میں اٹھایا
پالا اور پروان چڑھایا
تیرا گھر ہے سب کو پیارا
سر اونچا کیوں ہو نہ ہمارا

جمیل مظہری نے اپنی اس نظم میں سرزمین ہند کو "جگ ماتا" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ان کے اس شعری اظہار میں کہیں بھی کسی طرح کے جذباتی اور ہیجانی رویے کا احساس نہیں ہوتا، نہ کسی قسم کی شاعرانہ تعلّی کا گمان ہوتا ہے اس طرح ان کے اس پیرایہ اظہار میں نہ تو کسی خوابناک کائنات کی جھلک دکھائی دیتی ہے بلکہ یہ ایک سچا اور حقیقی طرز اظہار ہے۔

اگر غور کیا جائے تو انسانیت اور بچوں کا نہ تو کوئی ملک ہوتا ہے، نہ وطن، نہ کوئی مذہب اور نہ کوئی قومیت۔ ان دونوں چیزوں کی کائنات ہر قسم کی تقسیم سرحد اور حد بندیوں سے پرے ہوتی ہے اور جو ماں کسی ایک کی ماں نہ ہو کر "جگ ماتا" ہو اس کی ممتا نسلوں، قوموں، ذاتوں برادریوں اور طبقات کی کسی بھی تقسیم اور حد بندیوں کو اس طرح قبول اور تسلیم کر سکتی ہے بلکہ وہ اس طرح ان کہ ساری عمارتوں کو منہدم کر کے رکھ دیتی ہے جہاں سے منافرت، تقسیم اور فرقہ واریت وغیرہ کے عناصر جنم لیتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہوتی ہے جب تاریخ جغرافیائی حدوں کو مسمار کرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں سب کے دلوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں، مذاہب شیر و شکر ہو جاتے ہیں لوگ گفتگو کی زبان سمجھنے کے بجائے دلوں اور جذبوں کی زبان سمجھتے ہیں، جہاں سب کچھ مشترک ہو جاتا ہے چاہے وہ خوشی کے لمحے ہوں یا غم کے۔ یہیں ایک ایسے سماج، تہذیب، ثقافت اور معاشرت کی تعمیر ہوتی ہے جہاں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے باوجود سب ایک ہوتے ہیں، جہاں اختلاف میں بھی اتفاق اور اتحاد کی تصویر ابھرتی ہے۔

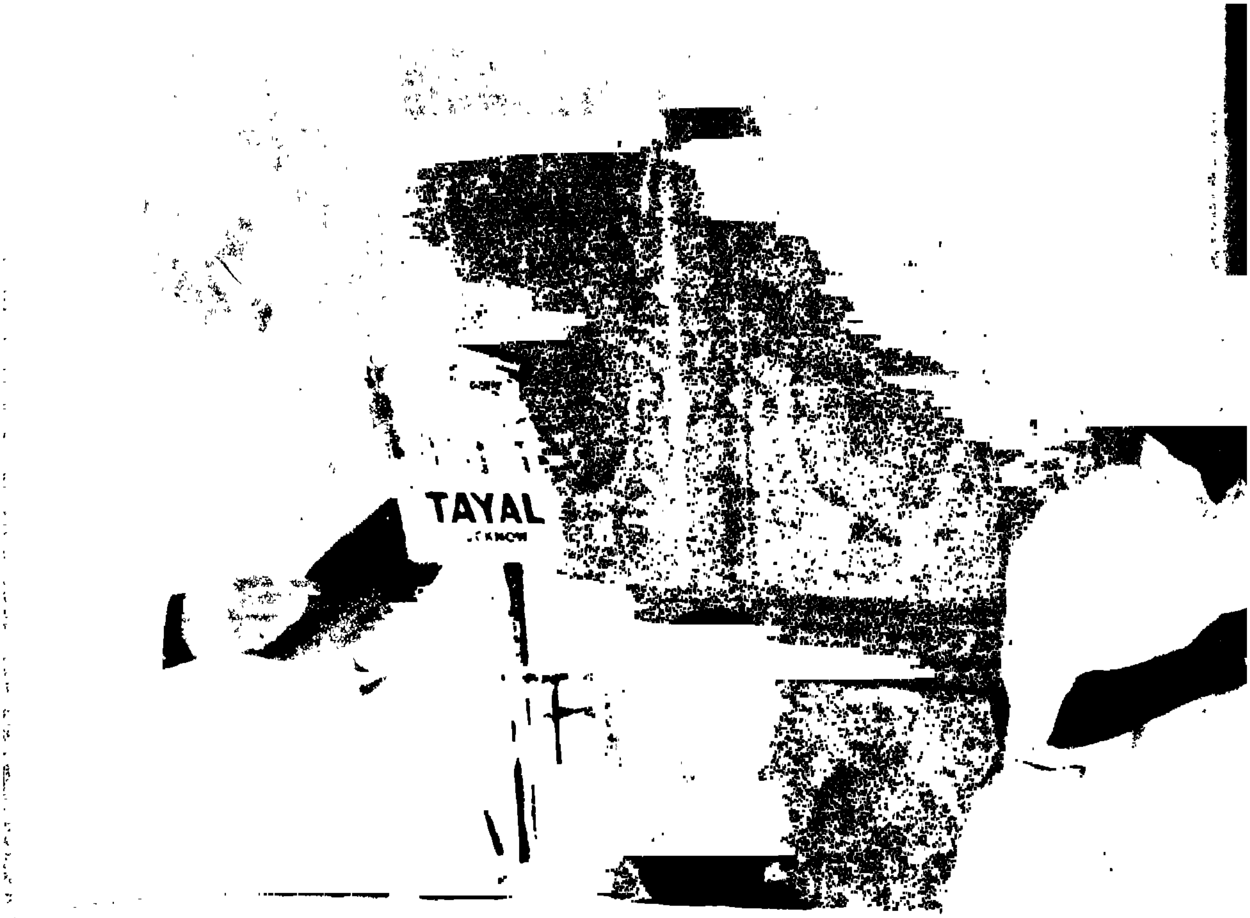
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
تیری گود میں بھائی بھائی
کھیتوں میں تیرے بادل کے
سائے میں تیرے آنچل کے
مسجد، گرجا اور شوالہ
لنکا سے تا کوہ ہمالہ

اور جب کسی ماں کے گھر پر آفت، مصیبت، پریشانی اور ادبار کے بادل چھانے لگتے ہیں تو ان دشواریوں کے لمحات میں کسی بھی ماں کا کوئی بیٹا، کوئی نونہال، کوئی سپوت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتا بلکہ ان حالات اور مواقع پر اپنی جانبازی اور بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے بے تاب و بے چین ہو اٹھتا ہے۔ ماں کا تحفظ اسے جان سے بھی زیادہ عزیز بن جاتا ہے کیوں کہ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب اولاد ماں کے قرض سے اپنے کاندھے کو سبک کرنے کے لیے رن میں کود پڑتی ہے۔ فرض کی آواز پر کان دھرنا اس کا مقصد حیات اور نصب العین بن جاتا ہے اسی لیے جب کسی ماں پر مظالم انتہا کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں غلامی زندگی کے لیے عذاب بن جاتی ہے، حیوانی و وحشیانہ طاقتیں ظالمانہ رویے کو تیز کر دیتی ہیں تو ماں کو جی جان سے چاہنے والے بیٹے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر شہادت کا جام پینے اور ماں پر قربان ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بھی اس عزم،

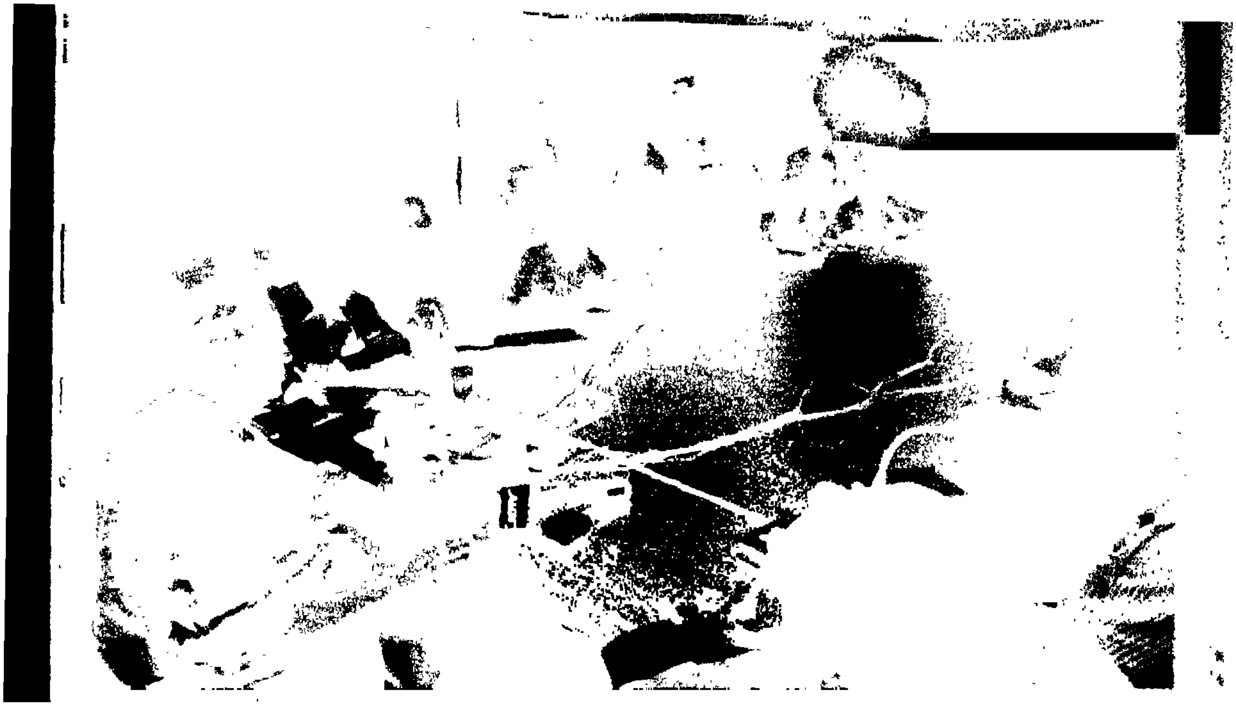


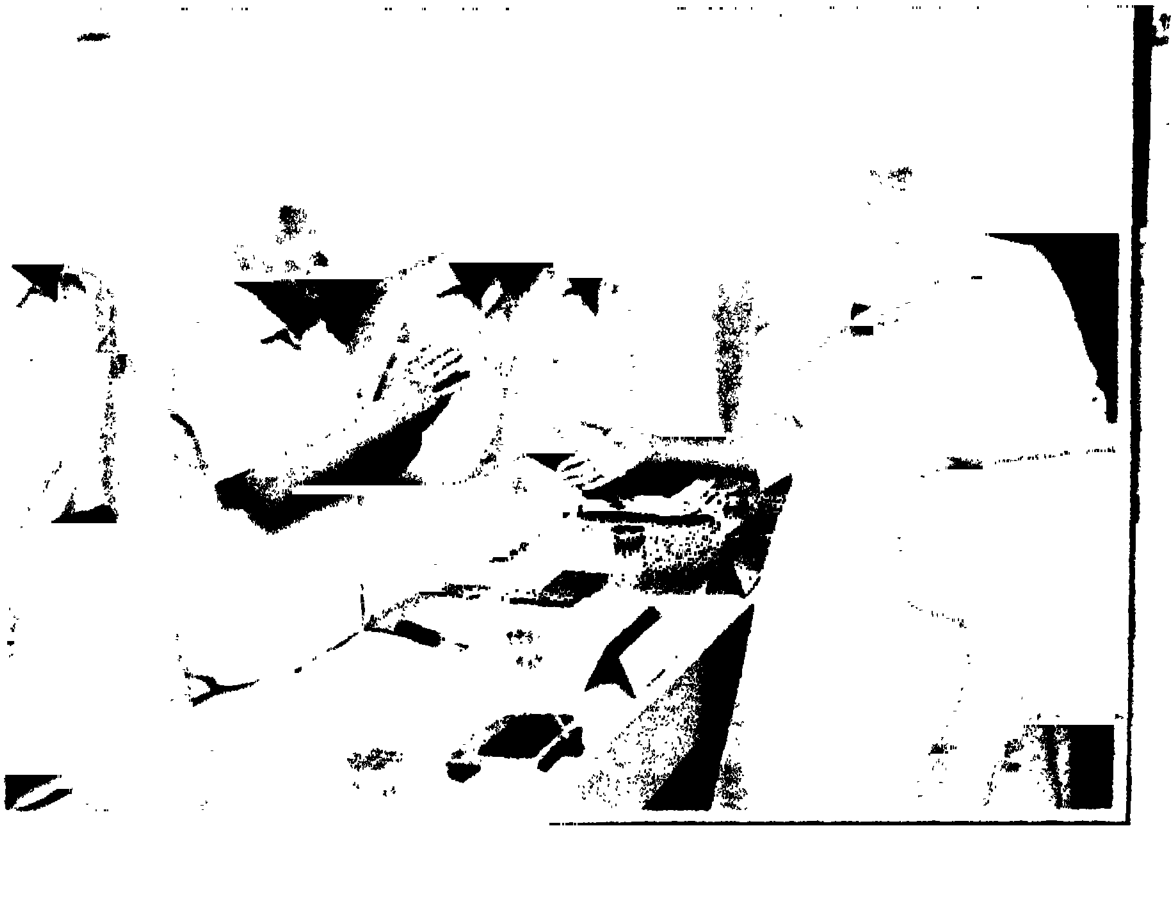





TAYAL







حوصلے اور عہد و پیمان کے ساتھ کہ ماں کو صرف غلاموں کی زنجیروں سے ہی نجات نہیں دلاتا ہے بلکہ غلاموں کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھنے والے نام و نہاد آقاؤں کی پست ذہنیت اور خود غرضانہ طور طریقوں کے باعث پامال شدہ زندگی، تہذیب، ثقافت اور معاشرت کے حسن کی واپسی بھی ان کا مطمح نظر بن جاتی ہے۔ اس نظم میں شاعر اس مقام تک آتے آتے وطن پرستوں کے ساتھ ساتھ خود بھی انھیں جذبات واحساسات سے سرشار نظر آنے لگتا ہے۔

آ ہم تیرے بال سنواریں
تجھ پر اپنی جانیں واریں
سیس تیرے چرنوں پہ نوائیں
پریت کے میٹھے منتر گائیں
قومیت کی کڑیاں جوڑیں
لعنت کی زنجیریں توڑیں

"بھارت ماتا" کے مطالعہ سے اس قاری کو اس بات کا بخوبی ادراک و عرفان ہو جاتا ہے کہ جمیل مظہری کو اس کا مکمل طور پر علم ہے کہ جب کوئی قوم کسی مقصد کے حصول کی خاطر پورے یقین اور اعتبار کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو وہ اپنی منزل ضرور پالیتی ہے اس کے سامنے صرف وہ منزل اور مقصد ہوتا ہے جس کے لیے وہ میدان جنگ میں اپنے پاؤں جما کر کھڑی ہو گئی ہے۔ جمیل مظہری اس بات سے واقف تھے کہ جنگ آزادی میں بھارت ماتا کے فرزند اور سپوت فتح و نصرت سے ضرور ہمکنار ہوں گے اور مادر وطن کے پیروں میں پڑی ہوئی غلامی کی زنجیر یقینی طور پر ٹوٹ کر پاش پاش ہو جائیں گی۔ اس لیے جمیل مظہری ایقان کے ساتھ کہتے ہیں۔

یہ تجھ کو آزاد کریں گے
گھر تیرا آباد کریں گے
مت رو اب دکھیاری ماتا
پیاری ماتا۔ پیاری ماتا

جمیل مظہری اس نظم میں بھارت ماتا کے فرزندوں، سپوتوں اور جاں نثاروں کے جذبۂ سرفروشی اور عہد و پیمان حصول آزادی کا اعادہ کرتے ہیں اور مادر وطن کو اس کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسے غلامی کی صعوبتوں سے بہت جلد نجات ملنے والی ہے، وہ اس عمل میں منظر در منظر تاریخ کی جانب لوٹتے ہیں اور گذشتہ سارے عہد و پیمان، قربانیوں اور شہادتوں کا ذکر نہایت ہی پر جوش طور پر کرتے ہیں، انہیں اس بات کا بھی بخوبی علم اور اندازہ ہے کہ کسی بھی قوم و ملت کو درپیش کوئی بھی چیلنج ہمیشہ حال کی بہتری اور مستقبل کی خوبصورتی کے لیے ہوتا ہے۔ تاریخ اس ملت و قوم کو صرف چیلنج سے مقابلے اور نبرد آزمائی کی قوت اور شعور فراہم کرنے کا کام کرتی ہے کیونکہ تاریخ کے ذریعہ قومیں ان اسباب، کمزوریوں، کوتاہیوں اور خامیوں کو سمجھتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں ماضی میں مقصد کے حصول میں ناکامیوں، نامرادیوں، محرومیوں اور شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اسی لیے قوموں کو اپنی تاریخ کا علم ضروری ہے کیونکہ تاریخ ہی قوموں کو ان کے عروج و زوال کی داستان کی بصیرت و آگہی عطا کرتی ہے اور آگے کے لیے فیصلہ کرنے میں معاون بنتی ہے، لیکن ضروری یہ ہوتا ہے کہ قومیں اپنی داستان عروج و زوال کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے تاریخ کے جھروکے میں ان اسباب و عوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں جو ماضی میں ان کی پسپائی اور شکست کا باعث تھے تاکہ جہد و عمل کی دنیا کی جانب ان کی مراجعت ہو سکے جس سے حال بہتر اور مستقبل منور و تابناک ہو سکے۔ جمیل مظہری اس کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

اب ہے ہماری باری ماتا
ماتا، ماتا، پیاری ماتا
او ماتا! گوتم کی ماتا
ارجن اور بھیشم کی ماتا
ٹیپو کی ماں، اکبر کی ماں
ستونتی ماں، بلونتی ماں
ٹیپو اور پورس پیدا کر
ایک اٹھے تو دس پیدا کر

جب مادر وطن کا ہر سپوت سپاہی بن جانے گا، مجاہد ہو جائے گا اور سرفروشی کی تمنا سے سرشار ہو کر اٹھ کھڑا ہوگا تو ماں کے دشمنوں کے قدم ایک لمحے کے لئے بھی مقابلے پر ٹھہر نہیں سکتے۔ اسی لیے شاعر چاہتا ہے کہ قوم کا بچہ بچہ مادر وطن ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنے اندر رہ نمایانہ شان اور جاہ و جلال پیدا کرے۔

دیش کا ہر بچہ ہو آندھی
ہر بچہ آزاد اور گاندھی

جمیل مظہری اس نظم میں اپنی ان خواہش اور آرزو کا بھی اظہار کرتے کہ اگر ہندوستانی مردوں کے دوش بدوش ہندوستانی

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

ڈاکٹر صادق
اے جی پی سی۔ وکاس پوری
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۸

بجوکا خوف ہے

بجوکا
ایک ساہوکار ہو تم
فصل کے پکتے ہی
اس پر حق جتانے
آ کھڑے ہوتے ہو
بیچوں بیچ
کھیتوں کے۔

بجوکا
ایک دھوکے باز ہو تم
بے زباں
بھوکے پرندوں پر
مسلط خوفِ بیجا کر کے
ان کو
رزق سے
محروم رکھتے ہو

بجوکا
تم کو خالق نے تمہارے
بے شکم پیدا کیا
خوش بخت ہو
کہ بھوک سے واقف نہیں
لیکن پرندے تو
شکم رکھتے ہیں
سمجھو اُن کی مجبوری

بجوکا
خود بھی تو مجبور ہو
کچھ کر نہیں سکتے
کبھی سرکش ہوائیں
سر کی ہانڈی توڑ دیتی ہیں
تمہاری تھر تھری وردی
اُڑا دیتی ہیں، بھانڈا پھوڑ دیتی ہیں
تو پھر وقعت تمہاری
کتنی رہ جاتی ہے
تم خود جانتے ہو۔

بجوکا
یہ تمہارا رازِ سربستہ
پرندوں پر کوئی دن فاش ہو جائے
کہ تم اک خوف ہو
پلتا ہے جو ذہنوں میں اُن کے
تو کہو کیا ہو؟

بجوکا
تم بجز اس خوف کے کچھ بھی نہیں
کچھ بھی نہیں ہو
خلاصہ بس یہی اک خوف
ساری زندگی کا ہے
یہی معنیٰ، یہی مقصد
تمہاری زندگی کا ہے

□□

احساس

(ایک سانیٹ)

وہ آگ جو راکھ میں دبی تھی
وہ راگ جو ساز میں چھپا تھا
وہ آہ جو دل میں سو رہی تھی
وہ چاہ جو خواب ہو رہی تھی
جوان جذبوں کی تابشوں سے
حسیں نگاہوں کی سازشوں سے
شفیق ہاتھوں کی نرمیوں سے
گداز بانہوں کی گرمیوں سے
کسی نے اس کو جگا دیا ہے
پھر ایک طوفاں اُٹھا دیا ہے

ڈاکٹر معراج احمد
شعبہ سماجیات
لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

نور محمد (آئی اے ایس)
۲۳- راج بھون کالونی، لکھنؤ

وقف کی ترقی: ایک نئے تناظر میں

وقف سے متعلق قانون گزشتہ ۱۴ صدیوں سے رائج ہیں۔ وقف کا نظریہ حضرت محمدؐ کی احادیث پر مبنی ہے۔ حضرت محمدؐ نے خود اپنی جائیداد اپنی امت کی سپردگی میں دے کر وقف کے نظریہ کو حوصلہ بخش ترویج دی۔ وقف کے قوانین، ٹرسٹ سے متعلق انگریزی قوانین سے قدرے مختلف ہیں۔ جہاں تک وقف کا سوال ہے جائداد کو اللہ کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس طرح سپرد کی گئی جائیداد پر فردِ متعلق کے سارے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ جائیداد ہمیشہ کسی ثواب کے کام یا بھلائی و بہبودی کے لیے سپرد کی جاتی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے انھیں امور پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ایک متولی وقف کا ناظم ہوتا ہے جس کا اس جائیداد پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کے نام پر اس جائیداد کی نگرانی ان پاکیزہ امور یا بھلائی و بہبود کے مقاصد کے حصول کے لیے کرتا ہے، جس کے لیے جائیداد کو اس کے اصلی مالک، جسے واقف کہا جاتا ہے، نے اسے سپرد کیا ہے۔

ہندستان میں وقف کا تاریخی پس منظر

مسلم حکمرانوں کے دورِ حکومت میں وقف کے نظریے نے ہندستان میں جڑیں پکڑیں۔ دورِ سلطنت میں وقف کے انتظامات سے متعلق تمام حقوق سلطان میں پنہاں ہوتے تھے۔ مرکزی سطح پر 'صدر الصدر' اور ریاستی سطح پر 'صدر صوبہ' اس کی مدد کرتے تھے۔ اس طرح ضلعی سطح پر 'صدر سرکار' وقف کے انچارج ہوتے تھے اور مقامی سطح پر 'قاضی' وقف کی نگرانی کرتے تھے۔ وہ وقف سے متعلق معاملوں کی شنوائی بھی کرتے تھے۔ متولی وقف کے انتظامی امور نیز ضروریات کے لیے ذمہ دار ہوتا تھا۔

ہندستان کی برطانوی حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی خیراتی اداروں پر معمولی نگرانی رکھتی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں مذہبی اداروں سے متعلق قانون (مذہبی نیاس قانون) پاس کیا گیا جس کے تحت متولیوں کو حقوق دیے گئے، اور اس کے بعد چیریٹیبل جائداد قانون ۱۸۹۰ء کے تحت پورے ملک میں علاج و معالجہ وغیرہ کے لیے قائم کیے گئے۔ چیریٹیبل نیاسوں (اداروں) کا مرکزی خازن مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں مسلم وقف ویلیڈیٹنگ قانون ۱۹۱۳ء پاس کیا گیا جس کے تحت وقف علی الاولاد کو منظوری دی گئی۔ برطانوی حکومت نے ۱۹۲۰ء میں چیریٹیبل اینڈ ریلیجیس ٹرسٹ قانون پاس کیا، جس میں متولیوں کو مزید حقوق دیے گئے۔ لیکن وقف انتظامیہ کے مختلف دعووں اور حوالے میں یہ قانون دیوانی عدالتوں پر انحصار کرتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم وقف ویلیڈیٹنگ قانون بنایا گیا، جس کے تحت ۱۹۱۳ء سے قبل کیے گیے وقف علی اولاد کی قراردادوں کو پہلے کی طرح موثر کیا گیا۔ بعد میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے متعدد قوانین بنائے جو یہ ہیں:

مسلم وقف قانون ۱۹۲۳ء بہار اور اڑیسہ۔ مسلم قانون ۱۹۲۶ء بنگال وقف قانون ۱۹۳۴ء، بمبئی۔ مسلم وقف قانون ۱۹۳۵ء صوبہ متحدہ مسلم وقف قانون ۱۹۳۶ء، دہلی مسلم وقف قانون ۱۹۴۳ء بمبئی۔ مسلم وقف قانون (ترمیم) ۱۹۴۵ء، بہار وقف قانون ۱۹۴۷ء، مرکزی وقف قانون ۱۹۴۵ء، اتر پردیش مسلم وقف قانون ۱۹۶۰ء۔ مرکزی وقف (ترمیم) قانون ۱۹۴۸ء اور مرکزی وقف قانون۔

مرکزی وقف قانون ۱۹۵۴ء کا اہم مقصد ملکی سطح پر وقف انتظامیہ میں یکسانیت لانا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ قانون ملک کے سبھی حصوں میں نافذ نہیں ہو سکا، اس کے علاوہ اس قانون سے وقف انتظامیہ میں کوئی خاص اصلاح نہ ہو سکی۔ وقف بورڈ بھی کچھ بہتر کر سکنے میں معذور رہے ہیں اور ان کی مالی حالت اتنی

خراب ہے کہ ان کے پاس اپنے ملازمین کو تنخواہ دینے تک کے لیے رقم نہیں ہے۔ مرکزی حکومت کی تشکیل کردہ وقف جائزہ کمیٹی نے اوقاف کی مالی حالت بہتر بنانے اور وقف انتظامیہ کو دوبارہ تشکیل دے کر قانون کی کمیوں کو دور کرنے کی سفارش کی تھی۔ نتیجے کے طور پر مرکزی وقف قانون کی درست اور واضح شکل پہلے ۱۹۸۴ء میں اور پھر ۱۹۹۵ء میں سامنے آئی۔

وقف کے مقاصد

دنیا کا پہلا وقف حضرت محمدؐ کے مشورے پر حضرت عمرؓ نے کیا تھا اس طرح حضرت عمرؓ نے خیبر میں اس وقف کے لیے اپنے متعلقین، غرباء اور غلاموں کی فلاح و بہبود اور خیر کے جذبے کے تحت ایک قطعہ آراضی مہیا کرایا۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ یہ زمین نہ تو فروخت کی جائے گی اور نہ ہی تحفہ کی شکل میں یا وراثت میں دی جائے گی۔

" جواہر الکلام کے مطابق وقف کا مقصد اللہ کی
راہ میں جائیداد کے تسلسل کو بنائے رکھنا ہے اور
یہ ایک مذہبی امر ہے"۔

——— امیر علی جلد ۱ ص ۲۲۱

۱۹۱۳ء میں تشکیل کردہ مسلم وقف ویلیڈیٹنگ قانون کے مطابق" وقف کا منشا کسی ایسے فرد کے ذریعہ جو کہ مذہب کی رو سے مسلمان ہو، کسی جائیداد کو کسی ایسے مقصد سے سپرد کرنا ہے جو اسلامی قانون کے لحاظ سے مذہبی، پاکیزہ یا فلاح و بہبود کرنے والا ہو"

بعد میں مختلف عدالتوں نے یہ تسلیم کیا کہ کوئی غیر مسلم بھی ان مقاصد کے حصول کے لیے جو کہ اسلامی قانون (شریعت) کی رو سے مذہبی تسلیم کیے جاتے ہیں، وقف کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کا مقصد واقف کے مذہب کے مطابق غیر قانونی نہ ہو۔ کسی مسلمان کے لیے قانون کی رو سے یہ مناسب ہے کہ وہ غیر مسلم غرباء اور بے سہارا لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف قائم کرے۔ اسی طرح وہ غیر مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے بھی وقف قائم کر سکتا ہے۔

اسلام کے دینی اور شرعی ضابطہ کی اساس انسانی خدمات اور بھلائی پر ہے لہٰذا وقف کا مقصد عام افراد کی مذہبی بھلائی قرار پایا ہے اس طرح کسی بھی مذہبی عقیدے کا طالب علم فطری طور پر وقف کے ذریعہ تشکیل ادارے سے مستفید ہو سکتا ہے۔ غریب اور بے سہارا افراد خواہ وہ کسی بھی مذہب کے معتقد ہوں، امور خیر اور بہبود کے مقصد سے قائم اوقاف سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ بیشتر اوقاف اس قدر بدانتظامی کے شکار ہیں کہ وہ بمشکل ان مقاصد کو عملی جامہ پہنا پاتے ہیں، جن کے لیے ان کا قیام عمل میں آیا ہے۔ وقف کا استعمال تعلیم کے فروغ، غرباء کو راحت رسانی اور مجبور و بے سہارا افراد کو سہارا دینے کے لیے کیا جا سکتا ہے، اور اگر ان اداروں کے ذریعہ مزید ذرائع کثیر تعداد میں پیدا کیے جاتے ہیں تو ان ذرائع کا استعمال دوسرے مذاہب کے معتقدین کو فائدہ پہونچانے کے لیے کیا جانا چاہیے اس سے نہ صرف ہندستان میں رہنے والے مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگوں کے درمیان بھائی چارے اور اخوت کا جذبہ بیدار ہوگا بلکہ حکومت کے ذریعہ اور سماج کی ترقی اور اس کی بھلائی کے لیے کیے جانے والے کاموں کو بھی حمایت حاصل ہوگی۔

وقف کی ترقی:
چند اہم پہلو

ترقیِ وقف کا نظریہ موجودہ عہد کی پیداوار ہے۔ اب تک وقف پر جو لٹریچر مہیا تھا وہ صرف ان کے نظم و ضبط کے ہی متعلق تھا، متولیوں کی ذمہ داریاں صرف جائیداد پر ناجائز قبضوں کو روکنے اور وقف سے موصول آمدنی کو واقف کے ذریعہ مقررہ مقاصد کو پورا کرنے پر خرچ کرنے کی حد تک محدود تھیں۔ متولیوں کی ذمہ داریوں میں کوئی تیزی نہیں تھی۔ ایسے بھی معاملے سامنے آئے ہیں جہاں پر واقف (بالخصوص وقف علی الاولاد کے معاملے میں) کے ذریعہ مسجد وغیرہ میں روشنی کرنے کے لیے مقرر کی گئی دس روپئے جیسی رقم آج بھی اتنی ہی بنی ہوئی ہے۔ حالاں کہ آج ان جائیدادوں سے ہونے والی آمدنی ہزاروں لاکھوں روپیوں تک پہونچ گئی ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ وقف سے ہونے والی کل آمدنی کے تناسب سے اس مقررہ دس روپئے کی رقم بڑھا دی جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مختصر یہ کہ واقف کی منشا کے قدیم نظریے کے نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے۔ وقف علی الاولاد کے طور پر رجسٹرڈ کیے گئے اوقاف میں

فلاح وبہبود کے کاموں پر خرچ کی جانے والی رقم میں کمی آگئی ہے۔ وقف بورڈوں کے ذریعہ ایسی کوئی بھی پہل نہیں کی جارہی ہے جس سے اس کا تعین کیا جاسکے کہ واقف کی منشاء کے مطابق صحیح تناسب میں رقم فلاح وبہبود کے کاموں پر خرچ کی جائے۔

اکثر اوقاف مکانوں وغیرہ کی شکل میں ہیں اور کرائے پر اُٹھے ہوئے ہیں۔ برسوں سے ان مکانوں کے کرایہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ ایسے اوقاف بڑی آسانی سے دیکھنے کو مل سکتے ہیں جہاں پر ابھی بھی وہی کرایہ لیا جارہا ہے جو ۵۰ برس قبل مقرر کیا گیا تھا۔ چونکہ ان میں سے بیشتر جائیداد پر رینٹ کنٹرول ایکٹ نافذ ہوتا ہے اور اس قانون کے تحت کرایہ میں اضافہ کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے اس لیے متولی کرایے میں اضافہ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔

راقم الحروف کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ آیا ریاستی وقف بورڈوں نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی کی ہے یا نہیں بہرحال اس بے عملی کے نتیجے میں وقف کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی آمدنی میں شرح گرانی میں اضافے کی وجہ سے گراوٹ ہی آئی ہے اور اس طرح اوقاف کا جو مقصد تھا، اس کو نقصان پہنچا ہے۔

بیشتر اوقاف مساجد، مکانات، امامباڑوں، عیدگاہوں اور قبرستانوں کی شکل میں ہیں۔ ان میں سے بعض امامباڑوں، عیدگاہوں اور قبرستانوں کے ساتھ مکانات، دکانیں، احاطے وغیرہ بطور وقف منسلک ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ بیشتر مکانات اور دکانیں وغیرہ معمولی کرایے پر اُٹھی ہوئی ہیں۔ احاطوں پر یا تو ناجائز قبضہ کرلیا گیا ہے یا مستقبل قریب میں ایسا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں یہاں تک کہ ایسی مساجد کے معاملوں میں، جن سے جائدادیں منسلک ہیں وہاں بھی روزمرہ کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کیا جاتا ہے اور منسلک جائداد سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ قبرستانوں کی حالت اور بھی خستہ ہے قبرستان بھی دو طرح کے ہیں۔ پہلے تو وہ جو گھنی آبادی کے درمیان ہیں اور دوسرے وہ جو قصبوں اور گاؤں کے باہر ہیں۔ پہلی قسم کے قبرستانوں کی زمین پر لازمی طور سے قبضہ کرلیا جاتا ہے کیوں کہ زمین کی قیمت ایسی آبادیوں میں کئی گنا بڑھ چکی ہوتی ہے۔ ان جائدادوں پر ناجائز قبضوں کو روکنے کے لیے کسی بھی طرح کی کارروائی نہیں کی جارہی ہے۔ وقف انتظامیہ کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ قبرستان کی چہاردیواری کھنچوانے جیسے کام پر پیسہ خرچ کرسکے اور نہ ہی کوئی ایسا مالی ادارہ ہے جو ان کاموں کے لیے قرض کی شکل میں رقم دے سکے۔ اس کا ایک دوسرا آسان طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان جائیدادوں کو کچھ اس طرح ڈیولپ کیا جائے کہ ان سے ہونے والی آمدنی کو اس قرض کی ادائیگی کے لیے خرچ کیا جائے جو ان کی ترقی اور ناجائز قبضوں سے انھیں بچانے کے لیے لیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر موجودہ قبرستان کے اس سرے پر جہاں سے قبضہ شروع کیا جاتا ہے اور جو سڑک کے کنارے ہو، وہاں پر کچھ دکانیں تعمیر کرادی جائیں۔ ایسے قبرستان جو اب استعمال میں نہیں ہیں، وہاں پر کامرشیل شجرکاری، دکانیں، کمرشیل کامپلکس تعمیر کرائے جاسکتے ہیں یہ سبھی کمرشیل کام ہیں اور ان کے لیے بینک جیسے کمرشیل اداروں یا صوبے کے وقف ترقیاتی کارپوریشن سے قرض کی رقم مل سکتی ہے لیکن ابھی تک ان خطوط پر کام نہیں کیا گیا ہے۔

شہروں، قصبوں اور گاؤں کے کنارے واقع قبرستانوں سے متعلق بھی کچھ اسی طرح کی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ چوں کہ ان زمینوں کی قیمت زیادہ نہیں ہوتی ہے اس لیے ان پر ناجائز قبضہ ہونے کی اُمید کم ہوتی ہے اگر مندرجہ بالا ترقیاتی طریقہ کار اپنایا جائے تو ان قبرستانوں سے آمدنی کے ذرائع بڑھ سکتے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق صرف اترپردیش ہی میں تقریباً ایک لاکھ قبرستان ہیں۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ایک قبرستان کا اوسط رقبہ نصف ایکڑ ہے تو صوبہ کے سبھی قبرستانوں کا کل رقبہ ۵۰ ہزار ایکڑ یا ۲۰ ہزار ہیکٹیر ہو جائے گا۔ محکمۂ جنگلات کی جانب سے مقررہ معیار کے مطابق ایک ایکڑ رقبہ میں دس ہزار درخت لگائے جاسکتے ہیں۔ نئی قبروں کے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے فی ایکڑ کم سے کم ایک ہزار درخت ان قبرستانوں میں لگائے جاسکتے ہیں اور اس طرح ۲۰ ہزار ہیکٹیر علاقہ میں تقریباً ۲ کروڑ درخت لگائے جاسکتے ہیں۔ پانچ برسوں کے بعد

اگر ایک درخت کی قیمت ۵۰۰ روپیہ مان لی جائے تو ان سے ایک ہزار کروڑ روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے یعنی ۲۰۰ کروڑ روپیہ ہر سال کمائے جا سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آر ایل ای جی پی (RLEGP) جیسی سرکاری اسکیموں کے تحت عوامی زمین پر شجرکاری کا انتظام ہے چونکہ قبرستان عوامی زمین ہے اس لیے ان اسکیموں کے تحت ان پہ شجرکاری کی جا سکتی ہے۔

حکومت اتر پردیش نے ایسا ایک حکم نامہ ۱۹۸۰ء میں جاری کیا تھا لیکن اس حکم نامہ کے تحت دی گئی سہولت کا فائدہ ان اوقاف کے متولیوں نے نہیں اٹھایا۔

کچھ ایسی قابلِ کاشت آراضی اور باغات بھی ہیں جو وقف کے طور پر رجسٹرڈ ہیں۔ ان جائیدادوں پر یا تو ناجائز قبضہ کر لیا گیا ہے یا پھر خود غرضی کے تحت ان کو نجی جائیداد کے طور پر استعمال میں لایا جا رہا ہے یا پھر یہ بے توجہی کی شکار ہیں۔ ان جائیدادوں کے انتظامیہ کی دل چسپی سے ان پر کمرشیل شجرکاری، زراعت وغیرہ کی جا سکتی ہے اور زراعت کی جدید تکنیکوں کو اپنا کر پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ ادارے بہت زیادہ بے توجہی اور بدانتظامی کے شکار ہیں اور اس طرح اوقاف کے جو مقاصد ہیں انھیں مالی دشواریوں کے سبب نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

صوفی فقیروں کے مزارات بھی ایک طرح سے اہم وقف ہیں۔ ان فقیروں کے عقیدت مندوں میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر فرقے اور طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ مزارات قومی اتحاد کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ ہر برس عرس کے موقع پر ان مزاروں پر عقیدت مندوں کی بڑی تعداد جمع ہوتی ہے اور وہ لوگ بڑی بڑی رقمیں عطیے کے طور پر دیتے ہیں جس کا ایک بہت بڑا حصہ عقیدت مندوں کو سہولیات مہیا کرانے پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ان مزاروں سے وابستہ جائیدادیں بھی خلفشار کا شکار ہیں جن کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں کیا جا چکا ہے۔ حالاں کہ ان جائیدادوں کی ترقی کی بڑی اُمیدیں ہیں۔

وقف کی ترقی کے لیے منصوبہ بند کوششیں

اِن باتوں کی بنیاد پر اوقاف کی ترقی کے لیے ایک خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے جو لائحہ عمل مرتب کیا جائے ان میں مختلف متبادل کی نشاندہی ضرور کی جائے اور اس کے بعد ان میں سے سب سے اچھے متبادل کو منتخب کیا جائے۔ زمین کے بہتر استعمال سے راستہ ہموار ہو سکتا ہے لیکن ایسا کرتے وقت یہ بات ضرور ذہن نشین ہونی چاہیے کہ جو متبادل چنا جائے وہ اسلام میں ممنوع نہ ہو۔ یہ بھی خیال رہنا چاہیے کہ جو متبادل منتخب کیا جائے وہ ان مقاصد کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے جن کے لیے ان اوقاف کی تشکیل کی گئی ہے۔ ان مقاصد کے لیے وقف جائیدادوں کو مندرجہ ذیل زمروں میں رکھا جا سکتا ہے:

۱. افتادہ آراضی
۲. قبرستان
۳. عمارت

جہاں تک افتادہ آراضی کا تعلق ہے، اس پر کمرشیل کامپلکس مسافرخانہ یا ملازمت پیشہ خواتین کا ہاسٹل تعمیر کرایا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ زمین آبادی کے درمیان ہو۔ اگر یہ زمین الگ تھلگ ہو تو اس پر اسکول، کالج، انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج، اسٹڈی سنٹر وغیرہ قائم کیے جا سکتے ہیں۔ کئی سرکاری اسکیمیں ایسی ہیں جنھیں ان آراضیات پر چلایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر محکمہ سماجی بہبود سے حاصل ہونے والی مالی امداد سے ملازمت پیشہ خواتین کے لیے ہاسٹل تعمیر کیے جا سکتے ہیں اس کے لیے اسکیم کی لاگت کا ۷۰ فی صدی مرکزی حکومت اور ۱۵ فی صدی ریاستی حکومت دیتی ہے، بقیہ ۱۵ فیصد وقف سے مہیا کرانا ہوتا ہے۔

اسی طرح حکومت اتر پردیش کے محکمہ تعلیم کی جانب سے چلائی جانے والی اسکیم کے تحت پسماندہ علاقوں میں لڑکیوں کے ہائی اسکول قائم کیے جا سکتے ہیں۔ کچھ رقم اتر پردیش وقف ترقیاتی کارپوریشن سے لی جا سکتی ہے۔ ایسے معاملوں میں جہاں مالیاتی اداروں سے رقم مہیا نہیں ہو سکتی وہاں مقامی ترقیاتی اتھارٹی کی طرز پر پریمیم کے طور پر ایڈوانس میں رقم لی جا سکتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی متبادل ممکن نہ ہو تو اس آراضی پر کمرشیل شجرکاری یا نرسری قائم کی جا سکتی ہے۔ اس سے آراضی کو جہاں ایک طرف ناجائز قبضوں سے بچایا جا سکے گا وہیں دوسری طرف کچھ آمدنی بھی کی جا سکے گی۔

جہاں تک استعمال میں آنے والے قبرستانوں کا تعلق ہے ان میں شجرکاری ایک بہتر طریقہ ہوسکتا ہے۔ اس کام کے لیے آر ایل ای جی پی کے توسط سے وسائل مہیا کرائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سڑک سے منسلک قبرستان کے حصہ پر دکانیں تعمیر کرائی جاسکتی ہیں تاکہ ناجائز قبضوں کو روکا جاسکے امام باڑوں اور عیدگاہوں سے بھی خالی زمین وابستہ ہوتی ہے۔ ان مقامات پر شجرکاری کرانے سے نہ صرف ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے آمدنی بھی بڑھے گی۔

کرایے پر اٹھائے گئے وقف کی عمارتوں کا سروے کراکر ان سے ملنے والے کرایے کا موازنہ مقامی سطح پر ضلع مجسٹریٹ کے ذریعہ مقررہ کرایہ سے کیا جاسکتا ہے۔ اتر پردیش میں وقف کی جائیداد کو رینٹ کنٹرول ایکٹ سے مستثنا کردیا گیا ہے، اس لیے اب متولیوں کے ذریعہ بازار میں رائج شرح پر کرایہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ وقف بورڈ کے ذریعہ اس کارروائی کا جائزہ لینے سے ریاستی سطح پر اس میں یکسانیت لائی جاسکتی ہے۔ صرف اسی ایک قدم سے اوقاف کی آمدنی کئی گنا بڑھ سکتی ہے۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ اتر پردیش وقف ترقیاتی کارپوریشن کے قیام کے بعد وقف کی جائیدادوں کی ترقی کے سلسلے میں جو پیش رفت ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ متولی ان سہولیات سے ناواقف ہوں جو انھیں وقف ترقیاتی کارپوریشن مہیا کراسکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر متولی کو اس کی جانکاری دی جائے اور وقف کی جائداد کی ترقی کو ایک منصوبہ بند طریقے سے روبہ عمل لایا جائے وقف بورڈ، وقف کمشنر اور وقف ترقیاتی کارپوریشن کی ذمہ داریاں مقرر کی جائیں اور متولیوں کو صحیح ہدایات دی جائیں۔ اس بدانتظامی کی ایک اہم وجہ اور بھی ہے، وہ یہ کہ زیادہ تر متولی جو وقف کا کام کرتے ہیں انھیں اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا اور نہ ہی ترقیاتی کاموں کے لیے ان کی کوششوں کا کوئی صلہ۔ ایسا بندوبست کرنا ہوگا کہ متولیوں میں جائداد کی ترقی کے تئیں دلچسپی پیدا ہو۔ انعام اور سزا مقرر کرنی ہوگی اور متولیوں کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ اپنے فائدے کے لیے ان جائیدادوں کا غلط استعمال نہ کریں۔

اوقاف کی بدحالی کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان سے وابستہ افراد کو جدید انتظامی معاملات کا علم نہیں ہوتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں ایک طرف اس میدان میں مہارت رکھنے والے افراد کا تقرر کیا جائے وہیں دوسری طرف متولیوں کو جدید انتظامی معاملات کی تربیت دی جائے۔

معاشرے کی ترقی میں اوقاف کی اہمیت

اوقاف کا قیام ثواب کے نظریے اور سماج کی بہبود کے لیے کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مذہبی نقطۂ نظر سے جائداد کے وقف کرنے کا تعلق ہے وہ صرف اسلام کی حد تک ہے۔ سماج کی بہبود اور ثواب کے کاموں کے لیے قائم کیے گئے اوقاف پوری انسانیت کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے نہیں روکتا اور نہ ہی کوئی مذہب یہ کہتا ہے کہ صرف اپنے مذہب والوں کے لیے ہی بھلائی کے کام کرو۔ مذہب اسلام ثواب اور سماجی بہبود دونوں کاموں کو اہمیت دیتا ہے۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ اگر کسی کا پڑوسی بھوکا سوجائے تو اس کے لیے کھانا حرام ہے۔ پڑوسی چاہے کسی بھی مذہب کا ماننے والا کیوں نہ ہو، اس صورت میں اوقاف کے کاموں کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے۔ سبھی غریب اور ضرورت مند افراد فطری طور پر اوقاف سے فائدہ اٹھانے کے حق دار ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت مند لوگوں کی بھلائی کے لیے اوقاف کی بھی ذمہ داری بنتی ہے لہٰذا اوقاف کی آمدنی بڑھانے کی کوششیں اور زیادہ اہم ہوجاتی ہیں۔ دونوں وقف بورڈ وقف ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ غیر سرکاری ادارے ہیں انھیں بھی وہ سبھی اختیارات حاصل ہیں جو دوسرے غیر سرکاری اداروں کو حکومت نے دے رکھے ہیں۔ اس وقت کئی غیر سرکاری ادارے صحت، خاندانی بہبود، تعلیم، غریبی کے خاتمے وغیرہ کے میدان میں کام کررہے ہیں اور ضرورت مندوں کو مستفید کررہے ہیں۔ یہ ادارے سرکاری رقوم، اپنے اسٹاف اور اس کے تجربے کو استعمال میں لاکر سرکاری اسکیموں کو عمل میں لاتے ہیں۔ لہٰذا وقف بورڈ بھی ان ہی اداروں کی طرح بہبودی کے کاموں کو انجام دے سکتے ہیں اوقاف بطور سرکاری ایجنٹ بہبودی پروگرام کو پورا کرسکتے ہیں۔

اس طرح ترقی یافتہ سبھی اوقاف کچھ تعلیمی اداروں کی ذمہ داریاں لے سکتے ہیں اور اپنے فنڈ سے ان کی آمدنی میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

ان مقاصد کے لیے مرکزی حکومت کی امداد سے چلنے والی اسکولوں کے تحت غیر رسمی تعلیمی مراکز اور خواندگی مراکز بھی چلائے جا سکتے ہیں۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے اور وائی ڈبلیو سی اے کی طرز پر ان شہروں میں جہاں ضرورت ہو وہاں روزگار سے متعلق خواتین کے لیے ہاسٹل تعمیر کرائے جا سکتے ہیں اور تجارت و سیاحت کے نقطۂ نظر سے اہم شہروں میں مسافر خانوں کی تعمیر کرائی جا سکتی ہے جہاں غریب لوگ ٹھہر سکیں۔

اوقاف کے ذریعے خود روزگار کے لیے ٹریننگ پروگرام بھی چلائے جا سکتے ہیں۔ اس وقت چل رہی ٹرائیسم ڈواکرا اور نہرو روزگار اسکیم کے تحت ان کاموں کے لیے کافی رقوم مختص ہیں اور غیر سرکاری اداروں کی طرح اوقاف بھی ان اسکیموں کے تحت مالی امداد لے کر بے روزگار لوگوں کو خود روزگار کی تربیت دے سکتے ہیں۔

اوقاف کی موجودہ عمارتوں میں یہ چھوٹے چھوٹے تربیتی مراکز قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مستقبل میں بنائی جانے والی وقف کی دکانوں، مسافر خانوں اور دوسری عمارتوں میں بھی ان مراکز کو قائم کیا جا سکتا ہے۔ اوقاف کے ذریعے سائنس اور کمپیوٹر تعلیم کے پروگرام بھی چلائے جا سکتے ہیں۔

مندرجۂ بالا تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اوقاف کی آمدنی میں اضافہ کر کے، نیز سرکاری امداد کے توسط سے سماج کے تئیں فعال رول ادا کرنے کے لیے اوقاف کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اگر اوقاف اپنی کارکردگی میں بہتری لے آئیں تو کوئی بھی بیوہ یا یتیم بھوکا نہیں سوئے، کوئی بھی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے، کوئی بھی غریب بیمار دوا کی قلت میں لقمۂ اجل نہ بنے اور نہ ہی کوئی ذہین و با صلاحیت طالب علم پیسے کی کمی کی وجہ سے اپنی پڑھائی چھوڑے۔ وسیع پیمانے پر ایک منظم افرادی قوت تیار کی جا سکتی ہے جو ملک کی ترقی میں معاون ہو ــــ بشرطیکہ اوقاف اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھائیں۔ لیکن ہم اس "اگر" کو کب تک ہٹا سکیں گے ــ یہ صرف وقت ہی بتا سکے گا۔

ــــ ترجمہ: خورشید علوی

□□

تحریک آزادی کی ایک اہم نظم ـ صفحہ ۲ کا بقیہ

عورتیں بھی آزادی وطن کی جنگ میں شریک ہو جائیں تو مادر وطن کی آزادی کی راہیں اور بھی استوار ہو جائیں گی اور غلامی سے نجات پانے میں آسانی ہوگی۔ تاریخ ہند اس بات کی شاہد ہے کہ ہندوستانی عورتوں نے شجاعت کے کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جمیل مظہری اپنی بات تاریخ کے اسی حوالے سے کہتے ہیں۔

ہر پتری ہو سروجنی بانی
ہر مانی ہو لکشمی مانی

جمیل مظہری کی یہ نظم مادر وطن ہندوستان سے محبت کرنے والوں، حب الوطنی کا جذبہ رکھنے والوں اور اس مقدس دھرتی کو دل و جان سے چاہنے والوں کو ہر لمحہ تحریک عطا کرتی رہتی ہے۔ نظم "بھارت ماتا" ہندوستان کی تحریک آزادی سے تعلق رکھنے والی ایک انتہائی اہم نظم ہے، جس میں فن کی باریکیاں بھی ہیں، اظہار و اسلوب کی انفرادیت بھی ہے، زبان و بیان کی گل کاریاں بھی ہیں، احساس کی شدت بھی ہے، فکر کی آگ بھی ہے، حوصلوں کی تڑپ بھی ہے اور جذبے کی صداقت بھی ہے۔ یہ نظم تشکیک کے شکار ذہنوں اور گمراہ لوگوں کو صراط مستقیم پر گامزن کرنے کا کام کرتی ہے، وطن دشمن طاقتوں کے حوصلے پست کرتی ہے اور بے حد کامیابی کے ساتھ ہمیں وطن پرستی کی روایات سے ہم آہنگ بھی کرتی ہے۔

جمیل مظہری کی نظم "بھارت ماتا" ہر اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ کا ایک شاہکار ہے۔ اس کا شمار تحریک آزادی سے تعلق رکھنے والی چند اہم نظموں میں ہونا چاہیئے۔ جمیل مظہری نے اپنی اس نظم میں موضوع کو ہر تقاضائے ادوار کے مطابق نہایت سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سلسلے میں ان کی شاعرانہ عظمت اور فن کاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دراصل جمیل مظہری نے اپنی نظم "بھارت ماتا" میں اپنے وطن پرستی کے جذبات و احساسات کو الفاظ کے جگنو عطا کر کے تحریک آزادی کی راہ کو منور اور تابناک بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم ان کا ایک بڑا شعری کارنامہ ہے۔

□□

ڈاکٹر محمد نعمان
صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج ۔ بھوپال

آزادی کے بعد

بھوپال میں اردو ادب کا فروغ

آزادی سے قبل ہندوستان کے وسیع وعریض صوبے مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال کو مالوہ، گونڈوانہ اور بندیل کھنڈ کے بعض علاقوں پر مشتمل ایک اہم مسلم ریاست کی حیثیت حاصل تھی جو کہ مخصوص تہذیبی ماحول نیز اس کے فرمانروایان کی ادبی سرپرستی کے باعث نہ صرف گہوارۂ ادب بن گئی تھی بلکہ وسط ہند میں جنوبی اور شمالی ہند کی مسلم ریاستوں کی تہذیبی نمایندگی بھی کر رہی تھی۔

بھوپال کے تاریخی شواہد اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ گوتم بدھ کے عہد سے قبل یہ علاقہ اونتی کے راجہ پردھوت کی ریاست کا حصّہ تھا اور موریہ عہد میں یہ علاقہ سمراٹ اشوک کے زیر نگیں آگیا تھا۔ موجودہ بھوپال کا قیام عہدِ وسطیٰ میں پرمار خاندان کے راجہ بھوج نے ایک عظیم الشان پشتینہ بنوا کر "بھوج پال" کی صورت میں کیا۔ راجہ بھوج سے لے کر گونڈرانی کملاپتی تک یہ علاقہ ہندو فرمانروا کے زیر حکومت رہا ۱۷۰۹ء میں افغان سردار دوست محمد خاں نے مسلم ریاست قائم کی جس کے تحت تقریباً ڈھائی سو سال تک ۹ نوابین اور چار بیگمات نے کامیاب کے ساتھ حکومت کی اور ادب دوستی کا ثبوت پیش کیا۔

بھوپال کی ادبی خدمات تین صدی کے طویل عرصہ کو محیط ہیں اور یہاں ملنے والے قدیم ادبی نمونے اور تاریخی شواہد اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ بھوپال میں اردو زبان وادب کا آغاز مسلم ریاست کے قیام سے قبل ہی ہو چکا تھا۔

بھوپال کا پہلا شاعر قاضی محمد صالح (مثنوی اخلاق حسنہ [illegible]) کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

حصولِ آزادی (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) یا انضمام ریاست (یکم جون ۱۹۴۹ء) سے قبل بھوپال کی سرکاری زبان اردو تھی اور اس کے کئی فرمانروا معروف ادیب اور صاحب دیوان شاعر تھے جن کی دلچسپی اور کوشش سے بھوپال میں اردو زبان وادب کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد اور خاص طور پر ریاست بھوپال کے ہندیونین میں ضم ہو جانے کے بعد، نہ صرف اردو سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گئی بلکہ اس کے فروغ کی ذمّہ داری ادبی اداروں، انجمنوں اور اردو سے محبت کرنے والے اشخاص کے کاندھوں پر آگئی۔

مذکورہ پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزادی سے قبل اردو زبان وادب کو ترقی کے جو شاندار مواقع میسّر تھے اُن کا سلسلہ آزادی کے بعد اس طرح جاری نہ رہ سکا لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ سرکاری سرپرستی ختم ہو جانے کے بعد بھوپال میں اردو زبان وادب کے ارتقاء کا سلسلہ بالکل ہی منقطع ہو گیا ہو بقول قاضی عبدالغفّار:

> "قوموں کی زبانیں نہ تو حکومتوں کے بنائے بنتی ہیں اور نہ ان کے بگاڑنے سے بگڑتی ہیں"

چنانچہ تبدیل شدہ نئے حالات میں نئے اسباب پیدا ہوئے زبان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی اور کالجوں کا قیام عمل میں آیا جن کے تحت تحقیقی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ادبی انجمنوں اور ان سے منسلک فنکاروں نے زبان وادب کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور بدلتے ہوئے تناظر میں مروجّہ ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ نئی ادبی اصناف

میں طبع آزمائی کر کے بھوپال کے فنکاروں نے اپنی بیدار مغزی نیز ذمہ داری کا ثبوت پیش کیا۔

آزادی کے بعد ملک میں معاشی، معاشرتی انفرادی اور ملکی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ تبدیل شدہ حالات میں جہاں نئے مسائل نے جنم لیا وہیں نئی اصناف اور نئے موضوعات بھی سامنے آئے جن کے ذریعہ فنکاروں نے وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی مقدور بھر کوششیں کیں جو اردو ادب، برطانوی سامراج یا مقامی سلاطین کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اسے اچانک اپنے سماج اور نئے مسائل کے خلاف جوجھنا پڑا۔ ایک جدوجہد کے بعد دوسری جدوجہد شروع ہوگئی۔ نئی نئی راہیں ہموار ہوئیں۔ زندگی کے دھارے کو ایک نئی سمت ملی جس سے ادب میں نئے باب کا اضافہ ہوا جس کے تحت اردو ادب میں ایک جاندار شعری مسلک کا آغاز ہوا۔ صحافت اور افسانوی ادب میں تیز چبھتے ہوئے تیور نمایاں ہوئے۔ نثر میں نئے لہجہ، مزاح میں نئی لطافت اور طنز میں ایک نئی کاٹ کا ظہور ہوا۔ رپورتاژ، خاکہ، نظم جدید اور تنقید جیسی نئی اصناف نے اپنی اہمیت کا سکہ جمایا۔ ادب صلح کل ہوتا ہے تفرقہ پرداز نہیں اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ سخت سے سخت حالات اور آشوب ہلاکت میں بھی ہمارے فنکاروں کا رویہ صحت مندانہ رہا ہے اور انہوں نے ہر قسم کی انتہاپسندی اور دیوانگی کے خلاف متحد ہو کر آواز حق بلند کر کے ادب کو داغدار ہونے سے بچایا ہے۔

آزادی کے بعد بھوپال کا ادب بھی تبدیل شدہ حالات و نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بڑھتی ہوئی آبادی، بے اطمینانی، انتشار صنعتی تہذیب کے زیر اثر صارف سماج کے بڑھتے اثرات نیز سیاسی بدعنوانیوں نے ہماری اعلیٰ قدروں کو نہ صرف پارہ پارہ کر دیا بلکہ زندگی کے تضادات کو اس قدر نمایاں کر دیا ہے کہ اب ہر خیال، ہر پلان اپنا تقدس اور اعتبار کھوتا جا رہا ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھوپال کے فنکاروں نے وہی لکھا جو کہ حالات کا تقاضا تھا مثال کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

میں چاہتا ہوں نظامِ کہن بدل ڈالوں
مگر یہ بات فقط میرے بس کی بات نہیں
اٹھو بڑھو مری دنیا کے عام انسانو
یہ سب کی بات ہے دو چار دس کی بات نہیں

———

جو انسانیت کی زباں بن گئی ہے
وہی داستاں، داستاں بن گئی ہے
——— (تاج بھوپالی)

اک کرن نور کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
بات ہے ان کی مگر صبح ہماری ہوگی
——— (اختر سعید)

اب کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی مجھ کو
زندگی اتنے تضادات سے ٹکرائی ہے
——— (وحید الدین نیاز)

خار و خس جب بھی متحد ہوں گے   پھونک دے گی کوئی شرر دلی
——— (ظفر صہبائی)

خون کے سیلابوں سے گذرے آگ کا دریا پار کیا
تب جاکر اے زندگی تجھ سے جینے کا اقرار کیا
——— (عشرت قادری)

تقسیم وطن کے ہولناک ہنگاموں کے بعد جب سکون میسر ہوا تو لکھنے والے نئی امنگوں کے ساتھ تخلیقی ادب میں مصروف ہوگئے آزادی کے بعد بھوپال میں شعر و ادب کی جو شاندار روایت قائم تھی وہ تبدیلی کے ساتھ آزادی کے بعد بھی ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے آزادی کے بعد جو اصناف یہاں کے فنکاروں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں ان میں ڈراما، ناول، افسانہ، طنز و مزاح، ترجمہ، صحافت، تحقیق و تنقید غزل، نظم، رباعی اور طنزیہ مزاحیہ شاعری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

نثری اصناف

بھوپال میں آزادی کے بعد ڈراما نگاری کی جانب سنجیدگی سے توجہ دینے والوں میں اہم نام ابراہیم یوسف کا ہے وہ گذشتہ نصف صدی سے اس صنف سے وابستہ رہ کر ۱۵۰ ڈرامے قلمبند کر چکے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ ڈراموں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے

ہیں۔ ان کے ڈرامے اعلا انسانی قدروں کے ترجمان ہیں جن میں زندگی اور سماج کے اہم مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے ڈراموں کی فکری سطح بلند ہے جس سے ڈرامہ نگار کی ذہنی بصیرت اور انسانی نفسیات کے تئیں گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابراہیم یوسف کے علاوہ جن ادیبوں نے ڈرامہ نگاری کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے ان میں جلیل انور بھوپالی (ڈراما تاج محل مطبوعہ) جہاں قدر چغتائی (ڈراما سندر چاپی اور دھواں) مرتضیٰ علی شاد (ابھی آدمی زندہ ہے" ایک ہی ناؤ میں، پتھر بولتے ہیں۔) نعیم کوثر (زخم وفا، کاش، تنہائی اور جنازے) نضل تابش (ڈرائیور آدمی اور اکھاڑے کے باہر") رشید انجم (صلیب زندہ ہے" "فرعون اور فاصلوں میں بٹی زندگی") اقبال مجید ("چاندنی کا زہر کتے اور ٹسر پھسنا") علی عباس امید (پروانے کی خاک) کے نام قابل ذکر ہیں۔

بھوپال میں اردو ڈرامے کا رواج بھی عام ہے۔ اس کے تحت قمر جمالی اور محمد خالد عابدی کے دو دو مجموعے اور عظیم الدین کے ریڈیو ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔

بھوپال میں آزادی کے بعد ڈرامہ نگاروں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن یہاں کے سبھی ڈراما نگاروں نے اپنے فن سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

آزادی کے بعد بھوپال میں ناول نگاری کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ یہاں ناول نگاری کا آغاز تحریک آزادی کے زیر اثر ہوا۔ جن فنکاروں نے اس صنف ادب کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ان میں سید محمد یوسف قیصر (ناول ٹھنڈی گولی" القاہرہ اور "صابرہ") حلی کوثر چاند پوری (ناول "اغوا" سب کی بیوی" "ٹوٹے غنچے" "مدا کھو اور کلیاں" "دھنی مون" "شام غزل" "محبت اور سلطنت" "پیاسی جوانی" عشق نہ دیکھے" "اور مسکرائی زندگی" کے علاوہ اور بھی کئی ایسے ناول ہیں جو اب دستیاب نہیں ہیں) ایم عرفان (ناول "ٹکراؤ") قدوس صہبائی (ناول "نئے انسان اور کردڈین") ابراہیم یوسف (آبلے اور منزلیں) آصف شاہمیری (چوٹ پر چوٹ) اور وسیم بانو قدوائی (۱۴ مطبوعہ ناول) کے نام شامل ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بھوپال میں صف اول کا کوئی ناول نگار پیدا نہیں ہوا۔ کوثر چاند پوری مرحوم کے بعد وسیم بانو قدوائی تنہا ایک ایسی ناول نگار ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ ناول تحریر کیے ہیں خاتون ہونے کے ناتے ان کے تمام ناول گھریلو مسائل کے ترجمان ہیں۔ سادہ اسلوب اور اصلاحی نقطۂ نظر کے غلبہ کے باعث ان کے یہاں یکسانیت نمایاں نظر آتی ہے۔

بھوپال میں افسانہ نگاری کا آغاز آزادی سے قبل ہی ہو چکا تھا سید قمر الحسن (داماد نیاز فتحپوری) اور کوثر چاند پوری نے نیاز فتحپوری کی رنگین تحریروں سے متاثر ہو کر افسانے لکھنا شروع کیے۔ سید قمر الحسن کی عمر نے وفا نہ کی لیکن کوثر چاند پوری مرحوم کے ہاں یہ سلسلہ آخری دم تک جاری رہا۔ وہ ۱۹۶۴ء تک بھوپال میں مقیم رہے اور یہاں ابتدائی دور کے کئی افسانہ نگاروں نے ان سے اثر قبول کر کے افسانے تحریر کیے۔

بھوپال میں بیانیہ ترقی پسندانہ اور علامتی ہر قسم کے افسانے لکھے گئے ہیں۔ آزادی سے کچھ پہلے یا بعد جن افسانہ نگاروں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے تحریر کیے ان میں قدوس صہبائی، شاغل فخری، سلطان الارشد، قمر جمالی، ابراہیم یوسف، مقصود عمرانی اختر جمال کے نام اہم ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں میں قدوس صہبائی سلطان الارشد اور اختر جمال نے سنجیدگی کے ساتھ صنف افسانہ کو اختیار کیا اور تعداد و معیار دونوں اعتبار اپنی حیثیت تسلیم کرالی۔

بھوپال میں آزادی کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں کوکب جمیل، انجم سلطانی، زہرہ جمال، آفاق احمد، جاوید محمود، شاہ میر راہی، عیسیٰ صدیقی، اقبال جعفری، اظہر راہی، مظفر حنفی، نعیم کوثر، شفیقہ فرحت اور اطہر صابری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں پانچ افسانہ نگاروں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے بعد آنے والی نسل میں محمد خالد عابدی، نثار راہی، مختار شمیم، رضیہ حامد اور فرحت جہاں (سبھی کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں) نے بھوپال میں افسانے کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ آج بھی ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔

ساتویں دہائی خوابوں کی شکست سے تعبیر ہے جس کے زیر اثر جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ابہام، علامت نگاری، خواب ناکی

خوف ناکی، ذہنی تشنج، نفسیاتی عناصر کی کارفرمائی نمایاں نظر آتی ہے
بھوپال کے جن افسانہ نگاروں کے یہاں یہ نفاست ہے ان میں اقبال مجید، فضل تابش (صرف ایک افسانہ "جٹاؤں کے جنم کے بعد") اقبال مسعود، اسد اور علی متقی دسنوی، منظور احتشام اور قمر احسن (دوران قیام بھوپال لکھے گئے چند افسانے) کے نام شامل ہیں۔ ان میں آخر الذکر نام کو چھوڑ کر سارے ہی فنکار علامتی انداز کے باوجود تشکیک و مایوسی کا شکار نظر آتے ہیں پھر بھی نہ تو ان کے افسانے ترسیل کے المیے کا شکار ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کے یہاں زندگی کے غلیظ تصور کو غلو کی حد تک نمایاں کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں اہم ترین نام اقبال مجید کا ہے وہ یہاں تقریباً ۲۰ سال سے مقیم ہیں لیکن بھوپال آنے سے قبل ہی افسانہ نگار کی حیثیت سے انھیں ملک گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی اور ان کا پہلا مجموعہ۔ "دو بھیگے لوگ" شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔ دوران قیام بھوپال انھوں نے کئی افسانے تحریر کئے جو رسائل میں شائع ہوئے اور ایک مجموعہ، "ایک حلفیہ بیان" بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کا تخلیقی سفر پورے شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ ان کے افسانوں میں عام فرد کی ذہنی پیچیدگیوں شہری زندگی کی ہنگامہ آرائیوں نیز ذہنی تناؤ میں مبتلا موجودہ نسل کی بہت اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص علامت کے ذریعہ نازک سے نازک خیال کو فنی خوبصورتی اور ایک خاص معنویت کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کی کہانیاں علامتی ہوتے ہوئے بھی مبہم نہیں ہوتیں اور پھر مستزاد ان کا دلچسپ انداز بیان جو کہ افسانہ کو بھی دلچسپ اور پر لطف بنا دیتا ہے۔

اقبال مجید کے علاوہ جن افسانہ نگاروں نے شہرت حاصل کی ہے ان میں عیسٰی صدیقی اور نعیم کوثر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ عیسٰی صدیقی نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنا افسانوی سفر شروع کیا تھا لیکن جدید افسانہ نگاری کے اثرات نے انھیں ایک کامیاب جدید افسانہ نگار بنا دیا۔ نعیم کوثر نے ورثے میں ملی افسانوی روایت کو اپنی انفرادیت کے ساتھ آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل کی اور کئی اچھی کہانیاں لکھیں جو معیاری رسائل کی زینت بن گئی ہیں۔

نعیم کوثر کے افسانوں میں عصری آگہی اور جدید حسیّت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ مذکورہ دونوں افسانہ نگاروں کا تخلیقی معیار بلند ہے جن میں فنی لوازم فنکارانہ انداز میں تشکیل پاتے ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں اختر جمال، زہرہ جمال، شفیقہ فرحت، کوثر جہاں اور فرحت جہاں کے افسانوں میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں اور اسی کے ساتھ خوبصورت زبان دردمندی اور انسانیت کی سربلندی بھی شامل ہے۔ آفاق احمد کے افسانے رنگینیٔ بیان سے عبارت ہیں۔ اظہر راہی نے سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر چند افسانے لکھے ہیں۔ خالد عابدی کے یہاں ڈرامائیت اور نثار راہی کے یہاں جنسیت حاوی ہے۔

اقبال مسعود کے افسانے اگرچہ ترقی پسند نظریات کے حامل ہیں۔ لیکن ان کا اسلوب حد درجہ شاعرانہ اور مبہم ہے۔

بھوپال میں اگرچہ اچھے افسانہ نگاروں کی کمی ہے لیکن چند نام ایسے ضرور ہیں جنھیں ہم فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں بھوپال کو طنز و مزاح کے ادبی افق پر ملک گیر شہرت دلانے میں موجد گلابی اردو ملا رموزی کی ادبی خدمات سے بھلا کون واقف نہیں؟ آزادی سے قبل ہندوستان کے ہر رسالے اور ہر اخبار میں شائع ہونے والے اور تیس سے زیادہ کتابوں کے مصنّف ملا رموزی نے طنز و مزاح کی جو عظیم الشان عمارت تعمیر کی تھی۔ آزادی کے بعد اس عمارت کے در و بام کو سجانے نیز طنز و مزاح کی اس شاندار روایت کو آگے بڑھانے میں یوں تو کئی نام شامل ہیں لیکن ان میں دو نام ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر کے بغیر اردو طنز و مزاح کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکے گی۔ میری مراد عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی اور شفیقہ فرحت سے ہے۔

تخلص بھوپالی نے ادبی زندگی کا آغاز اپنے ہی اخبار "بھوپال پنچ" (۱۹۶۰) سے کیا۔ انھوں نے مخصوص حالات اور مخصوص زبان میں لکھے گئے ادبی خاکوں "پاندان والی خالہ"، "منور میاں"، اور "پوسٹ مارٹم رپورٹ"، اور مخصوص اداریوں "شیطان جاگ اٹھا"، کے ذریعہ یہاں کے اہم مسائل، شخصیات اور کردار نیز تہذیب و معاشرت

کے ساتھ بھوپال اردو کو بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

شفیقہ فرحت کے انشائیے اور مزاحیہ مضامین عرصۂ دراز سے ہندوپاک کے ادبی رسائل میں پابندی سے شائع ہو رہے ہیں اور تین مجموعے "گول مال"، "رانگ نمبر" اور "لو آج ہم بھی" شائع ہو چکے ہیں۔ زبان کا دلچسپ استعمال، الفاظ کی الٹ پھیر اور اشعار کی تحریف سے وہ تحریر میں ایسا مزاح پیدا کرتی ہیں جس میں طنز کی کاٹ بھی پنہاں ہوتی ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے ان کے انشائیے قاری کو اپنے سحر میں باندھے رکھتے ہیں۔

آزادی کے بعد بھوپال میں مذکورہ فنکاروں کے علاوہ جوہر قریشی، جہاں قدر چغتائی، قیوم جاوید، فضل جاوید، سید مصطفیٰ تاج، ماسٹر فاروق اور شعرا میں جی ایم نفی اور ساجد سجنی نے اپنی تخلیقات سے اس صنف کو آگے بڑھانے میں اہم رول انجام دیا ہے۔

جوہر قریشی ایک کامیاب کالم نگار تھے۔ انھوں نے مخصوص حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۴۷ء میں بحیثیت صحافی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور یکے بعد دیگرے آزاد، ترجمان، نیا بھوپال، نئی راہ وغیرہ اخبارات جاری کر کے ۱۹۶۲ء تک ان میں پابندی کے ساتھ طنزیہ مزاحیہ کالم تحریر کرتے رہے۔ ان کے موضوعات کا دائرہ مقامی ہونے کے سبب محدود تھا۔ اس لیے باوجود اچھی صلاحیت کے ان کی شہرت بھوپال کے حدود سے باہر نہ جا سکی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کی کالم نگاری نے بھوپال کی اردو صحافت کو ایک نیا مزاج ایک نئی جہت عطا کر دی۔

جہاں قدر چغتائی نے علامہ مدہوش، لالہ غباری اور جہاں قدر چغتائی مختلف ناموں سے مختلف اخبارات میں طنزیہ مزاحیہ کالم تحریر کئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں لطافت و متانت کا امتزاج پایا جاتا ہے اور وہ ہنسنے ہنسانے کے ساتھ ساتھ دعوت غور و فکر بھی دیتی ہیں۔

قیوم جاوید اور فضل جاوید کے انشائیے اور کالم نگاری نے بھوپال کے ادبی حلقوں کو زعفران زار بنائے رکھا ہے۔ مصطفیٰ تاج کے انشائیوں کا مجموعہ "ولہجہ" میں لکھنے میں انھیں خاص مہارت حاصل ہے۔ ماسٹر محمد فاروق کے خاکوں کا مجموعہ "سرنوشت" نے پختہ زبان اور دلچسپ انداز بیان کے باعث ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔

آزادی کے بعد بھوپال کی طنزیہ مزاحیہ شاعری میں ہزلیات بھی لکھی گئی ہیں، مزاحیہ قطعات و منظومات بھی اور ریختی اور پیروڈی بھی!

آزادی کے بعد جی ایم نفی نے منظومات و قطعات (مطبوعہ "آہ سے واہ تک"، "ڈنکے کی چوٹ" اور "بھوپال نامہ") کے ذریعہ آل احمد احقر، نظام احمد قریشی اور مشتاق والد نے ہزلیات کے ذریعہ، ناصر کمال اور سعید اختر نے پیروڈی کے ذریعہ اور ساجد سجنی نے ریختی کے ذریعہ تبدیل شدہ سماجی حالات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ سرزمین بھوپال اگرچہ کسی اکبر الہ آبادی اور دلاور فگار کو پیدا نہیں کر سکی ہے لیکن سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری کا رواج یہاں ابتدا ہی سے ملتا ہے۔

آزادی کے بعد بھوپال میں اردو تحقیق و تنقید نے نمایاں ترقی کی ہے۔ بھوپال میں تحقیقی کام کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمرے میں ان حضرات کا نام شامل ہے جنھوں نے نجی ذوق کی خاطر اس کارزار میں قدم رکھا اور صلہ و ستائش کے بغیر معیاری کام انجام دیے۔ دوسرے زمرے میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے سند کے حصول کی خاطر تحقیقی مقالے سپرد قلم کیے!

اول الذکر زمرے میں شامل محققین میں ایم عرفان (کتاب "مولانا برکت اللہ بھوپالی" اور کئی تحقیقی و تاریخی مضامین) قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی (کتابیں: "ہندوستان اسلام کے سائے میں"، "تاریخ مفتیان و قضاۃ بھوپال"، "تاریخ ریاست بھوپال"، "قطب مالوہ"، "بھوپال تحریک آزادی کے آئینے میں" اور "برکت اللہ بھوپالی") کوثر چاند پوری ("دیدۂ بینا") ابو محمد سحر ("اردو میں قصیدہ نگاری"، "غالبیات کے چند مباحث"، "تنقید و تجزیہ"، "اردو املا اور اس کی اصلاح") عبد القوی دسنوی ("حسرت کی سیاسی زندگی"

غالب اور بھوپال" "تلاش آزاد" "علامہ اقبال بھوپال میں" "نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی" "اقبال اور دلی" "اردو شاعری کی گیارہ آوازیں" "اقبال انیسویں صدی میں" "بچوں کے اقبال" "اقبالیات کی تلاش" "تلاش و تاثر" "معاصرین و متعلقات آزاد" "مولانا ابوالکلام آزاد و مہدی حسن افادی" کے علاوہ اشاریہ سازی کے متعلق "غالبیات" "اقبالیات ہندوستان میں" "انیس نامہ" "نواب رائے دھنپت رائے منشی پریم چند" "مولانا ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی سے متعلق اشاریے) آفاق احمد (غالب کے دو مطبوعہ خطوط) ابراہیم یوسف (اندر سبھا اور اندر سبھائیں" "ہندی ڈرامے کا ارتقاء" "اردو کے اہم ڈرامہ نگار" ۲ جلدیں" "صولت عالمگیری") ڈاکٹر سید حامد حسین" کی تصانیف میں (تحقیق و حاصل تحقیق نثر اور انداز نثر" "اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات" "جدید عربی تحقیقات و تعبیرات" "لفظوں کی انجمن میں" "علامہ سلیمان ندوی کی تحقیقات میں الفاظ اردو) ڈاکٹر عبدالودود (اردو سے ہندی تک" "مضامین عبدالودود") طیبری کی کتاب (تاریخ فرمانروایان بھوپال) ماسٹر اختر (ریاست بھوپال اور اقبال اور اقبال کے کرم فرما) محمد خالد عابدی (مقطعات نساخ اور مضامین خالد) محمد نعمان خاں (بھوپال ادب کے آئینے میں) نسیم شہنوی (مطالعات کامل بہزادی) (تلوک چند محروم ایک مطالعہ) بسین سید (نئی نسل کی نئی غزل) ڈاکٹر اخلاق اثر "اقبال اور شیش محل" "اقبال نامے" "مکاتیب احتشام" "ریڈیو ڈرامے کی تاریخ" "اردو کا پہلا ڈرامہ" "نشریات اور آل انڈیا ریڈیو") مسعود الرحمان خاں (مطالعہ سلیمانی) تمرجالی اور شوکت رموزی (مدھیہ پردیش میں اردو صحافت ابتداء و ارتقاء) تبایہ مجلس اقبال" (۲ جلدیں مرتبہ ممنون حسن خاں دو جلدیں مرتبہ آفاق احمد) اسداللہ خاں (ر. سپاہی بہادر) نصرت بانو روحی (خان شاکر علی خان") سید ظہور الاسلام (موازنہ انیس و دبیر اور ناقدین) وغیرہ اہم تحقیقی و تنقیدی تصانیف ہیں جو آزادی کے بعد بھوپال میں شائع ہوئی ہیں۔

بھوپال میں آزادی کے بعد دوسرے زمرے یعنی حصول سند کے لیے لکھے گئے اہم مقالات میں ڈاکٹر گیان چند جین کا مقالہ "اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ڈاکٹر کلیم احمد رضوی (اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ) ڈاکٹر ابو محمد سحر کا مقالہ "مطالعۂ امیر" ڈاکٹر عبدالودود کا اردو نثر میں ادب لطیف۔ ڈاکٹر حنیف نقوی "شعرائے اردو کے تذکرے" ڈاکٹر یونس حسنی۔ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب" ڈاکٹر اخلاق اثر۔ ریڈیو ڈرامے کا فن" ڈاکٹر مظفر حنفی۔ شاد عارفی شخصیت و فن" ڈاکٹر خلیل احمد مشیر۔ ریختی کا تنقیدی مطالعہ" ڈاکٹر کشور سلطان "جاں نثار اختر۔ حیات اور فن" ڈاکٹر حدیقہ بیگم "عبدالرحمان بجنوری حیات و خدمات" ڈاکٹر صفیہ ودود "مخلص بھوپالی حیات اور ادبی خدمات" ڈاکٹر مختار شمیم "ظہیر دہلوی حیات و خدمات" ڈاکٹر رضیہ حامد کا مقالہ۔ نواب صدیق حسن خاں حیات اور ادبی خدمات" (یہ تمام مقالے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں) آزادی کے بعد بھوپال میں ایم اے سال آخر اور پی ایچ. ڈی کی سند کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالات جو کہ ہنوز غیر مطبوعہ ہیں ان کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ یہاں ان کا ذکر ممکن نہیں ہے۔

دانش گاہوں میں ہونے والے تحقیقی کاموں کو عام طور پر اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا سبھی مقالے معیاری کہہ لائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی تکمیل معروف محققین ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، پروفیسر شیخ فرید، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، پروفیسر ابو محمد سحر کی زیر نگرانی عمل میں آئی ہے۔

اس مختصر جائزے کی روشنی میں آزادی کے بعد بھوپال میں اردو تحقیق کی رفتار کو اطمینان بخش کہا جا سکتا ہے۔

بھوپال میں تحقیق و تنقید کا سفر ساتھ ساتھ جاری ہے۔ اس لیے چند ناموں کے اضافے کے ساتھ تقریباً وہی تمام نام جو تحقیق کے سلسلے میں اوپر لکھے گئے ہیں تنقید کے سلسلے میں بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ اضافہ شدہ ناموں میں صفیہ اختر (انداز نظر) حکیم سید قمر الحسن (نگارشات) محمود الحسینی (شخصیات) اختر سعید خاں (انداز بیاں) شمیم احمد (دو کتابیں) منظر حنفی (نقد رینے جہات و جستجو)

آفاق عیسیٰ صدیقی (رجاں نثار اختر شخص اور شاعر) مہدی جعفر (نئے افسانے) محمد نعمان، اقبال مسعود اور عارف عزیز وغیرہ کے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔

آزادی سے قبل بھوپال میں اردو صحافت نے تعداد و معیار اور خدمات کے اعتبار سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے وہ آزادی کے بعد نہیں دے سکی۔

آزادی کے بعد جاری اہم اخبارات میں "آرٹ اینڈ کلچر" "عرفان"، "منزل"، "شعلۂ حیات"، "بھوپال پنچ"، "بھوپال ٹائمز" "نشان منزل"، "افکار"، "الحمرا"، وغیرہ کا سلسلۂ اشاعت بند ہو چکا ہے۔ البتہ "ندیم"، "آفتاب جدید"، "اردو ایکشن"، "ایاز" اور "حق و انصاف" پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔

آزادی کے بعد بھوپال میں "معیار ادب"، "جادہ"، "کردار" "وزنجیر"، "مزاج"، "مجلہ سیفیہ"، "نوائے سیفیہ"، "آفذ"، "اوصاف حمیدہ"، "تشکیل"، "شناخت" اور "جذب و سلوک" رسائل شائع ہوئے لیکن کوئی بھی رسالہ تادیر جاری نہ رہ سکا۔ اور اب سوائے ایک مذہبی رسالہ "دین مبین" کے دوسرا کوئی رسالہ یہاں سے شائع نہیں ہوتا ہے۔ مذکورہ جائزہ اس بات کا غماز ہے کہ آزادی کے بعد بھوپال میں اردو صحافت زوال پذیر ہے۔

آزادی کے بعد بھوپال میں اردو صحافت سے وابستہ حضرات میں حکیم سید قمر الحسن محوی صدیقی، محمد مسلم، محمود الحسینی، اشتیاق عارف اے آر رشدی، جوہر قریشی، مخلص بھوپالی، قمر جمالی، ایم عرفان، تسا اشفاق، مقصود اصغر، وکیل بھوپالی، مفتی جنید صدیقی، عبدالقوی دسنوی، شرقی خالدی، غضنفر علی خاں، اشفاق مہدی، عیسیٰ صدیقی عارف عزیز، محمد ارتضیٰ، اقبال مسعود، اور خالدہ بلگرامی کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

آزادی کے بعد بھوپال میں بچوں کے ادب سے متعلق صرف تین شعری مجموعے بالک باغ (محوی صدیقی) تتلیوں کے گیت (عبدالمتین نیاز) اور "پھول ایک ہی چمن کے" (کوثر صدیقی) شائع ہوئے ہیں لیکن دیگر نثری اصناف شلا رپورتاژ، سفرنامہ، خطوط نگاری (سوائے صفیہ اختر کے خطوط "زیر لب" اور جاں نثار اختر کے خطوط "خاموش آواز" کے اور کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔) اور سوانح ترجمہ وغیرہ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔

شاعری

بھوپال میں ادب کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے غزل اگرچہ یہاں کی سب سے محبوب اور مقبول صنف سخن ہے لیکن آزادی کے بعد بھوپال میں تمام مروجہ اور نئی شعری اصناف میں طبع آزمائی کی گئی ہے اور یہاں ہر مکتبۂ فکر و خیال نیز رنگ و طرز کے شعراء موجود ہیں بعض خالصتاً روایتی رنگ کے حامل ہیں تو کچھ ترقی پسند نظریات کے پیرو اور کچھ جدید لب و لہجہ کے حامل۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں مذکورہ تینوں دھارے کا امتزاج متوازن انداز میں ملتا ہے۔

اول الذکر زمرے میں شامل شعرائے کرام میں شعری بھوپالی، باسط بھوپالی، منیر بھوپالی، ممتاز رسول یکتا، وکیل بھوپالی، مقصود عرفانی شاہد بھوپالی، ارشد صدیقی، وجدی الحسینی، صدر الدین صدر، اسد بھوپالی، کیف بھوپالی، اختر علی اختر، بختیار ضیاء، واحد پریمی، وفا صدیقی، قیصر محمود، ابو محمد سحر، شجاع فرخی، ظفر نسیمی، کوثر صدیقی، امتیاز انجم، قاسم نیازی، مظفر رئیس، شاہد ساگری، کامل بہزادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے متاثر شعرائے کرام میں مقصود عمرانی، احسن علی خاں، اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں، گوہر جلالی، محمد علی تاج، عرشی بھوپالی، عشرت قادری، وحید پرواز، مرتضیٰ علی شاد، شاہد اختر اور سید حامد جعفری کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں جبکہ جدیدیت سے متاثر شعراء میں شعیب انصاری، فضل تابش، منظر حنفی، بشیر بدر، اختر نظمی ظفر صہبائی، نجیب رامش، اجلال مجید، انصار انظر، نصیر پرواز، رہبر جونپوری، نور محمد یاس، آفتاب عارف، شفق تنویر، یوسف ھما، اختر وامق، اقبال مسعود، نسیم انصاری، خالد محمود اور فاروق انجم کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ بھوپال میں صف اول کا کوئی شاعر پیدا نہیں ہو سکا ہے لیکن ؎ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

کے مصداق یہاں کے بیشتر شعراء نے اپنے فن کے ساتھ انصاف کرنے کی سعی کی ہے۔ غزل ہو یا دیگر شعری اصناف، یہاں کے شعراء نے تازہ ہواؤں کا ساتھ دینے کے لیے اپنے ذہنی دریچوں کو ہمیشہ وا رکھا ہے اور زبان، عروض اور فن کے قاعدوں اور اصولوں کی تشکیل و تعمیر پر توجہ دے کر عصری حسیت نیز سماج کے بسیط پہلوؤں کی عکاسی کا فریضہ بخوبی انجام دیا ہے۔

غزل بھوپال کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے یہاں ایسے شعراء کی تعداد بہت کم ہے جنھیں خالصتاً نظم، رباعی یا نعت کا شاعر کہا جا سکے۔ یہی بات بچوں کی شاعری اور طنزیہ شاعری کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

آزادی کے بعد بھوپال میں مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ نگاری کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے البتہ چند شخصی مرثیے اور قطعات ضرور لکھے گئے ہیں۔

نثری اصناف میں بھوپال کا افسانوی ادب زیادہ وسیع نہیں ہے آزادی کے بعد لکھے گئے ناولوں کی تعداد اور معیار افسانہ نگاری سے بھی کم ہے۔ مذکورہ دونوں اصناف میں سوائے اقبال مجید کے اور کوئی اہم نام نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ڈرامہ نگاری میں بھی صرف ایک نام ابراہیم یوسف کا ایسا ہے جسے ملک گیر شہرت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ طنز و مزاح میں ملا رموزی، تخلص بھوپالی اور شفیقہ فرحت۔ تحقیق و تنقید میں ابو محمد سحر، عبد القوی دسنوی، سید حامد حسین، اخلاق اثر اور شاعری میں شعری بھوپالی، کیف بھوپالی، اسد بھوپالی، تاج بھوپالی، اختر سعید خاں، احسن علی خاں، عشرت قادری، ظفر صہبائی، بشیر بدر، مظفر حنفی اور منظر بھوپالی کے نام ادبی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔

زبان و ادب کی ترقی نیز ترویج و اشاعت میں ادبی تحقیقات، انجمنوں اور اداروں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ بھوپال میں آزادی کے بعد حسبِ ذیل انجمنوں اور اداروں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔

حلقۂ دانشوران، حلقۂ اربابِ ادب، انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین، مرکزِ ادب، بزمِ سخن، کاروانِ سیفیہ، مدھیہ پردیش اردو رائٹرس گلڈ، بزمِ اقبال، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن بھوپال، قلمکار پریشد، محاذِ ادب۔ حمیدیہ کالج، سیفیہ کالج، ایم ایل بی کالج، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز۔

بھوپال کے کتب خانوں میں مولانا آزاد گورنمنٹ سینٹرل لائبریری، حمیدیہ کالج لائبریری، کتب خانہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھارت بھون لائبریری، ایم پی اردو اکادمی لائبریری، اقبال لائبریری، امبیڈکر لائبریری، قادری لائبریری، سپرے سنگرالیہ، مکتبہ عابدیہ کے نام اہم ہیں۔

آزادی کے بعد بھوپال میں شعراء و ادباء کی تصانیف اور شعری مجموعوں کی اشاعت میں خاصہ اضافہ ہوا ہے اگرچہ شعری مجموعوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن نثر کی بعض کتب ایسی بھی ہیں جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ابو محمد سحر اور عبد القوی دسنوی کی تصنیفات پاکستان کے ناشرین نے بھی شائع کی ہیں۔

بھوپال کے کئی مصنفین اور شعراء کی تخلیقات ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں اور انھیں ملک کی مختلف اردو اکاڈمیوں اور اداروں کی جانب سے انعامات و اعزازات بھی ملتے رہے ہیں۔

"آزادی کے بعد بھوپال میں اردو و ادب کا فروغ" کے اس جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بھوپال میں اردو ادب کی روشنی اور رفتار کیا اور کیسی ہے؟

مذکورہ بالا جائزے کی روشنی میں بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ ابتدائی تعلیم کے امکانات معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور نئی نسل اردو سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے لیکن جہاں تک سوال ادب کے فروغ کا ہے اس کے متعلق تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد اردو و ادب نے بھوپال میں خاطر خواہ ترقی کی ہے اور یہاں کے فنکار پوری مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ ادبی خدمات انجام دینے میں منہمک و مصروف رہے ہیں۔

بھوپال میں اردو و ادب کا مستقبل کیسا ہوگا۔ اس کا انحصار آنے والی نسلوں کی اردو سے محبت میں مضمر ہے۔ □□

امن کی آواز

میری آواز صدیوں پُرانی مگر
تم سُنو تو سہی تم سُنو تو سہی
کیوں گریزاں ہے دُنیا گریزاں ہو تم
کچھ کہو تو سہی، کچھ کہو تو سہی

میری آواز میں سوز اور ساز ہے
جس کا کوئی نہ کوئی تو ہمراز ہے
جس کے پردے میں کوئی نہ ناز ہے
جو کہ غم ساز ہے، جو کہ دمساز ہے

ایسی آواز جو ہے پیام سکوں
جس کی چوکھٹ پہ ملتا ہے جام سکوں
جو لُٹاتی ہے سب کو سلام سکوں
جو ہے صبحِ سکوں اور شامِ سکوں

میری آواز ہر دور کا حسن ہے
جو سراپا چمن ہے سراپا چمن
کیوں نہیں سُن رہے ہو اس آواز کو
تم تو انسان ہو پھر یہ کیسا چلن ہے

میں ہوں آدم مجھے تم نہ پہچانو گے
کیونکہ ابلیس تم پر ہے سایہ فگن

ا س زیدی سِکندرپُوری
۵/۴۹۴ سیکٹر ۵ - وکاس نگر
لکھنؤ

غزل

کل تک جو حقیقت تھے ہیں آج وہ افسانے
تصویر ہیں آنکھوں میں یادوں کے نہاں خانے

سینے میں فروزاں ہے اک شعلۂ جوّالہ
اے شمع تری لو پر رقصاں ہیں جو پروانے

ہر نقش ادھورا ہے جاتی ہوئی آنکھوں میں
زنگار کیا شیشہ اندیشۂ فردا نے

اک شغل تھا کاغذ پر لکھ لکھ کے مٹا دینا
ہم آج خود اپنی ہی تحریر نہ پہچانے

مہکا ہی نہیں لب پر اظہار کا پیرایہ
خاموش رکھا برسوں اک عرضِ تمنّا نے

تسکینِ دل و جاں کی خواہش میں ہیں آوارہ
سُونی ہیں گزرگاہیں ویراں ہیں صنم خانے

ہم کان لگائے تھے عشرت جرسِ گل پر
لائی جو صبا خوشبو آواز دی صحرا نے

عشرت قادری
قادری لائبریری
ایم ایل بی کالج روڈ
بھوپال
۴۶۲۰۰۱

چہرے

غموں کی دھوپ میں جب بھی اُتر گئے چہرے
سنگارمیز پہ آکر سنور گئے چہرے

پلک جھپکتے ہی منظر بدل گئے سارے
کہاں سے آئے تھے آکر کدھر گئے چہرے

بچایا لاکھ مگر دل پہ اختیار ہی کیا
نظر کی راہ سے دل میں اُتر گئے چہرے

کھڑا رہا میں لیے کاسۂ شناسائی
انا کی اوڑھے ردائیں گزر گئے چہرے

اندھیرا اوڑھ چکا شہرِ آرزو عزمی
مثال جن کی تھی شمس و قمر گئے چہرے

خان عزمی رُدولوی
ارشاد منزل
رُدولوی بارہ بنکی
۲۲۵۴۱۱

افسانہ

حسن الحق

ھو بہو

صبح ابھی پوری طرح جاگی نہیں تھی۔

شمن نے اپنی بوجھل پلکیں ذرا سی کھولیں، پھر لگا آپ ہی آپ مُند گئیں، باہر سارے میں دُھند چھائی ہوئی تھی۔ لان، اس پر سویا سبزہ، سبزے پر شبنم کی چادر، باہر کچھ دُور پر شیتل ریستوران سے اُٹھتا مٹ میلا گاڑھا دُھواں، جو ہوا کی سُست روی کے سبب بہت دُور نہیں جا پا رہا تھا اور جم میں پھیل رہا تھا۔ اس نے ذرا پرے، سڑک میں سہانی سڑک پر گرد و نواح سے تازہ سبزی لے کر شہر آنے والے دیہاتیوں کا قافلہ، گرد دوارے سے شبد کیرتن کرنے والوں کی سوئی سوئی آوازیں، گنگا اشنان کر کے منتر پڑھتے ہوئے آنے والے اور گنگا اشنان کے لیے جانے والے پجاریوں کی بھیڑ .....

شمن نے اپنی بوجھل پلکیں ذرا ذرا سی کھولیں

صبح ابھی پوری طرح جاگی نہیں تھی، شمن بھی گویا جاگ کر سو رہا تھا اور سو کر جاگ رہا تھا، وہ ابھی تک رات کے خواب کے حصار میں تھا اسے لگا جیسے رگ و پے میں قطرہ قطرہ شراب اُتر رہی ہو، روم روم میں نشے کا احساس ..... وہ .... شیتل .... شیتل اس پر کیسی جھکی ہوئی تھی! اُسے تو ایسے لگا جیسے وہ کسی پرستان میں پہونچ گیا ہو، چاروں جانب مدھم خوش گوار روشنیوں کی چھوٹ، جیسے شادی میں رنگ برنگے برقی قمقمے لگا دیے جاتے ہیں، ہلکی ہلکی شہنائی کی دُھن موسم ابر آلود مگر پانی نہیں برس رہا تھا، بس جیسے کوئی ہیج ہیج، بہت دُور جھرنے کا ذکر رہا ہو، ہوا پانی کے بہت نرم اور باریک جھونکوں کو اس تک لاتی تو لگتا سارے میں اوس برس رہی ہے، اس نے فضا کو سونگھا بھی تھا، بھینی بھینی سوندھی مٹی کی خوشبو ــــــ

ہوا نے کُریدا،
کہ تم کون ہو؟
تو میں
مُسکرا کر
اُس سے چُپ رہا
میں کہتا بھی کیا
کہ وجہِ انبساط بزم مے
تو میں تھا
مگر بزم والے
مجھے جانتے تک نہیں تھے۔

پھر دُور سے جیسے فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دی ــــ کوئی ننھی منی گڑیا، پری جیسی چھب والی، میری سمت بڑھ رہی تھی، میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ جیسے جیسے قدم اُٹھاتی، ویسے ویسے ایک ایک کر کے ساری کلیاں کھلتی جاتیں،

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

وہ ننھی منی پری جیسی چھب والی گڑیا، لگا رات بھر رتجگا جگائے رکھتی، نندا سی بوجھل آنکھیں، کھوئی کھوئی، جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ پھر شمن نے خود کو ایک کنج کے قریب دیکھا جس میں پرندے چہچہا رہے تھے اور بلبل بار بار اپنے آشیانے سے یوں سر نکال کر باہر جھانکتی جیسے اس کا استقبال کرنے کے انتظار میں ہو، پھر ایک ایک کر کے سارے قمقمے بجھنے لگے، کہیں دور، شاید زمان و مکان کے پرے، چھن چھن کر آتی آدھی سچی آدھی جھوٹی کرن اس کنج میں لپ جھپ کرنے لگی ....

سشیل اس پر کیسی جھکی ہوئی تھی !

ثمن نے اپنی بوجھل بوجھل پلکیں ذرا سی پھر کھولیں ـــــ

خواب کی سرحد یہاں ختم ہوئی، صبح کی کسلمندی اب کچھ دُور ہوگئی تھی۔ ثمن کا رنگ روپ اب تقریباً بیدار ہوچکا تھا، مگر بستر پر سے اُٹھا نہیں تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تب تو سردیوں میں ایسی کیفیت آدھے آدھے دن تک رہتی تھی۔ ماں جی بگڑتیں ـــ

"باؤلے، اُٹھ! دن چڑھ آیا، روٹی ٹھنڈی ہورہی ہے"

مگر ماں جی کی باتوں کا اثر کون لیتا ہے۔ البتہ پتا جی ذرا چالاکی سے کام لیتے۔ آہستہ سے پوچھتے ـــ

"ثمن! کالج نہیں جانا ہے؟ دس بج رہے ہیں۔!"

اور وہ لحاف پھینک کر کھڑا ہوجاتا۔ مگر کالج پہونچ کر بھی اسکت کہاں دُور ہوتی۔ دیوار سے لگی بنچ پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتا اور حاضری کے بعد دیوار سے سر ٹیک کر آہستہ سے آنکھیں بند کرلیتا۔ اب اتنی بھیڑ میں پروفیسر صاحب یہ کہاں دیکھ پاتے کہ کون سو رہا ہے، کون جاگ رہا ہے۔ وہ تو اس کا دوست سبھاش اگروال اسے ٹہوکے دیتا۔

"اَبے او مَدَکچی! اُٹھ۔ سر چلے گئے!"

ثمن نے بستر چھوڑا، صبح کے پہلے پہر کے ملگجے نے بستر سمیٹا، دھوپ نے بستر کھولا۔

کالج کے بعد زندگی میں، ماہی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ نوکری کی تلاش، بے روزگاری پر گفتگو اور بحثوں میں جھلاہٹ، پانے کی خواہش، نہ پانے کا غصہ، یافت اور نایافت کا سلسلہ تو کالج کے زمانے ہی سے شروع ہوچکا تھا، ننھی مُنّی پری جیسی چھب والی گڑیا کس پل میں اس کے اندر اتری، یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں مگر زندگی میں کچھ پانے کی ایک شدید خواہش نے پہلی مرتبہ سر اُٹھایا، وہ مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھتا رہا۔ آئی۔ اے۔ ایس سے نیچے وہ سوچ ہی نہیں پاتا۔ ننھی مُنّی پری جیسی چھب والی گڑیا، خیرخواہوں نے آئی۔ اے۔ ایس ایکسل کی دوسری نوکریوں کے بارے میں بتایا، بھابی نے ایک مرتبہ جھلا کر کہا تھا ـــ

"اب اس دُنیا میں سشیل کے جیسی تو کوئی لڑکی ہی نہیں گویا"!

مگر آئی۔ اے۔ ایس کی بات ہی اور تھی۔ ننھی مُنّی پری جیسی چھب والی گڑیا، سچا موتی، مغل بادشاہوں کے تاج میں لگا ہیرا، پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ہشت پہل ہے یا ہشتاد پہل۔ ننھی منّی پری جیسی چھب والی گڑیا کے خواب کتنوں نے دیکھے، اس کا بہت واضح طور پر تو پتہ ہی نہیں مگر اتنا معلوم تھا کہ ـــــ

ایک حویلی
ایک تھی رانی
اس رانی کے
سَو عاشق تھے۔

پھر وقت کے ہاتھ سے وقت کا دامن چھوٹنے لگا، صبح کا ذب کا دُھندلکا، جھٹ پٹا ـــ ایک مرتبہ کچھ نمبروں سے written میں رہ گیا، دوسری مرتبہ written میں آیا تو viva میں کامیاب نہ ہوسکا۔ تیسری مرتبہ وائوا سے دو دن پہلے سخت بیمار پڑ گیا، معاملہ بینک کی نوکری پر آکر رُکا۔ پری جیسی چھب والی گڑیا پہلے تو ملتفت ہی نہ ہوتی تھی، پھر ملتفت ہونے کے دن آئے تو کالج سے بچھڑنے کے دن بھی پاس کھڑے دکھائی دیے ـــــ

رمتا جوگی
اِنشا جیا
ایک تھا پاگل
اس کوچے کا
سَو سَو بہانے
اس کی گلی میں
آنا جانا یاد آیا۔

مگر حاصل؟ ـــ "بینک میں پیسہ بہت ملتا ہے"۔ ایک بزرگ سمجھانے لگے ـــ "وہائٹ کالرڈ سروس ہے"

"یہ تصویر دیکھو۔ کیا شیل سے کم ہے۔؟" بھابی نے کہا۔

ایک سیدھا سادا سی ڈی او، یا ڈی ایس پی سرکاری لال بتی میں نظر آجاتا تو وہ اپنی نگاہ میں خود اپنے آپ کو چھوٹا دکھائی دینے لگتا۔ اندر اندر کچھ کٹ کٹ کر گرنے لگتا۔ گھر بھی بنا۔ گاڑی، فریج، ٹی وی،
(باقی صفحہ ۴۸ پر)

غزلیں

ہر اک محاذ پہ ناکام لکھ دیا جائے
بیاضِ غم میں مرا نام لکھ دیا جائے

مرے خامۂ افکار سے نوائے سروش
زوالِ شعر کو الہام لکھ دیا جائے

ابھی خیال مسرت سے شاخِ جاں ہے ہری
ہے غم کی فصل ابھی خام لکھ دیا جائے

جبینِ سنگ سے ابھرے بہار کا موسم
کہیں پہ پھول کہیں جام لکھ دیا جائے

علاجِ غم نہیں ممکن تو کیا ہوا ناظرؔ
ہمیں کو نسخۂ آلام لکھ دیا جائے

ناظرؔ صدیقی

غم اپنا چھپایا ہے مجبور ہو کر
بہت دل جلایا ہے مجبور ہو کر

ملا جب نہ اشکوں کو دامن کسی کا
لہو خود بہایا ہے مجبور ہو کر

خوشی مل نہ پائی تو ہم نے غموں کو
گلے سے لگایا ہے مجبور ہو کر

گلہ ہے کسی کا نہ شکوہ کسی سے
جو گزرا بھلایا ہے مجبور ہو کر

بڑی عمر کی جو ملی تھیں دعائیں
اسے اب اٹھایا ہے مجبور ہو کر

اداسی بڑھی ہے بہت جب ثریاؔ
انھیں کو بلایا ہے مجبور ہو کر

ثریاؔ خان
ایم آئی جی ۹۶، سیکٹر ای
علی گنج ایکسٹینشن
لکھنؤ

ہمت نئی عطا کی، نیا حوصلہ دیا
وہ ہمسفر ہوئے تو مرا غم بھلا دیا

تم نے کہا تھا سر کے لیے سر کٹا دیا
وعدہ جو ہم نے تم سے کیا تھا نبھا دیا

دلچسپ کس قدر تھی مری داستانِ غم
لیکن اسے بھی تم نے ہنسی میں اڑا دیا

تاریخ ہے گواہ! ضرورت پڑی جہاں،
ہم نے وطن کے واسطے سر بھی کٹا دیا

کس درجہ سادہ لوح تھے ہم کچھ نہ پوچھیے
تم آ گئے تو شہر کو مقتل بنا دیا

ان حادثوں کا دل سے ادا کیجیے شکریہ
جن حادثوں نے آپ کو اسلمؔ جگا دیا

اسلمؔ بھانوی
اسلام گنج۔ قصبہ بھانی
ضلع ہردوئی

کم روشنی ہے اور سویرے کی آس ہے
کیا اضطراب ہے کہ شبِ غم اداس ہے

کہتی ہے یہ بہارِ گلستاں یقین سے
پھولوں کی انجمن میں تمھاری ہی باس ہے

جذبِ وفا کا حسن کوئی دیکھتا نہیں
سب دیکھتے ہیں جسم پہ کیسا لباس ہے

کیف و نشاط کی کوئی حاجت نہیں رہی
جب سے ترا خیال مرے آس پاس ہے

کردار کی بلندیاں دیکھا کیے سدا
راحتؔ یہ زندگی کا مری اقتباس ہے

راحتؔ حسین کاظمی
۱۸ - جوہری محلہ، لکھنؤ

یاد اُن کی ہے زندگی میری
ان کی الفت ہے بندگی میری

کون افضل ہے تو بتا زاہد
بندگی یا کہ مے کشی میری

ایک اُن کے نہ ہونے سے یارو
ڈھل گئی غم میں ہر خوشی میری

بات دل کی نہ کہہ سکا اُن سے
اللہ اللہ رے بے بسی میری

وہ خفا ہیں تو یہ سمجھ لو عقیلؔ
مجھ سے بدظن ہے زندگی میری

زرینہ عقیل
جانکی پورم،
کرسی روڈ،
لکھنؤ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "کھویا ہوا سا کچھ" (شعری مجموعہ)
شاعر: ندا فاضلی   قیمت: ۱۰۰/- روپیے
ملنے کا پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

مہاراشٹر اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع شدہ یہ دیدہ زیب شعری مجموعہ ندا فاضلی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں، غزلیں دوہے اور گیت وغیرہ شامل ہیں۔ ندا کے اس کلام کو پڑھ کر ایک بار پھر ایسا لگتا ہے کہ وہ تجرد یعنی مروجہ شعری ملائق سے انحراف اور تہی دستی کی شاعری نہیں بلکہ تجدید پسندیت یا بہ الفاظ دیگر تازہ کاری کی شاعری کی ایک اور دلچسپ کوشش ہے کیوں کہ ان کی شاعری بار بار یہ احساس دلاتی ہے کہ انہیں تجریدے سے کم اور تجدید سے شغف زیادہ ہے ایک جگہ وہ شکایت کرتے ہیں ؎

آنکھوں دیکھی کہنے والے پہلے بھی کم کم ہی تھے
اب تو سب ہی لکھی لکھائی باتوں کو دہراتے ہیں

آپ جب اس مجموعۂ کلام کو پڑھ کر ختم کریں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ ندا کی شاعری کو سرمستی اور سرشاری سے زیادہ آگہی سے، استعجاب سے زیادہ فطری معصومیت سے، غنائیت سے زیادہ "آئرنی" سے، کاریگری سے زیادہ بے ساختگی سے، آسمانی سے زیادہ زمینی سے اور خدائی سے زیادہ بندگی سے سروکار رہتا ہے۔ نہ تو وہ جام و پیمانہ کے شاعر ہیں اور نہ خاصانِ مے خانہ کے۔ وہ بناوٹ اور نقلی پن کو خواہ وہ زبان کے حوالے سے ہو یا افکار و خیالات کے حوالے سے، "ٹاٹ باہر" رکھنا پسند کرتے ہیں ؎

شاعری سے نہ جی اُچٹ جائے
دیکھ آسانہ بن سنوکر دُنیا

ندا فاضلی کی شاعری میں پہیلی داری نہیں ہے وہ اپنے قاری کو عمیق لمحات کم اور خلیق لمحات زیادہ فراہم کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اور ن۔م۔ راشد کی طرح اپنے قاری کو حسن کوزہ گر کے پاس نہیں لے جاتے۔ وہ نہ تو ماں کو اس کی لوریوں سے پہچانتے ہیں اور نہ اس کے گرم جسم کے شفقت آمیز لمس سے، نہ اس کی دعاؤں سے نہ ایثار و قربانیوں سے یاد کرتے ہیں بلکہ بیسن کی سوندھی روٹی پر رکھی چٹنی سے، چوکا باسن اور چمٹا پھکنی سے، گرمی کی تھکی ہوئی دوپہری سے، گھر کی کنڈی کی آواز سے اور رسی پر چلنے والی نٹنی جیسی خارجی اور چھوٹی چھوٹی اشیاء سے پہچانتے ہیں۔ وہ اپنی شعری مہارت کو اپنے آس پاس کی تلخ و تند زندگی سے پنجہ کشی کے لیے بروئے کار لاتے ہیں ؎

وہ صوفی کا قول ہو یا ہو پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

شہریار اور ندا دونوں کی شاعری 'کہیں کچھ کم ہے' اور 'کھویا ہوا سا کچھ' کے احساس کو کہیں کہیں دہراتے ہوئے ملتی ہے۔ ندا اپنی شاعری میں دو پل اسے یاد کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور پھر دوسری چیزیں انھیں بھی شہریار کی طرح متوجہ کر لیتی ہیں۔ وہ اپنے اس مجموعے میں بھی بس اپنی ہی بولی میں مست ہیں انھیں اس کی پروا نہیں کہ محمد علوی کی گانٹھ میں کیا ہے، افتخار عارف کے پاس کیا مال ہے اور ذی شان ساحل کون سے سکے جمع کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اپنے اگلے مجموعے میں وہ اس بے نیازی سے باہر نکلیں! انھیں خود خیال ہے ؎

عمر کرنے کو ہے پچاس کو پار
کون ہے کس جگہ پتہ رکھنا

ہمیشہ کی طرح ندا فاضلی کا یہ مجموعہ بھی اپنے پچھلے شاعرانہ محاسن کے ساتھ منظرِ عام پر ہے ان سے پوری توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی شعری صلاحیتوں کے سبب تازہ بہ تازہ شعری امکانات کی راہیں ہموار کرتے رہیں گے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ کتابت دلکش اور کاغذ اچھا ہے پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور انجام میں شاعرانہ انبساط حاصل ہوتا ہے

جس سے ندا کا قاری پہلے ہی سے مانوس ہے۔

—— اقبال مجید

نام کتاب: "گاندھی جی کے افکار"
مؤلف: پریم گوپال متل   قیمت: سو روپئے
ملنے کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نمبر ۹ گولا مارکیٹ
دریا گنج - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

جیسا کہ اس کتاب کے نام "گاندھی جی کے افکار" سے ظاہر ہے مصنف نے گاندھی جی کے منتخب مضامین، ان کی یادداشتیں، ان کے انٹرویو اور اقوالِ زریں اسی لیے یکجا کیے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس عظیم عالمی شخصیت کو پہچانیں اور ان کے عمل کو اپنی زندگی میں اتاریں نیز ان کے افکار سے روشنی حاصل کریں۔

مصنف نے گاندھی جی کے افکار کو جس خوبی اور سلیقہ کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا ہے اس سے گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے کہ قوم کا معمار گاندھی جیسا عظیم انسان ہی ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کو پیش کرنے میں مصنف کے سامنے یہ نصب العین ضرور رہا ہوگا کہ بابائے قوم کی حیات اور ان کے کارناموں سے عوام کو بھرپور طریقے سے روشناس کرایا جا سکے تاکہ آنے والی نسلیں ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر ملک و قوم کی خدمت بھی کر سکیں اور اپنی زندگی کو بھی کامیاب بنا سکیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ مؤلف مارٹن لوتھر کنگ کے اس خیال سے متفق ہیں کہ:

"اگر انسانیت کو ترقی کرنی ہے تو گاندھی جی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ..... ہم صرف اپنا نقصان کر کے ہی انھیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

اس کتاب کی کتابت اور طباعت بہت خوب ہے لیکن قیمت کتاب کی عوامی اہمیت کو دیکھتے ہوئے زیادہ ہے۔

—— ناہید فرزانہ

نام کتاب: "اُردو مُراسلاتی انٹرویو"
مصنف: خالد عابدی   قیمت: ۷۵/- روپئے
ملنے کے پتے: (۱) دانش محل - امین آباد، لکھنؤ
(۲) بھوپال بک ہاؤس - بدھوارہ، بھوپال

ــــ رحیمہ پرنٹنگ ــــ

"اُردو مُراسلاتی انٹرویو" ملک کے ممتاز اور معتبر ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، دانش وروں اور چند فلمی ہستیوں کے ساتھ تحریری گفتگو اور مکالمات کا مجموعہ ہے۔ ان اکابرین میں اختر الایمان، علی سردار جعفری ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، علامہ جمیل مظہری، کوثر چاندپوری، وامق جونپوری، علی جواد زیدی، خمار بارہ بنکوی، وجاہت علی سندیلوی، واہی نقوی، ڈاکٹر صفدر آہ جیسے منفرد اور باکمال شاعر، ادیب افسانہ نگار اور مزاح نگار شامل ہیں۔

یہ مراسلاتی انٹرویوز ادبی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ جہاں ایک طرف ہم ان ممتاز اور بلند قامت ادبی شخصیتوں کی زندگی کے کوائف اور ان کے ادبی رجحانات سے واقف ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف ان فن کاروں کے نظریات اور تاثرات سے بھی ہم کو کما حقہ، آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ انٹرویو چونکہ تحریری طور پر لیے گئے ہیں اس لیے ان کے معتبر ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ فن کار نے بہت اطمینان کے ساتھ بذاتِ خود اپنی حیات، تخلیقات اور نظریات کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

اس کتاب کی اصل خوبی اس کا تنوع ہے کیوں کہ ادب، شاعری، افسانہ، ڈرامہ، تنقید، فلم، ہر میدان کے قابلِ ذکر فن کاروں کے انٹرویوز اس میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ خالد عابدی نے ایسے سوالات قائم کیے ہیں جن سے ان فنکاروں کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں بہت سے پوشیدہ پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائیں نہیں کہ یہ قابلِ قدر تصنیف ایک مستند اور معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

—— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: "کشتِ زعفران" (شعری مجموعہ)
شاعر: شاداں بدایونی قیمت: ۱۵۰ روپئے
ملنے کا پتہ: مینیجر "قوم کی آواز" چاہ میرا سٹریٹ
بدایوں (یوپی)

"کشتِ زعفران" شاداں بدایونی کے طنزیہ اور مزاحیہ قطعات کا مجموعہ ہے دوسو چھیاسٹھ صفحات کے اس مجموعے میں شروع کے ۳۲ صفحات پر شاعر کے فن اور شخصیت سے متعلق مضامین ہیں اور آخری دو صفحات پر دو نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر تین سو سے زیادہ قطعات ہیں۔ بہترین کاغذ، اچھی کتابت، چار رنگوں میں خوبصورت گرد پوش، گرد پوش کے درمیان سیاہ چشمے کے ساتھ شاعر کی تصویر۔ رنگوں میں سرخ نیلا، پیلا، سبز اور سفید رنگ استعمال ہوا ہے۔ شاعر کے ذہن اور افکار کو سمجھنے کے لیے ان رنگوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ رنگ انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

"کشتِ زعفران" طنز و مزاح کا مجموعہ ضرور ہے لیکن ہر قطعہ شاعر کا کرب، تخلیقی قوت اور عہد حاضر کے مسائل سے باخبری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، جسے زبان و بیان کی خوبیوں نے اور موثر بنا دیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ادب کے قاری "کشتِ زعفران" کو پڑھ کر شاعر کے اندازِ بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

——— خورشید افسر بسوانی

نام کتاب: "مرموز" (شعری مجموعہ)
شاعرہ: آشا پربھات قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: آشا پربھات۔ کوٹ بازار۔ وارڈ نمبر ۱۶
سیتا مڑھی۔ ۸۴۳۳۰۲

زیر تبصرہ شعری مجموعہ "مرموز" ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شعری تخلیقات اس حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے چھوٹے چھوٹے حادثات اور واقعات جن سے وہ متاثر ہوئی ہیں، آشا پربھات نے انھیں نظم یا غزل کا جامہ عطا کر دیا ہے۔ ان کا لہجہ دھیما اور پُرتاثیر ہے۔ کہیں کہیں طنزیہ انداز نے ان کے اشعار میں زندگی پیدا کر دی ہے:

پھونک ڈالیں یہ بستیاں کس نے
وہ اگر امن کا پیمبر تھا

مجموعے میں شامل نظمیں اور غزلیں آشا پربھات کی روح کی تڑپ اضطراری کیفیات، تجربوں، مشاہدوں، طبیعت اور مزاجی کیفیات کی آئینہ دار ہیں، وہ اپنے جذبات اور احساسات کو خوبصورت انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں، ان کے اندر جو داخلی کرب ہے اس نے ان کے الفاظ کی تہ میں چھپے ہوئے مفاہیم کے حسن کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ آشا پربھات زندگی میں قنوطیت کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ جہاں سے ان کی داستانِ حیات حادثہ بنتی ہے وہیں سے ان کے اندازِ بیان میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ رجائیت ان کی شعری تخلیقات میں جگہ جگہ موجود ہے۔

نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ نظم ختم ہوتے ہوتے قاری کے ذہن پر ایک دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ غزلوں کا وصف یہ ہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار نہیں ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی قاری کی سوچ کو متاثر کرتی ہیں۔ آشا پربھات بیک وقت ایک اچھی غزل گو بھی ہیں اور ایک اچھی نظم نگار بھی۔ کتابت، طباعت، کاغذ اور گیٹ اپ عمدہ ہے۔

——— بشیر فاروقی

نام کتاب: "لذتِ احساس" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر پیکر جعفری قیمت: نوّے روپئے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ
دبستانِ لوح و قلم۔ نخاس، لکھنؤ

"لذتِ احساس" ڈاکٹر پیکر جعفری کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی اور جدید رنگ کی آمیزش کے ساتھ ہی زخمِ دل اور غمِ دوراں کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی نیرنگیوں اور اس کی گوناگوں تلخ و شیریں صداقتوں کا احساس ملتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر کارل کے حوالے سے زندگی کو بحرِ بیکراں تصور کرتے ہوئے اپنے پیش لفظ میں انھوں نے اس کی گہرائیوں کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر پیکر جعفری کے یہاں سیاہ رات کا عذاب بھی ملتا ہے تو ایک نئی سحر کے آنے کا انتظار بھی ۔ موجودہ دور میں جس طرح صالح قدریں پامال ہو رہی ہیں اور پورا سماجی نظام جس طرح کرپٹ ہو گیا ہے اس پر انھوں نے طنز بھی کیا ہے اور خوابیدہ ذہنوں کو جگانے کی کوشش بھی ۔ پیکر صاحب کے کلام میں قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ شگفتگی اظہار خیال کا نیا انداز اور تغزل کے خوبصورت پیکر بھی نظر آتے ہیں' شعر ملاحظہ ہو ؎

یوں بھی نباہ ہم نے کیا زندگی کے ساتھ
اک اجنبی ہو جیسے کسی اجنبی کے ساتھ

——— ڈاکٹر علی باقر زیدی

نام کتاب : " خوشبو نظر آئے " (شعری مجموعہ)
شاعر : فاروق انجم قیمت : ۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ : شاہد پبلی کیشنز ، ۱۱ ۔ فاروق کیمپ ۔ سرسید روڈ
بھوپال (ایم پی)

فاروق انجم کا شعری مجموعہ " خوشبو نظر آئے " میرے سامنے ہے اس شعری مجموعے میں بہت سی آرا شامل ہیں لیکن عشرت قادری صاحب کی رائے " نئے وجود کی کونپل " پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ شاعر کا پورا وجود سامنے ہے ۔ دوسری چیز جو ان کے یہاں نظر آئی وہ ہے روایت کی پاسداری' اور میرے خیال سے کسی بھی اچھے شاعر کے لیے روایات سے وابستگی ضروری ہے ۔ انجم نے اس بات کو محسوس کر لیا اور حال کی روشنی میں ماضی کو یاد رکھتے ہوئے مستقبل کی تلاش شروع کی ۔ یہ بڑی خوش آیند بات ہے ؎

ترے خیال کے چمکیلے ماہتابوں سے
روایتوں کا شکستہ مکان روشن ہے

مجھے یقین ہے کہ اگر انجم صاحب نے یہ سفر یونہی جاری رکھا تو شاعری کے افق کو ضرور روشن کریں گے ، لیکن مشقِ سخن کی ضرورت ہے ؎

انجم بدل سکے تو بدل دے سماج کو
تحریکِ انقلاب تری دسترس میں ہے

——— فاطمہ وصیہ جائسی

ھُو بہُو

صفحہ ۴۳ کا بقیہ

سب آگیا ، مگر وہ درد تو زندگی بھر کاٹتا رہا ، دو مرتبہ آئی اے ایس پاس کر جانے والا " ———

سُورج اپنی پوری طاقت کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا ۔

ننھی مُنّی پری جیسی چھب والی گڑیا کو کوئی ڈاکٹر بیاہ لے گیا ، بھابی نے شرط لگائی ———

" آنے والی شیل جیسی ہی ہے " ۔

شیل ڈاکٹر کی بیوی بن چکی تھی ، وہ کہاں سے ملتی ؟ اس کے جیسی ملی ۔ شادی کی رات سُمن نے دُولہن کا گھونگھٹ اٹھایا تو پری جیسی چھب والی گڑیا یاد آئی ۔ سُمن کی بیوی نے جب جب اسے پیار کیا تب تب اسے شیل یاد آئی ۔ ڈبل پروموشن بھی ملے اور ہر پروموشن پر خیال آیا ، اگر وہ آئی اے ایس کمپیٹ کر گیا ہوتا ..... "

سُمن نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے گھڑی دیکھی ۔ ساڑھے نو بج چکے تھے ۔

اُسے جلد ہی تیار ہو کر آفس کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے ۔ سُمن نے سوچا ۔

منیجر چھٹی پر تھا officiating duty سُمن کمار سنگھ کو سونپی گئی تھی ۔ !!

□□

ہندی کے ممتاز ادیب ، شاعر اور ہفت روزہ " دھرم یگ " کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کا ۴ ستمبر ۱۹۹۷ء کو علی الصباح بمبئی میں انتقال ہو گیا ' وہ ۷۲ سال کے تھے ۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے ہندی ادب کو مالا مال کیا ۔ ان کی تخلیقات میں سورج کا ساتواں گھوڑا ' اور " گنا ہوں کا دیوتا " کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا ۔ دنیائے ادب میں ان کی کمی عرصے تک محسوس کی جائیگی ۔
ایڈیٹر

جلد (۵۲) نمبر (۸)

عنوانات

اپنی بات

دیوالی کی روشنیوں کی جگمگاہٹ ابھی بھی فضا میں موجود ہے۔ البتہ دسہرے کے قدموں کی آہٹ اب دور چلی گئی ہے۔ دونوں تہوار اکتوبر میں پڑے تھے۔ پہلا سچائی کی فتح کا تہوار تھا اور دوسرا خوش حالی کا ـــــ یہ دونوں تہوار دیگر تہواروں کی طرح ہماری تہذیبی زندگی کا جز ہیں۔ ان کی اہمیت کے بہت سے اسباب ہیں۔ ان میں مذہبی اساطیر کی جلوہ گری تو ہے ہی، ساتھ ہی یہ دونوں تہوار ایک مخصوص شاعرانہ کیفیت کے بھی حامل ہیں۔ ان میں برسات آنے والی سردی سے گلے مل کر آنسو بہاتی ہوئی رخصت ہوتی ہے اور اس طرح موسم کے تغیرات کا آغاز دسہرہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

دوسرا لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ یہ زمانہ روشنی کی تلاش میں عاشقوں کے ہجوم کا ہے۔ شعراء کی زبان میں پروانے ــ ہم لوگوں کی زبان میں پتنگے ـــ والہانہ انداز میں دیوانگی کے ساتھ روشنی پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور اس طرح روشن تہذیب میں، روشنی کی مزید تلاش کا تصور ہماری تہذیب اور ہماری تمدنی تاریخ کو سنہرا رنگ بخشتا ہے، اس کا ایک رخ اور ہے! ـــ دوسری زبانوں کے ادب میں فطرت کی منظرکشی جامد ہے لیکن ہندستانی ادبیات میں فطرت متحرک اور تغیرپذیر ہے خصوصًا موسموں کا تذکرہ اسے نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ جائسی کی 'پدماوت' تو اس کا شاہکار ہے اردو میں موسموں کی کیفیت کی کہانی محمد قلی قطب شاہ کے یہاں سے ہی ملنے لگتی ہے جب وہ کہتا ہے کہ

پپیہا گاؤتا ہے میٹھے بینا

تو موسم کا تصور ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ بکٹ کہانی سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک کسی نہ کسی شکل میں یہ روایت رہی ہے اور اردو ادب کی تہذیبی جڑوں کو مضبوط کرتی رہی ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے اس اہم تہذیبی روایت کی طرف کم توجہ دی گئی حالاں کہ اس روایت میں جو رنگ و نغمہ ہے وہ منفرد ہے۔ آج بھی جگنو کی طرح جھلکتا ہوا اگر کوئی شعری کارنامہ موسموں کی یاد دلادیتا ہے تو فضا میں بکھرے ہوئے رنگ ہندستانی تہذیب کا رنگ بن کر جگمگانے لگتے ہیں۔

دعا یہی ہے کہ جس طرح دیوالی کے دیپ روشنی دیتے ہیں اسی طرح ہماری تہذیب کی روشنی بھی دنیا کو جگمگاتی رہے۔

ـــــــ سید امجد حسین

غزل

فضا ابن فیضی

مئوناتھ بھنجن ۔ ۲۷۵۱۰۱

وہی روایت گزیدہ دانش ، وہی حکایت کتاب والی
رہی ہیں بس' زیرِ درس تیرے' کتب اُدھورے نصاب والی

نکالو تازہ معانی، باطن سے اپنے خلاق ذہن والو !
عجیب لگتی ہے مجھ کو یہ بحث' اخذ اور اکتساب والی

بہ قدرِ ظرف و مذاق ٹھہرا، معاملہ زندگی سے سب کا
مرا پیالہ ہے زہر والا، تری صراحی شراب والی

میں لفظ و معنی کے اس سفر میں قدم قدم ٹھوکروں سے عاجز
بہت کٹھن ہے یہ مختصر سی روش' کڑے انتخاب والی

سفر خطِ مستقیم کا بھی' ہے ان دنوں خطِ منحنی پر
بہت چلی، اب نہ چل سکے گی' پرانی منطق جناب والی

جو میرے چہرے پہ سادگی کی پرت ہے' اس کو کھرچ کے دیکھو
کہ اس کی تہ میں چھپی ہوئی ہے' اک آگہی صد حجاب والی

میں اپنے لفظوں کو' اپنے فن کے لہو سے سرسبز کرنے والا
مرا شعور اجتہاد والا، مری نظر احتساب والی

چلو! ذرا دوستوں سے مل لیں' کسے خبر اس کی' پھر کب آئے
یہ صبحِ گل گوں خیال والی' یہ مشک بو شام خواب والی

مرے لیے تو ترا علاقہ ہے شہرِ ممنوعہ جیسا، لیکن
کھنڈر کھنڈر زندگی کو میں نے' گلی دکھادی گلاب والی

فضا کہ درویشِ حرف ہے' دیکھنا ذرا بانکپن تو اس کا
قمیص خورشید بخت والی' کلاہ گردوں رکاب والی

رشید حسن خاں
۱۶۰ ، بازئی ، شاہ جہاں پور

مثنویاتِ شوق : زبان اور بیان

[مقدمہ "مثنویاتِ شوق" کا ایک باب]

نواب مرزا شوق لکھنوی کی تین مثنویات ہیں ۔ فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق ۔ زبان کے لطف اور بیان کے حسن کے لحاظ سے یہ مثنویاں قابل مطالعہ ہیں، خاص کر ان لوگوں کے لیے جو زبان لکھنؤ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، اور ان لوگوں کے لیے بھی جو زبان لکھنؤ کے حقیقی حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں ۔

شوق کی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں چند باتوں کو ذہن میں ضروری رکھنا چاہیے ۔ سب سے اہم یہ بات کہ شوق کی زبان اس عہد کے دوسرے لکھنوی شعرا، خاص کر غزل گو شعرا کی زبان سے مختلف ہے ۔ غزل ہی نہیں، یہ مرثیے کی زبان کے عمومی انداز سے بھی مختلف ہے ۔ مرثیے سے میری مراد یہاں پر میر انیس کے مراثی سے ہے ۔ ارباب نظر کا اس پر اتفاق ہے کہ انیس کے مرثیوں میں زبان اور بیان کا جو عمومی انداز ہے، وہ سلاست و فصاحت کے لحاظ سے منفرد ہے، شوق کی مثنویوں کی زبان اس سے بھی مختلف ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ زبان لکھنؤ کے جس لوچ، جس نزاکت اور لطافت کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ دراصل شوق (اور ان جیسے بعض لکھنوی مثنوی نگاروں) کی زبان سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس زبان میں صلابت کے اجزا نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ اس میں وسعت بیان کے امکانات کم سے کم ہیں، لیکن ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر یہ زبان لطیف تر، حسین تر، نفیس تر ہے ۔

لکھنؤ کی یہ نئی لسانی روایت یا یوں کہیے کہ شعری روایت اس دہلی روایت سے بھی مختلف ہے جو میر اثر اور مومن کی مثنویوں میں سامنے آتی ہے ۔ موضوع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میر اثر اور مومن کی مثنویوں میں اور شوق کی مثنویوں میں زیادہ فرق نہیں، یوں کہ ان سب کا محور اور مرکزی نقطہ جسم اور جنس ہی ہے ۔ اس کے باوجود زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت فرق ہے ۔ دونوں دہلوی شاعروں کی مثنویوں میں عورتوں کی باتیں کم نہیں، مگر وہ عورتوں کی زبان میں کم ہیں، میر اثر اور مومن کی زبان اور ان کا طرز گفتگو ان پر چھایا ہوا ہے ۔ ان میں خواتین کے مکالمے نہیں، خواتین سے منسوب بیانات ہیں ۔ اختلاط کے بیان میں مومن کے یہاں تفصیل نگاری ہے اور خوب ہے، لیکن شوق کے یہاں ایسے بیانات میں زبان "صاحبات محل" کا جو ریشمی پن ہے، جیسی لچک ہے، جو لوچ ہے، وہ وہاں نہیں ۔ اب رہیں دو معروف مثنویاں گلزار نسیم اور سحرالبیان، تو ان کو اس لسانی موازنے میں شامل نہیں کیا جا سکتا ۔ گلزار نسیم تو مرصع کاری کا آئینہ خانہ ہے، وہ روایت ہی دوسری ہے ۔ اور سحرالبیان نام کو لکھنوی مثنوی ہے کہ لکھنؤ میں لکھی گئی تھی ۔ اس میں ہر چیز دہلویت کی آئینہ دار ہے، خاص کر زبان اور بیان ۔

لکھنؤ کی لسانی روایت کا سلسلہ عام طور پر ناسخ سے جوڑا جاتا ہے ۔ یہاں دوسرے متعلقات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اس طرف توجہ مبذول کرانا ہے کہ "زبان لکھنؤ" کی جس نرمی، شفافیت اور لطافت کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ دراصل شوق (اور ان کے لکھنوی ہم مشرب مثنوی نگاروں کے یہاں ملتی ہے، ناسخ اور ان کے تلامذہ اور متبعین کے یہاں نہیں ۔ ناسخ اور ان کے متبعین اور مقلدین کی زبان میں صلابت کچھ زیادہ ہے، ثقالت بھی ہے اور لوچ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ناسخ کی مثنویوں کا بھی یہی احوال ہے (ویسے بھی وہ سب غیر عشقیہ مثنویاں ہیں، ان میں اس کی گنجایش بھی نہیں نکل سکتی تھی ۔) وہ نرمی اور نفاست، جس کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے، شوق کی مثنویوں کے واسطے سے زبان لکھنؤ کا جز بنی ہے ۔ اسی بات کو سرور صاحب نے اپنے انداز سے یوں کہا ہے، "لکھنؤ کی تہذیب کا تکلف ناسخ کے یہاں، اس کی مذہبیت انیس کے یہاں اور اس کی نزاکت شوق لکھنوی کے یہاں ملتی ہے ۔" (مسرت سے بصیرت تک ص ۴۸)

یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ لکھنؤ میں شعری زبان کا عمومی انداز وہی تھا جو دہلی سے آیا تھا ۔ بادشاہت کے آنے کے ساتھ یہاں زندگی کے ہر

شعبے میں نمایاں امتیازات کی واضح طور پر صورت گری ہوئی۔ شعری روایتوں کا بھی یہی احوال ہے۔ اس کے باوجود، عظیم المرتبت مہاجر شعرائے دلی کے واسطے سے دلی زبان اور انداز کے اثرات پوری طرح ختم نہیں ہو پائے۔ بعض گوشوں میں وہ ذرا سے تغیر کے ساتھ کار فرما رہے۔ شوق کی مثنویوں کے لسانی مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں آخر تک تقریباً وہ سب عناصر کار فرما ہے جن کو زبان دلی سے، یا بہتر لفظوں میں دہلوی طرز سے قریب کی نسبت حاصل تھی۔

دوسری طرف میر اثر کی مثنوی (خواب و خیال) اور مومن کی مثنویوں میں روزمرے کا وہ لطف، محاورے کی وہ چٹک اور بیان کی وہ لطافت نہیں ملتی جو شوق کی مثنویوں کے خصوصی حوالے سے اس لکھنوی روایت کا خاص حصہ ہے۔

اس اعتبار سے شوق کی زبان دلی اور لکھنؤ کے بہترین لسانی اجزا کا مرکب ہے اور عطر مجموعہ۔

یہ بات خاص طور پر کہنے کی ہے کہ لکھنؤ کی یہ نئی لسانی روایت مثنویوں میں پھلی پھولی۔ اسے فریب عشق اور بہار عشق جیسی مثنویوں ہی میں فروغ حاصل ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر کہ خواتین کی گفتگو کے جس قدر اجزا ایسی مثنویوں میں شامل ہو سکتے تھے، وہ کسی اور صنف میں شامل نہیں ہو سکتے تھے اور انہیں اجزا نے بیان میں لطافت اور نفاست کو سمویا ہے۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ تاثیر کے لحاظ سے زہر عشق کا مرتبہ باقی دونوں مثنویوں (فریب عشق، بہار عشق) سے بلند اور بلند تر ہے۔ یہ درد و غم کی کہانی ہے۔ اس کا آخری حصہ، جو دنیا کی ناپائیداری کے بیان پر مشتمل ہے، جان سخن کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن زبان اور بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی ان دونوں مثنویوں کے برابر کی نہیں۔ زبان کے حسن اور بیان کی خوبی کے لحاظ سے بہار عشق درجہ اول کی مثنوی ہے، اس کے بعد فریب عشق ہے۔ فریب عشق میں بھی مکالماتی حسن کی کمی نہیں، اس میں بھی روزمرے اور محاورے کی چاشنی ہے، مگر بہار عشق کے مقابلے میں یقیناً کم ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ بہار عشق کے بڑے حصہ پر ہیروئن کے مکالمے چھائے ہوئے ہیں۔ اس وسعت اور طول کلامی نے خواتین کے روزمرے اور محاورے کے لیے زیادہ گنجائش نکالی ہے۔ فریب عشق میں ہیروئن کی بات چیت کا حصہ بہار عشق کے مقابلے میں کم ہے، اسی نسبت سے اس میں محاورے اور روزمرے کا حصہ بھی کم ہے۔ مکالمے فریب عشق کے بھی برجستہ اور عمدہ ہیں، خواتین کی زبان کا حسن اس میں بھی کم نہیں، مگر ایسے بیانات نے بہار عشق کے ایسے بیانات کے مقابلے میں کم جگہ پائی ہے، اس لیے زبان اور بیان کی خوبیوں کا دائرہ بھی سکڑتا رہا۔

میں یہاں مثنویات شوق سے حسن بیان اور لطف زبان کی مثالیں پیش کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مثنویاں موجود ہیں، ان کو کہیں سے دیکھ لیا جائے، اس کی وضاحت خود بہ خود ہو جائے گی۔ اس کے بجائے میں شوق کی زبان اور بیان کے بعض اور اجزا کے متعلق اختصار کے ساتھ کچھ کہنا چاہوں گا اور محض اظہار مدعا کے لیے چند مثالیں بھی پیش کی جائیں گی۔

شوق کی ان تینوں مثنویوں میں نمایاں رعایت لفظی کی مثالیں کم ہیں۔ جو مثالیں ملتی بھی ہیں، ان میں سے بیشتر فریب عشق اور بہار عشق میں ہیں اور ان میں اکثر مثالیں ضلع کی ہیں۔ شوق نے جو زمانا پایا تھا اس میں لفظی مناسبات کا چلن عام تھا۔ اس کے باوجود شوق کے یہاں صنائع لفظی و معنوی اور لفظی مناسبات نے کم سے کم جگہ پائی اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر لفظی رعایتوں اور مناسبتوں کی کثرت ہوتی تو پھر وہ خوبیاں بے نور ہو جاتیں جنھوں نے ان مثنویوں میں زبان اور بیان کے حسن کو چمکایا ہے۔ شاعری میں صنعت گری کا اوسط جب بڑھ جاتا ہے، تو بیان کا حسن بگڑ جاتا ہے۔ ان مثنویوں میں رعایت لفظی کی جو قابل ذکر مثالیں سامنے آتی ہیں، وہ اس انداز میں ہیں۔

باولی ہو جو تیرے فقروں میں آئے
چاہ میں اپنی جان کون گنوائے

تازہ گل پھولا، خوش کمال ہوئی
باغ میں آکے میں نہال ہوئی

پہلے شعر میں باولی اور چاہ، دوسرے شعر میں گل، باغ، نہال، پھولا (گل پھولا) میں رعایت لفظی سامنے کی بات ہے۔

نام افیوں کا سن، وہ لالہ عذار   بولی اچھے نہیں ہیں یہ کردار

"لالہ" معروف سرخ پھول ہے، جس سے رخسار محبوب کو بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ "لالہ عذار" میں یہی تشبیہی نسبت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ "لالہ" پوستے کے پھول کو بھی کہتے ہیں، وہ بھی سرخ ہوتا ہے اور اس کے ڈوڈے میں سیاہ مادہ افیون جمع ہوتا ہے، اس شعر میں "افیون" اور

"لالہ" میں یہی نسبت ہے۔ (رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "افیون فیض آبادی لالے کی وہ رنگین جس نے تریاک مصر کے نشے کر کرے کیے۔")

مردوا ہونے نوج اس گت کا   جیسے دھونسا ٹھوڑا نوبت کا
سنکے یہ جھبتی میں نے اس سے کہا   اب یہ نوبت ہوئی ہماری، بجا
بولی، چپ رہیے منہ کی کھایئے گا   اک ذرا سینک کر بجایئے گا

یہ کھلا ہوا ضلع ہے، مگر اس انداز کی مثالیں کم اور بہت کم ہیں۔ ان تینوں مثنویوں میں کل بارہ سو ساٹھ (۱۲۶۰) شعر ہیں۔ ان میں، میرے شمار کے مطابق، ایسے شعر جن میں ایسی لفظی مناسبتیں نمایاں ہوں، بیس (۲۰) سے زیادہ نہیں ہوں گے اور یہ تناسب کچھ زیادہ نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ قابل ذکر بھی نہیں۔ (مقدمہ مثنویات شوق میں ایسے چند اشعار کو نقل کر دیا گیا ہے، یہاں محض اختصار کی خاطر ان سب اشعار کو نقل نہیں کیا گیا)۔

کہنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ مرکبات ان مثنویوں میں اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ کچھ مرکبات میں تو اردو پن نمایاں ہے اور خواتین کی گفتگو میں ذرا بھی بے جوڑ نہیں لگتے، بلکہ ان سے زبان کا لطف بڑھ گیا ہے، جیسے، فیل باز، سیر باز، فقرے باز، فقرے بازیاں، دیدہ دانستہ، دیدہ دلیل، فیلیاپن، ہر دیگی چمچہ، مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ وہ عام فارسی مرکبات اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور یہ عموماً راوی کے بیان (یعنی مردانہ گفتگو) میں آئے ہیں، جیسے عشق جاں گداز، قفس طائران تیز زبان، گنہ گاری خدا، خضر طریق عشق، خوش غلاف، طالب صورت حسین، تاج فرق پیمبران سلف، اختلال حواس، گریہ، چشم خوں چکاں، خندہ، زخم عاشقاں، پوشاک جسم دل براں، نگاہ وحدت بین، خوش اسلوب، خوش ظاہر، خوش جمالی۔

زہر عشق میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ایسی فارسی ترکیبیں ہیروئن کی زبان سے ادا کرائی گئی ہیں جو عموماً خواتین کی زبان میں بے جوڑ لگتی ہیں۔ ایسی ترکیبیں مثنوی کے نصف آخر میں، جہاں ناپائیداری دنیا کا بیان ہے، آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں شوق نے اپنی زبان ہیروئن کے منہ میں رکھ دی ہے۔

صبح کو طائران خوش الحان   پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

ایسے شعر پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خود شوق بول رہے ہیں، مگر پڑھنے والے کے ذہن میں کھٹک پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی بہ ظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مثنوی کا یہ حصہ اس قدر پراثر ہے، کہ اس کو پڑھتے وقت آدمی اور سب کچھ بھول جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے جس کو "گفتگوئے صاحبان محل" میں اچھی طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے (غالباً) کہ اس حصے میں فارسی ترکیبوں کا اوسط کچھ زیادہ ہے، مگر اسی وجہ سے وہ بے محل نہیں معلوم ہوتیں۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ مصدر کے ساتھ اگر اسم مونث ہے، تو علامت مصدر "نا" بدل کر "نی" کی شکل میں ملتی ہے، جیسے عمر کٹنی۔ یا جیسے، رات کٹنی۔ دہلی میں شروع ہی سے یہی قاعدہ رہا ہے کہ اس مذکر و مونث کی نسبت سے علامت مصدر "نا" یا "نی" آتی ہے، جیسے، پانی پینا اور شراب پینی۔ لکھنؤ میں بھی شروع میں یہی صورت تھی۔ بعد کو بیش تر اساتذہ، لکھنؤ کا عمل یہ رہا کہ علامت مصدر "نا" کسی بھی شکل میں نہیں بدلے گی، جیسے، کتاب پڑھنا، خط پڑھنا (اس سلسلے میں ضروری وضاحت کے لیے دیکھیے مقدمہ نور اللغات (جلد اول) اور فرہنگ اثر میں بحث متروکات)۔ داغ کے مشہور شاگرد مہر گوالیاری کے دیوان شعاع مہر میں ایک طرحی مشاعرے کی غزل ہے جس کے ردیف و قوافی ہیں، خبر ہونا، نظر ہونا، اس کا مقطع ہے

یہاں ہیں مہر اہل لکھنؤ بھی اہل دہلی بھی
یہ کہتے ہیں، سحر ہونی، وہ کہتے ہیں سحر ہونا

شوق کے یہاں پرانا دہلوی انداز ملتا ہے کہ اسم مونث کے ساتھ "نا" علامت مصدر "نی" بن گئی ہے،

ع۔ تھی جو قسمت میں ہونی آبادی
ع۔ عمر کٹنی تھی ایسے صدمے میں
ع۔ رات کٹنی محال ہوتی ہے

مندرجہ ذیل شعر میں "نے" کا استعمال پرانے دہلوی انداز کی یاد دلاتا ہے

سن کے ماماسے میں نے یہ تقریر
چپ رہا بنے صورت تصویر   (بہار عشق)

"نے" کا اس طرح استعمال اس عہد کی بعض دیگر لکھنوی تصنیفات میں بھی ملتا ہے، جیسے "شہ زادہ، عالی تبار نے آب و طعام دیکھ کر رو دیا" (رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عجائب مرتبہ، راقم الحروف، ص ۲۶۸)۔

آشنا، دوست آگئے جو کبھو
جس نے دیکھا، نکل پڑے آنسو   (زہر عشق)

"کبھو" بھی زبان دہلی کی نشانی ہے۔

ان مثنویات میں اعلان نون کی جو دو مثالیں ملتی ہیں، وہ بھی دراصل زبان دہلی کی یادگار ہیں۔

اور جو دل ان کا آگیا کہیں اور
تشنۂ خون ہو گئیں فی الفور (فریب عشق)

صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں، کل من علیہا فان (زہر عشق)

بعض مقامات پر نظر رکتی ہے مثلاً

نہیں قابو میں ہے کسی کا دل
چپکے سب ہیں صاحبان محل (زہر عشق)

"دل" اور "محل" کا قافیہ کہیں اور نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے جواز میں شاید یہ کہا جا سکے کہ لفظ "محل" عام طور پر زبانوں پر اس اس طرح آتا ہے کہ ح میں کسرے کی لہر شامل ہو جاتی ہے۔ (اس کی ایک بہت اچھی مثال لفظ "بہن" ہے جو اصلاً بہ فتح سوم ہے، مگر زبانوں پر عموماً بہ کسرِ سوم آتا ہے۔ یہ اردو کا لسانی رجحان ہے کہ درمیان لفظ ح یا ہ سے پہلے زبر کی آواز میں ترچھاپن آجاتا ہے۔ جیسے احمد، بہنا، سہنا، کہنا وغیرہ) بہ ہر صورت قافیے کا یہ انداز بھی دہلوی انداز استعمال کی یاد دلاتا ہے۔

سمجھو اس شب برات کی رات
ہم نہیں ہیں مہماں تمہارے رات کی رات

"شب برات کی رات" کا یوں تو جواز نظر نہیں، لیکن یہاں یہ ایک بات ضروری کہی جا سکتی ہے کہ یہ ٹکڑا ہیروئن کی زبان سے ادا ہوا ہے اور اس لحاظ سے شوق کے اس قول کا یہاں حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ محاورات صاحبات محل میں جو الفاظ غلط ان کی زبان کے تھے، انھیں صحیح سمجھ کر نظم کیا گیا ہے۔ مثنوی بہار عشق کی اشاعت اول کے آخر میں "نثر مصنف" کے عنوان سے یہ عبارت ملتی ہے۔

"اس ذرۂ بے مقدار کو منظور یہ تھا کہ محاورات صاحبات محل اور نوچندی کے لوگوں کے کچھ بیان کرے، لہٰذا یہ مثنوی مخصوص اسی واسطے کہی اور الفاظ غلط کہ ان لوگوں کے محاورات میں جاری تھے، موزوں کیے اور موافق قول اساتذہ کے ان کو صحیح سمجھ کر جاری رکھا۔ چناں چہ لکھا ہے کہ لفظ "منعصر" کو اگر ان لوگوں کے محاورات میں لکھے، تو "منعصر" لکھے۔ بلکہ اگر "منحصر" لکھے تو وہ غلط ہے۔ لہٰذا ارباب فہم و کمال پر پوشیدہ و مخفی نہ رہے کہ یہ حقیر بھی اس مثنوی میں جا بہ جا موافق اقوال اساتذہ کے عمل میں لایا اور ان کے الفاظ غلط کو صحیح جان کر موزوں کیا۔۔۔" (بہار عشق، مطبوعہ مطبع سلطان المطابع (لکھنؤ) سال طبع۔۱۲۶۶ھ)

فریب عشق کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ "ممکن ہے نومشقی کے زمانے کی ابتدائی تصنیف ہو"۔ میں اسے نومشقی کے زمانے کی تصنیف تو نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ ہیروئن کے مکالمے (جو اصل چیز ہیں) وہ کم جان دار نہیں، ہاں یہ ضروری ہے کہ سستی بندش، لفظی تعقید اور غیر ضروری اور غیر مناسب محذوفات کا تناسب اس میں کچھ زیادہ ہے۔ محض مثال کے طور پر ان چند اشعار کو دیکھیے۔ پہلی دو مثالوں میں محذوف الفاظ کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے

بعد، احمد کی مدح کر تحریر
کہ وہ دنیا میں ہے خدا کا وزیر

کہتی تھیں، وہ ہر اک سے ہنستا ہے
بات کرنے میں اس سے پھنستا ہے

جب تلک دل سے مبتلا ہیں یہ
نہیں پھر کس کی آشنا ہیں یہ

لطف صحبت ذرا نہیں تم کو
کیا غضب ہے، مزا نہیں تم کو

خالی اس جرم سے حضور ہیں وہ
سچ تو یہ ہیں کہ بے قصور ہیں وہ

جا ہے شکوہ ہے نہ شکایت ہے
اس میں بھی اپنی اپنی قسمت ہے۔

خوش گزرتے تھے اس طرح ایام
عیش رہتا تھا صبح سے تا شام

حکم احکام سب بجاتی ہے
وہی ہر بار کہتی جاتی ہے

بس خرابی نہ کر زیادہ اپنی
قصد ہے بانی فساد اپنی

لفظی تعقید ان مثنویوں میں جگہ جگہ ملتی ہے اور کچھ مقامات پر تو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ مثلاً۔

ع۔ تیر الفت جو تھا لگا کاری
ع۔ دل کو اپنے کرو ملول نہیں
ع۔ واسطے جس کے نالے کرتے ہو
ع۔ ہوئی میری جو اس کی چار نگاہ
ع۔ تیرے پیچھے کی تلخ سب اوقات

کئی جگہ "نہ" کے محل پر "نہیں" ملتا ہے، میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ع۔ جھوٹ سمجھیں اسے حضور نہیں
ع۔ دل کو اپنے کرو ملول نہیں

کئی شعروں میں افعال کا استعمال توجہ طلب ہے۔ مثلاً۔

ع۔ ہیں بہت ایسے دیکھے اور بھالے
ع۔ آکے سمجھائے گا، بجھائے گا کون

اب دیکھیے بھالے اور سمجھائے بجھائے گا کہتے ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ اس زمانے میں اس طرح بھی کہتے ہوں۔

دل جب اس کا بہت ہلاک ہوا
تب گریبان صبح چاک ہوا

اس کا دل جب بہت ہلاک ہوا، یعنی دل بہت گھبرایا، وہ بہت پریشان ہوئی۔

متعدد لفظوں کو اس طرح لایا گیا ہے کہ اب وہ اس طرح استعمال میں نہیں آتے، صرف ایک مثال

جو کہا تھا، ادا کیا اس نے
وعدہ اک دن وفا کیا اس نے

وعدہ وفا کرنے کے لیے اب اور کرنا میری نظر سے کہیں اور نہیں گزرا بعض اشعار پر نظر رکتی ہے، بہ ظاہر ان میں عجز شاعرانہ نظر آتا ہے، صرف ایک مثال۔

آگ لگ جاتی وہ گھڑی کم بخت
بام پر آئی تھی میں کون سے وقت

"وہ کم بخت گھڑی آگ لگ جاتی" بہ ظاہر اس میں بیان کا کچا پن نظر آتا ہے۔ ایسے بعض اور مقامات بھی ہیں۔ ایسے مقامات پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے ٹکڑے ہیروئن کی زبان سے ادا ہوئے ہیں اور یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورتیں اسی طرح بولتی ہوں گی۔ زبان کے لحاظ سے ان مثنویوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ لغت کے لیے ان میں بہت کچھ مسالا ملتا ہے، متعدد لفظوں کی سندیں بھی فراہم ہوتی ہیں اور کچھ نئے اجزا بھی ملتے ہیں۔ فراہمی اسناد کے لحاظ سے میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا، مگر پہلے بہ طور تمہید ایک اندراج کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

مولوی نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی معروف کتاب بحر الفصاحت میں عیوب قافیہ کی بحث میں غالب کے اس شعر کا حوالہ دیا ہے جس میں "صاحب" (بہ فتح سوم) آیا ہے، عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے۔ قوافی۔ لب، تب۔ مزید لکھا ہے۔

"راقم نے شہر رام پور میں ۱۳۰۷ھ میں نواب مرزا خاں صاحب داغ سے اس بات میں استفسار کیا، تو جواب دیا کہ غالب نے مقولہ غیر بیان کیا ہے اور مثال میں یہ شعر نواب یوسف علی خاں ناظم کا پڑھا۔

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم
میں جو آتا ہوں، تو کہتا ہے نوب آتے ہیں

(بحر الفصاحت، طبع دوم، نول کشور، ص ۲۲۹)۔ مقصود یہ ہے کہ اصلاً "نواب" مع واو مشدد ہے۔ اس شعر میں وزن اور قافیے کی مجبوری سے یہ لفظ صحیح صورت میں نظم نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے "نواب" مع واو مخفف نظم کرنا پڑا مگر غلطی سے بچنے کے لیے اسے مقولہ غیر (غلطی غیر کی گفتار کی) بنا کر پیش کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ زبانوں پر "نوب" بھی ہے، اگرچہ اساتذہ نے عموماً "نواب" نظم کیا ہے اسی طرح "نوابی"۔ مری نظر میں "نوب" (مع واو مخفف) کے استعمال کی صرف ایک مثال ہے۔

یوں چلا آتا ہے خوباں بیچ
فوج کے بیچ جوں نوب آتا

(آبرو۔ دیوان آبرو، مرتبہ محمد حسن، ص ۱۳)

مثنوی بہار عشق میں "نوب مرزا" آیا ہے (ہیروئن کی زبان سے)

نام جس وقت میں نے بتلایا
قہقہہ مار کر یہ فرمایا
اے لو میں بھی کہوں سبب کیا ہے
ارے تو ہی نوب مرزا ہے

اس شعر کو لغت میں سنداً درج کیا جاسکتا ہے اس صراحت کے ساتھ کہ عورتوں کی زبان پر بہ طور عموم اسی طرح آتا ہے اور ناموں میں بھی یہ صورت ہو سکتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ شوق کی مثنویوں میں بعض مقامات پر نظر رکتی ہے ("مثنویات شوق" کے ایک ضمیمے بہ عنوان "الفاظ اور طریق استعمال" میں ایسی مثالوں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔) ان مثنویوں کا یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ شوق کے یہاں حسن بیان اور لطف زبان کی کمی نہیں، ان کی شاعری کی سطح بہت روشن ہے، البتہ محل نظر مقامات مستثنا حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ شوقیہ مثنوی نگار تھے، اس زمانے کے معروف غزل گو شاعروں کی طرح استادانہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور زبان و بیان کے ریاض پر انھوں نے اس قدر توجہ نہیں کی تھی جس کی روایت اس زمانے میں عام تھی۔ وہ شاعر تھے اور ان کی شہرت اور بڑائی کے لیے ان کی شاعری دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی زبان میں مجموعی طور پر جو نفاست اور لوچ ہے، اس کی مثال لانا مشکل ہے۔ مولانا حالی جیسے شخص نے، جو شوق کی مثنویوں کے "ان مورل" ہونے پر بہت ناراض تھے، لکھا ہے

"جو کچھ اس نے بیان کیا ہے، خواہ وہ مورل ہو خواہ ان مورل اس میں حسن بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے"

(مقدمہ شعر و شاعری)

شوق کے طبیر مرصع انداز بیان اور شفاف، لچکیلی زبان کی ایک اہمیت اور بھی ہے، اور درحقیقت اس کی بڑی حیثیت ہے اور تاریخ ادب کے اس دور میں اس کا بیان اہم تر حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اہمیت یہ ہے کہ لکھنؤ میں جو زمانہ طرز ناسخ کے فروغ کا ہے، اس زمانے میں شوق نے اس طرز کے متوازی اس انداز کو اور اس طرز کو فروغ بخشا جس میں طرز ناسخ کی ثقالت کے مقابلے میں یکسر نرمی اور لچک ہے۔ یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ طرز ناسخ کی ہمہ گری سے جو لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کو اندازہ ہوگا کہ اس زمانے میں کسی دوسرے طرز کے فروغ کے امکانات کس قدر کم تھے۔ □□

حواشی

۱۔ یہ اشاعت اب نایاب کی حد تک کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی (مرحوم) میں تھا، نیر مسعود صاحب کی عنایت سے وہی پیش نظر ہے۔ "نثر مصنف" کے عنوان سے یہ عبارت اسی نسخے میں ملتی ہے، بعد کی اشاعتوں میں یہ شامل نہیں، اسی لیے یہ بیش تر لوگوں کے سامنے نہیں آسکی۔

اسی اشاعت اول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی "نواب ابو تراب خاں" کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اور انھیں کی فرمائش کے مطابق اس مطبع میں چھپی تھی۔ نواب ابو تراب خاں کے متعلق میں مفصل معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ شرر نے گزشتہ لکھنؤ میں واجد علی شاہی دور کے رئیس کی حیثیت سے "آغا ابو تراب خاں" کا حوالہ دیا ہے۔ "پتنگ بازی" کے تحت لکھا ہے۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں ڈیڑھ کنا کنکوا بن گیا۔۔۔۔ مگر اب نواب محمد حسین خاں سالار جنگی، آغا ابو تراب خاں اور دو ایک شوقین رئیسوں نے پسند نے کی جگہ نیچے پتا لگا کے وہ کنکوا بنایا جو فی الحال مروج ہے"۔

میرا خیال ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف اور اشاعت کے محرک یہی "ابو تراب خاں" تھے۔ ایک ابو تراب خاں عہد برہان الملک میں بھی تھے۔ لکھنؤ کا محلہ "کٹرا ابو تراب خاں" انھیں کا بسایا ہوا ہے۔ شرر نے محولہ بالا کتاب میں ان کا بھی ذکر کیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہ یہاں مراد نہیں ہو سکتے۔

۲۔ سید انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے، "منضر" اصل میں "منحصر" ہے اور بعض عورتوں اور مردوں کی زبان سے گوش زد ہے لیکن لائق اور استعداد والے "منحصر" بولتے ہیں، اگرچہ "منضر" بھی سامعہ خراش نہیں" (ترجمہ دریائے لطافت، ص ۲۵۵)۔

غزل

بہت قریب سے دنیا کو جانتا ہوں میں
کہ تجربات میں سب کچھ گنوا چکا ہوں میں

اب اپنے آپ کو پہچاننا بھی مشکل ہے
سوال یہ ہے وہی ہوں کہ دوسرا ہوں میں

جو ہو سکے تو مجھے تم تلاش کر لینا
تمھارے شہر کے منظر میں کھو گیا ہوں میں

کہیں اُجالے یہ شب خوں نہ ماریں اے احسن
اِسی خیال سے راتوں کو جاگتا ہوں میں

سرسید احمد خان

رباب رشید حیدری

تازی خانہ، لکھنؤ

یہ اضطراب کہ جو زندگی کا حاصل ہے
یہ اضطراب کہ جو آگہی میں شامل ہے
یہ اضطراب کہ جو رہبری میں کامل ہے
یہ اضطراب جو تعبیرِ خوابِ منزل ہے
اسی کے سلسلے سعی و عمل سے ملتے ہیں
اسی کے فیض سے صحرا میں پھول کھلتے ہیں

یہ اضطراب ہی تفسیرِ شوق کی ٹھہرا
یہ اضطراب ہی عزمِ سکندری ٹھہرا
یہ اضطراب ہی سرچشمۂ خودی ٹھہرا
یہ اضطراب ہی جزوِ قلندری ٹھہرا
اسی کے زیرِ اثر ہے نظامِ ہر تعمیر
یہ اہلِ حوصلہ و اہلِ درد کی تقدیر

یہ اضطراب ہے جو رنگ آرزو میں بھرے
یہ اضطراب ہے جو چاکِ دل رفو کردے
یہ اضطراب ہے جو منزلوں کی بات کہے
یہ اضطراب ہے جو آگ سے گزر جائے
یہ اضطراب ہی ناموں کو جگمگاتا ہے
یہ اضطراب بڑی عظمتیں دلاتا ہے

بلند و بالا ہے یوں ہی مقامِ سرسید
شناختِ عزم و عمل کی ہے نامِ سرسید
وسیع تر ہے بہت فیضِ عامِ سرسید
بجا ہے جتنا کریں احترامِ سرسید
وہ اضطراب جو ان کو خدا نے بخشا تھا
وہ اضطراب نہ تھا، روشنی کا ہالہ تھا

حصولِ علم کی پابند کامرانی ہے
حصولِ علم سے ہی کیف و شادمانی ہے
حصولِ علم ہی فطرت کی ترجمانی ہے
وہ خود شناس ہے جس نے یہ بات جانی ہے
یہی تھی فکر، یہی عمر بھر رہا مقصد
یہی ہے آج بھی یادو! پیامِ سرسید

جاں نثارانِ قوم و وطن — زندہ باد!

ایس. ایم. عباس

۸۸۔ تاڑتلہ، جونپور ۲۲۲۰۰۱

اے وطن!
اے دیارِ ہمالہ و گنگ و جمن
ہنس کے جو مر گئے تیرے ناموس پر
آبرو بن گئے جو ترے نام کی
تیرے ان جاں نثاروں کے خوں سے ہی ہے
آج شاداب تیرا چمن

وہ شہیدانِ انسانیت
جن کے مرنے کے دن بھی نہ تھے
مر گئے — اپنا سب کچھ فدا کر گئے
زندگی سونپ دی موت کو اور خوش ہو گئے
دار پر چڑھ گئے
گولیوں سے وہ چھلنی ہوئے
وہ مناظر جنھیں دیکھ کر
وقت بھی سر جھکائے رہا
درد اپنا چھپائے رہا
اُن تیرے جاں نثاروں کی قربانیاں
رنگ لاکر رہیں
رائیگاں نہ گئیں۔

اے وطن!
تجھ پہ صدقے ہیں یہ جان و تن
تو سلامت رہے
عظمت و شان تیری سلامت رہے
جو شہیدوں نے سر پہ ترے رکھ دیا
تاج وہ تاقیامت رہے
تیرے افکار کی عظمتیں — زندہ باد!
تیرے پروانوں کی جرأتیں — زندہ باد!
جاں نثارانِ قوم و وطن — زندہ باد!

□□

پروفیسر عابد پیشاوری
صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں ۱۸۰۰۰۱

پنڈت ہری چند اختر

کوئی میری خطا ہے یا تری صنعت کی خامی ہے
فرشتے کہہ رہے ہیں آدمی سے کچھ نہیں ہوتا
ترے احکام کی دنیا مرے اعمال کا محشر
یہاں میری وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا
مرے دست طلب کو جرات گستاخ دے یارب
یہاں دست دعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا
کمال شاعری حاصل کیا تو یہ کھلا اختر
کہ دنیا میں کمال شاعری سے کچھ نہیں ہوتا [1]

تو، مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں
اے خدا، میرے خدا، تجھ کو خدا سمجھا تھا میں
ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ، یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا
مرے چمن کی خزاں مطمئن رہے کہ یہاں
خدا کے فضل سے اندیشۂ بہار نہیں
شیخ و پنڈت دھرم اور اسلام کی باتیں کریں
کچھ خدا کے قہر کی انعام کی باتیں کریں
یہ سنائیں پاک نغمے اولیں الہام کے
وہ خدا کے آخری پیغام کی باتیں کریں
ہم کھڑے ہنستے رہیں اور دل میں یہ کہتے رہیں
اب یہ رخصت ہوں تو ہم کچھ کام کی باتیں کریں

جس طرح دیگ میں سے دو ایک دانے دیکھ کر پوری دیگ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اسی طرح کسی شاعر کے چند نمایندہ شعر دیکھ کر اس کی خوبیوں خامیوں کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ چند اشعار جو آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ان میں پنڈت ہری چند اختر کی تمام شاعرانہ خصوصیات موجود ہیں، طنز و مزاح، شوخی و شگفتگی، دردمندی و دل سوزی، قدرت بیان و پختگی، مضمون آفرینی و برجستگی، روایت کا پاس اور جدت کی تلاش۔ اس شاعر نغز گفتار نے بلا مبالغہ ہزاروں اشعار کہے اور اس صاحب طرز نثر نگار نے ہزاروں صفحات نثر لکھی ہوگی لیکن آج نثر کے نام پر جوش۔ ملسیانی کے مجموعے "جنون و ہوس" پر ان کا دیباچہ یا حفیظ جالندھری کے مجموعے "سوز و ساز" پر ان کا مقدمہ اور وہ بھی دستیاب نہیں۔ شاعری کے نام پر ایک مختصر مجموعے "کفر و دیں" کے محض باسٹھ صفحے جو وفات کے بعد ان کے دوست عرش ملسیانی نے ادھر ادھر سے فراہم کر کے چھاپ دیے، ورنہ آج یہ بھی ہاتھ نہ آتے۔

آل احمد سرور نے اختر کے متعلق اپنے "چند تاثرات" اس طرح بیان کیے ہیں۔ "لکھنؤ ریڈیو والوں نے اختر کو مشاعرے میں بلایا۔ اختر نے وعدہ کر لیا کہ شرکت کریں گے۔ مگر عین وقت پر نہ آئے۔ شاعری کی پختگی تو کلام سے ظاہر ہوئی تھی۔ لاابالی پن اس حرکت سے ظاہر ہو گیا۔"

"دوسرے سال انہیں پھر دعوت دی گئی۔ حضرت تشریف لائے۔ مجھ سے ملنے گھر پر آئے۔ میں انہیں ساتھ جون پور کے مشاعرے میں لے گیا۔ راستے میں بڑے مزے کی گفتگو رہی۔ انہوں نے اپنے شعر بہت کم سنائے۔ گرامی، اقبال، ظفر علی خاں، تاجور، تاثیر، سالک کے بہت سے لطیفے اور معرکے بیان کیے۔ بسمل سعیدی بھی سفر میں شریک تھے۔ جونپور کے مشاعرے میں انہیں پڑھتے دیکھا۔ کلام سنا۔ مشاعرے میں شعرا پر دل چسپ اور برمحل فقرے سنے۔ زندگی، ادب، مشاعروں، کانفرنسوں، دوستی، دشمنی، لاہور کی ادبی فضا، دہلی کی انجمنوں کی کش مکش، سرکاری ملازمت سب پر گفتگو رہی۔ مجھے محسوس ہوا ایک بڑے باغ و بہار آدمی، ایک بڑے مخلص اور بے ریا دوست، ایک فاضل، ایک کڑھے ہوئے انسان اور ایک زخموں کی کائنات دل میں لئے ہوئے محفل کو زعفران زار بنانے والے سے، ادب اور ادبی صحبتوں کے رسیا سے مل رہا ہوں۔۔۔ ایک یاروں کے یار سے مل رہا ہوں۔" پنڈت جی یاروں کے یار تھے اس کا انداز دوستوں سے ان کے سلوک کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ ساری زندگی ضرورت مند اور غیر ضرورت مند دوستوں کی بھی مدد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بچوں کے منہ کا نوالہ چھین کر، خود قرض لے کر بھی دوستوں کی ضرورت پوری کرتے رہے۔ دوستوں نے اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا لیکن بہ قول خود ع

بری عادت کوئی بھی ہو بہ آسانی نہیں جاتی

اس کے باوجود، نہ کبھی دل میں میل آیا نہ ماتھے پر شکن آئی۔ باغ و بہار

ایسے کہ بے بات کی بات سے بھی لطیفہ پیدا کر لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے اپنا پہلا مشاعرہ انہیں کی صدارت میں پڑھا تھا۔ دلی پبلک کالج قرول باغ کا مشاعرہ تھا۔ میں ان دنوں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ جب پنڈت جی کو دعوت سخن دی گئی تو کلام سنانے سے پہلے فرمایا۔ میرے شعروں میں اور کوئی بات ہو نہ ہو، میری غزل میں پانچ شعر سے زیادہ نہیں ہوتے۔ پھر جو غزل سنائی جس کا ایک مشہور شعر ہے۔

جہاں تجھ کو بٹھا کر پوجتے ہیں پوجنے والے
وہ مندر اور ہوتے ہیں شوالے اور ہوتے ہیں

سرور صاحب نے انھیں اختر شیرانی کا شاگرد دیکھا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنا تخلص اختر کبھی نہ رکھتے۔ ان کی شاگردی کے باب میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر حفیظ جالندھری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اختر حفیظ کے شاگرد ہیں تو ایک دن تاثیر نے اختر سے کہا۔ سنا ہے، تم حفیظ کے شاگرد ہو۔ پنڈت جی نے کہا۔ ہاں۔ تاثیر بولے۔ میں تو تمہیں شریف آدمی سمجھتا تھا۔ بہر حال۔

اختر ضلع ہوشیارپور کے ایک غیر معروف قصبے صاحباں میں پیدا ہوئے۔ جب گورنمنٹ ہائی اسکول، جالندھر میں زیر تعلیم تھے تو ان کی ملاقات حفیظ جالندھری سے ہوئی۔ شاعری کا شوق تھا۔ چناں چہ حفیظ کے شاگرد ہو گئے۔ استاد شاگرد دونوں ہم عمر تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اختر کی شاگردی نے حفیظ کو فیض پہنچایا یا حفیظ کی استادی نے اختر کو۔ سنا جاتا ہے کہ "شاہنامہ اسلام" کی تصنیف میں بالواسطہ یا بلاواسطہ محنت اختر کی بھی شامل ہے۔ یہ درست ہو کہ نہ ہو لیکن اختر کی وفات کے بعد دلی میں ان کے مکان پر حفیظ کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہم نے خود دیکھا ہے۔

جالندھر سے فارغ التحصیل ہو کر پنڈت جی نے فارمن کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے تقریباً بارہ سال لاہور میں گزارے۔ ادبی اور تحقیقی اعتبار سے یہ ان کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ شروع شروع میں وہ شرما تخلص کرتے تھے۔ بعد میں حفیظ کے مشورے سے اختر تخلص اختیار کیا۔ کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ مزاح ان کا مزاج تھا۔ دوزخی تخلص سے بے شمار دلچسپ و دلکش نظمیں تخلیق کیں۔ اخباروں میں کلام چھپنے لگا۔ ایس۔ پی۔ ہال کے ہنگامہ خیز مشاعروں میں شرکت ہونے لگی۔ بی۔ اے کے بعد رسالہ پھول کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہیں اسلامیہ کالج سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ پنجاب اسمبلی کے دفتر میں رپورٹر ہو گئے۔ کچھ مدت ریڈیو میں بھی ملازم رہے۔ اسی عہد کا ایک لطیفہ ہے، ایک دن لنچ کے وقت کسی محترمہ نے ٹیلیفون کیا انہیں جس سے بات کرنی تھی وہ موجود نہیں تھا۔ پنڈت جی نے کہا، میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گا۔ محترمہ نے کہا۔ آپ کا اسم شریف؟ جواب دیا۔ ہری چند اختر۔ محترمہ نے کہا ہری چند۔۔۔۔ پنڈت جی نے کہا۔ اختر۔ ان محترمہ نے کہا۔ سبحان اللہ کیا نام ہے ہری چند اختر۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے۔ ممتاز شانتی (ممتاز شانتی اس دور کی ایک مشہور ایکٹریس تھی) ریڈیو کے بعد پی۔ آئی۔ بی میں بھی رہے۔ پروفیسر سرور نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "حفیظ کی شہرت میں سر عبدالقادر کے بعد ان کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مگر اپنے دشمن تھے۔ دوستوں نے ترقی کی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یہ حضرت برابر تنزل کرتے رہے اور اسی میں مگن رہے۔"

لاہور میں لالا کرم چند نے اخبار "پارس" جاری کیا تھا۔ پنڈت جی اس میں مسلسل لکھتے تھے۔ بیشتر اداریے نوٹ اور کالم "نمک دان" اختر ہی لکھتے تھے۔ ملک میں "نمک دان" کی بڑی دھوم تھی۔ اس میں مشاعروں کے معرکے، مشاعروں کا حال، ادبی اور سیاسی تنازعے، سب کچھ ہوتا تھا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ ظفر علی خاں کی نظموں کے جواب دیے گئے۔ خواجہ حسن نظامی اور محمد علی کے جھگڑے اچھالے گئے۔ رام رچھپال سنگھ شیدا اور راج نراین ارمان سے خوش فعلیاں کی گئیں۔ "لاہور کا جو ذکر کیا" میں گوپال متل نے لکھا ہے کہ ارمان داغ کے شاگرد تھے۔ ان کا تکیہ کلام تھا۔ "کیا گھمنڈ ہے"۔ بات بات میں کہتے تھے، ہم داغ کے شاگرد ہیں، کیا گھمنڈ ہے۔ (یعنی تمہیں کیا گھمنڈ ہے؟) ان کی مونچھیں بہت بڑی اور گھنی تھیں۔ چناں چہ "گھمنڈ" ان کے منہ سے "گھمنڈا" ہو کر نکلتا تھا۔ چناں چہ جب انہوں نے اختر کے سامنے اپنا مخصوص فقرہ دہرایا۔ ہم داغ کے شاگرد ہیں، کیا گھمنڈ ہے۔ اختر کی رگ ظرافت پھڑکی۔ برجستہ کہا۔ تو داغ کا شاگرد ہو یا داغ کا استاد، داغی ہیں مگر سب ترے اشعار گھمنڈا۔

زبان و بیان کے نکتے اختر کی گھٹی میں پڑے تھے۔ مگر لفظی ہیترے بازی سے نفور تھے۔ چناں چہ "زبان کی شاعری" کا بڑا مذاق اڑاتے تھے۔ مثلاً

تمہیں چاہو تمہیں چاہو تمہیں چاہو رقیبوں کو
کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہا ہے نہ چاہیں گے

ان کی کئی پیروڈیاں مشہور ہیں۔ دو ایک نمونے دیکھیے۔

کہا کابل چلے جائیں کہا کابل چلے جاؤ
کہا افغان کا ڈر ہے کہا افغان تو ہو گا

کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں کہا تم اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے کہا کوہان تو ہو گا

دل خانہ خراب کی صورت دل خانہ خراب کی سی ہے
اک طرف پانو اک طرف جوتا میری حالت جراب کی سی ہے
شیخ جی دوزخی ملے تھے آج شکل بالکل جناب کی سی ہے

مشاعروں میں فقرے بازی اور بذلہ سنجی میں اختر کا جواب نہیں تھا۔ ایک مشاعرے میں نوح ناروی غزل پڑھ رہے تھے۔ زمیں تھی بات کتنی، رات کتنی۔ جب یہ مصرع پڑھا۔ یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجا، پھر پڑھا۔ یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجا جب تیسری بار دہرایا تو پنڈت جی نے باآواز بلند مصرع ثانی لگا دیا۔

قصائی دے گیا سوغات کتنی۔ کم از کم ہمیں تو نوح کا اصل مصرع یاد نہیں، شاید اوروں کا بھی یہی حال ہو۔

ایک مشاعرے میں اپنا کلام پڑھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے کہا۔ ارے کوئی مصرع تو اٹھاؤ۔ پنڈت جی نے برجستہ کہا، ہماری تو عمر ہی مصرع اٹھاتے اور جنازے اٹھاتے گذری ہے۔ ایک اور موقع پر جوش نے اختر سے کہا اردو زبان پنجابیوں کی نہیں ہے۔ اختر نے پلٹ کر جواب دیا درست، لیکن یہ ملیح آباد کے پٹھانوں کی بھی نہیں ہے۔

ظفر علی خان انقلاب کے مدیر تھے۔ بڑے بذلہ سنج اور معرکہ آرا شاعر تھے۔ ان کے کلام میں کہیں تعقید نظر آ گئی تو اختر نے پوری غزل اسی رنگ میں کہہ ڈالی، ملاحظہ ہو۔

پھر ظفر کے بعد گائے ایسے ڈھوے کون گا
پھر سنائے ٹھمریاں تیے جو بوے کون گا
امت۔۔۔ مرحوم کی جیبیں ٹٹولے کون گا
بھر کے لے جائے یونہیں چندے کے جھولے کون گا

تو، جو مجھ پر کر رہا ہے بے خبر مشق کلوخ
جن کے تیرے واسطے لائے غلولے کون گا

ہے شب وعدہ ادھر مجھ پر ہے غلبہ نیند کا
وہ اگر آئے تو پھر دروازہ کھولے کون گا

دوزخی صاحب بھی ساحل سے چمٹ بیٹھے اگر
عشق کے طوفان میں کھائے جھکولے کون گا

عرش نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ قاضی فضل الحق گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ انھیں خان صاحب کا خطاب ملا۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم لکچرار تھے۔ صوفی صاحب نے اس موقع پر ایک فارسی نظم "نظر گرداں"، "اثر گرداں" کی زمین میں سنائی۔ جونہی صوفی صاحب نے نظم ختم کی اختر نے (فی البدیہہ) یہ دعائیہ شعر پڑھا۔

قاضی مارا خاں بہادر کن صوفی را لکچرار تر گرداں

سرور صاحب کا قول ہے۔ "جب اختر ریٹائر ہو گئے تو مالی حالت اور خراب ہو گئی۔۔ بہت دنوں سے انھیں انجمن میں بلانے کا خیال تھا۔ جوش اور آزاد کو لکھا۔ تیار ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں جوش ملسیانی کے اعزاز میں جلسہ تھا۔ اس میں بڑی محبت سے ملے۔ تقریر بھی کی اور کلام بھی سنایا۔ پھر جلد علی گڑھ آنے کا وعدہ کیا۔ بعد میں خط آیا۔ مالیر کوٹلے مشاعرے میں گیا تھا۔ بیمار ہو گیا ہوں۔ نمونیا کا اثر تھا۔ مگر نمونیا میرا کیا کر لیتی۔ چناں چہ اچھا ہو رہا ہوں۔ چند روز کے بعد آؤں گا۔" لیکن اس چند روز میں موت کی نیند آ گئی۔

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

□□

حواشی

۱؎ واقعی کچھ نہیں ہوتا۔ غالب جیسے شاعر کو بھی یہ کہنا پڑا تھا۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

۲؎ اگر "پارس" اخبار کا فائل ہاتھ آئے تو اس میں یقیناً اختر کا کلام نظم و نثر وافر مقدار میں مل سکتا ہے۔

۳؎ عرش ملسیانی نے ایک واقعہ بیان کیا۔ ایک دن اختر ان کے پاس گئے اور کہا ایک سو روپیا نکالو۔ عرش نے انھیں سمجھانا چاہا کہ وہ فضول خرچی سے باز آئیں اور پوچھا ایسی کیا ضرورت پڑ گئی کہ تم سو روپے مانگنے آئے ہو۔ اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ اختر کچھ مایوس، کچھ دکھی ہو گئے اور جیب سے چار سو روپے نکال کر رکھ دیے۔ تم اس میں سے لے لو۔ عرش نے پوچھا کہ تمہارے پاس جب چار سو روپے موجود ہیں تو سو روپے اور کیوں مانگتے ہو؟ معلوم ہوا کسی دوست کو پانچ سو روپے درکار تھے۔ اختر کے پاس صرف چار سو تھے اس لیے سو روپیا قرض مانگنے گئے تھے۔

۴؎ وہی ہے اپنی رندی اور وہی واعظ کی فہمائش
بری عادت کوئی بھی ہو بہ آسانی نہیں جاتی۔

۵؎ ان کی شرافت کا صلہ انھیں سرکار نے یہ دیا کہ انفارمیشن افسر سے انھیں "تنزلی" دے کر اسسٹنٹ انفارمیشن افسر بنا دیا۔

غزلیں

عجب تھی بے دلی کل شب میں ہر امکاں کے آگے تھا
کبھی پیدا کے آگے تھا کبھی پنہاں کے آگے تھا

سبک سیری مری بے تابیوں پر دھار رکھتی تھی
کہ مشکل راہ میں تھی اور وہ آساں کے آگے تھا

کبھی بے خواب ہو جانا، کبھی پہلے سے سو جانا
بُتوں کا تذکرہ اکثر مرے ایماں کے آگے تھا

مرے اطراف ایسی بے حسابی تھی چم و خم کی
غزالاں میرے پیچھے تھے میں خوش چشماں کے آگے تھا

میں اس کے اور اپنے بیچ اب سکّہ اُچھالوں گا
ہوا کے ساتھ سب تھے اور میں طوفاں کے آگے تھا

میں بازاروں میں بے دام و درم بکتا رہا اکثر
عجب قلّت تھی اشیاء کی میں ہر ارزاں کے آگے تھا

مری آنکھوں کا روشن رنگِ بے تابی نہیں جاتا
میں خاکستر تھا لیکن جلوۂ جاناں کے آگے تھا

یہ جگنو دیکھنا ہے اب چمکتے ہیں کہ بجھتے ہیں
مرا فرمان بھی جاری درِ سلطاں کے آگے تھا

سید ابوالحسنات حقی
۹۵/۵۳ خانقاہ شریف، بیگم گنج، کان پور

ہوتے ہی شام گھر میں کھنڈر بولنے لگا
ہر سمت اک عجیب سا ڈر بولنے لگا

ہے یہ بھی کیا عذاب کہ تنہا جہاں ہوئے
خاموشیوں کے شور سے گھر بولنے لگا

وحشت نے اپنے ہونٹ ذرا وا کیے ہی تھے
دیوارِ شش جہات میں در بولنے لگا

معنی کے در کھلے کہ ہوا بابِ لفظ بند
طائر جو چپ ہوئے تو شجر بولنے لگا

چٹکی نہ تھی کلی کہ دھنک جیسے کھل گئی
وہ لب ہلے نہ تھے کہ اثر بولنے لگا

عرفی میں شہرِ سنگ کی آوازِ بازگشت
خاموش اِدھر ہوا کہ اُدھر بولنے لگا

عرفی آفاقی
۱۲/۳۵۹، اندرا نگر، لکھنؤ
۲۲۶۰۱۶

عشرت علی صدیقی
۱۹۳۔ زنہور خانہ، کینٹ روڈ
لکھنؤ

جواہر لال نہرو اور صحافت

پنڈت جواہر لال نہرو نے قومی اور بین اقوامی سیاست میں اعلیٰ مرتبہ پایا مگر انھوں نے ادب کے میدان میں بھی لوہا منوایا۔ تاریخ ان کا خاص موضوع تھا اور ان کی خود نوشت سوانح حیات، ان کی کتابیں خاص طور پر 'تلاشِ ہند'، 'بیٹی کے نام باپ کے خطوط' اور 'تاریخ عالم کی جھلکیاں' اس میدان میں ان کی پیش رفت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ اس سے ملا ہوا میدان صحافت کا ہے۔ صحافی ماضی قریب اور ماضی بعید کی روشنی میں حال کو دیکھتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے اور مستقبل کی بابت رائے مشورہ دیتا ہے۔ اس طرح وہ سیاست میں براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ حصہ لیتا ہے۔ جواہر لال نہرو کا تعلق سیاست سے براہ راست اور صحافت سے بالواسطہ تھا۔ وہ انگریزی، ہندی اور اُردو کے تین اخبار نکالنے والی ایک لمیٹڈ کمپنی کے بنانے والوں میں شامل اور نو دس برس تک اس کے چیرمین رہے۔ اس سے پہلے بھی اخباروں اور رسالوں میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ کبھی اصلی نام سے، کبھی فرضی نام سے۔ جس طرح کی تعلیم انھوں نے پائی تھی، اس کی وجہ سے انگریزی زبان پر انھیں خاصی قدرت حاصل تھی۔ کلکتہ کے ایک معروف انگریزی ماہنامے میں انھوں نے ملک کی آزادی سے کئی برس پہلے ایک مضمون فرضی نام سے لکھا تھا جس میں انھوں نے اپنا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا، اپنے مزاج میں ڈکٹیٹرشپ کے جراثیم کی نشان دہی کی تھی۔ ان جراثیم کے ممکنہ اثرات سے بحث کی تھی اور ان کو دبائے رکھنے والے جمہوریت پسندی کے طاقت ور عناصر کی بہتات اور طاقت کا ذکر کیا تھا۔ سیاست اور حکومت میں ان کا جو کردار ابھرا اس میں یہ دونوں پہلو وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتے رہے آخر میں جمہوریت پسندی غالب آئی اور آزاد ہندستان کا آئین اور اس کی پارلیمنٹ کی کارکردگی جمہوریت کی پختگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

رپورٹنگ

نہرو کی کمپنی کے اخباروں نے آزادی کے حصول اور جمہوریت کے استحکام میں حصہ لیا اور ان اخباروں کو چلانے میں جواہر لال نہرو دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح شریک رہے ہیں۔ انھیں اخباروں میں سے ایک میں، میں تقریباً پچاس برس تک کام کرتا رہا اور ان اخباروں سے، اور صحافت کی اہمیت اور افادیت سے، اور صحافت کی صحت مند ترقی سے نہرو کی دل چسپی کا چشم دید گواہ ہوں۔ اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے یہ دل چسپی قائم رکھی۔ اور یہ صرف اخبار پڑھنے تک ہی محدود نہیں تھی وہ اخبار میں لکھتے بھی تھے۔ انفرادی ستیہ گرہ کے زمانے میں جو آزادی کی لڑائی کے فیصلہ کن معرکے کی تمہید تھی، ایک روز جواہر لال نہرو اودھ کے پانچ ضلعوں کا دورہ کر کے رات میں گیارہ بجے کے قریب دفتر آ گئے، اور اپنے دورے کی خبر خود ہی لکھ دی۔ مختلف جلسوں میں انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا جامع خلاصہ بڑی خوبصورتی سے بیان کر دیا۔ اس بیان میں خود ستائی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ تعریفی کلمات تمام تر سامعین کے لیے استعمال کیے گئے، جو زیادہ تر کسان تھے۔ نہرو کی رپورٹ میں اودھ کے دیہات کی جان دار منظر کشی تھی اور ان کی تقریروں سے سننے والوں کے چہروں پر جو تاثر تھا اس کا بیان تھا، اس وقت کی زبوں حالی کا حقیقت پسندانہ تذکرہ تھا اور مستقبل کے ہندستان کی امید بھری تصویر تھی۔

بنیادی اصول

جس کمپنی کے وہ چیرمین تھے، اس کے اخبار میں جیسے ہندستان کے اندر ہی نہیں، ہندستان کے باہر بھی عام طور پر لوگ نہرو کا اخبار

کہتے اور سمجھتے تھے۔ جواہر لال نہرو کبھی کبھی قومی اور بین الاقوامی معاملات، مسائل اور واقعات پر اپنے نام سے مضمون لکھتے تھے اور بعض اوقات ایڈیٹوریل (اداریہ) بھی انھیں کا ہوتا تھا مگر اس میں ان کا نام نہیں رہتا تھا یہ اخبار جب جاری ہوا اس وقت نہرو ہنگری کی راجدھانی بوڈاپیسٹ میں تھے وہاں سے انھوں نے پرچے کے لیے ایک مضمون بھیجا۔ اس میں صحافت کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"ہم ناحق بات سے اپنے حق کو تقویت نہیں پہنچا سکتے۔ ہم خبروں کو دبا کر اور اس طرح جنتا کو صحیح رائے قائم کرنے کے حق سے محروم کرکے اس کی سیوا نہیں کرسکتے۔ ہم فسطائیت کے طریقے اختیار کرکے جمہوریت کو پروان نہیں چڑھا سکتے۔ ہم خبروں کو توڑ مروڑ کر اور دبا چھپا کر صحافت کے تقاضے اور نصب العین کے پابند نہیں رہ سکتے ...

مجھے بھروسہ ہے کہ یہ پرچہ اپنے نصب العین پر قائم رہے گا اور اس میں کسی کے متعلق کینہ وری یا بدخواہی کی بات نہیں لکھی جائے گی۔ میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ یہ اخبار ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے گا جو اس سے اختلاف کریں اور ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے گا۔"

مضمون نگاری

دوسری جنگ عظیم کے بعد یکم جولائی ۱۹۴۶ء کو جواہر لال نہرو دفتر آئے۔ کرشنا مینن جو یورپ میں ایک طرح سے ہندوستان کی تحریک آزادی کے سفیر تھے، ان کے ساتھ تھے۔ کئی گھنٹے تک دونوں آدمی دفتر میں رہے اور اسٹاف سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے، مشورہ دیتے رہے۔ اسی دوران ایک خبررساں ایجنسی کے نمائندے نے، جو وہاں آگیا تھا، ان سے بحرالکاہل کے جزیرے بکنی میں ہونے والے ایٹم بم کے تجربے کی بابت بیان دینے کو کہا نہرو نے اس نمائندے کو تو کوئی جواب نہیں دیا مگر ایڈیٹر سے کہا کہ وہ اخبار کے لیے مضمون لکھیں گے۔ شام کو دوبارہ آئے، ایڈیٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے، کاغذ مانگا اور کوئی دو فل اسکیپ صفحوں پر قلم برداشتہ مضمون لکھ دیا۔ عنوان تھا: THE DEATH DEALER (موت کا سوداگر)۔ میں نے ان کا لکھا ہوا مسودہ دیکھا ہے۔ خط صاف اور پختہ ہے۔ نظر ثانی کا کوئی نشان نہیں ہے صرف دو یا تین جگہ لکھتے ہی وقت دو تین لفظ کاٹ کر ان کے آگے اسی مفہوم کے لیے دوسرے لفظ لکھے ہوئے ہیں۔ مضمون میں حال کا ایسا بیان اور مستقبل کے متعلق ایسی آگاہی ہے جس کی حقیقت پسندی روز بروز زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جارہی ہے۔ یہ انداز بیان نہرو کے صاف ذہن کا کمال اور ان کی امن پسندی اور انسانیت دوستی کا اظہار ہے۔ انھوں نے نہ صرف ایٹم بم کے تجربے کو بلکہ اس کی دھوم دھڑکے والی تشہیر کو بھی ناپسند قرار دیا ـــــ

..."خاص کر ایسے وقت کہ جب دنیا اس منزل مقصود کے قریب پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس کا وہ صدیوں سے خواب دیکھتی رہی ہے ـ یعنی تمام قوموں کے آپس میں تعاون اور باہمی امن۔ یہ چیزیں ہماری دسترس کے اندر آگئی تھیں لیکن شاید قدرت کو انسان کی اس ترقی پر رشک آیا اور اس نے اسے پاگل کردیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آیا مستقبل قریب میں انسان اسی پاگل پن اور ہلاکت میں مبتلا رہے گا یا کوئی بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔ پھر بھی اتنا تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ایٹم بم کا راستہ امن اور آزادی کا راستہ نہیں ہے۔"

یہ بات آج وہ طاقتیں بھی مانتی ہیں جنھوں نے ایٹم بم بنایا اور استعمال کیا اور وہ بھی جو ایسے اسلحہ بنانے کی کوشش کررہی ہیں۔ اس سلسلے میں نت نئے تجربے بھی ہورہے ہیں۔ گویا اہل خرد بھی دیوانے پن کے کام کرتے ہیں، البتہ نہرو کا ہندستان ابھی تک اپنی بات پر قائم ہے۔

جنگ کے بادل جس طرح اور جس طرف سے امنڈ رہے تھے اس کو نہرو کی دوربین نگاہوں نے بہت پہلے سے تاڑ لیا تھا۔ جلسۂ عام کی تقریروں کے علاوہ اخباری تحریروں، ایڈیٹوریل اور مضامین کے ذریعہ بھی انھوں نے حالات کا حقیقت پسندانہ، عالمانہ اور عام فہم انداز میں تجزیہ کیا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۹ء کے ایک ایڈیٹوریل میں انھوں نے جنگ چھڑنے کے امکان کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

"چیکوسلاواکیہ دنیا کے نقشے سے غائب ہوگیا۔ گڈ فرائڈے کے دن البانیہ کو بے عزت کیا گیا۔ مگر جنگ نہیں ہوئی، البتہ

جنگ کی تیاریاں جاری ہیں۔"

اس پس منظر میں نہرو نے ملک کے اندر برطانی حکومت کی استبدادی کارروائیوں اور مزید سخت گیر اقدامات کی تیاریوں، اپنی جماعت کی اندرونی کش مکش، ملک کے فرقہ وارانہ مسئلے یہاں تک کہ شیعہ سنی قضیے کا بھی ذکر کیا۔ دو دن بعد انھوں نے پھر واقعات کے بہاؤ پر تشویش کا اظہار کیا اور لکھا کہ:

"اگر جنگ چھڑ گئی تو ہمارے تمام چھوٹے موٹے جھگڑے اور مسئلے اس بڑے بحران سے دب جائیں گے، ہندستان زبردست ترین آزمائش سے دوچار ہوگا۔ ہمیں اس آزمائش کے لیے تیاری کر لینا چاہیے۔"

اسی مضمون میں، جو اداریہ کی جگہ شائع ہوا، نہرو نے ہٹلر کے لیے امریکا کے صدر روزویلٹ کی للکار کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ اس کی وجہ سے ممکن ہے، جنگ وقتی طور پر ٹل جائے لیکن ——

"اگر یہی رویہ انگلینڈ، فرانس اور سوویت روس کو ساتھ لے کر آٹھ مہینے پہلے اختیار کیا جاتا تو جنگ کا جو امکان اس وقت دکھائی دے رہا ہے وہ ختم ہو جاتا اور چیکوسلاوکیہ اور اسپین کو بچا لیا جاتا، لیکن مسٹر چیمبرلین[1] منھ بھرائی کی پالیسی پر جمے ہوئے تھے اور آج ہم اسی پالیسی کے نتائج سے دوچار ہیں۔"

منھ بھرائی سے نقصان

برطانیہ کی اس خطرناک پالیسی کا تجزیہ کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے لکھا کہ:

"آج دنیا میں تین طاقتیں ہیں، ایک طرف نازی جرمنی ہے اور دوسری طرف امریکا اور سوویت روس، باقی طاقتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں کوئی دم نہیں ہے۔ چیمبرلین جانتے تھے کہ کسی بڑے معاملے میں انگلینڈ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا اسے کسی نہ کسی طرف جھکنا تھا اور چیمبرلین نے اسے نازی جرمنی کی طرف جھکا دیا، کیونکہ وہ روس کو قابل نفرت سمجھتے تھے اور امریکا کے لیے ان کی ساری نرم گفتاری اور نیک کلمات کے باوجود وہ امریکی جمہوریت کو پسند نہیں کرتے تھے متبادل راستہ صرف اجتماعی سلامتی کا تھا جس میں روس بھی شریک ہو...... یہ صحیح ہے کہ نازیت اور فسطائیت کے خلاف جنگ، خاص کر ایسی جنگ سے، جس میں سوویت روس بھی شریک ہو، طاقتور قوتیں جنم لیں گی جن کو مسٹر چیمبرلین دبا نہیں سکیں گے...... ہم ہندستانیوں کا راستہ صاف ہے ہم فاشسٹوں کے سرتاسر خلاف ہیں۔ ہم سامراج واد کے بھی مخالف ہیں۔ ہم چیمبرلین واد کے جھنڈے تلے نہیں کھڑے ہوں گے۔ ہم اپنے وسائل سلطنت کے دفاع پر نہیں لگائیں گے۔ لیکن انھیں وسائل کو جمہوریت، آزاد ہندستان کی جمہوریت کے دفاع پر بہ خوشی لگا دیں گے اور یہی ہندستان دوسرے آزاد ملکوں کے شانہ بشانہ کھڑا ہو جائے گا۔"

سنسر شپ کی ہتھکڑی

جمہوریت کا دفاع امن و جنگ میں، قومی اور بین اقوامی معاملات میں اور سیاست کی طرح صحافت میں بھی جواہر لال نہرو کے عقیدے اور عمل کا ایک بنیادی جز تھا۔ سنسر شپ کے معاملے میں جو جنگ کے دوران کسی حد تک ناگزیر ہو جاتی ہے تاکہ جنگی حکمت عملی، فوجوں کے نقل و حمل اور تعیناتی، اسلحہ کی تفصیل اور اسی طرح کی دوسری باتیں جن کا تعلق دفاع سے ہو، دشمن کو معلوم نہ ہونے پائیں، لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندستان میں برطانوی حکومت نے اخباروں پر جو سنسر شپ لگائی اس کے دائرے میں حکومت کی کسی بھی کارروائی پر کی جانے والی نکتہ چینی اور ہر وہ بات آ سکتی تھی جو سرکاری افسروں کو ناپسند ہو یا جس سے ان کے غلط رویے کی قلعی کھلتی ہو۔ جواہر لال نہرو ایسی مکمل زبان بندی کو جمہوریت کے منافی سمجھتے تھے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ایک مضمون میں انھوں نے لکھا کہ انگلستان میں اخباروں پر اس طرح کی پابندی اور حکومت کی ایسی رازداری کے خلاف عوامی احتجاج نے حکومت کو سنسر شپ کی گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور

[1] اُس وقت (۱۹۳۹ء) کے برطانی وزیر اعظم

کر دیا۔ اس کے برخلاف فرانس میں جہاں خبروں اور تبصروں کو دبایا گیا، عوام اور حکومت دونوں اندھیرے میں رہے، ہر طرح کی افواہیں اڑتی رہیں۔ لوگوں میں نفسیاتی اور اعصابی تناؤ بڑھتا رہا، اور جب حقیقت کا دھچکا لگا تو پوری عوام حیرت انگیز طور پر بیٹھ گئی۔

ہندستان میں نافذ کیے جانے والے سنسر شپ کے ضابطے کا ذکر کرتے ہوئے نہرو نے لکھا کہ،

" جنگ سے متعلق خبروں کی حد تک تو اسے قبول کرلیا گیا ہے لیکن اب اچانک اس کے دائرے میں ونوبا بھاوے کی ستیہ گرہ اور اس سے متعلق ساری باتیں شامل کرلی گئی ہیں اور ان سب خبروں کو سنسر سے پاس کرانا ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اس طرح سنسر شپ کا دائرہ وہاں تک پھیلا دیا گیا ہے جہاں تک انسان کا تخیل جا سکتا ہے۔ اس طرح تمام خبروں اور رایوں کا آزادانہ اظہار بند ہو جائے گا۔ یہ صورت حال صحافیوں اور خبریں فراہم کرنے والوں کے لیے بہت ہی سنگین ہے۔ اس طرح اخبار حکومت کی بولی بولنے لگیں گے۔ لیکن جنتا سے ہمارا قریبی تعلق ہے اور ہم جنتا کو دھوکے میں رکھنے کا وسیلہ نہیں بن سکتے۔ عام طور پر اخبار جو خبر دیتا ہے اس کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن اب جو خبریں شائع ہوں گی ان کے لیے ہم بالکل ذمہ دار نہیں ہوں گے اس لیے کہ وہ سنسر کی چھلنی سے چھن کر آئی ہوں گی، لیکن جنتا یہی سمجھے گی کہ یہ خبریں ویسی ہی ہیں جیسی ہم عام حالات میں دیتے ہیں اور وہ ان ہی خبروں کو صحیح باور کرلے گی۔ ہم کو سنسر کی موجودگی عوام سے بھی چھپائے رکھنے کی ہدایت کردی گئی ہے۔ لیکن جنتا کو اس صورت حال سے آگاہ کردینا ضروری ہے تاکہ وہ یہ سمجھ لے کہ جو خبر ہم دے رہے ہیں وہ مکمل ہے یا اس میں کسی واقعے کو صحیح ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ جنتا کی طرف سے جو فرض ہم پر عائد ہوتا ہے اسے انجام دینے کی ہم امکان بھر پوری کوشش کریں گے۔ لیکن ہمارے ہاتھ پیر سنسر شپ کی ہتھکڑی اور بیڑی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جنتا اس بات کو یاد رکھے۔"

آداب و اخلاقیات

اس مضمون میں 'ہم' کی ضمیر استعمال کرکے جواہر لال نہرو نے خود کو شعوری یا غیر شعوری طور پر صحافیوں کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ اخبار سے ان کے قریبی تعلق اور صحافت کے آداب و اخلاقیات سے ان کی واقفیت کا پتہ اس مراسلت اور ان مذاکرات سے بھی چلتا ہے جو وہ مختلف معاملات پر ایڈیٹر اور ایڈیٹوریل اسٹاف سے کرتے رہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مین پوری میونسپل بورڈ کے چیرمین سے متعلق کوئی خبر وہاں کے نامہ نگار نے بھیجی اور اس خبر کی اشاعت کے بعد چیرمین کے وکیل نے ازالہ حیثیت عرفی کا نوٹس دے دیا۔ ایڈیٹر نے اس معاملہ میں اپنی کمپنی کے چیرمین سے رجوع کیا۔ نہرو نے جواب دیا کہ خبر کی اشاعت میں واقعی پوری احتیاط نہیں برتی گئی۔ بغیر تحقیق کے کسی پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہیے۔ خبر میں "مبینہ" یا اسی طرح کا کوئی لفظ رکھ دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ نوٹس میں وکیل کا لہجہ کیسا ہی ہو اس کے جواب میں آپ کا لہجہ نرم ہی رہنا چاہیے۔ آپ نرم انداز میں لکھ دیں کہ ہم تردید چھاپنے کو تیار ہیں مگر نامہ نگار کا نام نہیں بتائیں گے۔ نام بتانا اخبار نویسی کے آداب اور اخلاقیات کے منافی ہے۔ اگر پھر بھی مقدمہ چلے تو لڑ لیجیے گا۔ اس اثنا میں نامہ نگار کو لکھ دیا جائے کہ عدالت میں وہ اپنا نام چھپا نہیں سکے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اقبال کرلے اور اپنا نام ظاہر کردے۔ مگر اقبال اور انکشاف نامہ نگار ہی کی طرف سے ہو نہ کہ آپ کی طرف سے۔ اور اس اثنا میں نامہ نگار اپنی صفائی اور اپنے لگائے ہوئے الزامات کے ثبوت میں شہادتیں خاموشی سے اکٹھی کرتا رہے۔

صحافت سے نہرو کے اس قریبی تعلق اور گہری دلچسپی نے ان کو اس صف میں شامل کردیا تھا، جس میں بال گنگا دھر تلک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ایسے ہی دوسرے سیاسی رہنما پہلے شامل رہ چکے تھے۔ ان حضرات نے سیاست اور صحافت دونوں میدانوں میں اپنے جوہر دکھلائے۔ اس طرح جب ستمبر ۱۹۵۲ء میں جواہر لال نہرو کو آل انڈیا نیوز ایڈیٹرس کانفرنس میں مدعو کیا گیا تو وہاں وہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ آپ لوگوں کے بیچ آکر میں محسوس کرتا ہوں کہ گویا اپنے گھر میں آگیا ہوں، نہ صرف اس لیے کہ آپ میں سے بہت سے لوگ میرے دوست ہیں بلکہ اس بنا پر کہ اکثر اوقات میں اخباری دنیا کی سرحد کے اندر تک پہنچ گیا ہوں اور کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں کہ میں بھی کسی حد تک اپنے کو صحافی

کہہ سکتا ہوں۔ اپنی تقریر میں انھوں نے برادری کے بزرگ فرد کے لہجے میں ایسی بات کہی جو صحافی برادری کی نئی نسل کو شاید کچھ عجیب سی معلوم ہو۔ نہرو نے اخباروں میں کامکس کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی ان کو دیکھتا ہوں اور دوسروں کی طرح ہنس لیتا ہوں۔ لیکن پھر رنجیدہ بھی ہو جاتا ہوں، اس لیے کہ یہ باہر سے آئی ہوئی نئی چیز ہے۔ اخبار کامکس کو حاصل کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم خرچ کر دیتے ہیں لیکن میرا بس چلے تو میں ان سے بچنے کے لیے رقم خرچ کر دوں۔ انھیں اعتراض اس بات پر تھا کہ جن کامکس کا چلن اس وقت بڑھ رہا تھا ان سے غلط قسم کی تعلیم ملتی تھی۔ لیکن نہرو کی تقریر میں زیادہ تر زور اس مسئلے پر دیا گیا جو آج بھی اخباری دنیا اور صحافتی دنیا میں بحث مباحثے اور غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے — یعنی پریس کی آزادی اور اس کا ضابطۂ اطوار۔

پریس کی آزادی

انھوں نے کہا کہ سیاست کاروں اور اخبار نویسوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں بہت زیادہ بولتے ہیں اور بہت زیادہ لکھتے بھی ہیں۔ دونوں کا انداز واعظانہ ہوتا ہے اور عام طور پر دونوں کو کسی لیاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا مطلب ہے کہ طب، انجینیرنگ یا کسی دوسرے پیشے کے لیے آدمی کو لمبی ٹریننگ لینی پڑتی ہے۔ ڈگری یا ڈپلوما حاصل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سیاست کار اور اخبار نویس بننے کے لیے ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص بات کہنے کا ڈھنگ جانتا ہے تو اس کا کام چل سکتا ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس کی بات میں کوئی جان ہے یا نہیں۔ دراصل بعض اوقات اس کا کاروبار صرف اس لیے چل نکلتا ہے کہ اس کو گالی دینے کا ہنر آتا ہے، اُسی طرح جس طرح کچھ لوگوں کو روپیہ کمانے کا ہنر آتا ہے۔

پریس اور پیسے کے تعلق کی روشنی میں پریس کی آزادی کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے نہرو نے اس حقیقت کی نشان دہی کی کہ:

"پریس کی آزادی کا مطلب لکھنے والے کی آزادی نہیں ہے کہ وہ جو چاہے لکھے، بلکہ اخبار کے مالک کی آزادی ہے کہ وہ جو چاہے لکھوائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص کثیر سرمایہ رکھتا ہے اس کا کلچرل معیار اور ادبی معیار یا کوئی اور معیار بھی اتنا ہی اعلا و ارفع ہو۔ اس لیے پریس کی آزادی کا مطلب ان لوگوں کی آزادی بھی ہو سکتا ہے جو روپیہ کمانے کا فن جانتے ہیں اور اس میں شرافت کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اصول کی آڑ

نہرو نے کانفرنس میں موجود سینیر صحافیوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ اگر ایک آدمی ایک کاغذ پر کوئی عبارت چھاپنے لگے تو کیا اسے پریس کی آزادی کے اعلا اصول کی آڑ میں ہر قسم کی غلط سلط بات کہنے اور کرنے کی آزادی حاصل ہونا چاہیے؟ فرض کیجیے کہ ایک بدمعاش اخبار کے ذریعے کھلم کھلا نہ سہی، شاطرانہ انداز اور اشاروں کنایوں میں بدمعاشی کا پرچار کرنے لگے۔ ایسی حالت میں پریس کی آزادی کا مطلب ہوگا بدمعاشی کا پرچار، اور دوسروں کے ساتھ نفرت کا پرچار جس کا چلن بہت سے ملکوں میں عام ہے۔ اگر آپ کے دماغ میں نفرت بھری ہے تو شاید اسے پالنے بڑھانے سے بہتر ہے کہ اسے ظاہر کر دیا جائے لیکن کچے دماغ کے لوگوں میں آئے دن اس نفرت کا پرچار ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

جمہوریت کی کسوٹی

پریس کی آزادی کے مسئلے کو جمہوریت کی کسوٹی پر کستے ہوئے نہرو نے کہا کہ جو لوگ جمہوریت پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ تھوڑی بہت غلط بات بھی برداشت کر سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ اس کو دبا دیں کیوں کہ اگر آپ کوئی غلط قسم کی چیز دبانے کی کوشش کریں تو ہو سکتا ہے کہ صحیح قسم کی چیز بھی دب جائے، اور صحیح قسم کی چیز کو دبانا صحیح نہیں ہوگا۔ غلط بات کسی حد تک اس وجہ سے برداشت کر لی جاتی ہے کہ آخرکار صحیح بات اس پر غالب آجائے گی۔ غلط رجحان اور بازاری پن کا مقابلہ صحیح رجحان سے کیا جا سکتا ہے۔

ایڈیٹر کی بپتا

غلط رجحان کو رد کرنے، صحیح رجحان کو آگے بڑھانے اور اوپر سے لادے جانے والے ضابطے سے بچنے کے لیے صحافیوں کو اپنا ضابطۂ اطوار اپنی انجمنوں کے ذریعہ مرتب اور نافذ کرنے کی دعوت دی، مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ سچی کہانی بھی سنائی کہ ایک روز پریس کانفرنس میں ان کے

کچھ کہہ دینے کے بعد دہلی کے ایک ایڈیٹر اُن سے ملنے آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ نے جو کچھ کہا وہ بجا اور درست ہے لیکن میں کروں تو کیا کروں۔ میرا آقا یعنی اخبار کا مالک مجھ سے اسی طرح لکھنے پر اصرار کرتا ہے میں ایسی بات لکھنا نہیں چاہتا، مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ملازمت سے الگ کر دیا جاؤں، اس لیے مجھے وہی کچھ لکھنا پڑتا ہے جس پر آپ اعتراض کرتے ہیں، اگرچہ مجھے بھی ایسا لکھنے پر اعتراض ہے۔

نہرو نے کہا کہ اس طرح کا اعتراف کوئی اچھی چیز نہیں ہے تاہم یہ واقعی ایک غیر معمولی صورت حال ہے کہ ایک خاصی بڑی اشاعت والے اخبار کا ایڈیٹر اس طرح مجبور کیا جائے یا سمجھے کہ ایک معمولی ذاتی قسم کے واقعے کو مبالغے کے ساتھ بیان کرنے اور وہ کچھ لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس سے دہلی میں فرقہ وارانہ فساد پھیلے۔ اس واقعے کا پبلک سے کوئی سروکار نہیں تھا اور اسے نجی طور پر یا عوامی سطح پر قانونی یا کسی اور طریقے سے حل کیا جا سکتا تھا، لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس کے ذریعے عوام کے جذبات برانگیختہ کیے جا رہے تھے۔ ایڈیٹر نے صفائی کے ساتھ یہ تسلیم کر لیا کہ اگر وہ ایسا لکھتا ہے تو اخبار کی اشاعت بڑھتی ہے۔

ایڈیٹروں کی اس انجمن کے اجلاس کو نومبر ۱۹۵۰ء میں ایک مرتبہ پھر خطاب کرتے ہوئے پریس کی آزادی کے مسئلے پر نہرو نے کہا کہ مجھے کوئی ایک بھی معاملہ ایسا یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اپنے ایڈیٹر کی آزادی میں مداخلت کی ہو۔ اگر کبھی ان کے اور میرے درمیان کسی بات پر رائے کا اختلاف ہوا تو ہم نے اس پر تبادلۂ خیال کر لیا۔ کبھی انھوں نے میری رائے سے اتفاق کر لیا اور کبھی ایسا نہیں بھی ہوا۔ تب یہ بات انھی پر چھوڑ دی گئی کہ جیسا چاہیں ویسا کریں۔ میں ایڈیٹر کی آزادی پر یقین رکھتا ہوں۔

پریس کی آزادی کو مستحکم بنانے صحافت کے معیار کو بلند کرنے اور صحافیوں کے کام کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے بھی جواہر لال نہرو نے بہت کچھ کیا۔ پہلا پریس کمیشن جس نے ان معاملات کی تحقیقات کرنے کے بعد اصلاح کے لیے متعدد سفارشیں کیں، نہرو ہی کی دین تھا۔ اس نے اور اس کے بعد دوسرے پریس کمیشن نے نہرو کے اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ پریس کو سرمایہ داروں کی گرفت سے آزاد اور اجارہ داری کی خرابیوں سے پاک رکھا جائے۔ یہ مقصد ابھی پوری طرح حاصل نہیں کیا جا سکا ہے، پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک نے ـــ

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

نہرو نے راستہ دکھا دیا ہے اور رکاوٹیں دور کرنے کا طریقہ بتا دیا ہے، اب یہ بات راہ گیروں کی قوت، صلاحیت اور محنت پر منحصر ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔

□□

رات کی مانگ سجاؤ

من کے آنگن کو سجاؤ کہ دیوالی آئی
دیپ سے دیپ جلاؤ کہ دیوالی آئی

ڈھل چکی شام، تمنّا کا سویرا مانگو
رُت نئی آئی ہے آشاؤں سے جوالا مانگو
یہ نئے دیپ ہیں اب اِن سے اُجالا مانگو
رات کی مانگ سجاؤ کہ دیوالی آئی
دیپ سے دیپ جلاؤ کہ دیوالی آئی

روشنی آئی اندھیروں کا سفر ختم ہوا
جگمگا اُٹھا ہے خوابیدہ نیا شہر وفا
تیرگی کے لیے کافی ہے بس اک چھوٹا دیا
روشنی دل میں بساؤ کہ دیوالی آئی
دیپ سے دیپ جلاؤ کہ دیوالی آئی

جگمگاتے ہوئے یہ دیپ خوشی لے آئے
ظلمتِ وقت کے اب بڑھ نہ سکیں گے سائے
حق پرستی کے، صداقت کے کنول مسکائے
لَو چراغوں کی بڑھاؤ کہ دیوالی آئی
دیپ سے دیپ جلاؤ کہ دیوالی آئی

رضا امروہوی
۲۵ اینڈ ٹی بلاک ۱۳/۱ سی
کالی باڑی مارگ نئی دہلی ۱۰

پروانہ رُدولوی
۱۶۸، ایس کے۔ وشوکرما نگر۔ جھلمل
دہلی۔ ۱۱۰۰۹۵

خواجہ حسن نظامیؒ کی تشبیہات وتمثیلات

مصوّرِ فطرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ اب ایک تاریخی چیز بن چکا ہے اور کیوں نہ بنتا؟ انھوں نے خود ہی پیش گوئی فرمائی تھی کہ "یہ روزنامچہ میرے بعد ایک تاریخی چیز بن جائے گا۔"

ان کے روزنامچہ میں تاریخ، جغرافیہ، ادب، تصوف، فلسفہ، سیاست اخلاقیات، موسمیات اور طب، الغرض ان تمام علوم کی جھلکیاں ملتی ہیں، جن کا ایک انسانی ذہن احاطہ کر سکتا ہے۔ مگر میری دل چسپی صرف ان نو بہ نو تشبیہات اور تمثیلات سے رہی ہے جن کی تخلیق خواجہ حسن نظامی نہ کرتے تو اردو ادب کا دامن بہت تنگ رہ جاتا۔ ان کے روزنامچے سے میری دل چسپی کی ایک ذاتی وجہ بھی رہی ہے وہ یہ کہ اس روزنامچہ میں کئی جگہ میرے وطن رُدولی کا ذکر آیا ہے۔

ان کی تشبیہات اور تمثیلات کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پورے منظر کا منظر نامہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس تشبیہ کو دیکھیے جس کا تعلق دربار رام پور کی شان وشوکت کے ساتھ ہی اسراف بے جا کی نشاندہی سے بھی ہے مگر خواجہ صاحب نے بالکل صوفیانہ انداز میں یہ نشاندہی کی ہے وہ آنے والی نسلوں کو ایک سبق بھی دے گئے ہیں اور نوابی مزاج کی برہمی کے اثرات سے بھی محفوظ رہے ہیں۔ وہ نواب سر رضا علی خاں مرحوم کی تاج پوشی کی تقریبات میں شرکت کے لیے اس شرط کو منوا کر گئے تھے کہ "نواب صاحب کو نذرانہ پیش کریں گے۔"

خاص باغ میں نواب صاحب سے تخلیہ میں ملاقات کا ذکر خواجہ صاحب نے جس انداز میں کیا ہے اس پر علم کلام کی کئی کتابیں نثار کی جا سکتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" میری ملاقات تخلیہ میں ہوئی، نواب صاحب ایک کمرے میں تھے جس کے صحن میں فوارے چل رہے تھے .... اور درختوں میں بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اگرچہ سورج چمک رہا تھا لیکن دھوپ میں بھی سرخ قمقموں کے اندر بجلی کی روشنی خوب بہار دے رہی تھی، درختوں کے سبز پتوں پر سُرخ قمقمے، ان کے اندر بجلی کی روشنی، اوپر سے سُورج کی کرنیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجنوں کی مطلوبہ لیلیٰ کو کسی نے کاٹ کاٹ کر درختوں سے لٹکا دیا ہے۔"

اس نئی تشبیہ کے لیے انھوں نے جو فضا تیار کی اور اس فضا کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کیا وہ واقعی انھیں کا حصّہ تھا۔ اس ایک تشبیہ یا تشبیہ کے ایک مجموعہ کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے اس دعوے کی صداقت سے کس کو انکار کی مجال ہو سکتی ہے کہ ——

"جو طریقہ مضمون کے ادا کرنے کا ہے وہ میرے لیے مخصوص ہے کوئی دوسرا اُردو نویس اس طرزِ ادا کی قدرت نہیں رکھتا۔"

میں نے تین سو سے زیادہ ایسی تشبیہات جمع کر لی ہیں جو امام المشائخ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے جدّت پسند ذہن اور قلم سے عالم وجود میں آئی ہیں اور اُردو کے علمی اور ادبی خزانہ میں شامل ہو چکی ہیں۔

موسم کے تغیر کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"چار پانچ دن سے گرمی بہت بڑھ گئی ہے۔ جنوری کے شروع میں اتنی گرمی بہت کم ہوتی تھی۔ موسم کا یہ تغیر ہندستانی جذباتِ سیاسی کے تغیرات سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہوگا۔"

موسم کے تغیر کو ہندستانی جذباتِ سیاسی کے تغیرات کے مشابہ قرار دینا بالکل نئی بات ہے۔ میں نے آج تک انگریزی اور اُردو میں اس طرح کی تشبیہ کہیں نہیں پڑھی۔

اپنے روزنامچے میں خواجہ صاحب نے ایک جگہ خود اپنے بارے میں نئی تشبیہات و تمثیلات کا کتنا خوبصورت، دل نشیں اور حقیقت پسندانہ طرز اختیار کیا ہے اور اس طرزِ ادا کے ذریعہ چار پیشوں کی کتنی صحیح تشریح کی ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"ایک شخص حسن نظامی دہلی میں گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چار پیشے ایسے ہیں کہ وہ ولی بھی بنا سکتے ہیں اور شیطان بھی — (۱) پولیس، (۲) پیر، (۳) بلیڈر، (۴) حکیم ڈاکٹر کہ اپنے فرض کو دیانت داری سے ادا کریں تو بغیر کسی اور عمل کے ولی بن جائیں، ورنہ بغیر کسی گناہ کے شیطان بن جائیں۔"

اپنے عہد کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت نے ایک جگہ صرف پانچ سطروں کے کوزے میں تشبیہات کا سمندر اس طرح بند کیا ہے:

"کوئلے بجھ گئے تھے اور کہیں آگ کی چمک دکھائی نہ دیتی تھی، مگر اس پر کچے کوئلے ڈال دیئے۔ راکھ میں دبی ہوئی کسی نامعلوم چنگاری نے اندر ہی اندر سب کوئلوں میں آگ لگا دی اور وہ بھڑک اُٹھے۔ یہ آگ خدا نے جلائی تھی، اس کو کوئی سیاست نہیں بجھا سکتی تھی۔"

ایک جگہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میرے اندر کچھ نہیں ہے، بھوک بند ہے، دل خوط میں ہے، دل کی مشین ایسے چل رہی ہے جیسے مسلمانوں کی قومی مشین۔"

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

کوئی نہ کوئی بے چینی ہر شخص کو ہوتی ہے، جب تک کہ وہ زندہ ہے۔ کیوں کہ زندگی کا دوسرا نام بے چینی ہے۔ اور تکلیف ہے۔ اور راحت ہے، رزم ہے اور بزم ہے۔"

زندگی کے تعلق سے ان کی اس نئی تشبیہ کے بعد مجھے اردو شعراء کی دی ہوئی تشبیہات مصنوعی لگتی ہیں۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: —

"بادشاہی اور بیماری یکساں ہوتی ہے۔"

خواجہ صاحب ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ ان کا علم، ان کی قوتِ عمل اور ان کی پوری زندگی تجربات کے حوالوں سے تخلیق کے تمام مراحل سے گزری تھی اس لیے ان کی تشبیہات میں ان کی حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے روزنامچے کا یہ ٹکڑا قابلِ غور ہے:

"ٹرکی سے خبر آئی ہے کہ کمال پاشا کی بے دینی کے خلاف تمام قوم بھڑک اٹھی ہے اور خلافت از سرِ نو قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہاں تک کہ کمال پاشا بھی جھک گئے ہیں مگر خلافت چار خلفاء کے بعد نہ کبھی دنیا میں ہوئی نہ آئندہ ہو سکے گی۔ یہ سب بے وقوفوں پر اقتدار جمانے کے پھندے ہوتے ہیں۔"

اپنے زمانے کے مصر کے مفتی اعظم اور ٹرکی کے شیخ الاسلام کو بھی انھوں نے اپنی نادر تشبیہات کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

مراد آباد کے مولانا محمد یعقوب (مرحوم) کے تعلق سے اپنے روزنامچے میں خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"گورا رنگ ہے، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، میانہ قد، مضبوط جسم، داڑھی صاف۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مصر کے مفتی اعظم ہیں یا ٹرکی کے شیخ الاسلام ہیں کہ وہ دونوں بھی داڑھی نہیں رکھتے۔"

کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے تشبیہ دینے کی اس خوبصورت مثال کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ انہی کے سلسلے میں آگے لکھتے ہیں:

"قدیم تہذیب کی وضع داریاں اور دوست نوازیاں رگ رگ میں موج زن ہیں، مختلف خیالات والوں کو خوش رکھ سکتے ہیں، مروّت بہت زیادہ ہے اس لحاظ سے مسلمان ہیں۔ قومی وحدت و تنظیم کے دلدادہ ہیں اس اعتبار سے ہندو ہیں، ہر وقت خوش نظر آتے ہیں اس لحاظ سے سر آغا خاں ہیں۔ مگر سر آغا خاں نے بڑھاپے میں شادی کی ہے اور یہ جوانی میں بھی رنڈوے ہیں۔"

ان تشبیہات کے ذریعہ انھوں نے ایک فرد کے حوالے سے مسلمانوں اور

ہندوؤں کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان کا اس قدر موثر اور مختصر انداز میں ذکر کسی اور کے بس کی بات نہیں ۔

مشہور ریاضی داں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کے بارے میں خواجہ صاحب علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا ہے کہ :

" گورا رنگ ہے، لمبوترا چہرہ ہے ۔ داڑھی رکھتے ہیں مگر ایسی جیسی بعض لوگ ناک کے نتھنوں کے پاس مونچھیں رکھتے ہیں ۔ آنکھیں بہت چھوٹی ہیں ..... ڈاکٹر صاحب ریاضی میں ہنستے ہیں، ریاضی میں روتے ہیں اور ریاضی میں خواب دیکھتے ہیں ۔ غرض ان کا اوڑھنا بچھونا، مرنا، جینا، ہنسنا، بولنا سب ریاضی کے اندر ہے اور وہ خود بھی ریاضی کے اندر ہیں اور کمال یہ ہے کہ ریاضی بھی ان کے اندر ہے ۔"

" ریاست " کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں خواجہ صاحب کے بے تکلف دوست تھے ۔ دونوں میں قلمی جنگیں بھی ہوتی تھیں، مگر دوستی برقرار رہتی تھی ۔ ان کے دفتر کے زینے کو خواجہ صاحب نے نئی تشبیہ دی ہے حضرت تحریر فرماتے ہیں :

" ان کا زینہ مصر کے اہرام سے بھی زیادہ اونچا معلوم ہوا ۔ اور وہ اتنا تاریک، اتنا میلا اور اتنا بدبودار معلوم ہوا کہ اگر سوراج ملنے کے بعد کسی انگریز پولیس افسر پر کانگریس مقدمہ چلائے تو اس زینے میں اس کی حوالات بنواد ے ۔ بیچارہ ۵ منٹ کے اندر ختم ہو جائے گا ۔"..

خواجہ حسن نظامی کی تشبیہات کو پیش کرنے کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں ۔ اس لیے کچھ تشبیہات بطور تبرک پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں :

" میں تو وزیر اعظم انگلستان سے اس شخص کو زیادہ سمجھتا ہوں جو ٹھنڈا اور میٹھا دہی کھانے کو دے ۔ وزیر اعظم صاحب تو محض الفاظ دیتے ہیں جو خبر نہیں کتنے بڈھے بکرے کی بوٹیاں ہیں کہ رات بھر چولھے پر پکلتے رہو، بوٹیاں گلنے کا نام نہیں لیتیں ۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :

" اگر ان کو چیر کر دیکھا جائے تو کوئی رگ، کوئی پٹھا اور کوئی ہڈی ایسی نہ ملے گی جس پر صادق و مخلص تحریر نہ ہو ۔"

پردوں والی مسہری کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے :

" ہوا بند ہو تو مسہری کے پردے قبر کا مزہ دیتے ہیں ۔"

خواجہ صاحب کے روزنامچہ سے ایک لطیفہ پیش ہے :

" ایک مولوی کی بچی ہوئی روٹیاں مسجد کے سامنے چارپائی پر سوکھ رہی تھیں، سقہ کا بیل اُدھر سے گزرا اور وہ روٹیاں کھانے لگا ۔ سقہ یہ دیکھ کر رونے لگا ۔ مولوی نے کہا، تو کیوں روتا ہے ؟ نقصان تو میری روٹیوں کا ہوا ۔ سقہ نے کہا، میں اس لیے روتا ہوں کہ میرا بیل کاہل اور بے کار ہو جائے گا ..."

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے عہد کی ایک سچائی بیان کی ہے حالانکہ اب اس میں بہت کمی آ چکی ہے مگر ان کی بیان کردہ روایات و حکایات جو سبق دیتی ہیں ان کی اہمیت سے شاید کسی کو بھی انکار نہ ہوگا ۔

غزل

شام کو اک اُداس دھوپ وادیِ دل پہ چھائے کیوں
روز افق پہ ذہن کے سورج سا ڈوب جائے کیوں

ہر اک روش پہ صبح دم کتنے گہر تھے آب دار
صحنِ چمن نے دن چڑھے موتی وہ سب گنوائے کیوں

پھول کی نودیدگی غنچے سے ہنس کے کہہ گئی
خوشبو سفر سرشت ہے مٹھی میں تیری آئے کیوں

ساحلِ دل ڈبو گئی، سارا جہاں بھگو گئی
موج تھی اک گزر گئی، اب وہ پلٹ کے آئے کیوں

ظاہراً اس کی راہ سے یوں تو گریز کر لیا
احمد حقیقتاً کہو، تم اسے بھول پائے کیوں؟

افتخار احمد
نرولی ہاؤس، خیالی گنج ۔ لکھنؤ

غزلیں

دشوار کتنی زیست کی راہِ طویل ہے
ڈوبا ہوا لہو میں ہر اک سنگِ میل ہے

ہر بات آپ کی ہے معلق فضاؤں میں
اس کا نہ ہے ثبوت، نہ اس کی دلیل ہے

تپتی ہوئی زمین ہوں میں ریگ زار کی
دریا بھی میری پیاس کے آگے قلیل ہے

کس حال میں ہے شہرِ تمنا نہ پوچھیے
ویران راستے ہیں، شکستہ فصیل ہے

اونچی انا کی اور بھی دیوار ہو گئی
اس قید سے رہائی کی اب کیا سبیل ہے

اہلِ نظر جو ہیں، یہ علی ان سے پوچھیے
چہرہ ہماری فکر کا کتنا جمیل ہے

علی احمد جلیلی

جلیل منزل، ۱/۱۸-۴۳-۲۲۰۱
سلطان پورہ
حیدر آباد - ۵۰۰۰۲۴

ہمیں رہِ حیات میں بہت سے کارواں ملے
تھکے تھکے ملے ہیں جو کبھی رواں دواں ملے

کہیں پہ راہبر ملے کہیں پہ راہ زن
نئے نئے لباس میں بہت سے مہرباں ملے

ہر ایک عزمِ نو پہ دل سہم سہم گیا کہ پھر
کہیں نصیب میں وہی نہ سعیِ رائیگاں ملے

جنھیں بھی اپنا جان کر خلوص سے لپٹ گئے
نظر ملی تو کیا کہیں کہ وہ بھی بدگماں ملے

کبھی جو انتہائے غم سے نبض ڈوبنے لگی
ہمارے چارہ گر لیے حیاتِ جاوداں ملے

کبھی جو مظہر انجمن میں تم غزل سرا ہوئے
ہر ایک دل میں تم نہاں نہاں، فغاں کناں ملے

مظہر رائے بریلوی

سپر مارکیٹ
رائے بریلی

اب نہ دستار و عمامہ نہ عبا ہے یارو
بس مرے ساتھ مری اپنی انا ہے یارو

سب کے دکھ درد کا احساس تو ہر دل کو مرے
مطمئن ہوں مری زخموں کی قبا ہے یارو

زندگی کا یہ کبھی حسن رہا ہوگا، مگر
اب کتابوں میں لکھا لفظِ وفا ہے یارو

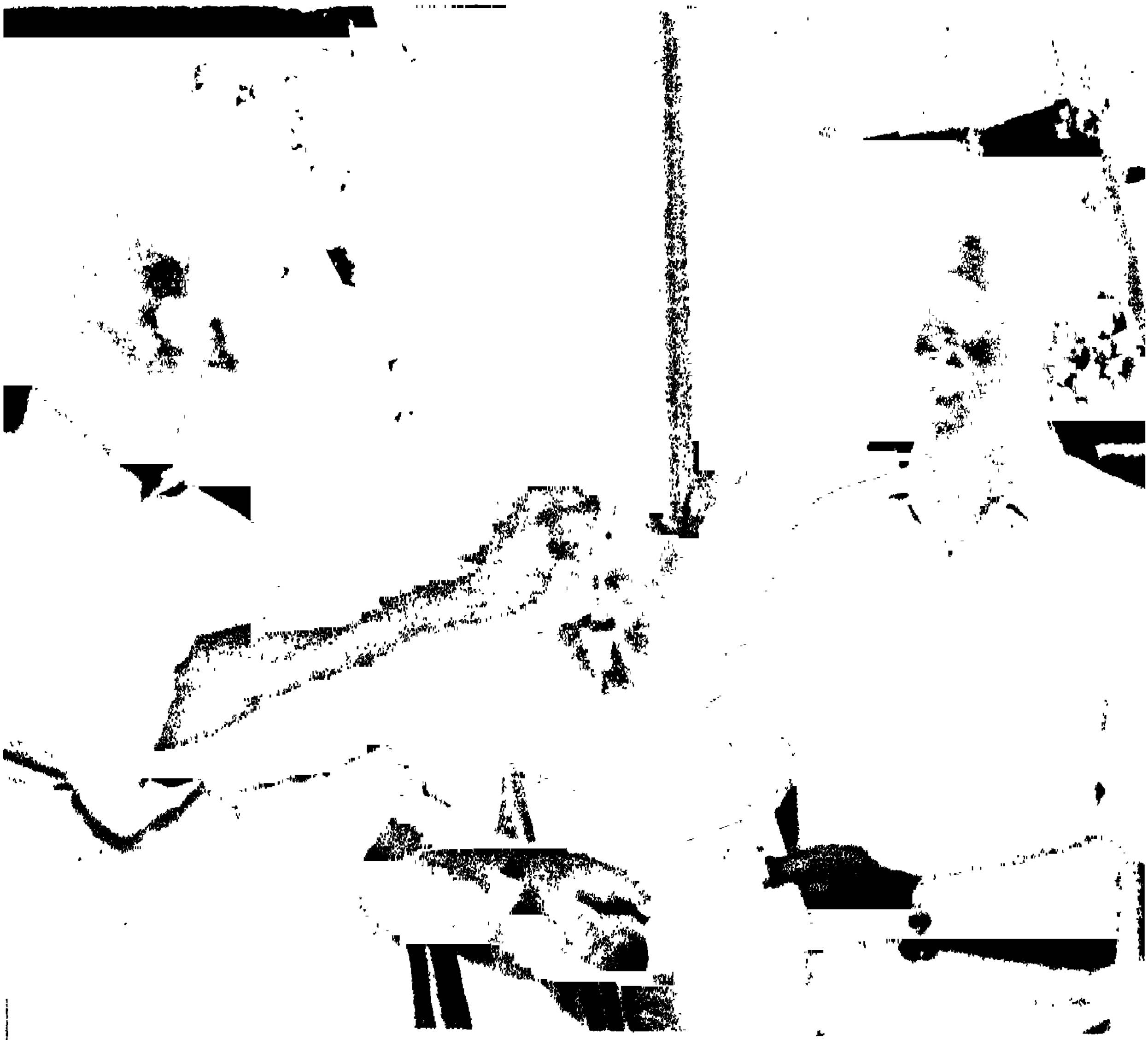
اب شرافت نہ مروّت نہ محبت نہ خلوص
اپنے بھی گاؤں میں اک شہر چھپا ہے یارو

کس کو فرصت ہے کسی اور سے پوچھے جو مزاج
اپنے بارے میں ہر اک سوچ رہا ہے یارو

مست ایوان مرا گوشہ نشینی میری
خرقہ پوشی مری غربت کی ادا ہے یارو

مست حفیظ رحمانی

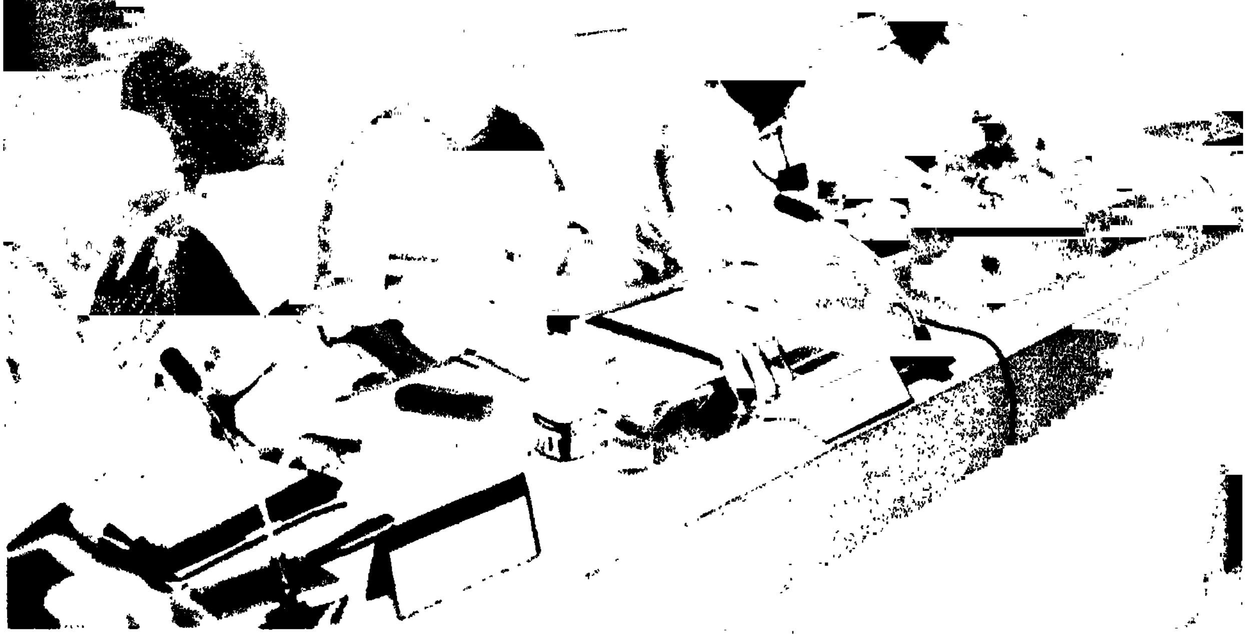
مکان نمبر ۲۹۱
پرانا سیتاپور
(یو۔پی)



وزیراعلا جناب کلیان سنگھ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو وشپ منڈل انٹر کالج بریلی میں
قرض تقسیم کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا جناب کلیان سنگھ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ریزرو بینک کے گورنر کے ساتھ
تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا جناب کلیان سنگھ ریاست کے امن و قانون کی صورت حال کا
جائزہ لیتے ہوئے



جناب کلیان سنگھ جنتا درشن کے مو … ورت
کی فریاد سنتے ہوئے۔



سید علی رضا حسینی
96/22 بجرمنڈی چوراہا، کرنیل گنج کان پور

مولانا آزاد "غبارِ خاطر" کے آئینے میں

فارسی کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے :

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

عاشق اپنے محبوب کے حُسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سر سے پیر تک ایک حُسن سراپا کا منظر ہے اور بس۔

یہ شعر محض اپنی فارسی دانی کے اظہار کے طور پر نہیں پیش کیا گیا بلکہ اس حقیقتِ حال کے بیان کے لیے کہ "غبارِ خاطر" ایک ایسا آئینہ ہے جس کا ہر جلوہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ غبارِ خاطر یوں تو ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جو قید و بند کی چار دیواری میں بیٹھ کر لکھے گئے، اور چھپنے کے بعد اپنے مکتوب الیہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی تک پہونچے۔ اس مجموعے کا حُسن صرف مکتوباتی دنیا کا حسن نہیں۔ یہ ایک جادو نگار قلم کا شاہکار ہے حسن کا جمالیاتی طرزِ نگارش سدا بہار ہے۔ فکر و فن کا یہ حسین امتزاج جو حدیث بادہ و تریاک اور داستان کوہکن و بے ستون سے ترکیب پاتا ہے، قاری پر ایک کیف و سرور کی حالت طاری کر دیتا ہے ـــــ علم و حکمت، فلسفہ و منطق، نفسیات و جمالیات سیرت و شخصیت کے حسین نقوش، تاریخی واقعات کے حسین مُرقعے فکر و فن، وسعتِ نظر، مجتہدانہ نگاہ، وسعتِ مطالعہ، مشاہدۂ فطرت کی دقیقہ سنجیاں، زبان و بیان پر قُدرت، تشبیہ و استعارات، تلمیحات ایجاز و اختصار ـــ پھر عبارت سادہ و رنگیں اور موثر، یہ ہے وہ غبارِ خاطر جو مجھے بار بار مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔

آج کی صحبت میں غبارِ خاطر کے چند فکری و جمالیاتی مرقعے پیش کیے جاتے ہیں جو اس کے ہر ورق پر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور بغیر کسی کد و کاوش کے صاحبِ نظر قاری کو مل جاتے ہیں ـــــ

موسم سرما کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد کا قلم گُل کاریاں کرنے لگتا ہے :

"جنوری آئی تو اس عالم میں آئی کہ ہر گوشہ مالن کی جھولی تھا۔ ہر تختہ گل فروش کا ہاتھ تھا۔ کوئی پھول یاقوت کا کٹورہ تھا، کوئی نیلم کی پیالی تھا۔ کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلم کاری کی گئی تھی۔ کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔ بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا کہ صناعِ قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا، صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں ؎

تکلف سے بَری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گل پہ گُل بُوٹے کہاں ہیں"

مولانا آزاد کا قلم نسیم صبح گاہی کے جھونکوں اور چائے کی لطافت، اس کے رنگ روپ، اس کا فنجان حلبی دیواروں سے چھنتا ہوا، حُسنِ محسوس کی تندی اس کی تلخی مگر اس بادہ دوشینہ کی لطافت کا احساس نسیم سحر کے جھونکوں کے بغیر ناممکن و محال۔ لیکن نگاہوں کو یہیں تک محدود کر لینا غلط ہوگا، جیسا کہ مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ غبارِ خاطر مکتوبات کا مجموعہ ہے یا آدابِ چائے نوشی پر ایک کتاب، حقیقتِ حال یہ ہے کہ مولانا کا قلم حُسن و جمال کے ہر گوشے پر اسی طرح ثمر فشاں ہوتا ہے جس طرح نسیم سحر اور چائے کی لطافت پر، لیکن مولانا کی چائے شکر، چائے اور دودھ کا توام نہیں بلکہ لطافت کا مجموعہ، یعنی "اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اتنی ہی پُر کیف .... رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے

آتشِ سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے۔ لیکن آگ کا تخیل بیرازمنی ہے، اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھئے کہ جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔ یہ ہے وہ بادۂ دوشینہ جس کا لطف صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔

"طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر این و آں سے بالکل آسودہ۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجہ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے، مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جاں فزا وقت ہو اور چین کی بہترین چائے کے پے درپے فنجان .... اصحاب نظر کا قول ہے کہ حسن اور فن کے معاملے میں حب الوطنی کے جذبہ کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی چائے کے باب میں شاہانِ ہند کا نہیں خوبان چین کا معتقد ہوں۔"

ایک اقتباس اور پیشِ خدمت ہے، جمالیات کا شہپارہ :

"کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشوں پر پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کار میں ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی ع

صبا وقت سحر بوئے ز زلف یار می آورد ..."

یہ دو اقتباسات آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ غور کیجیے کہ آپ یہاں کس ابوالکلام سے ملتے ہیں — یہ نہ الہلال والا ابوالکلام ہے نہ البلاغ والا، یہ نہ تذکرہ والا ابوالکلام ہے اور نہ ترجمان القرآن والا۔ یہاں نہ بلند بانگ خطابت ہے اور نہ علمی تبحر نہ نظریاتی استدلال ہے نہ فلسفہ نہ منطق کی موشگافیاں بلکہ یہاں ہماری ملاقات اس آزاد سے ہوتی ہے جو حسن و جمال کا شیدا ہے، جس کا قول ہے کہ متاعِ نیک جس دوکان سے ملے اسے خریدلو۔

اس آزاد کی صحیح مصوری کے لیے جگر مرادآبادی کے اس شعر کا سہارا لینا پڑتا ہے ؎

حسن جس حال میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

چاہے وہ قید خانے کی چہار دیواری ہو یا چین کی لطیف چائے، یا نسیم سحر کی دل آویزی، اس کے جھونکوں کی لطافت و دلدوزی۔ اس کا حسن، اس کا کیف، چاروں طرف صاف شفاف، دھلی فضا، خاموش منظر بولتا ہوا سناٹا، بقول میر انیس ؎

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

یہ جمالیاتی اسلوب نگارش ہر ایک کے بس کی بات نہیں، جب تک اُسے زبان و بیان پر پوری قدرت نہ حاصل ہو، مزاج میں نادرہ کاری کے جوہر نہ ہوں، جذبے کی آگ تیز نہ ہو "دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم نہ رہے" جس کی وجہ سے دن بھر اگر سوز و تپش کا کوئی سامان نہ بھی ملے تو بھی چولھے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہے۔ اس طرزِ نگارش کے لیے جس میں کیف و سرور کا ہر سامان موجود ہو اور نشاط کار کا ہر جزو مکمل ہو۔ اُردو فارسی و عربی کی حسین عبارتیں نگینے کی طرح جڑی ہوئی نظر آئیں، اس کے لیے فکرِ فلک پیما، وسعتِ مطالعہ اور مشاہدۂ فطرت کی دقیقہ سنجیوں کی ضرورت ہے۔ مولوی محمد اجمل خاں صاحب نے (جو ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور جن کی بدولت یہ شاہکار ہمارے پیش نظر ہے) اس طرزِ تحریر کو "شعر منثور" کہا ہے۔ وہ مولانا کے طرزِ تحریر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس طرزِ تحریر کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ مولانا اپنی نثری شاعری کو شعراء کی نظم کی شاعری سے مخلوط و مربوط کر کے ترتیب دیتے تھے اور یہ اختلاط اور ارتباط اس طرح وجود میں آتا تھا کہ اشعار صرف مطالب ہی کی مناسبت سے نہیں بلکہ بجائے خود مطالب کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔"

ایسا جزو کہ اگر اسے الگ کر دیجیے تو خود نفسِ مطلب کا ضروری
اور لاینفک جزو الگ ہو جائے"۔

(افسوس یہ ہے کہ فارسی تو در کنار اب اُردو تہذیب و روایات سے ہم اتنے دُور ہوتے جا رہے ہیں کہ ہماری نسلیں نا واقف ملیں گی، اسلیے اقتباسات نقل کرتے ہوئے مجھ کو عمداً اشعار کو حذف کرنا پڑا، یہ جانتے ہوئے کہ مولانا کے مافی الضمیر کو سمجھانے کے لیے نقل کردہ شعر کی تشریح ضروری ہے اور تشریح میں مضمون کی طوالت مانع راہ ہے)۔

خیر ان دونوں اقتباسات کو ذرا پھر پڑھیے اور مصنف کے نفسیاتی عمل اور ردِّ عمل کا جائزہ لیجیے ۔ ایک شخص گرفتار ہو کر جا رہا ہے مگر لطافتِ سحر اس کا "نغمۂ بیداری" ہے ۔ یہ وہ اندازِ گفتگو ہے جو جذباتیت کا مرہونِ منت نہیں بلکہ اندازِ گفتگو فکر کی ان وسعتوں سے پیدا ہوتا ہے جسے اقبال نے ع

دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

کہا ہے جس میں آفاقیت پرستی اور انانیت پسندی دونوں کی جھلک ملتی ہے

" زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی
دُنیا سے اُلٹی چال میرے حصے میں آئی جو دُنیا کے لیے
سونے کا وقت ہے وہی میرے لیے بیداری کی اصل پونجی"۔

(بیداری؟ اس لفظ کو وسعت دے کر دیکھیے ۔ بیداری فکر و نظر کی، بیداری قرطاس و قلم کی)۔

"..... میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا میں نے
دنیا کو ایسی جرأتوں کا موقع نہیں دیا"۔

مولانا آزاد کے طرزِ نگارش کا حسن ہی ان کا انانیت پسندانہ اندازِ گفتگو ہے۔ ان کی جمال پسندی ان کی اس انانیت پسندی کی دین ہے۔ اُردو ادب میں دو ایسے صاحبانِ تصنیف گزرے ہیں جن کے اندازِ نگارش کو ان کی انانیت پسندی ہی نے جمالیاتی آب و تاب عطا کی ہے ۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد ۔ مولوی محمد حسین آزاد بھی خاکہ نگاری میں جب اپنی تحقیق کے نتیجے پر پہونچتے ہیں تو اپنے مرتب کردہ نتیجے کو اتنے شد و مد سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو سوائے اسے قبول کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ مگر ان دونوں کی انانیتی روش ناگوار خاطر نہیں ہوتی کیوں کہ دونوں کا مزاج جمال پرستانہ اور دونوں کا طرزِ نگارش جمالیاتی، لیکن حسن کی مناظرہ پرستی اور مظاہر نگاری کی جو خوبصورتی مولانا آزاد کے حصے میں آئی ہے اس میں موئے قلم کی مصورانہ تراش خراش بھی شامل ہے، جس سے عبارت کا آب و رنگ اور بھی نکھر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دو تین چھوٹے چھوٹے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

" اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن
ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانہ کے باہر ہی نہیں چمکتیں،
اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیغام دیتی ہیں، صبح
جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں
چادریں پھیلانے لگتی ہے تو صرف عشرت سراؤں کے
دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے
کی لگی ہوئی دیواریں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی"۔

"... جس قید خانہ میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جس کی
راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی
چاندنی کی حسن اندوزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں
دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام
چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و عشرت کے سامانوں
سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے"۔

جمالیاتی تصویر کشی کے دو ایک نمونے اور ملاحظہ ہوں ۔ قلم کی گلکاریاں، موسم کی گلکاریوں سے زیادہ حسین، فرحت بخش، دل آویز اور کیف آور ہیں۔ موسم بہاراں کی کیفیاتِ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں جب کہ وہ سفر کر رہے تھے، مولانا رقمطراز ہیں:

" آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا، اپریل کا مہینہ تھا اور
چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں جب کہ رات کی پچھلی پہر
شروع ہونے کو ہوتی ہے تو چاند پردۂ شب ہٹا کر جھانکنے
لگتا ہے ۔ رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی
چاندنی اور اپریل کی بھیگی رات ، چاروں طرف تاج کے منارے
سر اٹھائے نظر آ رہے تھے، بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، کچھ دیر
تک فضا تھمی رہتی، گویا کان لگا کر خاموشی سُن رہی ہے، پھر

آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا ہے، چاند بڑھنے لگتا ہے، یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا ہے، ستارے دیر سے پھاڑ کر تکنے لگتے ہیں، درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ کر جھومنے لگتی ہیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے۔"

"زمستان کی برف باری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے تو فضا کا ایک ایک ذرّہ عیش و نشاط کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آئے گا..... آنکھیں کھولیے تو ہر طرف حسن کی عشوہ طرازی، کان لگائیے تو نغمہ کی جاں نوازی، سونگھیے تو سرتاپا عطر بیزی ہے۔ بادِ سحر نافہ کشا ہو، درخت سبز پوش ہوں، چڑیاں چہچہا رہی ہوں تو جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور یہ "نغمہ سرائے بہشتی" اس خود رفتگی اور محویت کے ساتھ گانے لگتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے ہیں..... شاعر پہلے مضطرب ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہ کھینچ سکے گا تو خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ دیو اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھتا ہوگا اور پھر خود آپ کو دے پڑے گا اور خود اپنی ہستی کو بھی اس کی ایک موج بنا دے گا۔ بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم"

عبارت کی یہ چستی ترکیبوں کی یہ دل آویزی، لفظوں کی یہ بست و کشاد کانوں میں رس گھول رہا ہے، آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ ہونٹ واہ واہ کے لیے بے ساختہ کھل جاتے ہیں لیکن اس حسنِ تخلیق کا سرچشمہ کہاں ہے؟ وہ ذات جس کے ذوقِ سلیم اور مذاقِ طبعی کا یہ حال ہو کہ وہ اپنے دل کو کسی حالت میں مرنے نہیں دیتا، اسے خشک مزاجی پسند نہیں۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے تو انہیں بھی ادھورا نہ چھوڑا..... یہ ہے وہ مجتہدانہ شان جس کی لطافتِ طبع کا معیار زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عماموں کو برداشت کرنے کو تیار نہیں "کیوں کہ ایک فلسفی ایک زاہد ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے"۔ اسے موسیقی اس لیے پسند ہے کہ "طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔"

کیا مندرجہ بالا اقتباسات اس بات کی غمازی نہیں کرتے کہ ایسا صاحبِ قلم اپنی لطافتِ طبع کے ساتھ اپنی تحریر کے ہر جملہ اور ہر سطر میں بولتا نظر آئے گا اس کا اندازِ نگارش اس کے مزاج کا آئینہ ہوگا، اگر یہ بات صحیح ہے کہ طرزِ نگارش مصنف کی شخصیت کا عکس ہے تو اس کا بھرپور اطلاق غبارِ خاطر پر ہوتا ہے۔ اس جمالیاتی اسلوب کا سب سے بڑا حسن فکر و نظر کی گہرائیاں اور گیرائیاں ہیں۔ نگاہِ حسن میں فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی نکال لاتی ہے اور یہ ثابت کر دیتی ہے کہ فکر اور نظر کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ دور کیوں جائیے، مولانا کے "چڑیا چڑے کی کہانی" کے ذکر کردار ملاحظہ ہوں۔

فلسفہ اور منطق محض بڑے بڑے مسئلوں کو سلجھانا نہیں، بلکہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی نگاہِ دور بیں کے لیے دعوتِ مطالعہ ہیں مگر اس کی تلاش کے لیے بھی وسعتِ نظر اور دقتِ نظر دونوں کی ضرورت ہے ایک طرف ایک چڑیا موتی ہے دوسری طرف دو کردار قلندر اور ملا ہیں۔ یہ دونوں مناظر زندگی کے بھرپور عکاس ہیں۔ زندگی کے دونوں پہلو اپنے اندر جذب و کشش کا سامان رکھتے ہیں، " چہرہ ابرنی، نکلی ہوئی گردن، مخروطی دم، گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا اولتا ہوا بھولا پن، جب دانہ چگنے کے لیے آتے لگی تو ہر دانہ چنتی جاتی ... [illegible]

ہم دونوں کی نگاہیں خاموش رہتی ہیں لیکن نگاہیں گویا ہوگئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے اور میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔" یہ ہے وہ چڑیا جس کا نام مولانا نے موتی رکھا ہے جو مولانا آزاد کے الفاظ میں "مادام قلعہ احمد نگر" ہے۔ کتنی دلآویز تصویر ہے اور کتنا حسین خاکہ مصنف کے جمالیاتی ذوق و شوق کا آئینہ۔ اسی ضمن میں مولانا کے دو خاکے اور، جو زندگی کے بھرپور ترجمان اور فکر و نظر کے بھرپور آئینہ دار ہیں:

"آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانی کرنا پڑتی ہیں جونہی ان کے قدموں کا رُخ دونوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کرلیں اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنالیا ..... یہ گویا نازِ حُسن اور نیازِ عشق کا پہلا مرحلہ تھا۔ التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو رہی تھی کہ ناگاہ ایک تنومند چڑے نے اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے ساتھ سلسلہ کار کی درازی سے اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا، اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک تمام رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کُھل پڑے اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی نہ کسی نگاہ میں تذبذب۔"

یہ تو ہوئی نگاہ جلوہ پرست کی گل فروشیاں، لطفِ تحریر، حُسنِ بیان۔ اب اس معمولی سے واقعہ زندگی کا نفسیاتی پہلو اور نگاہ جلوہ پرست کی فکر تراشیاں۔ غور کیجیے تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں، جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین پر گڑے رہتے ہیں، یہ اٹھا اور ساری دنیا اچانک اٹھ گئی۔

فکر کا یہ گوشہ تو اس اخذ نتائج کے بعد ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے بعد کے یہ چند جملے مولانا کے مزاج کے غماز ہیں اس لیے پیشِ نظر ہیں:

"اس چڑے کا بیباکانہ انداز کچھ ایسا دل پسند ہوا کہ اسی وقت میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس مردِ کار سے راہ و رسم بڑھانا چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا کیوں کہ اس کے انداز میں بے دماغی کے ساتھ ایک طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا جو اس کی قلندرانہ وضع کو آب و تاب دے رہا تھا۔"

اسی سلسلے کا ایک اور خاکہ نفسیاتی ژرف نگاہی اور فلسفیانہ موشگافیوں کے پیش نظر ضیافت طبع کے لیے حاضر ہے:

"اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطع نظر کرلی جائے تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قلندر اور موتی سے آپ کی تقریب ہو چکی، اب مختصراً ملا اور صوفی کا حال بھی سُن لیجیے: ایک چڑا بڑا ہی تندو مند اور جھگڑالو ہے، جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا، سینہ تنا ہوا رہتا ہے، جو بھی سامنے آجائے دُو دُو ہاتھ کیے بغیر نہ رہے گا۔ کیا مجال کہ جو ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی لیکن پہلے ہی مقابلہ میں پست ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سر و سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور اپنے داہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً موجود ہو جاتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہونچ جاتا ہے اور پھر اپنے شیوہ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں شروع کردیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے ذاعلک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے"۔

(اس کے بعد قاآنی کے وہ قطعہ بند اشعار ہیں جن کا حوالہ اقتباسی جملے میں ہے انہیں افسوس کے ساتھ صرف نظر کیا جا رہا ہے اس لیے کہ اب فارسی مذاق تو درکنار اُردو کا مذاق خود ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے) اس جملہ معترضہ کے بعد مصنف کے فکر و نظر کی وسعت ملاحظہ ہو:

"خاکہ نگاری کی تراش خراش اور مشاہدہ کی باریک بینی عبارت کے ایک ایک جملہ میں پیوست نظر آتی ہے معمولی معمولی باتوں سے بڑے بڑے نتائج نکال لینا ہر مصنف کے بس کا روگ نہیں، اس کے لیے فکر و نظر دونوں کی ضرورت ہے اور یہ دولت بقول ایک انگریز ناقد ولیم پیٹر اسی کا حصہ ہے

کہ جب وہ تخلیق کے لیے قلم اُٹھائے تو ذہن و دل کی تمام قوتیں، فکر و نظر کی تمام توانائیاں کھنچ کر اس کے قلم سے ٹپک پڑیں۔"

چند نمونے اور پیشِ خدمت ہیں۔ بقیہ کو مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر حذف کرتا ہوں۔

مکتوب نسیم باغ ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء

"وہی چار بجے کا جاں فزا وقت ہے، ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں، داہنی طرف جھیل کی وسعت شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے، بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دُور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔"

قلعہ احمد نگر کا نقشہ:

"مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری۔ تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو تکیہ پر سر رکھا تو صبح کو تین بجے آنکھ کھلی۔ تین بجے اٹھا تو تازہ دم اور چست و چاق تھا۔ نہ سر میں گرانی اور نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلہ حرارت کام میں لایا اور چائے دم دی۔ اب جامِ صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصوّر کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و کوہکن سنا رہا ہوں۔"

ناظرینِ کرام کو زحمت تو ضرور ہوگی، لیکن غبارِ خاطر کا مطالعہ ہر موڑ پر دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے بقول شاعر ؎

لذیذ بُود حکایت دراز تر گفتم

وہی معاملہ میرا اور غبارِ خاطر کا ہے۔ اس سلسلے میں چند تراشے پیشِ خدمت ہیں جن میں مولانا کی موشگافیاں ہر موڑ پر نظر آتی ہیں، مثلاً:

"عرب کے فلسفی شاعر ابوالعلیٰ معری نے زمانے کا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹا ہے: کل جو گزر چکا ہے۔ آج جو گزر رہا ہے۔ کل جو آنے والا ہے، لیکن ان تینوں زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ ہے کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں فی الحقیقت ہے کہاں۔ یہاں وقت کا احساس جو ہمیں میسّر ہے وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے، یا "مستقبل" کی اور انھیں دونوں زمانوں کا اضافی تسلسل ہے جسے ہم "حال" کے نام سے پکارتے ہیں، ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا اور ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل دی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا ہے یا مستقبل جو ابھی آیا ہی نہیں۔"

طبیعت افسردہ ہوتی ہے تو الفاظ بھی افسردہ نکلتے ہیں۔ میں طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں۔ آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا۔ آپ اس طریقِ کار پر متعجب نہ ہوں۔ آج سے ساڑھے تین سو برس قبل فیضی کو بھی یہی طریقہ کام میں لانا پڑا۔ نل دمن میں اس نے ہم کو خبر دی ہے ؎

تا تازہ و تر زدم رقم را
در بادہ کشیدہ ام قلم را

آج جام وہی ہے جو روز گردش میں آتا ہے لیکن جام میں جو کچھ ہے اس کی کیفیت کچھ اور ہی ہو جائے گی۔

بارہا خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے کے لیے اسلیے بھی مجبور ہیں کہ کارخانہ ہستی کا کوئی حل باقی نہیں رہتا۔ ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے۔

"اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنیٰ رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمائے ہستی کے فنجان اور بے معنی جسم میں صرف اس ایک حل سے رُوحِ معنیٰ پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو تسلیم کر لیں۔"

□□

پسِ تقریبِ ملاقات...

پسِ تقریبِ ملاقات یہاں شام ڈھلے
دیر تک پھیلی رہے گی تری شرکت کی مہک

مترنم سے رہیں گے یہ ہوا کے جھونکے
جن میں غلطیدہ ہے اب لحنِ تکلم تیرا
رات بھر پھولی رہے گی یہ تاثر کی شفق
جذب ہے جس میں دلآویز تبسم تیرا

بے نیازانہ تخاطب میں پریشاں سے ترے
گوشہ لب پہ کوئی حرف شناسائی کا
تمکنت والی اداؤں میں انوکھا سا نیاز
مجتنب آنکھوں میں اک عکس پذیرائی کا
عام موضوعِ سخن میں بھی عیاں لہجۂ خاص
ذہن کی بات میں بھی دل کی دھمک کا احساس
اک تفاہم سا کسی غمزۂ غلطیدہ میں
ایک مانوس کا خم کاکلِ پیچیدہ میں'

تجھ سے یہ ربط کہ موہوم بھی' مفہوم بھی ہے:
تو کہ ہے مجھ سے تری زیست کا ہر رنگ جدا
شرحِ حالات الگ' عمر کا آہنگ سوا
پہلے ہی راہ میں حائل ہے خلیجِ اقدار
کسی گلشن کی امانت ہے تری فصلِ بہار
تو نے تابندہ بھی رکھا ہے ترا خطِ حصار
پھر بھی اک قرب کی خوشبو ہے فضا میں بیدار

یہ رہ و رسم جو اظہارِ محبت بھی نہیں
ہے ترے دم سے یہ راحت کہ جو راحت بھی نہیں
غمِ بے نام' ترے نام سے موسوم بھی ہے!

حسن سے رابطۂ عشق کے مضموں ہیں بہت
اس لطافت کدۂ کیف میں افسوں ہیں بہت!

نہ ترے جسم کا صندل' نہ ترے لب کے گلاب
نہ تری زلف کی شبنم ہے اس احساس کا نام
یوں تو اس شام کا پیکر بھی ہے تیرا یہ جمال؛
اس شناسائی کا عنواں ہے فقط نکہتِ شام
چشمِ ہمدم کی عطا کردہ یہ آسائشِ دید
مہرباں حسن کا بخشا ہوا یہ اذنِ کلام!

آج پھر جاگتی رہ جائے گی ہر بام تلے
وہی شاداب سی حسرت' وہی آسودہ کسک
دیر تک پھیلی رہے گی تری شرکت کی مہک
پسِ تقریبِ ملاقات یہاں شام ڈھلے

عبدالاحد ساز

ذکریا مینر فلور ۴
۱۴۹۔ یوسف مہر علی روڈ ممبئی ۔ ۴۰۰۰۰۳

نہرو جی

ملک کے رہبر نہرو جی
صاحبِ جوہر نہرو جی
نورِ نگاہِ موتی لعل
لعلِ جواہر نہرو جی
گاندھی جی کے سچے ساتھی
قوم کے یاور نہرو جی
تھے میدانِ سیاست میں
خود اِک لشکر نہرو جی
ذہنِ رسا اللہ اللہ!
علم کے گوہر نہرو جی
بچوں میں بچوں کی صورت
شمعِ منور نہرو جی
رنج سہے ہنس ہنس کر سارے
صبر کے خوگر نہرو جی
آزادی کے دیپ جلا کر
ہوئے اجاگر نہرو جی
بہرِ عقیدت بھارت واسی
تم پہ نچھاور نہرو جی
گوہر بالآخر دل کہہ اٹھا
دلوں کے محور نہرو جی

گوہر خیرآبادی

کالا پیادہ'
خیر آباد
سیتاپور

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی
صدر شعبۂ اردو ۔ ودیانت ہندو ڈگری کالج
لکھنؤ

ایک گمنام شاعر

محمد رستم علی خاں ادیبؔ

شاعری کی دُنیا، بہت ہی آباد، بہت ہی شاداب، بہت ہی پُرفضا، بہت ہی پُربہار اور بہت ہی طرحدار دُنیا ہے، اس دُنیا کے کتنے ہی رنگ ہیں، ان رنگوں میں کتنی ہی گُل کاریاں ہیں اور ان گل کاریوں کے نقش کہیں نمایاں، اُبھرے ہوئے اور درخشاں ہیں، کہیں پوشیدہ، گُم اور ڈوبے ہوئے ہیں۔ جو نمایاں ہیں ان سے سب واقف ہیں، جو پوشیدہ ہیں انہیں تلاش و جستجو کی ضرورت ہے۔

فرخ آباد کے محمد رستم علی خاں ادیبؔ باغِ شاعری کا ایک ایسا ہی مہکتا ہوا پھول ہیں جو عام قاری کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری کے رنگ اور خوشبو سے پہچانے جاتے ہیں۔

محمد ابو علی خاں کے فرزند محمد رستم علی خاں ادیبؔ نے ۱۲۵۳ھ میں جنم لیا۔ مادّہ تاریخِ تولد "لختِ جگر" اور "برخوردارم" ہے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد عبداللہ خاں سے حاصل کی، پھر عربی تعلیم کے لیے لکھنؤ آ گئے اور علوم فارسیہ و عربیہ میں شہرت رکھنے والے مولوی محمد مکرم خاں سے درس لینے لگے۔ ۱۲۶۵ھ میں مولوی محمد مکرم خاں، اپنے شاگرد ادیبؔ کو ساتھ لے کر محمد حسین خاں کلکٹر چکلہ دار محمدی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے مشورے سے پرگنہ حیدر آباد ضلع کھیری میں بہت سے مواضعات خرید کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ زمینداری کی مصروفیات کی وجہ سے محمد مکرم خاں دوسرے تیسرے مہینے ادیبؔ کو سبق دینے لگے اور پھر مجبور ہو کر مشورہ دیا کہ تم اپنے والدین کے پاس واپس چلے جاؤ۔ لیکن ادیبؔ کے واپس فرخ آباد آتے ہی غدر شروع ہو گیا اور محمد مکرم خاں کو ان کے کسانوں نے قتل کر دیا۔ چنانچہ محمدی واپس جانے کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے کے بعد ادیبؔ نے مولانا محمد حسن خاں بہادر سب جج فرخ آباد اور حضرت مولوی تراب علی سے منطق، فلسفہ، عربی، فارسی اور حساب میں دسترس حاصل کر لی۔

رستم علی خاں ادیبؔ کو بچپن سے شعر و شاعری سے دل چسپی تھی، فارسی اور اُردو اشعار بڑی لگن اور شوق سے سُنتے اور پڑھتے تھے لیکن شعر کہنے کی طرف طبیعت مائل نہیں تھی۔ علم عروض اور فنِ شعر سے خوب واقف تھے، اسی لیے فرخ آباد کے مشاعروں میں شعر کی داد بھی دیتے تھے اور تنقید بھی کرتے تھے۔ مرزا کلب حسین خاں نادر کے دولت خانے پر ہر ماہ نشست ہوتی تھی جس میں فرخ آباد کے علاوہ اطراف کے شعرا بھی شرکت فرماتے تھے۔ ادیبؔ کے ایک دوست سید امراؤ علی خطیرؔ، شہر کے ایک رئیس منشی موہن لعل کے فرزند لالہ شمبھو ناتھ کو پڑھانے جاتے تھے، ایک دن ادیبؔ بھی وہاں موجود تھے۔ سید امراؤ علی نے انھیں اپنی ایک تازہ غزل سنائی۔ ادیبؔ نے اپنی عادت کے مطابق غزل کے تمام عیوب اُجاگر کر دیئے۔ سیّد صاحب بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ "شعر کہنے میں خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے، یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے، خود تو ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے، دوسروں پر تنقید کرنے لگتے ہو"۔

ادیب بہت شرمندہ ہوئے اور فرمایا: "آپ درست کہتے ہیں اگر اجازت ہو تو کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔" سید صاحب نے اپنی غزل کا ایک مصرع ان کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ اس پر غزل کہہ لاؤ۔

ادیب حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فرخ آباد سے ایٹہ کے سفر میں چودہ شعر کی ایک غزل مکمل کرکے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سید امداد علی نے شعر سن کر فرمایا کہ اگر مصرع میں نے خود نہ دیا ہوتا تو یقین نہ آتا کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی ایک مصرع نہ موزوں کیا ہو ایسے اشعار کیوں کر کہہ سکتا ہے۔

غزل کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

صد شکر ہمیں کاکلِ پیچاں سے نکالا
اللہ نے کیا بھول بھلیاں سے نکالا

اے دل نہیں پھر کیفیتِ ضبط خبر دار
آنسو جو کوئی دیدۂ گریاں سے نکالا

ممنون رہیں گے ترے تا روزِ قیامت
اے موت جو رنجِ شبِ ہجراں سے نکالا

خورشید قیامت کے نکلنے کی ہوئی دھوم
داغوں نے جو سر چاک گریباں سے نکالا

رویا کیے فرقت میں ہم اک پردہ نشیں کی
آنسو نہ کوئی دیدۂ گریاں سے نکالا

اس طرح ادیب کی غزل گوئی کی ابتدا ہوئی اور انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کے لیے بھی غزلیں کہنا شروع کیں جو مشاعروں میں پڑھ کر دادِ تحسین حاصل کرتے رہے، مگر ایسا وقت بھی آیا کہ دوستوں نے ادیب کو اپنا دیوان ترتیب دینے پر مجبور کر دیا۔ چناں چہ ادیب نے "دیوانِ مرغوب" کے نام سے دیوان ترتیب دیا۔ خود تحریر فرماتے ہیں:

" الغرض جب دیوان مرتب ہو گیا تو پھر وہی خیالِ پارینہ سوہانِ جاں ہوا کہ اگر بغیر لاحظہ کیے کسی استادِ ماہر و مستند کے دیوان شائع و طبع ہوگا تو لوگ ہدفِ سہامِ عیب چینی بنائیں گے، چنانچہ چند احباب نقاد گوہرِ معنی صرافِ جوہرِ نکتہ دانی کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا کہ نظر غائر سے ملاحظہ فرمائیں اور جس مقام پر عیب و اسقام نظر آئیں، وہ بتائیں۔ بعض حضرات نے چند روز رکھ کر بجنسہ واپس فرمایا، کسی مقام پر جرح و دخل نہیں کیا۔"

آخر میں فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی محمد عبدالاحد شمشاد کی خدمت میں جو اس زمانے میں غازی پور کے ایک مدرسے کے مہتمم ہوا کرتے تھے اپنا دیوان روانہ کیا۔ مولوی صاحب نے پورے دیوان پر اصلاحات فرمائیں اور سند دے دی کہ اب کلام میں کسی قسم کا فنی عیب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں "دیوان مرغوب" مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا مولوی عبدالاحد شمشاد نے قطعہ تاریخ کہا جس کے دو مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

زکلکِ گہر بارِ شمشاد سالش
دلآویز نظمِ گرامی برآمد = ۱۳۱۹ھ

دیوانِ ادیب لگ بھگ ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں حروف تہجی کے حساب سے غزلیات کو ترتیب دیا گیا ہے۔ غزلیات کے بعد مختلف قسم کے قطعات تاریخ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر حکیم اصغر حسین صاحب کے انتقال پر قطع تاریخ ہے، منشی منصب علی ساکن قصبہ حیدر آباد ضلع کھیری کی مسجد کی تعمیر پر قطع ہے۔ فرخ آباد کلکٹر کے عہدے پر فائز ہونے والے انگریز افسر ڈیو ہرسٹ پر قطع تاریخ، موضع روشن نگر، گولا گوکرن ناتھ ضلع کھیری میں ادیب نے خود بھی ایک کنواں تعمیر کروایا ہے جس کا قطع تاریخ ۱۹۰۰ء ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے احباب نے دیوان کی طباعت کے سلسلے میں قطعات تاریخ کہے ہیں۔

ادیب کے کلام پر ہم عصر شعراء کے روایتی اندازِ فکر کی پرچھائیاں نمایاں ہیں، زبان بہت ہی صاف، ستھری اور رواں ہے۔ اگرچہ ادا ہی پرانا انداز لیے ہوئے ہے، مگر کلام میں بڑی تازگی، شستگی اور زندگی ہے۔ اشعار میں بلا کی آمد ہے۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کلام کسی اسکول کے مدرس کا ہے جسے اپنے کلام پر اتنا بھی اعتماد نہیں کہ کسی مشاعرے میں پیش کرنے کی جرأت کرے۔ بہت سے اشعار تو بالکل تازہ پھلوں کا رس محسوس ہوتے ہیں ؎

جب خیال آیا فراقِ یار کا — وصل میں بھی دل مرا دھڑکا کیا
میں نہ کہتا تھا وہ ہے وعدہ خلاف — جھوٹ نے اس کے مجھے سچا کیا
شب نہ تم آئے نہ موت آئی مجھے — رات بھر میں ایڑیاں رگڑا کیا

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

اَنیس نُصرت
علی گنج، لکھنؤ

لیتھوگرافی سے آفسیٹ تک

لکھنؤ اور پوری ریاست میں پچاس سال قبل، یعنی آزادیِ ہند کے وقت لیتھو کے ذریعے طباعت کا رواج عام تھا جب کہ آج طباعت کا یہ طریقہ تقریباً مفقود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ آفسیٹ نے لے لی ہے۔ کتابوں کی طباعت کے لیے اُن دنوں عام طور سے کتابت کی جاتی تھی، جب کہ آج اس مقصد کے لیے کمپیوٹر کا استعمال بھی ہونے لگا ہے۔

پچاس سال قبل لیتھو طباعت کے لیے نول کشور، نامی، نظامی اور مدرسۃ الواعظین ایسے پریسوں کے علاوہ جن میں سے بعض تو سو سو برس پُرانے ہیں، لکھنؤ میں بہت سے دوسرے پریس تھے جن کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں۔

لیتھوگرافی کے معنی ہیں پتھر کے ذریعہ چھپائی۔ اس طریقِ طباعت میں ایک طرح کے مخصوص کاغذ پر، جو انڈے کی زردی، عُصارہ ریوند اور بعض دوسری چیزوں کے محلول سے رنگ کر سکھا لیا جاتا تھا اور مسطر کہلاتا تھا، ایک مخصوص سیاہی سے جو اسی مقصد کے لیے تیار کی جاتی تھی، خوش نویس حضرات مسودہ کی کتابت کرتے تھے۔ یہ تحریر داب کے ذریعے چکنے سفید پتھر کی سلوں پر منتقل کی جاتی تھی، اور ان بڑے بڑے پتھروں کو مشین پر رکھ کر طباعت کا کام مکمل کیا جاتا تھا۔ اس طریقِ کار میں مسطر کی تحریر معکوس ہو کر پتھر پر منتقل ہوتی تھی اور پتھر سے دوبارہ کاغذ پر منتقل ہوتے وقت یہ تحریر اپنی اصل شکل میں آجاتی تھی۔ طباعت کے پہلے پُروف نکالے جاتے تھے جن پر نشان دہی کے بعد مصلح سنگ غلطیاں درست کر دیتے تھے۔ یہ ماہرینِ فن معکوس تحریر اسی سہولت سے پڑھ لیتے تھے جیسے سیدھی لکھی ہوئی عبارت پڑھی جاتی ہے۔

ملک کی آزادی کے دنوں میں یہ طریقِ طباعت پتھر سے آزاد ہو کر الومینیم کی پلیٹوں کے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا استعمال بے حد دقت طلب تھا، دوبارہ طباعت کے لیے انھیں محفوظ رکھنے کے واسطے بہت زیادہ جگہ کی ضرورت ہوتی تھی اور انھیں محفوظ رکھنا بھی آسان نہ تھا لیکن ماہرینِ فن کا کہنا ہے کہ شانِ خط پتھر کی سلوں پر جس خوبی سے منتقل ہوتی تھی وہ بات دھات کی پلیٹوں میں نہیں آپاتی۔ اس سب کے باوجود شاید یہ کہنا درست ہو کہ سہولت نے بہتر طباعت کے امکان کی جگہ لے لی اور پتھر کی سلوں کا استعمال کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ بہتر طباعت کے لیے مرطوب آب و ہوا مناسب ہوتی ہے۔ اِن دنوں تو کولروں کے ذریعہ درجۂ حرارت کو ضرورت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے، لیکن لیتھوگرافی کی حکمرانی کے دور میں جب آج کی سہولتیں موجود نہ تھیں، موسم گرما میں مشین کے چاروں طرف ٹاٹ کے موٹے موٹے پردے ٹانگ کر انھیں مستقل طور سے نم رکھا جاتا تھا۔

ہندستان میں خطاطی کا آغاز تین سے پانچ ہزار سال قبل اُس وقت ہوا ہوگا جب اہلِ ہنود کے اہم ترین الہامی مسودات یعنی وید انسانی شعور کا حصہ بنے۔ کچھ عرصہ تک سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کے بعد انھیں محفوظ کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہوگی۔ اس قدر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد پانڈولپیوں کی موجودگی فنِ خطاطی کی رہینِ منت ہے۔ لیکن دیوناگری اور ہندستان کی بیشتر دوسری زبانوں کے رسم الخط ایسے ہیں جن میں تقریباً ہر حرف اپنی مکمل شکل میں لکھا جاتا ہے جس کے سبب خوش خطی کے جوہر دکھانے اور عبارت میں گل بوٹے ٹانکنے کی اس میں زیادہ گنجائش نہیں۔ رسم الخط کے اسی پہلو کے سبب دیوناگری کا ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر بھی اردو کے مقابلہ میں پہلے ایجاد ہوئے۔

فارسی، عربی، اردو اور ایسے ہر رسم الخط میں جن میں حروف ملا کر

لکھے جاتے ہیں اور اس عمل میں ان کی شکل مختصر اور مختلف بھی ہو جاتی ہے خطاطی کے جوہر دکھانے کی زیادہ گنجائش ہے۔ رسم الخط کی اسی خصوصیت کے سبب اُردو کا ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر تیار ہونے میں وقت لگا۔

خطاطی اور خوش نویسی، عبارت کو بے حد خوبصورت انداز سے لکھنے سے متعلق ہے جب کہ طباعت کے لیے اس کام کو عام طور سے کتابت کہا جاتا ہے۔ پیشہ کے طور پر یہ فن ایک ہزار سے زائد برسوں سے رائج ہے طباعت کے آغاز سے قبل چوں کہ کتاب کے نئے نسخے ہاتھ سے لکھ کر تیار کیے جاتے تھے اس لیے ان کی قیمتیں بہت زیادہ ہوتی تھیں، لیکن اس کے باوجود بغداد میں کتابوں کی پانچ سو دکانیں تھیں جہاں خوشنویس حضرات کتابوں کے نسخے تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔

ہندستان میں خوش نویسی مسلم حکمرانوں کی آمد کے ساتھ ساتھ داخل ہوئی۔ ابتداً تو اس کی حیثیت شوق ہی کی تھی اور مولانا غلام محمد ہفت قلم دہلوی کی فارسی تصنیف "تذکرہ خوش نویساں" کے مطابق، جس کا اب اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے، داراشکوہ، شاہجہاں، جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خسرو اور سلطان پرویز، راجہ ناگرمل کے پوتے راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ، بیرم خاں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم خانخاناں، راجہ ٹوڈرمل، نواب روشن الدولہ (جن کا محل روشن الدولہ کچہری کے نام سے مشہور ہے) کے بیٹے نواب مظہر خاں نہایت عمدہ خوش نویس تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرآن شریف کے نسخے تیار کیا کرتا تھا۔

کان پور میں ایک مختصر سی مدت کے لیے آرچر نامی ایک انگریز کے پریس کے بعد لکھنؤ میں پہلا مطبع ۱۸۱۹ء میں غازی الدین حیدر نے مکتبۂ سلطانی کے نام سے قائم کیا تھا جو ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے وقت تک قائم تھا۔ اپنی مختصر سی زندگی میں سرکاری احکامات اور فرامین کی اشاعت کے علاوہ اس مکتبہ سے عربی، فارسی اور اُردو کی سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔ مطبع سلطانی کے قیام کے بعد سے ۱۸۵۱ء تک لکھنؤ میں درجنوں مطابع قائم ہوئے جن میں مطبع حاجی حرمین شریفین مطبع جلالی، مطبع علوی، مطبع میر حسن، مطبع مولائی اور مطبع مصطفائی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد ساری بساط پلٹ دی گئی تھی لیکن طباعت کی اس گرم بازاری کے جلو میں اَودھ اور خاص طور سے لکھنؤ نہایت عمدہ خوش نویسوں کا مرکز بن گیا تھا۔

دو سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں نول کشور پریس کے قیام سے اودھ طباعت کے ایک نئے دَور میں داخل ہوا۔ اس ادارہ نے صرف ابتدائی ۳۷ برسوں میں دو ہزار سے زائد چھوٹی اور بے حد ضخیم کتابیں شائع کیں جن میں ضخیم ترین کتاب داستانِ امیر حمزہ تھی جو چالیس ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل تھی۔ غالب اور میر انیس کے دواوین کے علاوہ فارسی کا مشہور لغت فرہنگ آنند راج اور فسانۂ آزاد کے پہلے ایڈیشن بھی اسی مکتبہ سے شائع ہوئے۔ مشہور خطاط منشی محمد شمس الدین اعجاز رقم، جن کی خوشنویسی کے اسرار و رموز سکھانے والی تصنیف "اعجاز رقم" آج تک مقبول ہے، اسی مطبع سے متعلق تھے۔

نامی پریس ۱۸۸۳ء میں قائم ہوا جو اسی جگہ اب تک موجود ہے اور سو سال قبل جرمنی سے جو مشین برآمد کی گئی تھی، اب تک اسی طرح کام کر رہی ہے۔ مشہور خوشنویس مرزا محمد جواد نے ۱۹۴۰ء میں نظامی پریس قائم کیا جو اَب بھی طباعت کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ مرزا محمد جواد بے حد عمدہ خوش نویس تھے اور کربلائے معلّٰی میں حضرت امام حسینؑ کے روضہ کے پھاٹک پر عربی عبارت انھیں کی فن کاری کا نمونہ ہے۔ آزادیٔ وطن کے وقت لکھنؤ میں مرزا محمد جواد، نور الحسن، ریاض الحسن، عبدالحق، نجم الحسن، مجاہد حسین، عشرت، مظفر حسن عرف نوابو اور قیصر مرزا جیسے خوش نویس موجود تھے۔ اور آج بھی وقار رضوی، محمد الیاس، حسن اختر، آغا محمد حسن، اور عبدالسمیع قاسمی ایسے خطاطِ شہر اپنے فن کے جوہر دکھا رہے ہیں۔

تقریباً بیس سال قبل اُردو طباعت کے سلسلے میں ونڈائک اور آفسیٹ مقبول ہونا شروع ہوئے۔ ونڈائک میں چکنے شفاف کاغذ پر، جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے، سیاہ روشنائی سے کتابت کی جاتی ہے۔ یہ کتابت پلیٹ پر آسانی سے منتقل ہو جاتی ہے جس سے لیتھو کے علاوہ آفسیٹ طباعت بھی ممکن ہے۔ ونڈائک کی کاپی سے نگیٹو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ نگیٹو سے پلیٹ تیار کی جائے تو طباعت بہتر اور زیادہ روشن ہوتی ہے لیکن ونڈائک طریقِ کار میں ایک خرابی یہ ہے کہ کتابت، نقشہ جات اور تصویروں کو بڑا یا چھوٹا نہیں کیا جا سکتا، جب کہ فوٹو آفسیٹ میں یہ سب

(باقی ص ۴۲ پر)

افسانہ

ڈاکٹر بشیشر پردیپ
اے۔ ۵۵۵، اندرانگر، لکھنؤ

بھرم

وہ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر تھے ــــ ڈاکٹر مسز شبنم اور ڈاکٹر انوراگ ــــ اور آگرہ میں ان کی بہت اچھی پریکٹس تھی۔ دونوں ہی اپنے مریضوں سے ہمدردی رکھنے والے ڈاکٹر کے بطور مشہور رہتے تھے۔ شبنم کوئی خاص خوبصورت نہ تھی' لیکن اس کے دردمند دل نے اسے ایک عجیب دلکشی عطا کردی تھی۔ مریض کی آدھی بیماری تو اسے دیکھتے ہی دور ہوجاتی تھی۔ معروف ڈاکٹر اور میڈیکل کالج میں ریڈر ہونے کے باوجود وہ ایک سگھڑ گھریلو بیوی اور پیار کرنے والی ماں بھی تھی۔ اپنے ساتھی ڈاکٹروں میں بھی وہ ہر دلعزیز تھی۔ میڈیکل سائنس کی نو دریافت دواؤں یا تکنیک کے بارے میں باخبر رہنے کی وجہ سے ان سب پر چھائی جاتی تھی۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے اس کے ساتھی ڈاکٹروں نے دیکھا تھا کہ جب میڈیکل سائنس کی نئی نئی ایجادوں' جیسے لیزر بیم (LASER BEAM) سرجری، مائکرو سرجری یا اسکیننگ (SCANNING) وغیرہ کے بارے میں بات ہوتی تو وہ کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگتی۔

"ارے ڈاکٹر! یقیناً یہ بہت بڑی ترقی ہے۔ لیکن یہ سب بھی کسی بھیانک بیماری کی دسترس سے محفوظ رکھ سکیں' اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے ــــ اب دیکھئے نا ــــ ایک ہلکی سی سوزش، معمولی سا زخم یا ننھا سا پھوڑا بھی کبھی کبھی کینسر کی شکل اختیار کرلیتا ہے ــــ اور ــــ اور ــــ" اس کی زبان کانپنے سی لگتی۔ اور اس وقت اس کا شوہر ڈاکٹر انوراگ خاموشی سے مداخلت کرتا۔

"لیکن کینسر کا مریض بھی آج آپریشن اور مناسب علاج کے بعد شفایاب تو ہو ہی جاتا ہے۔"

"شفایاب؟ ــــ شفایاب تو خیر بہت بڑا لفظ ہے۔ مائی ڈیئر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مریض ایک مقررہ مدت تک نارمل زندگی گزار سکتا ہے۔"

وہ اپنے شوہر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتی ــــ اور اس کا شوہر اس کی نگاہوں کا جواب اپنی نرم اور تسلی بخش نگاہوں سے دینے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے شوہر کو ایک خاموش پیغام دینا چاہ رہی ہو اور اس کا شوہر اس کی ہمت بڑھانے کی کوشش کررہا ہو۔ ایک خاموش روحانی تکلم دونوں کے درمیان جاری ہوجاتا ــــ ایک ٹیلی پیتھی (TELEPATHY)!

اور پھر چند ہی دنوں کے بعد اس کے ساتھی ڈاکٹروں نے اور اس کے عزیز و احباب نے حیرت کے ساتھ سنا کہ ڈاکٹر شبنم کا کینسر کا ایک بہت بڑا آپریشن ہوا ہے جو اس نے چپکے سے کروالیا ہے۔ صرف اپنے شوہر ڈاکٹر انوراگ کی موجودگی میں۔ جب کینسر کے ماہر ڈاکٹر نے اس کی بیماری کی تشخیص کے فوراً بعد آپریشن تجویز کیا تھا تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ شہر میں اپنے کئی عزیزوں اور دوستوں سے مل آئی تھی۔ لیکن اس کے شوہر نے اور نہ ہی اس نے کسی سے بھی اپنے آپریشن کے بارے میں ذکر کیا تھا۔

آپریشن کے بعد جب دوست احباب اس کی عیادت کو آئے تو ڈاکٹر انوراگ ان کو اس کا حال بتاکر اور ان کی آمد کا شکریہ ادا کرکے باہر ہی سے رخصت کردیتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے چہروں پر ابھرنے والے کسی بھی قسم کے دکھ، ہمدردی یا رحم کے جذبے کو دیکھ کر شبنم دکھی ہو اٹھے ــــ اور دو ہی ماہ کے بعد ان لوگوں نے پھر سنا کہ اس کے کینسر کا دوسرا آپریشن بھی ہوگیا ہے ــــ اس دوسرے آپریشن کے بارے میں بھی اس نے یا اس کے شوہر نے کسی سے کچھ نہیں بتایا تھا اور یہ ان کی ہمت اور ارادے کی پختگی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔

اس دوسرے آپریشن نے ڈاکٹر شبنم کی تو جیسے جان ہی نکال لی تھی۔ اس کے چہرے کی پیلی رنگت میں کچھ اور زردی مل گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کچھ اور گہرے ہوگئے تھے اور جسم کچھ اور دُبلا ہوگیا تھا اسپتال کے سفید چادر بچھے بیڈ پر وہ درد کو دُور کرنے والی دوا کھا کر خاموش لیٹی رہتی۔ کمرے کے ایک سمت آکسیجن کا سلنڈر پڑا رہتا۔ سلائین اور خون کی بوتلیں ہوتیں اور دل کی حرکت کو جانچنے کے لیے "ہارٹ مانیٹر" (HEART MONITOR) ہوتا۔ بیڈ کے پاس رکھی ہوئی چھوٹی سی اسٹیل الماری کے اندر اور اوپر دواؤں کی شیشیاں اور پھل رکھے ہوتے —— اور پھر تقریباً اسی طرح کا کمرہ اس کے اپنے گھر میں بھی سجا دیا گیا، جہاں اسے پورے ایک ماہ تک رہنا پڑا، اور اس کے بعد ہی وہ بیڈ پر سے اُٹھ سکی!

"میں نہ کہتا تھا تم ٹھیک ہو جاؤگی۔"

ڈاکٹر انوراگ نے اس کے کمزور دُبلے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ پھیکی دردناک مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی اپنے ہاتھوں کو اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ انوراگ نے اپنی نظریں جھکا لیں وہ اس کے ہاتھوں کی طرف نگاہیں کیے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

مزید کچھ دن آرام کرنے کے بعد اس کے کمزور جسم میں کچھ جان سی پڑی تو اس نے اپنے کلینک میں بھی بیٹھنا شروع کر دیا اور میڈیکل کالج بھی جانے لگی۔ ڈاکٹر انوراگ نے اسے ایک دوبار منع کیا ——

"دیکھو تمہاری صحت کے لیے ایک لمبی چھٹی کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں کلینک میں بیٹھنا ابھی بند کر دو، اور کالج سے بھی چھٹی لے لو۔"

"نہیں انوراگ۔ نہیں۔ کالج جانا اور کلینک میں بیٹھنا میری صحت کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوائیں کھانا یا کیمو تھراپی (CHEMO THERAPY) لینا۔ اپنے کام میں مصروف رہ کر میں اپنی بیماری کو بھولی رہتی ہوں۔"

"بیماری؟ —— اب کہاں ہے بیماری —— اب اس دوسرے آپریشن کے بعد کینسر ختم ہو چکا ہے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤگی۔"

اور وہ سوالیہ نگاہوں سے انوراگ کی طرف دیکھنے لگتی —— "یہ تم کہہ رہے ہو انوراگ؟ ایک ڈاکٹر ہو کر کہہ رہے ہو —— مجھ سے؟ ایک ڈاکٹر سے —— ؟ کیا تم نہیں جانتے یا میں نہیں جانتی کہ کینسر کے مریض کا خاتمہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ اسے اپنی موت کا انتظار اسی طرح سے کرنا پڑتا ہے جس طرح پھانسی کی سزا پانے والا قیدی اپنے آخری وقت کا انتظار کرتا ہے۔"

اور ڈاکٹر انوراگ ان نگاہوں کی تاب نہ لا پاتا —— "اچھا! تمہارے لیے سنگترے کا جوس لے آؤں۔" کہہ کر اُٹھ جاتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر انوراگ نے اسے اپنا کام کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ ہاں گھر سے متعلق کاموں میں نہ صرف اس کا ہاتھ بٹانے لگا بلکہ اس کی ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کا خیال بھی رکھنے لگا۔ جیسے نوکر سے کہہ کر وقت پر اس کی چائے بنوا دینا، اور کبھی خود ہی بنا دینا۔ اس کے کپڑے نکال کر پریس کروا دینا۔ اور اگر وہ کچن میں کوئی کام خود کرنا چاہ رہی ہے تو کچن میں جا کر اس کی مدد کر دینا —— اور سب سے اہم یہ کہ گھر میں اور گھر کے باہر زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا۔ لیکن جب بھی وہ اس کی نظریں بچا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تو تڑپ اُٹھتا —— اس کی زرد رنگت میں یہ سیاہی کیوں جھلکنے لگی ہے —— ؟ کیا وہ —— کیا وہ —— ؟ —— وہ آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ آنکھوں میں آئے آنسو آنکھوں ہی میں جذب کر لیتا۔

ڈاکٹر انوراگ نے اس کے آپریشن کے دن سے ہی سوچ لیا تھا کہ اس کے سامنے خوش رہنا نہایت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی بیماری سے گھبرا کر سسکیاں بھرنے لگے۔ یہ سسکیاں بھی یقیناً اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہیں۔ اس کے اندرونی ٹانکوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

انوراگ جب ایم۔ ایس، کے آخری سال میں تھا تو اپنے سے جونیر اسٹوڈنٹ شبنم، جو اس وقت ایم' بی' بی' ایس کے آخری سال میں تھی اور ہر امتحان میں ٹاپ کرتی آئی تھی، کے نزدیک آگیا تھا۔ شبنم کی ظاہری شکل و صورت تو اسے کیا کھینچتی —— وہ اس کی ذہانت اور سیرت سے متاثر ہوا تھا اور اس نے اپنے والدین کے ذریعے اس کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔ اور پھر اس کے ایم' ایس' کر لینے تک اُس کا انتظار کیا تھا۔ اور جیسے ہی اس نے

ایم۔ ایس کرلیا۔ اس نے اس سے شادی کرلی تھی اور پھر دونوں نے آگرہ میں پریکٹس شروع کردی اور دو ہی تین سال میں ان کی پریکٹس چل نکلی تھی۔ شبنم کو اپنے بہترین تعلیمی ریکارڈ کی بنا پر میڈیکل کالج میں لیکچرار کی پوسٹ مل گئی، جہاں وہ اب ریڈر بن چکی تھی۔ یعنی اس ڈاکٹر جوڑے کی ازدواجی زندگی کا یہ پہلو بھی بہت خوش گوار ثابت ہوا۔ اس طرح ان دونوں کا ساتھ پچھلے بائیس برس سے محبت، کامیابی اور مسرت سے لبریز چلا آ رہا تھا ——— اور اب ——— اب اچانک یہ ساتھ چھوٹتا دکھائی دینے لگا تھا۔

ان کا ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی ——— بیٹی بڑی تھی اور بیٹا چھوٹا۔ بیٹی نے بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا، اور لڑکا ڈاکٹر بننے کے لیے پی۔ ایم۔ ٹی کی تیاری کر رہا تھا۔ جب شبنم آپریشن کے بعد اپنی ڈیوٹی پر جانے لگی تو بیٹے کے پی۔ ایم۔ ٹی۔ کرنے میں ابھی ڈیڑھ ماہ باقی تھا ایک دن شبنم نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس کے امتحان کی تیاری میں اس کی مدد کرے گی ——— اور وہ وقت نکال کر اسے پڑھانے بھی لگی اور انوراگ سے بھی اس کے لیے وقت نکالنے کو کہنے لگی ——— جب انوراگ اُسکی خراب صحت کے پیش نظر اسے اس طرح کی محنت کرنے سے منع کرتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتی۔

" اس تھوڑی سی محنت سے میری صحت پر کچھ اثر پڑنے والا نہیں اور اگر کچھ خراب اثر پڑتا بھی ہے تو وہ اس تسلی سے، اس اطمینان سے جاتا رہے گا جو ہمارے بیٹے کے میڈیکل کالج میں داخل ہو جانے پر مجھے حاصل ہوگا ——— ہمارے بیٹے کو تو ڈاکٹر بننا ہی ہے۔ ہر حالت میں۔"

اور وہ اچانک خاموش ہو جاتی اور اس کی آنکھوں میں اُداسی لہرانے لگتی۔

وہ باقاعدہ اپنے بیٹے کو پڑھاتی رہی، اور وہ پی۔ ایم۔ ٹی میں کامیاب ہوگیا اور آگرہ ہی کے میڈیکل کالج میں داخل بھی ہوگیا۔

اور پھر ایک دن ڈاکٹر انوراگ نے دیکھا کہ وہ اپنی انشورنس پالیسیوں کے کاغذات چیک کر رہی تھی۔

ایک پالیسی نکال کر بولی ———

" انوراگ ——— دیکھو تو ——— اس پالیسی میں ابھی تک نامزدگی نہیں بدلی گئی ——— یہ وہ پالیسی ہے جو میرے بچپن میں میرے ڈیڈی نے میرے لیے لی تھی۔ اس وقت انھوں نے نامزدگی کے کالم میں اپنا ہی نام لکھوایا تھا ——— اب اس میں نامزدگی کا نام بدلوانا ہے ——— میں نے انشورنس کمپنی کے نام یہ چٹھی لکھ دی ہے۔ اسے ذرا فالو اَپ (FOLLOW UP) کرلینا پلیز۔"

اور انوراگ نے دیکھا ——— چٹھی میں نامزدگی اس کے نام کی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل تڑپ اُٹھا، اور پھر ایک دن وہ اخبار میں میٹری مونیل (MATRIMONIAL) کالم لے کر بیٹھ گئی۔

انوراگ سے بولی ———

" سوچتی ہوں ——— بے بی کے لیے کوئی اچھا میچ مل جائے تو اس کی شادی کردی جائے ——— کیوں کیا خیال ہے؟"

" ہیں ——— ؟" انوراگ اس کی بات کے پیچھے چھپے اس کے درد تک پہنچ گیا، لیکن پھر بھی بولا ———

" ٹھیک ہے ——— لیکن ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے ——— ایم۔ اے تو کرلے۔"

' کیوں ——— شادی کرنے کے بعد بھی تو اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتی ہے ——— ہم اس کے لیے ایسا میچ ڈھونڈیں گے جہاں وہ لوگ اسے تعلیم مکمل کرنے دیں۔"

" ٹھیک ہے" ——— انوراگ نے سر ہلا دیا۔ اور ایک بار پھر اس کے چہرے کی زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں میں کھو گیا۔

انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے میچ تلاش کرنا شروع کردیا ——— اور انھیں ایسا میچ مل ہی گیا جہاں ان کی بیٹی کو شادی کے بعد تعلیم جاری رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو ——— اور انھوں نے اس کی شادی کردی۔

اس دن وہ کمزور ہوتے ہوئے بھی چُست دکھائی دے رہی تھی۔

بیٹی کی شادی کے چند ہی روز بعد اس نے انوراگ کے نام ایک خط لکھا ———

" ڈیئر انوراگ!

ایسا لگتا ہے کہ اب میں زیادہ دن نہیں جی سکوں گی۔

اب کی بار ایکس رے رپورٹ بہت بھیانک آئی ہے ——— مرض بڑھ گیا ہے ——— اور اب نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے ——— اور اب اس کے بعد کسی ایکسرے کی ضرورت نہ ہوگی ——— ایک ڈاکٹر اپنے کینسر کے مریض سے اس کے

مرض کی شدت کو جتنا چاہے چھپا سکتا ہے۔ لیکن ایک ڈاکٹر کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ اپنے مرض کو خود سے نہیں چھپا سکتا ـــــ اور پھر تم خود بھی تو ایک ڈاکٹر ہو۔

دیکھو انوراگ ! میں ایک وصیت کر رہی ہوں' اسے میری آخری خواہش سمجھ لو۔ میرے مرنے کے بعد میرے اعضا، جو بھی ٹرانسپلانٹیشن (TRANSP-LANTATION) کے کام آ سکیں' کسی نزدیک کے اسپتال میں دے دینا۔ میری آنکھیں بھی۔ غریب مریضوں کے لیے' اور میرے جسم کو کسی میڈیکل کالج میں دے دینا تاکہ اناٹمی (ANATOMY) کے طلباء کے کام آ سکے۔ ایک کینسر زدہ جسم شاید ریسرچ کے لیے کارآمد ثابت ہو!

تمھاری چند روز اور'

شبنم"

لیکن یہ خط وہ ابھی تک ڈاکٹر انوراگ کو نہیں دے سکی تھی۔ انوراگ کے دُکھی ہو جانے کے احساس سے ہمّت نہیں جُٹا پا رہی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر انوراگ کا ایک بہت ہی بے تکلف دوست جو خود ڈاکٹر نہیں تھا۔ لیکن میڈیکل سائنس میں کچھ سوجھ بوجھ رکھتا تھا، پیٹ میں اٹھنے والے شدید درد سے پریشان ہو کر صبح سویرے اس کے پاس آیا۔ اتفاق کی بات کہ انوراگ کا چیمبر نوکر نے ابھی تک صاف نہیں کیا تھا۔ وہ اس دوست کو شبنم کے چیمبر میں لے گیا۔ اس کے پیٹ کی جانچ کے بعد مسکراتے ہوئے بولا ـــ

"کچھ نہیں۔ صرف گیس ہے۔ دیکھو تمھیں کسی مریضہ کے پیٹ کا ایکسرے دکھاتا ہوں۔ شبنم کے دراز میں ضرور کوئی پڑا ہوگا۔" اور اس نے میز کی دراز میں پڑے ایکسرے کو اسکرین پر لگا دیا اور روشنی جلا دی۔

"یہ دیکھو! اس میں جو یہ ناڈیولز (NODULES) ہیں نا۔ یہ سیاہ دھبے۔ دیکھ رہے ہو نا۔ یہ کینسر کے نشانات ہیں۔ اور یہ جو بہت بڑا نشان ہے نا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس مریضہ کا پہلے آپریشن ہو چکا ہے ـــــ دیکھ رہے ہو نا ـــــ یہ آپریشن کے اسکارز (SCARS) کے نشانات ہیں۔ کینسر میں یہ خصوصیت ہے کہ آپریشن کے بعد اگر اُبھرتا ہے تو زیادہ اُبھرتا ہے۔ بس تم اسے گان کیس (GONE CASE) سمجھ لو۔ چند روز کی مہمان ہے ـــ پتہ نہیں کس کا ایکس رے ہے۔؟"

اور پھر وہ ایکس رے کے پیلے کوَر کو دیکھنے لگا۔ اس پیلے کوَر کے نیچے مریضہ کا نام لکھا تھا۔ ڈاکٹر مسز شبنم! ـــــ اور ڈاکٹر انوراگ جیسے منجمد ہو گیا ـــــ اس دوست کی موجودگی نے اس وقت اسے اپنے آپ پر قابو پانے میں مدد کی ـــ اسی دراز میں اس کے نام لکھا شبنم کا خط بھی وہ پڑھ گیا۔

لیکن ڈاکٹر انوراگ نے شبنم کو نہیں بتایا کہ اس نے اس کا وہ ایکس رے دیکھ لیا ہے اور وہ دُکھی ہوا اٹھا ہے۔ لیکن دردناک بات یہ ہوئی کہ شبنم کو اسی دن تھوڑی دیر بعد اپنی نرس سے پتہ چل گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے چیمبر میں آئے تھے اور اس کے دراز میں رکھا ایکس رے اسے دکھا رہے تھے۔

اور اس سے بھی زیادہ دردناک بات یہ ہوئی کہ شبنم نے بھی ڈاکٹر انوراگ کو نہیں بتایا کہ وہ جانتی ہے کہ انوراگ نے اس کا ایکس رے دیکھ لیا ہے۔!!

□□

ایک گمنام شاعر ـــ ـــ ـــ صفحہ ۲۲ کا بقیہ

پوچھا جو اُن سے ہم نے کہ ہوگا وصال کب
تیور بدل کے کہنے لگے وہ' کبھی نہیں

ملک الموت یہ بولے شبِ فرقت مجھ کو
وہ تو کیا اُن کے فرشتوں کو مری یاد نہیں

اُردو شاعری میں اس قسم کے نادر و کمیاب شعراء کی کمی نہیں ہے نہ جانے کتنے ہی غزل گو اور نظم نگار گمنامی کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جنھیں تلاش کرنے اور ان کے کارناموں کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

□□

ریحان عباس رضوی
[illegible]

جعفر حسین منظر لکھنوی

دبستان لکھنؤ کے بیسویں صدی کے شعراء میں جن لوگوں کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں ان میں جعفر حسین منظر لکھنوی کا نام بھی شامل ہے۔ منظر لکھنوی کا شمار ان باقیات الصالحات میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے شاعری میں فکر و تخیل سے زیادہ زبان و بیان کی نوک پلک کا خیال رکھا اور لکھنؤ کی روایتی شاعری میں اپنی پر کیف طبیعت سے لطف و مزہ پیدا کیا۔ انکے کلام میں ندرت تخیل اور جدت فکر کے جلتے ہوئے سکے نہ سہی، جدید لب و لہجہ کی توانائیوں کے اثرات موجود نہ سہی لیکن روایتی فکر کو ایک بامزہ کیف میں تبدیل کرنے والا سحر ضرور ملتا ہے۔

منظر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے اور مرزا شرر اور مشہور ڈرامہ نگار مہدی حسن احسن سے اکتساب فیض کیا۔ اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز اور مقبول ہوئے۔ لکھنؤ کے نوجوان شعراء کے مشہور حلقے یعنی ینگ پارٹی کے شرکاء میں ہمیشہ ممتاز اور معتبر سمجھے گئے۔

منظر لکھنوی کے ادبی کارناموں کی فہرست مختصر ہوتے ہوتے بھی قابل لحاظ ہے۔ ان کی حیات میں ان کے کلام کے دو مجموعے منظرستان اور پروانہ و جنت شائع ہوئے تھے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔

جعفر حسین منظر کا نسبی تعلق امام رضا علیہ السلام سے تھا جو حضرت رسول ﷺ کے آٹھویں امام تھے اور رسول اکرم کی نسل میں سے تھے۔ امام رضا کے اخلاف اپنے نام کے ساتھ بالعموم رضوی لکھتے ہیں۔ دور [illegible] زمانہ و زوال میں منظر کے جد نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ان کا خاندان آگرہ، دلی، فیض آباد ہوتا ہوا لکھنؤ میں آکر آباد ہو گیا اور تقریباً دو صدی سے یہ خاندان مغربی لکھنؤ کے ان محلوں میں آباد ہے جنھیں اب قدیم لکھنؤ کہا جاتا ہے۔ منظر کے اجداد کا عہد شاہی میں [illegible] شمار ہوتا تھا۔ تعلقہ داری گاؤں قریہ محل باغات بھی [illegible] قدرت نے [illegible]

انہیں بخشا تھا۔ منظر کے والد کا نام مرتضیٰ حسین تھا۔ ان کا ذریعہ معاش آبائی جائداد کی آمدنی تھی۔ باپ حیات تھے اس لیے کبھی کسی قسم کی فکر دامن گیر نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہیں ٹی۔بی جیسا پریشان کن اور مہلک مرض پیدا ہو گیا تھا جسکی بنا پر ان کا انتقال اپنے والد کی حیات ہی میں ہو گیا۔ اپنے پسماندگان میں جو افراد مرتضیٰ حسین نے چھوڑے ان میں ان کی تین اولادیں بھی تھیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے لڑکے کا نام قیصر حسین تھا۔ جنھوں نے آگے چل کر شاعری میں دلچسپی لی اور قیصر لکھنوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ انکے دوسرے بیٹے جعفر حسین تھے اور ان دونوں سے چھوٹی بیٹی کا نام عالیہ بیگم تھا۔

جعفر حسین کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بوجھ ان کے ایک قریبی عزیز میر آغا حسین صاحب نے اٹھایا درآں حالیکہ خود جعفر حسین کے دادا حیات تھے۔ ذی حیثیت اور صاحب استطاعت تھے اس کے باوجود انہوں نے پوتے کی پرورش میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ آغا حسین بڑی خوبیوں کے مالک تھے، طبیعت فیاض تھی نرم دل اور غمگساری جو لازم و ملزوم شے ہے انکی فطرت میں موجود تھی لکھنوی تہذیب و ادب کی بولتی تصویر تھے۔ شاعر نہ تھے لیکن غضب کے شعر فہم تھے۔ مذہبی معاملات میں سخت اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ جعفر حسین کی ابتدائی تعلیم و تربیت انہیں کے زیر سایہ ہوئی۔ قرآن اور دینیات کی تعلیم کے لیے مولوی مقرر ہوئے تو اردو فارسی کے علوم متداولہ کے لیے الگ الگ استادوں کا اہتمام کیا گیا۔ جعفر حسین ابتداہی سے مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ فطرتاً شوخ و شریر تھے۔ اس لیے اپنے استادوں کے [illegible] کبھی کبھی شوخی و شرارت کا مظاہرہ [illegible] دوستوں میں ماسٹر گھونٹا کے نام سے مشہور تھے [illegible] شہرت انکی [illegible] پر تھی۔ ایک دن منظر نے [illegible] اس طرح نقل

کیا کہ وہ گھوڑے کی تصویر بن گئی۔ (جیسے کہ آجکل تعویذ لکھے جاتے ہیں) ماسٹر صاحب نے جب نقل کی کاپی اٹھا کر ان کی اس شرارت کو دیکھا تو بجائے ناراض ہونے کے حد درجہ محظوظ ہوئے اور ان کی ہمت افزائی کی کہ وہ طغرا نویسی میں مزید کوشش کریں۔ الغرض جعفر حسین کی تعلیم و تربیت اسی قسم کے ماحول میں گھر کی چہار دیواری کے اندر ہوئی۔

منظر کے ماموں منشی مہدی حسن جن کا تخلص احسن تھا اپنے زمانے کے مشہور ڈرامہ نگار شاعر، ادیب اور تذکرہ نویس تھے۔ ان کے قریبی اعزا میں ایک دوسری بزرگ ذات منے مرزا شرر لکھنوی کی تھی۔ خود انکے بڑے بھائی قیصر حسین شعر و سخن سے دلچسپی کی بنا پر قیصر تخلص رکھتے تھے۔ اور ایک کامیاب شاعر تھے۔ جعفر حسین کو اپنے انہیں بزرگوں کے سایہ میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شرر کے مزاج پر سنک کا غلبہ نہیں ہوا تھا۔ جب ان میں سنک کے شدید آثار پائے جانے لگے تو منظر صاحب نے اپنے ماموں مہدی حسن احسن سے اصلاح کی درخواست کی اس طرح منظر لکھنوی کو اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے ہی میں یکے بعد دیگرے ایسے رہنما مل گئے جو انہیں منزل تک پہونچانے کی پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔ منظر کی پرورش بڑے ناز و نعم کے ساتھ ہوئی تھی۔ میر آغا کے علاوہ ان کی ایک پھوپی بھی انہیں بہت زیادہ چاہتی تھیں وہ صاحب املاک تھیں۔ اور سستے زمانے میں بھی انکی سالانہ آمدنی کافی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی منظر کو معاشی بحران کا شکار نہیں ہونے دیا۔

منظر لکھنوی نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مشاعروں کی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ کے ہر در و دیوار سے تغزل کی موجیں ابل رہی تھیں۔ اساتذہ نووارد شعراء کی پذیرائی کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر طرف سے منظر لکھنوی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ منظر کی فطری طبعی شوخی اور لحن نے اشعار میں چار چاند لگا دیے۔ شعراء کی عام روش کے برخلاف ان کے کلام میں ایک نشاطیہ کیفیت پائی جاتی تھی۔ جسے لکھنؤ کے روزمرہ کی لطافتوں کے ساتھ ترتیب دیا جاتا تھا منظر نے اپنے عہد کے شاعروں میں بہت جلد اپنی جگہ بنا لی اتفاق سے منظر کے ہم عمر شعراء میں ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کے خوش فکر اور خوش گو شعراء کا ایک نیا حلقہ ترتیب پانے لگا۔ ان نوجوان شعراء نے قدیم اساتذہ کے حلقوں سے الگ اپنا ایک حلقہ ترتیب دیا اور اسے شعراء کی ینگ پارٹی کے نام سے متعارف کرایا۔

ینگ پارٹی کے پلیٹ فارم سے منظر صاحب بہت جلد مشہور و مقبول ہو گئے اب وہ بیرونی مشاعروں میں بھی بلائے جانے لگے۔ منظر صاحب زمانہ شباب میں ہی گراں گوشی کا شکار ہو گئے۔ گویا زبان حال سے کہتے تھے۔

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

ان کی گراں گوشی کے بعض لطیفے مشہور ہیں۔ اپنی اس مجبوری کا وہ خود بھی دل کھول کر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ منظر صاحب کے اخیر زمانہ شاعری میں معز لکھنوی کے ایک شاگرد کمال لکھنوی نے مشاعروں میں شرکت شروع کی۔ کمال اچھا کہتے اور اچھا پڑھتے لیکن اس زمانے میں انکی بلند آوازی کے آگے اسپیکر کی آواز کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ سینے میں بھی اتنی جان تھی کہ دو دو تین تین غزلیں مسلسل پڑھ ڈالتے تھے۔ کمال لکھنوی سے مخاطب ہو کر ایک دن منظر صاحب نے انکی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ "تنہا تم ہی لکھنؤ میں شاعر ہو اور کوئی دوسرا نہیں۔ کمال اپنے دل میں اس تعریف کو سن کر اور حوصلہ افزائی کے اس انداز کو دیکھ کر ابھی حیران اور متعجب ہی تھے کہ انہوں نے فرمایا میاں مشاعرہ میں میں سن ہی نہیں پاتا کہ کوئی کیا پڑھ رہا ہے البتہ دوسروں کی سماعت پر اعتبار کر کے تعریف کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہوں تم وہ واحد شاعر ہو جسکے شعر میری سماعت تک پہونچتے ہیں۔" کمال منظر صاحب کی یہ بات سن کر بیساختہ مسکرا دیے۔

ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔

شہنشاہ بلڈنگ نخاس، لکھنؤ کی بالائی نشست گاہ میں ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی اس کے بانی و منتظم خود جناب بادشاہ حسین بقا لکھنوی (اسپیشل مجسٹریٹ) تھے۔ دور کا مشاعرہ تھا۔ مبتدی اور نو آموز شعراء اپنی جگہ سے اپنا کلام سنا رہے تھے انہیں میں سے ایک صاحب نے غزل شروع کی تو مطلع سنتے ہی داد تحسین کا شور بلند ہونے لگا۔ منظر صاحب نے حسب عادت بغیر شعر سنے ہاتھ اٹھا کر تعریف کی۔ متعدد بار مطلع پڑھنے کے بعد شاعر نے دو شعر اور پڑھے وہ بھی مطلع ہی کی طرح کامیاب ثابت ہوئے اور منظر صاحب بھی حسب عادت تعریف کرتے رہے۔ پھر بیٹھے بیٹھے طبیعت بے چین ہوئی اور ذوق سخن فہمی نے زور مارا تو ماچس کی تیلی میں روئی لپیٹ کر کان میں پھریری کی جس سے سماعت کو سہارا ملا اب نہایت متوجہ ہو کر ان شاعر کا کلام سننے کی کوشش کرنے لگے۔ پڑھتے شعر کا پہلا مصرع سمجھ میں آتے ہی منظر صاحب کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور پھر جب اس کا دوسرا مصرع

شاعر نے پڑھا اور مجمع سے داد تحسین کا غلغلہ اٹھا تو منظر صاحب ضبط نہ کرسکے چھڑی ٹیک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے میاں! میری غزل کیوں سوارت کر رہے ہو کوئی اپنی غزل پڑھو۔

منظر صاحب وضع دار انسان تھے انہوں نے اپنے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیا اور جب بھی کبھی ان کے معمول میں فرق پڑا تو اس کا سبب کوئی ذاتی مجبوری ہی ثابت ہوتی۔ منظر صاحب جیسے وضع دار آدمی تھے ویسی ہی وضع داری کے دوسروں سے بھی خواہاں تھے۔ انکی روزمرہ کی نشست میں شریک ہونے والے افراد میں سے اگر کوئی فرد کسی دن نہ پہونچتا تو دوسرے دن وہ اسکی خیریت دریافت کرنے ضرور جاتے۔

منظر صاحب ریاست رام پور کے والی کی تحریک پر کچھ عرصہ دربار رام پور سے بھی وابستہ رہے۔ جہاں انکے تمام ضروریات زندگی کی ذمہ داریاں ریاست کی طرف سے پوری کی جاتی تھیں اور ماہانہ مشاعرہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن منظر صاحب کا دل رام پور میں لگ نہ سکا اس لیے مختصر قیام کے بعد نواب سے اجازت لے کر لکھنؤ چلے آئے اور پھر دوبارہ رام پور کا رخ نہ کیا۔

رائے گوہ کے راجہ چکر دھر سنگھ نے جو فرحت تخلص کرتے تھے شعر و شاعری کے بہت دلدادہ تھے اور منظر صاحب کے مخصوص قدردانوں میں تھے۔ اکثر ریاست میں مشاعرے منعقد کراتے اور منظر صاحب کو بلاتے رہتے تھے۔ یوں تو انہوں نے منظر صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ منظر صاحب رائے گوہ میں قیام کرنا منظور کرلیں لیکن منظر صاحب کبھی اس بات پر تیار نہ ہوتے تھے لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب منظر صاحب راجہ صاحب کے اصرار سے مجبور ہو کر رائے گوہ کے قیام پر آمادہ ہو گئے چنانچہ راجہ صاحب انہیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ رائے گوہ لے گئے یہاں تقریباً دو سال تک منظر صاحب مقیم رہے۔ بالآخر کسی بہانے سے لکھنؤ واپس آئے اور پھر رائے گوہ نہیں گئے۔

منظر ان خوش قسمت شاعروں میں سے تھے جنہوں نے اردو ادب کی دنیا میں بہت جلد شہرت اور اعتبار حاصل کرلیا اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی ختم ہوتے ہوتے انہوں نے ایک پسندیدہ شاعر کی حیثیت سے دلوں میں اپنی ایک الگ جگہ بنائی اور ان کے اشعار مشاعروں کی فضا سے نکل کر ادب دوستوں کی زبانوں پر آگئے۔

لیتھو سے آفسیٹ تک

صفحہ ۲۵ کا بقیہ

ممکن ہے۔

آف سیٹ میں کتابت سفید چکنے کاغذ پر کی جاتی ہے۔ سطر بالکل سفید ہونے کی وجہ سے پروف ریڈنگ میں آسانی ہوتی ہے اور غلطیوں کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ نگیٹو بھی محفوظ کیے جا سکتے ہیں اور کسی بد احتیاطی کے سبب خراب ہو جائیں تو نگیٹو دوبارہ بنایا جا سکتا ہے۔ آفسیٹ کے ذریعہ طباعت کم وقت میں بہت تیز رفتاری سے کی جا سکتی ہے۔

اس وقت ریاست کے تقریباً سارے ہی بڑے شہروں میں آفسیٹ پریس قائم ہیں جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ خود لکھنؤ میں درجنوں آفسیٹ پریس ہیں جن میں بہار گو پریس، یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، تنویر پریس، پریم پرنٹنگ پریس، پرکاش پیکیجرس اور نیلکو پریس وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اتر پردیش میں آفسیٹ کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں یہاں طباعت کے نرخ دہلی کے مقابلہ میں زائد ہیں اور متعدد پبلشر طباعت کے کام کے لیے دہلی کا رُخ کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں طباعت کا نرخ زیادہ ہونے کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ یہاں کام کی وہ ریل پیل نہیں ہے جو دہلی اور دوسرے بڑے شہروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ چنانچہ یہ اُمید کرنا بے جا نہ ہوگا کہ معاشی سرگرمیوں میں جوں جوں اضافہ ہوگا، یہ فرق کم ہوتا جائے گا۔ □□

غزل

زمانے کو جو بیش و کم جانتے ہیں
وہی فرقِ دیر و حرم جانتے ہیں
محبت کی راہوں کے ان پیچ و خم کو
نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں
تراشا ہے عالم نے کیوں زندگی بھر
یہ سب پتھروں کے صنم جانتے ہیں

عالم قریشی
۱۴۴-۴۰۳، اصالت پورہ، مراد آباد

پروفیسر نیر مسعود اور مولانا واضح رشید ندوی کو صدر جمہوریہ ہند کا خصوصی اعزاز

اُردو اور فارسی کے ممتاز اسکالر، ادیب، دانش ور اور اُستاد ڈاکٹر نیر مسعود کو فارسی ادبیات کے نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند نے خصوصی اعزاز سے نوازا ہے۔ اس اعزاز و اکرام کے لیے ادارہ نیا دور انھیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

پروفیسر نیر مسعود نے فارسی اور اُردو ادبیات کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کی اب تک متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں فارسی ادبیات و تحقیق کے علاوہ فارسی شاعری، ڈرامہ اور فکشن سے متعلق تراجم بھی شامل ہیں۔ اُردو میں ان کے دو افسانوی مجموعوں کے علاوہ ایک سفرنامہ اور مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ نیر صاحب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں الگ الگ موضوعات پر پی ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ فارسی میں ان کی تحقیق کا موضوع 'ملا صوفی مازندرانی' اور اُردو میں 'رجب علی بیگ سرور' تھے۔

پروفیسر نیر مسعود نے ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لکچرر کی حیثیت سے درس و تدریس کا آغاز کیا تھا۔ نومبر ۱۹۹۶ء تک وہ اسی شعبے میں صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

ذیل میں ان کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ خاکہ انھوں نے ہماری درخواست پر بطور خاص نیا دور کے لیے مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے لیے ہم ان کے انتہائی شکرگزار ہیں۔ ——— ایڈیٹر

نیر مسعود : مختصر حالات

پیدائش : لکھنؤ ۱۹۳۶ء

"میرے والد اور والدہ دونوں کا تعلق طبیبوں کے گھرانوں سے تھا، لیکن میرے دادا اور نانا دونوں اپنے خاندانی سلسلے کے آخری طبیب تھے۔ میرے والد پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اور اُردو کے اُستاد تھے۔ ان کا کتب خانہ اُردو کی علمی دُنیا میں مشہور تھا۔ میری ادبی تربیت میں سب سے بڑا حصہ والد مرحوم اور ان کے کتب خانے کا ہے۔

میری تعلیم معمولی درس گاہوں میں ہوئی۔ اوسط درجے کا طالب علم تھا نصابی کتابوں سے زیادہ اِدھر اُدھر کی چیزیں، خصوصاً افسانے، ناول پڑھا کرتا تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی سے اُردو، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۶ء تک لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتا رہا۔

۱۹۷۱ء میں شادی ہوئی (اتفاق سے بیوی بھی طبیبوں کے گھرانے سے ہیں اور ان کے والد بھی اپنے خاندان کے آخری طبیب تھے) ایک بیٹا، تین بیٹیاں ہیں۔

لڑکپن میں کچھ نظمیں، افسانے، ڈرامے، بچوں کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ۱۹۶۵ء سے تنقیدی تحقیقی تحریروں کی اشاعت شروع ہوئی۔ شمس الرحمان فاروقی کی دوستی نے لکھنے کے شوق کو مہمیز کیا۔ ۱۹۷۱ء میں پہلا افسانہ "نصرت" لکھا۔ یہ افسانہ اور پہلے مجموعے "سیمیا" کے باقی سب افسانے فاروقی کے رسالے "شب خون" (الٰہ آباد) میں شائع ہوئے۔ افسانہ نویسی کی رفتار تیز نہیں ہے۔ چھبیس (۲۶) برس میں تیس (۳۰) افسانے لکھے ہیں۔ ترجمہ کرنے کا بہت شوق ہے لیکن مہارت نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ ترجمے نہیں کر پاتا۔ کافکا کی بیش تحریریں

اور فارسی کی پندرہ کہانیوں اور کچھ نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ کبھی ساز بجالیتا تھا۔ خطاطی، مصوری، موسیقی کا شوق رہا ہے۔ معماری، پلمبری، بڑھئی گیری اور بجلی کا کام صرف اتنا جانتا ہوں کہ گھر پر معمولی مرمّت کے کام کے لیے مستری کی محتاجی نہیں ہے۔ جلد سازی باقاعدہ سیکھی ہے۔ اصل مشغلہ بہرحال پڑھنا اور کبھی کبھی لکھنا ہے۔ تیرہ کتابیں اور دو سو سے کچھ اوپر مضامین وغیرہ چھپ چکے ہیں۔ سفر اور مجلسی زندگی سے گریز کرتا ہوں، لیکن دوستوں سے خط و کتابت، گھر پر آنے والے ملاقاتیوں اور ملازمت نے خارجی دنیا سے بے تعلق نہیں ہونے دیا۔

کتابیں

۱. مشاعرہ (بچوں کے لیے) — ۱۹۵۵ء
۲. ترجمۂ حکیم نباتات (فارسی ڈرامہ کا ترجمہ) — ۱۹۶۶ء
۳. رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے — ۱۹۶۷ء
۴. تعبیرِ غالب — ۱۹۷۳ء
۵. کافکا کے افسانے (ترجمہ) — ۱۹۷۸ء
۶. دولھا صاحب عروج — ۱۹۸۰ء
۷. دیوانِ فارسی میر تقی میر — ۱۹۸۳ء
۸. سیمیا (افسانے) — ۱۹۸۴ء
۹. خطوطِ مشاہیر بہ نام مسعود حسن ادیب — ۱۹۸۴ء
۱۰. سوتا جاگتا (بچوں کے لیے ڈراما) — ۱۹۸۵ء
۱۱. انتخاب بُستانِ حکمت — ۱۹۸۸ء
۱۲. مرثیہ خوانی کا فن — ۱۹۸۹ء
۱۳. عطرِ کافور (افسانے) — ۱۹۹۰ء
۱۴. شفاء الدولہ کی سرگذشت — ۱۹۹۰ء
۱۵. بزمِ انیس — ۱۹۹۰ء
۱۶. یگانہ: احوال و آثار — ۱۹۹۰ء
۱۷. [illegible] (افسانے) — ۱۹۹۰ء

۱۹. ایرانی کہانیاں (ترجمے)
۲۰. شفاء الدولہ کی سرگذشت

انعامات

۱۹۶۷ء "رجب علی بیگ سرور" پر انعام منجانب حکومت اترپردیش
۱۹۶۷ء " " آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنؤ
۱۹۷۱ء "تعبیرِ غالب" " اترپردیش اُردو اکاڈمی لکھنؤ
۱۹۷۸ء "کافکا کے افسانے" " "
۱۹۸۴ء "سیمیا" " "
۱۹۹۰ء "عطرِ کافور" " "
۱۹۹۱ء سندِ افتخارِ میر منجانب آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنؤ
۱۹۹۳ء افسانہ "رے خاندان کے آثار" پر کتھا ایوارڈ منجانب "کتھا" نئی دہلی
۱۹۹۵ء مجموعی ادبی خدمات پر اترپردیش اُردو اکادمی انعام
۱۹۹۷ء فارسی کی خدمات پر سندِ اعزاز منجانب صدرِ جمہوریۂ ہند

مولانا واضح رشید ندوی

صدرِ جمہوریۂ ہند نے اس سال عربی زبان و ادب میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ادبِ عربی کے استاذ مولانا سیّد واضح رشید ندوی کو خصوصی اعزاز سے نوازا ہے۔

مولانا واضح رشید ندوی ادب کے استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ عربی کے کہنہ مشق صحافی اور انشا پرداز ہیں، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عربی اخبار پندرہ روزہ "الرائد" کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

مولانا واضح رشید ندوی نے مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کی معرکۃ الآرا کتاب "مذہب و عقلیات" کا عربی میں ترجمہ کیا جو بلادِ عربیہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ادبِ عربی کے جدید نصاب کی تیاری میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ "تاریخِ ادبِ عربی" کی ترتیب میں بھی انھوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر عربی کتابچے بھی تحریر کیے۔ "ادب الصحوۃ الاسلامیہ" بھی ان کی قابلِ ذکر اہم کتاب ہے۔

ادارہ نیا دور مولانا کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "زندگی وصل ہے" (شعری مجموعہ)
شاعر: انیس انصاری   قیمت ۲۰۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: معیار پبلیکیشنز، کے۔۳۰۲، تاج انکلیو، گیتا کالونی
دہلی۔ ۱۱۰۰۳۱

"زندگی وصل ہے" جدید اسلوب کے شاعر انیس انصاری کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی ۳۴ صفحات میں شاعر نے اپنے حالاتِ حیات، مزاج، افتادِ طبع اور مجموعی شاعرانہ شخصیت کا تجزیاتی مطالعہ، نیز اپنی فنی ترجیحات کا اعلانیہ، واحد غائب متکلّم کے پیرائے میں پیش کیا ہے، جس سے اس کی شاعری کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ یوں بھی انیس انصاری کے کلام میں ان کی شخصیت کی قوسِ قزح کے ساتوں رنگ موجود ہیں۔ فکر و خیال کی تازگی اس کے علاوہ ہے۔

انیس انصاری کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ جب تیری سمندر کی آنکھوں میں۔ تم جو خاموش ہو۔ بھٹکی ہوئی کہانی اور پنچھی، جھیل اور کشتی جیسی نظموں میں ان کے تلخ و شیریں محسوسات کا ایسا منظر نامہ ملتا ہے، جس میں بدن کی پکار بھی ہے اور دھرتی کے سینے پر اُگے ہوئے کانٹوں کی چبھن کا علامیہ بھی۔ فنی اعتبار سے بھی ان کی نظموں کا در و بست کافی مستحکم نظر آتا ہے۔

میں دُھوپ سفر سے لوٹا ہوں
اپنے اندر رہ جانے دو
ان گہری سمندر آنکھوں میں
اِک خواب جزیرہ پانے دو

غزلوں میں ان کی شاعری کا چاند رنگ پہلی ہی نظر میں متوجہ کر لیتا ہے۔ ان کے اشعار میں ایسی تازگی اور ندرت موجود ہے، جس سے اُن کی انفرادی شاعرانہ شناخت از خود متعین ہونے لگتی ہے۔ اُردو، ہندی کے نرم، رسیلے شبدوں کا خوش گوار اتصال اُن کے کلام میں ایک نئی جوت جگاتا ہے، اور ان کی کہانی بھی، زندگی کے نئے جزیروں کی کھوج کی ایک مانوس کہانی بن جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نئے استعارات اور تشبیہات، نیز سمعی و بصری پیکروں سے ان کی شاعری اور بھی دل آویز معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثلاً ؎

تمہاری زُلفیں ہیں وصل کی شب کا نرم جادو
ہم ان کو صندل کے جنگلوں کی ہوا کہیں گے

آخری فلیپ پر طبع شدہ نظم "زندگی وصل ہے" اس کتاب کے نام کا خوبصورت جواز پیش کرتی ہے۔ ان کے اشعار کی طرح، ان کی اس کتاب کا ظاہری رنگ رُوپ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کاغذ، کتابت (کمپیوٹر کمپوزنگ)، طباعت، سرورق، شیرازہ بندی۔ ہر چیز قدرِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک تازہ کار شاعر کا یہ تازہ ترین مجموعۂ کلام اُردو شاعری کی دُنیا میں دیر تک یاد رکھا جائے گا۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: "صبا نِدا" (شعری مجموعہ)
شاعر: ضیا قادری   قیمت: ۳۰۱/- روپئے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد
لکھنؤ

ضیا قادری اُردو کے ان شاعروں میں ہیں، جن پر کوئی لیبل نہیں چسپاں کیا جا سکتا۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ضیا ایک ترقی پسند شاعر ہیں، یا جدیدیت کے علمبردار ہیں یا یہ کہ کلاسیکی روایات کے شاعر ہیں۔ مگر ان تینوں رجحانات کی خصوصیات ان کی شاعری میں مل جاتی ہیں، ان کے یہاں روایتی زبان و اسلوب بھی موجود ہے اور ترقی پسندی اور جدیدیت کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچے فن کار پر اس طرح کا کوئی لیبل لگایا بھی نہیں جا سکتا، نہ لگانا چاہیے۔ لیکن ہم نے اسی طرح کے سانچے بنا رکھے ہیں اور انہی سانچوں پر ہم ہر فن کار کو پرکھتے ہیں، اور اس ضمن میں عصبیت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

ترقی پسندوں کی اچھی شاعری کو بھی جدیدیے نظر انداز کرتے ہیں اور جدیدیت کے تحت جو اچھی شاعری وجود میں آئی اسے ترقی پسند تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تنگ نظری اور عصبیت نہیں تو اور کیا ہے؟

جہاں تک ضیا قادری کے اولین شعری مجموعے "صبا ندا" کا تعلق ہے، وہ دراصل ان کے تخلیقی سفر کا پہلا پڑاؤ ہے، جو ادب شناس لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کی لفظیات بھی پرانی اور نئی زبان کا سنگم ہیں۔ ان کے یہاں شہر وفا، دست ستم، شیخ حرم، مقتل، نشیمن، آشیاں، پیر مغاں، خزاں، گلستاں، صیاد، باغباں، اسیر قفس، برق تپاں اور حریم ناز جیسی ترکیبیں بھی ملتی ہیں اور بنگلے، سڑک، سلیٹ، کار، ٹائر، پتھر، کلنڈر، اخبار، کسان، لگان، گوالن، پیپیرا اور پوسٹر جیسے الفاظ کا استعمال بھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ روایات سے بھی منہ نہیں موڑتے اور نئی حسیت بھی ان کے یہاں موجود ہے۔

ندا فاضلی اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

شرافت، آدمیت، دردمندی
بڑے شہروں میں بیماری سے بچیے

ضیا قادری اسی بات کو بالکل دوسرے انداز میں کہتے ہیں ؎

پیار، اخلاص، حسن، ہمدردی
شہر یہ لاجواب دیکھا ہے
آپ اس پر یقین مت کیجیے
ایک شاعر نے خواب دیکھا ہے

ندا فاضلی کے یہاں طنز ہے، لیکن ضیا قادری کے یہاں طنز کے ساتھ کسک بھی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر ہے ؎

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

ضیا قادری اس بات کو اپنے انداز میں اس طرح کہتے ہیں ؎

آوازِ پا نے آپ کی چونکا دیا مجھے
اب پھر ہوا نے دیکھیے دھوکا دیا مجھے

—— شاہنواز قریشی

نام کتاب: "اوٹ پٹانگ" (طنز و مزاح)
مصنف: مختار ٹونکی — قیمت: ساٹھ روپے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت
دہلی-۱۱۰۰۰۶

مختار ٹونکی کا شمار اردو ادب کے اچھے مزاح نگاروں میں کیا جانا چاہیے۔ ان کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز بھی ملتا ہے جو ایک مزاح نگار کو کامیاب مزاح نگار بنا دیتا ہے۔ ان کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کسی بھی مزاحیہ صورت حال کے پس پردہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں پر طنز اور ان کی اصلاح کا سبق بھی ملتا ہے۔ انھیں لفظوں کی جادوگری اور مزاحیہ انداز بیان پر قدرت حاصل ہے۔ دراصل مختار ٹونکی نے اردو کے کلاسکی ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے لہٰذا ان کے یہاں لفظوں کی جادوگری کا خوبصورت انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔

کتاب "اوٹ پٹانگ" بظاہر تو مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اسکے پیچھے چھپے طنز کو قاری شدت سے محسوس کر سکتا ہے۔ مصنف نے مزاحیہ مضامین کے ذریعے موجودہ سماج میں تیز رفتاری سے پھیلتی ہوئی ان تمام برائیوں کا پردہ فاش کیا ہے جو عام طور پر انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکی ہیں یا آہستہ آہستہ بنتی جارہی ہیں۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اگر ایک طرف وہ اپنی ظریفانہ سرگوشیوں سے انسان کو اس کے غموں سے نجات دلاتا ہے تو دوسری طرف اپنے طنزیہ نشتروں سے معلم قوم بھی واقع ہوا ہے اس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انسان کو اس کے اندر موجود معائب سے نہ صرف روشناس کرایا ہے بلکہ ان کی اصلاح کا سبق بھی دیا ہے تاکہ وہ اپنی ان اوٹ پٹانگ حرکتوں سے اجتناب کرے۔

یہ کتاب پندرہ مختلف عنوانات پر منقسم ہے اور ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ مجتبیٰ حسین نے لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ عمدہ کاغذ پر چھپی یہ کتاب، کتابت اور طباعت کی غلطیوں سے پاک ہے لیکن اس کی قیمت عام قاری کی پہونچ سے کچھ زیادہ ہے۔

—— ڈاکٹر محبوب جہاں

نام کتاب: "اشرفُ التّوارِیخ"
مُصنّف: سیّد سفیر احمد اشرفی   قیمت: ۱۰۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: سید سفیر احمد اشرفی، موضع پورہ شاہ کامگار، پوسٹ پٹرنگا
ضلع بارہ بنکی

شیخ عبدالقادر جیلانی و مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کی حیاتِ مبارکہ پاکیزہ حالات و کمالات نیز تصوّف اور اس کے رموز و نکات کی تشریحات و تفصیلات پر مشتمل "اشرفُ التواریخ" کے عنوان سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی ہے۔

اس کتاب کے مُصنّف سیّد شاہ سفیر احمد اشرفی صاحب ہیں، جن کے آباو اجداد کچھوچھہ شریف ضلع فیض آباد (حال امبیڈکر نگر) سے ترکِ مکانی کے بعد کئی پشتوں سے ضلع بارہ بنکی کے موضع پورہ شاہ کامگار میں آباد و سکونت پذیر ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنّف کا تبحرِ علمی و رُوحانی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس تصنیف سے عام آدمی تصوّف جیسے دقیق موضوع سے واقف ہوکر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کتاب کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ اس کا مسوّدہ آج سے تقریباً تین دہائی قبل قلم بند کیا گیا تھا اور جس پر مولانا عبدالماجد دریابادی و شاہ معین الدین ندوی جیسے مستند و باکمال بزرگوں نے اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ اب جب کہ یہ کتاب شائع ہوئی ہے تو ان حضرات کی قیمتی آرا بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

فاضل مصنّف نے اپنی اس کتاب میں تصوّف اور اس کے متعلقات و مروجہ مراسم پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، جگہ جگہ مناسب موقعوں پر قرآنی آیات احادیثِ نبویؐ نیز اُردو و فارسی کے بہترین اشعار سے کتاب کو مزیّن کیا گیا ہے، جس سے یہ کتاب بہ لحاظ موضوع و اسلوب نہایت دقیع اور دل کش ہوجاتی ہے۔

۲۷۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دراصل مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی و دیگر بزرگانِ دین سے محبت و دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک عرفانی و روحانی سوغات ہے۔ کتاب کو اُردو کی عام لائبریریوں میں ضرور محفوظ کیا جانا چاہیئے۔

——— ڈاکٹر انور حُسین خاں

نام کتاب: "دَرد" (شعری مجموعہ)
مصنّف: سید انور سعید انوَر   قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: رجسٹرار سس ریزیڈنس۔ جامعہ اُردو کیمپس، جامعہ اُردو علی گڑھ

سید انور سعید انور کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں نہ کسی کی تقریظ، نہ دیباچہ، نہ کسی کی زبان سے مصنّف کی تعریف ہے۔ تقریظیں اور مصنف کی تعریف نہ شامل کرکے انھوں نے مستحسن اقدام کیا ہے۔ انھوں نے نہ کسی کو استاد بنایا ہے نہ کسی سے اصلاح لی۔ خداداد صلاحیت اور احساس نے جو کچھ دکھایا اس کو قلم بند کرکے نظم کی شکل دے دی۔

انور سعید نے جہاں حُسن و محبّت کا دامن نہیں چھوڑا ہے وہیں غمِ دوراں عزم و حوصلہ، جدوجہد امکانات اور سماج کی بے راہ روی کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مثلاً ؎

اے طائرِ محبّت پرواز تو بڑھا لے
یہ آسماں کے تارے نیچے نہ آ سکیں گے

انوَر صاحب کا تعلق چونکہ رام پور سے ہے اور علی گڑھ میں قیام ہے اس لیے زبان نہایت شائستہ، سہل مگر اکھڑ ہے۔ بیباکی اور صاف گوئی ان کا حصّہ ہے ؎

وہ تھکا ماندہ دور ہے بس ایک بچّے کی طرح
خود ہی گرتا جائے ہے گر کے سنبھلتا جائے ہے

شعری مجموعہ "دَرد" اُردو ادب میں زبان کی سادگی اور بلند خیالی کی وجہ سے عوام و خواص میں پسند کیا جائے گا۔ اگر اسی طرح انوَر کا قلم رواں دواں رہا تو اردو دُنیا ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے۔

——— (مولانا) اسحاق سنبھلی

نام کتاب: "ٹھنڈا خون" (افسانے)
مصنّف: محمد اطہر مسعود خاں   قیمت: ۶۰ روپئے
ملنے کا پتہ: تخلیق کار پبلشرز۔ ۹-۱۷۰۰، کوچہ دکھنی سرائے
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

محمد اطہر مسعود خاں پچھلی دو دہائیوں سے افسانے لکھ رہے ہیں اور ملک کے

ادبی و نیم ادبی رسائل میں تسلسل سے چھپ بھی رہے ہیں۔

"ٹھنڈا خون" اطہر خاں کے ۳۸ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جس کی کچھ کہانیاں، عقیدت کے پھول۔ پیشگی شکریہ۔ معیار۔ آئینہ اور عکس، افسانچوں کے زمرے میں آتی ہیں۔ انھوں نے واقعیت نگاری پر زور دیا ہے اور فن کارانہ ادراک کے ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کی کوشش کی ہے۔

انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اور پرکھا، اس کا اظہار بڑی بیباکی سے کیا ہے۔ ان کی بیشتر مختصر کہانیاں، بیانیہ اور مکالماتی ہیں جن کے موضوعات، بھوک۔ رشوت۔ قتل و فساد اور کرفیو، وغیرہ پر مبنی ہیں۔ مثلاً: منشی بھر نام، معیار، کرچیں، فرشتہ، ٹھنڈا خون وغیرہ۔

میرے خیال سے "کوکھ کا درد" اس مجموعے کی سب سے زیادہ موثر کہانی ہے، جس میں اولاد کے سکھ کو ترسنے والی ایک معصوم عورت، شانتی دیوی کی ممتا کی پیاس، ہر دم افسانہ نگار کی آنکھوں میں تیرتی رہتی ہے۔ ایک طرف ایک جوان بانجھ عورت کا کردار، دوسری طرف کہانی کار، جو اس عورت کے پورے وجود کو اپنے افسانے میں متحرک رکھنا چاہتا ہے۔ اس عورت کو بیان کر کے مسعود خاں نے کافی حد تک خود کو بیان کیا ہے۔

ان کی کہانیوں کے کردار جیتے، جاگتے اور متحرک ہیں۔ زبان سادہ و سلیس ہے، مگر اس میں بھر پور معنویت کا احساس ہوتا ہے۔

مسعود خاں کے افسانوں میں مقصدیت کی جھلک زیادہ نمایاں ہے جو کبھی کبھی وحدتِ تاثر کو مجروح کر دیتی ہے۔ مستقبل میں اگر وہ اس خامی پر قابو پا سکے تو ان کے افسانے زیادہ پرکشش ہو سکتے ہیں۔

امید ہے کہ اطہر مسعود خاں کے اس پہلے افسانوی مجموعے کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

—— تسکین زیدی

نام کتاب: "روپیوں کا پیڑ" (افسانوی مجموعہ)
مصنف: رشید انور قیمت: ۷۵/- روپے
ملنے کا پتہ: ۸۔ امین نگر، نندن ون کالونی، اورنگ آباد
(۴۳۱۰۰۱)

رشید انور مہاراشٹر کے معروف ادیب ہیں اور تقریباً تین دہائیوں سے ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ زیر نظر افسانوی مجموعہ "روپیوں کا پیڑ" اگرچہ ان کی پہلی تخلیقی کاوش ہے لیکن بقول مصنف: "میرے طویل ادبی سفر کا نچوڑ اور میری زندگی کا حاصل ہے۔" ان کے افسانوں میں ایک تنوع اور رنگارنگی ہے۔ غیر ضروری جزئیات اور تفصیلات کی بھرمار سے پاک اور ذہن پر بار ہونے والے موضوع اور انداز بیان کی یکسانیت سے کوسوں دور ان کے افسانے قاری کی توجہ کو بے ساختہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں ان کے کردار سماج کے سبھی طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر طرح کے کردار کو اپنی فن کارانہ مہارت، وسعتِ مشاہدہ، معاشرتی تجربے اور پرکشش اسلوب سے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ سماج کے عام آدمی لگتے ہیں، ان میں سے بعض کردار دلوں پر ایک لازوال نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

رشید انور اپنے افسانوں میں اخلاقی قدروں کے زوال کا رونا نہیں روتے بلکہ ان حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان کا باعث ہیں۔ عریانیت اور فحاشی سے پاک ان کے افسانے چھوٹے بڑے سبھی پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کوئی بھی افسانہ ادھورا یا تشنہ نہیں ہے اور بعض جملے ایسے ہیں کہ جن میں پورے افسانے کی روح سمٹ آئی ہے۔

چودہ افسانوں کے اس مجموعے پر ڈاکٹر عصمت جاوید نے مقدمہ لکھا ہے۔ خوبصورت و دیدہ زیب کتابت و طباعت، دل کش و جاذب نظر سرورق اور عمدہ کاغذ سے مصنف کے سلیقے کا پتہ چلتا ہے

—— ڈاکٹر محمد کمال الدین کاکوروی

جلد (۵۲) نمبر (۹)

عنوانات

اپنی بات

سنہ ۱۹۹۷ء عروج و زوال اور نشیب و فراز کا سال رہا۔ اگر ایک طرف انسانی عزم و ارادہ اُمنگ و حوصلہ کا مظہر تلاش راہ (PATH FINDER) جس نے مریخ پر پہنچ کر اہم معلومات زمین والوں تک پہنچائیں اور پتہ لگایا کہ دو سو کروڑ سال پہلے مریخ کی سرزمین پر سیلاب آیا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کا وجود بہرحال مریخ پر بھی تھا۔ تو بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ سائنسداں جو باتیں بہت بعد میں کہتے ہیں، شاعر کا تخیّل بہت پہلے ان پر کمندیں ڈال دیتا ہے۔ اقبالؔ نے بہت پہلے کہا تھا ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

اس طرح کے چھوٹے بڑے بہت سے سائنسی کارنامے انجام دیے گئے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دُنیا میں انسانی زندگی کی ارزانی کی کہانی بھی بڑھنے کو ملی۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل تو اپنی جگہ، فطرت کا رویّہ بھی بے رحمی کا رہا۔ خصوصاً ایشیا کے لیے تو یہ سال بھیانک طور پر تباہ کن رہا۔ بنگلادیش میں زبردست طوفان آیا جس میں تقریباً چار ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ ایران میں ۱۰ مئی کو زلزلہ آیا جس میں تقریباً دس ہزار انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس سے قبل اپریل میں منیٰ میں بھیانک آتشزدگی سے حجاج کرام کی کثیر تعداد جاں بحق ہوئی جس میں ہندستانی حجاج بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں اسی سال اُردو کے ادیبوں کی بھی بڑی تعداد داغِ مفارقت دے گئی۔ نیا دور کے صفحات میں جنھیں نذرانۂ عقیدت پیش کیا جا چکا ہے۔

نیا دور نے اس سال، اپنی ادبی و صحافتی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے دو نمبر پیش کیے۔ ایک "فراق: صدی کی آواز" شائع ہوا، دوسرا نمبر آزادی کی نصف صدی پوری ہونے پر "یادگارِ آزادی نمبر" شائع کیا۔ حالاں کہ اس سے قبل نیا دور نصف صدی نمبر شائع کر چکا تھا، مگر 'یادگارِ آزادی نمبر' میں اس کا خاص التزام تھا کہ موضوعات کی تکرار نہ ہو، اس لحاظ سے یہ نمبر منفرد ثابت ہوا۔

اس نمبر کی اہلِ علم و ادب نے جس طرح پذیرائی کی ہے اس نے ہمارے حوصلے بلند ہوئے۔ دراصل یہی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہم اپنے کرم فرماؤں اور سرپرستوں کو یقین دلاتے ہیں کہ انشاءاللہ نیا دور اپنی سنہری روایات کے مطابق آپ کی خدمت میں ایسے ہی خصوصی، یادگاری اور معیاری نمبر پیش کرتا رہے گا۔

باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

سید امجد حسین
(ایڈیٹر)

غزل

غنچہ دہن جو صاعقۂ بادِ چمن ہوا
میرا ہر ایک زخمِ جگر خندہ زن ہوا

گرد و غبارِ راہ نے رکھ لی کسی کی لاج
کہتا ہے کون تیرا گدا بے کفن ہوا

نیچی نگاہِ ناز سے چھپ چھپ کے دیکھنا
شوخی ہوئی، ادا ہوئی یا بانکپن ہوا

مشاطگی کے فن سے بڑھی دختِ رز کی شان
بادہ وہی عزیز ہوا جو کہن ہوا

یوں اجنبی کی طرح سے جینا پڑا اسے مجھے
اپنے وطن میں جیسے غریب الوطن ہوا

مرنے کے بعد میرے لیے اس کا فائدہ
مقبولِ خاص و عام جو میرا سخن ہوا

خندہ دہانِ زخم سے مے ستعار کیا
تقدیر ہی میں گر یہاں رنج و محن ہوا

کاٹے ہیں دن پہاڑ سے طغیانیوں میں رات
سنگِ گرانِ زیست میں تب کوہکن ہوا

چھپتے نہیں ہیں لاکھ چھپانے سے بھی کبھی
کافور ہو کہ عشق کہ مشکِ ختن ہوا

اس کو ہو ماسوا کی خوشامد کہاں پسند
جو شخص اپنی ذات سے اک انجمن ہوا

کرتی ہے ہر نگاہ زلیخا صفت تلاش
گلزار گویا یوسفِ گل پیرہن ہوا

□□

گلزار زتشی دہلوی
ی ۱۹۹۶ سیکٹر ۲۳ نوئیڈا
۲۰۱۳۰۱

علی جواد زیدی
۱۰/۳/۲ - وشواس کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

یادوں کی رہ گزر

(۱۳)

بعض صاحب نظر قارئین نے فرمائش آمیز شکایت کی ہے کہ:

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اِن یادوں کا سلسلہ نیا دور کے "اودھ نمبر" کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی سے شروع ہوا تھا۔ یہ میری نوجوانی کی حکایت تھی۔ پھر سلسلہ در سلسلہ سرگزشت بڑھتی رہی۔ عام ناظرین نے پُرانے لکھنؤ کے دل کش افسانے سُن رکھے ہیں اس لیے ان کا اصرار ہے کہ میری آنکھوں نے گزرے ہوئے دور میں جو کچھ دیکھا، وہ بھی میں ضرور بیان کروں۔ اس وقت گرد و پیش کو کیسا پایا اور زندگی کو کس طرح برتا؟۔ میرا بچپن لکھنؤ سے دُور 'پورب دیس' میں گزرا۔ لکھنؤ سے میرے خاندان والوں ہی کے نہیں بلکہ پورے 'پورب دیس' کے گہرے ثقافتی اور سماجی روابط رہے ہیں، اس لیے قارئین کی فرمائش پر یادوں کی رو موڑ دی ہے۔ یہ یادیں ہماری ثقافتی زندگی کی بعض ارتقائی منزلوں کی نشاندہی کریں گی۔ بیاسی طویل برسوں پر پھیلی ہوئی یہ یادیں ہیجان و تلاطم و انقلاب کی داستانوں سے چھلک رہی ہیں۔ اس سمندر کو کوزے میں بھرنے کی فرہادی کوشش آسان نہیں۔ خود میری ذات سے وابستہ یادیں متنوع، رنگا رنگ اور کئی صورتوں میں متحارب اور متضاد ہیں۔ تلخ و شیریں، ناقابلِ فراموش اور بھول جانے کے لائق ہوتے ہوئے بھی ہماری ثقافت اور ماضیِ قریب کی تاریخ کا حصّہ بن چکی ہیں۔

میں اس کش مکش اور تلاطم کے دَور میں تنہا بھی رہا ہوں اور اُن بڑے بڑے ہجوموں کے ساتھ بھی، جہاں "ہم کو بھی کچھ ہماری خبر" نہ آتی تھی۔ دوستوں کا حلقہ وسیع اور ہفت رنگ رہا ہے۔ اگر کبھی کسی سے مخالفت ہوئی بھی تو اس کی نوعیت ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر فکری اور نظریاتی تھی۔ جب مختلف اجتماعی عوامل کی بدولت فکر کی رو بدلی تو کل کے مخالف اچھے دوست نکلے۔ انھوں نے تشکیک و تجزیہ و انحراف کی منزلیں طے کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس اجتماعی اور انفرادی احتساب سے مجھے نئی نظر اور نئی روشنی ملی۔ اندھی تقلید کا میں قائل ہی نہیں! یہ چند بکھرے ہوئے اوراق علم تاریخی یا سوانحی تصنیف کی طرح کسی منصوبہ بند طریقے سے نہیں لکھے گئے ہیں۔ قاری کو ماضی کی منزلوں میں بعض اوقات دو قدم آگے اور تین قدم پیچھے چلنے کی نوبت آسکتی ہے۔ بات میں بات نکلتی آئی ہے۔ کوشش یہی رہی ہے کہ سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ کچھ سُنی سُنائی باتیں بھی ہیں خاص کر بچپن کے دَور میں، لیکن ان کے راوی معتبر ہیں اور بعد کے واقعات نے تصدیق کی ہے، یہ سماعی سچائیاں بے لوث اور بے لاگ ہیں۔

پُورَب دیس

ہر شخص کی طرح میں بھی بے نام پیدا ہوا تھا، لیکن وہ دھرتی بے نام نہیں تھی جہاں میرا وجود میں آنا مقسوم تھا۔ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے پچھڑے ہوئے پُورَب دیس نے، عظیم دریاؤں سے سینچے ہونے کے باوجود کبھی اچھے دن بھی دیکھے ہیں، لیکن یہاں سامراجوں کی لوٹ کھسوٹ کی ایک طویل تاریخ بھی ہے، اس کو جبراً پسماندہ بنایا گیا۔ اس نے ۱۸۵۷ء میں آزادی کی پہلی جنگ چھیڑ کر برطانوی سامراج کے چھکے چھڑا دیے تھے — اتر پردیش نے اس یادگار جنگ میں (جسے انگریزوں نے فوجی بغاوت کا نام دیا) ملک کے دوسرے حصّوں کے مقابلے میں بہت ہی فعال حصّہ لیا تھا اور مرکزی نقطۂ انقلاب بن گیا۔ بہار، بنگال، وسطی ہند، مہاراشٹر، گجرات، دکن سب لپیٹ میں آگئے۔ یہ جنگ ہی میرٹھ سے شروع ہوئی اور پہلے تو دارالحکومت دلّی کی طرف چلی اور پھر چاروں طرف خصوصیت سے پورب میں پھیل گئی۔

اِن میں بھی پُورب کے اضلاع اعظم گڑھ، غازی پور، بلیا، جون پُور، الہ آباد، بنارس، جھانسی، بریلی وغیرہ کے کارہائے نمایاں سب کو معلوم اور لوک گیتوں تک میں محفوظ ہیں۔ نزاکت اور نفاست کے لیے بدنام مرکز اودھ لکھنؤ نے سامراجی حکومت کی چولیں ہلادی تھیں۔ مرد تو مرد، رانی جھانسی کی طرح بیگم حضرت محل کے کارنامے اطراف و جوانب میں آج بھی فخر سے یاد کیے جاتے ہیں۔ سکندر باغ اور چنہٹ صرف چند نشان ہیں۔ آزادی کی لڑائی پورب برابر لڑتا رہا ــــ دوسری جنگِ عظیم میں ضلع بلیا پر مجاہدین نے قبضہ کرلیا تھا اور اعظم گڑھ کے تھانہ مدھوبن کا علاقہ بھی چھین لیا تھا۔ سامراج نے اس انقلابی مزاج اور اعمال کی یہ سزادی کہ اس علاقے کو اقتصادی اعتبار سے تباہ و برباد کر دیا اور کبھی اُبھرنے نہ دیا۔ پورب مسلسل تباہ سے تباہ تر ہوتا رہا۔

ضبطیٔ جاگیر

اس پورب دیس کی زراعت کو تباہ کیا گیا، صنعتوں کا گلا گھونٹ دیا گیا جاگیرداروں اور زمینداروں میں جس نے سر اٹھایا، اس کی جاگیریں اور زمینداریاں چھین لی گئیں۔ خود میرے خاندان کی جاگیر کے گیارہ گاؤں ضبط کر لیے گئے قصور یہ تھا کہ سن ستاون کی جنگِ آزادی کے خاتمے پر جاگیرداروں اور زمینداروں کو یہ ذلت آمیز حکم دیا گیا کہ وہ تحصیل میں بذات خود حاضر ہو کر اپنی جاگیر اور جائیداد کی تصدیق کریں۔ عدم تعمیل کو باغیانہ اقدام سمجھا جائے گا۔ میرے مورث نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ہماری فقیر منشی اس کو گوارا نہ کرسکی کہ ہم تحصیل میں حاضری دیں۔ لوگوں نے لاکھ کوشش کی لیکن نہ انگریز افسر شاہی مانی اور نہ ہمارے بزرگ۔ ڈر تھا کہ سارے بائیس گاؤں نکل جائیں گے۔ بالآخر ان کے چھوٹے بھائی نے کہا کہ میں تو اس خودکشی میں شریک نہ ہوں گا اور تحصیل جاکر نصف حصے کی تصدیق کر دوں گا۔ اس طرح گیارہ گاؤں تو بچ گئے۔ چھوٹے بھائی کا یہ عمل مورثِ اعلیٰ کی ناگواری کا باعث ہوا۔ البتہ چھوٹے بھائی نے اپنی طرف سے یہ کیا کہ اس کے آدھے پر اپنے بڑے بھائی کا نام لکھوا دیا۔ گیارہ گاؤں ضبط کر کے ایک خیر خواہ سرکار جاگیردار کو دے دیے گئے۔ اس ضبطی پر ہمارے بزرگوں نے اُف نہ کی بلکہ بہت خوش ہوئے کہ آن بان باقی رہی!

طوفان تھمنے کے بعد بھی ان پوربی اضلاع میں نئی اور اچھی سڑکیں بننا تو در کنار، ریلوے کی بڑی لائن بھی نہ آنے دی گئی ــــ چھوٹی لائن پر B. N. W. RLY. کی ٹرینیں چلتی تھیں جو اپنی سست روی میں بے مثال تھیں۔ ہم لوگ B. N. W. مخففات کی تشریح "بے ہودہ، نالائق، واہیات" ریلوے کیا کرتے تھے۔ ویسے یہ بنگال، نارتھ، ویسٹرن ریلوے تھی اور صرف شاہ گنج (جون پور) سے بلیا تک چلتی تھی۔ غازی پور، گونڈہ، بستی وغیرہ بھی یوں ہی مُوردِ الزام تھے۔ آبپاشی، تعلیم اور صحت کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کسان اور مزدور بدحال تھے۔ دیہاتوں بلکہ قصبوں تک سے تلاشِ معاش میں دُور کلکتہ، بمبئی، سُورت، بلکہ مدراس اور دیسی ریاستوں تک بھاگے پھرتے تھے۔ مجھے بچپن کے وہ دردناک مناظر کبھی نہیں بھولتے، جب ریلوے اسٹیشن پر کام کی تلاش میں جانے والا کوئی کسان، مزدور آتا تو اس کے ساتھ بیوی، بچّوں کے علاوہ گاؤں کے ساتھی اور دوست بھی اسے رُخصت کرنے آتے اور اس طرح پھوٹ پھوٹ کے روتے کہ خود میری آنکھیں نم ہو جاتیں۔ نہ جانے یہ جانے والا کہاں کہاں بھٹکتا پھرے گا اور کب دیس واپس آئے گا؟ ہمارے گاؤں میں برہا اور بدیسیا کے لوک گیت راتوں کا سنّاٹا توڑ دیا کرتے تھے اور کتنی سہاگنوں اور ماؤں بہنوں کے آنچل آنسوؤں سے بھیگ جاتے تھے، انھیں کی محنت اور مزدوری نے ملک کے بڑے بڑے شہروں کو بسایا تھا، سنوارا تھا آج اس کا یہ صلہ ملا ہے کہ انھیں وہاں ناخوش گوار اجنبی سمجھا جا رہا ہے اور ان کو وہاں سے نکالنے کی فکر کی جارہی ہے!!

زندگی ساری گردِ کشیتر میں کاٹی ہم نے
اور وہاں آج کوئی اپنا شناسا بھی نہیں ــــ زیدی

اعظم گڑھ

اس پورب دیس میں کئی بڑے ضلعے تھے انھیں کو کاٹ کے چھوٹا کیا جا رہا ہے۔ گورکھپور، بستی، اعظم گڑھ، سب اس زد سے دوچار ہیں۔ ہمارا اپنا ضلع اعظم گڑھ دو ٹکڑے ہوگیا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت سے لہلہاتا مئو اب الگ ضلع بن گیا ہے۔ پہلے میرا وطن محمد آباد گہنہ ضلع اعظم گڑھ میں واقع تھا۔ اسی رعایت سے میں نے اپنی بعض نظموں اور مضامین میں اپنے نام کے ساتھ اعظمی کا اضافہ کر لیا تھا۔ اخباروں اور رسالوں میں چھپ گیا۔ اب اس کے واپس لینے کی کوئی شکل نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو ثقافتی سطح پر اعظم گڑھ سے وابستگی اسے کب گوارا کرے گی؟ ویسے مجھے

دونوں طرف کا خیال ہے ! لیکن ہم نے مدتوں اُستادِ مکرم اقبال احمد سہیل کا یہ شعر اپنے دوستوں کے مجمع میں جھوم جھوم کے پڑھا ہے اور اس پر وجد کیا ہے ۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلّی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اُٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

میں اب بھی ذرّۂ ناچیز ہوں لیکن یہ شعر گنگنا کے کبھی کبھی جھوم اٹھنا کوئی جُرم تو نہیں ہے !

وہ مئو ہو یا اعظم گڑھ ، دونوں ہی خطّے غریبی ، امراض ، تعلیم کی کمی ، صنعتوں کی بربادی کا شکار تھے ۔ ایک بہت ہی مختصر سا حلقہ چھوٹے بڑے زمینداروں کا نسبتاً خوش حال تھا ۔ عام طور پر چھوٹی چھوٹی آراضیوں سے پیٹ پالنے والے ، بیگاری اور مزدوری پر مجبور تھے اور بڑی اذیت ناک زندگیاں بسر کرتے تھے ۔ آبپاشی کا انتظام نہ تھا ۔ چھوٹے تالابوں ، پوکھروں ، نالوں ، یا پھر کنوؤں سے کام چلایا جاتا ۔ چھوٹی سی ندی ٹونس گرمیوں میں تقریباً سوکھ جاتی اور مسافر اپنے پیروں کمر تک پانی میں چل کر ندی پار کر لیا کرتے تھے ۔ چھچھلے دریا میں برسات کا پانی کناروں سے چھلک پڑتا اور باڑھ آجاتی ۔ کھیتیاں تباہ ہوتیں ، بڑی ناؤ چلنے لگتی ۔

جنگل جنگل

بسیں ، ٹیکسیاں ، جیپیں وغیرہ کہاں تھیں ؟ کاریں بھی اکّا دکّا صدر میں وہ بھی باہر کی بنی ہوئی پرانی نظر آجاتی تھیں لیکن بڑے جاگیرداروں کے پاس ؛ رئیس ٹمٹم یا بگھی رکھتے ، لیکن عام طور پر یکّے کی سواری ہر جگہ ملتی ، یا پھر بیل گاڑیاں گاؤں گاؤں پائی جاتیں ۔ لوگ دس بارہ کوس (کوس ، دو میل) پیدل چل لیتے تھے ۔ میرے وطن محمد آباد گہنہ میں ریلوے اسٹیشن تھا ۔ یہاں سے چریاکوٹ کی سڑک پر ریلوے اسٹیشن کے بعد ڈھاک کا ایک بڑا جنگل تھا ، جو میرے ننہال کرہان تک پھیلا ہوا تھا ۔ جب ہم نو دس برس کے ہوئے تو دوپہر میں بزرگوں کی آنکھیں بچا کر اس جنگل کی طرف چل پڑتے اور جنگل جنگل تقریباً ریلوے اسٹیشن تک دو میل کا سفر طے کر کے پھر اسی راستے واپس آجاتے ، ڈرتے ہوئے کہ کہیں بزرگوں کو معلوم نہ ہو جائے ۔ اب یہ سارا جنگل صاف ہو گیا ہے ۔ اس کا نام و نشان نہیں ۔ اس کی جگہ ہرے بھرے کھیتوں نے لے لی ہے ۔ رئیسوں کو اچھی نسل کے گھوڑے پالنے اور شہسواری کا شوق تھا ۔ شمس آباد (اعظم گڑھ) کے راجپوت رئیسوں کے عربی النسل گھوڑے گرد و نواح میں مشہور تھے ۔

محمد آباد گہنہ اور چریاکوٹ مشہور مقامات تھے ۔ بیچ میں کرہان ایک جزیرہ تھا ، علمی اور ثقافتی ۔ ان میں آمد و رفت رہتی تھی ۔ پاس ہی میرے دوست عبداللطیف اعظمی کا وطن بندی کلاں بھی تھا ۔ ان مقامات پر علم کا چرچا تھا اور چند اچھے ادیب اور شاعر میری یادداشت میں اُبھرے ۔ بعض مقامات پر بساطِ تدریس بھی بچھی تھی لیکن عموماً پڑھے لکھے لوگ کم تھے ۔ ہندو اور مسلمان رئیسوں اور " شریفوں " میں تعلیم کا رواج عام تھا لیکن مکتبوں کی بدولت ہر طبقے میں چند پڑھے لکھے لوگ مل جاتے تھے ۔ بعض گھروں میں ذاتی کتب خانے بھی تھے ۔ میرے ننہال اور ددھیال دونوں جگہ کتب خانے تھے جن سے مجھے بچپن ہی میں استفادہ کا موقع ملا اور رفتہ رفتہ مطالعہ گویا میری فطرت کا ایک حصّہ بن گیا ۔ متوسط طبقے والے عموماً مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں تعلیم پاتے تھے ۔ اس وقت تک مکتبوں میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے تھے ، جہاں اُردو ، معمولی حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی ۔ اُردو ، ہندی ، مڈل اسکول ، آٹھویں جماعت تک کی تعلیم کے لیے تقریباً ہر تحصیل کے صدر مقام پر ضرور ہوتے تھے ۔ ہر ضلع میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) ایک سرکاری اسکول ہوتا تھا کہیں کہیں غیر سرکاری اسکول بھی تھے ۔ سر سید احمد اور سوامی دیانند کی تحریکوں سے متاثر ہو کر کچھ غیر سرکاری اسکول بھی کھل گئے تھے ۔ اعظم گڑھ میں ویسلی ہائی اسکول مشن نے چلایا تھا ۔ مسلمانوں نے علامہ شبلی نعمانی کی یاد میں شبلی اسکول کھولا جو اب پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج ہو گیا ہے ۔ ڈی ، اے ، وی اسکول بعد میں کھلا ظاہر ہے کہ اس وقت آبادی کا بہت بڑا حصّہ تعلیم کی نعمت سے محروم تھا ۔ ہمارے قصبہ محمد آباد گہنہ میں اب دو دو ڈگری کالج ہیں اور قریب ہی عورتوں کا بھی کالج ہے اس وقت یہ سب کچھ نہ تھا ۔ قصبے میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری تھی لیکن زمیندار اور رئیس اس سے استفادہ کم کرتے ، زیادہ تر حکیموں اور طبیبوں سے رجوع کرتے تھے ۔ عطاروں کی دکانوں سے دوائیں مل جاتیں ۔ طبیب عموماً مفت علاج کرتے محمد آباد گہنہ اور کرہان میں میرے عزیز بھی طبابت کرتے لیکن علی میاں کامل کا گھرانا ممتاز تھا ۔ حکیم عبداللہ صاحب محمد آباد میں اور حکیم سید ذکی حسین صاحب کرہان میں دستِ شفا کے لیے دور و نزدیک مشہور تھے ۔ میرے بڑے چچا حسن امداد صاحب اور منجھلے ماموں سید محمود رضا کو بھی اس فن سے دلچسپی تھی

اور کچھ لوگ اُن سے رجوع بھی کرتے تھے۔

غلّے کا نرخ گر گیا تھا اور کسانوں کی گزر بسر مشکل ہو گئی تھی۔ ہر گاؤں، بلکہ قصبوں میں بھی آبادی کا بڑا حصہ غریب کھیت مزدوروں کا تھا، جو بوائی کٹائی کے زمانے میں کام سے لگ جاتے اور پھر مزدوری کرتے۔ زیادہ تر مقروض اور بندھوا مزدور تھے، یعنی قرض کا سُود ادا کرنے کی عوض مزدوری کیا کرتے تھے اور سُود تھا کہ کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہر گاؤں میں کچھ بڑے کسان بھی ہوتے تھے جو اپنی ضرورت سے فاضل غلہ بیچ دیا کرتے تھے، یا پھر دوسرے کسانوں کو بیج کے لیے اُدھار دیتے اور بُوائی کے وقت سُود سمیت وصول کرتے، بیچارہ کسان پنپ نہ پاتا تھا۔ لگان ادا کرنے کے لیے بھی پیسے نہ رہتے اور مقروض ہو کر قرقی کی نوبت آجاتی۔ بے دخلی عام تھی۔ زمیندار کی مزدوری مستزاد تھی۔ ہم بھی متوسط درجے کے زمیندار تھے لیکن والد مرحوم نے روایاتِ خاندان کے برخلاف تجارت بھی شروع کر دی تھی اس لیے میری یاد میں کبھی ایسی بے دخلیاں نہیں ہوئیں۔ بچپن کی یاد یہ ہے کہ ہمارے یہاں مزدوری ضرور دی جاتی ہے۔ کم و بیش کی اس وقت تمیز نہ تھی۔

لکھنؤ سے علمی روابط

زمینداروں میں نمود و نمائش کا خبط تھا۔ اکثر مقروض بھی رہتے تھے مجھے دادیہال، نانہال — اور بعد میں سسرال بھی درویش صفت ملی اس لیے ہم لوگ سادہ زندگی بسر کرتے تھے، فضول خرچی سے پرہیز کرتے تھے۔ پھر بھی خاصی آرام کی زندگیاں بسر ہوتی تھیں۔ پرہیزگاری بھی اچھی سمجھی جاتی تھی، کہیں کہیں گھروں میں کالی بھیڑ ضرور تھی۔ لیکن ایسے لوگوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے عزیز اور دوسرے خوش حال زمیندار الٰہ آباد، لکھنؤ، بنارس وغیرہ جایا کرتے تھے۔ مذہبی تعلیم کے خاص مراکز لکھنؤ میں تھے، لیکن قصبات اور دیہاتوں میں بھی اچھے اساتذہ موجود تھے۔ مثلاً فخرِ روزگار علامہ شبلی نعمانی نے چریاکوٹ کے علمی خرمن سے بھی خوشہ چینی کی تھی، مدرسہ اصلاح، سرائے میر تو ابھی حال تک خاص مرکزِ علم تھا۔ ہماری عزیزداریوں میں زنگی پور اور نونہرہ علم و ادب کے گہوارے تھے۔ اور یہ سب کسی نہ کسی طرح لکھنؤ سے بھی کسبِ فیض کیا کرتے تھے۔ علم و ادب و صحافت میں تو لکھنؤ میر کارواں تھا ہی۔ میرے گھر کے علمی روابط لکھنؤ سے تھے۔ میری چھوٹی چچی ظریف لکھنوی کی بھانجی تھیں۔ محمد آباد گہنہ کے علامہ سید احمد علی صاحب مجتہد استاذ الاساتذہ مانے جاتے تھے۔ علامہ سید عبدالحئی حسنی نے "نزہۃ الخواطر" میں ان کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ والدہ مرحومہ کے حقیقی پھوپھا اکلیل العلماء سید محمد محسن صاحب آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے وابستہ تھے اور ان کے فارسی اور عربی کے تراجم کی نظرثانی کی خدمت پر مامور تھے۔ انھیں کے ہمرکاب مٹیا برج بھی گئے اور وہیں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

اسی طرح عدلیہ میں جسٹس محمد اقبال، انتظامیہ میں آئی۔جی۔ اسلام احمد خاں اور سید اختر عباس نمایاں ہوئے۔ ہندی ادب میں ہری اودھ اور گربھکت سنگھ نے نام کمایا۔ شاعری میں قدما میں علی میاں کامل استادی کے مرتبے پر فائز ہوئے اور دھوم مچا دی اور اقبال سہیل نے پورے خطے کا نام روشن کیا۔ ندوۃ العلماء، سلطان المدارس اور ناظمیہ و فرنگی محل کے افاضل نے پورے پورب دیس کو سیراب کیا اور پورب دیس نے بھی شاگردی ہی نہیں بلکہ تدریس و نظم و نسق پر دسترس حاصل کی۔ علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء کے علاوہ دارالمصنفین کی شکل میں علم و ادب کی آبیاری کی روایت بڑے جتن سے آگے بڑھائی۔ اس پورے ماحول نے میری سیاسی، ثقافتی اور علمی زندگی کی پرورش و پرداخت کی اور اسے استحکام بخشا، لکھنؤ اور دلّی نے جلا بخشی اور قسمت نے دُنیا کے بائیس ملکوں کی سیر کرائی اور بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ سیکھا۔ یہ میرے وطن کا فیض تھا کہ خشتِ اول کج نہ ہونے کی وجہ سے ثریا تک حصولِ علم اور عمل کی عمارت درست خطوط پر اوپر اٹھتی رہی۔ شکر ہے! اپنی بھرپور زندگی پر فخر کرنے کا مجھے حق حاصل ہے۔

□□

حواشی:

۱۔ دلّی کے پورب میں جو علاقہ واقع تھا اُسے پُورب اور یہاں کے رہنے والوں کو "پوربیا" کہا جاتا تھا۔ اس میں تحقیر کا شائبہ بھی شامل تھا۔

۲۔ پہلے یوپی United Provinces of Agra and Oudh (ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ) کہا جاتا تھا۔

"ٹیلی ویژن"

عام معنوں میں جسے ٹیلی وژن کہتے ہیں
ایڈیٹ باکس اُسے ناقدِ فن کہتے ہیں

عمروعیّار کی زنبیل کی اولاد ہے یہ
دورِ حاضر میں نئی جنّتِ شدّاد ہے یہ

اک ابوالہول جو آہن کی پٹاری میں ہو بند
کھولیے اس کی گرہ اور لگائے وہ زقند

ایک دجّال، جو ہے برق کے گھوڑے پہ سوار
کرتا رہتا ہے کمیں گاہ سے ذہنوں کا شکار

جامِ جم، اس سیتم ایجاد کا جدِّ اعلا
اور اسی رشتے سے لاسلکی ہے اسکی خالا

بی جمالو نے اسے اپنی طرح پالا ہے
اس نے اخلاقی توازن میں خلل ڈالا ہے

اس کے معدے کو کرشموں کا ذخیرہ کہیے
چلتے پھرتے ہوئے سایوں کا جزیرہ کہیے

منتظر چائے کے ہیں آپ، مگر گھر والے
سامنے ٹی وی کے صف بستہ ہیں گھیرا ڈالے

عید کے روز کوئی آیا ہے ملنے کے لیے
اور سب لوگ نظاروں میں ہیں گم، لب کو سیئے

کوئی بیمار ہے، بازار سے لانی ہے دوا
فلم بینی میں اِدھر ذہن ہے گھر بھر کا لگا

"آئے عشّاق، گئے وعدۂ فردا لے کر"
متوجہ نہ ہوا گھر کا کوئی فردِ بشر

چترمالا کا سرِ شام کھلے جب بھنڈار
اسٹڈی روم سے دوڑ آتی ہے بچّوں کی قطار

ماسٹر جی بھی اسی غول میں رہتے ہیں کھڑے
بول گانوں کا وہ دُہراتے ہیں خوش ہو ہو کے

دیگچی چھوڑ کے چولھے پہ، مُلازم، ماما
دیکھنے کے لئے آجاتے ہیں یہ ہنگاما

والدِ محترم و امّی و باجی و بہو
سب پہنچ جاتے ہیں کرتے ہوئے ہی ہی ہوہو

انکل اقبال نے لقمہ دیا، آئی آواز
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

"بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے"
اس کے دربار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

رِضا نقوی واہی
۱۹/۴ گردنی باغ۔ پٹنہ-۱ (بہار)

بلراج کومل،
ای۔۱۳۹، کالکاجی۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۱۹

سوانحی کوائف

شاعر/مصنف/ادیب/صحافی کا نام : بلراج کومل
والد کا نام : حکومت رائے
تاریخ اور مقام پیدائش : ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۸ء۔ سیالکوٹ (پاکستان)
پتہ : ای۔۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۹
فون : ۶۴۳۶۴۲۵ فیکس : ۶۹۸۱۷۳۲-۰۱۱
تعلیم : ایم۔اے
مشاغل/ملازمت : ۱۹۸۶ء میں محکمۂ تعلیم، دہلی میں اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد، ادبی اور تخلیقی کام سے منسلک۔

تصانیف :

نام کتاب	صنف/موضوع	ناشر	سنہ اشاعت
۱۔ میری نظمیں	شاعری	مکتبہ فن کار، دہلی	۱۹۵۴ء
۲۔ رشتۂ دل	"	ادارہ ادبی دنیا، لاہور	۱۹۶۴ء
۳۔ ناریل کے پیڑ (دیوناگری حروف میں)	منتخب نظمیں	آریہ بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۶۷ء
۴۔ ہریالی کا ایک ٹکڑا	ناولٹ (ہندی)	لٹریری ہاؤس، لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۵۔ سفر مدام سفر	شاعری	شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد	۱۹۶۹ء
۶۔ انتخاب (منتخب نظمیں)	شاعری	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۷۱ء
۷۔ نژادِ سنگ	"	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۸۔ آنکھیں اور پاؤں	افسانے	اردو رائٹرز گلڈ، الٰہ آباد	۱۹۸۱ء
۹۔ پرندوں بھرا آسمان	شاعری	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۱۰۔ ادب کی تلاش	تنقید	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۱۱۔ شہر میں ایک تحریر	شاعری	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۷ء
۱۲۔ منتخب نظمیں (انگریزی ترجمہ)	شاعری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۱۳۔ اکیلی منتخب نظمیں	شاعری	گوہر پبلشرز، کراچی (پاکستان)	۱۹۸۹ء
۱۴۔ پرندوں بھرا آسمان (دیوناگری رسم الخط میں)	شاعری	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۱۵۔ اے اسکائی فل آف برڈز (پرندوں بھرا آسمان کا انگریزی ترجمہ)		ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۱۶۔ تواتر اور تسلسل	تنقید	ادب پبلی کیشنز۔ نئی دہلی	۱۹۹۵ء
۱۷۔ اگلا ورق	شاعری	میڈیا انٹرنیشنل، دہلی	۱۹۹۶ء

تراجم :

۱۔ خلا کے معجزے (ایم سندر راجن کی انگریزی تصنیف "ونڈرز آف اسپیس" کا اردو ترجمہ) سائنس نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) دہلی ۱۹۸۰ء
۲۔ تورودت (پدمنی سین گپتا کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ) سوانح ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۸۵ء
۳۔ سانپ اور رسی (راجہ راؤ کے انگریزی ناول دی سرپنٹ اینڈ دی روپ کا اردو ترجمہ) ناول ساہتیہ اکادمی۔ نئی دہلی ۱۹۹۶ء

اعزازات :

۱۔ حکومت ہند وزارت تعلیمات ایوارڈ برائے ناولٹ: 'ہریالی کا ایک ٹکڑا' ۱۹۶۹ء
۲۔ اترپردیش اردو اکادمی ایوارڈ۔ برائے سفر مدام سفر (شاعری) ۱۹۷۱ء
۳۔ میر اکادمی لکھنؤ امتیاز میر ایوارڈ برائے شاعری ۱۹۷۷ء
۴۔ اترپردیش اردو اکادمی ایوارڈ برائے آنکھیں اور پاؤں (افسانے) ۱۹۸۲ء
۵۔ دہلی اردو اکادمی ایوارڈ برائے شاعری ۱۹۸۲ء
۶۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے پرندوں بھرا آسمان (شاعری) ۱۹۸۵ء
۷۔ حکومت ہند، سینیر فیلوشپ ۱۹۸۸-۸۹ء
۸۔ فراق فاؤنڈیشن ایوارڈ ۱۹۹۵ء

ادبی انجمنوں کی رکنیت:

۱۔ ممبر دہلی اُردو اکادمی ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۰ء ـ ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۷ء
۲۔ ممبر ایڈوائزری بورڈ۔ اردو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
۱۹۹۷ء - ۱۹۹۳ء

بیرونی ممالک کا سفر

۱۔ عراق، بغداد، المربد پوئٹری فیسٹول ۱۹۸۸ء
۲۔ ماریشس، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ـ جدید اُردو ادب سمینار ۱۹۸۹ء
۳۔ ناروے، اوسلو، مشاعرہ ۱۹۹۰ء
۴۔ ڈنمارک کوپن ہیگن، ادبی سمپوزیم ۱۹۹۰ء
۵۔ جرمنی۔ 'ہاؤس آف کلچرز آف دی ورلڈ' برلن ـ خصوصی اُردو پروگرام ۱۹۹۱ء
۶۔ ڈنمارک، کوپن ہیگن ادبی سمپوزیم ۱۹۹۱ء
۷۔ سویڈن اسٹاک ہوم 〃 ۱۹۹۱ء
۸۔ انگلینڈ لندن 〃 ۱۹۹۱ء

سیمینار:

مختلف ادبی موضوعات پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی دہلی اُردو اکادمی، کرناٹک اُردو اکادمی، ساہتیہ اکادمی، انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی۔ سارک کلچرل فیسٹول ۱۹۹۲ء کے سمیناروں میں پرچے پیش کیے۔

ترتیب و تالیف اور تراجم:

۱۔ ساہتیہ اکادمی کی ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۰ء میں منعقد ہونے والی ٹرانسلیشن ورک شاپس کا بطور نگران اہتمام کیا۔
۲۔ ساہتیہ اکادمی کے لیے کنٹمپریری انڈین شارٹ اسٹوریز کے اُردو تراجم کی تین جلدوں کی ترتیب و تہذیب کے فرائض سرانجام دیے۔
۳۔ ساہتیہ اکادمی کے انگریزی جریدے 'اِنڈیَن لٹریچر' کے پہلے دو شماروں کے اُردو حصّے کی ترتیب و تہذیب کے فرائض سرانجام دیئے۔

میرا تخلیقی سفر

صراطِ مستقیم کا سفر
درونِ ذات کا سفر
دائرہ در دائرہ سفر

تخلیقی سفر.... میری نظمیں، رشتۂ دل ـ سفر مدام سفر ـ شرار سنگ ـ آنکھیں اور پاؤں ـ پرندوں بھرا آسمان ـ شہر میں ایک تحریر، تواتر اور تسلسل ـ اگلا ورق.... میں کون سے سفر میں تھا؟

یہ ۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں میں، گلابی جاڑوں کی ایک شام تھی۔ میں لال کرتی بازار جالندھر چھاؤنی کے علاقے میں ایک عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ میرے ٹھیک سامنے سڑک کے کنارے ایک روشن کمرہ تھا کمرے سے ملحق ایک برآمدہ تھا، برآمدے میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر ایک شخص کباب تیار کر رہا تھا۔ کمرے میں ڈبل روٹیوں کے انبار تھے اور ان کے درمیان ایک میز کے اردگرد اجنبی مصروفِ دعوت آب و ہوا تھے مصروفِ کاروبارِ شام تھے۔ میری عمر ۱۹ برس تھی۔

وہ لوگ دیارِ عمر کے دشت میں سے سرشار و خراماں گزر رہے تھے۔

میں جب کمرے میں داخل ہوا، ایک بے معنی نعرہ بلند ہوا۔ میرے منہ سے دفعتاً ایک جواب اُچھلا:

"بلاچ کول" ــــ اور میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا
فربہ و جیہ لحیم شحیم : مخمور جالندھری
دُبلا چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا، فکر تونسوی

فضا میں تقسیم ہندستان، تشدد اور خون کا ذائقہ تھا۔ مخمور جالندھری فوج کو ڈبل روٹیاں سپلائی کرتا تھا۔ فکر تونسوی پاکستان سے ہندستان پہنچنے پر اپنی نجی آباد کاری میں مصروف تھا اور میرے سامنے میرا اوّلیں جامِ اضطراب منتظر تھا۔

میں نے اعلان کیا: "میں شاعر ہوں"
بیکری کے طول و عرض میں ایک قہقہہ گونج گیا۔
میں نے مکرر اعلان کیا: "میں شاعر ہوں"
بیکری میں مکرّر ایک قہقہہ گونجا۔

میں زنجیروں سے آزاد ہو چکا تھا اور بلند خوانی کے عالم میں تھا۔
جب میری گہرائیوں میں چاند سورج اُتر گئے تو میرے ذہن میں صرف ایک جملہ متحرک تھا:

"تم شاعر ہو۔ تم شاعر ہو۔"

فیروزپور پہنچ کر میں ریاضیات میں اُلجھ گیا۔ لیکن میری شامیں اور راتیں پہلے سے زیادہ آزاد ہو گئیں۔ ہر شب ایک لشکر میرے شہرِ دل پر یلغار کرتا۔ میرے سامنے مَردوں، عورتوں، بچوں کو بے رحمی سے قتل کرتا اور درماندہ و محروم چھوڑ کر آگے نکل جاتا۔ میرے سامنے روز و شب ایک خوف زدہ، برہنہ پا مجروح سایہ چلتا۔ ایک لڑکی کا سایہ — ہر لمحہ التجا کرتا ہوا سایہ، میرے چلتے ہوئے قدموں سے التجا کرتا ہوا سایہ ؎

اجنبی! اپنے قدموں کو روکو
جانتی ہوں تمہارے لیے غیر ہوں
پھر بھی ٹھہرو ذرا
سُنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسّم فغاں
میری امّی بنو
میرے ابّا بنو
میری آپا بنو
میرے ننھے سے معصوم بھیا بنو
میری عصمت کی مغرور کرنیں بنو
میرے کچھ تو بنو ... میرے کچھ تو بنو ... میرے کچھ تو بنو ...

(اکیلی)

میں ایک بار پھر لال کُرتی بازار جالندھر میں ہجوم آب و ہوا میں تھا قتل و خون کا ذائقہ زبان پر اب بھی تھا، لیکن ہوا میں شگفتگی اور نرم لذی کے آثار تھے، اور میری پہلی نظم "اکیلی" وجود میں آ چکی تھی۔ زندگی کی شاہراہ پر میں پُر اُمید و پُر اعتماد کھڑا تھا۔ تعلیم کا ایک دَور پورا کر چکا تھا۔ دوسرے دَور میں داخل ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ لمحۂ موجود میں زمانۂ تشدّد سے گزرتے ہوئے میرے ہم سفر کوچہ گردی میں تلاش صبح و شام کرتے تھے۔ اچھی صورتوں پر مرتے تھے اور طلسم زار میں داخل ہونے کے منتظر تھے۔ میں بھی طلسم زار کی تلاش میں ہندستان کی راجدھانی میں داخل ہو چکا تھا۔ آوارہ خرامی کرتا تھا، نظمیں لکھتا تھا اور عشق کرتا تھا زمین سے، آسمان سے، آفتاب و مہتاب سے، صورتِ گُل سے اور قریب کی لذتوں سے۔ پرکاش پنڈت، ساحر لدھیانوی، مجاز، وامق جون پوری اور کرشن ادیب کے ہونے والی اولیں ملاقاتوں سے سرشار تھا اور تلاش روزگار میں بے دلی سے مصروف! مختصر وقفوں میں فلمی اور سنسنی خیز خبریں پڑھتا اور لکھتا۔ دیگر مختصر وقفوں میں نکھٹو اندھیروں میں اُتر جاتا۔

ایسے ہی ایک مختصر وقفے میں اندھیرے میں چلتا ہوا جب میں جالندھر کے کوٹ کشن چند میں ساتھی کرتونسوی کے گھر میں طلوع ہوا تو جالندھر کے اخبارات، ریڈیو اور محفل صبح و شام میں گھر گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مکرّر دہلی میں وارد ہوا تو دہلی کا ہو کر رہ گیا۔ یہ کم و بیش پچاس برس پر پھیلی ہوئی کہانی ہے۔

میرے تخلیقی سفر میں میری نجی زندگی، جذباتی زندگی، ذہنی زندگی — کم و بیش ایک تسلسل کی طرح ہیں۔

زندگی کے بحرِ بے کنار میں میری تخلیقی زندگی ایک جزیرے کی طرح ہے اور میں نے کثافتوں کے بے پایاں سمندر سے گزرتے ہوئے اپنے جزیرے کی مکمل حفاظت کا خیال رکھا ہے۔

میرے تخلیقی سفر کا پہلا موڑ میرا بچپن ہے۔ وہ گھر ہے جہاں میں پیدا ہوا، پلا بڑھا، جوان ہوا۔ اس گھر سے ہمیشہ فرار ہونے کے خواب دیکھتا رہا — فرار اختیار کرنے کے لیے قریب و دُور کے علاقوں کے طول و عرض میں سیلِ ہاؤ ہو میں قربتیں، لذتیں، اضطراب، مزید اضطراب تلاش کرتا رہا، تجربے کا اضطراب، جذبے کا اضطراب، ذہن کا، رُوح کا جسم کا اضطراب!

میرے تخلیقی سفر کا دوسرا موڑ میرا اپنا گھر ہے جہاں مرکزی نقطہ گارگی — میری رفیقِ حیات اور میرے بچے مینو اور انیتا ہیں۔

مینو اور انیتا اپنے اپنے جزیروں میں آباد ہو چکے ہیں۔ میرے گھر نے لمحہ موجود کے وہ تمام تجربات میرے لیے فراہم کیے ہیں جن کے لیے انسان دُعا مانگتا ہے۔ آج سے کئی برس پہلے، میرے بیٹے مینو نے مجھے کاغذ کی ناؤ کی معنویت سے روشناس کرایا تھا۔ اس رات بڑی تیز بارش ہوئی تھی۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو میرے سامنے ؎

کِھل اُٹھے چاروں طرف، بچوں کے رنگین قہقہوں اور تالیوں کے شوخ پھول
رات بھر کی تیز بارش کی بنائی جھیل میں
ڈگمگاتی ڈولتی
چل رہی تھیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں

میں نے دیکھا، ان میں ننھے کی بھی تھی پیاری سی ناؤ
نظم کا نقشِ گریزاں، جانا پہچانا سا کاغذ جانے پہچانے حروف
ننھا بولا، آج جو تالی نہ پیٹے بے وقوف !!

——— (کاغذ کی ناؤ)

گارگی سولہ برس سے ۵۹ برس کی منزل تک پہنچ گئی لیکن ہر لحظہ نو بہ نو تازہ بہ تازہ سرشاریوں اور رفعتوں میں ڈھلتی گئی ــ وہ ایک تھی صد ہزار صورتیں اختیار کرتی گئی ــ

وہ ایک تھی
ہزار صورتوں میں میرے سامنے
طلوع جب ہوئی
تو میرا آسمان بن گئی
نئی عظیم لذتوں کے درمیاں
میں اپنے مستقل مقام سے
افق کی سمت پھیلتا چلا گیا
حصارِ مرگ و زندگی کو روندتا چلا گیا۔

——— (ایک عورت)

تیسرا موڑ ـــــ شعر کے علاوہ میں افسانے اور تنقید کی وساطت سے بھی اپنی تخلیقیت کے مختلف گوشوں کو دریافت کرنے کے مراحل سے گزرتا رہا۔ زندگی کا سفر جاری رہا۔ بچے بڑے ہوتے گئے، مسائل میں الجھتے گئے۔ میں لمحۂ موجود کا شاعر ردِ عمل کو زندہ رکھنے کے لیے تمام سیاسی، سماجی، اخباری، اشتہاری آلائشوں، کدورتوں سے نبرد آزما ہوتا رہا۔ منوّر ہوتا رہا۔ خوبصورت عورتوں، بچوں کے دلآویز چہروں، نغموں اور ستاروں کو (کارل سینڈبرگ کی طرح) اپنے دامن میں سمیٹتا رہا۔ اور جب ایک مُردہ نقطے کے قریب تھا تو ایک اور سورج طلوع ہوا: ننھا منا ہمارا پوتا سمیر۔ میں برسوں بعد تجدید کے ایک نئے روشن تجربے سے روشناس ہوا۔ اس دوران میں فیض، راشد، وزیر آغا، مجید امجد، اخترالایمان، منیر نیازی اور سینکڑوں، ہزاروں رنگوں نسلوں کے داستان گو اور شاعر اپنے ننھے منے روشنی کے نقطوں کے ساتھ میرے ہم سفر رہے۔ میں زمین سے منسلک ہونے کے باوجود ہمیشہ بال و پر کے خواب دیکھتا رہا

مجھے سیاسی، معاشی، مذہبی، لفظیاتی اساطیری جبر سے وحشت ہوتی رہی۔ میں رشتوں کی تمازت کا شاعر ہوں۔ اپنے مختصر جزیرے میں نجی قریبی رشتوں کی تمازت سے سرشار ہوتا رہا۔ آل احمد سرور، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، وحید اختر، قاضی سلیم، رام لعل، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، جوگندر پال، دلیپ سنگھ، کمار پاشی، محمود ہاشمی، کرشن ادیب، محمد علوی، ندا فاضلی، کشور ناہید، حمید الماس، سریندر پرکاش، مجتبیٰ حسین، گیان سنگھ شاطر، عزیز پریہار، کنور سین اور دوسرے دوستوں کے ساتھ اپنی وابستگیوں کے جشن مناتا رہا۔۔۔۔

گارگی ہر روز قالبِ نو اختیار کر لیتی ہے
ایک ننھا شہ سوار میری پشت پر ایستادہ ہے
میں اس کا رخشِ رضا طویل لامختتم رہگزر پر رواں ہوں
میرے سر پر ستاروں بھرا آسمان ہے
میں اضطراب! مسلسل اضطراب۔!!

اس کا میں رخشِ رضا
تیز تر کرتا ہوں رفتارِ خرام
مجھ کو پہنچانا ہے آج
اس کو رنگوں، تتلیوں کے دیس میں
جادو نگر میں
میرے سائے کا بھی اب شاید جہاں
منتظر کوئی نہیں
منتظر ہیں اس کے لیکن میرے ننھے دوست کے
دیو قامت، سبز وارفتہ وقار
دور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے اشجار
رقصِ برگ و بار
جا رہا ہے خواب کی رفتار سے دیوانہ وار
میرا ننھا شہ سوار!

——— (ننھا شہ سوار)

(باقی ص۱۴۲ پر)

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری
۱۹- نیا گاؤں (ایسٹ)- لکھنؤ

ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی کا دلچسپ ادبی معرکہ

ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی رواں صدی کے دو بڑے مستند ادیب، صاحبانِ طرزِ انشا پرداز اور اولوالعزم صحافی تھے۔ موخرالذکر ۱۹۱۲ء میں ایک مستقل کتاب "علم النفس" پر لکھ رہے تھے۔ اس میں سے ایک مضمون "علم النفس کا ایک باب ــ حظ و کرب" کے عنوان سے آزاد نے الھلال کی دو قسطوں (۱۸ اور ۲۵ جون ۱۹۱۳ء) میں شائع کیا۔ مضمون میں متعدد بار "حظ و کرب" استعمال ہوا ہے۔ مثال میں پہلی قسط صفحہ ۸ میں "حظ و کرب" کے تحت عبدالماجد لکھتے ہیں:

"فطرت نے خود نفس انسانی میں ایک ایسی قوت ودیعت کر رکھی ہے جس کے باعث وہ فی الفور مضر کو مفید سے اور زہرِ ہلاہل کو آبِ حیات سے تمیز کر سکتا ہے، اور یہ وہ شے ہے جسے ہم حیاتِ نفسی میں احساسِ "حظ و کرب" سے تعبیر کرتے ہیں۔"

مصنف نے مضمون کی دوسری قسط ۲۵ جون والی (صفحہ ۱۱) میں "احساسِ حظ و کرب" اور "حسِ لذت و الم" کے الفاظ کی تشریح کر کے دونوں کے استعمال میں فرق دکھایا۔

دوسری قسط کے اختتام (ص ۱۱ کالم ۲) میں آزاد نے عبدالماجد کی صحتِ زبان پر اعتراض کیا اور لکھا کہ "حظ و کرب" غلط اور "لذت و الم" درست ہے۔ آزاد کے الفاظ "الھلال" کے تحت یوں درج ہیں:

"یہ مضمون کتاب کا ایک ٹکڑا ہے اور امید ہے کہ اس کے اور ابواب بھی شائع ہوں۔ مسٹر عبدالماجد ان معدودے چند تعلیم یافتہ اربابِ علم میں سے ہیں، جن کو تصنیف و تالیف اور تراجمِ علمیہ سے ذوق ہے۔ ان ابواب کی اشاعت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان سے متعلق اگر اربابِ علم مشورہ دے سکیں، تو قبل از اشاعت اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر مجھے اس میں شک ہے کہ لوگ اس طرح کے مضامین کو غور سے پڑھنے اور رائے دینے کی زحمت گوارا کریں گے۔ بالفعل صرف ایک امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ مضمون میں جا بجا "حسِ لذت و الم" کو "حظ و کرب" سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو بصورتِ اصطلاح عنوان میں بھی جگہ دی ہے، لیکن اس کے لیے "لذت و الم" ہی کے الفاظ زیادہ موزوں اور صحیح تھے۔ اوّل تو "حظ" کے معنی لذت کے نہیں بلکہ حصّے کے ہیں (الحظ: النصیب، جمع حظوظ) البتہ اردو اور شاید فارسی میں لذت کے لیے بولتے ہیں لیکن باعتبارِ لغت غلط ہے اور عربی میں تو اس معنی کا کہیں پتہ نہیں۔

پھر جب "لذت" کا ایک لفظ پیشتر سے اس کے لیے موجود ہے اور عربی میں ٹھیک ٹھیک اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے جو مباحثِ علم النفس میں آپ کا مقصود ہے تو دوسرا لفظ کیوں تلاش کیا جائے؟ اردو میں لذت کا لفظ اپنے اصلی معنی سے ہٹ گیا ہے اور مختلف موقعوں پر بولا جاتا ہے لیکن عربی میں یہ ہمیشہ "الم" کے مقابلے میں لایا جاتا ہے اور لغت میں اس کی تعریف "نقیض الالم" ہے۔

"کرب" اور "الم" میں بھی فرق ہے۔ کرب صرف "حزن" کے معنوں

معنوں میں آتا ہے۔ لیکن "الم" میں اس سے زیادہ وسعت اور تعمیم ہے"۔

۲ اگست ۱۹۱۳ء کے "الہلال (ص۲ کالم ۲) کے شمارہ میں آزاد نے پھر "حظ و کرب" کے اعتراض کا ساز چھیڑا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

مسٹر عبدالماجد بی اے کا خط کمپوز ہو چکا تھا اور چند سطریں اس کے متعلق پروف پر لکھ دینے کا خیال تھا کہ میں منسوری چلا گیا اور وہ بغیر جواب نکل گیا۔ اصطلاحات علمیہ کے وضع و تراجم کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ میں عنقریب اس پر ایک مستقل مضمون لکھوں گا۔

مسٹر موصوف صحیح قائم مقام الفاظ کی تلاش میں حق بجانب ہیں لیکن غالباً اس کے لیے صحت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ میرا خیال دُنیا کے عام خیال کے مطابق یہ ہے کہ کسی لفظ کا اس کے صحیح معنوں ہی میں استعمال ہونا چاہیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ صحتِ الفاظ کا لحاظ رکھنے کی غلطی میری طرح ہمیشہ سے ہر زبان کے جاننے والے کرتے آئے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اصل انگریزی اصطلاحات کے لیے "لذت والم" کافی نہیں اور اس کے وجوہ لکھے ہیں، لیکن میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ عربی زبان و علوم میں "لذت والم" بعینہ اسی پہلو کو ادا کرتا ہوا مستعمل ہے جس کے وہ متلاشی ہیں۔ اگر وہ عربی میں فلسفہ و کلام کے معمولی مباحث پر نظر ڈالیں تو ان پر واضح ہو جائے گا۔

رہا "حظ" کا لفظ، تو قطع نظر اس کے وہ لذت سے زیادہ ادائے مفہوم کے لیے مفید بھی ہے یا نہیں؟ سب سے پہلی بحث یہ ہے کہ جس معنیٰ کے لیے جو لفظ سرے سے غلط ہی ہو اس کے متعلق چنیں و چناں کا موقع ہی کب باقی رہتا ہے؟ میں نے اپنے نوٹ میں اختلاف کو، قوت کو، احتیاطاً و بخیال حفظ آدابِ تحریر کسی قدر ضعیف کر دیا تھا، اور عمداً لکھ دیا تھا کہ:

"اُردو اور شاید فارسی میں غلطی سے حظ بمعنی لذت بولا جاتا ہے" لیکن اب میں مسٹر موصوف کو یقین دلاتا ہوں کہ فارسی میں کبھی کوئی پڑھا لکھا آدمی "حظ" کو "لذت" کے معنی میں بولنے کی افسوسناک غلطی نہیں کر سکتا۔ "حظ" فارسی میں بھی ہمیشہ حصہ اور نصیب کے معنی میں بولا ہے۔ غالب:

دگر ز ایمنی راہ و قربِ کعبہ چہ "حظ"
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

رہا اُردو میں بولنا تو مسٹر موصوف مثنوی زہرِ عشق یا زیادہ داغ نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ علم النفس کی ایک کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اگر عوام و جہلا حظ کو لذت کے معنی میں بولتے ہیں اور ان کے تتبع میں گاہ گاہ پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان سے بھی "محظوظ" نکل جاتا ہے تو کسی علمی تحریر کے لیے اس کی سند نہیں ہو سکتی۔

فرہنگ آصفیہ کا حوالہ دینے پر افسوس کرتا ہوں، اور کیا عرض کروں۔ لوگوں نے غلط العام اور غلط عوام کی تفریق کی ہے اس کے لحاظ سے بھی دیکھیے تو حظ اس معنی میں محض عوام کی غلطی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُردو اور فارسی اپنے علمی لٹریچر میں محض لغتِ عربی کے تابع ہیں، کوئی مستقل زبان نہیں رکھتے۔ پس عام بول چال اور محاورہ کی سند اشعار میں معتبر ہے نہ کہ اُردو کی ادبیات علمیہ میں۔

وضع اصطلاحات کا معاملہ بہت اہم ہے۔ لیکن اس قدر مشکل نہیں، جس درجہ آجکل کے اہلِ قلم سمجھتے ہیں اور علی الخصوص فلسفہ میں بہتر سے بہتر صحیح عربی الفاظ مل سکتے ہیں، بشرطیکہ تلاش کیے جائیں۔

آخر میں پھر اپنے عزیز دوست کو مطمئن کر دیتا ہوں کہ ان کے مقصود کے لیے "لذت والم" پیشتر سے موجود اور بہ ہمہ وجوہ کافی و اکمل ہے "حظ و کرب" وغیرہ میں پریشان نہ ہوں، جسمی و نفسی کیفیات کے وضع کا پورا مفہوم اسی سے ادا ہو سکتا ہے"۔

ہم نے عبدالماجد دریابادی کا مضمون بغور پڑھا اور ان کے جواب اور جواب الجواب سے بالکل متفق ہیں۔ آزاد کی دلیلیں متوازن اور مستحکم نہیں ہیں۔ صحتِ زبان کا مسئلہ بڑا نازک

اور اہم ہے۔ کسی صحیح لفظ کو غلط قرار دینا یا غلط لفظ یا محاورے کو درست بتانا زبان و ادب کے لیے خطرناک ہے۔ اگر آزاد اسناد کی تلاش کرتے تو بہتر رہتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ انھوں نے غالب کا جو شعر پیش کیا اس میں "حظ" کے معنی فائدہ کے ہیں۔ عبدالماجد نے اپنے بیان کی تائید میں کتبِ لغت کا سہارا لیا، اور آزاد کے اعتراض کا جواب عوش گوار اور عالمانہ لہجے میں اس انداز سے دیا کہ آزاد کو خاموش ہو جانا پڑا۔ اس دل چسپ بحث میں جو آزاد کی طرف سے مناظرہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی، اکبر الہ آبادی اور خدا آبندہ از جون پور (غالباً مولوی عبداللہ عمادی صحافی و مترجم دارالترجمہ حیدر آباد) نے بھی حصّہ لیا تھا۔ اکبر نے انصاف کا حق ادا کر کے "حظ و کرب" کے صحیح معنی بتائے، جب کہ خدا آبندہ نے دبے لفظوں میں آزاد کی حمایت کی۔ عبدالماجد نے جس طرح اپنے موقف کی وکالت کی، وہ حد درجہ مستحسن اور قابلِ تعریف ہے۔ ہم ان کے وسعتِ مطالعہ کی داد دیتے ہیں۔ ان کا زیرِ نظر مضمون واقعی معرکہ آرا، اور معلومات افزا ہے۔ مضمون طویل نہ ہوتا تو ہم اس کو یہاں نقل بھی کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے صرف مضمون کے تنقیدی پہلو کو پیش کیا جس میں ایڈیٹر الہلال کا اعتراض اور مضمون نگار کا جواب شامل ہے۔ موصوف کا جواب "حظ و کرب" یا "لذّت و الم" کے عنوان سے الہلال بابت ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء (ص ۱۳، ۱۴) میں شائع ہوا۔ عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں:-

"۶ اگست کے پرچہ میں جناب نے پھر "حظ و کرب" کے مسئلے کو چھیڑا ہے اور اس سلسلے میں وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ کے متعلق کچھ عام مواعظ بھی ارشاد فرمائے ہیں جو باعثِ صد مشکوری ہیں۔ یہ شاید عام دستور ہے کہ مدعی کو آخری جواب کا حق حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر میں اس عام قاعدے سے فائدہ اٹھا کر جناب کے ارشاد کے متعلق دوبارہ کچھ گزارش کروں تو غالباً اپنے حدود سے تجاوز کرنے کا مجرم نہ قرار پاؤں گا۔

میں جواب و جواب الجواب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم کر کے اس مسئلہ کی مناظرانہ حیثیت پیدا کرنا نہیں چاہتا، تاہم چوں کہ میرے نزدیک ایک علمی سوال کے حل کرنے میں جناب کو بعض غلط فہمیاں ہو رہی ہیں، میں ان کا اظہار اپنے اوپر فرض جانتا ہوں، علی الخصوص اس حالت میں کہ اس کا تعلق براہِ راست مجھ سے بھی ہے۔

جناب کا یہ ارشاد نہایت ہی صحیح، اور ایک ناقابلِ انکار حقیقت پر مبنی ہے کہ میں مثنوی زہرِ عشق یا فریادِ داغ نہیں لکھ رہا ہوں۔ لیکن غالباً بے جا نہ ہو گا اگر میں بھی ایک مساوی درجے کا مبنی علی الحقیقت دعویٰ جناب کے گوش گزار کرا دوں، اور وہ یہ ہے کہ میں عربی میں نہیں بلکہ اردو میں کتاب لکھ رہا ہوں، اور اسلیے مجھے یہ بار بار یاد دلانا کہ "عربی زبان و علوم میں لذّت و الم بعینہٖ اسی پہلو کو ادا کرتا ہوا مستعمل ہے، جس کا میں متلاشی ہوں" مجھے ایک قطعی غیر متعلق بحث چھیڑ دینے کی ترغیب دینا ہے۔

سوال یہ، اور صرف یہ ہے کہ (PLEASURE) اور (PAIN) کا صحیح تر مفہوم اردو میں کون سے الفاظ ادا کرتے ہیں؟ جناب کا ارشاد ہے کہ لذّت و الم اور میرا خیال ہے کہ حظ و کرب۔ آپ اپنے دعویٰ پر عربی لغت سے حجت لاتے ہیں اور میں اپنی تائید میں اردو محاورہ و لغت کو پیش کرتا ہوں۔ آپ اردو لغات سے استشہاد کرنے پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ خود اردو بولنے والوں کو اردو الفاظ کی تحقیق کے لیے عربی لغات کی جانب رجوع کرنا پڑے۔ انھیں اردو کہنا کیوں کر جائز ہے؟ لیکن غرض یہ ہے کہ جس وقت وہ اردو عبارت میں استعمال کیے جاتے ہیں، وہ یقیناً اردو ہیں۔ ورنہ اگر آپ کے اس اصول کو وسعت دی جائے کہ ہر اردو لفظ کی تحقیق، اس زبان کے لغت سے کرنی چاہیے جس سے وہ آیا ہے تو اردو کے پاس باقی ہی کیا رہ جاتا ہے؟

اصل مسئلہ ختم ہو گیا۔ رہا یہ سوال کہ اہلِ فارس لذّت و حظ کو مترادف سمجھتے ہیں یا نہیں؟ تو مجھے اس بحث سے اس موقع پر کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے کہ میں پھر یاد دلاتا ہوں کہ میری کتاب جس طرح عربی میں نہیں اسی طرح فارسی میں بھی نہیں۔ لیکن چونکہ جناب اسی پہلو پر خصوصیت کے ساتھ زور دے رہے ہیں، یہاں تک

کہ جناب کو محض اسی کے واسطے پنے پہلے دعوے میں، جو (بقول جناب ہی کے) احتیاطاً اور حفظ آداب تحریر پر مبنی تھا ترمیم کرنا پڑتی ہے، اس لیے مجھے بھی مجبوراً کچھ عرض کرنا پڑتا ہے۔ جناب ایک ایسے لہجے میں جو بظاہر تنقید و تنقیح سے ارفع معلوم ہوتا ہے، ارشاد فرماتے ہیں :

" اب میں مسٹر موصوف کو یقین دلاتا ہوں کہ فارسی میں کبھی کوئی پڑھا لکھا آدمی حظ کو " لذّت " کے معنیٰ میں بولنے کی افسوس ناک غلطی نہیں کرسکتا۔ حظ فارسی میں بھی ہمیشہ حصّہ اور نصیب کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔"

اور اس کے ثبوت میں غالب کا ایک شعر پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں جس میں حظ کو حصّے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر کرکے، کہ منطقی حیثیت سے یہ دلیل آپ کے دعویٰ کے لیے کہاں تک مفید ہے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ واقعات اس قطعی اور غیر مفید فیصلے کی تائید نہیں کرتے۔

افسوس ہے کہ بہار عجم وغیرہ اس وقت سامنے موجود نہیں، ورنہ غالباً بقید منہ و سطر میں یہ بتا سکتا کہ فارسی کے متعدد لغت نویسوں نے حظ کو لذّت و مسرّت کے معنی میں استعمال کرنے کی " افسوس ناک غلطی " کی ہے۔ خوش قسمتی سے " غیاث " البتہ میز پر موجود ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے :

"حظ بہرہ و نصیب و در بہار عجم نوشتہ کہ فارسیاں بمعنی خوشی و خرمی استعمال کنند"۔ (صہ ۱۴۳ مطبوعہ کانپور)

اس سے بڑھ کر یہ کہ مستشرقین یورپ کے فارسی لغات جس قدر میری نظر سے گزرے ہیں، ان سب میں حظ کے معنیٰ صرف مسرّت کے دیے ہیں، اور یا اس کے یہ معنیٰ، منجملہ دیگر معانی کے تحریر کیے ہیں، لیکن ایسا کوئی لغت نہیں گزرا جس میں حظ اور لذّت کو مرادف قرار دینے کی افسوس ناک غلطی نہ کی گئی ہو۔ آپ کی تشفی کی غرض سے میں چند لغات کی اصل عبارتیں درج ذیل کرتا ہوں اور اگر ضرورت ہوئی تو اس سے زائد شواہد حاضر کرنے کو تیار ہوں۔

پروفیسر پامر، جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں، اپنے مختصر فارسی، انگریزی لغت میں لکھتے ہیں :

(HAZZ). PLEASURE, DELIGHT. حظ کردن TO ENJOY

حظ (CONCISE PERSIAN DICTIONARY) P. 199-200

یعنی، حظ، بہ معنیٰ، لذّت و مسّرت اور حظ کردن، بمعنی لطف اٹھانا

ڈاکٹر ویکنس، جن کا فارسی، عربی لغت، رچرڈسن کے مشہور و مستند لغت سے ماخوذ ہے، لکھتے ہیں :

"حَظ (HAZZ). HAPPINESS" (WILKIN'S PERSIAN ARABIC AND ENGLISH LOCUBVARY") P. 226.

اس میں میں نے اقتباس نہیں کیا، بلکہ اس نے حظ کے معنی صرف " مسرّت " کے دیے ہیں۔ مشہور محقق ڈاکٹر اسٹین گاس، اپنے مبسوط لغت میں فرماتے ہیں :

حظ (HAZZ). BEING BLESSED WITH PROSPERITY.......
GOOD FORTUNES; HAPPINESS; PLEASURE, DELIGHT;
FLAVOUR, TASTE; A PART, PORTION..... "حظ فانی" THE FADING PLEASURE" (STRINGASS'S PERSIAN AND ENGLISH DICTIONARY). P. 423

" یعنی، حظ کے معنی جائداد و دولت سے خوش بخت ہونا، مسرّت لذّت، انبساط، ذائقہ، مزہ، حصّہ، ٹکڑا وغیرہ۔ حظِ فانی: فنا ہونے والے لذات۔ حظ کردن: یعنی لطف اٹھانا۔ حظِ نفسانی: یعنی لذّاتِ حسی۔" غور فرمائیے کہ یہ اہل لغت، نہ صرف " حظ " کو لذّت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، بلکہ اس سے جتنے تراکیب پیدا کرتے ہیں (حظ فانی، حظ نفسانی، حظ کردن وغیرہ) ان سب میں بھی حظ کے معنی لذّت اور صرف لذّت کے لیتے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا باقی رہ گیا ہے کہ میں ایک مدت کی سعی و تلاش کے بعد، جو اگرچہ یقیناً محدود تھی، مگر شاید ناقابل لحاظ نہ تھی، اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مسلمانوں نے اصناف فلسفہ میں سے صرف دو چیزوں کو ہاتھ لگایا تھا، الٰہیات اور منطق قیاس۔ اسلیے فلسفہ کی جدید شاخوں مثلاً منطق، استقرا، نفسیات (PSYCHOLOGY)

علمیات (EPISTEMOLOGY) جمالیات (AESTHETIES) اور اخلاقیات اپنے جدید معنی میں (ETHICS) وغیرہ کے متعلق عربی زبان میں مواد موجود نہیں۔ لیکن آج مجھ سے یہ باور کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ "فلسفہ میں بہتر سے بہتر صحیح عربی لفظ مل سکتے ہیں، بشرطیکہ تلاش کیے جائیں۔"

یہ دعویٰ میرے لیے جس قدر حیرت انگیز ہے، اس سے زیادہ مسرت انگیز ہے۔ بشرطیکہ اس کی تائید واقعات کی زبان سے ہو، اور اگر الہلال کی کوششوں سے اس سخت غلط فہمی کا پردہ میرے اور مجھ جیسے صدہا ناواقفوں کے سامنے سے اٹھ جائے تو بلاشبہ یہ اس کی ایک قابلِ لحاظ علمی خدمت ہوگی۔"

الہلال کے اس شمارے میں صفحہ ۱۴ پر اکبر الہ آبادی کے تاثرات بھی درج ہیں۔ وہ آزاد کو خط میں لکھتے ہیں:

"جناب والا! حظ و کرب اور لذت و الم کے مقدمہ میں اگر میری گواہی کچھ وقعت رکھتی ہو تو آپ اپنا گواہ مجھ کو قرار دے سکتے ہیں۔ اگرچہ مجھ کو شبہ ہے، راحت و الم کہوں یا لذت و الم؟ مسٹر عبدالماجد صاحب سے چند روز الہ آباد میں مجھے ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا، اور میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ تحریر مضامین فلسفہ کے لیے ایک فرہنگ کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کچھ مشکلات بیان کی تھیں، اور ان کا فرمانا بجا تھا۔ درحقیقت بڑا کام ہوگا اگر مسٹر ممدوح ایک مجموعہ الفاظ یکجا کرلیں، اور مغربی خیالات کو اردو میں لکھنے میں مدد ملے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ الفاظ حظ و کرب یا لذت و الم کن انگریزی لفظوں کے مقابلے میں تحریر کیے جاتے ہیں، غالباً ہین اینڈ پلیزر۔ مسٹر ماجد علی صاحب کا ایڈریس ارشاد ہو تو ارادہ ہے کہ ان سے مراسلت کروں۔"

الہلال کے اسی شمارہ میں صفحہ ۱۵ پر خدابندہ جونپوری کا طویل مراسلہ آزاد کی حمایت میں شائع ہوا۔ مراسلہ نگار کو یہ شکایت اور افسوس ہے کہ فارسی زبان کا کوئی معتمد قابلِ استناد لغت نہ مرتب ہوا اور نہ موجود ہے۔ ایک شرف نامہ تھا مگر اب تک شائع ہی نہیں ہوا۔ موصوف نے فرہنگ رشیدی، جہانگیری، برہان اور مؤید الفضلا کے مرتبین پر تنقید کی کہ وہ مشاہیر شعرا کے کلام سے لغت کا استقرا کرنے میں کنایات و استعارات و تشبیہات کو بھی لغت سمجھتے ہیں۔ خدابندہ نے بہارِ عجم فرہنگ آنند راج، غیاث الدین رامپوری، خان آرزو (سراج اللغہ) انجمن آرائے ناصری اور مستشرقین فرہنگ نویسوں کو بھی نشانۂ تنقید بنایا۔ موصوف نے آزاد کو خوش کرنے کے لیے صائب کا یہ شعر بھی کسی قلمی نسخے سے بغیر کسی نشاندہی کے پیش کیا ہے

نشاطِ عمر ملاقاتِ دوست داران است
چہ حظ برد خضر از عمرِ جاودان تنہا

ساتھ ہی یہ انکشاف بھی فرماتے ہیں کہ فرہنگ نویسوں نے شعر کا دوسرا مصرع یوں غلط لکھا ہے

چہ حظ کند خضر از عمرِ جاوداں تنہا

یہ بھی لکھتے ہیں کہ "مفہوم تبدیل ہونے کے لیے اتنی تبدیلی کافی تھی۔ حظ کے معنی لذت و راحت کے بن گئے ہیں۔ وہ "حظ و کرب" کے بارے میں بغیر کسی تلاش و جستجو اور استشہاد کے اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

عربی و فارسی میں فی الواقع "حظ" کا صحیح استعمال "لذت" و "راحت" کے لیے نہیں ہوا، اور نہ ہو سکتا ہے۔ اردو میں بے شبہ یہ استعمال آجکل مروج ہے لیکن اساتذۂ لغت کا ہنوز اس پر اجماع نہیں، پھر کیا ضرور ہے کہ علمی اصطلاح کی ترجمانی کے لیے زبان میں جب ایک صحیح لفظ موجود ہے تو اس پر غیر صحیح کو ترجیح دی جائے۔"؟

ہم نے بھی "حظ" کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ یہ لفظ فرہنگ رشیدی، جہانگیری، برہان قاطع اور ہفت قلزم میں درج نہیں ہے۔ بہارِ عجم جلد اول ص ۲۳۹ میں اس کے معنی یوں درج ہیں: نصیب و قسمت و فارسیان بمعنی عیش و خوشی استعمال نمایند"۔ اس کے بعد وہ شعر سند میں لکھا ہے جو خدابندہ نے اوپر لکھا ہے۔ فرہنگ لغات کشوری (جدید اڈیشن) صفحہ ۱۴۰ میں "حظ" اس طرح ملتا ہے:

"حظ۔ ع۔ نصیب، بہرہ، بہرہ مند ہونا، صاحب نصیب ہونا مگر فارسی لوگ اکثر بمعنی فائدہ اور خوشی اور خرمی کے استعمال

(باقی ص ۴۲ پر)

غزلیں

یہ دکھ تو جھیلنے ہوں گے، یہ رونا عمر بھر کا ہے
لہو تو کھینچنا ہوگا، تقاضا چشمِ تر کا ہے

غبار اُڑتا تھا پہلے بھی، گھٹا پہلے بھی اُٹھتی تھی
مگر اب کے عجب عالم ترے شوریدہ سر کا ہے

کھلی آنکھوں پہ کچھ احوالِ دُنیا کا نہیں کھلتا
جو دیکھا ہے وہی سچ ہے کہ سب دھوکا نظر کا ہے

تمنا ہے بگولوں کی، نہ جانے کس طرف جائیں
بیاباں اس طرف کو ہے یہ رستہ میرے گھر کا ہے

کسی کی حسرتِ پرواز بکھرا دی گئی ہو گی
خلاؤں میں یہ سارا انتشار اک مشتِ پر کا ہے

ہزاروں نقشِ پا ہیں راستے میں اور کہتے ہیں
ہمیں چلنا نہیں آتا ارادہ تو سفر کا ہے

مظفرؔ خیر سے نقاد بھی ہو، غور سے دیکھو
کھری تحریر تھوڑی ہے نوشتہ آبِ زر کا ہے

ڈاکٹر مظفرؔ حنفی
پروفیسر اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی
کلکتہ

رخشندہ سرِ خاک ستارے نظر آئے
مہتاب بھی کچھ دیر میں شاید اُتر آئے

ہم کو تو گزرنا پڑا اک دشتِ بلا سے
در پیش تمھیں کاش نہ ایسا سفر آئے

لکھی تھی مقدر ہی میں کچھ دشت نوردی
ہم گھر سے جو نکلے، تو پلٹ کر نہ گھر آئے

مجھ کو نہ ملے، گر ہو جواب اُس کا نہیں میں
میرے لیے جو بد ہو نہ ایسی خبر آئے

خاموش سمندر میں یہ طوفان سا کیا ہے
ٹھہرے ہوئے پانی میں کہاں سے بھنور آئے

احساس یہاں ہوگا کسے سایۂ گل میں
اِک آگ کا دریا تھا جو ہم پار کر آئے

صد شکر مری پشت پہ آئی نہ کوئی ضرب
جو زخم بھی آئے وہ مرے سینے پر آئے

ہم سب ہی سمندر میں اُترنے کو کھڑے ہیں
لیکن جو گئے پار کچھ ان کی خبر آئے

اچھا تو خوش آئے تمھیں یہ صبحِ مسرت
مجھ کو یہ دُعا دو کہ شبِ غم بسر آئے

محسنؔ ملی اس شہر میں بس خانہ بدوشی
جس شہر میں ہم چھوڑ کر اپنا نگر آئے

محسن زیدی
۵۳/۱۸، ۱، اندرا نگر، لکھنؤ
۲۲۶۰۱۶

پروفیسر شارب ردولوی
II/۷ موریا نگر۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۷

مجاز — کچھ یادیں

مجھے ۴؍دسمبر ۱۹۵۵ء کی وہ رات اب تک یاد ہے جس نے مجاز کو ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا کردیا۔ ۳؍دسمبر سے لکھنؤ میں اُردو کنونشن تھا۔ سارے شہر میں ایک ہلچل تھی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے بعد پہلی بار کسی کنونشن کے موقع پر اُردو کے اتنے بڑے ادیب، شاعر اور دانش ور لکھنؤ میں اکٹھا ہوئے تھے۔ ہر ایک اس طرح خوش تھا جیسے اسے کوئی دولت مل گئی ہو۔ بہت سے ادیب اور شاعر ایسے تھے جن کو لوگوں نے رسائل میں پڑھا اور ریڈیو پر سنا تھا لیکن دیکھا نہیں تھا۔ ۳؍دسمبر کو لکھنؤ کی سفید بارہ دری (قیصر باغ) دُلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ شہر کے تمام معزز حضرات، ادیب، شاعر، یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ و طلبا، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے۔ سردی کے باوجود بارہ دری کے باہر تک لوگ کھڑے تھے کہ گورنر اترپردیش جناب کے، ایم، منشی کے آنے کا اعلان ہوا۔

کے۔ ایم۔ منشی صاحب کا شمار اس وقت اُردو حلقوں میں اردو دوست کی شکل میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہندی کے زبردست وکیلوں میں تھے، لیکن خود بھی ادیب و دانشور تھے اور میں اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر واقف تھا کہ وہ ہر زبان کا احترام کرتے تھے اور اس کی ترقی کے خواہشمند تھے، اسی لیے ہم نے انھیں کنونشن کے لیے مدعو کیا تھا۔ میں کنونشن کا جنرل سکریٹری تھا۔ میں نے سب سے پہلے مختصر الفاظ میں سب کا استقبال کیا۔ کنونشن کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس کے بعد عالیہ عسکری نے جو اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم، اے کر رہی تھیں، کنونشن کے صدر کی حیثیت سے استقبالیہ خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد کے۔ ایم منشی صاحب نے افتتاح کرتے ہوئے اُردو کی اہمیت پر بڑی اچھی تقریر کی۔ یہ اس وقت کی اُردو دشمنی کی فضا میں بہت خوش آیند قدم تھا جس کا اندازہ شاید آج نہ کیا جاسکے۔ افتتاحیہ جلسے کے بعد شب میں مشاعرہ تھا۔ لکھنؤ کی تاریخ بڑے اور کامیاب مشاعروں کے ذکر سے بھری ہوئی ہے لیکن یہ مشاعرہ لکھنؤ کی ادبی زندگی میں ایک تاریخی مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں لکھنؤ اور قرب و جوار کے مشہور شعراء کے علاوہ ساحر لدھیانوی، مجاز، سردار جعفری، نیاز حیدر اور باقر مہدی سب ہی لوگ موجود تھے۔ مجاز سرخوشی کے عالم میں تھے۔ مشاعرے کی نظامت میرے سپرد تھی۔ نصف رات کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں انھیں پڑھوا دوں۔ میں کچھ دیر ٹالتا رہا، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ زیادہ بے چین ہو رہے ہیں اس لیے ان کے تعارف میں انھیں کا ایک شعر؎

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ اُلفت کا طلب گار ہوں میں

پڑھتے ہوئے ان سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ مجاز نے دو غزلیں پڑھیں۔ ہر شعر پر داد تحسین کا وہ شور بلند ہوتا کہ کئی بار انھیں شعر پڑھنا پڑتا۔ دوسری غزل کے بعد لوگوں نے آوارہ، آوارہ کی آواز لگا کر ان کی مشہور نظم 'آوارہ' کی فرمائش کی۔ لیکن مجاز نے یہ کہہ کر کہ "وہ بہت آوارہ ہوگئی ہے" فرمائش کو ٹال دیا اور اس کے بجائے غزل کے چند شعر اور سُنا کر اپنی جگہ واپس آگئے۔

کسے معلوم تھا کہ یہ مجاز کی زندگی کا آخری مشاعرہ ہے۔ وہ جسمانی اعتبار سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ کئی دماغی حملے برداشت کرنے کے بعد اب وہ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ شعر گوئی بھی بہت کم ہوگئی تھی لیکن ذہانت وہی تھی۔ جس وقت شعر پڑھتے تھے تو خود ان پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ میں نے بزرگوں، نوجوانوں، ادیبوں اور شاعروں میں، خواہ وہ ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں، کسی کو نہیں دیکھا جو مجاز کی

شاعری کا مداح نہ ہو۔

ان کی اس مقبولیت کا سبب کیا تھا۔؟ ان کی رومانیت۔؟ ان کی ترقی پسندی۔؟ ان کا تصورِ انقلاب۔؟ ان کی غنائیت۔؟ مجاز کے ناقدین نے عام طور پر ان کی شاعری کے انھیں پہلوؤں پر زور دیا ہے لیکن یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس عہد کے کئی دوسرے شاعروں کا بھی طرۂ امتیاز تھیں۔ پھر وہ کون سی ایسی بات ہے جس وجہ سے وہ اپنے عہد میں سب سے زیادہ ممتاز و مقبول تھے، جس کا اعتراف فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر نے بھی کیا ہے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور فراق گورکھپوری نے بھی۔ میرے خیال میں رومانیت اور ترقی پسندی وغیرہ ثانوی چیزیں ہیں۔ مجاز کے یہاں بنیادی چیز زبان، اس کی سادگی، روزمرہ اظہار کا البیلا پن اور ان کی شدید حسیت ہے۔ وہ جذبے کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کا حصہ بن جاتے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتے ہیں۔

دراصل کلام ہی مخاطب اور گفتگو کرنے والے کے درمیان سب سے بڑا اور سب سے پُراثر رشتہ ہے۔ یہیں زبان کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے، اس لیے کہ زبان ہی اجنبیت کی دیواروں کو توڑ کر اپنائیت کے رشتے پیدا کرتی ہے اور جہاں اپنائیت کا احساس ہو وہاں دوسرے کی خوشی اپنی خوشی اور دوسرے کا غم اپنا غم بن جاتا ہے۔ مجاز اور مجاز کے قاری یا سامع کے درمیان یہی اپنائیت اور یہی مسرت و غم میں شرکت کا رشتہ ہے جو بہت کم لوگوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مجاز اور ان کے قاری کی WAVE LENGTH ایک ہے اسی لیے جو کچھ وہ کہتے ہیں قاری کو ان کے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ مجاز کی شاعری رومانیت یا انقلابی رومانیت کی علامت یا مثال بعد میں ہے پہلے وہ اپنے عہد کی حسیت کی علامت ہے۔ وہ اس وقت کی زندگی، اس وقت کے سماج، اس وقت کی تہذیب اس وقت کی محبتوں، رقابتوں اور تضادات کی علامت ہے۔ وہ اس وقت کی شکستوں، تشنگی، حرماں نصیبی، گھٹن اور بے بسی کی علامت ہے۔ وہ خونِ دل کو گلابی میں ڈھالنے، ناکامیوں سے کام لینے، جان و دل کو ایک نامعلوم کیف میں بسائے رہنے اور نا اُمیدیوں میں اُمید کی علامت ہے۔ وہ اس گھٹن کی تصویر ہے جس سے اس وقت کا معاشرہ اور اس وقت کا ہر نوجوان گزر رہا تھا۔

مجاز کی شاعری کی ایک خصوصیت اس میں زندگی کی تازگی اور گرمی ہے۔ وہ زندگی سے بیزار اور مایوس نہیں بناتے بلکہ بدترین حالات میں بھی زندہ رہنے اور اس سے لطف لینے کی اُمنگ پیدا کرتے ہیں ؎

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

یہ نرم، تصنع سے عاری، سادہ لب و لہجہ دلوں کو اس طرح چھوتا ہے کہ اس وقت کی ساری گھن گرج اور انقلاب کی نعرہ بازی اس میں ڈوب جاتی ہے اور یہی مجاز کی انفرادیت ہے اور یہ انفرادیت خواہ ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں ان کی عشقیہ شاعری ہو یا انقلابی شاعری، ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔

مجاز کے لیے شاعری مرصع سازی، یا انقلاب کے جوش میں ہر چیز کو جلا دینے، ہر روایت کو تحس نحس کر دینے کا نام نہیں تھا، جو اس وقت کی شاعری میں عام تھا۔ اس زمانے کی شاعری میں عام طور پر یہی دونوں رویّے نظر آتے ہیں۔ یا تو ٹھونک پیٹ کر بٹھائے گئے الفاظ، محاورے تشبیہات استعارات اور صنعتوں کی شاعری تھی یا انقلاب کی رجز خوانی، افلاس کا مرثیہ اور انتقام کی شاعری۔ وقتی طور پر یہ شاعری بھی متاثر کر رہی تھی۔ نوجوانوں اور عوام میں جوش و ولولہ پیدا کر رہی تھی لیکن شاعری شاعروں کے اس وقتی تاثر یا جوش سے آگے کی چیز ہے۔ ورنہ پھر وہ بھی اس لمحہ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ مجاز نے بھی وقتی تقاضوں کے تحت اشعار اور نظمیں لکھی ہیں۔ کچھ چیزوں پر کسی کو اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی وقتی تقاضوں کی شاعری بھی گلے سے اوپر چیخ و پکار کی شاعری نہیں بلکہ دل پر لگی چوٹ اور شدید احساس کی شاعری ہے جو جذبے کو ایک کیفیت میں تبدیل کر دیتا ہے ؎

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

تمہارے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجاز کے انقلابی تصور رکھنے والے اشعار ہوں یا اس طرح کے رومانی اشعار

مجھے پینے دے پینے دے کہ ترے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے کچھ اور ہے ساقی

تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لیے
گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں

ان کے یہاں جذبے کی 'بیہودہ تشہیر' نہیں ہے۔ ان کا ٹھہرا ہوا انداز، دل میں اتر جانے والی ان کی لَے، ان کا بے ساختہ اظہار، ان کے جذبے کی سچائی اور شدت، ان کی انقلابیت اور رومانیت دونوں کی قوت ہے جس نے انھیں اپنے زمانے کا مقبول ترین شاعر بنا دیا۔

میں نے ذکر کیا تھا کہ اس رات انھوں نے تین غزلیں پڑھی تھیں مجھے تمام غزلیں تو یاد نہیں لیکن ان میں ایک غزل یہ تھی :

پرتو ساغر صہبا کیا تھا
رات اک حشر سا برپا کیا تھا

کیوں مجاز آپ نے ساغر توڑا
آج یہ شہر میں چرچا کیا تھا

اور دوسری سے

بڑی مشکل ہے دُنیا کا سنورنا
تری زُلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

۴ر دسمبر کو دن بھر گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں کنونشن کا ڈیلی گیٹ سیشن ہوتا رہا۔ آج کل میں تمام ادیب و شاعر بھی موجود تھے۔ سہ پہر کو فوٹو گروپ ہوا جس میں ڈاکٹر عبد العلیم، بنّے بھائی، سردار جعفری، نیاز حیدر، مجاز، ساحر، باقر مہدی، محمد حسن سبھی لوگ تھے اور یہ مجاز کی زندگی کی آخری تصویر تھی۔ بہت سے لوگوں کے ذہنوں اور تصویر کے کلکشن میں ابھی وہ تصویر موجود ہوگی۔ آزادی کے بعد مُلک میں اُردو کے سلسلے میں یہ پہلا کنونشن تھا جس میں یوپی کی تمام یونیورسٹیوں کے نمائندے اور یونیورسٹی یونین کے عہدیداران شریک تھے اور ان شرکا میں بڑی تعداد غیر مسلم طلبا کی تھی جو پہلی بار اُردو کے جائز حقوق کے مطالبوں میں اُردو والوں کے دوش بدوش کھڑے ہوئے تھے۔

مہمانوں اور تمام ڈیلی گیٹس کو رخصت کرنے کے بعد تقریباً ½9 بجے رات میں مجھے فرصت ملی۔ میں چند ساتھیوں عارف نقوی، حسن عابد، ذکی شیرازی وغیرہ کے ساتھ نوری ہوٹل چلا آیا۔ یہ خیالی گنج کی سڑک پر 'روز محشر' والی مسجد کے سامنے ایک تاریخی ریسٹورنٹ تھا جسے ہوٹل کہتے تھے، اور میں مستقل طور پر یہیں کھانا کھاتا تھا۔ میں نے ابھی کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ کسی نے آکر کہا کہ آپ کو مجاز بلا رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "کہاں ہیں۔؟"

اس نے کہا "سنگم ہوٹل کے سامنے کھڑے ہیں۔"

نوری کے علاوہ امین آباد کا یہ دوسرا اس زمانے کا مشہور ریسٹورنٹ تھا، جس کے مالک ایک شاعر محبوز مان پاروی تھے اور جہاں ہر وقت شعرا کا مجمع لگا رہتا تھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ دھویا اور برابر کی گلی سے نکل کر تیز قدم سنگم پہنچا۔ مجاز چند لوگوں میں گھرے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ یہ لوگ مجھے لکھنوی کہتے ہیں۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر یہ شعر پڑھا

فانی ہم جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ابھی وہ بات بھی میں ان سے دریافت نہیں کر سکا تھا کہ انھوں نے مجھے کیوں بلایا ہے، کہ سنگم کے سامنے سے قیصر باغ کی طرف جاتا ہوا ایک رکشہ گزرا جس پر جلال ملیح آبادی اور ایک صاحب جنھیں ہم لوگ صرف پہلوان کی عرفیت سے جانتے تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجاز کو دیکھ کر زور سے آواز دی۔ مجاز اس وقت خاصی سرخوشی کے عالم میں تھے لیکن ان کی آواز سُن کر وہ بے تحاشا رکشے کی طرف دوڑے۔ میں نے اگر انھیں سنبھال نہ لیا ہوتا تو وہ سڑک پر گر جاتے۔ وہ اسی رکشے پر ان کے ساتھ سوار ہو گئے۔ میں انھیں روکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کب سننے والے تھے۔ رکشہ فوراً آگے بڑھ گیا

آج بھی کسی تصویر کی طرح وہ سارا منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میں سوچتا ہوں کہ مجاز نے کتنا سچ کہا تھا ۔

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دُور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

ایک زمانے کے بعد مجاز کے تمام دوستوں اور ساتھیوں کا لکھنؤ میں جمع ہوجانا ان کے لیے زندگی کی محفل کا دوبارہ آراستہ ہوجانا تھا لیکن موت واقعی کہیں گھات لگائے ہوئے تھی ۔

مجاز چلے گئے ۔ یہ لوگ لال باغ کے ایک شراب خانے میں جمع ہوتے تھے ۔ مجاز اسے 'لاری کی چھت' کہتے تھے ۔ وہاں چونکہ محنت مزدوری کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا اور بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی، اس لیے یہ لوگ اس کی کھلی چھت پر بیٹھ کر شراب پیتے تھے ۔ اُس رات کب تک یہ لوگ وہاں پیتے رہے کسی کو نہیں معلوم، لیکن نشے میں وہ دونوں تو کسی وقت اٹھ کر چلے آئے اور مجاز مدہوشی کے عالم میں دسمبر کی اس یخ بستہ رات میں ایک کرتے اور واسکٹ میں اسی کھلی چھت پر پڑے رہے ۔

۵ر دسمبر کو کنونشن کا کھلا اجلاس ہو رہا تھا ۔ عصمت چغتائی، بنّے بھائی اور احتشام صاحب مجلسِ صدارت میں تھے ۔ سردار جعفری کا نام بھی مجلسِ صدارت میں تھا لیکن وہ موجود نہیں تھے ۔ میں اجلاس کی نظامت کر رہا تھا ۔ تقریروں کا سلسلہ چل رہا تھا ۔ تھوڑی دیر میں سردار جعفری نے مجھے باہر سے اشارہ کیا ۔ میں باہر آگیا تو انھوں نے بتایا کہ مجاز کی حالت بہت خراب ہے ۔ وہ بلرام پور اسپتال میں داخل ہیں ۔ میں بنّے بھائی اور عصمت آپا کو لے کر فوراً وہاں پہنچ جاؤں ۔ یہ کہہ کر وہ الٹے پیر واپس ہوگئے ۔ مجھے ایسا لگا جیسے بجلی گر پڑی ہو ۔ میں اسٹیج پر واپس جاکر بنّے بھائی کے پاس بیٹھ گیا اور چپکے چپکے انھیں یہ خبر سنائی، اور ان سے یہ مشورہ کیا کہ اجلاس فوراً ختم کردوں ۔ انھوں نے اجازت دے دی لیکن تاکید کی کہ یہ مجمع اسپتال نہ جائے ۔ میں کسی طرح اسے روکے رہوں ۔ تقریر ختم ہونے کے بعد میں نے مائک پر جاکر مجاز کی تشویش ناک حالت کی اطلاع کے ساتھ اجلاس کے اختتام کا اعلان کردیا اور یہ تاکید کردی کہ ڈاکٹروں نے لوگوں کو وہاں جانے سے منع کیا ہے ۔

احتشام صاحب، بنّے بھائی اور عصمت آپا تو فوراً وہاں سے چلے گئے لیکن مجھے لوگوں نے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے، جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا ۔ ان لوگوں سے بچ کر میں کسی طرح بلرام پور اسپتال پہنچا تو اسپیشل وارڈ کے باہر برآمدے میں عصمت آپا دیوار سے ٹکی ہوئی زمین پر بیٹھی تھیں ۔ ان کے چہرے پر عجیب طرح کی مایوسی اور کرب تھا ۔ کمرے کے دروازے پر بنّے بھائی اور سردار جعفری کھڑے ہوئے تھے ۔ میں کمرے کے اندر چلا گیا ۔ مجاز بے ہوش تھے آکسیجن کا ٹیوب لگا ہوا تھا ۔ کمرے میں صرف ان کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آرہی تھی ۔ چارپائی کی پائینتی ایک نرس کھڑی بڑی اداسی اور افسردگی کے ساتھ مجاز کو دیکھے جارہی تھی جیسے وہ ان کی "نورا" ہو اور کہہ رہی ہو کہ "میں نے اس طرح بیمار ہوکر آنے کو تو نہیں کہا تھا" ۔

تھوڑی ہی دیر میں شاعروں، ادیبوں اور نوجوانوں کا ایک مجمع وہاں اکٹھا ہوگیا ۔ ہر شخص پریشان تھا ۔ بڑی مشکل سے لوگوں کو وہاں سے رخصت کیا گیا ۔ ڈاکٹر پہلے ہی ناامیدی کا اظہار کرچکے تھے ۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جس کے خوف سے ہر دل دہلا ہوا تھا ۔

رات میں ہم لوگ میت لے کر ان کے مکان 'دارالسراج'، نیو حیدرآباد پہنچے جہاں نصف رات کے وقت بھی نوجوانوں کا مجمع تھا ۔ بلرام پور اسپتال سے میت کے ساتھ جانے والوں میں سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، میں، ذکی شیرازی اور مجاز کے ایک عزیز سعید اختر نعمانی تھے ۔ جس وقت میت ان کے گھر پہنچی ہے ہر شخص چیخیں مار مار کر رو رہا تھا ۔

۶ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو نشاط گنج کے قبرستان میں مجاز کی تدفین ہوئی ۔ ان کی میت کو سب سے پہلے کاندھا دینے والوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، نیاز حیدر، احتشام صاحب اور محمد حسن تھے ۔ نیاز حیدر کا یہ عالم تھا کہ آنسوؤں سے چہرہ تر تھا اور تابوت کے ایک پائے کو اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہتے تھے ۔ شہر کا شاید ہی کوئی اہم شخص ہو جو اس وقت موجود نہ رہا ہو ۔ حسن عابد، ذکی شیرازی، احراز نقوی اور شکیب رضوی تو رات سے تھوڑی دیر کے لیے بھی الگ نہیں ہوئے تھے ۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

منزل بہ منزل، کو بہ کو

وہ بڑھا منزل بہ منزل کو بہ کو
بطنِ مادر سے وجودِ ہستی و انساں حیات
ذرّے ذرّے پر زمیں کے نقشِ پا کو چھوڑتا
آسمانوں پر ترقی کی کمندیں پھینکتا

جاوداں ہردم جواں آہن صفت
ارتقا کی راہ پر تنہا تھا، پر ثابت قدم
خوش نگاہ و خوش مذاق و بے خطر
وہ بڑھا منزل بہ منزل کو بہ کو
دل میں استقلال و استحکام تھا
عقل و دانش تھے غلامان و اسیر

اعلا ہمت
اور طبیعت پاک تھی
ہر ادا معصوم، پر بیباک تھی
ہر تبسم پر فدا تھی کائنات
ہر نفس میں ایک ہی آواز تھی

مرحبا اے مردِ کامل مرحبا!
وہ بڑھا منزل بہ منزل کو بہ کو
جب تھا تنہا بادشاہِ وقت تھا
جب تھا تنہا خوش تھا وہ خوش بخت تھا
جب تھا تنہا وہ تھا اہلِ ذی کمال
ماہرِ علمِ نجوم و صاحبِ جود و سخا
رشکِ قیصر، فخرِ دارا، خسروی اس کا مزاج
وہ بڑھا منزل بہ منزل، کو بہ کو

اسرار سید
"شوچنا بھون"
لکھنؤ

بھکارن

اک بھکارن شہر کے فٹ پاتھ پر بوسیدہ حال
وا کیے اہلِ کرم کے سامنے دستِ سوال
بوالہوس افراد کو غرقاب کرتی چاہ میں
خواہشِ بے جا کا سر پامال کرتی راہ میں
اپنی عریانی پہ گھبرائی کبھی شرمائی سی
اک پھٹے آنچل کا گوشہ زیرِ شانہ کھینچتی
کھردرے سے ہاتھ میں کاسہ فقیری کا لیے
غیرتِ انسانیت کا چہرے پر غازہ ملے
شہر کی گلیوں میں نکلی بھیک کی خواہش لیے
پیٹ کے اندر دہکتی بھوک کی آتش لیے
بال اُلجھے آنکھ بوجھل، ہونٹ مرجھائے ہوئے
حسن پر افلاس کے بادل سیہ چھائے ہوئے
پاؤں میں رنگِ حنا خواب گراں انمول تھا
ہاتھ میں کنگن کے بدلے فقر کا کشکول تھا
جس کی آنکھیں رو رہی تھیں شوخ کاجل کیلئے
زلف جس کی تھی پریشاں بوئے صندل کیلئے
نیچی نظروں میں سجائے سینکڑوں پژمردہ خواب
جس کے اشکوں کی روانی میں سلگتے ماہتاب
نوجوانی کا اٹھائے بوجھ اپنے دوش پر
کم سنی کے خط نمایاں تھے لبِ خاموش پر
میں کہ فاقہ مست کاوش اس کی حالت دیکھ کر
دیر تک رویا کیا بیٹھا اسی فٹ پاتھ پر

کاوش الٰہ آبادی
۲۳۰ - دائرہ شاہ اجمل
الہ آباد

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
سینٹر آف لینگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

غزل میں نئے تجربات کا مستقبل

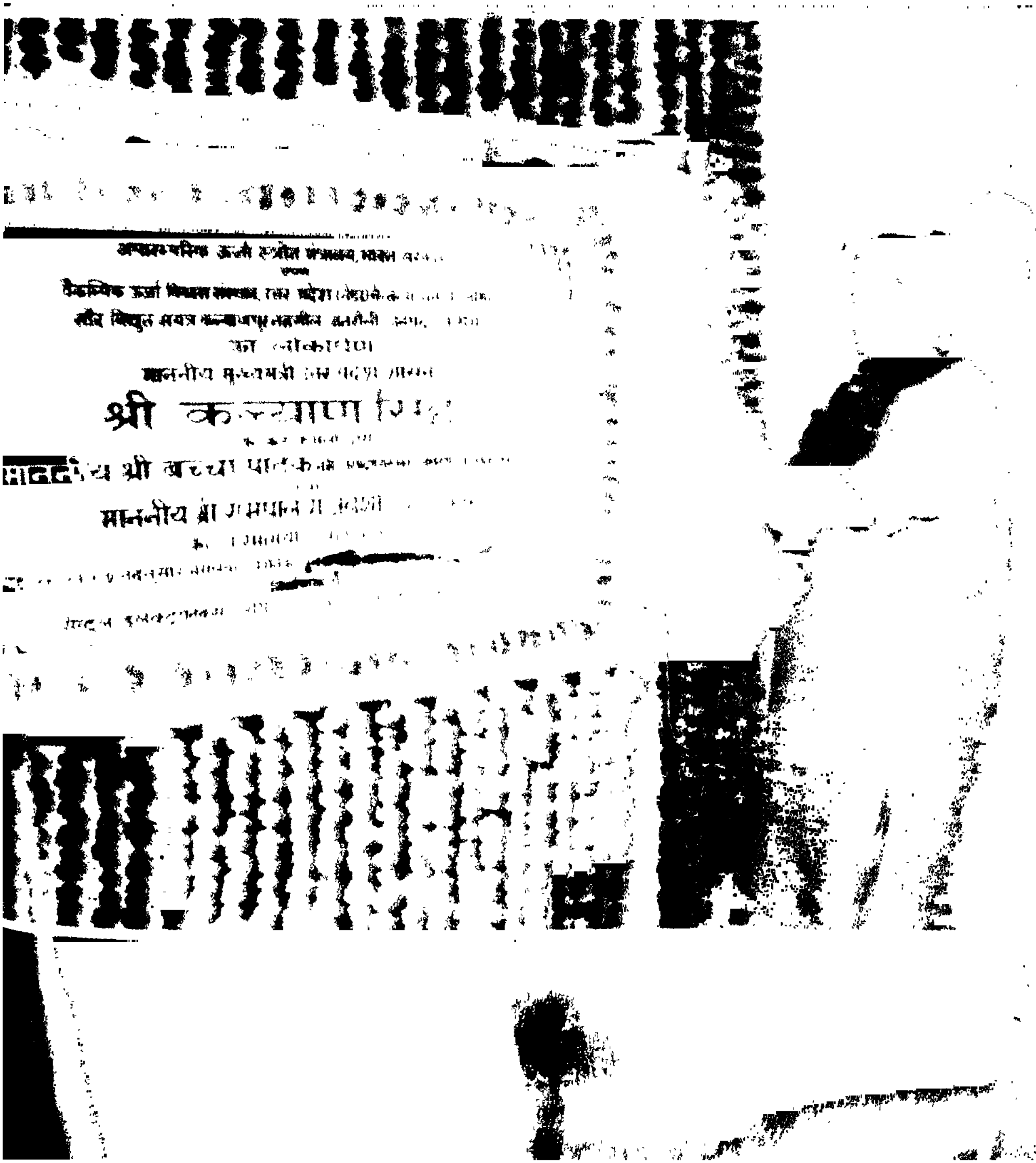
کسی بھی جیتی جاگتی زبان کا تصور تخلیق کے نئے تجربات کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیق کا مفہوم ہی کسی ایسی شے کو وجود میں لانا ہے جو پہلے موجود نہ ہو۔ نئی فنی تخلیق ایک پیچیدہ اور پُراسرار عمل سے گزر کر ظہور کرتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک دو لوگوں کا نہیں بلکہ کسی زبان کے پورے ادبی حلقے کا مدتوں کا ریاض ہوتا ہے۔ نئے تجربات بھی اس ادبی ریاض کا حصہ ہیں۔ مگر تجربہ کرنے والے تخلیق کار اپنی اپنی جگہ آزاد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی فضا سے، اپنی روایت سے، اپنے قریبی ہم عصروں سے حاصل تو بہت کچھ کرتے ہیں مگر اپنی انفرادیت کی جلا بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان ہی فن کاروں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے نئے تجربات اچانک سب کو چونکا دیتے ہیں اور بعضوں کے ہاں مانوس عناصر اتنے حاوی ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی ایسا پہلو ہوتا بھی ہے تو وہ کچھ پھیکا سا رہتا ہے۔ نئے تجربات کے سلسلے میں سرخروئی انہیں کو نصیب ہو سکتی ہے جنھیں دوسروں کے تجربات کی کامیابی یا ناکامی کا بھی بھرپور اندازہ ہو۔

نئے تجربات کے لیے نہ تو کوئی شرط ہے اور نہ حد۔ اگر ہو تو پھر وہ تجربہ ہی کہاں رہا! مگر ہر صنف کی اپنی ایک منطق بھی ہوتی ہے جس کے مطابق تجربات کی جہت خود بخود طے ہوتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے لیے خود غزل کو ہی لے لیجئے۔ فارسی اور اردو کی صدیوں پرانی روایت نے غزل کی ہیئت متعین کی، جس کے بغیر اب غزل کی صنف کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس ہیئت سے انحراف کی ایک صورت عہد حاضر میں 'آزاد غزل' کے نام سے نکالی گئی۔ مگر یہاں بھی ردیف، قافیہ، مطلع، مقطع اسی طرح رہا اور بحر میں ارکان کی کمی بیشی کے باوجود وزن ایک ہی رہا۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تجربہ کہاں تک کامیاب ہوا، 'آزاد غزل' ہی اس بات کا ثبوت بھی بن گئی کہ اس جیسا انوکھا تجربہ بھی غزل کی روایت کی منطق سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس سے ایک بات اور بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہر صنف نہ صرف روایت کی سند اور قوت اپنے ساتھ رکھتی ہے، بلکہ اپنے لیے ایک ایسی نفسیاتی فضا بھی بناتی ہے جو زمان و مکان کی آزمائشوں سے گزر کر مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کوئی مصنف جب اس صنف میں قلم اٹھاتا ہے تو بالکل اَن دیکھے اَن جانے طور پر اس کے قلم کی ہر جنبش میں کہیں نہ کہیں قارئین کے ایک حلقے کی توقعات بھی شامل ہوتی ہیں اور اس بنا پر فن کار اور اس کے قاری یا سامع کے درمیان رشتہ استوار ہوتا ہے۔ مثلاً غزل کا ذکر آتے ہی غزل کے ہی معیار ذہن پر حاوی ہوتے ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ محو ہو جاتے ہیں۔

ان باتوں کے پیشِ نظر اگر مستقبل میں غزل کے نئے تجربات کے امکانات پر غور کیا جائے تو ہم ماضی کے تجربات کے پیش نظر یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل اپنی صنف کے تقاضوں کے مطابق تجربات کی جس حد تک گنجائش فراہم کرتی ہے اس سے ہر زمانے میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غزل کو بھی فروغ ہوتا رہا ہے، نئے نئے عناصر شامل ہوتے جا رہے ہیں اور مستقبل کے امکانات بھی اسی بنا پر روشن نظر آتے ہیں۔

غزل کی ہیئت کی پابندیوں اور اس کی مانوس شکل و صورت کی بنا پر ہر زمانے میں بہت سے لوگوں کو یہ بھی لگا کہ جیسے غزل کے اندر تبدیلی یا فروغ کی تمام گنجائشیں ختم ہو چکیں اور انھیں اس کا اختتام بھی نظر آنے لگا۔ اگر ان کے اندازے صحیح ہوتے تو غزل کو کبھی کا ختم ہو جانا چاہیے تھا، مگر یہ




का लोकार्पण
माननीय मुख्यमंत्री
श्री कल्याण
माननीय



پھر غزل کی زبان کلاسیکی اور رومانی لہجے سے بھی آزاد ہوئی اور نئے شاعروں نے نہ صرف روایتی زبان اور شعریات کے اصولوں سے انحراف کیا بلکہ زندگی کے کھردرے پن کو نئی علامتوں، استعاروں اور طنز بھرے تیور کے ذریعے آشکار کیا۔ چنانچہ آج کی غزل کا لہجہ صدیوں تک فروغ پانے والے متعدد لہجوں سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

——— شہریار

شائستہ محفلوں کی ہواؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

——— ندا فاضلی

کائنات اور ذات میں کچھ چل رہی ہے آجکل
جب سے اندر شور ہے باہر ہے سناٹا بہت

——— شجاع خاور

ایسے نہ جانے کتنے اشعار ہیں جو غزل کے اندر نئے تجربات کے امکانات کو روشن کرتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی نئے تجربات کے لیے نہ صرف غزل کے دروازے بند نہیں بلکہ ماضی کی طرح غزل کے مستقبل کا دارومدار بھی اس بات پر ہے کہ وہ اپنے منفرد وجود پر اصرار کرتے ہوئے بھی تبدیلیوں سے کس قدر ساز کرتی ہے۔

□□

مجاز: کچھ یادیں ——— صفحہ ۲۱ کا بقیہ

میں نے آج تک کسی ادیب یا شاعر کے جنازے میں نہ تو اتنا بڑا مجمع دیکھا اور نہ اس طرح سڑک پر لوگوں کو گریہ وزاری کرتے دیکھا۔ اردو شاعروں اور ادیبوں میں کئی ایسے ہیں جن کو ان کی زندگی میں مقبولیت ملی لیکن ایسا میں نے کوئی نہیں دیکھا جس کے مرنے پر سارا شہر عزا خانہ بن گیا ہو۔ میر نے کہا تھا

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

تو اس شعر کی تصویر ہم نے مجاز کے انتقال پر دیکھی کہ لوگ مجاز کے شعر پڑھتے تھے اور ان کا ذکر اس طرح کرتے تھے جیسے ان کا کوئی بہت چہیتا عزیز ان سے جدا ہو گیا ہو۔

□□

غزل

تُل جائے گا خود بھی ان کو تول کے دیکھ
صدیوں کی خاموش کتابیں کھول کے دیکھ

اس ملبے میں کچھ تو ہاتھ آ جائے گا!
حال اور ماضی کے ٹکڑوں کو رول کے دیکھ

ہو سکتا ہے تو ہی زخمی ہو جائے!
ہمسائے کے خط کو یوں مت کھول کے دیکھ

کھو جائے گا رنگ برنگے لمحوں میں
سوچوں میں یادوں کا نشہ گھول کے دیکھ

قیمت کون طلب کرتا ہے زخموں کی
ایک نظر بس دل کی آنکھیں کھول کے دیکھ

تیرے ہی الفاظ تجھے ڈس جائیں گے
شہپر ان لوگوں میں سچ تو بول کے دیکھ

ڈاکٹر شہپر رسول
(شعبۂ اردو)
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

رباعیات

گفتار میں افسوں کا اثر رکھتے ہیں
ہر سمت، ہر اک رُخ کی خبر رکھتے ہیں
رفتارِ زمانہ پہ نگہ اُن کی ہے
وہ وقت کے تیور پہ نظر رکھتے ہیں

ہے رقصِ مسلسل میں قیامت ساقی
اس سمت بھی ہو چشمِ عنایت ساقی
ہنگامۂ نفرت ہے فضا میں برپا
خاموش ہے کیوں سازِ محبت ساقی

آؤ کہ بُنیں کوئی کہانی یارو
جس میں کہ ہو رقصندہ جوانی یارو
ہر گام پہ وہ نقش اُبھاریں ہم لوگ
جو پیار کی بن جائیں نشانی یارو

اندوہ کا سم روز پیا کرتا ہوں
پابستۂ آلام رہا کرتا ہوں
ہونٹوں پہ مگر پھول محبت کے ہیں
غم آتے ہیں، میں ہنس کے سہا کرتا ہوں

نسیم عزیزی
۳۱۲ - بیلیلیس روڈ، ہوڑہ - ۷۱۱۱۰۱
(مغربی بنگال)

دوہے

جس در پہ آٹھوں پہر، مجمع ہے جناب
اس کی زیارت کیجئے، ہوگا بڑا ثواب

اپنی ضد پر آج گر، اڑے رہیں گے آپ
لو ہم بھی دل تھام کے، جاتے ہیں چپ چاپ

کیا مجھ کو معلوم تھا، کھو گئے دن کو رات
ورنہ میں بھی بولتا، الٹی سیدھی بات

ایک جہتی کی راہ میں، یہ کیسا اُلجھاؤ
آؤ ہم مل کر کریں، گتھی کا سُلجھاؤ

ہر لمحہ ہر گام پر ہوگی میری مات
چھوڑوں گا پھر بھی نہیں، کاوش تیرا ساتھ

کاوش پرتاپ گڑھی
ڈی - ۱۹۰، بلجیت نگر
نئی دہلی
۱۱۰۰۰۸

پروفیسر فاروق احمد صدیقی
شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی۔ مظفر پور

غالب کے ایک مربی

علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی ایک جید عالم دین، معقولات کے امام، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سالار کارواں، دلی کی علمی، ادبی و تہذیبی زندگی کی روح رواں، عربی کے قادر الکلام شاعر، اردو اور فارسی شعر و ادب کے ادا شناس، کثیر التصانیف بزرگ اور پیکر زہد و ورع کی حیثیت سے برصغیر ہند و پاک کی مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور علمی و ادبی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ایسی جامع حیثیات اور محمود الصفات شخصیت کہیں صدیوں کے بعد مطلع عالم پر جلوہ گر ہوتی ہے، اور اپنے افکار و نظریات کے انوار سے گم کردہ راہ انسانوں کو یقین و اعتماد کے اُجالے میں جینے کا شعور عطا کرتی ہے۔ شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ شعر پوری طرح ان پر منطبق ہوتا ہے ؎

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت علامہ ایک ایسے ہی دانائے راز، دیدہ ور اور دانش ور تھے ان کی یگانہ روزگار شخصیت کا ایک اجمالی تعارف کراتے ہوئے جناب سرسید احمد خاں رقم طراز ہیں:

جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ..... سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایۂ خوش بیانی اور امراء القیس کو ان کے افکار بلند سے دست گاہ عروج معانی، الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگیں ان کے غیرت لعل ناب سرو ان کی سطور کے آگے پا بہ گل اور گل ان کی عبارت رنگین کے سامنے خجل، نرگس اگر ان کے سواد سے نگاہ ملا دیتی، مصحف گل کے پڑھنے سے عاجز نہ رہتی، اور سوسن اگر ان کی عبارت فصیح سے زبان کو آشنا کرتی، صفت گویائی سے عاری نہ ہوتی۔"

(آثار الصنادید: سرسید احمد خاں ص ۲۸۱)

یہ کسی عامی اور عقیدت مند کی رائے نہیں، بلکہ ایک ممتاز ادیب اور روشن خیال مفکر سرسید احمد خاں کا خراج تحسین ہے جو انھوں نے حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ سرسید کی جلیل القدر شخصیت کی طرح ان کی یہ رائے بھی جتنی جلیل و جمیل ہے، محتاج وضاحت نہیں۔

ہمارے عہد کے ایک مشہور دانشور پروفیسر یوسف سلیم چشتی حضرت علامہ کی جلالت علمی کا ان لفظوں میں خطبہ پڑھتے ہیں:

" ادب اور حکمت کی جن بلندیوں پر مولانا فضل حق خیرآبادی پہنچے، غالب ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے ان کی حیثیت مولانا کے سامنے طفل مکتب سے زیادہ نہیں ع
چہ نسبت خاک را با عالم پاک
سچ تو یہ ہے کہ جب تک فضل حق شامل حال نہیں ہوا انسان مولانا فضل کے مرتبے سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔"

(مقدمہ شرح دیوان غالب، سلیم چشتی ص ۱۵۸)

اس مقالہ کے ذریعہ دراصل یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ غالب کی شخصیت اور شاعری کی تعمیر اور تشکیل اور ان کو بہر طور غالب بنانے میں حضرت علامہ نے جو کلیدی رول ادا کیا ہے اس کو نئی نسل کے سامنے لایا جائے تاکہ حضرت علامہ کی بافیض و باوقار شخصیت کا عرفان عام ہو اور غالبیات کے موضوع پر کام کرنے والے حضرت علامہ کو مرزا کے محسن و مربی کی حیثیت سے جانیں اور

پہچانیں۔ جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے بھی لکھا ہے:

"مولوی فضل حق خیر آبادی غالب کے سب سے بڑے محب اور محسن تھے۔ انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں رہنمائی کی، جو ان کا اصل دائرہ عمل تھا، بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔"

(غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام صفحہ ۵۴)

مشہور ماہر غالبیات مالک رام اپنے مضمون "غالب کی زندگی میں غالب کے قیام دہلی کا اثر" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"دہلی میں غالب کی ملاقات مولوی فضل حق خیر آبادی سے ہوئی اور دونوں کے تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب موصوف آخری دور کے فاضل اجل اور امام معقولات ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے غالب کو ان کی بے راہ روی پر متنبہ کیا۔ خوش قسمتی سمجھئے کہ غالب کے دل میں ان کی وقعت تھی اور وہ ان کے خلوص اور پایۂ سخن سنجی کو مانتے تھے، ورنہ کیا بعید تھا کہ جیسے انھوں نے اس سے پیشتر اکثر لوگوں کی نکتہ چینی کی پرواہ نہیں کی تھی، اس طرح ان کی بات کو بھی قابل توجہ نہیں سمجھتے۔"

(غالب کے معنوی اساتذہ، ظفر ادیب صفحہ ۲۵-۱۲۴، جون ۱۹۸۰ء)

اسی مضمون میں وہ اخلاقی اثر کے تحت لکھتے ہیں:

"اگر مولوی فضل حق اور ان کے رفقاء کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ (غالب) شاعری میں اپنی غلط روش چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے تو بھی یہ کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالب کی اخلاقی اصلاح کا ہوا۔"

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اپنے مضمون "حیات غالب" میں رقمطراز ہیں:

"مولوی فضل حق خیر آبادی جیسی سخن فہم اور پاکیزہ ذوق ہستی سے بھی غالب نے بہت کچھ حاصل کیا اور ان لفظی و معنوی تعقیدوں سے پرہیز کرنے لگے جو ان کے کلام میں بیدل کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ اگر مولوی فضل حق خیر آبادی سے ملاقات نہ ہو جاتی تو شاید میر تقی میر کی پیش گوئی کی دوسری شق پوری ہو جاتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بھٹک جائے گا۔ طرز کلام کے علاوہ اسی شائستہ صحبت نے مرزا کے اخلاق و آداب پر بھی اچھا اثر کیا۔"

("سب رس"۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۰)

اور اب غالب کے شاگرد، ہم نشین اور مزاج شناس مولانا حالی کا یہ حقیقت افروز بیان ملاحظہ ہو:

"مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا؂

ہم چناں در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیان

تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لیے نمودے کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے نمود ثبوت بنا دیا۔"

(یادگار غالب۔ مطبوعہ اردو اکادمی اتر پردیش لکھنؤ ص ۷۹)

غالب کو حضرت علامہ نے کئی سطحوں پر اپنا بھرپور تعاون پیش کیا تھا اس کا اعتراف و اظہار ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی کیا ہے جن کا شمار عہد حاضر کے ممتاز ناقدین میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "غالب اور آہنگ غالب" میں لکھتے ہیں:

"مولوی فضل حق خیر آبادی اس زمانے کے جیّد عالم تھے۔ شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ غالب کے ان سے گہرے تعلقات تھے۔ انھوں نے غالب کی ہر طرح سے مدد کی تھی، اس لیے غالب انھیں محسن و مربّی خیال کرتے تھے۔ مولوی فضل حق ان چند نفوس میں سے تھے جن کا غالب دل سے احترام کرتے تھے۔"

(غالب اور آہنگ غالب صفحہ ۲۳)

اقتباسات بالا پر غور کیجیے بقول شیخ اکرام حضرت علامہ نے "غالب کی مالی

مشکلات دور کرنے کی کوشش کی۔" بقول مالک رام " علامہ کے ذریعہ غالب کی اصلاح کا کام ہوا۔" بقول حالی، غالب نے فنِ شاعری میں ان کا مشورہ قبول کیا۔" اور بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں " انھوں نے (علامہ فضل حق) غالب کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔" بس اس سے زیادہ ایک دوست دوسرے دوست کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ الغرض حضرت علامہ مرزا کی حمایت و ہمدردی کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب انھیں اپنا مربّی و محسن تسلیم کرتے تھے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ غالب جن کو ان کے کچھ کم نظر معاصرین مہمل گو قرار دے چکے تھے اور طرح طرح کی پھبتیاں کستے تھے حضرت علامہ ہی کے مشورے پر طرزِ بیدل کو ترک کر کے آسان گوئی کی طرف مائل ہوئے اور اپنے کلام کے ایک نمائندہ انتخاب کی ان سے درخواست کی۔ جیسا کہ محمد حسین آزاد کے اس بیان سے اندازہ ہوگا:

" مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے ایک زمانے میں دہلی کی عدالت فصل میں سرشتہ دار تھے۔ اسی میں مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر تھے۔ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے، انھوں نے اکثر غزلوں کو سُنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے مرزا نے کہا، اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے انھوں نے کہا، خیر جو ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگاتے پھرتے ہیں۔"

(آبِ حیات ص ۴۹۷، شائع کردہ اترپردیش اردو اکادمی)

اقتباسات کی کثرت کا مجھے احساس ہے مگر موضوع کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ورنہ بات واضح اور مدلل نہیں ہو پاتی نیز بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس بات کا اعتراف نہ کیا جائے کہ مرزا نے بھی حضرت علامہ کے ساتھ حقِ دوستی ادا کر دیا اور امتناعِ نظیر کے مسئلہ میں جو حضرت علامہ کو شاہ اسمٰعیل دہلوی سے اختلاف ہوا تھا۔ مرزا نے حضرت علامہ کی دل سے حمایت کی اور ان کے نقطۂ نظر کی مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعہ یوں تائید کی ؎

لیک در یک عالم از روئے یقیں
خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں

جو ہر یک گل بر نتابد تثنیہ
در محمد رہ نیابد تثنیہ

ہر کرا با سایہ نہ پسندد خدا
ہیچ دے کے نقش بہ بندد خدا

(نگارِ غالب ص ۴۴-۱۴۳)

یعنی کائنات میں صرف ایک ہی ختم المرسلین ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کو محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سایہ تک ہونا پسند نہ تھا تو وہ اس کا مثل کیونکر پسند کر سکتا ہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ کہ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی نے مرزا غالب کی علمی، ادبی، اخلاقی اور اقتصادی ہر لحاظ سے جو مدد کی وہ ہمارے شعر و ادب کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ اس سلسلے میں ابھی مزید تحقیق و مطالعے کی ضرورت ہے۔ راقم السطور نے تاریخِ ادبِ اردو کی اس روشن مگر عام نظروں سے اوجھل شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔ موضوع کا حق تو ادا نہیں ہو سکا، اہلِ تحقیق و تدقیق کے لیے میدان خالی ہے۔

□□

کوئی نہیں

کوئی نہیں جو اتنا پوچھے
کیوں کھوئے کھوئے رہتے ہو
تم کیا کیا سوچا کرتے ہو
کیوں رات گئے گھر آتے ہو
کیوں بجلی نہیں جلاتے ہو
کیوں اوندھے منھ سو جاتے ہو
کوئی نہیں جو اتنا پوچھے۔

صباح الدین عمر
۱۶۹ - [illegible] ۲۲۶۰۱۲

غزل

پھول سے اَب نادانی ہوگی
پتھّر کی مہمانی ہوگی

جن کے دل ہیں ٹوٹے اُن کے
چہروں پر تابانی ہوگی

کوئی ٹھکانہ ڈھونڈھ لو یارو
کل کی ہوا طوفانی ہوگی

کب تک یُوں ہی مقتل مقتل
نسلوں میں قربانی ہوگی

ہم کو بشیر اب بھی یہ یقیں ہے
کل کی سحر نورانی ہوگی

بشیر فاروقی

۵۱۵۔ مُراد علی لین، عقب رائل ہوٹل
ودھان سبھا مارگ، لکھنؤ

غزل

بچ بچ کے چل رہے ہیں ہوائے چمن سے ہم
یعنی خفا ہیں آج کسی گُل بدن سے ہم

ہیں دل کی خلوتوں میں سبھی بے حجابِ شوق
واقف ہیں خوب اہلِ نظر کے چلن سے ہم

برپا نہ ہوگا اب کوئی ہنگامۂ جنوں
لے آج جا رہے ہیں تری انجمن سے ہم

جس طرح کر رہے ہیں فقیرانہ زندگی
اک روز مر بھی لیں گے اسی بانکپن سے ہم

ناکامیِ حیات کے اسباب کیا کہیں
واقف نہ تھے پیام محبت کے فن سے ہم

ڈاکٹر پیام اعظمی

تنظیم المکاتب، گولہ گنج
لکھنؤ

غزل

ہر اک مکان ہر اک در اُداس کیوں ہے میاں
یہ سارے شہر کا منظر اُداس کیوں ہے میاں

یہ کیسا غم ہے کہ افسردہ ہیں گل و رخسار
جسے بھی دیکھو وہ پیکر اُداس کیوں ہے میاں

ہو سازباز نہ کچھ باغبان و گلچیں میں
چمن میں رہ کے گلِ تر اُداس کیوں ہے میاں

نگاہ اُٹھتی ہے جس پر ہر ایک رہرو کی
وہ شاہراہ کا پتھّر اُداس کیوں ہے میاں

یہ کس نے روک دیا رازؔ کو دمِ تحریر
قلم اُٹھا کے سخنور اُداس کیوں ہے میاں

رازؔ اعظمی

دفتر "نئے زاویے" میاں بازار
گورکھپور - ۲۷۳۰۰۱

مرزا محمد کاظم
افضل محل، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

آزادی کے بعد اُردو غزل

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ اُردو شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی اور ایک لمبے عرصے تک اقلیم سخن پر بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کرنے کے بعد آج بھی غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین اور ہر دل عزیز صنف ہے۔ اس مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ لوچ اور لچک ہے کہ یہ بغیر اپنی سرشت اور بنیادی ہیئت تبدیل کیے ہوئے ہر عہد کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جانے اور ان کی خوش اسلوبی سے ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُردو غزل کا یہی وصف اس کی بقا کا ضامن ہے۔

غزل کی زبان علامتی زبان ہے۔ غزل میں کوئی بات براہ راست یا صاف صاف نہیں کہی جاتی بلکہ علامتوں اور تمثیلوں کے ذریعہ ڈھکے چھپے ڈھنگ سے کہی جاتی ہے۔ یہ علائم اپنے لغوی یا لفظی معنی میں نہیں بلکہ اپنے مخصوص اصطلاحی یا مرادی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان رموز و علائم کے پیچھے افکار و تصورات کی ایک پوری دنیا آباد ہے اور ان کے پس منظر میں ایک پورا معنوی اور تصوراتی نظام ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ، مرغ و قفس، صید و صیاد، برق و شرر، شاخ و آشیاں، جام و سبو، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سراب و صحرا، نور و ظلمت، ذرّہ و آفتاب، قطرہ و دریا، سمندر و حباب ـــ یہ سب اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے الفاظ وہ مخصوص علامتیں ہیں جو اپنے اندر معنویت کی ایک پوری کائنات سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہی علائم و اشارات روایتی غزل کا لفظی اثاثہ اور اظہار کا وسیلہ ہیں۔

غزل کی تاریخ میں میرؔ، دردؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ، امیرؔ، فانیؔ، یگانہؔ، آرزوؔ، صفیؔ، ثاقبؔ، چکبستؔ، اصغرؔ اور جگرؔ وہ بزرگ شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے روایتی اسلوب، رمزیت اور ایمائیت کے تنگ و محدود دائرہ میں رہتے ہوئے بھی اپنے اعلا اور ارفع خیالات و افکار اور پاکیزہ جذبات سے اُردو غزل کو مالا مال کیا اور اسے زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا لیکن یہ بزرگ بھی غزل کے مروجہ روایتی اسلوب علامتی نظام اور کلاسیکی تصورات میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ کر سکے۔ غزل میں روایت شکنی کا کام اگر کسی نے کیا تو وہ حسرتؔ موہانی ہیں۔ حسرتؔ موہانی نے پہلی بار غزل میں عشق کے ماورائی، مبہم اور غیر حقیقی تصور کے سحر کو توڑا اور اسے حقیقت اور ارضیت سے ہمکنار کیا۔ ان کے یہاں عشق اور معشوق کا تصور روایتی عشق اور معشوق کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا عشق پوری طرح جنسی اور جسمانی ہے اور عشق کے مذکورہ روایتی تصور سے انھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ درج ذیل شعر اس کی مثال ہے ؎

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

ان کا محبوب گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے، کوئی خیالی محبوب نہیں وہ اگر چاہا جاتا ہے تو اپنے عاشق کے لیے خود بھی محبت کے جذبات رکھتا ہے اور وہ خود بھی اس سے ملنے کے لیے بے تاب رہتا ہے ؎

دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

یہی نہیں حسرتؔ موہانی نے غزل کو اپنے سیاسی افکار و خیالات کے اظہار کا بھی وسیلہ بنایا اور ان موضوعات کو بھی غزل میں شامل کیا جو ان سے پہلے غزل میں کبھی نہیں اپنائے گئے تھے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حسرتؔ نے "تنگنائے غزل" کو وسعت دے کر اسے عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنایا۔

اُردو غزل کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک اپنے وسیع تر اثرات کی بنا پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ گو کہ اس تحریک کی ابتدا، ۱۹۳۶ء میں ہو گئی تھی لیکن ۱۹۴۷ء اور آزادی کے فوراً بعد کا زمانہ اُردو شاعری پر اس کے لامحدود اثرات کا زمانہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کی تعریف کرتے ہوئے منظر اعظمی لکھتے ہیں:

"اُردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد یہ دوسری اہم اور سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظّم تحریک تھی جس کی کوشش شعوری اور مقصد واضح تھا، ادبِ لطیف کے رجحان اور حُسن پرستی کی شدّت کے خلاف یہ ایک طرح کا شدید ردِ عمل تھا۔ اس تحریک نے علی گڑھ تحریک کی عقلیت، مادّیت اور اجتماعیت کو ایک نئی شکل دی۔ علی گڑھ تحریک کے افادی اور مقصدی ادب کے نکتۂ نظر کو جدلی مادّیت یا اشتراکی اور سوشلسٹ نظامِ فکر سے جوڑ دیا گیا۔" [1]

ترقی پسند تحریک کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آگے چل کر وہ پھر لکھتے ہیں:-

"..... اس تحریک سے ہر وہ شخص وابستگی محسوس کرنے لگا جو کسی نہ کسی جہت سے سماج، سیاست، مذہب اور ادب کے پُرانے نظامِ فکر سے باغی تھا۔ اس کی رو بغاوت آہنگ تھی۔ دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا۔ اگرچہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے جوڑا مگر بہت جلد یہ بات کھُل کر سامنے آگئی کہ اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکی انقلاب تھا اور یہ ادب سے زیادہ اشتراکیت کی نقیب بن گئی۔" [2]

روایتی غزل کے علامتی نظام کا محور حُسن و عشق اور ان سے متعلق جذبات ہیں، جن میں غم کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کے برخلاف ترقی پسند غزل انفرادی جذبات و خیالات کے بجائے اجتماعی مسائل کی عکاسی کرتی ہے۔ روایتی غزل کی انفعالیت، جنس زدگی، یکسانیت اور باسی پن کے مقابلے میں ترقی پسند غزل میں فعالیت، جوشِ عمل اور ایک تازگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے غزل کو نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔

انھوں نے غزل سے منفی رجحانات کو ہٹا کر مثبت رویّہ اپنایا نیز غزل میں ہمّت، حوصلہ اور رجائیت کے عناصر شامل کیے۔

اپنی مخصوص ہیئت، ریزہ خیالی اور علامتی اسلوب کی وجہ سے غزل تسلسلِ خیال یا نظریہ کی تفصیلی تبلیغ اور راست بیانی کی متحمل نہیں تھی اس لیے شروع شروع میں ترقی پسند شاعروں نے اس کی زیادہ پذیرائی نہیں کی لیکن غزل چوں کہ عوام میں بہت زیادہ مقبول تھی، یہاں تک کہ عوام میں اُردو شاعری کا تصوّر ہی غزل سے منسوب تھا اور بیشتر ترقی پسند شاعر، غزل گو تھے، لہٰذا انھوں نے غزل میں بھی اپنے مقصد کی تبلیغ کی راہ نکال لی۔ تقریباً ہر ترقی پسند شاعر نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی اور اُردو شاعری میں بعض بہت اچھی غزلوں کا اضافہ کیا۔

آزادی سے پہلے ترقی پسند ادب کا موضوع ہندستان کو سماجی پستی اور سیاسی غلامی سے نجات دلانا تھا لیکن آزادی حاصل ہو جانے کے بعد انھوں نے ادب میں عوامی مسائل کی عکاسی کو اپنا موضوع قرار دیا۔ ترقی پسند تحریک کے عام مقاصد میں ادب کی عوام سے قربت، ایک مثالی معاشرے کی تلاش، ادب کو زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنانا، سماجی شعور، عصری آگہی اور روٹی روزی کے مسائل وغیرہ شامل تھے لہٰذا انھوں نے اُردو غزل کو بھی ان سے جوڑ دیا اور غزل کو زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ انھوں نے علامتی اندازِ بیان کو چھوڑ کر خطابت اور راست بیانی کو اختیار کیا۔ ترقی پسند غزل گو شاعروں کے یہاں روایتی غزل کی سی لہجہ کی نرمی، شگفتگی اور متانت کے بجائے بلند آہنگی، گھن گرج اور الفاظ کی تکرار پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے ترقی پسند شاعروں کی غزلیں اسی محور پر گھومتی نظر آتی ہیں۔ سردار جعفری فرماتے ہیں ؎

سکوں میسّر جو ہو تو کیونکر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

تقریباً اسی خیال کو ایک دوسری غزل میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

موضوع کی تکرار درج بالا دونوں شعروں سے ظاہر ہے۔

ساحر لدھیانوی بھی ڈھکے چھپے انداز میں عوامی مسائل کی ہی بات کرتے

ہیں۔ حالاں کہ ان کے یہاں سردار جعفری کی سی راست بیانی نہیں پائی جاتی۔ ان کا انداز بیان غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہے ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

ساحر لدھیانوی نے رومانی غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں نیا پن ہے لیکن سماجی نابرابری کا شعور اور طبقاتی کشمکش کا احساس ان کے یہاں حاوی ہے۔

کیفی اعظمی کا نظریہ رجائی ہے وہ حالات سے مایوس نہیں، ان کا خیال ہے کہ ظلم و جور کا خاتمہ ایک دن ہونا ہے ؎

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

وہ نئے پن اور تبدیلی کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تبدیلی چاہے جتنی بعید قدروں کی پامالی کے ساتھ آئے مگر اس میں ایک تازگی تو ہوتی ہے ؎

چاند سورج بزرگوں کے نقشِ قدم
خیر بجھنے دو ان کو ہوا تو چلے

شکیل بدایونی کہتے ہیں ؎

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

حالات سے بے اطمینانی شاید ترقی پسند شاعروں کا پسندیدہ موضوع ہے کیوں کہ بیشتر ترقی پسند شاعروں کی غزلوں میں اس مضمون کے شعر ملتے ہیں نیچے سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباں کے اشعار (بالترتیب) پیش ہیں جو اسی موضوع سے متعلق ہیں ؎

سکوں میسر ہو تو کیوں کر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل نظامِ دار و رسن وہی ہے

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

اب کوئی طوفان ہی لائے گا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

—— احمد ندیم قاسمی

نہ جانے بادِ صبا کیا پیام لائی تھی
کہ پھول ہنس تو دیئے پھر بھی منہ اتر سا گیا

—— غلام ربانی تاباں

احمد ندیم قاسمی ایک منفرد لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی گوناگوں کیفیتوں کی خوبصورت عکاسی بھی ملتی ہے ؎

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

ان کا درجِ بالا شعر اچھوتے خیال، حسی تجربہ اور تازگی کی ایک اچھی مثال ہے

غلام ربانی تاباں غزل کے ایک اچھے شاعر ہیں لیکن بحیثیت ترقی پسند وہ بھی مقررہ موضوعات (عوامی مسائل وغیرہ) کو ہی غزل کی ایمائیت کے پردے میں پیش کرتے ہیں ؎

کسے خبر تھی کہ یہ دن بھی دیکھنا ہوگا
میں آج بچ کے تری رہ گزر سے گزرا ہوں

اسرار الحق مجاز کا نام بھی ترقی پسندوں کے ساتھ لیا جاتا ہے لیکن ان کی غزل پر ترقی پسند روایت کا اثر کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ غالباً وہ اپنی نظموں کے موضوعات کی بنا پر ترقی پسندوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے، وہ اپنے آہنگ، ترنم، غنائیت اور مزاج کی رومانیت کی بنا پر ممتاز ہیں۔ ان کے بعض شعروں میں ترقی پسند روایت کی جھلک ملتی ہے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

جہاں پر انھوں نے دانستہ ترقی پسند موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہاں ان کا معیار بہت پست ہو گیا ہے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

۱۹۴۷ء کے بعد معین احسن جذبی بھی ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے اور انھوں نے بھی وہی موضوعات (سماجی حقیقت پسندی اور نئے عہد کے فنان

کے مسائل وغیرہ) اپنا لیے جو ترقی پسندوں سے مخصوص تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے کلاسیکی غزل کی روایت سے غزل کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیا۔ کیوں کہ ترقی پسند شاعروں کی غزلوں میں موضوعات کی محدودیت اور یکسانیت ایک عام بات ہے چنانچہ جذبی بھی اس سے دامن نہ بچا سکے ؎

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

اِس اُفق کو کیا کہیے نُور بھی دُھندلکا بھی
بارہا کرن پھوٹی بارہا غُبار آیا

حالاں کہ غزل کی علامتی معنویت کی وجہ سے اشعار میں تہ داری پیدا ہو جاتی ہے اور کسی ایک شعر کے مفہوم کی قطعیت کے ساتھ احاطہ بندی نہیں کی جا سکتی لیکن ترقی پسند ادب کے مخصوص موضوعات کی بنا پر ان کی غزلوں سے مخصوص مفاہیم کا اخذ کیا جانا عین فطری ہے۔

آزادی کے بعد کے ترقی پسند غزل گویوں میں مجروح سلطان پوری کا نام بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ترقی پسند غزل کے سلسلے میں وہ خود کہتے ہیں:

"...ترقی پسند تغزل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عصری احساس کا غزل کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔" ؎

اس "عصری احساس" کا مفہوم ترقی پسندوں کے نقطۂ نظر سے ان کا اجتماعی مسائل کے احساس سے ہے جن میں موٹے طور پر روزی روٹی کے مسائل، سیاسی غلامی اور سماجی پستی سے نجات کا سوال، محنت کش طبقہ کی اہمیت، سماجی حقیقت پسندی، طبقاتی کش مکش، جوشِ انقلاب، رجعت پرستی اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ مختصر آ مارکسی نظریات سے متعلق تمام اہم موضوعات شامل ہیں۔ درج بالا میں سے بعض موضوعات کی مثالیں ان کے کلام سے پیش ہیں:

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اہلِ دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سُبک ہوگا جَو کے ایک دانے سے

دیکھ زنداں کے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

درج بالا اشعار بالترتیب جوشِ انقلاب، سماجی تبدیلی کے سلسلے میں جذبۂ قربانی اور محنت کی اہمیت، ہمت، حوصلہ، جوشِ عمل اور رجائیت کی مثال ہے۔

ترقی پسند غزل گو شعرا میں فیض احمد فیض کو ایک خاص اور اہم مقام حاصل ہے اور ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ انھوں نے غزل کی روایتی علامتوں کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کی غزل میں روایت اور عصری مسائل کی عکاسی کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ زندگی اور فن کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فیض احمد فیض اپنے مجموعۂ کلام "دستِ صبا" کے ابتدائیہ میں خود تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔"

۱۹۴۷ء کے بعد ان کی غزلیں کلاسیکیت اور سماجی حقیقت پسندی کے امتزاج کی اچھی مثالیں ہیں۔ اس سلسلے میں "دستِ صبا" سے کچھ مثالیں پیش ہیں:

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

عشق و محبت سے متعلق بعض اچھوتے جذبات کی عکاسی بھی ان کی غزلوں میں بڑے خوبصورت انداز میں پائی جاتی ہے۔ درج ذیل اشعار اس کی مثال ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کلاسیکی رچاؤ، لب و لہجہ کے نئے پن اور انفرادیت کی بھی اچھی مثال ہیں ؎

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں   کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے   جواب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

مختصر یہ کہ فیض کی غزلیں، غزل کے ارتقاء کی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہیں۔

غزل کو نئے لب و لہجہ سے روشناس کرانے، غزل کے موضوعات کو وسعت دینے اور عشق کی گوناگوں کیفیتوں کی بھرپور عکاسی کرنے والے غزل گو شعراء میں ایک اہم نام احمد فراز کا بھی ہے، گوکہ ان کی شاعری کی نشوونما ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہوئی لیکن ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے یک رنگی نہیں۔ ان کی غزلوں کا مخصوص آہنگ، نغمگی اور داخلیت اُن کی غزلوں کو ایک امتیازی شان عطا کرتی ہے۔

کس کس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مُجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دُنیا تھی

تو خُدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

جس کو چاہا ہے اسے شدّت سے چاہا ہے فراز
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

تقسیم ملک کے بعد ہجرت کا مسئلہ (خصوصاً پاکستان میں) ایک اہم جذباتی مسئلے کے طور پر اُبھرا۔ ہجرت کے بعد دیارِ غیر میں اجنبیت کے احساس نے ایک پیچیدہ جذباتی مسئلے کی صورت اختیار کرلی۔ اس مسئلہ کو جن شعراء نے اپنی غزلوں میں جگہ دی اُن میں ناصر کاظمی کا نام بھی شامل ہے۔ ناصر کاظمی نے دیگر شعراء کی بہ نسبت اس رجحان کی بہتر طور پر عکاسی کی ہے:

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

حِسّی و جذباتی تجربوں کی رنگا رنگی اور ہمہ جہتی نے ناصر کاظمی کے شعری موضوعات کو وسعت بخشی ہے۔

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں   تو بھی جی سے اُتر نہ جائے کہیں

جب سے ایک ہوا ذائقۂ ہجر و وصال
اب کہاں سے وہ مزا صبر کے پھل میں آئے

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مِٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

ناصر کاظمی اُن شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی راہ الگ بنائی ہے۔ ان کی فکر آزاد ہے اور اس پر کسی تحریک یا رجحان کی چھاپ نہیں ہے۔

جاں نثار اختر کی غزلیہ شاعری کو دو ادوار پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور اس قسم کی شاعری کا دور ہے جب وہ اپنی کوئی انفرادی پہچان نہ بنا سکے تھے بلکہ ان کی اس دور کی شاعری کو چند دوسرے ترقی پسند شعراء جیسے جوش، سردار جعفری اور فیض احمد فیض کی آوازِ بازگشت کہا جائے تو بے جا نہیں، لیکن ان کے دوسرے دور کی شاعری نے ان کی ایک انفرادی پہچان قائم کی اور انھیں اُردو غزل گو شعراء کی صفِ اوّل میں شامل کردیا۔ غزل کے فن کے سلسلے میں جاں نثار اختر کا نقطۂ نظر اور ان کا نظریۂ شاعری خود ان کے اس شعر سے واضح ہے۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

جاں نثار اختر کے دوسرے دور کی شاعری داخلیت کی شاعری ہے اس دور کی شاعری میں انھوں نے اپنے ذاتی جذبات، احساسات اور داخلی

تجربوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، اور ان داخلی تجربوں کی رنگا رنگی، بوقلمونی اور لہجے کے نئے پن نے ان کی ایک انفرادی پہچان قائم کی۔ ان کے درج ذیل شعر سے ظاہر ہے کہ وہ خود بھی داخلی تجربات و احساسات کے اظہار کو شاعری کی بنیاد مانتے ہیں ؎

ہم سے مایوس نہ ہو اے غمِ دَوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اُجالوں کی طرح

درج ذیل اشعار میں انہوں نے بے حد جاندار حسّی، بصری و سامعی پیکروں کے ذریعہ بے حد دل نشیں مناظر کی تصویریں ایجاد کی ہیں اور اس طرح کہ یہ منظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں غزل کی روایتی لفظیات کے برخلاف مقامی (ہندی) لفظیات کا اثر نمایاں ہے ؎

صبح نہائے جوڑا کھولے ناگ بدن سے آ لپٹیں
اس کی رنگت اس کی خوشبو کتنی ملتی صندل سے

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پُروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر

پیرایۂ بیان کا نیا پن ان کی شاعری کی جان ہے، ان کی غزل شائستگی، دردمندی، زندگی کے نئے نئے تجربوں اور رنگارنگ حسی کیفیات اور تہ داری کی آئینہ دار ہے ؎

دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ
مندر میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہیں

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹے سے چُبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

خود بہ خود نیند سی آنکھوں میں گھُلی جاتی ہے
مہکی مہکی ہے شبِ غم ترے بالوں کی طرح

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

جن شعراء کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی ایسے شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے جن کو روایتی غزل اور ترقی پسند شعراء کی صف میں نمایاں جگہ حاصل ہے لیکن اختصار کے پیش نظر اس مختصر مضمون میں ان پر تبصرہ ممکن نہیں ہے۔

الغرض ترقی پسند شاعری نے اُردو غزل کو رسمی اور غیر حقیقی فضا سے آزاد کرایا اور سماجی حقیقت پسندی، اجتماعیت اور معاشی و معاشرتی مسائل سے اس کا رشتہ جوڑا لیکن اشتراکی مقاصد پر بے جا زور کی جبری قید نے غزل کو درج بالا موضوعات تک محدود کر دیا اور اس حد بندی کی وجہ سے ترقی پسند غزل انتہا پسندی اور یکسانیت کا شکار ہو گئی، کیونکہ ترقی پسند غزل نے اُردو غزل کو بہ لحاظ موضوع حقیقت پسندی اور واقعیت سے ہمکنار کرایا اس لیے اُردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔

اُردو شاعری میں جدیدیت کا رجحان ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر اُبھرا۔ ترقی پسند تحریک کے بعد اس کو اُردو شاعری (خصوصاً غزل) میں ایک دوسرا انقلابی موڑ کہا جا سکتا ہے جدیدیت کو ایک رجحان یا ایک ذہنی رویّہ کہنا چاہیئے۔ یہ ترقی پسند تحریک کی طرح کوئی تحریک نہیں کیوں کہ اس کا کوئی واضح مقصد اور دستور العمل نہیں تھا جو کہ ایک تحریک کے لیے ضروری ہے۔ ترقی پسندوں کی شاعری کا ایک خاص نصبُ العین تھا، جس کو نظر میں رکھنا ہر ترقی پسند شاعر کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے اجتماعیت ان کی بنیاد اور اجتماعی مسائل ان کا خاص موضوع تھے۔ جدید شاعروں کے سامنے ایسا کوئی اجتماعی نصب العین نہیں تھا۔ ان کا تخلیقی رویّہ ترقی پسندوں کی طرح معروضی نہ تھا بلکہ موضوعی اور داخلی تھا۔ تخلیقی عمل کے سلسلے میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق ترقی پسند تحریک اور جدیدیت میں یہی ہے جدیدیت نے ترقی پسند تحریک کی بنا کردہ روایت کو بالکل اُلٹ دیا۔ فرد کی ذاتی زندگی اور انفرادی اور ذاتی جذبات کا اظہار ترقی پسندوں کے لیے کفر تھا اسی طرح اجتماعی اور سماجی مسائل اور اجتماعیت کے الفاظ جدیدیت کے علمبرداروں کے لیے گالی ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے موضوعات کا دائرہ اتنا وسیع کیا کہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی واقعات تک کا احاطہ کر لیا اور جدیدیت نے اپنے موضوعات کو فرد کی ذات کے دائرہ تک محدود کر لیا۔ جدیدیت کے خاص موضوعات میں فرد کی تنہائی، درد و کرب، ذات کا المیہ، موت کا خوف اور اندرونی ذات کے موضوعات شامل ہیں۔ جدید شاعروں نے بنیادی طور پر موجودہ معاشرے اور آج کے انسانی مسائل

کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ صنعتی معاشرے کی خصوصیات اور ان سے پیدا شدہ مسائل مثلاً احساسِ تنہائی، موت کا خوف، انسان کی بے تعلقی کا شدید احساس برصغیر کے بڑے شہروں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ جدید شاعر ان کا شکار ہے لہٰذا وہ ان کی ترجمانی اپنی شاعری میں کرتا ہے۔

"فرد کی ذات اپنے آپ میں خود ایک کائنات ہے۔ اس لیے عرفانِ ذات کا موضوع خود ایک وسیع تر موضوع ہے، اس لحاظ سے جدیدیت نے غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا کی ہے۔ جدید شاعر ہر چیز کا اقرار اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس لیے جدید شاعر انفرادیت پسند بھی ہوتا ہے کیوں کہ ذاتی تجربہ ہر فرد کا الگ الگ ہو سکتا ہے۔ جدیدیت ان تمام اخلاقی اصولوں، معیارات اور مذہبی پابندیوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے، جن کی تصدیق ذاتی تجربے سے نہ کی گئی ہو۔ بقول منظر اعظمی: "نئی شاعری یا جدیدیت بنیادی طور پر امتیاز، انحراف اور تجربوں کی شاعری ہے۔"

نئے شاعروں کے شعری تجربے زیادہ پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں اس لیے اسی کے لحاظ سے ان کی زبان بھی ایسی ہے جو ان کے پیچیدہ اور تہ دار تجربوں کا ساتھ دے سکے۔ مروجہ لفظیات اور علامات ان کے پیچ در پیچ تجربوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں اس لیے ان کو زبان کے بنے بنائے ڈھانچے کو توڑنا پڑا اور نئے نئے استعارات و علامات وضع کرنے پڑے جس کی وجہ سے بعض جگہ ان کی زبان اکھڑی اکھڑی اور غیر مانوس سی لگتی ہے۔ یہ بھی ہوا کہ بعض شعراء نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بالکل ذاتی قسم کی علامتیں گڑھ لیں جن کی وجہ سے جدید غزل میں ترسیل اور ابلاغ کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ترقی پسند تحریک تک مروجہ علامتوں کے مفاہیم تقریباً متعین تھے اور اگر کسی نے مروجہ علائم کو نئے مفہوم و معنی میں استعمال بھی کیا تو بھی روایتی علامتی مفاہیم سے ان کا رشتہ بالکل منقطع نہیں تھا بلکہ موضوع کے لحاظ سے عام قاری کا ذہن اس نئے مفہوم تک پہونچ جاتا تھا لیکن جدید شاعر نے علامت سازی کے مرحلے میں عام قاری کی پہنچ کو نظر انداز کر دیا۔ اس لیے اکثر جدید شعر عام قاری کی سمجھ کے باہر ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں جن سے جدید شاعروں کے اسلوب اور موضوعات کے تنوع کا کچھ اندازہ ہوگا ؎

دھان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

ناصر کاظمی

ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے
جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

———— ناصر کاظمی

مل گئے سارے عقائد خاک میں
پانیوں میں بہہ گیا سورج مرا

———— کمار پاشی

نقش ابھرا نہ ہوا کوئی شرر ہی پیدا
دور چٹانوں سے ٹکرائی صدا آہستہ

———— زیب غوری

وہ چیختا ہے اور کوئی سنتا نہیں اسے
مدفن ہوا ہے وہ شخص اپنی صداؤں کا

———— حکیم منظور

رہا ہی ایسا تیز ہوا میرے ارد گرد
کٹ جاتا اپنے سر کو جو باہر نکالتا

———— غلام مرتضیٰ راہی

جدید شاعری نے عرفانِ ذات کی سعی کی بدولت فکر کو نئی وسعتیں عطا کی ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

دشائیں چھوڑ رہی ہیں آج مجھے
نکل کر خود سے باہر آ گیا ہوں

———— کمار پاشی

اک لمحہ مجھ کو سوچ مری ذات سے الگ
کیا میری وسعتوں کا سمندر جواب ہے

———— حکیم منظور

ان پانیوں سے کوئی سلامت نہیں گیا
ہے وقت اب بھی کشتیاں لے جاؤ موڑ کے

———— شہریار

گھومتا ہے شہر کے سب سے حسین بازار میں
اک اذیت ناک محرومی وہ گھر لے جائے گا (بانی)

————

جدید غزل میں جنس و محبت کے موضوع کو بھی ترک نہیں کیا گیا لیکن اس کا بیان نئے شاعر کے ذاتی تجربوں اور اپنے عہد کی سچائیوں کا آئینہ دار ہے ؎

ان وضع داریوں کا نہ اتنا خیال رکھ
وعدہ عذاب بننے لگے تو مکر بھی جا

———— جاوید شاہین

یوں ہے کہ تعاقب میں ہے آسائشِ دُنیا
یوں ہے کہ محبّت سے مُکر جائیں گے اک دن

——— ساقی فاروقی

کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم !

——— جون ایلیا

ہاتھوں کو گر نہیں تو نگاہوں کو دیجئے
اس صاحبِ نصابِ بدن سے کوئی زکات

——— وہاب دانش

اس کا بدن تو لمس کی فردوس بن گیا
اب میری انگلیوں کو ضرورت زباں کی ہے

——— مظفر حنفی

تاں مجھے حسن ہزاروں رنگ کی افراط سے
ایک تتلی کے لیے مصروفِ ماتم ہے ہَوا

——— مظفر حنفی

جدید شعرا نے اپنی غزلوں میں بعض ایسے خیالات کی ترجمانی بھی کی ہے جو اب تک کی غزلیہ شاعری کے لیے بالکل نئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ جدید شعراء نے زبان کے بنے بنائے ڈھانچوں کو توڑا ہے اور نئے استعارات اور علامات وضع کر کے اپنے خیالات و محسوسات کے اظہار کی کوشش کی ہے:

آیا تھا گھر سے ایک جھلک دیکھنے تری
میں کھو کے رہ گیا ترے بچّوں کے شور میں

——— ظفر اقبال

رستے میں وہ ملا تو میں بچ کر نکل گیا
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہو گئی

——— ندا فاضلی

المختصر بقول منظر اعظمی:

"نئی شاعری خواہ وہ نظم میں ہو یا غزلوں میں، ایک ایسی حسّی، علامتی اور عصری شاعری ہے جس کو محض طنز و استہزا کے ذریعہ یا تنقید کی زبان سے گالی دلوا کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

یہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی اردو غزل کے تدریجی ارتقا اور تغیر کی ایک مختصر روداد ہے جسے کمیوں اور خامیوں کے باوجود آزادی کے بعد کی اردو غزل کے تغیرات سمت اور رفتارِ ترقی کو سمجھنے کی ایک اور کوشش کہنا چاہیے۔ یہ کوشش کئی حیثیتوں سے نامکمل ہے۔ بعض بہت اہم شعراء کا ذکر اختصار کے پیشِ نظر چھوڑنا پڑا۔ آزادی کے بعد کی آزاد فضا میں شعراء نے اردو غزل کو فروغ دینے اور اس کے موضوعات کو وسعت دینے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اردو غزل کی تاریخ میں ایک زرّیں باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ □□

حواشی:

۱؎ "اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ" ۔ منظر اعظمی صفحہ ۳۶۸

۲؎ ایضاً صفحہ ۳۶۸

۳؎ "ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر" ترتیب، قمر رئیس، عاشور کاظمی ۱۹۸۷ء

غزل

ہاتھوں میں اُن کے سنگِ گراں آج بھی وہی
مجھ کو محبتوں کا گماں آج بھی وہی

تبدیل ہو چکے ہیں مناظر ہَوا کے ساتھ
ٹھہرا ہوا نظر میں سماں آج بھی وہی

ہیں یہ حدیں حرم کی وہ رستہ ہے دَیر کا
محدُود دائروں میں جہاں آج بھی وہی

اُٹھے نہیں ہیں جانبِ منزل مرے قدم
دل میں خیالِ سُود و زیاں آج بھی وہی

عادت سی پڑ گئی ہے وصیہ تو کیا کریں
مصروف ہے دُعا میں زباں آج بھی وہی

فاطمہ وصیہ جائسی

۳۷۔ ساتویں گلی نِشاط گنج۔ لکھنؤ

کہانی

رتن سنگھ
۲۲ - آدرش نگر، نرمدا روڈ
جبل پور

نیا سویرا

بات ہزاروں سال پہلے کی۔ نگری اُجین کی۔ راج بکرمادت کا۔ ایک دن راجا شکار کو گیا۔ آگے آگے راجا جا رہا تھا، پیچھے پیچھے اس کا لاؤ لشکر آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی ایک جھاڑی کی آڑ سے نکلی اور راجا کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور راجا کا راستہ روک کر بولی،

"اے بکرمادت! تو اُتر کی طرف شکار کرنے مت جا۔ اُدھر میرے چھوٹے چھوٹے ہرنوٹے کھیلتے ہیں۔ تمھارے لاؤ لشکر کے گھوڑوں کے نیچے دب کر مر جائیں گے۔"

راجا گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگا۔

"راجا نے کیا سوچا۔؟ راجا نے کیا کہا۔؟" ایک بچے نے نانی کو ٹوک کر جلدی سے جاننا چاہا۔

نانی کہانی سناتے سناتے رُک گئی۔ یہ نانی ہمالیہ کی ترائی میں بسے ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں بچوں کو کہانی سنا رہی تھی، جو آج کل چاروں طرف سے گھنے جنگل سے گھرا ہوا ہے اور جہاں آج کی سبھیتا کی روشنی تو کیا، سورج کی روشنی بھی بڑی مشکل سے گاؤں میں داخل ہو پاتی ہے۔ وہاں ہرنوں اور خرگوشوں کے بچوں کے ساتھ ساتھ کبھی شیروں اور چیتوں کے بچے بھی جنگل میں گھومتے گھومتے اس گاؤں کی طرف آ نکلتے ہیں۔ اور اگر وہ دو چار دن نہ آئیں تو اس گاؤں کے بچے ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے جنگل کے اندر بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔ اس لیے بچوں کے دل میں ہرنی کے بچوں کے لیے فکرمندی پیدا ہو جانا قدرتی بات تھی۔

نانی نے گلا صاف کیا۔ سب بچوں کے فکرمند چہروں کی طرف دیکھا اور پھر بولی — "راجا نے وہی کیا جو تم لوگ چاہتے ہو۔ یعنی بکرمادت نے ہرنی کی بات مان لی اور وہ شکار کرنے کے لیے اُتر کے بجائے پُورب کی طرف چل دیا۔"

"راجا نے بہت اچھا کیا۔" ایک بچہ بولا۔

لیکن راجا ابھی پورب کی طرف تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ ایک ننھی سی بیر بہوٹی نے راجا کا راستہ روک لیا۔ چھوٹی سی سُرخ رنگ کی مخملی بیر بہوٹی اپنا ننھا سا سر زمین سے اُٹھا کر راجا سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب راجا تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا تھا، ننھی سی بیر بہوٹی کی پتلی سی آواز راجا تک کیسے پہنچے، اس لیے راجا گھوڑے سے اُترا۔ بیر بہوٹی کو بڑی نرمی سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پوچھا۔

"بتاؤ۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

بیر بہوٹی بولی۔ "اے راجن! آج تم پورب کی طرف شکار کرنے نہ جاؤ۔ پچھلی رات اس طرف بڑی بارش ہوئی ہے، بارش ہوئی تو دھرتی نم ہو گئی۔ دھرتی نم ہو گئی تو میری نسل کی بہت سی بیر بہوٹیاں پیدا ہو کر آج پُورب کی دھرتی پر گھوم رہی ہیں۔ اب اگر تم ادھر شکار کرنے گئے تو ۔۔۔!"

"میں سمجھ گیا۔" بکرمادت بولا۔ "ہم پورب کی طرف نہیں جائیں گے تم بیر بہوٹیوں سے کہہ دو کہ وہ بے فکر ہو کر دھرتی کی سیر کریں۔"

اور راجا پورب کی بجائے دکھن کی طرف شکار کرنے چل پڑا۔

"پھر کیا ہوا۔؟" ایک بچے نے نانی سے پوچھا۔ پھر نانی کی کہانی کو خود ہی آگے بڑھاتے ہوئے بولا — "دکھن کی طرف جاتے ہوئے بھی کسی نے راجا کو اس طرف جانے سے روک دیا ہوگا۔"

"ہاں۔" نانی بولی۔ "تم نے ٹھیک سوچا۔"

"اور پچھم کی طرف بھی۔"

"ہاں۔ اس دن راجا نہ دکھن کی طرف جا سکا نہ کسی اور طرف۔"

"اُدھر راجا کا راستہ کس نے روکا۔؟"

ایک طرف تو خرگوش نے روکا۔ اس نے راجا سے کہا کہ آج اُن کا

شکار کرنے والے چیتوں کا جھنڈ دوسری طرف گیا تھا۔ اس لیے زیادہ تر خرگوش اِس طرف چرنے کے لیے گئے ہیں اور اگر راجا اُدھر گیا تو بہت سے خرگوش گھوڑوں تلے آکر مارے جائیں گے۔ دوسری طرف راجا گیا تو اُدھر ایک ندی پڑتی تھی۔ جب راجا ندی کے پاٹ میں اُترنے لگا تو کچھوؤں کے سردار نے کہا —

"اے راجن! آج کل کچھوؤں نے جگہ جگہ ریت پر انڈے دے رکھے ہیں اور اگر ....."

اس طرح اس دن راجا بکرمادت کسی بھی طرف شکار کو نہ جاسکے اور خالی ہاتھ اپنی اُجین نگری میں لوٹ آئے۔ لیکن نگری میں لوٹنے پر ایک عجیب غریب بات ہو گئی —

"وہ کیا نانی — جلدی بتاؤ۔"

"میں بتاتا ہوں۔" ایک بچے نے کہا۔ "جب راجا شکار سے خالی ہاتھ لوٹا تو رانی نے اس کا مذاق اُڑایا ہوگا۔"

"نہیں۔ رانی نے کچھ نہیں کہا۔"

"تو پھر جنتا میں سے کسی نے دھوبی بن کر کہا ہوگا کہ ....."

"نہیں بھائی، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تم لوگ دھیان سے سُنو۔ بڑی دل چسپ بات ہے۔"

"ہاں بتاؤ نانی بتاؤ — کیا بات ہوئی — ؟"

"ہوا یہ کہ جب راجا دربار میں جاکر اپنے تخت پر بیٹھا تو اس کے تخت پر جڑی ایک پتلی بول پڑی ....."

"پتلی بول پڑی؟ پتلی کیسے بول سکتی ہے؟" ایک بچے نے سوال کیا

"اور وہ پتلی آئی کہاں سے تھی؟" دوسرا بچہ سوال کر رہا تھا۔

نانی رک گئی۔ اس نے سب بچوں کی طرف دیکھا۔ سب کے چہروں پر، یہاں تک کہ گونگی لڑکی کے چہرے پر بھی یہ جگیاسا بنی ہوئی تھی کہ پتلی آئی کہاں سے اور وہ بولی کیسے — ؟

"یہ سونے کی پتلی کی کہانی الگ ہے۔ بلکہ یہ ایک پتلی کی نہیں بتیس پتلیوں کی کہانی ہے۔ اچھا تو یہ کہانی بیچ میں چھوڑ کر پہلے میں تم کو ان پتلیوں کی کہانی سُناتی ہوں۔"

"ہاں — سناؤ نانی۔" سب بچوں نے ایک ساتھ کہا۔ "ہمیں پتلیوں کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

اُن میں سے ایک دو بچے تو پتلیوں کی طرح سر بھی ہلانے لگے۔

"ہاں، تو ہوا یہ کہ جب راجا بکرمادت تخت پر بیٹھا تو پہلے ہی دن ایک لوک کلاکار نے راجا کو سونے کی بتیس پتلیاں لاکر پیش کیں اور کہا کہ اے راجن! یہ پتلیاں تمھارے دیش کی جنتا کی طرف سے تحفے کے طور پر دی جاتی ہیں۔

راجا بکرمادت ان پتلیوں کی خوبصورتی دیکھ کر اس حد تک خوش ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ ان پتلیوں کو تخت کے چاروں طرف جڑ دیا جائے۔

یہ سُن کر اس لوک کلاکار نے کہا کہ "ویسے بھی ان پتلیوں کی جگہ آپ کے تخت پر ہی ہے۔ اے راجن! یہ پتلیاں آپ کو یاد دلاتی رہیں گی کہ اپنی پرجا کے لیے آپ کی کیا ذمّہ داری ہے۔ کیونکہ یہ پتلیاں دراصل آپ کی پرجا کی آشاؤں، امّیدوں اور خواہشوں کی پرتیک ہیں۔ تمھارے شاسن کال میں جیسے جیسے یہ آشائیں پوری ہوتی جائیں گی، ویسے ویسے ان پتلیوں کو وانی ملتی جائے گی اور اگر یہ پوری نہ ہوئیں تو یہ پتلیاں گونگی کی گونگی ہی رہیں گی۔

"میری بہن کی طرح گونگی۔" ایک بچے نے اپنی گونگی بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو اچنبھے سے بھری اس کہانی کو بڑے دھیان سے سُن رہی تھی۔

"بیچ میں ٹوکو مت۔ مجھے کہانی سُنانے دو۔" نانی نے اس بچے کی طرف دیکھا اور پُرانی کہانی کو پھر سے شروع کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں تو اس دن، جس دن راجا چاروں دشاؤں میں کسی طرف بھی شکار کو نہیں جاسکا تھا، اس دن جب وہ دربار میں واپس آیا تو اس کے تخت سے جڑی پہلی پتلی کو آواز مل گئی اور اس نے راجا بکرمادت سے کہا — اے راجن! جس طرح تم نے اپنے راجیہ میں چھوٹے چھوٹے جیو جنتوؤں کی بات مان کر ان کی حفاظت کی ہے، اس کی کہانی میں تمھارے دیش کی آنے والی نسلوں کو ہمیشہ سناتی رہوں گی —

ایسا کہا جاتا ہے کہ راجہ بکرمادت نے اپنے راج کے پہلے پچاس برسوں میں ہی اپنے دیش کی جنتا کی اتنی سیوا کی، اتنی سیوا کی کہ اس کے تخت سے جڑی بتیس کی بتیس پتلیوں کو وانی مل گئی اور وہ اس کے گُنوں کی گاتھا کہنے کے لیے بیچو ہوا اٹھیں۔

"اور وہ پُتلیاں آج بھی بکمادت کے گُنوں کا گان کرتی ہیں"۔ ایک بچہ اونچی آواز میں نانی کی کہانی کو پُورا کرتا ہوا، اُٹھ کھڑا ہوا۔

"نانی! اب بھی تو ہمارے دیش میں آزادی آئے پچاس سال پُورے ہو رہے ہیں تو کیا اب میری گونگی بہن کو بھی وانی مل جائے گی؟ کیا وہ بھی بولنے لگے گی؟"

"بولنے لگے گی۔ ضرور بولنے لگے گی!"

نانی کی یہ بات سنتے ہی سب بچے تالیاں بجاتے ہوئے، ناچتے کودتے اٹھ کر باہر کی طرف چل دیے۔ جہاں ہرنوں کے ہر نوٹے اور دوسرے جنگلی جانوروں کے بچے کھیلنے کے لیے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

باہر ٹھنڈی، میٹھی تازہ ہوا چل رہی تھی۔ پیڑوں کے گھنے پتوں سے چھن کر روشنی ان راہوں پر بکھر رہی تھی، جن پر دیش کی نئی نسل کے بچے چل رہے تھے۔ پیڑ ان بچوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بارش کر رہے تھے

ایک رات ختم ہو رہی تھی — ایک نیا سویرا انگڑائی لے کر جاگ رہا تھا۔

□□

سوانحی کوائف ۔۔۔۔۔۔

صفحہ ۱۲ کا بقیہ

ایک اور موڑ!

یہ سلسلۂ تجدید نسل در نسل جاری ہے

میں براہِ راست اظہار کا شاعر ہوں یا علامتی اظہار کا؟ یہ سوال بے معنی ہے۔ میں تجربے کے برہنہ حسن کا شاعر ہوں۔ زندگی کے سرچشموں سے پھوٹتی ہوئی معنیاتی کیفیات کا شاعر ہوں۔ ماحول میں موت، دہشت، تخریب کاری خطرناک تنگ نظری اور خاک و خون کا ذائقہ شدید تر صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ میں زوالِ عمر کا سایہ اپنے ساتھ چلتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ نمک کے ذائقے کا اسیر ہوں۔ لمحۂ موجود میرے روبرو ہے۔ میں لمحۂ موجود کا شاعر ہر لمحۂ وجود کے محشر انقلاب سے گزرتا ہوں — ماورائیت کا تجربہ کرتا ہوں اور پھر لمحۂ موجود کی سرشاریوں میں کھو جاتا ہوں

میں ہر لمحہ ایک نئے تخلیقی سفر میں ہوں

میں تسلسل ہوں۔

□□

ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی

صفحہ ۱۰ کا بقیہ

کرتے ہیں اور یہ تخفیف ظائے معجمہ پڑھتے ہیں .... حظوظ جمع حظ کی"۔

آزاد اور خدا بندہ کا اعتراض درست نہیں ہے کہ فارسی میں "حظ" مسرّت، لذّت، انبساط اور لطف اندوزی کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں فارسی میں مرزا صائب اور اُردو میں میرؔ کے ہمعصر راسخ عظیم آبادی کے دو شعر پیش کرتے ہیں جن میں حظ مسرّت اور لطف اندوزی کے معنوں میں استعمال کیا ہے

ثنائے خود بخود گفتن نہ زیبد خود ثنائی را
چو زن پستان خود مالد حظوظ نفس کے یابد

—— صائبؔ

کیا کرے فدوی بیاں جو کچھ اُٹھایا اس نے حظ
جانے ہے دل ہی کچھ اس کو جس نے پایا اس نے حظ

—— راسخؔ

□□

غزل

اُسے کیا خبر تھی، اسے کیا پتہ تھا
وہ خوابوں میں، دل میں، نظر میں بسا تھا

جو کہنا بھی چاہا تو لب تھرتھرائے
عجب کشمکش سے گزرنا پڑا تھا

اگر میں نہیں تھا ترے دل کی دھڑکن
کتابوں میں کیوں نام میرا لکھا تھا

چلو خواب میں اس نے دیکھا تو مجھ کو
میں راتوں میں جس کے لیے جاگتا تھا

عتیقؔ اس کی محفل سے یوں اُٹھ کے آئے
نہ کچھ بھی کہا تھا نہ کچھ بھی سُنا تھا

عتیق اللہ آبادی
۳۲/۳۶ - استو گنج -
الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

انساں ہے کہ شعلہ ہے شبنم ہے شرارا ہے
یا چرخِ محبّت کا ٹوٹا ہوا تارا ہے

ہر سانس میں سو خوشبو، ہر بات میں سو پہلو
اظہارِ لبِ جاں نے کیا ذوق نکھارا ہے

کیا جانیئے کیا شے ہے آدابِ چمن رائی
کیا لالۂ صحرا نے گلشن کو سنوارا ہے

کچھ سیلِ حوادث ہے کچھ موجۂ طوفاں بھی
کشتی ہے تارا ہے دریا ہے کنارا ہے

ہر حرف اُدھورا ہے ہر نقش ہے بے چہرا
آئینہ بہ آئینہ کیا عکس اُبھارا ہے

ہر لوحِ جبیں پر ہیں بے ربط لکیریں سی
تقدیرِ امم کیا ہے کیا ظرف ہمارا ہے

احسان نانپاروی

بابا کا پُروا - آدرش نگر - نانپارہ بہرائچ

اسے وفاؤں کا اپنی حساب کیا دیتا
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتا

تمام عمر تو اس کی کٹی خرابے میں
معاشرے کو وہ خانہ خراب کیا دیتا

نظر فریب بنا اور کبھی فریبِ نظر
بس اس سے اور زیادہ سراب کیا دیتا

تھی کارِ نیک میں بھی اس کے اک ریاکاری
خدا پھر ایسے عمل پر ثواب کیا دیتا

ہنر وہ سیکھ کے آیا تھا بے وفائی کا
وفا کی پھر اسے حیدرؔ کتاب کیا دیتا

ڈاکٹر حیدر مصطفےٰ آبادی

جہان آباد
رائے بریلی

غزلیں

طلبِ چمن کی تو پھولوں کی جستجو بھی نہیں
لبوں پہ حرفِ تمنّائے رنگ و بُو بھی نہیں

دراز دستِ طلب ہیں نہ باز حرفِ دُعا
کہ قیدیوں کو رہائی کی آرزو بھی نہیں

کسی درخت کا سایہ نہ کوئی موجِ ہوا
عجیب وحشتِ دل ہے کہ ہاؤ ہُو بھی نہیں

جبینِ صبحِ قفس چھُو کے کون لوٹ گیا
گمان دل کو ہے تجھ پر مگر وہ تو بھی نہیں

میں اپنے عہد کا غالب نہ میرؔ ہوں نیّرؔ
کہ میرے ساتھ وہ دِلّی وہ لکھنؤ بھی نہیں

عبّاس رضا نیّرؔ

جعفرآباد، جلال پور، امبیڈکر نگر ۲۲۴۱۴۹

وقت ہے کتنا گراں، رات ہے تنہا تنہا
دُور ہے اپنا مکاں، رات ہے تنہا تنہا

جس طرف دیکھو ردا پھیلی ہے سنّاٹوں کی
تم ہو اس وقت کہاں، رات ہے تنہا تنہا

سُننے والا نہیں کوئی تو سُناتے ہو کسے؟
کم کرو شورِ فغاں، رات ہے تنہا تنہا

اب تو جاموں کے کھنکنے کی بھی آواز نہیں
سو گیا پیرِ مغاں، رات ہے تنہا تنہا

بیٹھے ہو آس لگائے ہوئے کس کی رضواںؔ
کون آئے گا یہاں، رات ہے تنہا تنہا

رضوان بنارسی

۵۱ ۔ ۔ ۔ بھادون۔ وارانسی

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "نیم کے پتّے" (افسانوی مجموعہ)
مصنف: سیماب طفیل قیمت: چالیس روپئے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین آباد
لکھنؤ

طفیل سیماب کا نام اردو کے نئے افسانہ نگاروں میں جانا پہچانا ہے۔ ان کے افسانے مختلف ادبی جرائد میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے اس سے قبل بھی شائع ہو چکے ہیں اور انھیں ادبی حلقوں کی جانب سے پذیرائی کی سند بھی حاصل ہو چکی ہے۔

"نیم کے پتّے" طفیل سیماب کی کہانیوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے جو ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں تقریباً ۲۲ چھوٹے بڑے افسانے شامل ہیں۔

طفیل سیماب نے اپنی کہانیوں میں زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے جو شب و روز ہماری زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں مگر ہماری نگاہ اور توجہ کا مرکز نہیں بن پاتے۔

ایک بات اور غور طلب ہے کہ "نیم کے پتّے" کے مصنف کی آواز میں ایک کرب ہے اور وہ دوہری زندگی جینے والوں، اخلاق بے راہ رویوں کے شکار لوگوں، تہذیبی انحطاط، فرقہ پرستی، تعصب اور انسانیت کی پامالی پر اپنے افسانوں کے ذریعہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ یوں تو مجموعی اعتبار سے یہ مجموعہ ایک خاصے کی چیز ہے مگر "کڑوے گھونٹ"، "صلہ"، "مشورہ"، "ترکیب"، "محافظ"، "آخری تحریر"، "قاتل فن کار" اور "نیم کے پتّے" وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

—— راحت علی خاں

نام کتاب: "پروں کے درمیان" (شعری مجموعہ)
شاعر: بشیر فاروقی قیمت: سّو روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل بک ڈپو۔ امین الدّولہ پارک
لکھنؤ

میں نے بشیر فاروقی کی شاعری پر کچھ برس پہلے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے شعری و فکری نظام کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان کا پیرایہ اظہار بہت واضح ہے گنجلک نہیں۔ ان کا نیا مجموعہ غزلیات "پروں کے درمیان" میرے اس مذکورہ بالا نظریے کی تصدیق کرتا ہے جس کا ہر شعر تفہیم کی ایک خاص سطح میں ہے اور براہ راست دل کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر بشیر فاروقی غزل کے شاعر ہیں اور اپنے معاصرین میں ایک منفرد لہجے کی نمائندگی کرتے ہیں وہ لہجہ جو عرفان عشق اور فلسفۂ ذات کا آمیزہ ہے ؎

جو سنگ اس نے اٹھایا تھا میرے سر کے لیے
وہ کب گلاب بنے گا میں انتظار میں تھا

ہر ایک رنگ کو میں نے ہزار رنگ دیے
ہزار رنگ میں وہ میرے سامنے آئے

"پروں کے درمیان" ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کچھ حصہ مشاہیر کی آرائے گرامی سے مزین ہے۔ کتابت و طباعت دونوں میں نفاست ہے لیکن فکری تبحر نے اس کتاب کو شاہراہ فن کا ایک اہم سنگ میل بننے میں مدد دی ہے۔

—— عشرت ظفر

نام کتاب: "زرخیز" (شعری مجموعہ)
شاعر: ظفر مہدی قیمت: ۱۲۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین الدولہ پارک
لکھنؤ

ظفر مہدی صاحب کا تعلق اودھ کے مردم خیز قصبہ رُدولی سے ہے وہ مرحوم استاد شاعر جعفر مہدی ناظم رُدولوی کے صاحبزادے اور ممتاز شاعر

باقر مہدی کے بھائی ہیں۔ ادبی ماحول میں آنکھ کھولنے اور گھر کی شاعرانہ فضا سے ان میں بچپن سے ہی شاعری کا شوق پیدا ہونا فطری بات ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "عکس جاں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

"زرخیز" ظفر مہدی صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں ۹۱ نعتیں اور غزلیں شامل ہیں۔ انھوں نے ابتدا مدینۂ منورہ میں دوبارہ حاضری دینے کی اپنی آرزو کے ساتھ کی ہے۔ رسولِ مقبول ؐ سے اپنی بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں ؎

بعد از خدا ملا ہے ترا آسرا مجھے
اور اب کچھ نہ چاہیئے اس کے سوا مجھے
ماتھے سے مس ہوئی ہے مدینے کی خاکِ پا
میں آئینے کو دیکھتا ہوں آئینہ سے مجھے

ظفر مہدی صاحب کی غزلیں بھی خوب ہیں جن سے ان کی شاعرانہ مہارت اور الفاظ پر قدرت کا پتہ چلتا ہے ؎

نشاط کرب کا منظر نظر میں رکھتا ہوں
میں صعوبتِ راہ کو اپنے سفر میں رکھتا ہوں

اس شعری مجموعہ کی کتابت اور طباعت بہت نفیس ہے مجموعی اعتبار سے "زرخیز" ایک اچھا شعری مجموعہ ہے جو باذوق حضرات میں یقیناً پسند کیا جائے گا۔

——— واصف اعظمی

نام کتاب: "رہ گزر" (افسانوی مجموعہ)
مصنف: ڈی۔ اے۔ ہریسن قربان قیمت: ۴۰/- روپیے
ملنے کا پتہ: ڈی۔ اے۔ ہریسن قربان۔ ۱/۲۲۴۔ ورام کھنڈ گومتی نگر۔ لکھنؤ

ہریسن قربان کا یہ افسانوی مجموعہ "رہ گزر" ان کے ۱۹ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں میں مصنف نے حالاتِ زمانہ کے تغیرات، مذہب، ثقافتی اور سماجی قدروں کے انتشار و انحطاط، خدمتِ خلق، فرد کی تنہائی کے کرب و اضطراب، رنگ و نسل، عشرت و عسرت، انبساط و الم اور زندگی کے نشیب و فراز کے علاوہ قاری کے افکار و خیالات اور نظریات و میلانات کی کامیاب عکاسی کی ہے، نیز ان میں اخلاقی و اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔ دراصل افسانے کی غرض و غایت تخیل کی تکمیل تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ تخلیق کا اصل مقصد انسانی زندگی میں تعمیری تغیر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہریسن قربان نے تخلیقی عمل کے دوران اصلاحِ معاشرہ کو مقدم رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں کہانی پن بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن بعض افسانوں کے غیر فطری اختتام سے اگر اجتناب کیا جاتا تو ان کا فنی حسن یقیناً دوبالا ہو جاتا۔

ہریسن قربان نے اپنے افسانوں میں واقعہ نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان دل کش اور زبان عام فہم و سلیس ہے۔ امید ہے کہ ہریسن قربان کا یہ افسانوی مجموعہ "رہ گزر" قارئین کو پسند آئے گا اور خاطر خواہ مقبولیت حاصل کرے گا۔

——— سلمان علی خاں

نام کتاب: "مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی: حیات اور ادبی کارنامے"
مصنف: سکندر آغا قیمت: ۶۵/- روپیے
ملنے کا پتہ: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

زیرِ تبصرہ کتاب ڈاکٹر سکندر آغا کا تحقیقی مقالہ ہے جس کے سرورق اور ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر ولی الحق انصاری، پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی، پروفیسر محمود الحسن، نور الحسن ہاشمی اور نیر مسعود جیسی اردو ادب کی باخبر اور بالغ نظر شخصیتوں کی کتاب سے متعلق نہایت صحت مند رائیں شامل ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اردو زبان کے موجودہ دورِ انحطاط میں تحقیقی تخلیقات کو پیش کرنا بے حد جاں سوزی و دیدہ ریزی کا کام ہے۔ اس قسم کی کاوشوں کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو زبان و ادب کی خدمت کو فرضِ اولیں تصور کرتے ہیں، اور جن کی نظر میں مالی منفعت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی کی مجموعی شخصیت کو منظرِ عام پر لاکر ڈاکٹر سکندر آغا نے رثائی ادب پر ایک عظیم احسان اور قارئین کی معلومات کے لیے ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہے اس لیے کہ اوج لکھنوی خاندانِ دبیر کا

گراں قدر سرمایہ تھے۔ خود رثائی ادب مذہبی اہمیت سے قطع نظر ادب کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔ مرزا اوج لکھنوی نہ صرف ایک مستند شاعر تھے بلکہ وہ تقریباً چالیس باکمال شعرا کے اُستاد تھے۔ مرزا اوج نے تقریباً ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن مرثیے کو ورثۂ خاندان تصور کرتے ہوئے خاص عطا کیا نیز نثر نگاری کو بھی اسی دلچسپی اور معیار کے ساتھ اپنایا نتیجے کے طور پر "مقیاس الاشعار" اوج لکھنوی کا وہ نثری کارنامہ ہے جس میں علم عروض، قافیہ اور تاریخ گوئی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر نیر مسعود: "انیس و دبیر کی وفات کے بعد مرزا اوج ایک مثالی اور مستند استاد کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے۔ خوش گو اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ انھوں نے شاعری کے تکنیکی پہلو یعنی عروض کی طرف خاص توجہ کی۔"

اس طرح یہ کتاب مجموعی حیثیت سے اُردو ادب میں ایک اہم ترین اضافہ ہے جس کے لیے مصنف مُبارکباد کے مستحق ہیں۔

ارشاد امروہوی

نامِ کتاب: "دیوانِ مبتلا"
مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ قطب پورہ۔ ڈالی گنج لکھنؤ۔

بزرگ ادیب و ناقد۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری سے ایک قلمی دیوان کھوج نکالا۔ جو ولی کے ہم عصر اور ان کے رنگ کے مقلد مبتلا کا ہے۔ یہ اہم شعری نسخہ ہے جو پہلے عبدالباری آسی الدنی کی ملکیت میں تھا فاضل مرتب نے ایک تحقیقی مقدمہ کے ساتھ اسے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ عہدِ ولی میں مبتلا تخلص کے دو ایک نام اور ہیں۔ ان میں شمالی ہند کے عبیداللہ خاں مبتلا بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دیدہ ریزی کے ساتھ تقابلی مطالعہ کر کے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مذکورہ دیوان مبتلا کے شاعر عبیداللہ خاں مبتلا نہیں ہیں بلکہ کوئی دوسرے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی رائے ہے کہ شمالی ہند خصوصاً دہلی کے ابتدائی شعرا میں اور ولی کے مقلدین میں اس مبتلا شاعر کے کلام کی لسانی اہمیت اپنے معاصرین (آبرو، یقین، فائز وغیرہ) کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ایہام اور رعایتِ لفظی کی کثرت بھی موجود ہے۔ محققین اُردو زبان کو ایسے فاضل سخن شخص کے بارے میں اور زیادہ تفصیل سے کام کرنے کی فرصت ہے۔ پروفیسر ہاشمی نے دیوانِ مبتلا شائع کر کے نیز تحقیقی کام کرنے والوں کو مقدمہ میں رہبرانہ اشارے دے کر احسان فرمایا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

فریاد کر دہ شوخ ستم گار نہ آیا
مجھ قتل کوں لے ہاتھ میں تلوار نہ آیا

ڈاکٹر ارشد علی

نامِ رسالہ: رُوحانی اسرار (ماہنامہ)
مدیر: حافظ جمیل احمد جمیل قیمت آٹھ روپے (فی شمارہ)
ملنے کا پتہ: بیت الجمیل۔ گلی حسام الدین نزد اسلامیہ انٹر کالج سہارن پور

انسان کی زندگی میں ہر قسم کے مصائب آتے رہتے ہیں کبھی گھریلو حالات سے پریشانی، تو کبھی دشمن کا خوف، تنگیِ رزق، بے برکتی، بیماری، سحر وغیرہ۔ یہ ایسے مصائب ہیں جو کسی نہ کسی بہانے ہر آدمی کی زندگی میں دخل انداز ہیں۔ ان سب مصائب سے چھٹکارا پانے کے لیے علاج و معالجہ اور مطالعہ و تعویذ کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ:- "اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی دلوں کو سکون حاصل ہوگا۔"

انسان کو بعض بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوا علاج کے ساتھ ہی دعا تعویذ کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسی کے پیشِ نظر جمیل احمد صاحب نے ایک ایسا ماہانہ رسالہ جاری کیا ہے جو ان پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ ان کا مشورہ ہے کہ صدق دل سے اللہ کو یاد کرتے ہوئے اس شمارے سے مستفید ہوں اور اپنا علاج روحانی طور پر خود کریں۔

زیرِ نظر شمارے میں علم رمل، علم جفر، علم اعداد، تصوف، طب روحانی و جسمانی وغیرہ موضوعات پر کافی معلوماتی ذخیرہ موجود ہے جو استفادہ کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے۔

شمارہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ، طباعت اور قیمت بھی مناسب اور قابلِ قبول ہے۔

نام کتاب: "پتھر کی لکیر" (شعری مجموعہ)
شاعر: ظفر نسیمی قیمت: ستر روپئے
ملنے کا پتہ: بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ۔ بھوپال
(ایم۔ پی)

"پتھر کی لکیر" ظفر حسین فاروقی ظفر نسیمی کا مجموعہ کلام ہے جس میں غزلوں کے علاوہ چند نظمیں، کچھ قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔

ظفر نسیمی کا غزل گو شعرا کے اس چھوٹے سے گروہ سے تعلق ہے جس نے اپنے فن کو حتی الامکان قافیے کی استبداد سے آزاد رکھا ہے۔ ان کی غزلیں گزشتہ نصف صدی کے دوران تیزی سے بدلتے فکری و محسوساتی مفاہیم کا ایک تخلیقی منظر نامہ ہیں۔ ان کے اشعار میں خود اعتمادی، فکر کی بلندی، خیال کی رعنائی اور بیان کی پختگی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں ان کی علمیت اور مزاج کی سادگی کی جھلک نمایاں ہے ؎

آؤ خندہ لبی کو عام کریں کرب کی داستاں تمام کریں
نئی قدروں سے واسطہ ہے ظفر کہنہ رسموں کو اب سلام کریں

ظفر نسیمی کے کلام میں عصری حسیت کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے اشعار کی رمزیت و ایمائیت کلام کی جلا بڑھا دیتی ہے۔ ان کے تجاہل عارفانہ میں بھی ایک رمزیت کا پہلو چھپا ہوا ہے۔

ظفر نسیمی کے اشعار غزل کی وسعت کو بالیدگی بخشتے ہیں اور اس کی معنی فہمی کو ایک امتیازی رنگ و روغن فراہم کرتے ہیں ؎

دستارِ عشق کی خاطر بہت ضروری ہے
تعلقات میں تھوڑا سا فاصلہ رکھنا

ان کا طنز و مزاح کلام میں شگفتگی پیدا کرتا ہے ؎

کھوٹے سکے بھی کام آتے ہیں
بھر لو جیبوں میں تجربات ابھی

مجموعی طور پر "پتھر کی لکیر" صاحبِ ذوق حلقے میں ضرور مقبول ہوگا۔ اس کی کتابت و طباعت بھی معیاری ہے۔

ــــــ ڈاکٹر خلیل اللہ خان

نام کتاب: "حدیثِ دل" (شعری مجموعہ)
شاعر: سید انوار الدین انور بھوپالی قیمت: ۵۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: بھوپال بک ہاؤس۔ بھوپال
(مدھیہ پردیش)

سید انوار الدین انور بھوپالی کا شعری مجموعہ "حدیثِ دل" ہمارے سامنے ہے۔ یہ روایتی انداز گزراں کا مرقع ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جسے پچاس سال پہلے ہم اکثر دیکھا کرتے تھے۔ ادب میں وہ سب کچھ شامل کر لیا جاتا تھا جس کی گنجائش ادب میں پیدا ہی نہیں کی جا سکتی، تمام اصناف شاعری کے نمونے پیش کرنا شاعر اپنے لیے ضروری سمجھتا تھا چنانچہ زیرِ نظر مجموعہ میں نعت، منقبت، نظم، قطعہ، مثلث، سانیٹ اور سہرا سب کچھ موجود ہے۔ جناب انور بھوپالی بزرگ شاعر ہیں ان کی عمر ۸۸ سال سے زیادہ ہے۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔ پھر بھی ہم اس مجموعہ کو ان کی زندگی کا حاصل اور نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔ اپنی خود نوشت میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"... شروع میں عربی میں شعر کہتا تھا، پھر فارسی کی طرف مائل ہوا ... ویسے ہر سخن پر قدرت بھی ہے اور عبور بھی۔ ایک ماہر فن کی حیثیت سے راجستھان میں جانا پہچانا جاتا ہوں .... انگریزی اور قدیم و جدید عربی میں فارسی میں مطالعہ جاری رکھا۔ سیکڑوں شاگرد ہند و پاک کے ہوئے۔ بہت سے شاگرد راجستھان میں مشق سخن کر رہے ہیں۔" اس طرح انھوں نے قاری کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور اسی سے موصوف کے بارے میں اچھی بری رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

کتاب، کتابت کی بے شمار غلطیاں لیے ہوئے ہے۔ اس میں بیچارے بزرگ شاعر کا کوئی قصور نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے کچھ ایسی غزلیں بھی 'حدیثِ دل' میں شامل کر دی ہیں جو دوسروں نے اپنے نام سے مختلف رسائل میں شائع کرائی تھیں کہیں ان کا حوالہ فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے اور کہیں صرف مقطع کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔ انور بھوپالی کے اس شعر سے ان کی فنی بصیرت کا اندازہ لگائیں ؎

سُنا اگر تمھیں آدم کی داستاں میں نہیں
تو پھر گناہ کوئی سجدۂ بتاں میں نہیں

[illegible] ــــــ

تاثرات

محب مکرم! تسلیم ۔ نیا دور (یادگار آزادی نمبر) اگست ۱۹۹۷ء ملا۔ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ اس جریدے نے چند برسوں سے جو خاص نمبروں کی دھوم مچا رکھی ہے اس میں اس ضخیم آزادی نمبر نے اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ ظاہری صورت دیدہ زیب ہے اور باطنی صورت بصیرت افروز۔ حق یہ ہے کہ مدیر محترم نے بڑی محنت کی ہے۔ اب "نیا دور" ان چند جرائد میں شامل ہے جنھوں نے اردو رسائل کی صحافت کے وقار کو مسلسل قائم رکھا ہے دلی مبارک باد۔

—— کالی داس گپتا رضا ممبئی

محترم۔ آداب عرض! نیا دور کا یادگار آزادی نمبر ملا۔

آپ نے مجھے پہلی بار نیا دور بھیجا ہے، وہ بھی خاص نمبر۔

یہ نمبر بے حد اہم ہے۔ آزادی کے بارے میں شاید ہی اس سے اچھا کسی اخبار یا میگزین میں کوئی نمبر شائع ہوا ہے۔

اردو کی ضبط شدہ تحریریں۔ مشرقی اضلاع میں آزادی کی تحریک۔ کاکوری کیس بھگت سنگھ کی اردو تحریر کا عکس۔ یہ اور ایسے بہت سے مضامین آج نایاب تحریریں بن گئی ہیں۔ آزادی کے بعد بھی مختلف موضوعات پر بڑے اہم مضامین ہیں۔ ادبیات، لسانیات اور تحقیق والا حصہ بھی بہت اچھا ہے۔ آپ نے اس شمارہ کو ایک یادگار نمبر بنا دیا ہے۔

اس پر تو بہت طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

فی الحال میری دلی مبارک باد قبول کیجیے، اور نیا دور بھیجنے کا شکریہ۔

—— جیلانی بانو۔ حیدر آباد

محترم سید امجد حسین صاحب، آداب

نیا دور کا یادگار آزادی نمبر ملا شکریہ۔ حسبِ توقع معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے اسے بے مثال پایا۔ یکے بعد دیگرے آپ اتنے ضخیم اور بلند پایہ خصوصی شمارے شائع کر پاتے ہیں، یہ امر اردو کے تئیں آپ کی غیر معمولی لگن، محنت اور خلوص پر دلالت کرتا ہے۔ آپ کو میری دلی مبارکباد۔

کتاب "فراق: صدی کی آواز" بھی موصول ہوئی۔ فراق پر اس سے زیادہ جامع اور بسیط کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ نے واقعی ایک اہم ادبی ضرورت کو پورا کیا ہے اور ایک عظیم تاریخ ساز شاعر کو واجب خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس تصنیف کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فراق کے حق میں اور اس کے خلاف دونوں قسم کی تحریریں ملتی ہیں۔ اس ہیچمدان کی رائے میں فکر و خیال کا عہد بھی بڑی طویل جستیں لگا کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے اور آج بھی کسی تخلیق کار کا احتساب زبان کے صحیح یا غلط استعمال اور گھسے پٹے قواعد اور تکنیکی ضرورتوں کی بنیاد پر کرنا فکر و خیال کی وسعت اور بلند پروازی کی توہین نہیں تو کم بینی کے مترادف ضرور ہوگا۔ جوش اور فراق تو صحیح معنوں میں تاریخ ساز شاعر ہوئے ہیں۔ آپ کی تالیف کردہ اس کتاب کا نام "فراق ۔ صدی کی آواز" فراق کے فکر و فن کی مختصر ترین تعریف ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ اردو کی اسی طرح سے بے خوفی سے خدمت کرتے رہیں۔ آپ ابھی جوان سال ہیں اور آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

—— م م۔ راجندر۔ دہلی

مکرمی تسلیم!

آپ کا ارسال کردہ تحفہ "فراق ۔ صدی کی آواز" وصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔

'اردو نمبر' کے بعد فراق گورکھپوری کے سلسلے میں یہ کوشش قابلِ صد مبارکباد ہے۔ آپ نے بڑی محنت سے فراق کی سوانح، شخصیت و سیرت، شاعری، تنقید نگاری اور زبان و بیان پر اچھے مضامین اس میں یکجا کر دیے ہیں جن سے فراق کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

فراق پر یہ مجموعہ مضامین حسنِ انتخاب، ترتیب و تنظیم کتاب اور طباعت وغیرہ ہر اعتبار سے خوبصورت ہے جس سے ذوقِ سلیم، سلیقہ مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

—— عظیم الشان صدیقی دہلی

جلد ۵۲ شمارہ (۱۰)

عنوانات

اپنی بات

قارئینِ نیا دور کو نیا سال مبارک ہو !

جب بھی جنوری کا مہینہ آتا ہے اپنے ساتھ نئی اُمیدوں کی روشنیاں لے کر آتا ہے۔ وہ تمام ممالک جہاں جنوری کلنڈر رائج ہے، نئے سال کا تہوار باقاعدہ منایا جاتا ہے، حالانکہ صرف ایک گنتی بڑھتی ہے اور ایک ورق پھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے مگر ہمارے ملک ہندستان کے لیے یہ مہینہ واقعی خوشیوں اور مسرتوں کا مہینہ ہے۔

اس لیے کہ ہم اس مہینے میں ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریت مناتے ہیں، خوشیوں اور مسرتوں کی رنگارنگ تقریب کے ساتھ یہ قومی تہوار اقوامِ عالم کے درمیان ہمیں سربلندی اور جذبۂ افتخار سے سرشار کر دیتا ہے، اس لیے کہ دُنیا کے کسی بھی ملک میں اپنی عظیم اور مسلسل تہذیبی روایات کے ساتھ اور شاندار اخلاقی اور رُوحانی اقدار کی حامل جمہوریت نہیں ہے۔ آج سے ۴۸ سال پہلے ہندستان نے اپنے مقدر کی بنیاد جمہوریت پر رکھی تھی اور صحیح معنوں میں اقتدار عوام کو سونپا گیا تھا۔ جمہوریت کا اتنا عظیم تجربہ تاریخ کے کسی دور میں کبھی نہیں کیا گیا اور ہندستان نے بالغ رائے دہی کی بُنیادوں پر انتخابات کے ذریعہ جمہوری روایات کو مستحکم بنایا۔

یوں تو یوم جمہوریہ کے موقع پر عکسی خاکے جنھیں ٹیبلو کہا جاتا ہے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن دراصل یہ خاکے یادگار واقعات کا متحرک اور مصور کارواں ہیں ـــــ جنھیں ہم جھانکیاں بھی کہتے ہیں۔ یہ جھانکیاں ہندستان کی ہر ریاست کی تہذیبی پہچان اور شناخت کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں، ان میں رقص کے ساتھ ساتھ ہماری دفاعی طاقت کا شاندار مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ اس موقع پر ملک کی اہم شخصیتوں کو خطابات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔

اِس سال کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر اے، پی، جے عبدالکلام کو یوم جمہوریہ کے موقع پر "بھارت رتن" کے عظیم اعزاز سے نوازا جائے گا۔ یہ ڈاکٹر عبدالکلام کی پُرخلوص، خاموش مگر عظیم خدمات کا قومی اعتراف ہے۔ مادرِ وطن کے اس سپوت پر ہر ہندستانی کو بجا طور پر فخر ہے، جس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں سے ملک کی دفاعی طاقتوں کو اقوامِ عالم میں ممتاز اور منفرد بنایا ہے یوں تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں زمین سے آسمان تک اپنا مظاہرہ کر رہی ہیں لیکن اُن کے میزائیل پروگرام نے جو وقار اور سربلندی عطا کی ہے وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ روشن اور تابناک رہے گا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر عبدالکلام کو میزائیل پروگرام کا خیال سلطان ٹیپو شہید کی اسلحہ سازی میں جدت کو پڑھ کر پیدا ہوا تھا۔

۳۰ جنوری کو بابائے قوم مہاتما گاندھی کی شہادت کا دن ہے۔ آیئے ہم سب گاندھی جی کے یوم شہادت پر انھیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کریں۔

اس سال جنوری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عالمِ اسلام کے مُقدس مہینے رمضانُ المبارک کے روزے بھی شروع ہو رہے ہیں اور اسی جنوری کے آخر میں عیدالفطر کا پُرمسرت تہوار بھی ہے۔ رمضانُ المبارک کے مذہبی فرائض کی بجا آوری کے بعد عید خوشی اور مسرت کی سوغات لے کر آتی ہے۔

اس لیے ـــــ

نئے سال اور عیدِ سعید کی سب کو مبارک باد !

ـــــــــــــ سید امجد حسین
ایڈیٹر

غزل

شمعِ تنہا کی طرح، صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

چھو گیا تھا کبھی اِس جسم کو اِک شعلۂ درد
آج تک خاک سے اُڑتے ہیں شرارے جیسے

حوصلے دیتا ہے یہ ابرِ گریزاں کیا کیا
زندہ ہوں دشت میں ہم اِس کے سہارے جیسے

سخت جاں ہم سا کوئی تم نے نہ دیکھا ہوگا
ہم نے قاتل کئی دیکھے ہیں تمہارے جیسے

دیدنی ہے مجھے سینے سے لگانا اُس کا
اپنے شانوں سے کوئی بوجھ اُتارے جیسے

اب جو چمکا ترا خنجر تو خیال آیا ہے
تجھ کو دیکھا ہو کبھی نہر کنارے جیسے

اُس کی آنکھیں ہیں کہ اِک ڈوبنے والا انسان
دوسرے ڈوبنے والے کو پکارے جیسے

عرفان صدیقی
حیدر مرزا روڈ، لکھنؤ

علی جواد زیدی
۲/۱۹۹ وشواس کھنڈ، گومتی نگر۔ لکھنؤ

یادوں کی رہ گزر

(۱۴)

علمی اور ثقافتی روابط

علم ہو یا ثقافت وہ کسی ایک خطہ کی اجارہ داری نہیں، ان کو کسی قلعے، کسی درس گاہ، کسی خانقاہ میں قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بہتے ہوئے دریا ہیں جو پیاسوں کو سیراب کرنے کے لیے ہی وجود میں آتے ہیں اور ان کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ محمد آباد کے ارد گرد بھی کئی علمی اور ثقافتی مرکز ایسے ہیں جن سے لوگ سالہا سال سے کسب نور کرتے رہے ہیں۔ ان میں علامہ شبلی کا اعظم گڑھ اور ملا محمود کا جون پور قریب تر ہیں، لیکن لکھنؤ، الہ آباد، بنارس سے تھوڑے سے فاصلے کے باوجود گہرے اور فنی روابط رہے ہیں۔

الہ آباد اور بنارس

لکھنؤ سے روابط کی بات بر سبیل تذکرہ پہلے بھی آچکی ہے، لیکن بنارس اور الہ آباد سے بھی قدیم تعلقات کی بھی ایک داستان ہے۔ الہ آباد اور بنارس دونوں ہی مشہور تیرتھ اور زیارت گاہیں ہیں۔ بنارس کے گھاٹ نے اس شہر کو "صبح بنارس" کا جھلکتا ہوا خطاب عطا کیا اور الہ آباد، گنگا جمنا کا سنگم ٹھہرا گنگ و جمن کے علاوہ تربینی ہے، ایک دریا پیوند زمین ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ صفی لکھنوی نے ایک شعر میں اسی کے گن گائے ہیں ؎

اے الہ آباد، اے جولانگہِ گنگ و جمن
تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن

یہیں قلعے کے علاوہ معتوب مغل شہزادے خسرو کی آرام گاہ بھی ہے جو "خسرو باغ" کے نام سے موسوم ہے۔ اب وہاں سناٹا چھایا رہتا ہے۔ اس کی نقشہ کشی صفی نے ایک خوبصورت مصرعے میں کر دی ہے ؎

بیٹھتے ہیں آ کے طائر بھی تو پر تولے ہوئے

الہ آباد اور اودھ کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ہی صوبے کا حصہ رہے ہیں۔ میرے بچپن میں الہ آباد صوبائی حکومت کا مرکز تھا اور ریاست کا نام ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (یو۔پی) تھا۔ میرے عنفوانِ شباب میں لکھنؤ منتقل ہوا، پھر بھی محکمۂ تعلیم صوبائی عدالتِ عالیہ اور اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفاتر الہ آباد ہی میں رہ گئے۔ بڑے بڑے ایڈوکیٹ اور بیرسٹر یہاں سے اٹھے جن میں سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو اور سر وزیر حسن کے نام سر فہرست ہیں۔ بعد میں اودھ چیف کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں بھی پنڈت جگت نرائن ملا، چودھری خلیق الزماں، سید علی ظہیر، محمد وسیم نامور ہوئے۔ سر وزیر حسن تو چیف جج ہو گئے تھے۔

تعلیم کے میدان میں الہ آباد کی اولیت مسلّم ہے۔ اعلا انگریزی تعلیم کے لیے سب یہیں جاتے تھے۔ بعض طلبا تو ابتدائی سطحوں پر بھی یہیں زیر تعلیم رہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی بعد میں وجود میں آئی۔ والد مرحوم سید علی امجاد صاحب افسر نے یہیں ابتدائی انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بھی پہلے جائیے تو کلکتہ یونیورسٹی ہی شمال کا مرجع تھی۔ خود میرے چچا سید حسن امداد صاحب مرحوم نے ایف۔اے (انٹر میڈیٹ) کا امتحان فیض آباد کے کاربس کالج سے پاس کیا تھا لیکن امتحان کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے لیا گیا تھا ؎

پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ دراز عشق

الہ آباد تصوف کا بھی ایک بڑا اور اہم مرکز تھا۔ یہاں صوفیائے کرام کے سات دوائر مشہور اور مریدین کے ایک بہت بڑے سلسلے کے لیے جاذب توجہ تھے۔ انھیں میں دائرہ شاہ اجمل بھی ہے جس سے راقم حروف کو بھی عزیزانہ ربط ہے اور بعد میں یہ شرف بھی میرے لیے مقدم تھا کہ یہی میری سسرال بھی ہو۔ ان دوائر میں بڑا علمی اور ادبی کام ہوا ہے، تاریخ کو

جب لکھنؤ سے شہر بدر ہونا پڑا تو انھوں نے اسی دائرے میں میرے اعزائے
خاص کے یہاں پناہ لی اور اس واقعے کو اپنے اس شعر میں ہمیشہ کے لیے
محفوظ کر دیا۔ وہ یہاں شاہ افضلؒ کے مہمان ہوئے جو خود اُردو و فارسی کے
خوش گو شاعر تھے۔

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

سیاسی اعتبار سے یہ جنگِ آزادی میں حصّہ لینے والوں کے لیے مرکزی نقطہ تھا۔ آنند بھون اور سوراج بھون کو کون بھول سکتا ہے؟ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو تو قومی ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے الہ آبادی عزیزوں میں مولانا شاہد فاخری صاحب (سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل) نے خود جہادِ آزادی میں حصّہ لیا۔

پنڈت نہرو کی صدارت کانگریس کے دور میں سجاد ظہیر، کنور محمد اشرف محمود الظفر اور راج نرائن، کیسکر وغیرہ کا ایسا مجمع تھا جس سے کانگریسی اشتراکیت کو بھی فروغ ملا اور نوجوانوں کی جدوجہد آزادی میں شمولیت کا بھی۔ باہر یونیورسٹی میں پروفیسران، اعجاز حسین، ضامن علی، احتشام حسین اور محمد عقیل نے اپنے لیے تاریخ ادب میں مستقل جگہ بنالی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشینوں میں شاہ سید اکمل اجملی ماشاء اللہ ادیب، شاعر اور محقق ہیں۔ ان کے بڑے بھائی اجمل اجملی ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود متصوفانہ اثرات کی پرچھائیاں ان پر بھی پڑتی رہی ہیں۔ افسوس کہ ان کے بڑے بھائی شاہ محمد افضل اور خود بھائی اجمل بھی رحمت حق سے پیوست ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔ تفصیلات میں جانے کا یہ محل نہیں ہے۔

صرف اپنے وطن الہ آباد سے تعلقات کے سلسلے میں اس کا ذکر آ گیا لیکن یہ ذکر نامکمل رہے گا اگر اکبر الہ آبادی اور الہ آبادی امرودوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ذائقہ شعر و سخن ہو یا ذائقہ کام و دہن' الہ آباد دونوں کی شناخت ہے۔

بنارس اپنے اطلس و کمخواب کے لیے ہی نہیں بلکہ بنارسی ساڑیوں کے لیے بھی نام پیدا کر چکا ہے۔ یہاں کی بنارس ہندو یونیورسٹی، ہندوستان کی مایہ ناز یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اُردو، فارسی اور عربی کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ ان میں ڈاکٹر عشرت، حکم چند نیر، پروفیسر بدرالحسن عابدی اور مولانا سلیمان عباس سے ذاتی دوستیاں یا قرابتیں تھیں۔ انھوں نے ادبیات فارسی و عربی اور اُردو میں سرگرم حصّہ لیا۔ لیکن خطوطِ غالب کی تدوین کے سلسلے میں مولوی مہیش پرشاد نے شہرت عام حاصل کی۔ سنسکرت کا یہ سب سے بڑا اور مسلّمہ مرکز ہے۔ حزیں نے برہمنوں کو کچھ اس انداز سے خراجِ عقیدت پیش کی کہ ابھی تک اس کا جواب نہ ہو سکا ہے

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

ہمارے ڈرامائی ادب میں آغا حشر کاشمیری اور رونق بنارسی نے اس صنفِ ادب کی آبیاری میں باقی رہ جانے والی شہرت پائی۔ الہ آباد اور بنارس کے کئی شعرا، شاعروں اور مقاصدوں کے سلسلے میں ہمارے وطن آتے رہتے ہیں۔ ان میں بسمل الہ آبادی، نذیر بنارسی اور حکیم کاظم بنارسی کی یادیں ابھی تازہ ہیں۔ ریاست کی سیاست میں سمپورنا نند اور پنڈت کملا پتی ترپاٹھی وزارتِ اعلیٰ تک پہنچے۔ دونوں کو صحافت سے بھی خاص شغف تھا۔ ترپاٹھی جی کے خاندان کو خاندانِ مغلیہ میں سنسکرت کی تدریس کا بھی علاقہ رہے۔ سمپورنا نند کا نام ہندی کے سائنس فکشن کے سلسلے میں بھی لیا جاتا ہے۔ بنارس سنسکرت زبان و ادب کی تعلیم کا بھی بڑا مرکز ہے۔ یہاں عربی کے بھی کئی اہم جامعات ہیں، نام کہاں تک گنائے جائیں۔ ہمارے وطن کے بہت سے طلبا، یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ودیا پیٹھ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے لال بہادر شاستری جیسا فرزند پیدا کیا جو ہندستان کا وزیر اعظم بنا۔ شاستری جی مجھ جیسے فقیروں سے بھی برادرانہ ملتے تھے۔

غرض یو۔پی کے ایک گوشے میں واقع اعظم گڑھ، بالخصوص محمد آباد کہاں کہاں سے فیض حاصل کرتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ یک طرفہ ہرگز نہیں تھا۔ علم اور ثقافت کی دُنیا لین دین کی دُنیا ہے کسی کونے میں بند نہیں ہے۔ اسی علم و ادب و ثقافت کے سرچشموں سے سیراب محمد آباد گہنہ میں میرا دادیہال ہے۔ لیکن میری ولادت یہاں سے پانچ میل دُور واقع میرے نانہال کرہاں میں ہوئی۔ کیونکہ ہمارے اطراف میں یہ عام رواج ہے کہ پہلی ولادت دادیہال میں نہیں بلکہ نانہال میں ہوتی ہے۔

ہجرتیں اور ترک و ریاض

ابھی کچھ دیر پہلے الہ آباد میں تصوّف کا ذکر آ چکا ہے۔ میرے دادیہال اور نانہال دونوں ہی کی تاریخ میں ہجرتوں اور ترک و ریاض کا ایک

سلسلہ چلتا رہا ہے۔ وہ دور اب ختم ہو گیا، لیکن اس کے اثرات بالکل زائل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ اعتراف غزل کے ایک شعر میں ارتجالاً آ گیا تھا ؎

دوستوں نے اس کو عرفان و تصوف کہہ دیا
یاں فقط ذوقِ سماع و چشمِ نم رکھتا ہوں میں

لیکن ایک ربطِ تصوف سے میرے بزرگوں کے یہاں برابر رہا ہے۔ ناخہال ایک گھنے جنگل کرہان کے نام سے حضرت میر شمس الدینؒ (عرف میر شمسی) کے فیضِ قدم سے آباد ہونا شروع ہوا۔ حضرت میر شمسی علیہ الرحمۃ کا سالِ وصال (۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء) ہے۔ غنی مادّۂ تاریخ ہے۔ یہ آج ایک بڑا گاؤں بن گیا ہے۔ ان کا مزار مرجع عوام و خواص ہے اور راہِ ترقی پر گامزن ہے ان کا تعلق محمد آباد گہنہ کے ایک صاحبِ جائداد خاندان سے تھا لیکن ابتدا سے ترک و ریاض کا رجحان تھا۔ آخر ایک روز شہری زندگی سے عاجز آ کر ترکِ وطن کی ٹھان لی اور جنگل کی راہ لی۔ ان سے کئی کرامتیں مشہور ہیں۔ ایک کا تعلق خود ورودِ کرہان سے ہے۔ روایت ہے کہ بے پایاں جنگل کی راہ طے کرتے کرتے رات ہو گئی۔ چاروں طرف سناٹا اور ہُو کا عالم۔ یکایک دُور کسی چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو نظر آئی۔ سوچا شاید یہاں کوئی شخص ہو۔ اُدھر کا رُخ کیا ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ایک جھونپڑی نظر آئی۔ قریب گئے تو صرف ایک بڑھیا وہاں موجود تھی۔ اُس سے کہا کہ "میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ اجازت ہو تو سامنے اپنی چٹائی بچھا کر نماز ادا کر لوں۔" اس نے بخوشی اجازت دے دی۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو بڑھیا نے آگے بڑھ کر لجاجت سے کہا۔

"میرا لڑکا بارہ سال سے غائب ہے۔ میری ساری کائنات ہے۔ آپ بھگوان سے دُعا کریں کہ وہ مل جائے۔"

آپ نے تسکین دی اور کہا کہ "فکر نہ کرو۔ جلد مل جائے گا۔" پھر رات کو محوِ اورادو وظائف ہو گئے اور آنکھ لگ گئی۔ صبح سویرے بڑھیا نے کسی کے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سُنی۔ دیکھا کہ کھویا ہوا لڑکا سامنے تھا۔ دوڑ دوں سے رو پڑی۔ میر شمسی صاحب بھی اُٹھ گئے اور تھوڑا سا پانی لے کر پہلے وضو کیا پھر نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد آگے چلنے کی اجازت چاہی۔ بڑھیا قدموں پر گر پڑی اور کہا کہ یہاں سب کچھ آپ کا ہے۔ ہم سب غلام ہیں۔ اب آپ کو یہاں سے کہیں نہ جانے دیں گے، آپ یہیں رہیں اور پوجا پاٹ کریں۔ اس طرح کرہان کی بُنیاد پڑی۔ میرے پرنانا

آزر حسین قتیل نے اُن کے ترکِ مکانی کے واقعے کی طرف مثنوی میں سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے:

قصبے سے جو دل نے رنج پایا جد نے یہ مقام آ بسایا
حج سات کیے ہیں ایک دم سے طے راہ یہ کی فقط قدم سے

اُس زمانے میں جب سفر کی سہولتیں مہیا نہ تھیں، سات حج پیادہ پا کرنا معمولی ریاض نہ تھا، جلد ہی ان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی، اور کرہان آباد ہونے لگا۔

وادیہال سے ترک و ریاض و ہجرت کا ایک سلسلہ رہا ہے۔ اس موقع پر مجھے حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "سب سے مضبوط تعلق وہ ہے جو آدمی اور خدا کے مابین ہے۔" اور سب تعلقات ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔ ہمارا خاندان ہمیشہ سے محمد آبادی نہیں تھا، ہم یہاں مہاجرانہ آئے یہ ہجرت در ہجرت تھی۔ ہم سادات زیدی مدینۂ منوّرہ سے عراق کے قصبے واسط، وہاں سے خُشکی کی راہ سے ایران و افغانستان کو منزل بناتے، لاہور میں ٹھہرتے، ہر طرح کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرتے، آج سے صدیوں پہلے شیرازِ ہند، جون پور میں وارد ہوئے۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ حضرت سید کمال صاحبِ کشف بڑی برگزیدہ ہستی گزرے ہیں۔ ہمارے ایک دُور کے عزیز حاجی مولوی سید علی اکبر اکبر مرحوم کیدلی پوری لکھتے ہیں ؎

جد میرے تھا کمال جن کا نام معتقد جن کے خاص تھے اور عام
ورع و زہد کا ہُوا جو ظہور صاحبِ کشف ہو گئے مشہور
مورثِ خاندان تھے حضرت
معدنِ عزّ و شان تھے حضرت

(رسائل جعفریہ۔ طبع سوم، ۱۹۲۲ء)

عزّ و شان کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں ترک و ریاض کا جذبہ بہت قوی تھا۔ یکایک جون پور کی سکونت ترک کر کے ایک اُجڑے ہوئے گاؤں بجوکی میں قیام کیا۔ کچھ دنوں بعد خاندان والے نسبتاً آباد تر گاؤں کیدلی پور ضلع اعظم گڑھ میں جا بسے۔ میرے پردادا کے والد مولانا سید عبدالولی کی شادی محمد آباد گہنہ میں جدید نقلِ مکانی کا سبب بنی اور مجھ تک پانچویں پشت وہیں گزر رہی ہے۔

تہران اور بمبئی میں رہنے کے بعد پھر لکھنؤ پلٹ آیا ہوں لیکن وہ وسیع و عریض، نقش نمایاں سے بسا محمد آبادی مکان آج بھی میرے اصلی مکان سے عبارت ہے

یہ کہانی کچھ ہماری ہی نہیں ہے بلکہ گاؤں سے قصبوں اور قصبوں سے شہروں کی طرف ہجرت کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں ہے۔ ہمارے ہی خاندان کی ایک شاخ غازی پور ڈنگولی چلی گئی تھی۔ ان کے اخلاف میں پروفیسر سید امیر حسن عابدی فارسی و عربی کے عالم اور فارسی جدید کے ماہر ہیں۔ ہندی فارسی گویوں پر ان کا تحقیقی کام بہت دقیع ہے۔ پروفیسر مونس رضا دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور جغرافیہ کے علم میں استاد کا درجہ رکھتے تھے (افسوس کہ وہ آج ہم میں نہیں ہیں) ان کے بھائی پروفیسر مہدی رضا بھی علی گڑھ کے شعبۂ جغرافیہ کے صدر رہے ہیں اور اب علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔ ان دونوں کے بھائی راہی معصوم رضا نے شعر و ادب میں ہندی، اُردو اور فلمی دُنیا کو مالامال کیا۔ خصوصاً فلم مہا بھارت میں ان کے گانوں اور مکالموں نے تو دُھومیں مچادیں۔ (انھوں نے بھی داغِ مفارقت دے دیا)۔ ط

چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

اگر تمام بکھری ہوئی داستانوں کو سمیٹا جائے تو ہماری قرابت گورکھ پور کے مشہور خانوادہ سادات "سبز پوش" میں بھی ہے۔ آخری دور میں ان کے خاندان کے نمایاں فرد سید ناہد سبز پوش تھے۔ اُن کے صاحبزادے کاظم صاحب مرحوم کو ہمارے محلے شیخ واڑہ کی زہرہ بہن (مرحومہ) ان کو منسوب تھیں — میرے ماموں زاد بھائی سید خورشید احمد مرحوم (مدیر نیا دور لکھنؤ) کی شادی میں کبر سنی کے باوجود، ماموں جان کے قرابت دارانہ خلوص کا پاس کرتے ہوئے کرہان سے غازی پور تک کا سفر بنفسِ نفیس طے کیا۔ ماموں جان کے اصرار پر میں نے شادی کے سلسلے میں ایک مخمس "ساقی نامہ" فی البدیہہ لکھا اور زاہد صاحب کا ذکر بھی ایک بند میں کیا ؎

سبز پوشے کہ دریں بزم نظر می آید
نہ بزاری نہ بزور و نہ بزر کا آید
بل ز شوقِ دل و اخلاصِ جگر می آید
چون ز کرہان خبرِ نغمہ اثر می آید
زاہدِ پاک کند خواہشِ جام اے ساقی!

اس مبتدیانہ مگر فی البدیہہ کلام پر بہت دل بڑھایا گیا۔ خود زاہد صاحب بہت مسرور نظر آرہے تھے اور انھوں نے بھی ہمت افزائی کی۔

بظاہر اس جمالیاتی اور رُوحانی فضا سے اثر لینے اور جدلیاتی فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں کتنا عجیب تضاد ہے لیکن زندگی ایک لمحے یا ایک دن یا ایک مقام میں نہیں بلکہ آہستہ آہستہ اور پُر پیچ راہوں سے گزرتی ہوئی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ اس میں تضاد نہیں مختلف الجہاتی ہے۔ فکری فضا میں بھی ٹھہراؤ نہیں بلکہ ارتقائی کیفیت ہوتی ہے۔ گرد و پیش کے اس سارے ماحول سے کوئی بے نیازانہ کیسے گزر سکتا ہے۔ نہایت ڈھلوان پتھریلی زمینوں سے تیزی سے اُترتا پانی بھی سطح پر کچھ تری چھوڑ ہی جاتا ہے۔ میرے اس سفرِ حیات کا یہی منظر نامہ ہے۔

ولادت

اسی پورب دیس اور اس کے مردم خیز خطے کے ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں ہوئی جس کا وجود تصوف کا مرہونِ منت ہے۔ نانا سید علی جعفر ذکا کے یہاں پہلا نواسہ پیدا ہوا اور سید کمال صاحب کے خانوادے میں ایک پوتا۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہوئی کہ بعض لکھنے والوں نے یہ جان کر کہ محمد آباد گہنہ میرا وطن ہے، اسی کو میری جنم بھومی تصور کرلیا تھا۔ میری ولادت ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو علی الصباح اسی ساڑھے تین سو برس پرانے گاؤں کرہان میں ہوئی جب بندوقیں داغی گئیں۔ یہ جاگیردارانہ روایت شکر ہے کہ اب ختم ہو گئی ہے۔ میرے دادیہال محمد آباد گہنہ کے محلہ سید واڑہ میں واقع میرے دادا سید علی حماد صاحب ڈپٹی کلکٹر کے گھر اطلاع پہنچائی گئی۔ دادی صاحبہ پہلے سے موجود تھیں، دوسرے قریبی اعزا بھی جلد آ گئے۔ مبارک سلامت کا شور اُٹھا۔ میر شمسی صاحب کے مزار پر چراغ جلائے گئے اور نذر ہوئی۔ گاؤں کی اجتماعی زندگی میں یہ بڑا واقعہ تھا کیونکہ کرہان کے بانی میر شمسی کے گھر میں خوشی ہوئی۔ گھر گھر سے گانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پورے گاؤں نے ایک بڑے خاندان کی طرح جشن منایا۔ اس میں مذہب و ملت اور چھوٹے بڑے کی، ذات پات کی تفریق نہ تھی۔ آج ہم سیکولرزم کی باتیں بہت کرتے ہیں لیکن ان معصوم خوشیوں کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں جو اجتماعی ہم آہنگی کا نتیجہ تھیں، سیاسی نعرے کا نہیں!

تاریخِ ولادت کی داستان الگ ہے اور تعلیم کے سلسلے میں اختلافِ روایات کا ذکر آئے گا جو شاید سنینِ ولادت و وفات کے ذکر میں بال کی کھال نکالنے والوں کے کام آئے، شاید!

□□

حاشیہ: لہ آزادی کے بعد بنارس کا نام بدل کر وارانسی کر دیا گیا لیکن عوام کی زبان پر اب بھی بنارس ہے۔

غزلٰ نمبرتین

یہی نہیں کہ "وہ" ہے اور شش جہات میں ہے
نہیں کچھ اس کے سوا، جو بھی کائنات میں ہے

اسی میں "ذات" کا اس کی پتا چلے گا تجھے
وہ عکس دیکھ جو آئینۂ صفات میں ہے

ہے بے خبر وہ حقیقت سے زندگانی کی
گھرا ہوا جو ہجوم تفکّرات میں ہے

ہے آرزوؤں کی پاکیزگی کا نام حیات
وہ ترکِ زیست ہے جو ترکِ خواہشات میں ہے

وہ بات آج نظر آتی ہے جو ناممکن
بلوغِ عقل بتائے گی ممکنات میں ہے

کسی کے خونِ جگر کی، کسی کے اشکوں کی
چمک ہے یہ، جو بظاہر جواہرات میں ہے

ہر ایک بات میں نشتر، ہر اک نگاہ میں تیر
یہ کیسا زہر ترے جامِ التفات میں ہے

اُسے بھلانے کو اک عمر چاہیے یارو!
ابھی جو منزلِ ترکِ تعلقات میں ہے

تلاش جسم کی جس کے تو کرتا ہے ناداں
چھپا ہوا وہ خود اپنے نگارشات میں ہے

جو ساتھ یاروں کے ہے بے تکلفی میں مزا
کہاں وہ بات، برادر، تکلفات میں ہے

ہے اُن پہ غور کی فرصت کہاں ولی کو ابھی
ابھی تو کھویا ہوا وہ مشاہدات میں ہے

پروفیسر ولی الحق انصاری
۲۷۔ فرنگی محل، لکھنؤ ۔ ۳

لہ اس سلسلے کی پہلی دو غزلیں جون ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھیں —— ایڈیٹر

غزل

تبصرہ یوں نہ مرے حال پہ اتنا ہوتا
اس کو نزدیک سے دنیا نے جو دیکھا ہوتا

کوئی مرتے ہوئے لمحوں کا مسیحا ہوتا
کربِ تنہائی کا احساس نہ اتنا ہوتا

یہ جو آہٹ کی طرح ساتھ مرے رہتا ہے
بن کے تصویر کبھی سامنے آیا ہوتا

میں کہ جیسا ہوں بہر حال نظر میں رہتا
مجھ کو احساس کی نظروں سے تو دیکھا ہوتا

دے گیا جو مجھے تپتے ہوئے لمحوں کا گداز
کاش وہ درد مرے واسطے تنہا ہوتا

ایسا لگتا ہے دوبارا نہ ملے گا مجھ سے
اس طرح ٹوٹ کے وہ یاد نہ آیا ہوتا

کیا ملا جاگ کے بتلائیے شبنم صاحب!
اس سے اچھا تھا کوئی خواب ہی دیکھا ہوتا

شبنم نقوی
۱۸۷۔ ہمت گنج
الہ آباد

پروفیسر محمد حسن
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن - دہلی ۹ ۱۱۰۰۰

ہمدم یہی ہے رہگزرِ یارِ خوش خرام

دورِ آصفی: مغل شہزادے اظفری کی نظر میں

لکھنؤ جو سینوں میں آباد ہے سفینوں میں کہاں! صفحے کے صفحے سیاہ کرتے جایئے، پھر بھی اس دیار کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں اُبھرے گی جسے زندگی بھر عزیز رکھا اور جس پر ایک دو نے نہیں سینکڑوں نے جان و دل نثار کیے ان میں ہر کوئی اپنے اپنے لکھنؤ پر فدا رہا اور ان مختلف شہروں کے نگارخانے سے رنگ و نور چُرا کر اپنا لکھنؤ بسانا بڑے جوکھم کا کام ہے کہ زندگی کسی ایک لمحے کے لیے دم لینے کے لیے بھی نہیں رُکتی۔

وہ لکھنؤ جو ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک مجھے پناہ دیے رہا آج کے لکھنؤ والوں کو شاید اجنبی سا لگے مگر کیا کروں، میرا لکھنؤ وہی ہے نول کشور پریس سے لے کر دین دیال روڈ اور فرنگی محل تک پھیلا ہوا یہ قطعۂ زمین لہجے کی کیسی نرمی، احساس کی کیسی گرمی، علم و فضل کی کیسی خنک چاندنی اور حرکت و عمل کے کیسے اضطراب کا نام تھی اب اس دُنیا کو کوئی پھر سے بازیافت کرے تو کولمبس کہلائے یا بالزاک کا سا قلم کار! افسوس کہ اس دیار کو چاہنے والے تو بہت سے ملے کوئی ایسا مصور نہ ملا جو اس کی اداؤں کا رمز شناس ہوتا اور اس کے شیوۂ محبوبی کو دیکھ اور دکھا سکتا۔

جب سورج آصف الدولہ کے امام باڑے کی اوٹ میں ہو جاتا ہے جب چاند گومتی کے گھاٹ پر اپنی جلوہ سامانی بکھیرتا ہے، جب صبح شاہ نجف کے سبزہ زاروں پر طلوع ہوتی ہے جب علی گنج کے مندر کے لیے یاتری پری کرما کرتے ہوئے رواں ہوتے ہیں، جب چوک کا تھکا ہارا بازار پھولوں کی تازگی اور گھنگھروؤں اور طبلے کی جھنکاروں کے ساتھ پھر سے جاگتا ہے، جب شام کا لہرانت نئے رنگ و آہنگ سے امین آباد میں گونجتا ہے جب حضرت گنج کے بازار روشنیاں، ارمانوں اور حسرتوں سے آباد ہوتے ہیں تو ان کا رمز شناس کوئی نہیں ہوتا۔

پھر کوئی ہلکے سے میرے شانے جھنجھوڑتا ہے کہ کس خواب میں کھو گئے، آج کے لکھنؤ کی بات کرو، جہاں آئے دن اس قسم کے فسادات ہوا کرتے ہیں۔ جن کا ذکر بھی تم نے اپنے زمانے کے لکھنؤ میں نہیں سنا تھا۔ رستوگی ٹولہ جہاں تمہارے جگری دوست گوکل چند رستوگی کا گھر تھا جو اُردو کے شاعر اور مضمون نگار اور افسانہ نگار وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ وہ دین دیال روڈ کا چوراہا جس سے آگے بڑھ کر تمہارے ہم جماعت سریشور دیال سکینہ جو اُردو کے شعر بھی کہتے تھے اور تمہارے ساتھ مل کر رسالہ "مضراب" بھی نکالتے تھے یہیں کہیں تو رہتے تھے مگر اب وہ سب کہاں، ان کا ذکر کرنے والے بھی کہاں

اب ڈھونڈیئے تو اس کا نشاں بھی نہ پایئے
وہ موج جو سفینۂ دل کو ڈبو گئی

جی! تو میں جس لکھنؤ کے بارے میں لکھتا ہوں وہ اپنے من میں بسا ہوا لکھنؤ ہے مگر ایسا ہرگز نہیں کہ یہ محض من مانی داستان ہو یا محض تخیل کے پردے پر بنائی ہوئی تصویریں — یقین مانیے، ایسا لکھنؤ تھا۔

مگر ایسا لکھنؤ کیوں تھا؟ مہذب، شائستہ، متمدن۔ جہاں کے یکے والے بھی آپ، جناب، سے بات کرتے ہیں اور بھڑ بھونجے تک تمیز اور سلیقے کے پیکر ہیں (رہا تھے) آج تک یاد ہے، مگر بات زیادہ نہیں صرف پچیس سال پُرانی ہے۔ امین آباد سے چوک یکے شاید چار آنے سواری لے جایا کرتے تھے یکے والا بار بار آواز لگاتا تھا۔ ایک صاحب جھنجھلائے ہوئے ادھر سے گزرے، یکے والا سمجھا انہیں کہیں جانا ہے۔ فوراً لپکا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"جہنم۔"

اُس نے برجستہ کہا: "آیئے۔ پہیے کے نیچے۔"

خیر۔ یوں تو لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کے قصّے قصیدے بہت لکھے گئے، اور لکھے جاتے رہیں گے گو اب یہ قصیدے بھی اُدھورے رہ گئے ہیں اور ان کے

دُہرانے والی آوازیں بھی بیٹھ گئی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ اس تہذیب کا آخری مستقر تھا جو ہندوستان میں قدیم ہندوستانی، ایرانی اور مغربی (انگلستانی اور فرانسیسی) عناصر سے مل کر اُبھر رہی تھی اور جسے انگریزی حکمرانوں اور مورخوں نے مسلمانوں کی جھولی میں ڈال کر اپنے خیال میں بُرا نام دیا (یا بدنام کیا) اور پھر پھانسی پر لٹکا دیا۔ انگریزی ہی کی ایک مثل ہے کہ کتے کو بُرا نام لے کر پھانسی پر لٹکا دو۔ یہ اور بات ہے کہ اس دور میں بھی ہارٹ کورٹ بٹلر جیسے گورنر مشرقی لباس اور لکھنوی آداب کو اپنائے رہے ؂

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

اور اب لکھنؤ کا حال جگرمرادآبادی کے لفظوں میں وہ ہے ؂

اپنی ہی وفا یاد نہ غیروں کی جفا یاد

اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد

یادوں کے اسی بکھرے اُجڑے ذخیرے سے ایک پُرانی یاد ڈھونڈتا ہوں
زمانہ نواب آصف الدولہ کا ہے، سنہ ہجری ۱۲۰۴، ربیع الثانی کی آخری تاریخ کو دلی سے ایک شہزادہ لال قلعے کی قید و بند سے فرار ہو کر لکھنؤ پہنچا ہے
وضاحت کے طور پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ جہاں دادا شاہ کے زمانے سے (جو اس شہزادے کے جدِ امجد تھے) یہ روایت شروع ہوئی تھی کہ ہر اُس شہزادے کو قید میں رکھا جاتا تھا جو حکومت کا دعوے دار ہو سکتا ہو۔ انھیں لال قلعے میں مقید کر دیا جاتا تھا اور اس قید خانے کا نام ہی "سلاطین" سے موسوم ہو گیا تھا ان شہزادوں کی قید میں بھی نگرانی کی جاتی تھی۔

"عنایت رسول خاں خواجہ سرا ہماری ڈیوڑھی کا نائب ناظر تھا..... حکم شاہی سے، ہمیں دیکھنے اور سلام کرنے کے لیے روزانہ دروازے پر حاضر ہوا کرتا تھا..... محل دار بیگم کی طرف سے نائب کے طور پر ایک عورت مقرر ہے جو سلاطین کے محلوں میں جاتی آتی ہے۔ ہم کسی حالت میں ہوں، رات اور دن میں چار مرتبہ ہمیں اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور ہمارے محل کے اندر کی ہر اچھی بُری بات کئی بار حضور میں لکھتی ہے..... ہم سلاطین کی ڈیوڑھیوں کا یہ بھی معمول تھا کہ تین پہر کو دن ڈھلے بند ہو جاتی تھیں اور ہر دروازے میں اندر اور باہر تین تین قفل لگا دیے جاتے تھے، ان کی کنجیاں ناظر محل کے پاس بھیج دی جاتی تھیں جس کا نام منظور علی خاں تھا۔" (ص ۲۴)

اِس قید و بند کے دوران ہی غلام قادر روہیلا کا غلغلہ لال قلعے میں برپا ہوا، اور اس ہنگامے کے چند روز بعد ہی میرزا محمد ظہیر الدین علی بخت (اظفری دہلوی گورگانی (ولادت ۱۱۷۲ھ) تیس سال کی عمر میں قید سلاطین سے فرار اختیار کرتا ہے، جس کی انتہائی دلچسپ خود نوشت تفصیلات سے گریز کیا جاتا ہے۔ پہلے جے پور اور جودھ پور کا سفر کیا اور وہاں کے مہاراجاؤں کے مہمان رہے پھر براہِ رام پور لکھنؤ پہنچے۔
زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔

ان کا یہ سفر اور آصف الدولہ کی میزبانی دونوں یادگار ہیں اور اس دور کی تہذیب معاشرت، رکھ رکھاؤ اور مشاغل پر روشنی ڈالتے ہیں، اس لحاظ سے یہ بیانات نہایت قابلِ قدر شہادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں: (اصل عبارت فارسی میں ہے اس کا اُردو ترجمہ عبدالستار صاحب نے کیا ہے جس کی اصلاح اور نظرِ ثانی محمد حسین محوی صدیقی نے فرمائی ہے اور اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی نے مارچ ۱۹۳۷ء میں مع اضافہ حواشی کے شائع کیا ہے):

"جیسے ہی ہم لکھنؤ پہنچے، مہاراجا جھاؤ لال نے آکر نہایت ادب کے ساتھ نواب وزیر کی آداب و تسلیمات پہنچائی۔ گئو گھاٹ کے پاس ہمیں اُتارا۔ جہانی بھیجی۔ لکھنؤ کی گلیاں اور بازار، زمین اور عمارتیں، کیچڑ اور رستوں کی تنگی، زمین کی پستی و بلندی کے لحاظ سے جے پور سے بالکل برعکس ہیں۔ نواب وزیر نے اگرچہ بے نظیر عمارتیں بنوائی ہیں، لیکن اس شہر کی افتاد ہی دراصل کچھ ناموزوں جگہ پر پڑی ہے۔ البتہ آبادی درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہے۔ ہر فن کے صاحبِ کمال موجود ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے ایک سال بعد ہم نے اپنے گھر والوں کو بھی شاہجہاں آباد دلی سے یہیں بُلوا لیا اور بہت آرام اور عزت سے رہنے سہنے لگے۔"
(ص ۷۸)

"نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر اور ان کے نائب سرفراز الدولہ ناظم الملک مرزا حسن رضا خاں بہادر ظفر جنگ نے ہماری دلداری اور خاطر مدارات کی حد کر دی، نہایت شائستہ

خدمت کی اور عمدہ سلوک سے پیش آئے، لکھنؤ میں دو کم مہینے کم سات سال سکونت رہی ہم میں اور ان میں میل جول اور محبت انتہائی حد کو پہنچ گئی تھی دو سال تک ایک ہی تودے پر تیر اندازی کرتے رہے ... فن تیر اندازی میں، میں اور میرے بھائی میرزا جلال الدین نواب وزیر کے شاگرد ہوئے۔"

——— (صفحہ ۷۹)

یہ تو ہوا مشاغل کا حال۔ حیرت یہ ہے کہ افراد کے بارے میں اَطفری بڑی جچی تلی رائے رکھتا ہے۔ نواب آصف الدولہ کے بارے میں لکھتا ہے:

" نواب آصف الدولہ بہادر واہی تباہی باتوں اور کھیل کود میں مشغول رہنے کے باوجود جواب برجستہ اور "ماقل و دل" چھا تلا دیتے ہیں کہ مدعی ساکت رہ جاتا ہے اور دم تک نہیں مارتا۔"

اس محاکمے میں نواب آصف الدولہ کے کردار پر بہترین تبصرہ ہے۔ واقعات انھوں نے کئی نقل کئے ہیں جن سے نواب آصف الدولہ کی ذہانت اور خوش طبعی و برجستگی ظاہر ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ "واہی تباہی باتوں اور کھیل کود میں مشغولیت" کا تذکرہ اَطفری کی امور جہاں داری سے باخبری سے واقفیت کی دلیل ہے، یہی نہیں، وہ اس مختصر سی یادداشت میں انگریزوں کے بارے میں جس بصیرت اور پیش بینی کا ثبوت دیتے ہیں وہ ابوطالب لندنی کے علاوہ اس دور میں شاید کسی کے ہاں ملے (تفصیل کے لیے صفحہ ۱۸۱ دیکھیں)۔ اس قسم کی برجستہ گوئی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

" سُنا ہے کہ جس وقت شاہزادہ میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ ولی عہد مرحوم قلعہ مبارک سے فرار ہو کر نواب وزیر کے پاس لکھنؤ پہنچے تو دونوں میں بہت محبت ہو گئی نواب نے ان کے ساتھ لاکھوں کا سلوک کیا .... شاہزادہ اور نواب وزیر رات دن قسم قسم کے کھیل تماشوں میں ساتھ ساتھ رہتے تھے خصوصاً اکثر باہم یاد فراموش کی شرط باندھتے تھے، چند سال بعد شہزادہ موصوف نواب وزیر کی رضامندی حاصل کیے بغیر اپنے قبائل کو لینے کے لیے دہلی چلے گئے۔ یہ بات نواب کو ناگوار گزری۔ ... ایک دن اسی رنج و کدورت کی حالت میں شاہزادے نے الائچی کے چند دانے وغیرہ نواب وزیر کے ہاتھ میں دیئے نواب وزیر نے تسلیمات بجا کر لے لیے اور یاد و فراموش کی شرط فراموش کر دی۔ شاہزادے نے فرمایا:

" نواب بھائی فراموش"۔

فوراً نواب وزیر نے جواب دیا: " انشاءاللہ اب سے عمر بھر کے لیے فراموش"۔

نواب وزیر کا یہ ملال انگیز جواب سُن کر شاہزادے باہمی صفائی سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو گئے اور چند مہینوں کے بعد بنارس چلے گئے۔ چند روز بعد بنارس ہی میں انتقال کیا"۔ (ص ۸۲)

دوسرا واقعہ نواب وزیر اور ان کے نائب کی صحبت سے متعلق ہے اس موقع پر آفریں علی خاں خواجہ سرا بھی موجود تھے جن کے بارے میں اَطفری نے لکھا ہے کہ بعض اوقات بہت ظریفانہ بات کہہ دیا کرتے تھے اور یہ عالم تھا کہ جو کچھ زبان پر آ جاتا، بے تحاشہ کہہ ڈالتے۔

" ایک روز کا ذکر ہے کہ تیر اندازی ہو رہی تھی۔ راقم بھی اس مشغلے میں شریک تھا اور خواجہ سرائے مذکور بھی۔ وہ بہت دُبلے پتلے اور کمزور آدمی تھے مگر تیر اندازی میں اکثر شرکت کیا کرتے تھے، ان کا تیر کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے بہت دُور نہیں جا سکتا تھا۔ سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر ظفر جنگ نائب وزیر ... نہایت جوان، قوی ہیکل تھے، ان کا تیر ٹھیک نشانے پر لگتا اور خوب تحسین و آفرین ہوتی تھی، اس وجہ سے نواب وزیر وغیرہ خواجہ سرائے موصوف کے تیر کی سُست رفتاری پر ہنستے اور بہادر موصوف کی تیر کی چستی پر بے اختیار شاباشی فرماتے تھے ایک روز آفریں علی خاں خواجہ سرا نے پیچ و تاب کھا کر نواب وزیر سے ظرافتاً کہا کہ نواب صاحب! آخر انصاف تو فرمایئے۔ میں بھی آپ کا غلام ہوں اور یہ حسن رضا خاں بھی۔ پھر کیا معنی کہ آپ میری تحقیر کرتے ہیں اور اس تبیل کی تعریف فرماتے ہیں۔ بظاہر تو اتنا ہی فرق ہے کہ میں بہت دُبلا پتلا ہوں اور حسن رضا بہت موٹا ہے۔ نواب وزیر نے برجستہ جواب دیا:

" ہاں ہاں۔ اتنا ہی فرق سمجھنا چاہیئے"... جواب کا مطلب

"یہ تھا کہ میرا نائب تجھ سے ظاہر میں جسامت و عظمت رکھتا ہے
اسی قدر مرتبے میں بھی تجھ سے بلندی و امتیاز رکھتا ہے۔"

اسی طرح تیر اندازی کی محفل میں حکیم میر محمود علی خاں شریک تھے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور نواب شجاع الدولہ سے سمدھیانے کا رشتہ رکھتے تھے، ان کا تیر شست بے جڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نواب وزیر مسکرائے۔ میر صاحب نازک مزاج تھے، بگڑ کر بولے:

نواب صاحب! آپ ہنستے کیا ہیں۔ میں تو تیر اندازی صرف ثواب کی نیت سے کرتا ہوں، ورنہ میرا سن کب اس کا متقاضی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگلے بادشاہ حکیموں کو اپنا وزیر بنایا کرتے تھے، بس آگے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

نواب آصف الدولہ پیشانی پر شکن تک نہیں لائے اور فوراً جواب دیا کہ "ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ بے شک وہ اس مرتبے کی لیاقت بھی رکھتے تھے۔" اور منہ پھیر کر پھر اسی خوشی اور انبساط کے ساتھ تیر اندازی میں مشغول ہو گئے۔

اس سلسلے کے دو واقعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ سے متعلق ہے اور دوسرا اُردو کے مشہور شاعر میاں قلندر بخش جرأت کے بارے میں ہے۔

ایک روز نواب وزیر گھوڑے سے گر پڑے۔ آلفزی بھی عیادت کو گئے۔ وہ گومتی پار فوجدار خاں کے مکان پر بیٹھے تھے۔ آلفزی کو دیکھتے ہی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، ہر چند انھوں نے منع کیا لیکن نہ مانے پھر آگے بڑھے اور آلفزی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور خود ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اسی محفل میں توپیں ڈھالنے کا تذکرہ نکلا۔ یہ بھی ذکر آیا کہ مرزا سلیمان شکوہ نے دو تین توپیں تیار کر کے اپنی سرکار میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ ایک مصاحب نے مذاق سے کہا:

اچھا! اب مرزا سلیمان شکوہ بہادر خود اپنی سرکار کا توپ خانہ تیار فرماتے ہیں۔"

نواب وزیر نے غصّے سے اس کی طرف نگاہ کی اور فرمایا کہ آئندہ پھر کبھی ایسا نہ کہنا۔"

میاں جرأت کے بارے میں آلفزی لکھتے ہیں: (اُردو ترجمہ محوی صدیقی)

"ایک نوجوان نابینا شاعر جس کا تخلص جرأت ہے لکھنؤ میں ریختہ اور ہجو بہت گرم و شوخ ترکہتا ہے۔ کسی نے نواب وزیر کے حضور میں ایک روز اس کی تعریف اور سفارش کے طور پر عرض کیا کہ "جناب عالی نے سُنا ہوگا آج کل نابینا جرأت کو کیسے کیسے تازہ رنگین مضامین سوجھتے ہیں کہ دوسرے شاعروں کے گوشۂ دل میں کبھی ایسے مضامین کا گزر نہیں ہو سکتا۔" فوراً نواب وزیر نے جواب دیا: "اس کو مضامینِ شعر کے سوا اور سوجھتا ہی کیا ہے۔" (صفحہ ۸۵)

ایک اور خاصا عبرت خیز واقعہ شاہ حسین کتاب خوان سے متعلق ہے جو اسی زمانے میں ایران سے لکھنؤ آیا تھا اور ایرانی طرز پر موسیقی کے سبھی راگ بخوبی ادا کرتا تھا۔ محرّم کا زمانہ تھا، آلفزی بھی اس موقع پر موجود تھے، نواب آصف الدولہ کتاب "دہ مجلس" پڑھ رہے تھے۔ نواب کے مصاحبوں میں سے کسی شخص نے شاہ حسین کے وارد لکھنؤ ہونے کی اطلاع دی اور کہا:

"سنتے ہیں شاہ حسین اس وقت کس خوش الحانی اور دلکش انداز میں گا رہا ہے، اس فن میں وہ مہارت رکھتا ہے کہ شاید ولایت میں بھی اس کا نظیر کم ہوگا۔ خدائے تعالیٰ نے ایسے ممتازِ فن آدمی کو جناب عالی کے عہدِ مبارک میں، یہاں بھیجا ہے جس نے آں جناب کے طفیل سے ہم غلاموں کے سامع کو اپنے دلپذیر فنِ موسیقی سے اس قدر لذّت اندوز کیا۔" یہ سنتے ہی نواب وزیر نے جواب دیا: "یہ علم تو آپ ہی کو ہوگا۔ بندہ اس سے محض لاعلم ہے۔"

آلفزی لکھتے ہیں:

"ظاہراً نواب وزیر کا مزاج اس کتاب خوان سے کسی قدر مکدّر تھا ... جواب کی لطافت یہ ہے کہ سفارشی کا نسب ماں کی طرف سے ایک مغنی تک پہنچتا تھا۔" (ص ۸۵)

اس قصّے کا اختتام یہ ہوا کہ کتاب خوان مایوس ہو کر واپس چلا گیا، البتہ ہندستانی موسیقی کا پہلے بالکل قائل نہ تھا اور آخر میں اس کو اس قدر پسند کرنے لگا تھا کہ کہتا تھا: "بے شک! گانا یہ ہے جو ہندستان والے گاتے ہیں۔"

آلفزی اور آصف الدولہ کے باہمی تعلقات میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ

دکھاجاتا تھا اور کئی واقعات سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ یہاں صرف دو واقعات نقل کیے جاتے ہیں:

"ایک روز نواب وزیر نے عین ہولی کھیلنے میں مجھے بھی اپنے دولت خانے میں بلوایا۔ نواب موصوف نے لکھنؤ میں جو مکانات بنوائے ہیں، دولت خانہ ان میں سے ایک خاص مکان کا نام ہے، جیسے ہی میں پہنچا، آداب بجالائے اور استقبال کیا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھالیا نواب وزیر کے سارے دانت آغاز جوانی ہی میں شراب خوری کی کثرت کے سبب گر گئے تھے۔ منہ کسی قدر کھلا رہتا تھا اس لیے میں نے دیکھا کہ وہ اس وقت مخمل یا کسی اور چیز کا چھوٹا سا گیند منہ میں رکھے ہوئے تھے تاکہ عبیر اور گلال منہ میں نہ چلا جائے۔

اسی اثنا میں سرفراز الدولہ کے خلیرے بھائی شرف علی خاں نے رنگ سے بھرا ہوا ایک قمقمہ میری پیٹھ پر دے مارا۔ نواب وزیر نے آنکھ کے اشارے سے منع فرمایا۔ میں نے نواب وزیر سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائی جان! میں بار خاطر ہوں یا بر خاطر نہیں۔ ہولی کھیلنے آیا ہوں اس لیے منع نہ فرمائیے۔ کھیل کود خاص کر ہولی کے موسم میں آداب و لحاظ کو الگ رکھ دینا چاہیے ___ نواب وزیر نے جواب میں فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہاں ہر حالت میں ادب ضرور ہے۔ پھر میں نے بھی ایک قمقمہ اٹھا کر نواب کے سینے پر مارا اور کہا کہ اب تو میں نے پہل کی ہے آپ بھی بسم اللہ کیجیے۔ مسکرا کر چپ ہو رہے۔ میں نے پھر اصرار کیا تو فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے۔ یہ کام مجھ سے ہرگز نہ ہوگا۔ غرض وہ سب لوگ باہم ہولی کھیلتے رہے اور میں تماشا دیکھا کیا۔ جب میں قلعہ مبارک دہلی کی کوئی بات بیان کرتا تو کھیل چھوڑ چھاڑ کر بہت توجہ کے ساتھ سننے لگتے اور فرماتے کہ قلعۂ مبارک کے صاحبوں کے کلام میں ایک ایسی خاص لذت اور فصاحت کی چاشنی پاتا ہوں جو اور لوگوں میں نہیں۔"

(صفحہ ۸۷)

دوسرا واقعہ اس سے زیادہ دلچسپ ہے اور اس دور کے آئین و آداب پر روشنی ڈالتا ہے۔ اظفری لکھتے ہیں:

"میں لکھنؤ سات سال رہا۔ ہزاروں بار نواب وزیر کی سواری دیکھی لیکن کبھی ان کے سر پر مورچھل جھلتے اور چنور ہلاتے نہیں دیکھا۔ سنا ہے کہ جس روز سے دہلی کے شاہزادے لکھنؤ پہنچے نواب وزیر نے کہا، مجھے شرم آتی ہے کہ ان بزرگوں کے ہوتے ہوئے میرے سر پر مورچھل جھلا جائے، اب موقوف رکھو۔ مگر سواری خاص کی عماری اور آس پاس کے ہودوں پر مورچھل ہمراہ رہتے تھے۔ کم و بیش بیس ہاتھی ساتھ ہوتے تھے مگر جس ہاتھی پر نواب وزیر سوار ہوتے اس پر مورچھل نہ رکھا جاتا۔ یہ حکم صادر فرما دیا تھا کہ خواص رومال سے مگس رانی کیا کریں۔"

یہ ادنیٰ اظہار تھا دلی کی مرکزی حکومت سے وابستگی کا اور یہ اس وقت جب دلی کا بادشاہ محض اپنے اقبال و اقتدار کی پرچھائیں ہو کر رہ گیا تھا۔ اظفری آگے لکھتے ہیں:

"میں کئی مرتبہ ان کے دولت خانے کو گیا اور کئی مرتبہ حسن رضا خان بہادر کے مکان پر جا کر ان کا ہم مجلس رہا لیکن وہ کبھی ہمارے سامنے مسند پر نہ بیٹھے نہ کوئی چنور بردار مکھیاں جھلنے کے لیے ان کے پاس جاکر کھڑا ہوا۔ صرف پنکھا جھلنے والے رہتے تھے۔" (ص ۸۵)

جس روز گھوڑے سے گرے اور شہزادہ اظفری ان کی عیادت کو گئے، فوجدار خاں کے ہاں گئے، اسی روز اور اسی وقت شاہزادہ میرزا سلیمان شکوہ بھی آ پہنچے۔ ان کا استقبال دروازے تک کیا۔ اظفری بھی نواب وزیر کے ساتھ ہی اٹھے اور ان سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔ آصف الدولہ نے میرزا سلیمان شکوہ کو مسند پر بٹھا کر خود مسند کے پاس بیٹھ گئے۔

آصف الدولہ کے متبنیٰ کی شادی ہوئی تو پچاس لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف ہوا۔ اظفری نے چشم دید واقعے کے طور پر بیان کیا ہے کہ شادی کی رات چراغاں، مشعلوں اور آتش بازی کی یہ کثرت تھی کہ ڈڑکوس تک معلوم ہوتا تھا کہ آگ کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ نواب وزیر نے اکیس خوان کا توڑہ کھانا اظفری کے گھر بھجوایا تھا۔ کئی ہزار روپے نقد سے تواضع کی۔

اور اپنے ہاتھوں سے گوٹہ کناری اور پھولوں کے ہار ان کے گلے میں ڈالے۔ یہی شان و شوکت چند سال بعد نواب وزیر کی لے پالک بیٹی کی حیدر علی خاں سے شادی کے موقع پر ہوئی۔ حد یہ ہے کہ شہزادہ اظفری کی بیٹی سعیدۃ النسا بیگم کی بسم اللہ خوانی کی رسم ہوئی تو سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان بہادر ظفر جنگ اور نواب وزیر کے دیوان راجہ ٹکیٹ رائے اپنے آقا کے حکم سے وائسرائے سے ملنے کلکتہ گئے ہوئے تھے مگر انھوں نے کلکتہ سے اس مبارک تقریب کی مبارکباد پیش کی اور کئی ہزار روپئے نقد ہنڈی کے ذریعے بھیجے۔ ان دونوں کے مبارکباد کے خطوں کی نقلیں بھی واقعات اظفری میں نقل کی گئی ہیں۔ راجہ نواب انوپ گر گرگسائیں ہمت بہادر نے بھی کالپی کے نواح سے بخشی رائے ٹیکا رام بہادر کی معرفت عرضی بھیجی جس کا ترجمہ صفحہ ۹۰ پر ہے۔

میرزا سلیمان شکوہ دہلی کے شہزادے تھے جو مدتوں سے لکھنؤ میں مقیم تھے مگر اظفری اب تک ان سے ذرا دور دور ہی رہے تھے پہلی بار نواب وزیر آصف الدولہ کے امامباڑے میں عشرۂ محرم میں ملاقات ہوئی مگر صرف سلام دعا تک محدود رہی، دوسری بار دریائے گومتی کے کنارے راستے میں عید کے دن ملاقات ہوئی جب وہ ہاتھی پر سوار نواب وزیر سے ملاقات کے بعد اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ اس بار سلام دعا کے بعد دو چار باتیں بھی ہوئیں۔ اظفری نے ان کا رخ دیکھا تو اپنی طرف سے ایک خط رفع ملال کے لیے میرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں بھجوایا۔ یہ دراصل اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے واسطے بھیجا گیا تھا جو دہلی کے حلقوں میں عام ہوگئی تھی کہ لال قلعے کی قید سے فرار ہوکر شہزادہ اظفری نے جے پور اور جودھ پور کے مہاراجوں کی مدد سے دہلی کے تخت و تاج پر قبضہ جمانے کی سازش کی تھی۔ اس کا جواب میرزا سلیمان شکوہ نے بھی بڑی محبت اور فراخ دلی سے دیا اور دونوں میں خلوص اور محبت کے رشتے استوار ہوگئے۔

ایک اور دلچسپ بات جو واقعات اظفری سے معلوم ہوتی ہے، وہ میر تقی میر کے مدراس بلائے جانے کے بارے میں ہے۔ نواب والاجاہ نے اپنے ایک خط میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:

"آپ کی تحریروں کو اپنی آنکھوں کا سواد بنایا۔ شہزادے کا نشان (مکتوب) جو میرے نام تھا، دکھ لیا ہے باقی کاغذات لفافے میں ارسال کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میر محمد تقی میر کو آپ کی معرفت بلوا لیتا ہوں۔"

غلام حسین

میر تقی میر مدراس تو نہ جا سکے البتہ لکھنؤ ضرور پہنچ گئے۔

یوں تو "واقعات اظفری" زمانے بھر کی دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے مگر لکھنؤ سے اظفری کا رشتہ آصف الدولہ کے انتقال کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ نواب وزیر کے انتقال کی اطلاع اظفری کو سفر کی حالت میں ملی جب وہ مدراس کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور کلکتہ کے قریب تھے، ہوگلی بندرگاہ سے آدھے کوس کے فاصلے پر چیچڑا نامی گاؤں میں تھے یہاں بہت سی اعلا درجے کی پختہ رنگین اور خوش نما عمارتیں بنی ہوئی تھیں، عمدۃ التجار حاجی کربلائی کے گھر میں تین دن قیام کیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ماہ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری کی آٹھویں تاریخ کو وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر نے استسقا کی بیماری میں طبعی موت سے انتقال کیا۔ اظفری لکھتے ہیں:

"اس خبر سے دل کو بہت ملال ہوا۔ عجیب لاابالی طبیعت کے رئیس تھے۔ ایک لحظہ بھی کھیل کود کے اشغال سے جدا نہ ہوتے تھے۔ امور مملکت اور اپنے پرایوں سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ مدح اور مذمت دونوں کے لحاظ سے عقل مند لوگ انھیں لائے نفی کی حیثیت دیتے تھے۔ افسوس کہ وہ بھی نہ رہے۔"

(صفحہ ۱۰۸)

آگے کے صفحات میں سرفراز الدولہ مرحوم کے انتقال پر بھی انھوں نے بڑی محبت سے ان کا ذکر کیا ہے (صفحہ ۱۵۲) اور اپنے لکھنؤ قیام کے زمانے میں ان سے ملاقاتوں کا حال لکھا ہے لیکن اصل داستان آصف الدولہ کے انتقال ہی پر تمام ہوتی ہے۔

غرض ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ یہ نہیں کہ اس میں صرف روشنی ہی روشنی ہو اور تاریکیوں کے حاشیے نہ ہوں مگر دھوپ اور سائے کے اسی کھیل سے لکھنؤ اور اس کے تمدن کی تشکیل ہوئی ہے اور اس لحاظ سے یہ معاصرانہ شہادت نہایت اہم ہے۔ □□

حاشیہ: ۱ اس شہر کے کوچوں اور سڑکوں کے بارے میں میر حسن کا یہ شعر لکھا ہے

عجب یہ شہر ہے بیہڑ پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

نئی سحر آئی

وہ تار تار سا ہوتا ردائے شب کا وجود
دریچے کھول کے دیکھو نئی سحر کی نمود
بلند غلغلۂ آمدِ جلوسِ سحر
ہوا تو لرزاں سا ہے قصرِ تیرگی کا وجود
کلی نے جھوم کے بوسے لیے ہیں پتّوں کے
بگارِ فصلِ بہاراں نے چھیڑ دی ہے سرود
کرن اُجالے کی چوُمے ہے پاؤں دھرتی کے
ہر ایک سمت اندھیرے کی راہ ہے مَسدُود
روش روش پہ اُمیدوں کی ہے ضیا باری
نئی سحر کی ہے یہ کیسی ساعتِ مَسعُود
چلو کہ سعی کریں ہم حصُولِ راحت کی
کچھ ایسی دُور نہیں اپنی منزلِ مقصُود
ہوائے تازہ نے کھولا دریچۂ گُلِ تر
مشامِ جاں کو معطّر کرے ہے بادِ شمیم
دلوں پہ ساعتِ گزراں کے زخم ہیں لیکن
نئی اُمنگوں کا مرہم لگا رہی ہے نسیم

خلوصِ دل سے کرو صبحِ نَو کا استقبال
نہ جانے کون سا لمحہ امینِ راحت ہو
خدا کرے کہ مسّرت کا نُور گھر گھر ہو
خُدا کرے کہ نیا سال باسعادت ہو

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸۔ اسکول وارڈ پرتاپ گڑھ (یو۔پی)
۲۳۰۰۰۱

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں

خلا میں یہ اَن گِنت ستارے
یہ چاند سُورج زمین
سَب اپنے اپنے محَور پہ گھومتے ہیں
اور اپنی اپنی کشش کے باعث
وجُود اپنا کیے ہیں قائم
جو سُورج اپنا تموز کھو دے
تو خاکدانِ حیات میں کچھ رہے نہ باقی
تمام اجرامِ آسمانی
جو اپنے محور سے منحرف ہو کے اپنی گردش کا رُخ بدل دیں
تو وہ تصادم ہو
وہ تصادم ہو
جس سے اک پل میں ہر نشانِ وجود کا خاتمہ یقینی ہے
تاہم ایسا ہوا نہ اب تک ۔
کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
تمام سیارگاں میں آخر یہ ایک مخصوص نظم کیوں ہے
یہ سَب کے سَب کس طرح سے اک خاص ضابطے میں بندھے ہوئے ہیں
یہ رات کے بعد دن کی آمد
یہ صبح کے بعد شام کا التزام کیوں ہے
یہ کُل عوامل میں منطقی ربط خود بخود تو ہے غیر ممکن
ضرور کوئی عظیم ہستی ہے
جو عقب سے ہے کارفرما
جو پردۂ غیب میں نہاں ہے
جو فہمِ انساں سے ماورا ہے ۔

طاہر تلہری
صدر بازار قصبہ تلہر
شاہجہاں پور

خود نوشت

راجیندر بہادر موج
موج ایگٹ، فتح گڑھ (یوپی)

اپنی کہانی - اپنی زبانی

خوابِ عدم سے عالمِ امکاں میں آگئے
آخر حیات و مرگ کے زنداں میں آگئے (موج)

میں ۲؍ جولائی ۱۹۲۲ء کو حیات و مرگ کے اس زندان یعنی عالمِ فانی میں آگیا۔ میری پیدائش ضلع بہبل پور، تحصیل چھپرامئو ضلع فرخ آباد (یو۔پی) میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ میرے والد صاحب منشی رام کنور سکسینہ فارسی و اُردو کے عالم تھے۔ اُنھیں ان دونوں زبانوں کے متعدد اشعار یاد تھے جنھیں وہ حسبِ موقع سُنایا کرتے تھے۔ کوئی بھی موسم ہو روزانہ غسل کے پابند تھے اس کے بعد شنکر دیال فرحت کی رامائن، جس کا کافی حصّہ انھیں اَزبر تھا، کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ میری والدہ صاحبہ شریمتی رام دیوی تعلیم یافتہ نہ ہوتے ہوئے بھی کھڑی بولی بولتی تھیں کیونکہ میرے نانا منشی کاشی پرشاد سکسینہ، متوطن قصبہ علی گنج ضلع ایٹہ بھی فارسی اور اُردو میں مہارت رکھتے تھے۔ میری چچی شریمتی جے دیوی اُردو مڈل پاس تھیں، رشتہ داریوں میں خط و کتابت کا سلسلہ اُردو ہی میں تھا۔ ایسے ماحول میں میں نے آنکھ کھولی اور ذہنی تربیت پائی۔

میری صغر سنی اور طفلِ دبستانی کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بہت شورش کا تھا۔ ملک کے طول و عرض میں اتھل پتھل کا عالم تھا۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں کانگریس کی اہنسا (عدم تشدد) کے طریقہ پر عدم تعاون کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ انگریزی سرکار نہتے والنٹیروں پر لاٹھی گولی کا استعمال کر رہی تھی، بے گناہوں کو سرِ عام زدوکوب کر کے زبردستی جیل میں بند کیا جا رہا تھا۔ حکومت کے ٹوڈی (خوشامدی) و زر خرید غلام طرح طرح کے مظالم کر رہے تھے۔ آزادی کے دیوانوں کے خون سے زمین سُرخ ہو رہی تھی۔ فضا "انقلاب زندہ باد" اور "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی جے، ہر طرف سُنائی دیتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں ہوئی۔ شاعری کی طرف میرا رجحان فطری تھا۔ میں آٹھویں کلاس کا طالبِ علم تھا۔ اسکول میں بیت بازی ہوا کرتی تھی۔ ایک بار "غ" سے شروع ہونے والا شعر کسی کو یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے برجستہ کہہ دیا ؎

غفلت سے اُٹھو اے ہندی   اُٹھو بھارت کو آزاد کرو!

اس شعر پر دوسری پارٹی نے اعتراض کیا کہ شعر سیاسی ہے۔ مگر مولوی سلیم صاحب نے فیصلہ ہمارے حق میں دیا کہ شعر صحیح ہے۔ غالباً یہ پہلا شعر تھا جو میری اس وقت کی ذہنیت کا آئینہ دار بھی ہے کیونکہ یہ یکایک مجھ پر نازل ہوا تھا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ اس دور میں ہندو شرفا میں، خاص طور پر کائستھوں میں شادی کی مختلف تقاریب پر دولھا دلہن کی جانب سے بچّوں میں مقابلے کے طور پر غزل خوانی و شعری پہیلیوں کا رواج تھا، جیسے ایک طرف سے یہ شعر پڑھا گیا ؎

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر
پَر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

دوسری جانب سے جواب دیا گیا:

خط کبوتر اس طرح لے جائے بامِ یار پر
خط کا مضموں ہو پَروں پر، پَر کٹیں دیوار پر

بزرگ حضرات بچّوں کو شعر خوانی کے انعامات سے نواز کر ان کی ہمّت افزائی کرتے تھے۔ شادی کی ایک رسم کنور کلیوا (طعام طفلاں) یعنی نوشہ سے کم عمر ناکتخدا لڑکوں کی دلہن کے گھر کے اندر دعوت، ہوتی تھی جس میں دولھا کو خطِ شکستہ میں اُردو کا خط پڑھنے کا انعام (جسے حق کہتے تھے) کسی قیمتی تحفے کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ یہ رسم و رواج تفریح کے علاوہ اُردو کی ترویج کیلئے

مؤثر اقدام بھی تھے۔

۱۹۳۵ء میں تیرہ سال کی عمر میں میں نے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد فتح گڑھ چھوڑ کر کان پور میں بی این ایس ڈی کالج میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس وقت ضلع فرخ آباد میں کوئی انٹر کالج نہیں تھا۔ یوں تو دسویں درجے میں ہی شعر کہنے لگا تھا، یہاں کالج کے صدر شعبۂ اُردو منشی ہری کرشن سکسینہ راز بلند شہری نے میری ہمت افزائی کی اور مجھے کالجوں کے مشاعروں میں شرکت کے مواقع دیئے۔ جگت موہن لال رواں اُناوی کے صاحبزادے پربھان شنکر سروش میرے ہم جماعت تھے۔

اس وقت کان پور میں ثاقب کان پوری، نشور واحدی، گنگا دھر ناتھ زحمت اور کرشن سہائے ہنکاری وحشی کان پوری کا دور تھا۔ وحشی صاحب مجذوب انسان اور معرفت کے رنگ کے بلند پایہ شاعر تھے جو صرف اعلیٰ ادبی نشستوں میں ہی کلام پڑھتے تھے۔ صدیق حسن آئی سی ایس (جو خود بھی شاعر تھے) کے دولت کدے پر نشستوں میں ان کی شرکت لازمی تھی۔ نشور صاحب کو عوامی مقبولیت حاصل تھی۔ مجھے شروع ہی سے ہمعصروں کے بجائے بزرگوں کے ساتھ نشست و برخاست کا شوق تھا۔ ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہونے لگا، ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرنے لگا۔ منشی دیا نرائن نگم کا ماہنامہ 'زمانہ' عروج پر تھا، ان سے بھی نیاز حاصل کرنے کا شرف ملتا رہا۔

جب میں نے الٰہ آباد میں کائستھ پاٹھ شالہ کالج میں داخلہ لیا، وہاں منشی بابو رام سکسینہ صدر شعبۂ اُردو تھے وہ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں کے عالم تھے۔ شیروانی، چست پائجامہ، ململ کی دوپلی ٹوپی میں ملبوس، کاندھے پر چیک دار انگوچھا ڈالے کلاس میں آتے تھے۔ سب طلباء انھیں مولوی صاحب کہتے تھے۔ وہ خود تو شاعر نہیں تھے مگر طلباء کو مشاعروں اور تقریری مقابلوں میں حصہ لینے دور دور تک بھجواتے تھے۔ اس وقت الٰہ آباد میں نوح ناروی اسکول چھایا ہوا تھا ان کے تلمیذ بسمل الٰہ آبادی اس کے روحِ رواں تھے۔ فراق گورکھپوری ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اُبھر چکے تھے۔ میں یہاں کے مشاعروں میں شریک ہونے لگا جس سے ان سب حضرات سے ملنے جلنے کے مواقع ملتے رہے۔ کالج میں ایک مضمون لامک بھی تھا جس میں اس وقت میں اور مرحوم یشودھا نندن (جج عدالت العالیہ الٰہ آباد اور جناب روہت نندن آئی اے ایس کے والد) صرف دو ہی طالب علم تھے۔

جولائی ۱۹۳۹ء میں میں سینٹ جونس کالج آگرہ میں بی اے کا طالب علم ہوگیا۔ آگرہ اس وقت صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ (موجودہ اترپردیش) کا اعلا تعلیمی مرکز تھا۔ یہاں کی اُردو ادبی فضا پورے شباب پر تھی، مجھے یہاں ذہنی سکون اور شعر و شاعری کا اعلا معیاری ماحول میسّر ہوا۔ کالج کے صدر شعبۂ اُردو مولانا حامد حسن قادری شاعر طلباء کی ہمّت افزائی کرتے تھے ان کے فی البدیہہ مشاعرے انوکھی اختراع تھے۔ اس وقت مغیث الدین فریدی فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے مگر شعر گوئی کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ہم دونوں ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

سینٹ جونس کالج میں خورشید عالم خاں (حال گورنر کرناٹک) ایم اے کے طالب علم تھے اور میرے ساتھ بشپ فرنچ ہوسٹل میں رہتے تھے، بڑا اچھے طالب علم ہونے کے علاوہ ہاکی کے اچھے کھلاڑی بھی تھے۔

کالج کے سامنے خاں بہادر اختر عادل گورنمنٹ پلیڈر آگرہ کی عالی شان کوٹھی تھی جہاں بسا اوقات شنبہ کی شب میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں شعرا اپنے حلقۂ تلامذہ کے ساتھ شرکت فرماتے تھے۔ قرب و جوار اور قریبی مقامات جیسے فتح پور سیکری، ٹونڈلہ، بھرت پور اور جھانسی وغیرہ کے مقامات پر بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ میں ان سب میں شرکت کرتا تھا۔ جھانسی کے ایک طرحی کل ہند مشاعرے میں میں نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع مجھے ابھی تک یاد ہے ؎

دل کی شکستگی ہے خوب، دل کی شگفتگی نہ دیکھ
ہنستے ہوئے سرشک دیکھ، روتی ہوئی ہنسی نہ دیکھ

میں فطرتاً بہت کم سخن رہا اور گوشہ نشینی میری عادت رہی۔ خودنمائی سے احتراز اور نام و نمود سے گھبراتا ہوں۔ حُسن کا دیدۂ بلبل سے نظارہ کرکے مدح سرائی کا قائل رہا۔ وہاں کے حسین ماحول سے متاثر ہونا لازمی تھا مگر میرے تعلقات نے کبھی تکلفات و سماجی حدود کو پار نہیں کیا۔ اس نازک دور میں اکتوبر ۱۹۳۹ء میں مجھے حبالۂ ازدواج میں محدود کردیا گیا۔ میری شادی شریمتی شکنتلا سکسینہ ایم اے و شاردہ دختر منشی منگولال سکسینہ متوطن شہر اٹاوہ کے ساتھ کردی گئی جو اب تک میری رفیقۂ حیات ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے

یہ ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو بھی جانتی ہیں۔ انھوں نے مجھے ہندوؤں کے سنسکرت کے دھارمک گرنتھوں کا اُردو منظوم ترجمہ کرنے میں پوری مدد کی۔ خود بھی انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق ہے جو اَب بینائی کی کمزوری و دیگر امراض کی وجہ سے ختم سا ہوگیا ہے۔ "تذکرہ شعرائے فرخ آباد" — اور "نل دمنتی" ان کی دو تصنیفات کو یو۔ پی اُردو اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

آگرہ میں اس وقت ایک باغ و بہار شخصیت حکیم محمد اسحاق اسحاق تھے شاعروں میں بہت بلند آواز سے پڑھتے تھے ماہر نباض تھے، مریض کا حال دریافت نہ کرکے صرف نبض دیکھ کر علاج کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد سوائے حکیم اسحاق کے، آگرہ کے سارے شعراء و ادباء پاکستان چلے گئے خود کو تنہا پاکر حکیم صاحب بہت ملول رہنے لگے اور لمبی ریش و درویشانہ چغہ اختیار کرلیا۔ غالباً مارچ ۱۹۶۶ء میں، میں سخت بیمار ہوگیا۔ مقامی ہر ممکن علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کسی نے میری اہلیہ کو مجھے آگرہ کے حکیم اسحاق کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ اپنی طویل علالت اور نقاہت کی وجہ سے اور حکیم صاحب کی بدلی ہوئی شبیہ کی وجہ سے میں حکیم صاحب کو پہچان نہ سکا اور وہ بھی مجھے نہ پہچان سکے۔ وہ اس زمانے میں مُفت علاج کرنے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد حکیم صاحب نے دو منٹ میری نبض دیکھی۔ میں نے حال کہنا چاہا، انھوں نے اشارے سے منع کردیا۔ پھر نسخہ لکھنے کے لیے میرا نام دریافت کیا۔ نام بتانا تھا کہ حکیم صاحب اُٹھ کر بغل گیر ہوگئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ حکیم صاحب نے آبدیدہ ہوکر فرمایا:

"آج مدت بعد ایک پُرانا ساتھی ملا ہے۔ یہاں کی تو ساری ادبی دُنیا پاکستان چلی گئی، کوئی بات کرنے تک کو نہیں رہ گیا۔"

پھر ہم دونوں کا شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے میں اپنی بیماری بھول گیا اور وہ حکمت بھول گئے۔ دوائیں دے کر مجھ سے کہا کہ وہ اِمسال ماہ ستمبر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے (حالانکہ دیکھنے میں تندرست دکھائی دے رہے تھے) اس لیے ستمبر کے شروع میں ان سے دوبارہ آخری بار مل لوں۔ میں نے ان کی پیشین گوئی پر زیادہ یقین نہیں کیا اور بجائے ستمبر کے اکتوبر میں جا سکا۔ حکیم صاحب وقتِ موعود پر دارِ فانی سے کوچ کرچکے تھے۔ ان کی کرسی پر ان کے داماد صاحب تشریف فرما تھے میرا نام سُن کر صرف اتنا کہا کہ حکیم صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے۔

مجھے اپنی تساہلی پر بے حد افسوس ہوا۔ خود اپنی نبض دیکھ کر اپنی وفات کا تعین کرنا یہ بھی ایک کرشمہ ہی تھا۔ مجھے حکیم صاحب کی دواؤں سے مکمل فائدہ ہوگیا تھا۔

آگرہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد جولائی ۱۹۴۲ء میں ایک بار پھر کان پور آگیا اور ڈی۔ اے۔ وی کالج میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہوسٹل میں اقامت اختیار کی۔ اس زمانے میں قانون کی تعلیم شام کو ہوتی تھی اور سارا دن خالی رہتا تھا۔ اس وقت کو میں شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں گزارنے لگا۔ چند ماہ مقامی کرائسٹ چرچ کالج میں اُردو کا لیکچرر بھی رہا۔ اس وقت نشور واحدی حلیم مسلم کالج میں صدر شعبۂ اُردو تھے۔

اگست ۱۹۴۲ء میں ڈی۔ اے۔ وی کالج ہوسٹل، کانگریس کے ستیہ گرہیوں اور مفرور لیڈروں کی پناہ گاہ تھا اور میں یونین کا صدر تھا۔ "انگریزو بھارت چھوڑو" تحریک میں کالج کے طلباء کا جلوس لے کر ہم لوگ ترنگے جھنڈے لیے کچہری کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ دُور چل کر جلوس دو حصّوں میں منقسم ہوگیا ایک کچہری کی طرف دوسرا پولیس لائن کی طرف روانہ ہوا۔ کیونکہ دونوں مقامات پر جھنڈے نصب کرنا تھے۔ کالج کے پاس اینگلو انڈین سپاہیوں کی چوکی تھی، اس نے افسران کو خبر دی۔ جیسے ہی دونوں جلوس کچہری اور پولیس لائن کے قریب پہنچے، پولیس نے لاٹھی چارج شروع کردیا۔ میں کچہری والے جلوس کی اگلی قطار میں تھا۔ میرے کافی چوٹیں آئیں، میں پولیس دفتر کی چہار دیواری کے پاس نیم بے ہوشی کی حالت میں گر گیا۔ سیکڑوں طلباء زخمی ہوئے۔ زخم خوردہ ہوتے ہوئے بھی طلباء دونوں مقامات پر جھنڈے نصب کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس نے زخمیوں کو اور درجنوں راہ گیروں کو اپنی گاڑی میں ڈال کر جیل پہنچا دیا۔ تیسرے دن سٹی مجسٹریٹ محمد یوسف آئی۔ سی۔ ایس کے اجلاس میں سب کے خلاف سرسری طور پر فرضی بیانات لکھ کر سب کو سزایاب کردیا گیا۔

۱۹۴۴ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرکے ۱۹۴۵ء سے فتح گڑھ کی ضلع عدالتوں میں وکالت شروع کردی۔ کانگریس کے سرگرم کارکن ہونے اور مختلف عہدوں پر فائز رہنے کی وجہ سے اس وقت کے سرکردہ جاں نثارانِ وطن کی قربت کا مجھے شرف حاصل رہا۔ لال بہادر شاستری، رفیع احمد قدوائی، سمپورنانند، حافظ محمد ابراہیم، کیشو دیو مالوی، موہن لال سکسینہ گوبند سہائے اور چودھری گردھاری لال کی مجھ پر کرم فرمائی رہی۔ سید علی ظہیر اور بیگم علی ظہیر کی تو مجھے خاص سرپرستی حاصل رہی۔ ۱۹۷۵ء میں میں نے

سیاست کو خیرباد کہہ دیا اور وکالت کے علاوہ ادبی، ثقافتی و فلاحی تنظیموں کی طرف توجہ مرکوز کردی۔

ساٹھ سال سے زائد عرصے سے اُردو ادب کی ہر ممکن طریقہ سے خدمت کر رہا ہوں۔ اُردو کانفرنسوں اور کل ہند مشاعروں کا بھی اہتمام کرتا رہا ہوں۔ شبینہ اسکول چلانا اور اردو لائبریریاں قائم کرنا میرا مشغلہ رہا ہے۔ شعراء اور ادبا کو ان کو تصانیف شائع کرانے کی ترغیب دینا اور ان کی معاونت کرنا میری عادت بن چکی ہے۔ اُردو ادب کی بیشتر مقتدر ہستیوں کو فتح گڑھ مدعو کرچکا ہوں۔ عرش ملسیانی، شاہ میکش اکبر آبادی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے غریب خانے کی عزت افزائی کی ہے۔ امین سلونوی، نشور واحدی، فنا نظامی اور چندر پرکاش جوہر وغیرہ میرے زیر اہتمام مشاعروں میں شرکت فرماتے رہے۔ غریب خانہ مہمان نوازی کے لیے وقف رہا۔

شروع میں میں نے اُردو صحافت و نامہ نگاری میں بھی نمایاں حصہ لیا اور فرخ آباد ضلع نامہ نگار ایسوسی ایشن کا صدر بھی رہا۔ اس ضمن میں امین سلونوی نے میری رہنمائی کی۔ جناب محسن نظامی سکریٹری انجمن تحفظ اُردو نے میری معاونت کی مگر ۱۹۶۰ء میں ضلع وکیل سرکار (فوجداری) کے عہدے پر تقرری کے بعد مجھے صحافت و نامہ نگاری ترک کرنا پڑی۔

دہلی کی ادبی فضا میں جناب گوپی ناتھ امن، مولانا امداد صابری اور جمنا داس اختر نے مجھے کافی تعاون دیا۔ امن صاحب روزنامہ 'سنسار' اور اختر صاحب روزانہ 'تیج' کے ایڈیٹر تھے۔ کئی سال 'سنسار' کے ہر ہفتہ کے ایڈیشن میں میری ایک غزل شائع ہوتی رہی۔ 'تیج' میں بھی میرا کافی کلام شائع ہوا۔

۱۴ سال ضلع وکیل سرکار کے عہدے پر رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وکالت پھر شروع کردی اور کئی سال ضلع بار ایسوسی ایشن کا صدر بھی رہا۔ صوبے کی مختلف سماجی تنظیموں سے وابستہ رہا اور اب بھی ہوں۔ اترپردیش جرائم انسداد کمیٹی کا کارگزار چیرمین اور ضلع بھارت اسکاؤٹس و گائڈس ایسوسی ایشن کا نائب صدر ہوں۔

لکھنؤ کے ادبی اداروں سے منسلک ہونے کے بعد لکھنؤ کی آمدورفت بڑھ گئی اور یہاں کے بہت سے شعراء و ادباء سے تعلقات استوار ہوئے اس میں بزرگ ادیب عرفان عباسی سے برادرانہ تعلقات قائم ہوئے۔ ان کے مسلسل اصرار نے مجھے نثر نگاری کی طرف بھی مائل کیا۔ مختلف ادبی موضوعات پر میرے کافی مضامین مؤقر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں ادبی حلقوں میں نثر نگار کی حیثیت سے بھی نوازا جاتا ہوں۔

ادبی تنظیموں میں یوپی اُردو اکادمی کا وائس چیرمین اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا رکن رہا ہوں اور انجمن ترقی اُردو ہند نئی دہلی کا رکن ہوں۔

اس وقت ملک کے سارے ادبی جرائد میں میرا کلام شائع ہوتا ہے 'دُور درشن' اور آکاش وانی سے بھی نشر ہوتا ہے۔ میری ادبی خدمات کے اعتراف میں:

۱۔ حکومت نے میری رہائش گاہ کی سڑک "ہسپتال روڈ" کا نام بدل کر "راجیندر بہادر موج مارگ" کردیا ہے۔

۲۔ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے "امتیاز میر" ایوارڈ سے نوازا۔

۳۔ 'برنگیا بھارتی' نے مجھے 'سرسوتی سمان' سے سمانت کیا ہے۔

۴۔ یوپی اُردو اکادمی نے میرے چھ شعری مجموعوں کو انعامات سے نوازا ہے۔

۵۔ اُردو سماج لکھنؤ نے بھی مجھے ایوارڈ دیا۔

۶۔ ۱۸ مارچ ۱۹۸۷ء کو شملہ میں انڈو پاک مشاعرے کے بعد میرا مختلف اصناف پر کلام سننے کے بعد پاکستان کے مشہور شاعر راغب مرادآبادی نے میری بیاض پر یہ رُباعی لکھ دی ؎

جذبات کی رو میں نہیں بہنے والا حق کہہ کے رہوں جبرِ وقت سہنے والا
اس دور میں موج کے سوا کوئی نہیں ہر صنفِ سخن میں شعر کہنے والا

عشقیہ اور رومانی شاعری میں میں نے عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کی ابتدائی منزل کی طرح پیش کیا ہے ؎

حقیقتیں بھی براہِ مجاز ملتی ہیں
نہ ہو جو پائے صنم پر تو وہ نماز نہیں

ہر شے پہ ہے یقیں مجھے تیرے وجود کا
اب دل کو وقفِ یادِ صنم کر رہا ہوں میں

میرے اب تک مندرجہ ذیل آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں آخری چھ کو اترپردیش اُردو اکادمی نے انعام سے نوازا ہے:

۱. طوفان	اشاعت	۱۹۵۴ء
۲. موج اور ساحل		۱۹۵۸ء
۳. موج در موج		۱۹۸۱ء
۴. ساگر مجموعۂ رُباعیات		۱۹۸۳ء
۵. موجیں		۱۹۸۵ء
۶. لہریں		۱۹۸۷ء
۷. شکنتلا (کالی داس کے شاہکار کا منظوم خلاصہ)		۱۹۹۱ء
۸. آکاشں		۱۹۹۳ء

میری مندرجہ ذیل تین کتابوں کو اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ ہی نے شائع کیا ہے:

۱. انتخابِ کلام شفیق جون پوری	۱۹۸۹ء
۲. انتخاب کلام مادھو رام جوہر	۱۹۹۷ء
۳. انتخاب کلام کرشن سہائے ہنکاری وحشی کانپوری	۱۹۹۷ء

ملک کے بہت سے صدور شعبۂ اردو، بلند پایہ ادبی ہستیوں اور متعدد رسائل نے میرے کلام کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے جن کا ذکر اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ صرف چند آرا کا ایک ایک فقرہ پیش ہے:

"ساگر کی رباعیات پڑھ کر ایک طرف تو موج صاحب کی پاکیزہ نفسی، مشاہدہ کی وسعت اور تجربہ کی متانت پر ایمان لانا پڑا تو دوسری طرف ان کی امواجِ تخیل کی رومانی فن کارانہ پختگی کا قائل ہونا پڑا۔"

——— ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

" ان (موج) کی رُباعیوں اور قطعات میں ایک ایسی رُومانی فضا ملتی ہے جس میں مختلف موضوعات، ادراکات اور ردّعمل کی کہکشاں اپنی دل کش رنگا رنگی کے ساتھ جلوہ گر دکھائی پڑتی ہے۔

——— ڈاکٹر شبیہ الحسن ڈی لٹ

" راجندر بہادر موج اُردو کی شعری روایات اور عصری حیات دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں وہ ہماری بزم ادب میں اپنے لیے خاص جگہ بنا چکے ہیں"۔

——— پدم شری علی جواد زیدی

" جو لوگ قدرت کی طرف سے سلیم الطبعی لے کر پیدا ہوتے ہیں غزل کا مزاج انھیں سے ہم آہنگ ہوتا ہے یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ موج صاحب کے مزاج و فکر کو غزل سے اور غزل کے مزاج و فکر کو موج صاحب سے فطری مناسبت ہے اس لیے وہ تنگنائے غزل سے کامیاب و کامران گزرے ہیں۔"

——— ڈاکٹر محمد رضوان علوی

" ان (موج) کے اشعار محدود دائرے میں بندھے ہوئے نہیں ہیں وہ کائنات کا پتہ دیتے ہیں۔ بہت سے اشعار تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں"

——— ڈاکٹر ہارون ایّوب

" موج صاحب کے خیالات میں بلندی اور پاکیزگی، جذبات میں شرافت اور صداقت، اور اظہار میں خلوص و شعریت ہے"

——— ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب

" جذبات کی عکاسی اور زبان پر قدرت موج کی شاعری میں یہ دونوں وصف پائے جاتے ہیں"

——— ڈاکٹر ضیا احمد بدایونی

" جناب موج کی شاعری کا پس منظر کلاسیکی ہے، وہ جدید شاعروں کی طرح اپنے آپ کو فنی پابندیوں سے آزاد نہیں سمجھتے"

——— علامہ نیاز فتح پوری

" موج کی متعدد غزلیں حسرت، اصغر اور فانی کے رنگ میں نظر آتی ہیں۔ یہ فن نہایت مشکل ہونے کے ساتھ نازک بھی ہے مگر موج نے اس نازک مقام سے بڑی خوش اسلوبی سے اپنا نیا راستہ نکالا ہے"۔

——— جناب امین سلونوی

" موج کے کلام میں تخیل کی نزاکت، بندش کی چستی اور سلاستِ زبان بکثرت پائی جاتی ہے"

——— سید علی ظہیر

" موج لطیف اور رومانی جذبات کے اظہار میں غیر معمولی دست گاہ رکھتے ہیں، درحقیقت فرخ آباد کو ان کی اتنی بلند معیاری شاعری کو تقویت دینے کا فخر حاصل ہے"

——— خورشید عالم خاں (گورنر کرناٹک)

" جناب موج کہنہ مشق شاعر ہیں ان کا ذوقِ سخن خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اور اپنے خیالات و مشاہدات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے"

——— ڈاکٹر شجاعت علی

" ان (موج) کے کلام میں جہاں قدیم روایات کا احترام ملتا ہے وہاں نئے دور کے افکار کی بھی جلوہ گری ہے۔ وہ محسوسات کو شعر کے پیکر میں ڈھالنے کا فن جانتے ہیں اور اس باب میں کسی کے مقلد نہیں"۔ ڈاکٹر محمود الٰہی

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

گیت

ہم ہندستان کی ماٹی ہیں
اب چاہے زمانہ کچھ بھی کرے   ہم یوں ہی چمکتے جائیں گے

مندر، مسجد، گرودوارے ہیں
اندھیاروں میں اُجیارے ہیں
اک نور کے سب فوّارے ہیں
ہم بِکتے تن سے الگ سہی
اک مَن سے کھنکتے جائیں گے   ہم یوں ہی چمکتے جائیں گے

گنگا کا سنہرا پانی ہے
کیلاش کی مست جوانی ہے
صدیوں کی امر کہانی ہے
یہ سورج چاند ہیں پھول اپنے
دن رات مہکتے جائیں گے   ہم یوں ہی چمکتے جائیں گے

ہو کوئی پڑوسی کی دھمکی
راکٹ بندوق ہو یا بم کی
یا سیخی جھوٹے موسم کی
سازش کے یہ کچّے دھاگے
بجلوں سے اُدھڑتے جائیں گے   ہم یوں ہی چمکتے جائیں گے

اتہاس نے ہم کو مانا ہے
ہر روپ رنگ میں جانا ہے
ساہس سے بڑا یارانا ہے
ہم مانوتا کے راہی ہیں
بکھرے تو سنورتے جائیں گے   ہم یوں ہی چمکتے جائیں گے

ہم نے پی زہر بھری پیالی
ہم ہوش میں، دنیا متوالی
ہم بیکل جگ کی ہریالی
یہ دھوپ تیز جتنی ہوگی
ہم اتنے لہکتے جائیں گے   ہم یوں ہی چمکتے جائیں گے

□□

عیدالفطر

عید انعام ہے ریاضت کا
عید احساس ہے طہارت کا
اک مہینہ وہ ضابطوں والا
ہر نفس سلسلہ اطاعت کا
نکہتِ فرض ساعتوں میں بسی
کیا ٹھکانا ہے اس کی عظمت کا
عید لائی ہے کیف کا موسم
ہر طرف ہے نزول رحمت کا
سب کو اس کی خوشی مبارک ہو
دور چلتا رہے محبت کا

ظفر شہدی
نہرو کراسنگ۔ احاطہ کمال جمال لکھنؤ

جشنِ جمہوریہ

یوم جمہوریت پیامِ حیات
لے کے آتا ہے اپنے دامن میں
اور ہم جھوم جھوم اُٹھتے ہیں
منظروں کا وہ کیف زا عالم
اک دھنک جیسے بادلوں پہ کھلی
ایک گلدستہ جیسے پھولوں کا
ایک آئینہ جیسے عکسوں کا
اپنا دستور کیسا پاکیزہ
جس نے ہم سب کو باندھ رکھا ہے
اسی دستور کی بلندی کو
یوم جمہوریت بتاتا ہے

ڈاکٹر نادرہ اخلاق
بالدہ کالونی۔ لکھنؤ

افسانہ

بابا مقدم
نسیم مسعود

مُردہ سانپ

گھنی شاخوں اور ہری پتّیوں کی چھتری والا دارِ زعفران واحد درخت تھا جو لُرستان کے تختِ آب واشیون کے علاقے میں نظر آتا تھا۔ کچھ دن ہوئے مجھے شوق پیدا ہوا کہ دارِ زعفران کو قریب سے جاکر دیکھا جائے۔ تختِ آب میں خیمہ لگانے کے پہلے ہی دن میں نے ایک لُرستانی سے اس درخت کا نام پوچھ لیا۔ اس سرزمین کے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے پست و بلند میں یہ درخت پہچان میں آنے والا تنہا پیکر تھا جو ایک لمبے ٹیلے پر تنا کھڑا تھا، جیسے کوئی تماشا گر خود حیرت سے اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا ہو۔ راتوں کو جب اندھیرا اُترنے لگتا تو سیاہ پڑتے ہوئے سُرخ اُفق کے پس منظر میں درخت ایک دو گھنٹے تک کسی اساطیری ہیولے کی طرح نظر آتا رہتا اور رات کی سیاہی جتنی بڑھتی جاتی اور ستارے جتنے روشن ہوتے جاتے، وہ تاریکی میں ڈوبتا اور گھلتا جاتا۔ تاریکی نیچے کی گھاٹیوں سے اُٹھتی ہوئی آتی اور درخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

تیسرے دن میں نے درخت کے نزدیک جانے کا فیصلہ کیا۔ مغرب کے وقت میں نے چھڑی اُٹھائی اور چل کھڑا ہوا۔ سیّد احمد، میرا خانساماں، بھی ہمراہ تھا۔ وہ کوئی پچیس سال کا ہوگا۔ اس کے پھولے پھولے گول زرد چہرے پر مہاسوں کی کثرت تھی اور اس کی اُداس صورت میں اکیلی نمایاں چیز اس کی دھنسی ہوئی سوئی سوئی آنکھیں تھیں۔

سورج کی چمک اب آنکھوں کو چبھ نہیں رہی تھی۔ کسی پیلے تھال کی طرح وہ دُور کی پہاڑیوں سے تھوڑا اوپر فضا میں معلق تھا۔ اس کے اوپر آسمان میں ٹکے ہوئے چھدرے بادل کا رنگ کالا پڑتا جا رہا تھا۔ اس کی نچلی گوٹ البتہ ابھی سُرخ تھی۔ میرے سامنے پھیلی ہوئی زمین پر نالیاں سی بنی ہوئی تھیں اور اس پر اُٹھے ہوئے ٹیلے مل کر سمندر سے ابھری ہوئی بڑی بڑی مچھلیوں کی پیٹھوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ نیچے کی گھاٹیوں میں سائے گہرے ہو رہے تھے اور بلندی کی ماہی پشت زمین پر ہر طرف بکھری ہوئی کربی کی جھاڑیاں اور پتھروں کی سلیں دُھوپ میں چمک رہی تھیں۔ یوں تو دن بھر ہی یہ علاقہ ویران اور خاموش رہتا تھا لیکن غروب کے وقت اس کا سنّاٹا پُراسرار، وہم انگیز اور ڈراؤنا سا ہو جاتا تھا۔ نیچے سامنے والی گھاٹی سے ایک بنجارا اوپر جا رہا تھا اور اس سے کچھ آگے بڑھ کر کئی اور بنجارے ایک اور پہاڑی کی کمر پر چل رہے تھے۔ ایک گگارے کے چھوٹے سے ہموار قطعے پر کئی سیاہ خیمے دکھائی دے رہے تھے، ان میں سے ایک کے اندر سے دُھواں اوپر جا رہا تھا۔ ایک اور خیمے کے سامنے رہ رہ کر شعلے بھڑک رہے تھے۔

ہم ڈھلانوں سے اترتے ہوئے سایہ دار میدان میں پہنچ گئے، اور ترڑخی ہوئی زمین پر مشکل سے پیر جما جما کر ایک اور دامن سے اوپر چڑھتے ہوئے ٹیلوں کی روشن پٹی تک آ گئے۔ سورج نیچے اُترتا جا رہا تھا۔ جیسے کسی طلائی تمغے کی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیلی دی جا رہی ہو۔ جتنی دیر ہم گھاٹیوں میں چلتے، دارِ زعفران نگاہوں سے اوجھل رہتا۔ ٹیلوں کے اوپر جا کر ہم اس کو دوبارہ دیکھتے اور اپنا راستہ اس کی جانب موڑ لیتے۔

ہم درخت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اوپر سے وہ چھتری کی طرح تھا۔ اور زمین کے پاس ہی اس کے تنے سے کئی شاخیں پھوٹی تھیں جو اوپر اٹھ کر تیلیوں کی طرح درخت کی چھتری کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ سورج ڈھل چکا تھا اور اب اپنے کنویں میں آخری غوطہ لگانے کو تھا۔ اس کی پھیکی نارنجی روشنی درخت کی چھتری اور تنے کی شاخوں سے چھنتی ہوئی زمین پر پڑ رہی تھی اور اس روشنی میں درخت کے نیچے کی ہموار زمین پر پڑے ہوئے سنگ پاروں کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں خود درخت کی پرچھائیں اس کے قریب کی زمین پر واضح تھی مگر آگے بڑھ کر دُھندلی ہوتی گئی تھی۔ میں اور سیّد درخت کی پرچھائیں پر چلتے ہوئے زمین کے روشن دھبّوں کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ درخت کی شاخوں پر سیکڑوں چھوٹی چھوٹی چڑیاں بول رہی تھیں۔

سید نے زور سے ہانک لگائی۔ اچانک چڑیاں پھڑپھڑا کر اُڑیں اور درخت کے اوپر اوپر چرخی کی طرح گھومنے لگیں۔ سورج کی ایک قاش غائب ہو چکی تھی اور بقیہ حصے کو آسانی سے نظر بھر کے دیکھا جا سکتا تھا۔ اب اس کا رنگ سرخ تھا جیسے پگھلا ہوا لوہا ٹھنڈا ہو چلا ہو۔ اس کے اوپر ٹکا ہوا چھدرا بادل پورا سیاہ ہو گیا تھا۔ دار زعفران کی دوسری سمت تیز ڈھال کی صورت میں اترتی ہوئی زمین ایک گھاٹی تک چلی گئی تھی گھاٹی کے جھٹ پٹے میں کچھ بنجارے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ہوا کے ساتھ کسی بچے کی آواز رہ رہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں اور سید درخت کے نیچے تھے۔ میں درخت کی چکنی چھال پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور سید مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گھوم گھوم کر درخت کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی ڈری ڈری آواز بلند ہوئی:

"ارے سانپ!"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سید نے ہاتھ سے ایک شاخ کی طرف اشارہ کیا۔

شاخ میں ایک سانپ لٹکا ہوا تھا۔

"لیکن مرا ہوا!" سید پھر بولا۔ "گڈریوں نے پھن کچل کر ڈال میں لٹکا دیا ہے۔"

شاخ کی جنبش کے ساتھ اس کے دونوں طرف لٹکا ہوا سانپ کا بدن بھی دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ پھن کچل جانے کی وجہ سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔ سُرخ رنگ کا گوشت منہ سے باہر نکل آیا تھا، اس میں کہیں اس کی آنکھیں بھی مل گئی تھیں اور اب ان کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کی کمر بھی پھٹ گئی تھی۔ پتھر یا لاٹھی کا زخم تھا۔ سفید پیٹ پر کالی اور زرد چتیاں نہیں، باقی بدن پر سفید اور راکھی رنگ کے چھوٹے چھوٹے سفنے تھے۔ پتلا لمبا سانپ تھا اور اس کی گردن پر نقطے نقطے تھے جیسے گلوبند لپٹا ہوا ہو۔

سیّد، جو آگے بڑھ کر اسے دیکھ رہا تھا، بولا:

"مادہ ہے، گردن دیکھیے کتنی پتلی ہے۔ ان سانپوں کو مارنا نہیں چاہیے۔ جو مارتا ہے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ میں نے یہ سانپ دیکھے ہیں کسی سے بولتے نہیں۔ اب دیکھ لیجیے گا، جس نے بھی اسے مارا ہے پائی پائی کو محتاج ہو جائے گا، جنگل بیابان کی خاک چھانتا، در در بھٹکتا پھرے گا، جیسے میں پورے پانچ سال سے بھٹک رہا ہوں ـــ اور ابھی پتا نہیں کہاں کہاں کا پانی لکھا ہے۔"

سورج کی بچی کھچی قاش بھی دُور کے پہاڑوں کی اوٹ میں جا چھپی۔ گھاٹیاں تاریک ہو گئیں اور صرف اُن کے حاشیوں اور ٹیلوں کی بلندی پر لالی باقی رہ گئی تھی۔ اس کالے بادل کی گوٹ اب کسی پہاڑی کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو۔ چڑیاں اب بھی درخت کے اوپر اوپر چکر کاٹ رہی تھیں اور شاخ پر مُردہ سانپ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا، دور پر سفید دھبوں کے سے ہمارے خیمے بہ مشکل نظر آرہے تھے۔ ہم درخت سے کچھ دُور ہو گئے تو چڑیاں دھیرے دھیرے دو تین چکر کاٹ کر پھر درخت پر بیٹھ گئیں۔ ہم گھاٹی میں پہنچے تھے کہ ان کی چہچہاہٹ سُنائی دی اور سید نے اپنی کہانی شروع کی:

کس کو یقین آ سکتا تھا کہ مجھے بادیہ گردی کرنا پڑے گی۔ میرے آبا بیوپاری تھے خرم آباد میں سب ان کو جانتے پہچانتے تھے ـــــ اب بھی اتنے برسوں بعد بھی، وہاں اُن کا نام لیجیے تو سب سوداگروں کو یاد آ جائے۔ کُنبے میں بس میں تھا اور میری ماں، اور مجھ سے بڑی ایک بہن، جو بیاہ کر سسرال کی ہو گئی تھی۔ میں ابھی چھوٹا تھا۔ اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے آبا تہران سے مال لا کر بیچتے تھے۔ اچھا بھلا کاروبار تھا۔ بہت سے لوگ تو ہم سے جلتے تھے۔ میری ماں دھیمے مزاج کی بے زبان عورت تھی۔ بچپن ہی سے میں دیکھتا تھا کہ اس کے دل میں کچھ ہے جو وہ کسی کو بتاتی نہیں۔ دن میں دو بار وہ اس کوٹھری کے اندر ضرور جاتی تھی جو ہمارے مکان کے بڑے کمرے کے پیچھے تھی۔ وہاں جا کر وہ اندر سے دروازہ بند کر لیتی اور کچھ دیر تک وہیں رہتی تھی۔ مجھ کو اس نے وہاں جانے سے منع کر رکھا تھا۔ کہتی تھی کہ بچوں کو اندھیری جگہوں پر نہ جانا چاہیے۔ میں خود ہی اندھیرے سے ڈرتا تھا اس لیے میرا کبھی وہاں جانے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ کو صرف اتنا پتا تھا کہ اس کوٹھری میں میرے ماں باپ کے کپڑوں کے دو پرانے صندوق ہیں اور ایک بکس، ایک سماور اور کچھ اور سامان۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی جھری سے کوٹھری کے اندر جھانکا بھی تو مجھے سامنے کے طاقچے میں رکھے سماور کی چمک نظر آئی، بس۔ غرض وہ کوٹھری مجھے ایک اندھیری اور ڈراؤنی جگہ معلوم ہوتی تھی اور مجھ کو اس کے اندر قدم رکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوتی تھی۔

جاڑوں کی ایک رات کی بات ہے۔ میں اسکول کا کام کرتے کرتے تھک کر

کرسی[1] کے نیچے جا لیٹا اور سو گیا۔ ابا ابھی آئے نہیں تھے اور ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ معمول یہ تھا کہ ابا کے آنے کے بعد سب ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ شاید بھوک ہی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر نکلا کہ ماں سے کھانا مانگوں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کرسی کے اوپر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ طاقچے میں جلتے ہوئے چراغ کی روشنی کرسی پر پڑ رہی تھی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی رسی دکھتی ہے۔ لیکن جب اس نے پھن اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں ایک چیخ مار کر پھر کرسی کے نیچے گھس گیا۔ ماں کمرے کے باہر تھی، میری آواز سن کر آ گئی۔ اس نے مجھے کرسی کے نیچے سے کھینچ کر نکالا۔ میں نے جب اس کو ساری بات بتائی اور قسم کھا کر کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کرسی پر سانپ دیکھا ہے تو وہ مجھ کو بہلانے لگی کہ میں نے خواب دیکھا ہوگا ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ تھا۔ مجھ کو یقین تھا کہ میں نے کرسی پر سانپ ہی دیکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس رات میں بڑی بے چین نیند سویا۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے میرے دل میں سانپ دیکھنے کی دہشت سمائی ہوئی تھی۔ کلاس میں بھی سارے وقت میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر رہا کہ سانپ کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے اور پھن اٹھا کر مجھے دیکھ رہا ہے۔

چھٹی کے بعد مجھے گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ دیر تک گلی کوچوں میں سرگشتی کرتا رہا۔ تھک گیا تو ایک مکان کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ماں گھبرائی ہوئی مجھ کو گلیوں میں ڈھونڈھتی پھر رہی ہے۔ وہ بہت پریشان تھی، کہتی جاتی تھی کہ سارے شہر کی خاک چھان ڈالی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر آئی اور اس آوارہ گردی کا سبب پوچھنے لگی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ گھر میں جو سانپ نکلا تھا اس سے مجھ کو ڈر لگ رہا ہے اور اب میری وہاں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تھپکنے لگی اور بولی:

"بیٹے! ڈرو نہیں۔ آؤ گھر چلیں۔ تم نے کچھ اور دیکھا ہوگا، نیند میں تھے، اور پھر سانپ سے ڈرنا کیسا۔ اگر تھا بھی تو ہمارے ہی یہاں کا سانپ تھا۔ وہ گھراتی سانپ تھا۔ گھراتی سانپ کسی کو ستاتا نہیں، سب گھروں میں سانپ کا ایک ایک جوڑا تو ہونا ہی چاہیے۔"

پھر اس نے مجھے بازار سے گیہوں کی کھیلیں اور بتاشے دلوائے۔ ہم ساتھ ساتھ گھر لوٹے۔ راستے میں اس نے مجھے تاکید کی کہ سانپ والی بات کسی کو نہ بتاؤں۔ میں نے بھی وعدہ کر لیا۔

اس قصے کو بہت دن گزر گئے اور سانپ والی بات میرے لیے ایسی ہی ہو کر رہ گئی جیسے آدمی کسی پرانے زخم کی ٹپکن کا عادی ہو جائے۔ مگر اس کے بعد سے میں کبھی گھر میں یا کمرے میں اکیلا نہیں رہتا تھا، ہمیشہ ماں کے پہلو سے لگا رہتا اور اسی کے ساتھ مکان میں ادھر ادھر آتا جاتا تھا۔ تہ خانے اور خاص کر کوٹھری کا تو رخ بھی نہ کرتا۔ میں کھٹک گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے وہ اسی اندھیری کوٹھری میں ہے جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے اور صرف ماں اس کے اندر جاتی ہے۔

آخر ایک رات ماں مجھ سے کہنے لگی:

"بیٹے! تمھیں ایک بات بتانا ہے۔ اب تم سیانے ہو گئے ہو اور ضروری ہے کہ تم بھی وہ بھید جان لو اور کسی اور کو نہ بتاؤ۔"

میرا دل بولنے لگا کہ بات اسی سانپ کی ہے۔ میرا چہرہ فق ہو گیا اور بدن تھرتھرانے لگا۔ ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر بولی:

"آخر تو تمھیں پتا چلنا ہی ہے، اسی گھر میں جو رہتے ہو اور کسی نہ کسی دن وہ تمھیں دکھائی دے جائیں گے۔"

میں ماں سے چمٹا ہوا کھڑا سن رہا تھا، لیکن میرا جی چاہا کہ اس کے پاس سے بھاگ کھڑا ہوں۔ مجھے ماں سے بھی ڈر لگنے لگا تھا، جیسے اس نے خود اپنے پاس کہیں سانپ چھپا رکھے ہوں۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی بول رہی تھی اور اس کی گرم سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ پسینے سے تر ہو گیا اور مجھے چکر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری ماں کے کپڑوں میں سے ابھی ابھی کوئی سانپ سرسراتا ہوا گرے گا اور سیدھا مجھ پر لپکے گا۔

ماں کہہ رہی تھی:

"لال! آخر تو تم ان کو دیکھو ہی گے۔ اب ان سے دوستی کرنا سیکھ لو۔ وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جانتے ہو، زیادہ تر مکانوں میں گھراتی سانپ ہوتے ہیں، مگر کوئی کسی کو بتاتا نہیں۔ ہمارا نصیبہ انھیں کے دم سے ہے۔ وہ ہمارے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ اسی کوٹھری میں رہتے ہیں۔ وہ وہیں انھیں

---

[1] کرسی: ایران کا بڑا سا اونچا تخت، جس پر اس سے بہت بڑی پوشش ڈال دی جاتی ہے جاڑوں میں گھر والے اسی پوشش اور تخت کے نیچے سوتے ہیں۔ برقی حرارت کے رواج سے پہلے گھروں میں کرسی کا استعمال عام تھا۔

——— مترجم

میں کا ایک تھا جسے تم نے اُس رات کرسی پر دیکھا تھا۔ دوسرا نیچے کرسی کے اُس طرف تھا، تمھیں دکھائی نہیں دیا۔ تم چیخ پڑے اور میں آئی تو وہ چلے گئے۔ انھیں شاید خود بھی پتا ہے کہ تم اُن سے ڈرتے ہو۔ اسی لیے تو وہ تمھارے سامنے آتے نہیں"۔

ماں کی باتیں سُن کر میں ڈر سے کانپنے لگا، منھ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی لیکن بھاگ کر جاتا کہاں۔ اکیلے میں ڈر لگتا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں کم سے کم وہاں اپنی ماں کے ساتھ تو تھا۔

بہت کہہ سُن کر آخر ماں نے مجھے راضی کر لیا کہ اس کے ساتھ چلوں اور سانپوں سے کچھ کچھ آشنائی پیدا کروں۔ میں دونوں مٹھیوں میں اس کے دامن کو جکڑے ہوئے تھا اور وہ مجھے آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہی تھی۔ اس نے کوٹھری کے دروازے کی کُنڈی کھولی تو میں نے اس کے لباس میں منھ چھپا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں نے ایک کنارے ہو کر میرا چہرہ کوٹھری کی طرف گھما دیا۔ دروازے کے کھُلے ہوئے پٹ سے آتی ہوئی مدھم روشنی کی چادر سی کوٹھری کے فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا اور انگلیوں کے بیچ سے دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں مجھے دو سانپوں کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت سر دکھائی دیے۔ دونوں نے منھ اوپر اٹھا لیے تھے اور ہم کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے ماں کہہ رہی تھی:

یہ داہنی طرف والا وہی ہے جو تمھیں دکھائی دیا تھا۔ یہ ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کرتے۔ گھر میں ہر طرف آتے جاتے ہیں۔ برسوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ تمھیں بھی ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ دیکھو نا! کیسا تمھیں دیکھ دیکھ کے حیران ہو رہے ہیں۔ اگر میں ساتھ نہ ہوتی تو دونوں بھاگ کر چھپ گئے ہوتے۔ نئے لوگوں کے سامنے بالکل نہیں آتے۔ لیکن تم تو گھر ہی کے ہو۔ اب بڑے ہو رہے ہو چاہیے کہ انھیں اچھی طرح پہچان لو اور یہ بھی تم سے ہل جائیں۔ ہمارا نصیبہ انھیں کے دم سے ہے۔ اور دیکھو بیٹے! کہیں ایسا نہ ہو کسی کے سامنے منھ سے یہ بات نکال بیٹھو کہ ہمارے یہاں سانپ ہیں، کسی کو بھی ان کے ٹھکانے کا پتا نہ دینا۔ اپنے ابّا کو بھی نہیں۔ بہن کو بھی نہ بتانا۔ وہ خود جانتے ہیں مگر کسی سے کہتے نہیں"۔

پھر وہ آہستہ سے کوٹھری میں داخل ہوئی اور میں اکیلا دروازے پر کھڑا رہ گیا۔ میں دیوار سے لگا کانپ رہا تھا۔ ماں سانپوں کے قریب پہنچی تو وہ دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ دونوں ایک ایک طرف سے اس کی پنڈلیوں میں لپٹ گئے اور اس کی جوتیوں اور شلوار کے پائنچوں پر سر رگڑنے لگے ماں ان سے باتیں کر رہی تھی جیسے لوگ پالتو پرندوں اور جانوروں سے باتیں کرتے ہیں۔ زمین پر پانی کا برتن اور کھانے کا کچھ سامان تھا۔ تھوڑی دیر بعد ماں باہر نکل آئی اور کہنے لگی:

"دیکھا بیٹے! کیسے اچھے اور غریب سانپ ہیں! اب تم ان کے عادی ہو جاؤ گے۔ انھوں نے بھی تم کو پہچان لیا ہے اور اب تم سے بھاگا نہیں کریں گے اگر کسی دن ان کے پاس جاؤ اور انھیں پریشان نہ کرو تو وہ اسی طرح تمھارے بھی لپٹیں گے اور تمھارے پیروں پر سر رکھ دیں گے"۔

ماں نے کہہ تو دیا تھا کہ سانپ میرے دوست بن گئے ہیں لیکن میں خود کو اس پر کبھی تیار نہ کر سکا کہ کوٹھری میں جاؤں اور ان کو دیکھوں۔ ان کا اس گھر میں ہونا میرے لیے مستقل عذاب تھا۔ میں ہر وقت سہما سہما رہتا تھا۔ ذرا سی آواز پر میرا دل بیٹھنے لگتا۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ ایک نہ ایک دن سانپ مجھ کو ڈس لیں گے مجھے دکھائی دینے لگتا کہ ڈسے جانے کے بعد میرا بدن پھول گیا ہے اور میں تکلیف سے بل کھا رہا ہوں۔ اسی لیے میں کسی وقت بھی گھر میں اکیلا نہیں رہتا تھا۔ کوئی رات ایسی نہ جاتی تھی کہ میں ہول اور ہراس کے بغیر چین کی نیند سو سکوں۔ اکثر سوتے سے چونک کر اُٹھ بیٹھتا اور اپنے بستر کو غور سے دیکھنے لگتا تھا۔

ہمارے کمرے کی چھت لکڑی کی تھی۔ چھت پر کڑیاں ڈال کر ان پر نرکل اور لکڑی کی چھیلن جمائی گئی تھی۔ اس زمانے میں میرا ایک کھیل یہ بھی تھا کہ چت لیٹ جاتا اور چھت کی کڑیوں کو دونوں جانب سے گنا کرتا تھا۔ میں ساری کڑیوں کو ان کے رنگوں ان کی موٹائی پتلائی، ان کے زخموں اور گانٹھوں سمیت پہچانتا تھا۔ ایک زمستانی رات جب ہم کھانا کھا چکے تھے، میں اپنی جگہ پر لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے اسکول اور کلاس کے بارے میں سوچتا ہوا کڑیوں کو ایک ایک، دو دو، اور کبھی ایک ایک چھوڑ کر گن رہا تھا۔ اسی میں ایک بار جب میں بیچ کی کڑیوں کی جوڑی پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک کڑی میں کوئی چیز لٹکی ہوئی دھیرے دھیرے ہل رہی ہے۔ یہ نئی چیز تھی جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ نرکل یا چھیلن اپنی جگہ سے باہر لٹک پڑی ہے۔ لیکن فوراً ہی پتا چل گیا کہ انھیں میں کا ایک سانپ ہے جو چھت پر پہنچ گیا ہے۔ ایک گز

سے زیادہ اس کا بدن چھت سے لٹکا ہوا تھا اور وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور کمرے کے ایک کونے میں جا چھپا۔ میری زبان بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ابّا اور ماں نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا اور اب حیران حیران سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، لیکن کچھ بولے نہیں۔ آخر ابّا اٹھ کر آئے اور ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں ڈر کے مارے کرسی کے نیچے گھس گیا اور وہیں مجھے نیند آ گئی۔

کچھ دن بعد ابّا نے ایک اچھا سا مکان مول لے لیا اور ہم اسباب سمیت وہاں چلے گئے۔ میں بہت خوش تھا اور سمجھ رہا تھا اب ہمیں سانپوں کی علت سے چھٹکارا مل جائے گا اور مجھے کوٹھری اور بہرخانے اور کمروں کی چھتوں اور اپنے بستر اور گھر کے کسی بھی حصے سے ڈر نہیں لگے گا اور میں بے کھٹکے ہر جگہ آ جا سکوں گا، اور راتوں کو آرام سے سویا کروں گا۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سانپوں کا وہی سا جوڑا ہم سے پہلے ہی اس گھر میں پہنچ چکا ہے اب پھر ماں کا کام ان کی خدمت کرنا تھا۔ وہ روز ان کو دیکھنے جاتی اور ان کی خوراک پہنچاتی۔ پھر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اس مکان میں رہنے پر مجبور تھا۔ میرے ماں باپ وہاں تھے، میرے سونے کا ٹھکانہ وہاں تھا، وہی ایک جگہ تھی جہاں ہم کو صبح شام کا کھانا ملتا تھا اور سردی گرمی میں چھت کے نیچے پناہ لینا تھی۔ اب مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہر گھر میں سانپ کا ایک جوڑا ضرور رہتا ہے اور گھر والے مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ گزارا کریں، انھیں کھانے کو دیں اور دوسروں کو ان کے بارے میں کچھ نہ بتائیں اور اس بات کو راز کی طرح اپنے سینے میں چھپائے رکھیں۔ اگر مجھ کو کسی چہرے پر فکر یا پریشانی نظر آتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ اسے کوئی دھڑکا لگا ہوا ہے تو میں اپنے آپ سے کہتا ہو نہ ہو اس بیچارے کو اپنے گھر میں سانپ دکھائی دے گئے ہیں اور اب ڈر کے مارے اس کی جان پر بنی ہوئی ہے اس لیے کہ جس دن سے میں نے سانپوں کو دیکھا تھا خود میری یہی حالت تھی۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں اسکول کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا کودتا گھر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں زمین کا بڑا سا ہموار قطعہ پڑا، جس میں سے بچے کھیل رہے تھے۔ ہم بھی کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے میں دیر دیر تک اس میدان میں دوڑیں لگاتے اور اگر گیند پاس ہوتی تو گول بنا کر فٹ بال کھیلتے تھے۔ اس روز ہم وہاں پہنچے تو ایک لڑکے کو میدان کے کنارے ایک سانپ پڑا نظر آیا، جسے مار دیا گیا تھا۔ لڑکے نے اسے اٹھا لیا۔ زرد رنگ کا لمبا سا سانپ تھا، اس کا پھن کسی چیز سے کچل دیا گیا تھا۔ لڑکے نے سانپ کو دُم سے پکڑ رکھا تھا اور اسے گھما گھما کر دوسرے لڑکوں کو ڈرا رہا تھا۔ جو لڑکے ڈر رہے تھے وہ تو بھاگ کھڑے ہوئے اور جنھیں ڈر نہیں لگا وہ اطمینان سے کھڑے رہے، سانپ ان کے بدن پر لگتا رہا۔ لڑکے نے سانپ میری طرف بڑھایا تو میں چیخ مار کر بھاگا۔ سب لڑکے ہنسنے اور میرا مذاق اُڑانے لگے۔ آخر اس لڑکے نے سانپ کو ایک گڑھے میں ڈال دیا اور ہم آگے بڑھے۔ راستے میں بھی انھوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور یہ کہہ کہہ کر میری ہنسی اڑاتے رہے کہ میں مرے ہوئے سانپ سے بھی ڈرتا ہوں اور اسے چھونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اب جو ہم سنوں کے سامنے میری کرکری ہوئی اور سانپ سے میرے ڈرنے کا حال سب کو معلوم ہو گیا تو میری غیرت کو جوش آ گیا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ میں سب میں بودا ٹھہروں اور ڈرپوک کہلانے لگوں، اسی لیے میں نے کہہ دیا کہ مُردہ سانپ سے ڈرنا کیسا، میں تو زندہ سانپ سے بھی نہیں ڈرتا، اور اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کی دھن میں یہ بھی بتا گیا کہ ہمارے مکان میں دو دو سانپ ہیں جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں اور انھیں ہاتھ سے چھوتا ہوں۔ میری بات سن کر سب ہنس پڑے اور پھر میرا مذاق اڑانے لگے اور مجھ کو جھوٹا بنانے لگے۔ میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور خون کے گھونٹ پی رہا تھا کہہ بیٹھا کہ اگر تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہو اور میری بات کا اعتبار نہیں کرتے تو میں تمھیں وہ سانپ دکھا سکتا ہوں۔ چلو، سب مل کر میرے یہاں چلو۔ وہ سب کے سب خوشی سے چیختے ہوئے راضی ہو گئے اور میرے گھر کی طرف چل پڑے۔ ذرا دیر میں گھر آ گیا۔ ماں گھر پر موجود نہیں تھی۔ راستے بھر مجھے اس کا یہ کہنا یاد آتا رہا کہ سانپوں کے بارے میں نہ تو کسی سے کچھ کہوں، نہ کسی کو ان کا پتا نشان بتاؤں۔ لیکن اب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اور بہتے ہوئے پانی کو اٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔

اگر اب میں لڑکوں کو سانپ نہ دکھاتا تو وہ اسکول میں میری جان کو آ جاتے اور میں ہمیشہ کے لیے بزدل اور جھوٹا ہونے کی شرم میں مبتلا رہتا۔

میں نے سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ لڑکے میرے پیچھے پیچھے تھے صرف ہمارے پیروں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ سب خاموش اور دم سادھے ہوئے تھے۔ میرا دل سینے میں اس طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا۔ سانپوں کا سامنا کرنے کے خیال سے میرے ماتھے پر ٹھنڈا

ٹھنڈا پسینہ آگیا تھا اور پیر کانپ رہے تھے۔ کوٹھری کے دروازے پر پہنچا تو اس کی کنڈی کھولنے کے لیے میرا ہاتھ نہیں اٹھ رہا تھا۔ لیکن سب لڑکے میرے پیچھے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ جس لڑکے نے میدان میں مُردہ سانپ اُٹھایا تھا وہ آگے بڑھا اور بولا:

"میں سمجھ گیا۔ تمھارے یہاں گھراتی سانپ ہیں۔ مگر گھراتی سانپ تو کسی کو دکھائی نہیں جاتے۔ خیر اب دروازہ کھولو۔ ذرا دیکھیں تو!"

اور مجھے ہچکچاتے دیکھا تو اس نے خود آگے بڑھ کر ایک دم سے دروازہ کھول دیا۔

سب لڑکے گردنیں بڑھا بڑھا کر کوٹھری کے اندر دیکھنے لگے۔ کوٹھری کے فرش پر پانی کا برتن اور کھانے کا سامان تو تھا لیکن سانپوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ کچھ لڑکے دبے پاؤں اندر داخل ہوئے اور ہر طرف دیکھنے لگے مگر سانپ گویا کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔ ایک کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی تھی۔ طاقچوں میں کچھ برتن اور دوسرا کاٹھ کباڑ، اور بس۔ کچھ لڑکوں نے وہاں پانی کا برتن اور کھانا دیکھ کر وہاں سانپوں کا ہونا مان لیا لیکن بعض پھر بھی میری ہنسی اڑاتے رہے۔

لڑکوں کے جانے کے بعد میری بھی گھر میں ٹھہرنے کی ہمت نہیں ہوئی ماں کے آنے تک میں گلی میں گھومتا رہا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ میں اپنے گھر اور اپنی زندگی کا راز ظاہر کر دینے سے پریشان تھا، اسی لیے زبردستی دو تین نوالے حلق سے اُتار کر جلد ہی سو گیا۔

دوسرے دن میری ماں معمول سے پہلے ہی گھبرائی ہوئی جاگ پڑی۔ اس کی عجیب حالت تھی، چہرے کا رنگ اُڑا ہوا اور آنکھیں کچھ ایسی ہو رہی تھیں کہ ان کی طرف دیکھنے سے ڈر لگتا۔

وہ کچھ دیر تک کسی سوچ میں گم رہی، پھر لپک کر کوٹھری میں گئی اور ایک دو منٹ تک اندر رہی۔ میں سانس روکے ماں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا، کیا اسے وہاں سانپ ملیں گے؟ کبھی سوچتا کہ سانپ غائب ہو گئے ہوں گے اور ماں سمجھ جائے گی کہ میں نے کیا حرکت کی ہے۔ وہی ایک موقع تھا جب میرا دل چاہا کہ سانپ موجود ہوں اور ماں کو دکھائی دے جائیں۔ میں جانتا تھا کہ سانپوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ صحیح طریقہ نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد ماں باہر نکلی۔ کچھ دیر تک مجھ کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی، "کچھ پتا ہے؟ سانپ گئے! رات خواب میں آئے تھے، کہہ رہے تھے لوگ ان کا ٹھکانا جان گئے ہیں اس لیے وہ ہمارے یہاں سے جا رہے ہیں، ہمیشہ کے لیے، اور اب ہم پر جو کچھ بھی پڑے گی اس کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے بار بار میری آنکھ کھلتی رہی اور میں صلوات پڑھ کر اور شیطان پر لعنت بھیج کر سو جاتی تھی لیکن ہر بار یہی خواب آتا تھا۔ صبح تک ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ اب کوٹھری میں جا کر جو دیکھا تو خواب سچا تھا۔ سانپ گئے، کہیں پتا نہیں۔ میں سمجھتی ہوں اسی لڑکے نے کوئی گل کھلایا ہے۔"

پھر اس نے ڈانٹ کر مجھ سے معاملہ پوچھا۔ میں نے بھی جو کچھ ہوا تھا، سب کا سب بتا دیا۔ ماں نے یہ ماجرا سُنا تو اس کے سینے سے ایک آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس نے مجھے زیادہ کچھ تو نہیں کہا لیکن اتنا ضرور کہا:

"بیٹے! تم نے ہماری زندگی برباد کر دی۔ ہمارے گھر کا اقبال رخصت کر دیا، بدنصیبی کو دعوت دے دی۔ مجھے ڈر ہے اب تھوڑے ہی دن میں ہم محتاج اور دربدر ہو جائیں گے۔ یہ سانپ پشتوں سے ہمارے یہاں چلے آ رہے تھے۔ ہمارے گھر کے نگہبان تھے۔ انھیں شاید پتا تھا کہ تم ان کو بھگا کر رہو گے۔ ان کا دل تم سے نہیں مل رہا تھا، اسی لیے وہ تم سے دُور دُور رہتے تھے وہ جانتے تھے کہ تم کو اپنی زبان پر قابو نہیں، گھر کا راز نہیں چھپا سکتے۔ آخر تم نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ سانپ گئے اور ہم بے سہارا رہ گئے۔ مجھے تو یہ بھی ڈر ہے کہ خدانہ کردہ وہ تمھیں کوئی آزار نہ پہنچا دیں۔"

کئی دن تک میں سخت دہشت میں گرفتار اور ڈرتا رہا کہ کہیں کوئی سانپ مجھے ڈس نہ لے۔ ماں نے مجھ کو بہن کے گھر بھیج دیا۔ کئی دن تک وہیں رہا۔ اپنے گھر میں قدم نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتے بعد ماں نے آکر بتایا کہ اسے پھر خواب میں سانپ نظر آئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے کہ اگرچہ ان کو ہمارا گھر چھوڑ دینا پڑا ہے لیکن وہ ہم سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے اور مجھ سے بھی نہیں بولیں گے۔ اس لیے ماں مجھے گھر لے گئی۔

اس قصّے کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ میرے ابا کا کاروبار الٹ پلٹ ہو گیا۔ تہران سے جو مال وہ بیچنے کو لائے تھے اس کا مندا پڑ گیا اور بکری نہیں ہو سکی۔ ابا نے نقصان بھرنے کے لیے دوسرے دھندوں میں ہاتھ ڈالا لیکن سب میں گھاٹا ہی رہا۔ شہر بھر میں یہ بات پھیل گئی کہ ابّا دیوالیہ ہو گئے، اور

لین واں ان پر چڑھ دوڑے۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب ہاتھ سے جاتا رہا۔ مکان تک بک گیا۔ وہ شخص جس کے بھاگوان ہاتھوں کی دھوم تھی اور جو مٹی کو چھو دیتا تو سونا ہو جاتی، اس کا ایسا وقت بگڑا کہ کرائے کے ایک کمرے میں زمین پکڑ کے بیٹھ رہا اور تھوڑے سے ہی دن میں مر گیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ پریشانیوں اور کوفت نے ابا کی جان لے لی لیکن جن لوگوں کو سانپوں کے معاملے کی خبر تھی وہ جانتے تھے کہ اس بدبختی اور سیاہ روزی کا اصل سبب میں ہوں۔

باپ کے مرنے کے بعد مجھ کو اسکول چھوڑنا پڑا۔ مدت تک ڈرائیوری کی، اس شہر سے اس شہر دوڑتا پھرا۔ جان کھپا کر اور دوسرے ڈرائیوروں کی گالیاں کھا کھا کر پیسے جمع کیے اور ایک ٹیکسی خریدی۔ شہر کے باہر کی بستیوں کے پھیرے کرتا تھا۔ کام چل نکلا، اور قریب تھا کہ جم جاؤں اور گھر بسا لوں۔ ماں بھی خوش تھی۔ مگر ایک دن شام کے وقت جب میں سواریاں بٹھائے واپس آ رہا تھا، شہر کے قریب ایک موڑ اترتے ہوئے میری نگاہ اچانک ایک مُردہ سانپ پر پڑ گئی جس کا پھن کسی گاڑی کے نیچے آ کر پچی ہو گیا تھا، بالکل ویسا ہی سانپ تھا جیسے ہمارے یہاں تھے۔ دم بھر میں ایک عجیب سی وحشت سے میرا بدن کپکپا گیا۔ میں نے گاڑی کو ایک طرف کاٹا کہ سانپ اس کے نیچے نہ آنے پائے۔ اُس طرف ایک بڈھا اپنے خچر پر ڈھیروں لکڑیاں لادے پہاڑ سے اتر کر شہر جا رہا تھا، قریب تھا کہ دونوں کو روند ڈالوں۔ جلدی سے میں نے گاڑی کو پھر دوسری جانب کاٹا۔ اُتار کا راستہ تھا۔ بریک ماروں تو گاڑی اُلٹ جائے۔ اور یہی ہوا۔ ایک دو لڑھکنیاں کھا کے ہم ایک کھڈ میں جا پڑے۔ مسافروں میں سے دو وہیں کے وہیں ختم ہو گئے دو تین زخمی بھی ہوئے۔ میرا بھی ہاتھ ٹوٹ گیا، اور گاڑی تو ایسی مٹی کہ کسی کام کی نہ رہی۔

اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ دوڑنے دھوپنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں نے آوارہ گردی شروع کر دی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں، دو نوالوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اب خانساماں ہو گیا ہوں۔ ماں اکیلی بیٹھی میری لگائی ہوئی آگ میں جل رہی ہے۔ جب میری حالت پر اس کا دل کڑھتا ہے تو کہتی ہے:

"بیٹا! تم نے ہمیں بھی برباد کیا، خود بھی کہیں کے نہ رہے۔"

مغربی اُفق کی سُرخی سیاہی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ کالے بادل نے کسی بہت بڑے اژدہے کی طرح دارِ زعفران کی چھتری کو نگل لیا تھا۔ درخت کا تنہ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آگ کے شعلوں میں کوئی ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو۔

سیّد نے کہا:

"اور آج، قسمت کا لکھا یہ تھا کہ ہم اُس درخت کو دیکھنے جائیں اور وہاں ہمیں مُردہ سانپ دکھائی دے جائے۔ یہ اشارہ ہے اِس کا کہ مجھ کو جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ جاتا ہوں، بستر باندھ لوں۔ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔"

□□

غزل

گھر کی دیوار کتنی اونچی ہے
زندگی دھوپ کو ترستی ہے

جانے کیسا زہر ہے ہواؤں میں
سانس لینے میں سانس رکتی ہے

کھل نہ جائے کہیں بھرم اس کا
اس لیے بند اس کی مٹھی ہے

کیسے خود کو اجاڑ کر دیکھوں
میرے اندر بھی ایک بستی ہے

عکس میرا بکھرنے لگتا ہے
ضرب جب آئینے پہ پڑتی ہے

ظفر اقبال ظفر
۱۷۰- جیلدار، فتح پور- ۲۱۲۶۰۱

ہم آخری پہاڑی چڑھ رہے تھے۔ ہمارے خیمے تھوڑی ہی دور رہ گئے تھے

ڈاکٹر آصفہ زمانی
صدر شعبۂ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی - لکھنؤ

مہاتما گاندھی کا فلسفہ اور فارسی شعر و ادب

گاندھی جی ایک فلسفی اور مفکر کا ذہن و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے انھوں نے اپنے اصولوں کو گفتار و کردار کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا، اس کے لیے انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں، لیکن بڑی سے بڑی طاقت انھیں اپنے مقصد کی حصولیابی سے باز نہ رکھ سکی۔ لیکن یہاں تو ہر سقراط کو جامِ اجل پیش کیا جانا اس کا مقدر بن چکا ہے، انجام کار انھیں بھی جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ تقریباً نصف صدی پر محیط ان کی تگ و دو کا بظاہر ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو خاتمہ ہو گیا۔ لیکن ان کے اصول اور نظریات نے جو دور رس اثرات مرتب کیے وہ انسانی عظمت کا لا فانی نقش بن گئے۔

گاندھی جی نے نہ تو فلسفہ یا سائنس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، نہ انھوں نے فلسفہ سے متعلق باقاعدہ کوئی کتاب تصنیف کی۔ ۱۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو جب "ینگ انڈیا" میں تین مضامین کی اشاعت پر، بغاوت کے الزام میں انھیں گرفتار کیا گیا تو جیل میں انھوں نے آپ بیتی کے طور پر گجراتی زبان میں Search for Truth لکھنا شروع کی، جس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے "تلاشِ حق" کے نام سے کیا، جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۹ء کے قریب شائع ہوا۔ اس میں اگرچہ انھوں نے اپنے قیام جنوبی افریقہ کے حالات زندگی درج کیے تھے لیکن اگر اسے ان کے نظریات کا نچوڑ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

فارسی شعر و ادب کا گاندھی جی کے فلسفہ سے کیا تعلق ہے، اس پر بحث کرنے سے پہلے گاندھی جی کی فلسفیانہ فکر کی وضاحت ضروری ہے گاندھی جی نے وقتاً فوقتاً اس کا اظہار یوں کیا ہے:

"وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے، جس کی آرزو اور سعی میں، میں تیس سال سے بے چین ہوں "معرفتِ نفس" "دیدارِ الٰہی" اور "حصول موکش" ہے۔ یہی تلاش، یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے، یہی میری زندگی ہے، میری تحریر و تقریر اور میری سیاسی جد و جہد کا یہی مقصد ہے۔"

ایک دوسری جگہ اس طرح اظہار خیال کیا ہے، لکھتے ہیں:

"مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھار نظر آگئے، اُن سے اُس نورِ محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرّۂ بے نور ہے۔ سچ پوچھیے تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ فروغِ تجلّی کا ایک خفیف سا پرتو ہے۔ مگر اتنا میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اُسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو "اہنسا" کی تکمیل کر چکا ہو۔ حق وہ رُوحِ کلی ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے، انسان اس کے جلوے کی تاب تب ہی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔"

ایک جگہ تزکیۂ نفس اور "اہنسا" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس کیے بغیر "تزکیۂ نفس" ناممکن ہے۔ جب تک نفس آلائشوں سے پاک نہ ہو جائے "اہنسا" کے قانون کی پابندی محض خیالِ خام ہے۔ جو شخص عفت سے محروم ہے، اسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ "تزکیۂ نفس" کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں عفّت برتی جائے، پاک نفسی میں خدا نے بڑی تاثیر دی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ مگر تزکیۂ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے، کامل عفّت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خیال۔ قول اور فعل میں جذبات

کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ محبّت اور عداوت، رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔"

ان اقوال سے مجموعی طور پر جو باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) یہ کائنات فانی ہے۔ اگر کوئی مستقل جوہر ابدی ہے تو وہ خدا کی ذات ہے۔

(۲) انسان اس وجود کا ایک حصّہ ہے، لہٰذا وہ کل مخلوق کو ایک ہی وجود حقیقی کا حصّہ مان کر ایک رشتۂ اتحاد و محبّت میں مربوط ہو جائے بالفاظ دیگر "ہنسا" (تشدّد) ترک کر کے "اہنسا" (عدم تشدّد) کو اختیار کرے۔

(۳) انسان اگر کسی ذی روح کو تکلیف دیتا ہے تو گویا اسے اپنی حقیقت کا علم نہیں یعنی وہ "معرفتِ نفس" سے بیگانہ ہے۔

(۴) ہنسا یا تشدّد، غصّے اور نفرت کے شدید جذبات سے پیدا ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس پر قابو حاصل کیا جائے جسے تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔

(۵) تزکیۂ نفس صرف خیال سے نہیں بلکہ قول و فعل سے بھی ہونا چاہیے یہی معرفت کی پہلی سیڑھی ہے۔

یہ ہے گاندھی جی کے فلسفہ کا نچوڑ، جو انسانی زندگی کے لیے اعلیٰ اخلاقی تربیت کا حامل ہے۔

گاندھی جی کا یہ فلسفہ کوئی نیا فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام اب سے چودہ سو سال پہلے اس کی منادی کرا چکا ہے۔ یہاں "دیدارِ الٰہی" کی تڑپ بھی ہے جو وحدانیت کی علمبردار ہے۔ ان کے "اہنسا" لفظ میں حضرت عیسیٰ کا وہ درس بھی شامل ہے کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو تم بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ ان کے معرفتِ نفس میں اس حدیثِ نبوی کی جھلک موجود ہے جہاں فرمایا گیا:

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

غرض ان کا یہ فلسفہ روحانیت اور تصوّف کی راہ سے ہو کر بھی گزرتا ہے۔

تصوّف ایک مخصوص عقائد و افکار کا مجموعہ ہے۔ ایران میں ان عقائد کا ظہور بہت قدیم ہے۔ اس میں بتدریج وسعت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ فارسی شعر و ادب میں ان کا پُرزور و پُرشور مظاہرہ کیا گیا۔ ایران میں تصوّف کے دو شعبے ہیں۔ ایک "منفی" جو ترکِ دنیا سے عبارت ہے دوسرا "مثبت" جو سلوک، جستجو، طلب، اخلاص، عبادت، ایثار، بے غرض خدمت، تربیتِ نفس، محبّت، معرفت اور عشقِ الٰہی تک پہونچنے اور اس ہستی میں فنا ہونے میں مضمر ہے اس کی اساس عشق و محبت، خدمتِ خلق اور تزکیۂ نفس پر رکھی گئی ہے۔

ایران کے عارف اور صوفی شعراء و ادبا نے انھیں افکار و خیالات کو شیریں ترین نظم و نثر میں پیش کیا جس کے روشن منارے سنائی، عطار اور مولانا روم ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کے صوفی شاعر سنائی جنھوں نے باطن کی خوب سیر کی تھی اور تزکیۂ نفس کے تمام پر پہونچ چکے تھے، ان کا دل آتشِ عشق سے روشن تھا۔ یہی مطالب ان کے دیوان اور ان کی مثنویوں میں موجود ہیں ؎

منم بندۂ عشق تا زندہ باشم
اگرچہ ز مادر من آزاد زادم

سنائی کی مشہور مثنوی "حدیقہ" (۵۲۵ھ) کا ذکر یہاں خاص طور پر ضروری ہے جس میں انھوں نے اخلاقی مضامین اور سودمند نصائح کو صوفیانہ مسائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خود پرستی کی مذمّت، ترکِ غرور اور بیہودہ گوئی کی ممانعت جیسے مضامین اس کی خصوصیات ہیں۔

کیا سنائی کی یہ تعلیمات گاندھی جی کے فلسفہ کے منافی ہیں؟

اس سلسلے میں دوسرا اہم نام شیخ فریدالدین عطار کا ہے جو چھٹی صدی ہجری کے وسط یعنی خراسان کے سلجوقیوں کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے تمام عمر طریقِ عرفان میں سلوک کی سیر کی اور تا زندگی عشقِ الٰہی کی آگ میں جلتے رہے۔ صوفی شعراء کی صف میں سنائی و عطار، دو ایسے باعظمت نام ہیں جن کو عارف شاعروں کے امام مولانا جلال الدین رومی نے بھی اپنا بزرگ و پیشوا مانا ہے ؎

عطار روح بود، سنائی دو چشم او
ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

یوں تو ان کی تصنیف "تذکرۃ الاولیا" ان کے قصائد، شور انگیز غزلیں اور ان کی بیشتر مثنویاں عرفانی نکات کی حامل ہیں لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کی

مثنوی "منطق الطیر" ہے جس میں حدیث نبویؐ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کو بنیاد بناکر پرندوں کی زبانی تمثیل پیرایۂ بیان میں حکایت کے طور پر سات مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اول مقام جستجو و طلب ہے، دوسرا مقام 'عشق' ہے۔ تیسرا مقام 'معرفت' ہے۔ چوتھا مقام 'استغنا' ہے، یہی تزکیۂ نفس ہے۔ پانچواں مقام توحید یعنی خدا کی ہستی کو واقعی ہستی تسلیم کرنا ہے چھٹا مقام 'حیرت' ہے جہاں پہونچ کر پتہ چلتا ہے کہ انسان کے تمام علم محدود تھے، ساتواں مقام 'فنا' ہے۔ یہاں تمام خود پرستیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں اور وہ عالم وحدت کا ایک جز بن جاتا ہے۔ اسی "فنا" سے اسے 'بقا' نصیب ہوتی ہے۔

ہر کہ در دریای کل گم بودہ شد
دائماً گم بودہ و آسودہ شد

اس وقت "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کا راز اس پر آشکارا ہو جاتا ہے۔ شیخ عطار کا درس خود شناسی، شہوت کو دبانا، زندگی کو نکوکاری اور خدمتِ خلق میں گزارنا۔ تمام ذرّے ایک ہستی کے ذرّے ہیں ان کا ہستی حق میں فنا ہو جانا وغیرہ جیسے مضامین کیا گاندھی جی کے فلسفہ معرفت نفس، دیدار الٰہی اور حصول موکش کا اظہار نہیں ہیں؛

اس سلسلہ کا تیسرا اہم نام مولانا جلال الدین بلخی (پ: ۶۰۴ھ) کا ہے۔ اقبال جنھیں اپنا پیر و مرشد مانتے ہیں، جن کی مثنوی کو زبان پہلوی میں قرآن کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی مثنوی کا لب لباب یہ ہے کہ دنیا کی ہستی ایک ادر ہے اور وہ خدائے واحد کی ذات ہے۔ ہماری روح اس ہستی کی ایک شعاع ہے، یہ اپنے دلدار کے حسرت دیدار میں اپنی مدّت بسر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ظلماتی حجابات کو چاک کرکے اپنی اصل سے جا ملے۔ کور بینوں کو روح کی یہ آواز سنائی نہیں دیتی ہے وہ مجبور ہیں ؎

بشنو از نی چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا نمایم شرحِ دردِ اشتیاق

عاشق صادق کو اپنی تمام سہولتوں اور اپنی ساری غرض کو ختم کر دینا چاہیئے۔

چون غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوی دیدہ شد

عارفوں کی نظر میں ساری دنیا ایک حقیقت کی مظہر ہے۔ اختلافات رنگ و نسل اس کے جہل کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت کو صرف حقیقت بیں آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ریاضت اور تہذیب نفس لازمی ہے۔ دل جمعی کا راستہ وحدت ہے۔ یہی چیز اقوام کو بیگانگی کی جگہ یگانگت سکھاتی ہے

ای بسا ہندو و ترک ہم زبان
ای بسا دو ترک چون بیگانگان

پس زبان ہمدلی خود دیگر است   ہمدلی از ہم زبانی بہتر است

کیا گاندھی جی کا فلسفہ، روحانی اتحاد، اہنسا یا عدم تشدد اور موکش اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے۔

اس کے علاوہ بھی فارسی شعر و ادب میں بہت سے نام ایسے ہیں جو اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ کیا شیخ سعدی کی "گلستان و بوستان" کا موضوع گاندھی جی کے فلسفہ یگانگت و اتحاد و اتفاق کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ جہاں وہ کہتے ہیں:

بنی آدم اعضای یک دیگرند   کہ در آفرینش ز یک جوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار   دگر عضوہا را نماند قرار

ناصر خسرو کے بیشتر قصائد ایمان و معنویت کی دعوت دیتے ہیں اور ریاضت و تقوی کی تشویق کرتے ہیں۔ جمال الدین اصفہانی فروتنی؛ عدم تشدد کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ؎

طاعت فرمان ایزد شفقتی بر خلق او
در ہمہ حال این دو معنی را شعار خویش کن

حافظ شیرازی کا درس بھی یہی تھا ؎

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عرفی شیرازی نے فلسفیانہ مضامین سے غزل کو روشناس کرایا۔ لیکن وہ نرا فلسفی نہیں، شاعر بھی ہے اس لیے فلسفہ جیسے خشک موضوع کو تشبیہات و استعارات کی چاشنی سے لطیف بنا دیتا ہے۔ اس کا مختصر رسالہ نفسیہ اخلاقی و عرفانی لحاظ سے نرم کلامی کی دعوت دیتا ہے۔

اقبال کے فلسفہ خودی کی اساس بھی خود شناسی یا معرفت نفس پر قائم ہے

البتہ وہ "موکش" یا "نجات" کے اس نظریے کے خلاف ہیں جہاں قطرہ سمندر میں مل کر اپنا وجود کھو دیتا ہے یعنی صرف خدا موجود ہے اور انسان موہوم۔ وہ انسانی ہستی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے اندر خدائی صفات پیدا کرنے کے حامی ہیں جیسے حرارت آگ میں پڑا لوہا اپنی ہستی کو برقرار رکھتے ہوئے آگ کے خواص اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ ایسے ہی کتنے نام ہیں جو اس ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی گاندھی جی نے جس فلسفہ کو بیسویں صدی میں پیش کیا، فارسی شعر و ادب میں سات سو سال پہلے یہ نظریات اپنی جگہ بنا چکے تھے لیکن اس میں بھی دو رائیں نہیں کہ بیسویں صدی کے ہندوستان کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو مادیت سے پرے روحانیت کی آواز بلند کرتا، سو وہ کام گاندھی جی نے کیا۔ اس نحیف و لاغر شخص نے سارے عالم کو دکھا دیا کہ روحانیت میں بڑی طاقت ہے، وہ مخالف ہواؤں کا رخ موڑ سکتی ہے۔

□□

اپنی کہانی اپنی زبانی ـ ـ ـ ـ ـ صفحہ ۲۰ کا بقیہ

"جناب راجندر بہادر موج ایک کہنہ مشق اور معتبر شاعر ہیں، ان کی شاعری پرخلوص، شستہ زبان، عمیق تجربات اور شدت احساس پر مبنی ہے۔"

——— رسالہ آجکل نئی دہلی

"موج در موج" ایک اچھے قادر الکلام صاحب طرز مسلم الثبوت شاعر جناب راجندر بہادر موج کا مجموعۂ کلام ہے۔ محسوسات اور جذبات دونوں کو شعر کے حسین پیکر میں ڈھالنے کا فن موج صاحب کو آتا ہے۔"

——— قومی آواز، لکھنؤ

"غزلیں زیادہ تر کلاسیکی انداز میں کہی گئی ہیں لیکن شاعر (موج) نے بڑے سلیقے سے ان پرانی راہوں پر بھی ایسے نقش چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے جنھیں شاعر کا اپنا نقش کہا جا سکتا ہے۔"

——— ہفت روزہ بلٹز بمبئی

"موج صاحب خوش گو شاعر ہیں اور سیدھے سادے انداز میں اپنے جذبات نظم کر لیتے ہیں۔" ——— رسالہ فاران، کراچی

"موج صاحب نے روانی غضب کی پائی ہے اور تخلص کو اکثر اشعار میں خوب استعمال کیا ہے۔" ——— صدق جدید، لکھنؤ

میں زندگی اور ادبی دنیا کے بہت خوش گوار دور سے گزر رہا تھا۔ میرے تین فرزند، وجے کمار پتر کار، ڈاکٹر امر دیپ ساکن نیش ولاد ہرہ دون، اور کلدیپ ایڈووکیٹ، ایک دختر کلپنا جوہری ہے جس کے شوہر مین پوری کے مشہور ایڈووکیٹ راجیندر موہن جوہری ہیں۔ یکایک ۲۹ مارچ ۱۹۹۴ء کو میرا فرزند خورد کلدیپ، حرکت قلب بند ہو جانے سے ۳۹ سال کی جواں عمری میں، تین معصوم بچے عزیزی انکر، دیپتی اور رجت کو چھوڑ کر داغ مفارقت دے گیا۔ جس کے صدمہ جاں خراش نے میری ۷۵ سال کی عمر پر اور میری اہلیہ کی ۷۲ سال کی عمر پر، ہم دونوں کو متزلزل کر دیا۔ میری رفتار کارکردگی اور قلمی رفتار مدھم ہو گئی۔ زندہ تو ہوں، سارے معاملات و معمولات زندگی بھی نباہ رہا ہوں ـــ مگر ؎

وہ وقت بھی آ ہی گیا ٹلتے ٹلتے
ہارا ہوں رہِ زیست پہ چلتے چلتے
دن ڈوب رہا ہے موج کہ اب مہر حیات
دھرتی پہ اتر آیا ہے ڈھلتے ڈھلتے ـــ موج

□□

غزل

فصلِ بہار میں ہے گُلِ تر لہو لہو
یعنی مرے جہاں کا ہے منظر لہو لہو
مقتل میں آج دیکھ کے اک بیگناہ کو
غم سے ہوئی ہے چشمِ ستم گر لہو لہو
باہر کا جو سماں ہے وہ دیکھا نہ جائے گا
ماحول کرب ناک ہے منظر لہو لہو
مجھ کو یہ غم نہیں کہ میں مارا گیا یہاں
اب بھی ہے رہ گزار کا پتھر لہو لہو
قاتل انھیں نہ کہیے وہ معصوم ہیں نسیم
دامن ہے سرخ سرخ نہ خنجر لہو لہو

شمس الاسلام نسیم
۲۲۴/۲۵۶ بخشی بازار، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

غزل

کسی کے وعدۂ فردا پہ یہ خوشی کب تک
خوشی رفیق بنے بھی تو زندگی کب تک؟

ابھی تو دل میں چراغِ اُمید باقی ہے
کسے خبر کہ رہے گی یہ روشنی کب تک

کبھی ضمیر کی آواز بھی سنو تو سہی
ہم اہلِ درد سے آخر یہ بدظنی کب تک

ہر اک کے غم کا مداوا تو ہو گیا لیکن
ہماری آنکھوں میں اے چارہ گر نمی کب تک

اسی دیار کی خوشبو ہے میری سانسوں میں
نہ جانے سمجھو گے تم مجھ کو اجنبی کب تک

طبیعتوں میں ہے جو فرق کیسے کم ہوتا
فقیہ شہر سے رندوں کی دوستی کب تک

ہے تھوڑی دیر کا احساسِ کیف آخرِ شب
نسیم چلتے ہی محبوبؔ چاندنی کب تک

پروفیسر محبوب پاشا
امیر محل۔ چنتنی ۔ ۱۴
۶۰۰۰۱۴

دوہے

آسمان گرتا ہوا لیا ادھر میں تھام
ہم نے آنکھوں سے لیا ننھو ہاتھوں کا کام

دُنیا کی گھڑ دوڑ میں، کیا پکھوے کا ساتھ
سودا بڑی دُکان کا، بکتا ہاتھوں ہاتھ

موتی برسے فرش پر امبر سے اس بار
ہاتھ کٹے سب جوہری مُنہ تکتے لاچار

بھاری ہے اس ماہ بھی، بیرن اداس رات
ماٹی کے سورج بکے دن بھر ہاتھوں ہاتھ

ہم بھی جیون کا جوا، کھیلے خالی ہاتھ
جیسے بچہ کھیلتا پرچھائیں کے ساتھ

جس گھر جنمے لائے ہم نو من سونا ساتھ
جب جب لوٹے لے گئے ماٹی دونوں ہاتھ

ایک تو چہرہ بدنما اور ہاتھ نہ پاؤں
تم اپنا "پہچان پتر" بھول آئے کس گاؤں

بھگوان داس اعجاز
ڈی - ۴۵۱، بلجیت نگر
نئی دہلی
۱۱۰۰۰۸

غزل

آغوش میں کرگس کے جو شاہین پلے گا
کرگس ہی بنے گا نہ وہ شاہین رہے گا

پہنچے گی ترے گھر میں بھی کچھ روشنی اس کی
کمرے میں اگر میرے دیا کوئی جلے گا

صدیوں کی تھکن جس کو وراثت میں ملی ہو
وہ کیسے بھلا اپنے قدم آگے رکھے گا

اربابِ خرد جشنِ طرب اور منالیں
کچھ اور ابھی دیر سے دیوانہ اُٹھے گا

اس دور کا وہ سب سے بڑا ہوگا مجاہد
اس دور میں جو میری طرح فوق جیے گا

ڈاکٹر فوق کریمی
کریمی بلڈنگ
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ (یو۔پی)

ڈاکٹر افغان اللہ خاں
شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

رام پرشاد بسمل

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے شہیدوں میں رام پرشاد بسمل ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کاکوری ڈکیتی کیس میں ماخوذ ہوئے تھے اور انھیں دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ پھانسی کی کوٹھری کے اندر موت کے سائے میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی۔ اسے انھوں نے جیل کے ایک وارڈن کے ہاتھ گورکھپور کے مشہور کانگریسی رہنما اور ہندی اخبار "سودیش" کے ایڈیٹر شری دشرتھ پرشاد دویدی کے پاس بھجوا دیا۔ پوری سوانح عمری تین قسطوں میں باہر آئی۔ آخری قسط بسمل کے پھانسی پانے کے ایک دن پہلے باہر آئی تھی۔ دویدی جی نے ان کا غذات کو گنیش شنکر ودیارتھی کے پاس بھیج دیا۔ اور انھیں کے زیرِ اہتمام "کاکوری کا شہید" کے عنوان سے یہ سوانح عمری شائع ہوئی۔ شائع ہوتے ہی انگریزی سرکار نے اسے ضبط کر لیا۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ شری چھابر مل شرما کے کتب خانے میں محفوظ رہ گیا۔ اسی کی مدد سے شری بنارسی داس چترویدی نے "امر شہید" کے نام سے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہاں اسی سوانح عمری کی مدد سے رام پرشاد بسمل کے حالات پیش کیے جا رہے ہیں۔

رام پرشاد کا آبائی وطن تومار دھا تھا جو گوالیار میں چمبل ندی کے کنارے واقع ہے لیکن ان کے بزرگ ترکِ وطن کر کے شاہجہاں پور میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "میرے دادا شری نرائن لال جی کا جنم یہیں تومار دھا میں ہوا تھا۔ وہ خاندانی جھگڑے اور بھابھی کی بداخلاقی سے پریشان ہو کر اپنے پیدائشی مقام کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ادھر ادھر بھٹکتے رہے — آخر میں اپنی بیوی اور دو لڑکوں کے ساتھ شاہجہاں پور پہونچے۔ انھیں دونوں لڑکوں میں بڑے لڑکے شری مرلی دھر جی میرے والد تھے"۔ شاہجہاں پور میں ان کے خاندان کو بڑے برے دن دیکھنے پڑے۔ ان کے والد میونسپلٹی میں پندرہ روپئے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ یہاں ۱۸۹۷ء (اٹھارہ سو ستانوے) میں رام پرشاد بسمل کی پیدائش ہوئی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی رام پرشاد انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ اس لیے تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ انھوں نے اردو کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے حاصل کی اور ہندی سے ان کے والد نے روشناس کرایا — انھیں کے الفاظ میں:

> "جب میں سات سال کا ہوا تو والد صاحب نے خود ہی مجھے ہندی الفاظ سے روشناس کرایا اور ایک مولوی صاحب کے مدرسے میں اردو پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ جب میں نے اردو کا چوتھا درجہ پاس کیا اور پانچویں میں میرا داخلہ ہوا تو اس وقت میری عمر لگ بھگ ۱۲ سال کی تھی۔

رام پرشاد نے نویں درجے تک تعلیم پائی۔ اسی تعلیمی دور میں وہ چند بری عادتوں کے بھی شکار ہوئے۔ وہ اپنے والد کے صندوق سے روپے چرانے لگے۔ اس پیسے سے وہ ناول خریدتے اور پڑھتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سگریٹ اور بھنگ کے بھی عادی ہو گئے —

> "میں سگریٹ پینے لگا تھا۔ کبھی کبھی بھنگ بھی چڑھا لیتا تھا۔ میں ایک روز بھنگ چڑھا کر والد صاحب کے صندوق سے روپیہ نکالنے لگا۔ نشے کی حالت میں ہوش نہ رہنے کی وجہ سے صندوق کھولنے کی آواز دب نہ سکی۔ ماں کو شبہ ہو گیا اور انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں رام پرشاد بسمل آریہ سماج تحریک کے

حامیوں میں سے تھے اور اس کے جلسے اور جلوس میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔

"میں تھوڑے دنوں میں کٹر آریہ سماجی بن گیا۔ آریہ سماج کے جلوس میں جاتا اور آریہ سماج کے مہاتماؤں کی سیوا کرتا۔"

انھیں مہاتماؤں میں ان کے اُستاد شری ۱۰۸ سوامی رام دیوجی تھے، رام پرشاد ان سے بے حد متاثر تھے، لکھتے ہیں:

"اپنی ماں کے علاوہ جو کچھ میں نے زندگی میں حاصل کیا یا تعلیم پائی وہ محترم شری ۱۰۸ سوامی رام دیوجی کی مہربانی کا نتیجہ ہے، آپ کا نام شری برج لال چوپڑا ہے۔"

اپنے انقلابی ذہن کی بنا پر وہ ہر تحریک کو لبیک کہتے تھے مگر کوئی تحریک ایسی نہیں تھی جو ان کے ذہن کو پوری طرح مطمئن کر سکتی۔ شاہ جہاں پور میں شری رام باجپئی نے "سیوا سمیتی" کی بنیاد ڈالی۔ اس میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر دراصل رام پرشاد کی انقلابی زندگی کا آغاز کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں دسمبر ۱۹۲۱ء میں شرکت کے بعد ہوا۔ وہ اس وقت نویں درجے کے طالب علم تھے۔ لکھنؤ آکر انھیں معلوم ہوا کہ ایک ایسی خفیہ تنظیم بھی کام کر رہی ہے جو مطالبات کے ذریعہ نہیں بلکہ بغاوت کے ذریعہ آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ راستہ پُرخطر تھا مگر آزادی کی لگن نے انھیں خطرات سے بے نیاز کر دیا۔ اپنے ایک دوست کی مدد سے وہ اس خفیہ تنظیم کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے اور اس تنظیم میں دل وجان سے لگ گئے۔ یہ تنظیم اس وقت مالی مشکلات سے دوچار تھی۔ روپئے کی کمی کی بنا پر بہت سے کام رُکے پڑے تھے۔ روپیہ اکٹھا کرنے کے لیے ان لوگوں نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "امریکا کو آزادی کیسے ملی؟" یہ کتاب بکنے بھی نہ پائی تھی کہ ضبط کر لی گئی۔ ساتھ ہی ایک کتابچہ بہ عنوان "دیش واسیوں کے نام سندیش" بھی چھپوایا گیا۔ یہ کتابچہ پنڈت گیندا لال کی گرفتاری کا ردعمل تھا۔ گیندا لال جی کے ساتھ ہی گوالیار میں برہم چاری جی بھی گرفتار ہوئے۔ روپوں کی کمی کے باوجود یہ تنظیم کچھ اسلحہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

"ہم نے تین رائفلیں، ایک بارہ بور دونالی کارتوس بندوق، دو ٹوپی دار بندوقیں، تین ٹوپی دار ریوالور اور پانچ کارتوسی رائفل خریدیں۔ مگر اس کے باوجود جو ہتھیار تنظیم اپنے لیے ضروری سمجھتی تھی وہ میسر نہ تھے۔ اسلحہ خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور پیسے تھے نہیں۔ کتاب بیچ کر روپیہ جمع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب ہمارے لیے سب سے اہم ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ تھا کسی بھی قیمت پر روپئے کی فراہمی۔ اور اس کا ایک ہی ذریعہ نظر آتا تھا "ڈاکہ"۔ اس وقت تنظیم کی حالت بہت خراب تھی اور روپیوں کا انتظام بہت ضروری تھا۔ لیکن وہ کیسے ہو دان کوئی دیتا نہ تھا، قرض ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ آخر ڈاکہ ڈالنا ہمیں پسند نہیں تھا۔ سوچا اگر لوٹنا ہی ہے تو سرکاری مال کیوں نہ لوٹا جائے۔"

انھوں نے ایک منصوبہ بنایا اور کاکوری میں ایک مسافر ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ بسمل ہی کی زبان سے اس ڈاکہ کی تفصیل سنئے:

"ہم نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روکی اور ٹرین کو گھیر لیا۔ مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ سب گاڑی میں چڑھ جائیں، اس لیے کہ زیادہ تر مسافر گاڑی رُکنے کی وجہ سے ٹرین کے باہر آ گئے تھے۔ گاڑی کا گارڈ بھی ڈبے میں چڑھنا چاہتا تھا مگر ہم لوگوں نے اسے زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا، تاکہ بغیر گارڈ کے گاڑی نہ جا سکے۔ دو آدمیوں کو لائن کے نزدیک پگڈنڈی پر کھڑا کر دیا گیا کہ وہ گھاس اور جھاڑیوں کی آڑ سے گاڑی پر گولی چلاتے رہیں۔ ایک آدمی گاڑی سے اترا اس کے پاس بھی پستول تھا اور اسی کے پستول سے ایک آدمی زخمی ہو گیا۔ میں نے اس کا انتظام کر دیا تھا کہ اگر کوئی بندوق لے کر سامنے نہ آئے یا مقابلے میں گولی نہ چلے تب تک کسی آدمی پر فائر نہ ہونے پائے۔ میں کسی آدمی کے قتل کے بعد اس کو خطرناک ڈکیتی کیس بننے نہیں دینا چاہتا تھا۔"

یہ یقیناً ایک کامیاب ڈاکہ تھا اور اس طرح ان لوگوں کے ہاتھ بہت سا روپیہ آیا۔ اس کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا انتظام اس طرح کیا گیا:

"صندوق کو توڑ کر تین تین تھیلیاں بنالی گئیں اور پھر راستے میں ان تھیلیوں سے روپیہ نکال کر ایک جگہ باندھ لیا گیا اور لکھنؤ

پہنچے۔ کسی نے راستے میں پوچھا تک نہیں کہ تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔"

اس طرح دس آدمیوں نے ایک گاڑی کو لوٹ لیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس گاڑی میں ۱۴ آدمی ایسے تھے جن کے پاس بندوقیں یا ریوالور تھیں۔ کاکوری میں ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹے جانے کے بعد پولیس چوکنا ہو گئی تھی۔ بہت زوروں کے ساتھ جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔ خفیہ پولیس کے افسران سرگرم عمل ہو گئے اور آخرکار اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئے۔ رام پرشاد بسمل کی گرفتاری عمل میں آئی۔

"صبح چار بجے میں جاگا۔ ضروری حوائج سے فارغ ہو ہی رہا تھا کہ باہر دروازے پر بندوق کے کندوں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس آگئی۔ میں فوراً دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ایک پولیس افسر نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں گرفتار ہو گیا۔"

ادھر ان کے بقیہ ساتھی بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ جیل میں سب لوگوں کو الگ الگ رکھا گیا۔ اس دوران خفیہ پولیس اس بات کے لیے کوشاں رہی کہ بسمل کو سرکاری گواہ بنا لیں۔ بسمل کو سرکاری گواہ بنانے میں تو وہ ناکام رہے لیکن ان کے ایک ساتھی بنارسی داس کو سرکاری گواہ بنانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

سرکاری طور پر دکھاوے کے لیے شناختیں کرائی گئیں اور یہ سب کام ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوتا رہا مگر بعد میں یہ مقدمہ سشن کو سپرد کر دیا گیا۔ جب تک یہ معاملہ عدالت میں آئے اس وقت تک رائے بریلی میں بنواری لال بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ بسمل نے ہرکرن ناتھ کو بلوایا اور کہا کہ وہ سب کام چھوڑ کر جائیں اور بنواری سے ملیں۔ کیونکہ بسمل یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر ہم لوگوں نے کوئی قانونی قدم نہ اٹھایا تو دامودر سیٹھ کی طرح جیل میں سڑا دیئے جائیں گے۔

جیل میں بسمل اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرنے لگے اور کبھی کبھی یہ اکیلاپن ان کو جیل میں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ

"ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ سرکار سے سمجھوتہ کر لیا جائے۔ خفیہ پولیس کے کپتان اور بیرسٹر سے بات چیت شروع ہوئی مگر یہ سوچ کر کہ اس سے انقلابی تحریک کی عزت ختم ہو جائے گی، یہ خیال ترک کر دیا گیا۔"

اور اس وقت تک ان لوگوں پر باقاعدہ مقدمہ تیار ہو چکا تھا۔ مسٹر ہارٹن کاکوری کیس کو دیکھ رہے تھے انھوں نے ۲۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کو تقریباً تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ خفیہ پولیس کے افسران نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے کمرے سے دو ریوالور بھی برآمد کر لی تھیں۔ گرفتار ہونے والوں میں رام کرشن کھتری، پرمیش کمار چٹرجی اور یوگیش چندر چٹرجی بھی شامل تھے بعد میں اشفاق اللہ خاں بھی گرفتار ہو گئے۔ ۳۰ سے زائد گرفتاریاں عمل میں آئیں مگر مقدمہ صرف ۲۸ لوگوں پر چلایا گیا۔

رام پرشاد بسمل اپنے دوستوں میں اگر کسی سے متاثر تھے تو وہ اشفاق اللہ تھے۔ بسمل اشفاق کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے حالاں کہ وہ بڑی حد تک آریہ سماجی تھے۔

"... تھوڑے ہی دنوں میں تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو گئے۔ سبھوں کو تعجب ہوا کہ میں ایک کٹر آریہ سماجی اور تم ایک مسلمان دونوں کا کیا میل ..... مگر تم میرے ساتھ آریہ سماج مندر میں آتے جاتے تھے۔ کیونکہ تمھارا دل بالکل صاف تھا تمھاری صاف گوئی نے میرا دل جیت لیا تھا کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں بات چھڑتی کہ کہیں مسلمان پر اعتبار کر کے دھوکا نہ کھا جائیں مگر جیت تمھاری ہوئی۔ ہم لوگوں نے ایک ہی تھالی میں کھانا کھایا۔ میرے دل سے یہ خیال نکل گیا کہ میں ہندو ہوں تم مسلمان۔ مجھے تم پر اٹوٹ اعتبار تھا۔ تم بھی میری طرح کٹر انقلابی تھے، تمھاری ذات کا صرف یہی کام تھا کہ تم زیادہ سے زیادہ مسلم نوجوانوں کو انقلابی بناؤ، تنظیم میں بھرتی کرو، اور وہ انقلاب میں حصّہ لیں، گرفتار ہو جانے کے بعد بھی تمھارے خیالات میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

اسی طرح کے خیالات سے بسمل کی سوانح عمری بھری پڑی ہے۔ پھانسی سے تین روز پہلے بسمل نے جو صفحات قلم بند کیے ان میں بھی وہ اشفاق اللہ کو نہیں بھولے۔

وہ صفحات جو پھانسی پانے کے تین دن پہلے لکھے گئے وہ ایک دستاویز کی ہی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک انقلابی ذہن کے آئینہ دار بھی ہیں۔ بسمل کے سامنے زندگی کے صرف تین دن تھے اور تین دن کے بعد پھانسی کا پھندا

منتظر تھا۔ بسمل پھانسی پانے کے تین دن پہلے لکھتے ہیں:

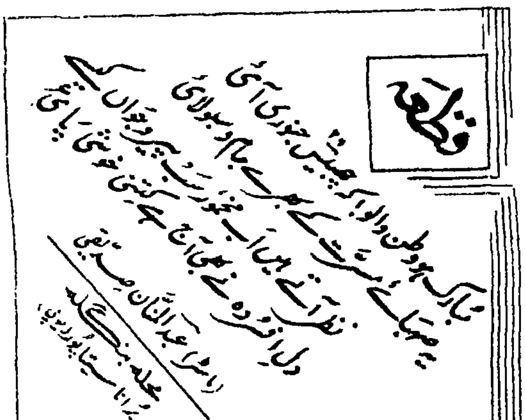
"آج ۱۶ ستمبر ۱۹۲۷ء کو یہ آخری لائنیں لکھ رہا ہوں جبکہ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کو سوموار ½۶ بجے صبح کو اس جسم کو پھانسی پر لٹکا دینے کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ ۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو سیشن جج نے فیصلہ سنایا تھا اور ۱۸ جولائی کو اودھ چیف کورٹ میں ہم لوگوں نے اپیل کی مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ جتنے لوگوں کو سزائیں ہوئی تھیں ان میں ایک آدھ آدمی کی سزائیں بڑھیں، کم نہیں ہوئیں۔ میں نے ایک خط، جو گورنر کے نام تھا اس میں کہا تھا کہ میں آئندہ کسی انقلابی تحریک یا کام میں حصہ نہیں لوں گا، مگر چیف کورٹ نے اس کو نہیں مانا۔ چیف کورٹ نے یہ درخواست رد کر دی تو پھر گورنر اور وائسرائے کے پاس رحم کی درخواست بھیجی جس میں رام پرشاد بسمل، راجندر ناتھ لاہری روشن سنگھ اور اشفاق اللہ کو پھانسی کی سزا بدل کر دوسری سزا دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ کونسل کے چنے ہوئے ممبروں نے بھی دستخط کر کے ایک درخواست دی۔ میرے والد نے ڈھائی سو رئیس، آنریری مجسٹریٹ اور زمینداروں کے دستخط کروانے کے بعد ایک الگ درخواست دی۔ مگر سر ولیم کی سرکار نے ایک نہ سنی۔ اس وقت لیجس لیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے ۷۸ ممبروں نے دستخط کر کے وائسرائے کے پاس رحم کی درخواست کی کہ کاکوری کیس میں موت کی سزا بدل کر دوسری سزا دی جائے کیونکہ دوبارہ جج نے یہ سفارش کی تھی کہ اگر یہ لوگ افسوس کریں تو سرکار سزائیں کم کر دے۔ چاروں (جن کی موت کی سزائیں تھیں) مجرموں نے افسوس ظاہر کیا مگر وائسرائے نے ایک نہ سنی اس وقت مدن موہن مالویہ جی اور اسمبلی کے کچھ ممبروں نے وائسرائے سے مل کر یہ کوشش کی کہ سزائیں کم ہو جائیں مگر کوشش کارگر نہ ہوئی حالانکہ اشفاق اللہ تو انگریزی سرکار سے رحم کی درخواست کرنے پر راضی نہیں تھے ان کا تو یہ اعتبار تھا کہ خداوند کریم کے علاوہ کسی دوسرے سے کچھ نہیں مانگنا چاہیے مگر میرے ضد کرنے پر وہ اس کے لیے تیار ہوئے اس کا ذمہ دار میں ہوں کیوں کہ ان کو میں نے اس فیصلے سے ڈگمگایا تھا۔ میں نے اس بھول کی معافی ایک خط میں (وہ دوسرے جیل میں تھے) اشفاق سے مانگی تھی، خدا جانے وہ ان تک پہنچا کہ نہیں۔ آخر میں میں نے سوچا کہ جیل سے نکل بھاگوں، مگر باہر سے کوئی مدد نہیں ملی۔ مجھے باہر سے ایک ریوالور تک دستیاب نہیں ہو سکا۔"

وہ آخر میں کہتے ہیں:

"میں جان دینے میں ہچکوں گا نہیں کیونکہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ مگر یہ افسوس ضرور ہے کہ جس کے لیے کام کرو، بھلائی کرو، وہی برے برے نام دیتے ہیں، اب میری ہم وطنوں سے گزارش ہے کہ جو کچھ کریں سب مل جل کر کریں اور سب دیش کے لیے کریں اور اسی میں سب کا بھلا ہے۔"

ان الفاظ پر ان کی سوانح عمری ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کو صبح ساڑھے چھ بجے پھانسی کے تختے پر چڑھ گئے۔ ان کے پاؤں میں لغزش تک نہیں تھی۔ وہ اس اعتبار کے ساتھ جان دے رہے تھے کہ

"یہ میرا اعتبار ہے کہ میں پھر ایک نئے جسم میں جنم لوں گا اور بھارت کے کسی عزیز کے گھر میں جنم لوں گا کیوں کہ یہ میرا مقصد حیات ہے کہ کوئی کسی پر حکومت نہ کرے۔ ساری دنیا میں جمہوری حکومت قائم ہو۔"



طے ہوا کس طرح زندگی کا سفر کیا بتائیں تمھیں
دھوپ کیسے ٹھہرے، چاندنی کا گزر کیا بتائیں تمھیں

ہم اٹھاتے نہیں اپنے ہاتھوں کو اب تو کسی کے لیے
کھو چکی ہیں دعائیں سب اپنا اثر کیا بتائیں تمھیں

آنسوؤں نے خد و خالِ رخسار سارے عیاں کر دیے
دیکھ لو خود اٹھا کے تم اپنی نظر کیا بتائیں تمھیں

خاک دانوں میں مہر و قمر و کہکشاں قید ہونے کو ہیں
شام قبضے میں کرنے چلی ہے سحر کیا بتائیں تمھیں

خاک اڑ اڑ کے جانے کو تیار ہے آسماں کی طرف
سنگ ریزوں سے ہے کہکشاں کو ڈر کیا بتائیں تمھیں

خود تو زندہ ہیں بیساکھیوں کے سہارے یہ شہرت نشاں
آج کل کے یہ قد آورانِ ہنر کیا بتائیں تمھیں

جاوید برقی
نشاط گنج، لکھنؤ

میں نے اُس سے یہی ہنر جانا
صرف اپنے کو معتبر جانا

ایک ہی بار عشق ہوتا ہے
کس لیے اب اِدھر اُدھر جانا

کوئی بھی پیڑ سایہ دار نہ تھا
دھوپ کیا ہے یہ دوپہر جانا

اِک خُدا کی ہی ذات ایسی ہے
جس کو دیکھا نہیں مگر جانا

شعر جاویدؔ لاجواب کہو
ورنہ جلدی کہیں نہ مر جانا

ملک زادہ جاوید
ٹی ۲۵ سیکٹر نمبر ۱۱
نوئیڈا (یو۔پی)

وہ سر سے مرے دھوپ سرکنے نہیں دیتا
میں پیاس کے شعلوں کو بھڑکنے نہیں دیتا

ہر چیز کی حد ہے تو سرابوں کی بھی حد ہے
یہ میرا تصور ہے مجھے تھکنے نہیں دیتا

کتنے ہی سمندر مرے سینے میں نہاں ہیں
بس ظرف مرا مجھ کو چھلکنے نہیں دیتا

صدیوں کی کسک دل میں چھپائے ہے وہ مفلس
لیکن وہ کبھی خود کو سسکنے نہیں دیتا

یہ درد کا رشتہ بھی عجب رشتہ ہے ناجیؔ
جو دل کو کبھی کھل کے دھڑکنے نہیں دیتا

ناجیؔ جلالپوری
جامعہ سلطانیہ لکھنؤ

غیر ممکن ہے کہ منزل کا پتا رہنے دے
یہ ہوا ریت پہ نقشِ کفِ پا رہنے دے

میں کوئی اور نیا تجربہ کرنے سے رہا!
تو مرے سامنے اظہارِ وفا رہنے دے

میں کبھی زہر کو تریاق نہیں کہہ سکتا
حاکمِ وقت خفا ہے تو خفا رہنے دے

تو امیروں کا مصاحب ہے مبارک ہو تجھے
میرے حصے میں غریبوں کی دعا رہنے دے

چارہ سازی کی ضرورت تو ہے لیکن مخمورؔ
اس سے کہہ دو کہ ابھی زخم ہرا رہنے دے

ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی
اقصیٰ پبلک لائبریری
کاکوری۔ لکھنؤ

ڈاکٹر اسلم الہ آبادی
سی ۳/۱۳ ۔ کانجو روڈ ۔ الہ آباد

خوشبو کا سفر ۔ پروین شاکر

اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مردوں کے شانہ بشانہ صنفِ نازک نے بھی ادب کی تخلیق و تعمیر میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یوں تو قدیم شاعرات کی اچھی خاصی تعداد ہمارے سامنے ہے لیکن چند شاعرات ایسی ہیں جن پر نظر ٹھہرتی ہے، جن میں احمدی بیگم سونی پت، ماہ عفیفہ دہلی، نواب صدر محل، نواب عالم ملکہ واجد علی شاہ، سلطان بیگم، عابدہ امراؤ بیگم، شاہ جہاں بیگم شیریں صاحب دیوان گزریں۔

جدید شاعرات میں ادا جعفری بدایونی کا مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" بہت مقبول ہوا۔ سیدہ اختر کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ نجمہ تصدق کا مجموعہ تخواشعار پر مشتمل ہے پھر بھی لوگوں کی نگاہ کا مرکز بنا۔

زیب عثمانیہ کا "متاعِ حرم"۔ زاہدہ خاتون کا مجموعہ "آئینۂ حرم" اور "فردوس"۔ سپہر آرا بیگم پنہاں کا مجموعہ "آئینۂ جمال" اور "قوسِ قزح"۔ غزالہ بریلوی کا "غزال"۔ بلقیس فاطمہ بلقیس کا "جذباتِ بلقیس"۔ محمودہ خاتون کا "گلستانِ سخن"۔ بانو طاہرہ سعید کا "برگِ سبز"۔ زوجی دہلوی، حمیدہ نسیم، رشیدہ سلیم سیمیں کے مجموعے بھی سراہے گئے۔

ہم یہاں پر پروین شاکر کے حالات زندگی اور شاعری کا مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں، جسے ہم ۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ء کو کار کے حادثے میں کھو بیٹھے۔

جہاں تک پروین کی شاعری کا سوال ہے اس کی ابتدا ۱۹۶۸ء سے ہی ہو چکی تھی جبکہ پہلی بار اس کی نظم اخبار جنگ نے شائع کی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی میں پروین کا ادبی ذوق آگے بڑھتا رہا۔

۱۹۶۸ء سے نو سال بعد شاخِ انا پر ایک ایسا پھول کھلا جس کی "خوشبو" ۱۹۷۷ء سے آج تک محسوس کی جارہی ہے۔ چار سال میں "خوشبو" کے سات ایڈیشن بازار میں آگئے۔ پروین کے چار عدد شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں: (۱) خوشبو (دسمبر ۱۹۷۷ء)۔ (۲) صد برگ (فروری ۱۹۸۱ء) (۳) خود کلامی (اگست ۱۹۸۴ء) اور (۴) انکار (مئی ۱۹۹۰ء) شائع ہوئے دوسری طرف نثری کاوش "آئینے کے اُس پار" (تراجم) زیرِ ترتیب ہے۔

پروین کی شاعری کی عمر ۱۹۶۸ء سے ۱۹۹۴ء تک ہی رہی۔ اس ۲۷ سال کے عرصے میں اس نے جو چار عدد شعری مجموعے چھوڑے ہیں، وہ اس کی شعری صلاحیت کے آئینہ دار ہیں۔ یوں سمجھئے کہ "صد برگ" کے سائے میں جب "خوشبو" کا جھونکا رومانی فضا تیار کرتا ہے تو "خود کلامی" کا احساس ہوتا ہے اور اس احساس کے بطن سے ایک جذباتی اور بیباک لڑکی وجود میں آتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

پروین کی شاعری ایک ایسی ہی جذباتی اور بیباک لڑکی کے احساسات کی عکاسی ہے جو حوصلہ مند بھی ہے اور اپنے اطراف سے باخبر بھی۔ "خوشبو" سے "انکار" تک کا سفر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ کسی خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہی ہو ۔

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

گھر کا دروازہ کھلا رکھا ہے وقت مل جائے تو زحمت کرنا

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی

پروین نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ادا جعفری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ پروین نے اسلوب اور لہجے کی ندرت سے ادب میں اپنا الگ مقام بنالیا۔ پروین سے پہلے شاعرات کے یہاں وہ شگفتگی اور لہجے میں ندرت اور بیباکی نہ تھی ۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

ریل کی سیٹی میں کیسے ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا

لڑکیاں بیٹھی ہیں پاؤں ڈال کے   روشنی ہونے لگی تالاب میں

اِک چاند صلیب شاخ گُل پر   بالی کی طرح لٹک رہا ہے

پروین نے مشرقی تہذیب کو اپنی غزلوں اور نظموں میں بھرپور طرح سے برتا اور عام کیا، اور شاعری میں محبت کے جذبے کا احترام قائم رکھا، اسے ایک نئی جہت بخشی۔

گھر کی چہار دیواری میں قید نئے زمانے اور نئی روشنی سے ناآشنا مشرقی لڑکیوں کو زبان دی اور ان کے احساسات اور جذبات کو اپنی شاعری کا جُز بنایا۔ پروین سے پہلے ادا جعفری کے یہاں جذبے کا عمل سرگوشی کی منزلوں تک رہا، لیکن پروین نے اس سرگوشی کو لَے اور زبان بنا دیا اور اس لَے کو وقار بخشا ہے

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

دُور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں   مجھ کو تھامے ہوئے باہیں اس کی

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلّف سے بات کی
اور میں نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

پروین نے اپنے بزرگوں سے سیکھا بہت کچھ لیکن ان کی تقلید نہیں کی بلکہ دوسروں کو اپنی تقلید کرنے پر مجبور کر دیا۔ بقول امجد اسلام امجد :

"اُردو ادب میں سچے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری بہت کم ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری شاعرات نے آنکھیں بند کر کے اُردو زبان اور شاعری کے مروجہ آہنگ کی پیروی کی ہے۔ پروین کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی خوبصورت نرم و نازک فوارے کی طرح اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی شاعری کے ذریعہ اُردو ادب کے شعری اسالیب میں نئی جہت کا اضافہ کیا۔"

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی   وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اُسے دیتی امیر ایسی تھی

پروین نے جہاں ایک طرف پابند نظمیں کہی ہیں وہیں دوسری طرف آزاد نظموں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ آزاد نظمیں بہت جگہ دو تین مصرعوں پر مشتمل ہیں لیکن بامقصد اور بامعنی۔ بہاری کے دوہوں کی طرح تیر نیم کش، جو کسک اور چبھن پیدا کرتی ہیں! پروین نے غزلوں اور نظموں دونوں جگہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا احساس دلایا ہے۔ سماج کی دُکھتی رگ پر بلا جھجک اُنگلی رکھی ہے۔ ضد۔ گلہ۔ مقدر جیسی نظموں سے میری بات کی تصدیق ہو جاتی ہے مثال کے طور پر چند نظمیں نقل کر رہا ہوں ؎

"میں کیوں اس کو فون کروں
اس کے بھی تو علم میں ہوگا
کل شب
موسم کی پہلی بارش تھی!"

———— "ضد"

اے خُدا!
میری آواز سے ساحری چھین کر
تو نے سانپوں کی بستی میں کیوں مجھ کو پیدا کیا

———— "گلہ"

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
گھونگھٹ اُٹھا کے یہ کہہ دے
میرا سب کچھ تیرا ہے دل کے سوا

———— "مقدر"

پروین کی بہت سی غزلوں اور نظموں کا تانا بانا لوک گیتوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر تیار کیا گیا ہے جس میں دیہے کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سنگیت کے سروں کے ساتھ گاؤں کے ماحول میں پہنچا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ؎

بسنت بہار کی نرم ہنسی
آنگن میں چھلکی
بھیگ گئی مری ساری

پھر ـــ پُروا کی شوخی
کیسے اپنا آپ سنبھالوں
آنچل سے تن ڈھانپوں ـــ تو
زُلف سمیٹوں
تن چھلکے گا ـ !!

ـــــــــ (بسنت بہار کی نرم ہنسی)

گوری کرت سنگھار
بال بال موتی چمکائے
روم روم مہکار
مانگ سندور کی شُندرتا سے
چمکے چندن وار
جوڑے میں جوہی کی بینی
بانہہ میں ہار سنگھار
کان میں جگمگ بالی پتّہ
گلے میں جگنو ہار
صندل ایسی پیشانی پر
بندیا لائی بہار !

پروین کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جیسے "لڑکیاں اُداس ہیں"۔ "واٹرلو"۔ "ڈپارٹمنٹل اسٹور"۔ "کانچ کی سُرخ چوڑی"۔ "گوری کرت سنگھار"۔ "بے بسی"۔ "بسنت بہار کی نرم ہنسی"۔ "ملالِ تیز روی" اور "نیگ" ـــ ان تمام نظموں میں لوک گیتوں کی بھرپور فضا بنتی ہے۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو خوشبو کا چاند بادل کی اوٹ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ فضا ماتمی ہو گئی۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شہرِ ادب سے جب تک قافلے گزرتے رہیں گے، پروین کی "خوشبو" کا احساس ہوتا رہے گا۔

مختصر یہ کہ پروین کی شاعری میں شکر کی منزلیں بھی ہیں، "خوشبو" سے "انکار" تک کا سفر بھی جس میں اقرارِ زیست بھی ہے اور اقدارِ فن بھی۔

□□

میرا معصوم بچپن

رفعت العصفی
[illegible]

کوئی لوٹا سکے تو لوٹا دے
میرا بچپن، مرا ماضی، مرے گزرے ہوئے دن
وہ جو بچپن میرا.....
کتنے بھولے تھے، کتنے سادہ تھے
نرم و نازک گُلابی سے لمحے
زندگی میں جو آ نہیں سکتے۔
میری امّی مجھے بتاتی ہیں
میں بہت جلد رُوٹھ جاتی تھی
اور پھر خود سے مان جاتی تھی۔
وہ آرزوئیں، تمنّائیں، التجائیں میری
چندا ماما کے لیے میرا مچل جانا بھی
آسماں سے کبھی تاروں کو توڑ لانا بھی
اور شرما کے، لجا کے پھر ایک ہی پل میں
ماں کی آغوشِ محبّت سے لپٹ جانا بھی !
کوئی لوٹا سکے تو لوٹا دے.....
میں بہت تم کو یاد کرتی ہوں
سب ہی ملتے ہیں تم نہیں ملتے
تب بہت رونے کو جی کرتا ہے
دل کی تسکیں کے لیے تکیہ میں چھپا کر منھ
ہچکیاں لے کے بہت روتی ہوں
روتے روتے کچھ ایسا لگتا ہے
جیسے ممتا بھری کوئی ماں
آتی ہو لوریاں دے کے مجھے سُلانے کو
اس گھڑی اور بھی یاد آتے ہو میرے بچپن
یہ جانتے ہوئے کہ تم اب آ نہیں سکتے ـــ
کوئی لوٹا سکے تو لوٹا دے
میرا بچپن،
مرا ماضی، مرے گزرے ہوئے دن

□□

کہانی

محمد شمیم الاسلام
[illegible] محمود نگر، لکھنؤ

منشی جی

کہنے کو سب اُن کو منشی جی کہتے تھے مگر ان کا اصلی نام تھا محمد احمد۔ ان میں منشی گیری کہیں نام کو نہ تھی۔ گاؤں کے پاٹھ شالہ میں ایک ادھیاپک تھے دُبلے پتلے، میانہ قد، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، گھنے بال۔ مگر تھے اپنی دھن کے پکے۔ سچے، ایمان دار، دل میں خدا کا خوف، ہمدردی کوٹ کوٹ کر رگوں میں بھری ہوئی۔ گاؤں کا ہر آدمی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ـــ ان کی بہت عزت کرتا تھا، بڑے شان سے انھیں اپنے پاس بٹھاتا۔ گاؤں کے چھوٹے موٹے جھگڑے کو آپس میں بیٹھ کر سلجھانے میں جیسے انھیں مہارت تھی اسی لیے لوگ انھیں گاؤں سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ لیکن یہ کہاں ممکن، دھیرے دھیرے زمانے نے کروٹ بدلی اور منشی جی نے شہر کا رُخ کیا۔ وہ ایک اسکول میں ملازم ہو گئے۔ ان کی ایمان داری اور سچائی کی خوشبو جیسے پہلے ہی پھیل گئی ہو۔ اسکول کا پورا اسٹاف ان کا گرویدہ ہو گیا۔

ایک دن منشی جی نے اپنے داماد کو بلایا، جو اسٹیشن ماسٹر تھا، اسے پیسے دیتے ہوئے کہا:

"بیٹا! مجھے ایک ٹکٹ فیض آباد سے لکھنؤ کا لا دینا۔"

کمال (داماد) نے بہت کوشش کی کہ ان سے پیسے نہ لے لیکن وہ نہ مانے۔ مجبوراً کمال کو پیسے لینا پڑے اور انھیں ٹکٹ لاکر دے دیا۔ ٹکٹ دیکھ کر منشی جی نے اطمینان کی سانس لی اور پھر سب کے سامنے ٹکٹ کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ہم سب حیرت سے ان کا منھ تکنے لگے۔ ہمارا اضطراب دیکھ کر منشی جی نے کہا:

"یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے، جب میں ضلع بلیا سے ایک ساتھی کے ہمراہ ٹرین سے فیض آباد آیا، یہاں میں نے درجہ نو تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد ایک دن فیض آباد سے اپنے تین دوستوں کے ساتھ لکھنؤ آیا۔ حالانکہ یہ ساتھی کھاتے پیتے گھرانے کے تھے لیکن سب بغیر ٹکٹ لکھنؤ آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ بغیر ٹکٹ لکھنؤ آیا۔ یہ وہی ٹکٹ ہے جس کا کرایہ آج میں سرکار کو ادا کر رہا ہوں۔"

کہنے کو یہ کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کے گواہ آج بھی زندہ ہیں۔

شانتی اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پریشان تھی۔ مٹی کے کھلونے بنانے والی شانتی اپنی بیٹی کی زندگی میں کیسے جان ڈال دے، یہ اس کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ ایک دن بہت ہمت کر کے وہ منشی جی کے پاس پہنچی اور اپنی پوری داستان سنائی۔ منشی جی بہت متاثر ہوئے۔ فوراً چارپائی پر سے اُٹھے، بکس کھولا اور ایک اچھی خاصی رقم شانتی کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا: "بٹیا! اس کے بارے میں کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔"

منشی جی کے سمجھانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ آجکل اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ بھی انگریزی کے مشہور شاعر جان ملٹن سے واقف ہوں گے جو نابینا تھا اور جس کے دوست انگلینڈ کے لارڈ بکنگم تھے۔ ملٹن کی تیسری بیوی بہت خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بدمزاج بھی تھی۔ ایک بار جب لارڈ بکنگم جان ملٹن سے ملنے گئے تو ان سے ملٹن نے اپنی بیوی کی بدمزاجی کی شکایت کی۔ اس پر لارڈ بکنگم نے کہا۔

"تم اپنی بیوی کی شکایت کرتے ہو۔! وہ تو گلاب کا پھول ہے۔"

ملٹن نے اپنی نابینائی کے پیشِ نظر جواب دیا۔ "ہاں! وہ گلاب کا پھول ہے لیکن اس حقیقت کو میں نے اس کے رنگ سے نہیں، بلکہ اس کے کانٹوں سے پہچانا ہے۔"

بالکل اسی طرح منشی جی لوگوں سے کہتے کہ زندگی میں اگر نامناسب حالات ہوں تو گھبرائیں نہیں، صبر اور ہمت سے کام لیں کیوں کہ ایسے ہی موقع پر اپنا پرایا پہچانا جاتا ہے۔

اسکول کی ملازمت میں یہ ایک اچھا پہلو ہے کہ بچّہ کے گارجین ہو جانے سے فیس میں سہولت پہنچائی جا سکتی ہے۔ کارخانہ کے کتنے ہی بچّوں کے منشی جی گارجین تھے۔ ہری، حلیم، راجندر اور محلّے کے کتنے ہی بچے ہیں جو آج بھی ان کو دُعائیں دیتے ہیں۔

وقت کی پابندی اور کسی بہانے سے مدد کرنے میں منشی جی کا جواب نہ تھا۔ بس کا سفر ہوتا یا ٹرین کا، آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچتے۔ شادی بیاہ میں بھی وقت سے پہونچتے۔ اکثر شادی میں شرکت نہ کرتے تو کیا ہوا؛ بیٹے کو بُلا کر حکم دیتے کہ لفافہ ہماری طرف سے فلاں کو دے دینا۔ گھر میں بچّے کہتے کہ آپ تو فلاں کی شادی میں جا نہیں رہے ہیں تو یہ رقم کیوں بھجوا رہے ہیں؟ اس پر منشی جی مہاراجا رنجیت سنگھ کا بہت مشہور قصّہ سناتے، کہ ایک بار مہاراجا رنجیت سنگھ کہیں جا رہے تھے کہ اوپر سے ایک ڈھیلا اُن پر گرا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے کہ یہ کیا ہوا؟ پوچھ گچھ کے بعد لوگوں نے ایک بُڑھیا کو پکڑ کر مہاراجا کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ سرکار یہی وہ عورت ہے جس نے آپ پر ڈھیلا مارا تھا۔

بُڑھیا گڑگڑاتے ہوئے بولی "سرکار! میری کیا مجال کہ آپ پر ڈھیلا چلاؤں۔ میں تو ایک پکے ہوئے بیل پر نشانہ لگا رہی تھی کہ اپنے بچّوں کی بھوک مٹا سکوں۔ غلطی سے ڈھیلا اُس پر نہ پڑا اور آپ کے اوپر آ گرا۔" کہتے کہتے بُڑھیا رونے لگی۔ مہاراجا نے اسے تسلّی دی اور ایک ہزار روپیہ اور کھانے کا کافی سامان دے کر رخصت کر دیا۔ درباریوں اور لوگوں نے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ اس نے آپ کو مارا اور آپ اسے انعام و اکرام دے رہے ہیں۔! مہاراجا نے جواب دیا کہ "ڈھیلا مارنے پر تو پیڑ پھل دیتا ہے تو کیا میں اس سے بھی گیا گزرا ہوں۔"

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

آجکل کے ماحول کو دیکھتے ہوئے منشی جی ایک فرشتہ صفت انسان تھے وہ کارخانہ، اسکول اور پڑوس کے بچوں کو بلا کر مفت پڑھاتے۔ اُن کے نزدیک ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب برابر تھے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا لوگوں کے دلوں میں خوشی کے پھول کھلانا، جو بقول گوتم بدھ ہزار تیرتھوں سے بہتر ہے۔

جہیز کے تو وہ قاتل دشمن تھے۔ حکیم مرتضٰی نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے بیٹے کی شادی کے لیے منشی جی کی بیٹی رابعہ سے بات چلائی۔ تاریخ طے بھی ہو گئی۔ عین شادی کے دن لڑکے والوں نے کہیں سائیکل کی فرمائش کر دی۔ منشی جی آگ بگولا ہو گئے۔

"ہماری بیٹی کی شادی حکیم مرتضٰی کے یہاں نہیں ہوگی۔"

بعد میں لوگوں نے بہت سمجھایا۔ سمجھایا تو بات بنی ورنہ برات کے لَوٹنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

خدا کا دیا منشی جی کے پاس سب کچھ تھا۔ سعادت مند بیٹے، بیٹیاں، پوتے، نواسے، جائداد اور باحیثیت رشتہ دار۔ مگر ان کے دل میں حسد نے جنم نہیں لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مشہور امام اصمعی جو بہت بوڑھے ہو چکے تھے لیکن صحت اور توانائی قابلِ رشک تھی۔ کسی نے پوچھا:

"آپ کی اس ۱۲۰ سال کی عمر اور تندرستی کا راز کیا ہے۔؟"

جواب ملا: "زندگی کی قاتل ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے حسد۔ میں زندگی بھر اس سے دُور رہا۔"

تقریباً ۹۲ سالہ منشی جی کی داستان بہت طویل ہے۔ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن اپنے اخلاق، محبّت، پڑوسیوں کے ساتھ رواداری، خلوص، بلاتفریق مذہب و ملّت عزّت سے جو انھوں نے اپنی چھاپ چھوڑی ہے اس سے وہ آج بھی زندہ ہیں اور روز صبح سُورج اس کی گواہی دیتا ہے، اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

تمھیں کہتا ہے مُردہ کون، تم زندوں میں زندہ ہو
تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

□□

قطعہ

وطن کی سرزمیں جنت نشاں معلوم ہوتی ہے
سراسر جو کہ رشکِ بوستاں معلوم ہوتی ہے
یہ بھارت ہم کو پیارا ہے ہم اس کے چاہنے والے
ضیا اس کی ہمیں جلوہ کناں معلوم ہوتی ہے

ڈاکٹر انعام اشرف جیلانی
جائس، رائے بریلی

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "کالی داس: ایک مطالعہ"
مصنف: محمود زکی قیمت: ۱۵۰ روپئے
ملنے کا پتہ: لبرٹی بک ہاؤس، امروہا ہاؤس کمپلکس رام موہن رائے مارگ لکھنؤ

"اردو زبان میں کالی داس کی تصانیف کے کئی ترجمے خصوصاً شکنتلا" ڈرامے کے تو سترھویں صدی سے لے کر اب تک بے شمار ترجمے شائع ہو چکے ہیں منظوم و نثری دونوں۔ محمود زکی صاحب نے اس کتاب میں جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا ہے، کالی داس کی زندگی اور ان کی متعدد تصانیف کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے سنسکرت اور ہندی میں چھپی بعض تحقیقی تحریروں کے حوالے سے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ سنسکرت ادب میں کالی داس نام کے آٹھ مصنفین گزرے ہیں جن کی تصانیف کی مجموعی تعداد اکیاون ہے۔ لیکن محققین بڑی جاں فشانی سے کام لے کر ان تصانیف میں سے حقیقی کالی داس کی سات ایسی تصانیف کی نشان دہی کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو زبان و بیان، لب ولہجہ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے واقعی ان ہی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے تین ناٹک اور چار شعری شاہکار اس طرح ہیں: رتو سنگھار۔ مالویکا گنی متر۔ وکرمو روشی (منظوم و نثری ناٹک)۔ کمار سمبھو۔ میگھ دوت۔ رگھو ونش اور مالویکا گیان شکنتلم (منظوم و نثری ناٹک)۔

اس کتاب میں محمود زکی صاحب نے "اجین" جس کا قدیم نام "ابینی" تھا کی تاریخی اہمیت پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ کبھی زمانے میں وسطی ہندستان کا یہ شہر بہت بڑا تجارتی مرکز تھا، جہاں چین، سیریا، روم وغیرہ ممالک سے نہایت بیش قیمت ہیرے جواہرات اور دوسرا قیمتی سامان لاکر بازاروں میں بکثرت بیچا جاتا تھا اور اس دور میں ملک کی بیشتر سڑکیں اس مشہورِ عالم شہر کو ہر جانب سے ملائے ہوئے تھیں۔ محققین نے اس زریں دور کو وکرما دتیہ دوئم کی حکومت سے منسوب کیا ہے جس کے دربار میں مہاکوی کالی داس جیسے عظیم فن کار کے علاوہ کئی اور رتن بھی موجود تھے۔ کالی داس آج دنیا کی تقریباً ہر ترقی یافتہ زبان میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف محمود زکی نے بڑے احترام کے ساتھ اور بہت ہی خوبصورت نثر میں کیا ہے۔ ان کی اس تصنیف سے ادبیات اُردو میں یقیناً ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ محمود زکی صاحب کی یہ تصنیف ملک کی ساری یونیورسیٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو کے علاوہ اہم ترین لائبریری کی زینت بننی چاہیے تاکہ مستقبل کے ریسرچ اسکالروں کو کالی داس پر مزید کام کرنے کے لیے تحریک ملے اور اس قسم کا مفید مواد بھی میسر آسکے۔

—— رام لعل

(یہ تبصرہ رام لعل صاحب کی آخری تحریر ہے۔ ایڈیٹر)

نام کتاب: **میڈیکل ڈکشنری** (انگریزی سے اُردو)
مرتب: ڈاکٹر حکیم غلام جیلانی قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: اعجاز پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی

ڈاکٹر جیلانی نے طب و حکمت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان کتابوں میں 'مخزن الجواہر' جو دو حصوں میں ہے بہت مشہور ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بیماریوں اور علاج کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ طب و ڈاکٹری میں بیماریوں کے لیے مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں جنھیں ایک عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ اُردو والوں کی مدد کے لیے ڈاکٹر جیلانی نے یہ ایک چھوٹی سی 'طبی و ڈاکٹری لغات' مرتب کی ہے جس میں ڈاکٹری اصطلاحات کے عربی اور فارسی مترادفات دیے گئے ہیں۔ عربی اور فارسی کے ساتھ متبادل اردو معنی بھی اس میں موجود ہیں جنھیں اُردو قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

کمپیوٹر سے کمپوز، سفید کاغذ، صاف ستھری طباعت، ڈیمائی آکٹوو سائز کے سو صفحات پر مشتمل مفید کتاب ہے۔

—— ایس اے رحمٰن

نام کتاب: "صدائے حسینی"
شاعر: سید علی شبر حسینی کرہانی   قیمت: ۳۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: سید علی شبر حسینی کرہانی، کواٹر نمبر ۲۲، پریس روڈ
نئی دھلی

زیر تبصرہ کتاب "صدائے حسینی" رثائی ادب کے سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ہے جو جناب علی شبر حسینی کرہانی کی ادبی فکر کا نتیجہ اور ان کے سلاموں و نوحوں وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ جناب حسینی کرہانی مشرقی یو پی کے نہایت ہی مردم خیز خطہ ضلع اعظم گڑھ کی علم پرور بستی کرہان کے ایک اعلا خاندان کے ادب نواز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ موصوف اردو ادب کے مشہور و معروف تنقید نگار، تاریخ نویس اور افسانہ نگار نیز ناول نویس علی عباس حسینی کے پوتے، عظیم اور معتبر صحافی و شاعر اعظم حسین اعظم اور عالمی شہرت یافتہ شاعر شمیم کرہانی کے برادر زادے کی حیثیت سے اپنے خانوادے کی دیرینہ علمی و ادبی روایات کے محافظ و امین ہیں۔

اگرچہ اس مجموعے میں شامل سلام قدیم طرز کے اور تاریخی نوحے روایتی انداز کے ہیں تاہم ان میں جگہ جگہ جدتِ بیان، ندرتِ خیال، جودتِ فکر اور جولانیٔ طبع کے ساتھ تخیل کی تازگی کی جھلک بھی بہت واضح طور پر بالکل صاف نظر آتی ہے جو شاعر کے قدرت و کمالِ فن کی علامت اور مشق شعر و سخن کی دلیل ہے۔ "صدائے حسینی" ایک سو ایک سلاموں، ۳۶ نوحوں، ایک مسدس، آٹھ مخمس، ایک مثلث اور بخت ہند جوگی پورہ کی ایک طویل منظوم تاریخ پر مشتمل ہے۔ صاف ستھری کتابت اور روشن طباعت سے مرصع ۱۹۶ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی قیمت صرف ۳۰/- روپے بہت مناسب ہے۔

—— مظفر سلطان حسن ترابی

نام کتاب: "دبستانِ جلال"
مصنف: ڈاکٹر سید سکندر آغا   قیمت: ۱۵۰/- روپئے
ملنے کے پتے: (۱) "دانش محل" امین الدولہ پارک لکھنؤ (۲) نصرت پبلشرز
امین آباد لکھنؤ

دبستانِ ناسخ سے وابستہ شعراء میں جلال لکھنوی کا نام غیر معمولی اہمیت و عظمت کا حامل ہے، وہ بحیثیت شاعر جتنے ممتاز و منفرد ہیں اس سے زیادہ زباں داں اور ماہر فن کی حیثیت سے اہم ہیں۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ محض لکھنؤ یا رامپور تک محدود نہ تھا لیکن نیرنگیٔ زمانہ کے باعث اب تک ایسے باکمال شاعر پر کوئی خاطر خواہ کام منظر عام پر نہ آسکا تھا اور نہ ہی ان کے شاگردوں کی خدمات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ڈاکٹر سید سکندر آغا قابلِ ستائش ہیں کہ انھوں نے نہایت محنت و مشقت سے دن رات ایک کرکے نہ صرف جلال کی حیات و خدمات کو منظر عام پر لانے کی سعی مستحسن کی، بلکہ ان کے شاگردوں سے متعلق معلومات کو یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی خدمات کو بھی "دبستانِ جلال" کی صورت میں پیش کیا ہے۔

مذکورہ تصنیف میں ڈاکٹر سکندر آغا نے جلال کے ۷۷ شاگردوں کی حیات و خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے انفرادی رنگ کو اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بیشتر شعراء سے متعلق اس قدر معلومات اکٹھا کردی ہیں جو مستقبل میں شاگردانِ جلال کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی اور بعض گوشۂ گمنامی میں پڑے شعراء کے تعارف میں مدد و معاون ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر سکندر آغا اپنے معروضات کو حوالوں کے ساتھ سلیقے سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں جس کے سبب ان کے یہاں ترسیل و ابلاغ کے مسائل نہیں پیدا ہوتے۔ تحقیق و تنقید کی خشکی ان کے اسلوب کی روانی اور شگفتگی پر اثر انداز نہیں ہونے پائی ہے۔

—— ڈاکٹر ای، اے حیدری

نام کتاب: پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تراجم
(ایک تنقیدی جائزہ)
مصنف: عبدالرشید صدیقی   قیمت: سو روپئے
ملنے کا پتہ: موضع سندپا، ڈاک خانہ سلطان پور، کبیر پور
ضلع امبیڈکر نگر

عبدالرشید صدیقی نے اس تحقیقی مقالے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کو ایک بہتر مترجم کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اگرچہ ابھی تک پنڈت رتن ناتھ سرشار کی اصل شہرت ایک ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے اور بیشتر ناقدین نے سرشار کی ناول نگاری کا ہی مختلف زاویے سے تنقیدی جائزہ لیا ہے مگر

سرشار کا کامیاب مترجم کی حیثیت سے تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ مصنف نے خاصی تلاش تحقیق و جستجو کے بعد سرشار کے چار تراجم شمس الضحیٰ، اعمال نامۂ روس، خدائی فوجدار اور الف لیلیٰ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ سرشار نے ۱۸۸۰ء میں علم طبیعی کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا جو "شمس الضحیٰ" کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس کتاب میں ابر، ہوا، برف کا تذکرہ ہے اس مناسبت سے انھوں نے اس کا نام شمس الضحیٰ رکھا۔

"اعمال نامۂ روس" میں سرشار نے روس کی مکمل سماجی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی، جغرافیائی اور سماجی زندگی سے روشناس کرایا ہے اور بقول مصنف سرشار کے اس ترجمے کو اصلاً ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ سرشار نے اسپینی ناول نگار ڈان کوئکزاہٹ کے مزاحیہ ناول "سروینٹس" کا ترجمہ "خدائی فوجدار" کے نام سے کیا ہے۔ داستان الف لیلیٰ کا بھی سرشار نے ترجمہ کیا۔ بہرحال عبدالرشید صدیقی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے سرشار کو ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے پیش کیا۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے تعاون سے شائع ہوئی ہے کتابت و طباعت اچھی ہے سرورق بھی دیدہ زیب ہے لیکن اس کے باوجود صرف ۱۲۰ صفحات کی قیمت سو روپے کھٹکتی ہے۔

——— نافع قدوائی

نام کتاب: "فصیلِ شب" (شعری مجموعہ)
شاعر: کوثر صدیقی قیمت: ۹۰ روپے
ملنے کا پتہ: زیب ولا، اے۔ ۹، گنگوتری۔ مین روڈ بھوپال
(ایم۔ پی)

صلاحیت، ریاضت، فکر اور جذبہ جب ایک خاص توازن کے ساتھ فن کار کی تخلیقات میں در آتے ہیں تو وہ تخلیقات چمک اٹھتی ہیں اور پڑھنے والوں کو کیف و سرور کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر یہ وصف سب کے حصے میں کہاں آتا ہے۔ نصیب والے ہی اسے پاتے ہیں۔ جناب کوثر صدیقی ایک عمر سے مشق و مزاولت کے مرحلے میں ہیں۔ "فصیلِ شب" ان کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے یعنی غزلیں، نظمیں اور ثلاثی کا انتخاب۔ انھوں نے ان تینوں اصناف پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کر کے اپنی صلاحیت اور ریاضت کا لوہا منوایا ہے۔ اس مجموعے میں شامل ان کی غزلیں، نظمیں نیز ثلاثی زندگی کے مختلف گوشوں کے آئینہ دار ہیں۔ قدروں کی شکست و ریخت، اخلاقیات کا زوال انسانیت کی زبوں حالی کے ساتھ رجائیت، حوصلہ مندی، بلند پروازی اور مستقبل کی روشن بشارت بھی ان کی شاعری کے نمایاں عناصر ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ کوثر صاحب کا سفر اسی آن بان سے جاری رہے گا اور بہت جلد وہ اپنی اس پہچان کو کچھ اور بھی زیادہ تابناک و درخشندہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ ۱۴۴ صفحات کا یہ مجموعہ طباعت، کتابت اور کاغذ نیز سرورق کے لحاظ سے اُردو میں چھپنے والی اچھی کتابوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

——— سہیل احمد

نام کتاب: "تنقیدی تناظر" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
مصنف: ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی قیمت ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت
لال کنواں، دہلی ۶

زیرِ نظر کتاب "تنقیدی تناظر" ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ۱۴ مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین اُردو کے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نقوی نے "اقبال کا فن"۔ "اقبال کا فلسفۂ خودی"۔ "میر تقی میر اور غزل"۔ "مسدس مد و جزر اسلام"۔ "موازنہ مثنوی سحرالبیان و گلزار نسیم"۔ "خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری"۔ "پھول بن"۔ "رشید احمد صدیقی"۔ "نظیر کا موازنہ میر، غالب، آتش اور جوش سے"۔ "شاگردانِ نظیر اکبرآبادی"۔ "اُردو غزل پر ایک نظر"۔ "اُردو زبان اور اس کے مسائل"۔ "مرزا دبیر شاعر اور نثار" اور "قومی یک جہتی میں اُردو کا حصہ" کے عنوانات سے ان موضوعات پر آسان و سلیس زبان میں تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

ڈاکٹر نقوی نے بڑی عرق ریزی اور تحقیق کے بعد یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل یہ ایک معلوماتی کتاب ہے جو ادب و تنقید کے طلبا اور شائقین کے لیے یقیناً مشعل راہ ثابت ہوگی۔

——— شکیلہ رضا

نام کتاب: "دستاویز"
مرتب: جابر حسین   قیمت: سو روپئے
رعایتی قیمت: ۲۵/- روپئے
ملنے کا پتہ: اُردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل۔ پٹنہ
(بہار)

دُنیا کی دوسری اہم اور ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اب اُردو کو بھی مختلف موضوعات کے اظہار و بیان میں کامل دسترس حاصل ہو چکی ہے۔ آج اُردو میں جدید سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات، سیاسیات، قانون، جغرافیہ، سماجی علوم اور ان بے شمار عصری موضوعات، جن کا تیزی سے ترقی کی جانب گامزن انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے، کی اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔ جدید علوم و فنون سے متعلق تصانیف کی اشاعت برابر جاری ہے۔

"دستاویز" پروفیسر جابر حسین کی مرتب کردہ اُردو زبان و رسم الخط سے متعلق ان کارناموں اور کارگزاریوں کی تفصیلی تاریخ ہے جنھیں انھوں نے بہار قانون ساز کونسل کے کارگزار چیرمین کی حیثیت سے مختلف کمیٹیوں کے نمائندوں اور کونسل کے اراکین کے اشتراک سے عملی اور قانونی شکل عطا کی۔

پروفیسر جابر حسین نے "دستاویز" کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا ہے اس کتاب کے مندرجات کی ابتدا "اپنی بات" سے ہوتی ہے۔ پھر ۲۶ اپریل ۱۹۹۵ء سے تاریخ وار یہ سلسلہ چلتا ہے اور مختلف تاریخوں میں بہار قانون ساز کونسل میں اُردو سے متعلق جو بھی عمل درآمد ہوا اس کی تفصیلات سامنے آتی ہیں، یہ وقفہ اچھا خاصا طویل ہے اور ۴ دسمبر ۱۹۹۵ء کو اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔

"دستاویز" اُردو کے حوالے سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اُردو سے تعلق اور ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کو کرنا چاہیے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ مواد کے اعتبار سے "دستاویز" ایک اہم کتاب ہے۔ اُردو کے کاز سے وابستہ لوگوں کے لیے یہ ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ سمت کے تعین میں "دستاویز" سے تعاون ملے گا۔

موجودہ حالات میں "دستاویز" جیسی کتاب کی سخت ضرورت تھی، مجھے یقین ہے کہ اُردو کی تاریخ میں اس کتاب کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا "دستاویز" کو میں پروفیسر جابر حسین کا نہایت ہی وقیع، بامقصد، بروقت اور ضروری کارنامہ سمجھتا ہوں۔ "دستاویز" کی شکل و صورت میں انھوں نے اُردو دنیا کو جو کچھ دیا ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اُردو والوں کی جانب سے "دستاویز" کی پذیرائی ضروری ہے تاکہ اُردو کے لیے کام کرنے والوں کو حوصلہ ملے۔

——— ڈاکٹر سعید عارفی

نام کتاب: "لگی" (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
مصنف: انصاری اصغر جمیل   قیمت:
ملنے کا پتہ: صافہ بک ٹریڈرس اینڈ اسٹیشنرس، جامع مسجد مومن پورہ
ناگ پور۔ ۴۴۰۰۱۸

زیر تبصرہ کتاب "لگی" جناب انصاری اصغر جمیل کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔

انصاری صاحب کو زمانے سے جو کچھ ملا اور مشاہدے کی آنچ میں تپتے ہوئے ان کے ذہن نے جو کچھ سوچا ہے اسے انھوں نے نہایت ایمان داری کے ساتھ مزاحیہ پیکر عطا کیا ہے۔ تنگ نظریوں، ناانصافیوں اور دوسری معاشرتی خرابیوں کو گوارا بنا کر چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھیرنے کا کام کیا ہے۔

طنز کے تیر برسانے کے لیے مزاح نگار عموماً اپنی ہی ذات کو یا زیادہ سے زیادہ اپنی بیوی کو تختۂ مشق بنا کر پیش کرتا ہے تب جا کر قاری کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کرتی ہے۔

بائیس مضامین پر مشتمل اس مجموعے میں "سبتے" کے تحت ناگ پور کی چند ممتاز شخصیتوں کے خاکے بھی ہیں جنھیں تاثراتی مضمون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

——— محمد ارمان ندوی

قطعہ

دوستو! سادہ بیانی بھی دکھاتا اے کاش
چند شعر اپنی زبانی میں سُناتا اے کاش
کہ نمائش کے جبیں شور میں جم کر اخترؔ!
بسری یادوں کو کبھو بھول نہ پاتا اے کاش

اختر عمر اختر
۱۴۸/۳۳۵ محمود نگر۔ لکھنؤ

فراق صدی کی آواز

تاثرات کے آئینے میں

سید صاحب !

مہینوں کے انتظار کے بعد فراق نمبر ملا۔ اب کے تو آپ نے خاص نمبر کی شکل صورت ہی بدل دی اور اس طرح کہ یہ بجائے خود ایک نیا انداز بن گیا۔ ایک مثل کبھی سُنی تھی : کھانا پہلے آنکھیں کھاتی ہیں۔ اس نمبر کو دیکھ کر وہ یاد آگئی۔ خوب صورت طباعت، عمدہ کاغذ، حاشیوں پر دیدہ زیب آرایشی لہر، ہر صفحے کی پیشانی پر فراق کی تصویر ! ایسا آرایشی انداز بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ مضامین پر عنوانات اور مضمون نگاروں کے نام جلی اور کم جلی قلم سے اس طرح ثبت نظر آتے ہیں کہ حُسنِ آرایش بڑھ گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اس کتابی خاص نمبر کے لیے صفحات کا جو سائز اختیار کیا گیا ہے، اس کی رعایت سے مسطر کا انتخاب نہایت مناسب ہے۔ نہ اتنا گنجان کہ دیکھتے ہی نگاہ اُلجھن اور تھکاوٹ محسوس کرنے لگے اور نہ ایسا تفاوت زدہ کہ بکھراؤ کی تصویر بن جائے۔ سرورق کی تصویر بھی خوب ہے۔ آنکھوں کی چمک اس طرح روشن نظر آتی ہے جیسے سچ مچ وہ آنکھیں کچھ کہہ رہی ہوں۔ رسالہ سرکاری، اور سرکاری کاموں میں سَو پابندیاں اور اس سے زیادہ اُلجھنیں ہوتی ہیں۔ ان سب مشکلوں کے سایے میں آپ نے اس سے پہلے کئی بہت اچھے خاص نمبر نکالے ہیں اور یہ فراق نمبر بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی بن گیا ہے۔ اس محنت اور خوش ذوقی کے ساتھ اور مشکلوں کے ہجوم میں سے اپنا راستہ نکال لینے کی صلاحیت پر آپ واقعتاً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اس فراق نمبر کی مشکل یہ بھی تھی کہ نیا دور اس سے پہلے دو جلدوں میں بہت اچھا خاص نمبر شائع کر چکا ہے۔ دوسرے اداروں نے بھی اس سلسلے میں خاص نمبر شائع کیے ہیں ؛ ایسے میں ایک بار پھر اچھے مضامین حاصل کر لینا واقعی کمال کی بات ہے۔

اس نمبر میں جگن ناتھ آزاد اور گیان چند کے مضامین خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ آزاد صاحب نے ایک بہت اہم سوال اٹھایا ہے کہ ہندو تہذیب اور فلسفہ کیا محض محبوب کے اعضا کی حرکت شماری اور اس سے متعلق بیانات کا مجموعہ ہے؟ یہ بہت غور طلب بات ہے۔ جو لوگ فراق کی شاعری کو آفاقی عناصر کا مجموعہ اور ہندستان کی قدیم تہذیب کا عطر مجموعہ کہتے ہیں بغیر سوچے سمجھے، ایسے لوگوں کو جگن ناتھ آزاد کا یہ مضمون توجہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

مجھے اس خاص نمبر کی یہ خوبی خاص طور پر پسند آئی کہ اس میں فراق سے متعلق ایسے مختلف مضامین کو شامل کیا گیا ہے جن کو پڑھ کر اُن کی شاعری سے متعلق صحیح طور پر رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ نمبر بہت متوازن ہے اور بہت کام کا ہے۔

چوں کہ آپ نے بہت اچھے خاص نمبر مرتب کیے ہیں، اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ مرزا غالب کے دو سو سالہ جشنِ یادگار کے موقع پر بھی اگر نیا دور کا ایک خاص نمبر مرتب ہو سکے تو خوب ہو۔ چوں کہ آپ اس کام کو کر سکتے ہیں۔ اس لیے آپ سے فرمایش کر رہا ہوں۔ غالب کا کلام واقعتاً جلال و جمال اور فکر و خیال کا مجموعہ ہے۔ اُردو زبان پر اور اُردو شاعری پر غالب کا بہت بڑا حق ہے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ ادھر بھی توجہ کریں۔

———— رشید حسن خاں، شاہجہاں پور

عزیز گرامی قدر امجد حسین

ہزار در ہزار خلوص و دُعا۔ تمھارا ارسال فرمودہ فراق نمبر ملا، ایک اچھا ادبی تحفہ ملا۔ سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا، اور یہ سمجھ کر یہ تمھارا بھیجا ہوا ہے، اسے پیار کیا۔ ہماری ادبیات بالخصوص اُردو شعر و شعور کے مطالعہ میں فراق ایک کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور انفرادی یا اداراتی طور سے جب بھی فراق اور دورِ فراق پر کوئی مطالعہ کیا جائے گا یہ شمارۂ فراق اس میں ایک ریفرنس بن کر سامنے آئے گا۔

یہ کتنی بڑی بات ہے کہ آپ ایک ایسے ماحول میں کام کر رہے ہیں اور بہت اچھا کام کر رہے ہیں، جہاں بادی النظر میں کام کرنا کیا، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کے اس حوصلے اور اس سلیقۂ کار کو مسلسل کامیابیوں سے نوازے اور آپ اسی طرح اُردو کی گراں قدر اور لائقِ تحسین خدمات انجام دیتے رہیں۔

———— تنویر احمد علوی

جلد ۵۲ شمارہ (۱۱)

عنوانات

اپنی بات

نیتا جی سبھاش چندر بوس ہندستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہیں۔ اُن کا جذبۂ حب الوطنی اور آزادی کے لیے اُن کی تڑپ عدیم المثال تھی۔ اُنھوں نے ہندستان کے صفِ اوّل کے مجاہدین کے شانہ بشانہ جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور اس کے لیے اُنھوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ مسلسل جدوجہد سے عبارت تھا۔ اس ضمن میں مہاتما گاندھی سے اُن کے اختلافِ رائے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن گاندھی جی کے بارے میں اُن کے اِن گراں قدر الفاظ کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ:

"مہاتما گاندھی نے ہندستان اور ہندستان کی آزادی کے لیے جو کچھ کیا ہے، وہ اتنا انوکھا اور عدیم المثال ہے کہ اُن کا نام ہماری قومی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔"

اسی طرح گاندھی جی نے اُن کے متعلق کہا تھا:

"نیتا جی کی شخصیت میں ایک عجیب سحر انگیز کشش ہے۔ اُن کی حب الوطنی بے مثل ہے۔ اُن کی شجاعت اُن کے سبھی کاموں میں جھلکتی ہے۔"

گاندھی جی کی ہی طرح اُن کا بھی یہی کہنا تھا کہ "مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے خیالات، روایات، اقدار اور تاریخ سے واقف ہونا ہوگا، کیوں کہ تہذیبی وحدت سے ہی فرقہ وارانہ امن اور خیر سگالی کا راستہ ہموار ہوگا۔"

علی سردار جعفری نہ صرف اُردو شعر و ادب، بلکہ پورے ہندستانی ادب کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ وہ ہندستان کے ادبی منظر نامے کا لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ بحیثیت شاعر وہ بین اقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ شعری اظہار کے ساتھ نثری اظہار پر بھی ان کی گرفت بے پناہ ہے اور جب کبھی وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ:

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا"

بلکہ اُن کے جمال کی دلآویزی کچھ اور نکھر آتی ہے۔ جعفری صاحب کو ۱۹۹۷ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ دینے کا اعلان بلاشبہ پوری اُردو دنیا کے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہے۔

اُنیس سو ستانوے کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ جن فن کاروں کو دینے کا اعلان ہوا ہے، اُن میں نئی حسیت کے ممتاز ہندی شاعر لیلادھر جگوڑی کا نام بھی شامل ہے۔ جگوڑی صاحب کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاعری میں نئے طرزِ اظہار، نئے اسلوب اور نئی زبان کو فروغ دیا ہے۔

ادارۂ نیا دور علی سردار جعفری، لیلادھر جگوڑی اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ پانے والے تمام فن کاروں کو دلی مبارکباد اور تہنیت پیش کرتا ہے۔

—— شین قاف

وہ اِک ستارہ

نیتا جی سبھاش چندر بوس کی یاد میں

ڈاکٹر سعید عارفی

وہ اِک ستارہ
جو آسماں کی بلندیوں سے اُترا
غلام ہندوستاں کی
مہیب تاریکیوں میں چمکا
جس نے ساکت فضاؤں کو ارتعاش بخشا
شعور کو
بیداریاں عطا کیں
اور
ضمیر کو جھنجھوڑا
بے فکر ذہنوں کو
فکر کی حرارت سے جوڑا
دلوں میں شمعِ آزادیِ وطن جلائی
کہ جس سے
دلوں کے سیاہ خانے منوّر ہوئے
وہ جانتا تھا
کہ
آہن آہن کو کاٹتا ہے
وہ عسکری طاقتوں سے
جابر عسکریت کے استحکام کو
پارہ پارہ کر کے
وطن کو آزاد کرنے کا
خواب بُنتا رہا
وہ عزم و حوصلے کی قندیل
اپنی صلیبِ جاں پر
جلا کے
روشنی اور تمازتیں بانٹتا رہا
وہ جانتا تھا
اپنے سفر کی
ابتدا اور انتہا کا حاصل
وہ ذہن کی
وسعتوں میں
اِس اُمید کے ساتھ
عزائم کے بیج بوتا رہا
کہ
آنے والی نسل
اس فصل کو
کامیابی اور کامرانی سے کاٹ سکے۔

ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی
خاتون منزل۔ سید مرزا روڈ۔ لکھنؤ

نیتاجی اور جنگِ آزادی

"وہ لوگ مجھے خواب دیکھنے والا کہتے ہیں۔ میں قبول کرتا ہوں کہ میں خواب دیکھتا ہوں۔ میں ہمیشہ خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اپنے بچپن سے ہی۔ دنیا کی ترقی کا انحصار خواب دیکھنے والوں اور ان کے خوابوں پر ہی رہا ہے۔ اور یہ خواب تمام ممالک کی ترقی، زیادہ سے زیادہ عوام کی خوش حالی، ان کی آزادی اور خود مختاری سے متعلق رہے ہیں۔

میں خوابوں کے خواب دیکھنے والا رہا ہوں۔ لیکن میرے تمام خوابوں کا خواب، میری زندگی کا سب سے پیارا اور محبوب خواب ہندستان کی آزادی کا خواب رہا ہے۔

اُن کا خیال ہے کہ خواب دیکھنا بزنامی کی بات ہے۔ مگر میں اپنی اس عادت پر فخر کرتا ہوں۔ انھیں میرے خواب اچھے نہیں لگتے ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

اگر میں نے ہندستان کی آزادی کے خواب نہ دیکھے ہوتے تو میں غلامی کی زنجیروں کو ابدی شکل میں قبول کر لیتا۔

اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا میرے خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔۔؟

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے خواب روز افزوں حقیقت میں تبدیل ہوتے رہے ہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد ہندستان نیتاجی سبھاش چندر بوس کی زندگی کا سب سے زیادہ حسین خواب تھا۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد شروع کر دی ہوگی اور جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ نیتاجی نے اپنی پالیسیوں اور کوششوں کے نتیجے میں مادرِ ہند کی آزادی کو یقینی بنا دیا تھا۔

سبھاش چندر بوس کٹک (اڑیسہ) میں ۲۳ر جنوری ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کی پیدائش کا یہ سال تاریخ ہند میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۸۵۷ء یعنی نیتاجی کی پیدائش سے چالیس برس قبل برطانوی سامراج کے خلاف جنگِ آزادی لڑی گئی تھی۔ سبھاش جی نے ۹۰ برسوں کے بعد دوبارہ علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں حاصل ہونے والی آزادی کی لڑائی کے دوران سبھاش جی کی پیدائش اس کے درمیانی نکتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سبھاش جی کے والد جانکی ناتھ بوس اڑیسہ میں آکر آباد ہوے تھے انھوں نے وکالت کو پیشے کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ ان کے والد کا تعلق ماہی نگر کے بوس خانوادہ اور ماں کا تعلق کلکتہ میں ہتہ کھولا کے دت خاندان سے تھا۔

سبھاش جی نے پانچ برس کی عمر میں کٹک کے ایک مشن اسکول میں تعلیم شروع کی۔ یہاں وہ سات برس تک پڑھتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں سبھاش جی نے ریون شا کالجیٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں اساتذہ ان کا خاص خیال رکھتے تھے کیوں کہ انھیں سبھاش میں ایک ذہین طالب علم نظر آتا تھا اور سبھاش نے امتحان میں اپنے اساتذہ کی امیدوں کو پورا کر دکھایا۔ اسی کالج میں سبھاش ذہنی بحران سے گزرے جس سے وہ کافی پریشان اور الجھے ہوے رہے۔ جلد ہی ان کی دل چسپی رام کرشن اور وویکا نند جیسی عظیم شخصیتوں میں پیدا ہو گئی اور انھوں نے اپنے ہم خیال لڑکوں کا ایک گروپ بھی تشکیل کر لیا تھا سوامی وویکانند کی تعلیمات نے سبھاش کو ذہنی بحران سے نکلنے میں بڑی مدد کی۔ انھوں نے سوامی جی کی کتابیں پڑھیں، جن سے انھیں اپنے مسائل کے اطمینان بخش حل ملے۔ سبھاش جی ان کی اس تعلیم سے بہت زیادہ متاثر ہوئے کہ بنی نوع انسان کی فلاح میں اپنی نجات تلاش کرو۔ اپنا غیر تعلیمی دلچسپیوں

کے باوجود سبھاش نے ۱۹۱۳ء میں نہ صرف میٹرک کولیشن کرلیا بلکہ کلکتہ میں دوسرے مقام پر رہے ۔۔۔۔ اب انھوں نے پریسی ڈنسی کالج میں داخلہ لے لیا جو اس وقت کا معیاری کالج سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اپنی روحانی معاملات میں دلچسپی کے باعث وہ گھر چھوڑ کر غائب ہوگئے۔ جب ان کے والدین نے ان کی واپسی کی اُمید چھوڑ دی تو وہ دوبارہ نمودار ہوئے۔ اب وہ پھر تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک استاد کے ساتھ طلباء کی بدسلوکی کے نتیجے میں انھیں بھی کالج سے نکال دیا گیا۔ اخراج کا حکم منسوخ ہونے کے بعد انھوں نے ۱۹۱۷ء میں اسکاٹش چرچ کالج کلکتہ میں داخلہ لیا اور سنجیدگی سے اپنی تعلیم میں لگ گئے۔ اسی دوران انھوں نے ٹیری ٹوریل آرمی کی یونیورسٹی یونٹ میں داخلہ لے لیا۔ ان کی یہ فوجی تربیت ۲۵ برس بعد اس وقت ان کے کام آئی جب انھوں نے انڈین نیشنل آرمی کی تشکیل کی۔ ۱۹۱۹ء میں سبھاش نے امتیازی حیثیت سے گریجویشن کیا اور فلسفہ میں امتیاز حاصل کیا۔ اب انھیں انڈین سول سروس کے مقابلہ کے امتحان کے لیے برطانیہ روانہ کر دیا گیا۔ گو کہ سبھاش کو اس سروس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، تاہم وہ انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ہندستان کا ماحول کشاکش سے پُر تھا۔ جلیان والا باغ کا المناک سانحہ ہوچکا تھا، جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سبھاش نے ۱۵ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو ہندستان چھوڑا، اور اس وقت وہ پنجاب میں انگریزوں کی زیادتیوں اور ظلم سے باخبر نہیں تھے۔ کیوں کہ خبروں پر زبردست پابندی عائد تھی۔ سبھاش اس مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہوئے مگر جب ملازمت کا موقع ہاتھ آیا تو وہ پس و پیش میں پڑ گئے اور اس ذہنی کیفیت کا اظہار بھی انھوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۲۰ء میں کیا ہے جو انھوں نے اپنے بڑے بھائی شرت چندر بوس کو لکھا تھا،

> "انڈین سول سروس دنیاوی سہولتیں مہیا کرسکتی ہے لیکن کیا یہ تمام آسائشیں رُوح کی قربانی کا صلہ ہیں؟ میں اسے منافقت سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ایک آئی سی۔ ایس کی ملازمت کی شرائط کی پابندی اور زندگی کے اعلا اقدار کے درمیان کوئی مناسبت ہے۔"

اپنی اسی فکر کے باعث سبھاش نے ۲۲ر اپریل ۱۹۲۱ء کو آئی سی۔ ایس۔ کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور ۱۶ر جولائی ۱۹۲۱ء کو ہندستان واپس آکر اپنی زندگی ملک کی آزادی کے حصول کے لیے وقف کر دی۔

ہندستان واپس آکر سبھاش چندر بوس نے ملک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا اور یہ محسوس کیا کہ یہ دور قومی بیداری کا ابتدائی دور ہے۔ ہر نوجوان کے دل میں انقلاب کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ سبھاش نے پنجاب کو جلیان والا باغ کے المیے سے مضطرب پایا۔ اسی دوران رولیٹ ایکٹ نے اس انقلابی لہر کو نئی زندگی دی۔ مہاتما گاندھی ملک کے گوشے گوشے میں گھوم کر لوگوں کی قوتِ نفس کو بیدار کرنے لگے۔ لوگوں نے اپنے سرکاری خطابات واپس کر دیے۔ بنگال میں دیش بندھو چترنجن داس نے مختلف تنظیموں کے ذریعہ نوجوانوں میں انقلاب اور آزادی کی روح پھونک دی۔ سبھاش بھی چترنجن داس کی مقناطیسی شخصیت کی جانب کھنچے چلے گئے اور ان کے گرویدہ ہوگئے۔ دوسری جانب دیش بندھو کو بھی سبھاش جیسے پُرعزم نوجوان کی صلاحیت پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔

سبھاش کو دیش بندھو نے اسی طرح متاثر کیا تھا جیسے وویکانند کو رام کرشن پرم ہنس نے۔ اور پھر سبھاش ہندستان کی جنگ آزادی میں پوری طرح شامل ہوگئے۔ دیش بندھو نے انھیں نیشنل کالج بنگال کا پرنسپل مقرر کر دیا اور انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کی ایک تجویز کے تحت جب سیکڑوں قومی رضاکاروں کی ٹیم دیش بندھو نے تیار کی تو اس کی قیادت بھی سبھاش کے سپرد کر دی۔ انھوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ جس بے مثل شجاعت اور تنظیمی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اس سے بنگال کی حکومت گھبرا گئی۔ جب اس ٹیم نے پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کی مخالفت کا ارادہ کیا تو ہزاروں رضاکاروں کے ساتھ ہی سبھاش چندر بوس کو گرفتار کر کے علی پور جیل بھیج دیا گیا۔ ایک مجاہد آزادی کے طور پر سبھاش کی یہ پہلی گرفتاری تھی۔ انھیں چھ ماہ کی قید ہوئی۔ اسی دوران خوش قسمتی سے دیش بندھو کو بھی گرفتار کر کے اسی جیل میں لایا گیا۔ اس طرح سبھاش کو اپنے رہنما سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد سبھاش نے بنگال میں آنے والے زبردست سیلاب کے شکار افراد کی خدمت کی ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے رات دن ایک کر کے پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کو راحت پہنچانے کا کام انجام دیا۔ دیش بندھو نے آزادی کی لڑائی کے لیے آئندہ پروگراموں میں یہ بھی طے کیا تھا کہ برطانوی حکومت کی کونسلوں میں شامل ہو کر برطانیہ کے خلاف لڑا جائے۔

انھوں نے جب اپنی یہ تجویز کانگریس کے سامنے پیش کی تو سبھاش نے ان کی مکمل حمایت کی۔ مگر اس تجویز نے کانگریس کو دو گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح دیش بندھو نے ایک نئی پارٹی سوراج پارٹی کے نام سے تشکیل کی جس نے کونسل کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور دیش بندھو نے میئر بنتے ہی سبھاش کو ایگزیکیٹو افسر مقرر کیا۔ سبھاش نے کلکتہ کو ایک آدرش شہر کی حیثیت سے ترقی دینے کا عزم کیا مگر اسی دوران ایک نوجوان نے کسی انگریز افسر کو قتل کر دیا جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے انتہائی انقلابیوں کو گرفتار کر لیا اور ساتھ ہی سبھاش کو بھی بغیر کسی سبب کے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ان کی گرفتاری نے پورے ملک میں آگ لگا دی۔ جیل میں سبھاش مسلسل اپنے انقلابی ساتھیوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسی دوران دیش بندھو کا انتقال ہو گیا مگر سبھاش کو رہا نہیں کیا گیا۔ انھوں نے برطانی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف جیل میں ہی اپنے بیس ساتھیوں کے ساتھ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ شری نواس شاستری، شری گو سوامی اور لالہ لاجپت رائے کے ساتھ ہی اخبارات نے ان کی قید کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا۔ زبردست ہنگامے کے بعد حکومت نے ایک میڈیکل ٹیم کی سفارش پر سبھاش کو سخت پابندیوں کے ساتھ علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ بھیجنے کی تجویز رکھی۔ سبھاش کو یہ شرائط منظور نہیں تھیں، لہٰذا ان کی رہائی ٹل گئی۔ مگر کچھ دنوں بعد حکومت نے خود ہی انھیں آزاد کر دیا، اور جہاں مرضی ہو، جانے کی اجازت بھی دے دی۔

اگرچہ سبھاش کو گاندھی جی کی پالیسیوں سے مکمل اتفاق نہیں تھا تاہم انھوں نے گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک میں پوری طرح حصہ لیا، مگر ۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی تو سبھاش نے ان کی مخالفت کی۔ لیکن ۱۹۳۰ء کی شہری نافرمانی تحریک میں دونوں پھر ایک ساتھ تھے۔ سبھاش سوشلسٹ نظریات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ کانگریس میں نوجوان طبقے کی حمایت سے وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی سے ان کے اختلافات شدید ہو گئے۔ اس کے باوجود ۱۹۳۹ء میں وہ دوبارہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ گاندھی جی سے اختلافات کے باعث انھوں نے کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور آزادی کے حصول کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے واسطے انھوں نے فارورڈ بلاک پارٹی قائم کی۔

سبھاش چندر بوس کو برطانوی حکومت کے خلاف اپنے خیالات اور سرگرمیوں کے نتیجے میں جولائی ۱۹۴۰ء میں ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ سبھاش بھوک ہڑتال پر چلے گئے اور انھوں نے بنگال کے گورنر کو لکھا،

"فرد کو مر جانا چاہیے، تاکہ قوم زندہ رہے۔ آج مجھے مر جانا چاہیے تاکہ ہندستان اپنی آزادی اور شان و شوکت حاصل کر سکے۔"

صحت کی خرابی کے باعث انھیں جیل سے رہا کر کے نظر بند کر دیا گیا، مگر ایک پٹھان کا بھیس بنا کر وہ روس اور وہاں سے جرمنی نکل جانے میں کامیاب ہو گئے، وہاں ہٹلر سے مل کر انھوں نے اسے ہندستان کی آزادی کی لڑائی کے بارے میں تفصیل سے سمجھایا۔

سبھاش کو ۱۹۴۳ء میں انڈین انڈی پنڈنس لیگ کا صدر اور انڈین نیشنل آرمی کا سپریم کمانڈر مقرر کیا گیا۔ عوام انھیں پیار سے "نیتا جی" کہنے لگے تھے۔ انھوں نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو سنگاپور میں عارضی حکومت ہند قائم کی۔ اس حکومت کو اس وقت دنیا کے ۹ ممالک نے، جن میں جاپان، جرمنی، اٹلی اور برما وغیرہ شامل تھے تسلیم کر لیا تھا۔ اب حکومت کے صدر کی حیثیت سے نیتا جی نے امریکا اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انھوں نے انڈین نیشنل آرمی کو اپنی قیادت میں ہندستان کی جانب کوچ کرانے کا فیصلہ۔ انھوں نے اس آرمی کو "چلو دہلی" اور "ٹوٹل موبلائزیشن" جیسے جنگی نعرے بھی دیے۔

نیتا جی کی اس عارضی حکومت کو اس وقت کچھ حصوں میں اقتدار حاصل ہوا جب جاپان نے ۶ نومبر ۱۹۴۳ء کو انڈمان اور نکوبار کے جزیرے اس کے حوالے کر دیے۔ نیتا جی نے انھیں 'شہید' اور 'سوراج' کے نئے نام دیے۔ ۱۹۴۴ء میں انڈین نیشنل آرمی ہندستان کی سرزمین میں داخل ہوئی اور چٹاگانگ کے قریب موڈوک پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے کوہیما اور ناگالینڈ کی جانب پیش قدمی کی۔ اس کا نصب العین منی پور کی راجدھانی امپھال پر قبضہ کرنا تھا۔ اس وقت تک آرمی ہندستان میں دو سو کیلومیٹر اندر داخل ہو چکی تھی اور اس نے کئی جنگی چوکیاں برطانوی سپاہیوں سے چھین لی تھیں۔ جب یہ آرمی امپھال کے قریب پہنچ رہی تھی اس وقت جاپان کو برما اور ہند کی سرحد سے اپنی افواج کو پیچھے ہٹانا پڑا اور ساتھ ہی اپنے ہوائی جہاز بھی امریکا کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اپنی سرحد سے ہٹانا پڑے۔ دوسری طرف اس علاقے میں زبردست بارش نے بھی آرمی کی پیش قدمی کو روک دیا اور آرمی برما کی جانب پیچھے ہٹ گئی۔

۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی بمباری کے بعد جاپانی افواج

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

عارف ایوبی،
شعبۂ علوم مشرقیہ۔ لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

آزاد ہند فوج اور نیتاجی

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے جرمنی کے خلاف جنگ بند کرنے کے لیے کچھ خطوط ہوائی جہاز سے گرائے تھے، ان کا ہندستانی فوجیوں پر شدید ردعمل ہوا۔ ہندستانی فوجیوں نے سبھاش چندر بوس کا پیغام پوری توجہ سے پڑھا اور سمجھا اور انگریزوں کی کمان سے نکل کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ جرمن سے صلح کرنے کے لیے کرنل حسن علی کی قیادت میں جرمن فوج کی جانب بڑھے۔ لیکن جرمن فوج کے کمانڈر نے جب برٹش فوج کے ہندستانی دستے کو اپنی جانب پیش قدمی کرتے دیکھا تو اس نے سوچا ممکن ہے کہ دشمن بالکل قریب پہنچ کر اچانک حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، اس لیے اس نے اپنی فوج کو ہوشیار رہنے کا حکم دیا، اور ہندستانی دستے کے اپنے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

جرمن فوج کے قریب پہنچ کر ہندستانی فوج کا دستہ رک گیا اور ان کا نمائندہ جرمنی کے کمانڈر کے پاس گیا اور صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے جرمن کمانڈر سے کہا کہ "کرنل حسن علی آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں" اور ملاقات کی اجازت حاصل کرکے وہ واپس آگیا۔

کرنل حسن علی کا خیر مقدم کرتے ہوئے جرمن فوج کے کمانڈر نے انھیں برٹش فوج سے الگ ہونے کے لیے مبارک باد دی، ساتھ ہی اس کی خبر وائرلیس سے سبھاش چندر بوس کو بھی دے دی۔ خبر ملتے ہی نیتاجی میدانِ جنگ میں پہنچے اور ہندستانی فوجیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی قیادت سنبھال لی۔

سبھاش چندر بوس سے متاثر ہو کر پینتالیس ہزار ہندستانی فوجیوں نے انگریزوں کی کمانڈ چھوڑ کر نیتاجی کو اپنا قائد تسلیم کرلیا۔ اسی موقع پر نیتاجی سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج کی داغ بیل ڈالی اور ڈریسڈن کو اپنا صدر دفتر بنا کر فوج کی مکمل قیادت سنبھال لی، اور فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ساتھیو! برطانیہ ہمارا اور جرمنی دونوں کا دشمن ہے اس لیے جرمنی کی مدد سے ہی ہمیں اپنی تحریکِ آزادی کی تیاری کرنا ہے۔"

خطاب کے بعد نیتاجی نے قومی جھنڈا لہراتے ہوئے کہا:

"ہمیں طے کرلینا چاہیے کہ ہم نے اس قومی جھنڈے کو جو اہمیت دی ہے اسے کبھی مٹنے نہیں دیں گے۔"

برلن ریڈیو سے پوری دنیا میں پھیلے ہندستانیوں کے نام ایک پیغام میں نیتاجی نے کہا تھا:

"ہم کو اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے۔ سرزمین ہند پر ہمارا پورا حق ہے اور جب تک ہندستان کی سرزمین پر ایک بھی ہندستانی زندہ باقی ہے تب تک ہمارا یہ حق قائم و دائم رہے گا۔ اسی حق کے ساتھ ہم اپنی خود اعتمادی کی بنیاد پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم پوری طرح سے آزاد ہیں اور اپنی جان پر کھیل کر ہندستان کی عظمت قائم رکھیں گے، اور جب تک اپنے اسلحوں کی مدد سے ایک ایک غیر ملکی کو اپنے ملک سے باہر نہ نکال دیں تب تک چین نہ لیں گے۔"

سبھاش چندر بوس کے اس نشریے نے ہندستان، ملایا، سنگاپور، جاپان اور برما کے ہر ہندستانی کو تحریکِ آزادی میں فعال کردار ادا کرنے کے لیے بے چین کردیا۔

رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مقبرے پر آزاد ہندستان کے آخری بادشاہ کو نیتاجی نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

ہم ہندستان کے مذہبی عقائد کو الگ رکھ کر بہادر شاہ ظفر کی یاد منا رہے ہیں، لیکن یہ اس لیے نہیں کہ وہ ایسے شخص تھے جنھوں نے ہندستانیوں کو دشمن سے لڑنے کے لیے راغب کیا تھا، بلکہ اس لیے کہ ان کے جھنڈے کے نیچے آزادی کے متوالے مسلمان، ہندو اور سکھ سب نے شانہ بشانہ مل کر

جنگ لڑی تھی"۔

آزاد ہند فوج کا سپہ سالار بننے کے بعد نیتاجی کی ذمہ داریاں کافی بڑھ گئی تھیں اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ آزاد ہند فوج کا کام کافی بڑھ گیا ہے تو انھوں نے اسے پوری طرح فعال رکھنے کے لیے غیر مستقل ہندستانی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے کہا،

" مغربی ایشیا میں بھارتیہ سوادھینتا سنگھ کے ذریعے آزاد ہند حکومت قائم کرکے ہم نے جو پیش رفت کی ہے اس کے لیے پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کے لیے اب اور آگے بڑھتے ہیں اسی لیے اب اس غیر مستقل حکومت کے قیام کا اعلان کیا جاتا ہے اور ہر ہندستانی پورے اطمینان کے ساتھ اس پر اعتماد کرسکتا ہے۔ نیز یہ حکومت اپنے ہر شہری کو مذہبی آزادی کے ساتھ یکساں اختیارات اور سہولیات فراہم کرنے کا وعدہ کرتی ہے۔ یہ حکومت ملک کے ہر شخص کے لیے یکساں طور سے خوش حالی کی ضمانت دیتی اور اس کی حفاظت کا اعلان کرتی ہے۔ ماضی میں غیر ملکی حکومت نے اختلافات پیدا کرکے جو نازک صورتِ حال پیدا کی ہے اسے ختم کرنے کے بعد حالات کو پُر امن بنانے کا بھی اعلان کرتی ہے "۔

آزاد ہند حکومت کے اعلان کے چند روز بعد ہی مختلف ممالک نے نیتاجی کو مبارک باد دی، اور ان کی تشکیل دی ہوئی حکومت کو تسلیم کرلیا۔ جن میں جاپان، اٹلی، جرمنی، تھائی لینڈ اور برما وغیرہ شامل تھے۔

اسی دوران ٹوکیو میں کُل ایشیائی ممالک کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی، جس میں برما کے ڈاکٹر باما نے ہندستان کی تحریک آزادی کو ہر ممکن تعاون دینے کی تجویز پیش کی۔ اس لیے نیتاجی نے راجدھانی یا صدر دفتر کو سنگاپور سے رنگون منتقل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اس غیر مستقل سرکار نے ہندستانی شہریوں پر ایک ٹیکس لگایا جس سے وصول ہونے والی رقم کا ایک حصّہ فوجیوں کے لیے مختص کیا گیا اور دوسرے حصّے سے سبھاش چندر بوس نے سنگاپور میں ایک پریس خرید لیا، اور یہاں سے ایک اخبار "آزاد ہند" جاری کیا جس کے یومیہ دو ایڈیشن شائع ہوتے تھے، ایک انگریزی میں دوسرا ہندی میں، جو اردو رسم الخط میں آسان ہندی زبان میں شائع ہوتا تھا اسی اخبار "آزاد ہند" کے ایڈیٹر نے ایک بار اپنے اداریے میں لکھا تھا:

"جے ہند کیسی شان دار سلامی ہے، ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ جے ہند ہندوستان کی جے ہو۔ چالیس کروڑ بھوکی ننگی روحوں کی جے ہو۔ تہذیب کی مشعل جلانے والے عظیم ملک کی جے ہو۔ اس ہندستان کی جے ہو جس کے سنتوں نے ہمیشہ امن کا درس دیا ہے۔ کروڑوں دبے کچلے لوگوں کی جے ہو جس پر مٹھی بھر غیر ملکی حکومت کر رہے ہیں — وہ غیر ملکی جو کبھی غاروں میں رہتے تھے —

سُنو! ہندستان ہمیں پکار رہا ہے۔ ہندستان کی راجدھانی دلی ہمیں پکار رہی ہے — دیکھو۔ سامنے راستہ کھلا ہوا ہے — ہم اسی راستے سے آگے بڑھیں گے — دشمن کی فوج کو چیر کر ہم اپنا راستہ بنالیں گے۔ خدا کی مرضی ہو گی تو ہم میدانِ جنگ میں شہید ہو جائیں گے، لیکن جس راستے سے ہماری فوج دلّی کی جانب بڑھے گی ہمارے فوجی جوان، اس راستے کو مرنے سے پہلے چوم لیں گے۔ دلّی کا راستہ تحریکِ آزادی کا راستہ ہے۔

دلّی چلو — !!

قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا
یہ زندگی ہے قوم کی، تو قوم پہ لٹائے جا
تو شیرِ ہند آگے بڑھ، مرنے سے پھر بھی نہ ڈر
فلک تلک اٹھا کے سر، جوشِ وطن بڑھائے جا
ہمت تری بڑھتی رہے، خدا تیری سُنتا رہے
جو سامنے ترے اَڑے، تو خاک میں ملائے جا
چلو دلّی پکار کے، تو کمانشاں سنبھال کے
لال قلعے پہ گاڑ کے، پھہرائے جا پھہرائے جا
قدم قدم بڑھائے جا !!

مٹی کا المیہ

مُلائم، بھُوری بھُوری سی،
بہت زرخیز تھی اس کھیت کی مٹی
کوئی موسم ہو، وہ رہتی نئی فصلوں کا گہوارہ
کِھلے ہوتے گلاب اور موتیا، بیلا چنبیلی اس کی مینڈھوں پر
اِدھر سے جو گزرتا، ایک لمحے کو ٹھہر جاتا
مہک پھولوں کی سانسوں میں بسا لیتا
صَبا لہرا کے جب چلتی تو اس مٹی کی خوشبو کو
بساتی اپنے دامن میں، فضا میں رقص فرماتی
وہ مٹی بن گئی موضوع گیتوں کا
اُسے لکھا گیا، گایا گیا، چاہا گیا ـــــ لیکن
ہوئے پھر جمع اس کے گرد ایسے خود غرض، جن کو
کوئی نسبت نہ تھی مٹی کی عظمت سے
ہوس میں کر دیا پامال،
اس کو روند ڈالا پلٹ کے نفرت سے

وہ مٹی اب بھی ہے اس کھیت میں، لیکن
گلاب اس میں نہیں کھلتے
اُگے ہیں باڑھ پر کانٹے
اور اس کی سوندھی سوندھی مست خوشبو کو
چُرا کر لے گئی ہے وقت کی آندھی۔

رفعت سروش

۲-بی، پاکٹ 'سی'
سدھارتھ ایکسٹینشن،
نئی دہلی
۱۱۰۰۱۴

ہائیکو

دیواروں کو پڑھ
بعد اس کے مرضی تیری
رُک یا آگے بڑھ

O

خوابوں کا موسم
اب بھی دیتا رہتا ہے
تعبیروں کا غم

O

زخمی سب اقدار
آنکھیں ہوگئیں پتھریلی
اور پڑھو اخبار

O

رنگ و نُور اپنے
پھر بھی دیکھتا رہتا ہوں
مٹی کے سپنے

O

مایوس کیوں رہیں
پھیلی ہوئی ہیں دُور تک
امکان کی حدیں

O

پھول ہے وہ نہ سنگ
پھر کیوں ہوتی رہتی ہے
اپنے اندر جنگ

O

خواب نہ کوئی دُھن
دے رہا ہے وقت آواز
کان لگا کر سُن

O

چلنا ہے تو چل
رقصِ آتش روک کے راہ
یا برسے بادل

عطا عابدی

اُردو سیکشن
بہار قانون ساز کونسل
پٹنہ
۸۰۰۰۱۵

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
۵۲۴ - اترسوئیا - حسن منزل
الہ آباد

ہند۔ایران تعلقات تہذیبی تناظر میں

افکارِ حیات پر مبنی تخلیقی کاوشوں کے مظہر کا نام تہذیب ہے ہماری گفت گو، نشست و برخاست، معاشرت اور پھر اپنے رہن سہن کو سجانے اور سنوارنے کے لیے لسانیات، فنِ تعمیر، مصوّری، نقاشی اور ادبیات میں نئی نئی جدّتیں ـــ یہ سب تہذیب ہی کا ایک رُخ ہیں۔

وہ جو کسی فلسفی نے کہا ہے کہ ہم دوسروں کو دیکھ کر اپنی پہچان اور شناخت بناتے ہیں، کچھ ترک کرتے ہیں، کچھ اختیار کرتے ہیں۔ زندگی کے بہت سے معاملات میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے اور سکھاتے ہیں اور یہی ایک دوسرے سے رابطہ، انسانی ارتقا، اور اعلیٰ و ارفع تہذیب کی تعمیر اور تشکیل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ہندستان اور ایران کے روابط بہت قدیم ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے، اپنایا ہے۔ ہندستان کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کا آبِ حیات' کا یہ پہلا فقرہ قابل غور ہے:

"آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔ مگر اب تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اُردو ہے"۔

اس ایک فقرہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک ہندستان کے اہلِ علم میں فارسی کا ہی چلن تھا۔ اپریل ۱۹۰۰ء تک بھی محکموں اور دفاتر میں فارسی کا ہی رواج زیادہ رہا۔ آج بھی وہ لوگ جو اُردو نہیں جانتے، تمسّکات، رہن بالقبض، دستاویز بڑی بے تکلفی سے بولتے ہیں۔

آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں ایران اور ہندستان کے لسانی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"اور عجب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہندستان آکر راجا مہاراجا کا خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی پر درفش کاویانی لہرایا"۔

لوکس کے خیالات میں بھی آزاد کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ انڈو یورپین گروہ جو وادی سندھ میں بلخ کے راستے داخل ہوا تھا۔ اپنی زبان اور مذہبی تصوّرات میں ایرانیوں سے قریب تھا۔ چنانچہ ایران کی قدیم تاریخ میں چار برنوں کی تقسیم ملتی ہے۔ پیشوں کی بنا پر شناخت بھی ایرانیوں کی ہی دین ہے۔

آزاد نے ہند ایران کے لسانی رشتوں پر روشنی ڈالی ہے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں زردشت کے ماننے والوں کی مذہبی کتاب کا نام اوستا تھا پھر اس کے شکل مقامات کی تفصیل لکھی گئی، جو ژند کہلائی اور پھر اس ژند کی تفصیل اور تشریح کا نام پاژند پڑا۔

اس لسانی تعلق کی وجہ سے بہت سارے الفاظ، جن میں رشتوں کے نام ہیں، سنسکرت اور فارسی میں ایک ہی آہنگ رکھتے ہیں اور سنسکرت اور ان کتابوں کی زبانیں ایک ہی دادا کی اولاد معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن ان سے قطع نظر آج بھی زبانوں پر ایسے الفاظ چڑھے ہوئے ہیں جو ایران سے تہذیبی سفر کر کے یہاں آئے اور ہماری تہذیب کا جزو بن گئے۔ چنانچہ حمام، شیشہ، شمع، نماز، روزہ، عید، ماضی، ساقی، بادام، منقیٰ، شہتوت اور مشک وغیرہ ایسے ہی الفاظ ہیں۔ اور یہ الفاظ یا دوسرے الفاظ اپنے پس منظر میں پوری تہذیب رکھتے ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعے انسانوں کو گھر میں متحرک دیکھا جا سکتا ہے۔ جو کچھ استعمال کرتے ہیں اسی سے ان کے ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، چاہے سیب ہوں یا جہانگیر کے لفظوں میں بدخشاں اور خراسان کا خربوزہ، انگور اور [illegible] اگر آراستہ ہو تو قورمہ، پلاؤ، شیر [illegible] کباب، [illegible] نان، شب دیگ

اور متنجن ہوں۔ غرضیکہ میر امنؔ نے شہزادی بصرہ کی داستان میں جتنے کھانوں کے نام گنوائے ہیں ان میں سے بیشتر ایران کی دین ہیں — کھانا کھاتے ہوئے جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ قالین پر بیٹھے ہیں، گاؤ تکیہ لگا ہے۔ تو آبدار خانے سے صُراحی میں پانی آیا ہے اور ہاتھ دھونے کے لیے اُٹھے ہیں تو سامنے آفتابہ موجود تھا۔ اس طرح کے ہزاروں الفاظ ہیں جنھیں سماجی لسانیات کے ماہرین تہذیبی تناظر میں پیش کر سکتے ہیں جو ایران کا عطیہ ہیں۔

ان تمدنی جلوؤں میں سے فنِ تعمیر بھی اہم ہے۔ اس سلسلے میں گلبرگہ کی جامع مسجد، بیجاپور کی جامع مسجد، بیدر میں محمود گاواں کا مدرسہ، احمد آباد کی جامع مسجد، جھولتی مینارین، مسجد رانی جیسی عمارتیں تو ایرانی ماہرِ فن کی مہارت کا نمونہ ہیں۔ تاج محل کے منصوبہ ساز عیسیٰ بھی ایرانی تھے انھوں نے اطالوی ماہرین کے ساتھ مل کر تاج محل بنایا تھا۔ لیکن ان سب سے بالاتر حضرت امین الدین اعلیٰ کا مقبرہ ہے جس کی تعمیر ان کی وصیت کے مطابق ان کی حیات ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ حضرت امین نے خواب میں مشہدِ مقدس میں حضرت امام رضاؔ کے روضۂ مبارک کی زیارت کی تھی اور ہو بہو ویسا ہی مقبرہ اپنے لیے تیار کروانا چاہتے تھے اور ویسا ہی مقبرہ بنا تھا۔ حیدر آباد کا چار مینار۔ الاوہ سرطوق مبارک میں دار الشفا کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ میر محمد مومن استر آبادی کے اثر کی وجہ سے یہ عمارتیں ایرانیت کا نمونۂ اعلا ہیں۔

عبد السلام ندوی نے "تاریخ فرشتہ" کے حوالے سے گول کنڈہ کی بہت سی عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے جو ایرانیوں کی طرز پر تعمیر کی گئی ہیں۔ ایرانیوں کے لطیف مزاج میں عمارتوں میں نہر، حوض اور تالاب کی تعمیر ضروری سمجھی جاتی تھی۔ میر حسنؔ نے "سحر البیان" میں جس باغ کی منظر کشی کی ہے وہ ہند ایرانی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے ؎

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چمن سے بھرا باغ، گُل سے چمن — کہیں نرگس و گُل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جُدا اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار — ہر اک گُل سفیدی سے مہتاب دار
کہیں زرد نسرین کہیں نسترن — عجب رنگ کے زعفرانی چمن

پڑی آب جو ہر طرف کو بہے — کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

ان اشعار سے جو پہلو سامنے آتے ہیں ان میں حوض و تالاب بنوانا، باغ میں نہر کی تعمیر، چمن بندی، تختہ بندی، جدول اور بیابان کو خیاباں میں بدل دینا ایرانیوں کا کارنامہ تھا۔

میر حسنؔ کے اشعار میں ایک اور پہلو قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ چنبیلی، موتیا، رائے بیل، موگرا، گیندا کی مہک کے ساتھ ساتھ ارغوان، لالہ، جعفری، داؤدی، نسرین و نسترن کی خوشبو بھی ہے سرو کے گرد قمریوں کا ہجوم ہے۔ میر حسنؔ نے جو منظر کھینچا ہے اس کے پس منظر میں یہ تاریخی صداقت بھی ہے کہ علی مردان خاں نے لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان جو نہر بنوائی تھی وہ ایرانی ماہرینِ فن کی رہینِ منت تھی۔ محمد قلی نے چار مینار کے پاس گلزار حوض بنوایا تھا اور گجرات کے سلطان محمود نے ایسا عمدہ باغ تیار کرایا تھا جس میں حوض اور فوارے تھے۔ امیر خسروؔ کو ہندستانی پھول زیادہ پسند تھے، چنانچہ اپنی مثنوی "نُہ سپہر" میں بیلا، چنبیلی، جوہی، کیوڑا، سیوتی، مولسری کا ذکر کیا ہے۔ چنپا کو سب پھولوں کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں ایرانی پھولوں میں گلِ سرخ، بنفشا، سوسن، ریحان، تاجِ خروس، نافرمان خطمی کا تذکرہ کیا ہے۔

ان باغوں میں کثرت سے پرندے پالے جاتے تھے۔ ہندستان میں طوطا مینا پالے جاتے تھے۔ کوئل کا تذکرہ ہوتا تھا۔ چیل کوّے کو حقارت سے دیکھتے تھے البتہ کوّا جب دیوار پر بولتا تھا تو کسی کے آنے کی خبر دیتا تھا اور کبوتر پیغام رسانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ بگلا بھگت تھا، سارس حرماں نصیبی کی علامت۔ مور حُسن کا پیکر مگر پیر سے منحوس۔ لیکن ایران میں پرندوں کا عام رواج تھا: شہباز و شاہین، قمریوں و بُلبُل کے زمزموں اور چہچہوں سے ہر چمن گونجتا دکھائی دیتا تھا۔

فنونِ لطیفہ کا ایک رُخ نقاشی ہے۔ خواجہ عبد الصمد، میر علی تبریزی بھی ہندستان آئے اکبر کے دربار میں آقا رضا کاشانی کے فرزند جو خود بھی بہت بڑے نقاش تھے، موجود تھے۔

نقاشی کو بھی ایک رُخ خطاطی کو بھی سمجھنا چاہیے جس میں محمد عرف کی

تزئین سے لفظوں کی آرائش کی جاتی ہے، حالاں کہ ابوالفضل نے خواجہ میر علی تبریزی کو خط نستعلیق کا موجد تسلیم نہیں کیا ہے لیکن یہ تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے ہی اس کے اصول وضوابط مرتب کیے تھے۔

یہ ان اثرات کا اجمالی خاکہ ہے جو ہندستانی تہذیب پر پڑے، لیکن ان اثرات کا ایک اور رُخ ملاحظہ ہو:

ہندستان وہ سرزمین ہے جہاں سے میر عربؐ کو ٹھنڈی ہوا آئی تھی، اور حضرت علی علیہ السلام کو جہاں جنّت کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ اس سرزمین کی مہمان نوازی اپنے اندر جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے اور ایک ایسی فضا ہے جس میں اجنبیت یا بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس سرزمین کی گنگا جمنا نے باہیں پھیلا کر ہر آنے والے کو گلے لگایا ہے عزّت و احترام کی مسند پر بٹھایا۔ چونکہ ہندستان کے ایران سے قدیم تعلقات تھے اس لیے آنے والوں کو کچھ زیادہ محبّت ملی۔ ہندستانیوں کو عجم کی نفاست نے موہ لیا۔ ایرانی یہاں کے اخلاق کے گرویدہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ میں ایک منفرد واقعہ ہوا اور وہ یہ کہ ہزار بارہ سو برس میں لاکھوں کی تعداد میں ایرانی ہندستان آتے رہے، یہیں کی خاک سے لالہ و گل بن کر ابھرے اور پھر یہیں پیوند خاک ہوئے۔ لیکن اپنے ساتھ جو روایات لے کر آئے تھے، ہندستان نے صرف ان روایات کی پاسداری نہیں کی بلکہ ان روایات کو آگے بڑھایا۔ مثلاً نقاشی اور مصوّری کی روایت لے کر آئے تھے تو یہ روایت یہاں آگے بڑھی۔ جہانگیر نے بشن داس کو حکم دیا کہ شاہ عباس صفوی کی تصویر بنائے اور اس نے کمالِ فن سے اسے انجام دیا۔ شاہ نامہ، گلستان بوستاں کے مشہور نسخے تیار کیے گئے۔ مسعود کاشی گلستان بوستاں کے کاتب مقرر ہوئے تھے۔ سید علی خاں جواہر رقم اورنگ زیب کے دربار میں نستعلیق کے ماہر تھے۔

میر علی تبریزی کے شاگردوں میں ملا عبدالرحیم عنبریں رقم نے شہرت حاصل کی لیکن فتح اللہ شیرازی نے اس فن کو کمالِ عروج تک پہنچایا۔ عبدالباقی آئے تو شاہجہاں کے زمانے میں، لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں پھر واپس چلے گئے۔ اورنگ زیب نے انھیں یاقوت رقم کا خطاب دیا تھا۔ ان کے بہت سے شاگرد اپنے کو یاقوت رقم لکھا کرتے تھے۔ شجاعت علی شیرازی کو خط نسخ میں بڑی مہارت تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہندستان میں رہ کر خطاطی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

اس کے علاوہ ایرانی بحیثیت اتالیق زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ راقم الحروف کے جدِ اعلیٰ سید ابوسعید اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد معظم (بہادر شاہ اوّل) کے اتالیق تھے۔ سید محمد مومن استر آبادی قطب شاہی بادشاہوں کے اتالیق بھی رہے اور پیشوائے سلطنت کہلاتے تھے۔ عبدالمجید سالک نے لکھا ہے کہ "ایرانیوں کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مقامی باشندوں سے قریبی روابط رکھتے ہیں۔"

ان سب کے باوجود ایرانیوں نے اپنی شناخت اور تہذیبی وجود کو برقرار رکھا۔ آج بھی بہت سارے مقامات پر ایرانی گلی پائی جاتی ہے اور جگہ جگہ ان کے عاشور خانے، شاہ خراسان یا مسجد ایرانیاں جیسا نام رکھتے ہیں۔ بہت سارے لوگ صدیاں گزر جانے کے باوجود اپنے نام کے آگے سبزواری لکھتے ہیں۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد تہذیب کا سب سے اہم شعبہ یاد آتا ہے جسے ہم ادبیات کے نام سے موسوم کرتے ہیں حالاں کہ اس پر لکھنے کے لیے دفاتر درکار ہیں۔ بہر حال سرسری طور پر یہ عرض کرنا ہے کہ نثر میں تو راقم الحروف صرف آئینِ اکبری کا تذکرہ کر سکتا ہے جو ابوالفضل کی تالیف ہے یا بدایونی یا فرشتہ کی تاریخوں پر یا پھر صوفیائے کرام کے ملفوظات وغیرہ۔ البتہ شعر کی دنیا میں ہندستانیوں نے اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوا لیا۔ امیر خسرو کی نہ سپہر، قِرآن السعدین اور غالب کی شاعری ادبی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ ہندستان آکر رہ جانے والے شعرا میں عرفی، نظیری اور صائب تبریزی اہم ہیں۔ صائب چھ برس رہ کر واپس چلے گئے تھے۔ شیخ علی حزیں اور فیضی نے نل دمن کا قصہ فارسی میں لکھا۔ عہد جہانگیری میں دہلی کے ایک کائستھ گردھر داس نے فارسی میں رامائن لکھی اور اس کا نام شاہنامہ کے وزن پر رام نامہ رکھا۔ یہ نہ سوچا جائے کہ فارسی ادب کا کوئی تعلق صرف مسلمانوں سے تھا، تو یہ درست نہ ہوگا بلکہ حق یہ ہے کہ ہندوؤں سے زیادہ تھا۔ ان میں چندر بھان برہمن، آنند رام مخلص، ولی رام ولی، ٹیک چند بہار کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں آنند رام مخلص کی مراۃ الاصطلاح اور ٹیک چند بہار کی بہار عجم (اصطلاحی لغات) اہم اور معروف ہیں۔

دانشوروں میں منشی ہر کرن، منشی مادھو رام، پیارے لال آشوب بہت مشہور ہوئے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شعرائے اردو کے بیشتر تذکرے فارسی میں ہی لکھے گئے۔ میر کا نکات الشعرا ہو یا لکشمی نرائن شفیق کا چمنستان شعرا یا قائم چاندپوری کا مخزن نکات وغیرہ سب فارسی میں ہیں۔ اودھ میں فارسی

کے نو تذکرے لکھے گئے۔ ان میں رتن سنگھ زخمی، بھگوان داس، موہن لال انیس کے تذکرے بہت معروف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اردو کی شعری اصناف فارسی سے اردو میں آئیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نصرتی، سودا، انشا اور منیر شکوہ آبادی کے دھوم دھام کے قصائد کے باوجود خاقانی، سلمانی، ساوجی کے مرتبے تک نہیں پہنچ پائے۔ مثنوی میں اردو شعراء کی مجال نہیں کہ فردوسی یا مولانا روم کے سامنے کھڑے بھی ہو سکیں۔ البتہ غزل میں ضرور اردو شعراء نے اپنے جوہر دکھلائے اور اسے بلندیوں تک لے گئے۔

فارسی ادبیات پر ہندستان کے فارسی شعراء کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ فارسی شاعری میں سبک ہندی کی اصطلاح چل پڑی جو اپنی نادر تشبیہات اور استعارات، کنایہ ندرتِ الفاظ و زبان و بیان کی نزاکت اور معنی آفرینی کی وجہ سے فارسی شعراء کی آنکھ کا تارہ رہی۔ بعد میں سبک بازگشت کا سلسلہ شروع ہوا اس لیے کہ سبک ہندی کی دقت پسندی اور معنی آفرینی کا لنگر سنبھالنا مشکل نظر آیا۔ البتہ دو اصناف ایسی ہیں کہ جو آئیں تو فارسی سے لیکن اردو نے اس کی شمع کو ایسے روشن کیا کہ اصل کو پیچھے چھوڑ گئے۔ یہ دو اصناف داستان اور مرثیہ ہیں، خصوصاً اردو مرثیہ میں انیس و دبیر کے سامنے فارسی مرثیہ گوئی زانوئے ادب تہہ کرتی نظر آتی ہے۔

جس طرح کشمیری شال کی گل کاری، ڈھاکے کی ململ کی لطافت، تامی کے کپڑے کی چمک دمک نے ایرانی نظروں کو خیرہ کر دیا تھا اسی طرح اردو مرثیہ بھی ایرانی اذہان کے لیے بے حد پرکشش ثابت ہوا۔

ہند ایرانی تعلقات کبھی یک طرفہ نہیں رہے، ہزار ہا برس میں دونوں ممالک ایک دوسرے سے ہر میدان میں اثرات قبول کرتے رہے اور دورِ حاضر میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر آیۃ اللہ خمینی، استاد مطہری اور ڈاکٹر علی شریعتی نے ہندوستانی اہل فکر و نظر کو متاثر کیا ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو کے افکار اور اقبال کی شاعری نے ایرانی فکر و نظر کو بصیرت و آگہی سے سنوارا ہے۔

دورِ حاضر ٹکنالوجی کا دور ہے۔ تہذیبی لطافتیں، اس کا جمالیاتی روپ اس کے حسین خد و خال مشینی دھوئیں میں اوجھل ہو رہے ہیں۔ شاید اب ایک نئی تہذیب جنم لینے والی ہے ــــ بہر حال اس دور میں بھی اور انشاء اللہ آنے والے دور میں بھی ہندستان کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کا ایران پر گہرا اثر پڑتا رہے گا۔ آج بھی ایران میں تقریباً ہر شعبۂ حیات میں ہندستانی انجینیئر، پروفیسر، ڈاکٹر اور ہندستانی علماء مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔

ماضی میں ایرانی صنّاع اور دانش ور ہندستان کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوئے تھے آج بھی ہندستانی صنّاع ایران کے لیے نشانِ منزل ہیں اور ہندی دانش وروں نے اپنے علمی اکتسابات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

غزل

دلداری، تہذیب، شرافت، کیا کیا کرتب آوے ہے
ہم جیسے بے حال ہو تم بھی، تم کو تو سب آوے ہے

ایک ترے ہونے سے کیا کیا باتیں دنیا کرتی ہے
خاموشی اب جا کر ہمیں بھی باتوں کا ڈھب آوے ہے

ہم سادہ دل لوگ ہوے جس کے، اس کے ہو جاتے ہیں
رشتوں کے بیوپار کا فن تو آپ کو صاحب آوے ہے

یا سیلاب اسے لے آئے یا آنکھوں کا ٹوٹے باندھ
ورنہ اپنے دروازے تک یوں دریا کب آوے ہے

شبنم لرزے کانٹوں پر، پانی چمکے تلواروں پر
اس موسم میں دیکھنا یہ ہے کس کی طرف لب آوے ہے

ہم جس سے اک موڑ پہ چھوٹے، اپنے سوا وہ کوئی نہ تھا
اے دلِ تنہا تھوڑا تھوڑا یاد ہمیں اب آوے ہے

ظفر گورکھپوری

اے/۳۰۲۔ فلور پلاٹ ۱۔ شاستری نگر۔
اندھیری (ویسٹ)، ممبئی ۴۰۰۰۵۳

وہ چہرا کتابی نور بھرا، وہ کیف بھری تحریر غضب
ترتیب غضب، تزئین غضب، مفہوم غضب تعبیر غضب

باتوں میں عجب سی سرمستی، لہجے میں بلا کی سرشاری
خاموش رہے آنکھیں بولیں، جب لب کھولے تقریر غضب

اب پہروں راہ کسی کی تکنا دل کو اچھا لگتا ہے
اک وقت وہ تھا جب میرے لیے تھی پل بھر بھی تاخیر غضب

آداب کو برتوں نیند اڑے، اور ہوش گنواؤں بات بڑھے
وہ ضبطِ ذوقِ دید بلا، یہ شوقِ دامن گیر غضب

جذبات کی گرمی سے پگھلیں، احساس کے لمس سے شرمائیں
جو لمحے ہیں روشن اس کیلئے، ان لمحوں کی تاثیر غضب

ان آنکھوں کا کچھ یونہی سا وہ میری جانب اٹھ جانا
اس کوچے میں رکنے کے لیے اب پاؤں میں یہ زنجیر غضب

سب منظر اس کے اپنے ہیں، سب موسم اس کے صفاتی ہیں
وہ عکس بھی ہے تو آئینہ تصویر سے ہے تو تصویر غضب

رباب رشیدی
شاہجہاں پور

ڈاکٹر کاظم علی خاں
۲۷-بی، جاپلنگ روڈ، لکھنؤ

غزلیاتِ آتش کا تجزیاتی مطالعہ

یہ مقالہ دراصل میری زیرِ تسوید کتاب "آتش - زمانہ، زندگی اور شاعری" کا ایک باب ہے۔ تکمیل سے پہلے کتاب کے ایک باب کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ نظر کتاب کے اس باب کی خامیوں اور خوبیوں سے باخبر ہو کر اس کے اُن حصّوں کے بارے میں راقم کو اپنے وقیع مشوروں سے سرفراز فرمائیں جو اُن کی نظر میں محلِّ نظر ہوں تاکہ کتاب کی تکمیل سے قبل اس کی خامیاں دُور کی جا سکیں۔

—— [illegible]

خواجہ حیدر علی آتش (زمانۂ حیات تقریباً ۱۷۷۸ء/۱۱۹۲ھ تا جنوری ۱۸۴۷ء/محرم ۱۲۶۳ھ) ہمارے ان قد آور و تاریخ ساز شاعروں میں سے تھے جنھوں نے سرزمینِ لکھنؤ پر اُردو شعر و سخن کی ایک توانا اور رجحان دار روایت کو پروان چڑھانے کا یادگار ادبی کام سر انجام دیا تھا۔ خواجہ صاحب کا صحیفۂ حیات وہ بند کتاب ہے جس کے متعدد ابواب آج بھی بے نقاب ہونے کے منتظر ہیں۔ خواجہ آتش کی حیات و شخصیت کے متعلق جو ناکافی مواد دستیاب ہے اس کی بنیاد پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ایسے پختہ کار اہلِ قلم نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" (ص ۵۲۸) میں یہ رائے قائم کی ہے کہ: "آتش کی شاعری ان کے حالاتِ زندگی کے اثرات سے عاری نظر آتی ہے۔" ڈاکٹر صدیقی کا مبنی بر قیاس یہ ارشاد ہمارے نزدیک حقیقت سے بعید ثابت ہوتا ہے۔ آتش کی شاعری میں ہمیں متعدد مقامات پر ان کی حیات و شخصیت اور ان کے دور کے رجحانات و ادبی تصورات کے اثرات کی کارفرمائی جاری و ساری ملتی ہے۔

آتش کے صحیفۂ حیات اور اُن کے دور کے مطالعے کے نتیجے میں ہمیں ایسے متعدد گوشے نظر آتے ہیں جو ان کی قبائے شاعری میں تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو غزلیاتِ آتش کے متعدد مثبت و منفی گوشوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں ہماری مدد و رہنمائی کر سکتے ہیں۔ خواجہ آتش کی غزلیہ شاعری کے تجزیاتی مطالعے میں ان کی زندگی اور زمانے کے اثرات کی کارفرمائی کو نظر انداز کر دینا کسی طرح مفید نہ ہوگا۔

خاندانی اعتبار سے خواجہ حیدر علی آتش کا نسب نامہ خواجہ ابو عبیداللہ احرار بغدادی (وفات ۱۴۹۰ء/۸۹۵ھ) کے ایسے معروف صوفی بزرگ تک منتہی ہوتا ہے یلہ خواجہ آتش کا خاندان بغداد سے جلاوطن ہو کر ہندستان آیا تھا۔ "تذکرۂ ریاض الفصحا" (زمانۂ تالیف ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ تا ۱۸۲۱ء/۱۲۳۶ھ) میں مصحفی کا بیان ہے کہ ہندستان میں آتش کا خاندان دیارِ دہلی کے پُرانے قلعے میں مدتِ مدید تک مقیم رہا۔ دستیاب مصادر یہ بتلانے سے قاصر ہیں کہ خواجہ آتش کا خاندان ہندستان کب آیا؟ یا خواجہ صاحب کے اسلاف میں جو بزرگ سب سے پہلے ہندستان آئے اُن کا کیا نام تھا؟ خانوادۂ آتش کے سلسلے میں دستیاب ناکافی معلومات سے بس اسی قدر پتا چلتا ہے کہ خواجہ آتش کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ کے عہدِ حکومت (اکتوبر ۱۷۵۴ء تا ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء) کے دوران جنگِ بکسر (۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء) سے قبل دہلی کو خیرباد کہہ کر صوبۂ اودھ کی پُرانی راجدھانی فیض آباد کے محلے مغل پورہ میں آباد ہوئے تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ خواجہ حیدر علی دیارِ فیض آباد کے محلے مغل پورہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے خواجہ حیدر علی آتش کا زمانۂ ولادت ۱۷۷۸ء/۱۱۹۲ھ کے آس پاس قیاس کیا ہے۔ صحیح سنہ ولادت مزید تحقیق کا طالب ہے۔ خواجہ آتش کے والد خواجہ علی بخش صوفی منش اور درویش صفت شخص تھے۔ ان کی گزر بسر فقیری اور پیری مُریدی کے پیشے پر منحصر تھی (آبِ بقا ص ۹ نیز لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۵۲۳ تا ۵۲۴)۔ خواجہ آتش کی شخصیت میں توکل اور تصوف کے اوصاف ہمارے نزدیک ان کی وہ آبائی یا خاندانی میراث تھی، جو ان کی شخصیت سے ہوتی ہوئی ان کی غزلیہ شاعری کا بھی اہم و قابلِ ذکر وصف بن گئی۔

غزلیاتِ آتش میں تصوف جگہ جگہ جلوہ گر ملتا ہے۔ آتش کی حیات

اور شاعری میں تصوّف کی نوعیت و کیفیت وہ موضوع ہے جس پر استاد محترم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے مابین خاصی گرما گرم ادبی بحث ہو چکی ہے۔

تصوّف نے آتش کی غزلیہ شاعری کو ایک ایسے امتیازی وصف سے متصف کیا جس سے تعشق سے مغلوب لکھنؤ کی عام شاعری عاری نظر آتی ہے۔ تصوّف کی بدولت آتش کا غزلیہ کلام اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے لکھنؤ کے عام رنگِ سخن کے برخلاف دہلوی شعراء کے مذاق شاعری سے قریب نظر آتا ہے۔ تصوّف کی راہ سے آتش کی غزلیہ شاعری اخلاقی موضوعات اور انسان دوستی کے تصوّرات کی تصاویر کا نگار خانہ محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں غزلیاتِ آتش سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

منصور بھی جو ہوں تو انا الحق کہیں نہ ہم
اپنے طریق میں نہیں یہ ما و من درست

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

طبل و علم ہی پاس نہ اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ   قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

ناقص ہے دوست داری میں کامل نہیں ہے تو
دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا

درد سر میں ہو کسی کے تو مرے دل میں ہو درد
واسطے میرے ہوا ہے غمِ عالم پیدا

جو روئے حال پہ اپنے وہ کیا کسی پہ ہنسے
وہ دل دکھائے کسی کا جو دردمند نہ ہو

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے

کم سنی ہی میں یتیم ہونا آتش کی زندگی کا وہ اہم واقعہ ہے جس نے آتش کی شخصیت اور شاعری دونوں کو متاثر کیا۔ فیض آباد کا محلہ مغل پورہ جہاں یتیم آتش نے لڑکپن گزارا مغل سپاہیوں کا مسکن تھا۔ مغل سپاہیوں کے بدقماش اور شورہ پشت لڑکوں کی بے روک ٹوک صحبت کے زیرِ اثر آتش جیسے کم سن یتیم لڑکے کا بے راہ روی اختیار کرنا وہ مجبوری تھی جس پر کسی کو اختیار نہ تھا۔ آتش کم سنی ہی سے شورہ پشتی کے خوگر ہو گئے۔ تند مزاجی ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی۔ مغل سپاہیوں کی صحبت میں لڑکپن ہی سے سیف زنی کی عادت آتش کی سیرت میں یوں داخل ہو گئی کہ شباب و شیب کے زمانے میں بھی کمر سے بندھی تلوار نہ کھلی۔ بات بات پر بانکوں کی طرح تلوار کھینچ لینا آتش کی شعلہ مزاج شخصیت اور تند خو طبیعت کا وطیرہ بن گیا۔ آتش کی غزلیہ شاعری میں بانکپن، کج کلاہ سپاہی کی آن بان کے رنگ ڈھنگ ان کی شخصیت کے اسی رنگ کی دین محسوس ہوتے ہیں اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اس ارشاد کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں کہ آتش کی شاعری اُن کے حالات زندگی کے اثرات سے عاری نظر آتی ہے۔ آتش کی شاعری میں مردانگی اور بانک پن کے لہجے کو خلیل الرحمٰن اعظمی "ایک البیلے سپاہی کی آواز" سے تعبیر کرتے ہیں (مقدمۂ کلام آتش، خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۶۶)۔ غزلیاتِ آتش سے اس ضمن میں چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں ؎

وعدہ جھوٹا نہ کر، وہ مرد نہیں
قول سے فعل جب خلاف ہوا

نامرد آسماں سے گوارا ہے کس کو جنگ
آتش سپر کو چیریئے تلوار توڑیئے

روک منہ پر وار قاتل کا سپر کی طرح سے
مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا

معرکے میں ہاتھ قاتل کی کمر میں ڈالیے
کھینچیے دامن سر میداں گریباں گیر کا

جانے دے آتش اگر اہلِ جہاں تجھ سے پھرے
مرد پچھتانا کریں بھاگے ہوئے لشکر کا

طلانہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

غنیمت جان اسے دل جنبشِ ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

تیری تلوار کی بُرّش کا ہے شہرہ قاتل
ہم بھی دیکھیں تو ہمیں کرتے ہو کیوں کر ٹکڑے

پھر گئے ہیں معرکے میں مجھ سے تلواروں کے منھ
سخت جانی نے مری، توڑے ہیں خنجر سیکڑوں

طلب دُنیا کو کر کے زن مُریدی ہو نہیں سکتی
خیالِ آبروئے ہمّتِ مردانہ آتا ہے

آتش یتیم ہوئے تو ان کی تعلیم بھی خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ ذوقِ تیغ زنی بھی کتب کی ورق گردانی میں مانع ہوا ہوگا۔ ناکافی تعلیم ان کی غزلیہ شاعری میں مختلف اقسام کے اسقام کا موجب بنی۔ ناکافی تعلیم نے ان کی غزلوں کو زبان و بیان کی سطح پر جن ناہمواریوں اور کمزوریوں سے ہم کنار کیا، اُن پر اہلِ قلم برابر حرف زنی اور انگشت نمائی کرتے رہے ہیں۔ کلامِ آتش کا یہ منفی پہلو بھی ان کی زندگی کے ناسازگار حالات ہی کا نتیجہ ہے۔ گویا کلامِ آتش ان کے حالاتِ زندگی کے اثرات سے عاری نہیں۔ کلامِ آتش کے اِس منفی پہلو کی مثالیں درج ذیل مصادر میں موجود ہیں:

۱۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۵۲۵ تا ۵۲۸
۲۔ تنقیدی تجزیے، کاظم علی خاں ص ۲۲۸، ۲۲۷ تا ۲۴۹
۳۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا: مؤلفہ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۰۴

معاصر تذکرے آتش کے دینی عقائد کے متعلق واضح شہادت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ آتش کے مذہب کے بارے میں مستند ترین شہادت خود ان کا کلام ہے جو انھیں شیعہ اثنا عشری مسلک کا پیرو ثابت کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی ہماری اس بات کا بہ خوبی اثبات کرتی ہے کہ آتش کی شاعری اُن کے حالاتِ زندگی کے اثرات سے عاری نہیں۔ اس ضمن میں کلامِ آتش سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو ہم اپنے شاگردِ عزیز منیر اختر نقوی سلمہٗ کی کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" (کراچی۔ طبع ۱۹۹۳ء ص ۵۳۷ تا ۵۴۱) سے پیش کر رہے ہیں:

ساغرِ صاف مئے حُبِّ علی (مشرب ہے)
مردِ مومن ہوں میں، اِثنا عشری مذہب ہے
——— (کلیاتِ آتش طبع ۱۲۶۱ھ ص ۲۲۰)

زور و قوت سے ڈراتا ہے یہ کس کو آتش!
میں بھی شمشیرِ علیؑ ہوں جو عدوِ مرحب ہے

پہچانا حق کو چاردہ معصوم کے طفیل
زینے سے رہ نمائی ہوئی مجھ کو بام کی

آتش! کمالِ مہدیِ دیں کا ہے اشتیاق
آنکھوں کو آرزو ہے ظہورِ امامؑ کی

عاشقِ شیدا علیِ مرتضےٰؑ کا ہو گیا
دل مرا بندہ نُصَیری کے خُدا کا ہو گیا[۲]

کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مولا مرے
کعبہ پیدائش سے تیری، گھر خُدا کا ہو گیا

یہاں یہ انکشاف کرنا بے محل نہ ہوگا کہ آتش نے جب قیامِ فیض آباد کے دوران شاعری شروع کی تو خواجہ حیدر علی کے ایسے مولا علیؑ کے شیدائی نے اپنا ابتدائی تخلص "مولائی" رکھا تھا۔ خواجہ صاحب کے ابتدائی تخلص "مولائی" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وارد لکھنؤ ہونے سے قبل اپنے قیامِ فیض آباد کے دوران ہی وہ شیعی عقائد کے پیرو ہو چکے ہوں گے۔ اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" کے ایک قلمی نسخے میں خواجہ حیدر علی کے حالات مولائی تخلص کے تحت لکھے ہیں:[۳]

خواجہ حیدر علی مولائی جب دیارِ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو کر شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے تو ان کا ابتدائی تخلص مولائی تبدیل ہو کر آتش ہو گیا۔ خواجہ صاحب کا ورودِ لکھنؤ ۱۸۰۴ء کے بعد ۱۸۰۶ء کے آس پاس کا واقعہ قیاس کیا جاتا ہے۔ (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۵۲۴)۔ ریاض الفصحاء

میں مصحفی نے جب اپنے شاگرد خواجہ آتش کا حال لکھا تو اس وقت خواجہ صاحب کا سن ۲۹ سال بتایا ہے۔ فیض آباد میں خواجہ صاحب اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں آتش نے فارسی شاعری ترک کر کے صرف اُردو شاعری سے سروکار رکھا اور اُردو میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بیشتر صنفِ غزل تک محدود رکھا۔ کلیاتِ آتش غزل کے علاوہ اُردو شاعری کی دوسری صنفوں سے خالی ملتا ہے لیکن بعض شواہد آتش کے ادبی آثار میں ایک عدد واسوخت اور دو عدد قصائد کی بھی نشان دہی کرتے ہیں (بہ حوالہ: (۱) مقدمہ کلامِ آتش ص ۱۲۰ تا ۱۲۸ ، (۲) شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ ص ۵۳۹)۔

غزل اُردو شاعری کی آبرو ہو یا نہ ہو، مگر غزل کو آتش کی شاعری کی آبرو کہنا غلط نہ ہوگا۔ کلیاتِ آتش اپنے دامن میں دو دواوین رکھتا ہے جن میں شروع سے آخر تک صرف اور صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ یہ اُردو غزل سے آتش کی غیر معمولی وفاداری کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ کلیات میں شامل آتش کے دوسرے دیوان کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد، حکیم عبدالحیٔ، پروفیسر ولی الحق انصاری اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا بیان ہے کہ دوسرا دیوان وفاتِ آتش (۲۵ رمحرم ۱۲۶۳ھ مطابق چہارشنبہ ۱۳ رجنوری ۱۸۴۷ء) کے بعد مرتب ہوا لیکن محمدی مطبع لکھنؤ سے خواجہ آتش کی زندگی کے دوران خود خواجہ صاحب کی تصحیح کے ساتھ ۱۴ رجمادی الاولیٰ ۱۲۶۱ھ / ۲۱ رمئی ۱۸۴۵ء کو جو کلیات چھپا ہے اس میں ہمیں دونوں دواوین موجود ملتے ہیں۔[۱۲] ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں چھپنے والے کلیاتِ آتش میں غزلوں کی تعداد کی تفصیل یہ ہے:

۱. دیوانِ اوّل ۔ ۴۸۱ غزلیں

۲. دیوانِ دوم ۔ ۱۰۴ غزلیں (میزان ۴۸۱ + ۱۰۴ = ۵۸۵ غزلیات)

ڈاکٹر شعیب راہی کو آتش کے پہلے دیوان کا جو قلمی نسخہ ملا ہے اس پر تاریخِ تکمیلِ کتابت ۱۴ ررجب ۱۲۴۸ھ (مطابق ۷ ردسمبر ۱۸۳۲ء) درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آتش کا دیوانِ اول ۱۴ ررجب ۱۲۴۸ھ (۷ ردسمبر ۱۸۳۲ء) سے قبل مکمل ہو چکا تھا (بہ حوالہ: خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی ۔ حیات اور شاعری۔ از ڈاکٹر شعیب راہی۔ پٹنہ جون ۱۹۸۲ء ص ۱۱۹)۔ ان قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آتش کے دوسرے دیوان میں رجب ۱۲۴۸ھ / دسمبر ۱۸۳۲ء کے بعد کا کلام شامل کیا گیا ہوگا۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کا بیان ہے کہ آتش کے دونوں دیوانوں میں شامل غزلوں میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ تعداد اشعار کے بارے میں ہم مزید تحقیق کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے (دیکھیے دبستانِ آتش، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۵۲)

کلیاتِ خواجہ حیدر علی آتش" کے عنوان سے کلامِ آتش کی ایک اور اہم اشاعت ۱۵ رجمادی الاوّل ۱۲۶۸ھ (مطابق یکشنبہ ۷ رمارچ ۱۸۵۲ء) کو منظرِ عام پر آئی۔ یہ اڈیشن کارخانۂ علی بخش خاں المسمیٰ بہ سلطان المطابع لکھنؤ سے وفاتِ آتش کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس اڈیشن کے دوسرے دیوان میں غزلوں کی تعداد بڑھ کر ۱۲۹ ہو گئی جبکہ ۱۲۶۱ھ میں شائع ہونے والے دوسرے دیوان میں غزلوں کی تعداد ۱۰۴ تھی۔ اس طرح اب کلیاتِ آتش مطبوعہ ۱۲۶۸ھ کے دونوں دواوین میں غزلوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) دیوانِ اوّل ۴۸۱ غزلیں۔ (۲) دیوانِ دوم ۱۲۹ غزلیں

(غزلوں کی مجموعی تعداد ۴۸۱ + ۱۲۹ = ۶۱۰)

یہاں یہ بات بھی بتانا ضروری ہے کہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء کے بعد کلیاتِ آتش کی جو اشاعتیں نول کشور پریس سے منظرِ عام پر آتی رہی ہیں ان میں دوسرے دیوان کی غزلوں کی تعداد ۱۰۹ کی جگہ ۱۰۴ ہی ملتی ہے۔ چنانچہ منشی نول کشور پریس کانپور سے اپریل ۱۸۸۸ء میں شائع ہونے والے کلیاتِ آتش کے نویں (نولکشوری) اڈیشن کے دوسرے دیوان میں وہ فاضل غزلیں موجود نہیں جو ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں شامل تھیں (کلیاتِ آتش مطبع نول کشور کانپور مطبوعہ اپریل ۱۸۸۸ء ص ۲۵۵۔ کلیاتِ آتش کا یہ نواں نول کشوری اڈیشن کتب خانۂ ڈاکٹر کاظم علی خاں لکھنؤ میں موجود ہے اور کلیاتِ آتش طبع ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء نیز طبع ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء کتب خانہ ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی لکھنؤ میں دیکھے جا سکتے ہیں)۔ آتش کا کچھ ایسا غزلیہ کلام بھی ملتا ہے جس سے ان کا متداول دیوان خالی ہے۔

کلامِ آتش پر ان کے حالاتِ زندگی کے اثرات کی بات کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونے کا واقعہ آتش کی ادبی زندگی اور شاعری کے لیے ایک خوش آیند نئے باب کا عنوان بنا۔ خواجہ صاحب نے فیض آباد میں شاعری شروع ضرور کی تھی مگر دیارِ فیض آباد میں قیام کے دوران خواجہ حیدر علی مولائی اُس شہرت و مقبولیت سے محروم تھے جو انھوں نے لکھنؤ آنے کے بعد حاصل کی۔

ب جب ۱۸۰۶ء کے آس پاس لکھنؤ آئے تو اس وقت نہ تو وہ صاحبِ ،شاعر تھے اور نہ انھوں نے اپنے کلام پر کسی استاد سے اصلاح ،صل کی تھی۔ ورودِ لکھنؤ کے وقت خواجہ حیدر علی مولائی کا کلام نہ صرف کسی استاد کی اصلاح سے محروم تھا بلکہ خواجہ صاحب اپنے درجنوں شاگردوں کی اس کثیر جمعیت سے بھی محروم تھے جو انھوں نے بعد کو اپنے قیامِ لکھنؤ کے دوران تیار کی تھی۔ خواجہ صاحب نے اپنی ناکافی تعلیم کی تکمیل بھی لکھنؤ آنے کے بعد ہی کی۔ لکھنؤ ہی میں خواجہ آتش مصحفی کی صحبت اور شاگردی سے فیض یاب ہوئے۔ آتش اگر لکھنؤ نہ آئے ہوتے تو اس فیض سے محروم ہی رہتے۔ لکھنؤ کی ادبی فضاؤں نے ہی آتش کی غزلیہ شاعری کو نئے بال و پر عطا کیے۔ اور سرزمین لکھنؤ پر ہی ان کی شاعری نئے برگ و بار لائی۔

خواجہ حیدر علی مولائی و آتش جب ۱۸۰۶ء کے آس پاس ۲۹ برس کے سن میں لکھنؤ منتقل ہوئے تو سرزمینِ لکھنؤ اس وقت جرأت (متوفی ۱۸۱۰ء)، میر تقی میر (وفات ستمبر ۱۸۱۰ء)، انشا (وفات مئی ۱۸۱۷ء)، قتیل (وفات جنوری ۱۸۱۸ء)، مصحفی (وفات ۱۲۴۰ھ/ ۲۵-۱۸۲۴ء)، مرزا محمد تقی خاں ہوس (وفات ۱۸۲۵ء)، ناسخ (وفات اگست ۱۸۳۸ء) کے ایسے قدآور سخن وروں سے معمور و آباد ہونے کی بدولت ہندستان کے ادبی نقشے پر ایک ابھرتے ہوئے نئے ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ لکھنؤ کے اس نئے ادبی مرکز کی تعمیر و تشکیل میں ناسخ نے جو مرکزی و کلیدی کردار ادا کیا، اس سے انکار کی گنجائش نہیں، لیکن اس یادگار و تاریخ ساز ادبی کارنامے کو سرانجام دینے میں ناسخ کو خواجہ آتش نے جو بھرپور تعاون پیش کیا اسے بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ ناسخ نے اپنے اس تاریخ ساز و یادگار ادبی کارنامے پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے ؎

سب زمینیں ہیں نئی، بحتیں ہیں اے یار نئی

روز یاں ریختے کی اٹھتی ہے دیوار نئی

لکھنؤ میں تعمیر ہونے والی ریختے کی اس نئی دیوار کے معماروں میں آتش بھی ناسخ کے شریکِ کار رہے تھے۔

خواجہ صاحب نے شاعری کا آغاز دیارِ فیض آباد میں کیا تھا۔ فیض آباد خواجہ حیدر علی کی ولادت (تقریباً ۱۷۷۸ء) سے قبل والیِ اودھ نواب شجاع الدولہ کی وفات (اواخر جنوری ۱۷۷۵ء) تک اودھ کی راجدھانی رہا، اس کے بعد شجاع الدولہ کے فرزند نواب آصف الدولہ نے اپنے عہدِ حکومت (اواخر جنوری ۱۷۷۵ء تا ستمبر ۱۷۹۷ء) کے دوران جولائی ۱۷۷۵ء کے بعد اودھ کی راجدھانی کو دیارِ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا مگر راجدھانی نہ رہنے کے بعد بھی فیض آباد میں دھوم دھام سے منعقد ہونے والے مشاعروں کی بدولت اس شہر کی ادبی رونق خواجہ صاحب کی ولادت کے برسوں بعد بھی برقرار رہی تھی۔ خواجہ حیدر علی مولائی کی شاعری کے ابتدائی دور میں سرزمین فیض آباد پر یہ مشاعرے جاری تھے اور ان میں خواجہ صاحب سمیت فیض آباد کے دوسرے اور بھی بہت سے سخن ور غزل سرائی کرتے رہتے تھے۔

فیض آباد خواجہ صاحب کے عہد سے قبل بھی اردو شاعروں سے معمور و آباد تھا اور دورِ خواجہ آتش میں بھی آغا محمد تقی خاں ترقی (وفات سہ شنبہ ۸ر فروری ۱۸۳۱ء مطابق ۲۴ر شعبان ۱۲۴۶ھ) کے ایسے امیروں کی بدولت فیض آباد کی ادبی رونق قائم و برقرار تھی۔ (برائے تفصیل دیکھیے: (۱) اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا، ڈاکٹر اکبر حیدری، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۸۱ء ص ۵۸ تا ۶۶۔ (۲) رسالہ نیا دور لکھنؤ اودھ نمبر ۱ فروری، مارچ ۱۹۹۴ء ص ۸۶۔ مقالہ ڈاکٹر کاظم علی خاں: "اودھ میں اردو شاعروں کی آخری آرام گاہیں"۔ بسلسلۂ تاریخ وفات آغا محمد تقی ترقی)۔

فیض آباد کے اس ادبی ماحول میں ادبی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد خواجہ حیدر علی مولائی تقریباً ۲۹ سال کے سن میں ۱۸۰۶ء کے آس پاس لکھنؤ آئے تھے، ان کا قیامِ لکھنؤ نہ صرف خواجہ صاحب کی غزلیہ شاعری کے لیے مفید و سعید ثابت ہوا بلکہ خود خواجہ صاحب کی غزلیہ شاعری نے بھی لکھنؤ کو ایک نیا ادبی مرکز بنانے میں ایک یادگار و تاریخ ساز ادبی کارنامہ سرانجام دیا۔ خواجہ آتش کی شاعری ان حالات میں "وہ آتشہ ہو کر لکھنؤ کی ابتدائی غزلیہ شاعری کی آبرو بن گئی۔

آتش ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) کے آس پاس جب لکھنؤ آئے تو اس وقت تک ناسخ لکھنؤ میں ایک قابلِ ذکر شاعر کی حیثیت سے اسٹیبلش (Establish) ہو چکے تھے۔ ناسخ نے لکھنؤ میں تقریباً بیس سال کی عمر (۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱ء) سے شاعری شروع کر کے ۱۸۰۶ء تک اپنا ادبی مقام بنا لیا تھا۔ سرزمینِ لکھنؤ پر میدانِ شعر و سخن میں قدم جمانے کی خاطر خواجہ آتش کو شیخ ناسخ کی ہم سری کرنا ایک ناگزیر مجبوری تھی۔ ناسخ سے آتش کی حریفانہ زور آزمائیوں اور ادبی چشمکوں کا میدان لکھنؤ کے وہ مشاعرے بنے جن میں دونوں سخن ور اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں سے

کام لے کر میدان سر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ آتش و ناسخ میں یہ ادبی معرکہ آرائی ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی کے اندازے کے مطابق تقریباً ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء کے آس پاس شروع ہوئی ہوگی۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ناسخ کی زبانی جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ خواجہ آتش نے لکھنؤ کے ایک شاعرے میں ناسخ کا کلام سُن کر پیچ و تاب کھایا اور

"....آتش رشک کی جلن میں اس جان کاہی اور سینہ خراشی سے غزلیں کہیں کہ سینے سے خون آنے لگا۔"

(دیکھیے: (۱) ناسخ ۔ تجزیہ و تقدیر، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی ص ۴۲۔
(۲) آب حیات: محمد حسین آزاد ۔ الٰہ آباد ۱۹۶۲ء ص ۲۴۶ احوالِ ناسخ)۔

لکھنؤ میں آتش کی غزل سرائی اپنی ارتقائی نشو و نما کے بعد جس معراج سے ہم کنار ہوئی اس میں متعدد دوسرے عوامل و محرکات کے ساتھ ساتھ آتش و ناسخ کی اس ادبی معرکہ آرائی کی کارفرمائی بھی شامل تھی جو ۱۸۰۹ء کے آس پاس سے شروع ہو کر وفات ناسخ اگست ۱۸۳۸ء تک جاری رہی۔ آتش کی غزلیہ شاعری کے تخلیقی سفر میں یہی وہ زرخیز ترین دور ہے جب کلام آتش اُن کے دیوانِ اوّل (زمانۂ تکمیل قبل از ۷ دسمبر ۱۸۳۲ء) میں منزلِ کمال پر پہنچا تھا۔ آتش کا دوسرا دیوان جو ناسخ کی وفات ۱۸۳۸ء کے بعد ۲۱ مئی ۱۸۴۵ء کو چھپا، صفحات و غزلیات کی تعداد کے لحاظ سے نہایت مختصر نظر آتا ہے۔ آتش کا دوسرا دیوان اپنے دامن میں محض ۵۶ صفحات اور ۱۰۴ غزلیات رکھتا ہے۔ جب کہ آتش کے مطبوعہ دیوانِ اوّل کی ضخامت ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں غزلوں کی تعداد ۴۸۱ ملتی ہے۔ ہمارے ان معروضات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ آتش کی غزلیہ شاعری کو تقویت دینے میں ناسخ سے ان کی ادبی معرکہ آرائی بھی شامل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ آتش کی زندگی کے اس واقعے نے ان کی شاعری پر جو اثر ڈالا ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان حالات میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا یہ ارشاد بے بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ: "آتش کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ نظر نہیں آتا جس سے ان کی شاعری پر اثر پڑا ہو۔" (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ص ۵۳۸)۔

عشق مجازی خواجہ آتش کی غزلیہ شاعری کا ایک اہم و قابل ذکر پہلو ہے۔ ان کی غزلوں میں عشقِ مجازی کی نوعیت و کیفیت کا جائزہ لینے پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اس خیالی اور افلاطونی عشق کی کارفرمائی زیادہ نہیں جو جنسِ نازک کے جسم کی بو باس سے خالی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی غزلیہ شاعری میں عاشق، محبوب اور رقیب کے کرداروں سے تیار ہونے والا مثلث اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ملتا ہے۔ آتش کی غزلوں میں عاشق محبوب کا پرستار ضرور ہے لیکن اس کے کردار میں خودداری کا جذبہ بھی موجود ہے۔ عاشق، محبوب کے ناروا اور ذلت آمیز سلوک پر ؎

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

کے مقولے پر عمل نہ کر کے محبوب سے احتجاج بھی کرتا ہے اور اسے سخت و سست بھی سُنا دیتا ہے۔ کلیاتِ آتش طبع ۱۲۶۱ھ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کون ملتا ہے، نہیں ملتا اگر وہ نازنین
میں بھی اس ناآشنا کا آشنا ہوتا نہیں

(ص ۱۲۳)

ملتا جو نہیں یار تو ہم بھی نہیں ملتے
غیرت کا اب اپنی بھی تقاضا ہے تو یہ ہے

(ص ۲۲۲)

جنگ جو یار کا اصلاح پر آیا نہ مزاج
عقل سے ہوتا ہے فی الواقع جاہل خالی

(ص ۲۳۵)

آتش کی عشقیہ شاعری میں محبوب کے حسن کا بیان کہیں کہیں روایتی عشق سے زیادہ تجربے کی غمازی کرتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین (پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی) نے اپنے نانا میر سید حسن فوق سے یہ روایت سنی تھی کہ خواجہ آتش لکھنؤ کی ایک طوائف سے بھی تعلق رکھتے تھے اور روزانہ شام کو اس کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے نانا میر سید حسن فوق کو آتش کا شاگرد قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر شاہ عبد السلام نے اپنی پی ایچ. ڈی کی تھیسس "دبستانِ آتش" میں شاگردانِ آتش کی جو فہرست پیش کی ہے میر سید حسن فوق کا نام اس پر اضافہ ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری میں محبوب کے حسن کے بیان کے تحت جس قسم کے جنسی اور جسمانی پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے وہ کسی گہرے اور حقیقی ذاتی تجربے کی آئینہ دار ہے۔ (بحوالہ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی ۔ حیات اور شاعری، ڈاکٹر شعیب راہی ص ۹۲)۔

خواجہ آتش کے سوانح نگار شکل و شمائل کے اعتبار سے خواجہ صاحب

کو حسین و جمیل شخص قرار دیتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ریاض الفصحا، آبِ بقا اور آبِ حیات کے حوالے سے لکھا ہے: "آتش وجیہ، باپ کی طرح گورے چٹے اور خوب صورت، کشیدہ قامت اور چھریرے بدن کے تھے۔"

(مقدمہ کلام آتش ص ۲۰)

آتش جیسے حسین شخص کا حسن سے دلچسپی رکھنا اور حسن پرستی کا شیوا اختیار کرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ آتش کی عشقیہ شاعری میں محبوب تو غیر ارضی ہے اور نہ خیالی۔ آتش کے یہاں محبوب اسی دنیا کی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی گوشت پوست کی ہی ایک ایسی دل فریب ہستی ہے جو ناز و ادا کا حسین پیکر ہونے کے ساتھ ساتھ عاشق کی محبت کے جواب میں سرد مہری کے بجائے گرم جوشی سے بھی کام لیتی ہے۔ وہ پتھر کی مورت نہ ہو کر نسوانی جذبات سے معمور ہے اور عاشق سے افلاطونی عشق کے بجائے ارضی اور انسانی عشق کی طالب ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری محبوب کے حسن کی مصوری میں جسم و جسمانیات کے جلووں اور جنس کی مہک سے عاری نہیں۔ اس سلسلے میں کلیاتِ آتش (مطبوعہ ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء) سے چند مثالیں حاضر ہیں ؎

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا
(ص ۵۲)

یار کو میں نے، مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا
ص ۱۰

یہ خوش اسلوب جسم اس نوجواں کا ہے جو ناپیں تو
برابر نکلے ڈورا اس کمر کا اور گردن کا
(ص ۱۳)

شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا
(ص ۷۳)

آفتیں ڈھاتی ہے وہ نرگسِ فتاں کیا کیا
داغ دیتی ہے مجھے گردشِ دوراں کیا کیا
(ص ۲۵)

تجھ سا حسیں ہو یار، تو کیوں کر نہ اس کے پھر
نازِ بجا و غمزۂ بے جا اٹھائیے
(ص ۳۰۹ ـ دیوانِ دوم)

جور و جفا ہزار کرے، ہم خفا نہ ہوں
خوش رو سے خوش جمال سے خوش اختلاط سے
(ص ۲۹۸ ـ دیوانِ دوم)

واں پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے
(ص ۳۰۲ ـ دیوانِ دوم)

دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے
(ایضاً)

ہوا مہماں آکر رات بھر وہ شعلہ رُو برسوں
رہا روشن مرے گھر کا چراغِ آرزو برسوں
(ص ۱۲۹)

قیدِ نقاب و قیدِ حیا و حجاب و شرم
یوسف ہمارا رکھتا ہے زنداں نئے نئے
(ص ۲۴۸)

آتش کی عشقیہ شاعری میں عاشق و محبوب کے بعد رقیب کا کردار بھی موجود ہے لیکن یہ کچھ زیادہ جان دار نہیں۔ ناسخ، غالب اور مومن کی غزلیہ شاعری میں رقیب کا ذکر آتش کے کلام کے مقابلے میں کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ رقیب سے متعلق کلیاتِ آتش (مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی الہ آباد ـ ۱۹۷۲ء) سے چند اشعار حاضر ہیں ؎

یاد میں تیری رقیبِ روسیہ جاگا تو کیا
مرتبہ عالی نہ ہو خفاشِ شب بیدار کا
(ص ۱۷)

یہی اللہ سے خواہش ہے ہماری اے بُت
کور بد بیں ہو ترا، گنگ ہو غمّاز اپنا
(ص ۱۶)

نہ سُنی یار نے اک بات سخن سازوں کی
رہ گئے کھول کے منہ مفسدہ پرداز اپنا
(ایضاً)

حسد سے جل کے دبے پاؤں اُڑ گئے اغیار ہمارے نالوں نے جب کار برق و باد کیا
(ص ۲۷)

دمِ آخر بھی بالیں پر مری، ہم راہ یاد آئے
رقیبوں نے محل باقی نہ رکھا عذر خواہی کا (ص ۳۳)

غزلیاتِ آتش میں رندانہ مضامین بھی اہم پہلو ہیں۔ خمریات اُردو کی غزلیہ شاعری میں ایک ایسا روایتی موضوع ہے جو فارسی شاعری کی دین ہے اُردو شاعروں میں ریاضؔ خیرآبادی خمریہ شاعری کے اہم نقیب تھے مگر انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی شراب کا مزہ بھی نہ چکھا تھا۔ خواجہ آتش اپنی زندگی میں بھنگ کے نشے کے شوقین تھے۔ ان کی غزلوں کے خمریہ عناصر میں بھنگ کے نشے کی کارفرمائی کا شامل ہونا بعید از امکان نہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام سے خمریہ شاعری کی چند مثالیں حاضر ہیں ؎

ہے جب سے دستِ یار میں ساغر شراب کا
کوڑی کا ہو گیا ہے کٹورا گلاب کا
(کلیاتِ آتش طبع ۱۹۷۲ء مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ص ۵۶)

ہاتھوں میں یار کے نہیں ساغر شراب کا
دستِ مسیح میں ہے قدح آفتاب کا
(ص ۵۸)

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج
(ص ۱۲۲)

غزلیاتِ آتش میں تمثیلات ناسخ کے مقابلے میں کم ہیں۔ اُردو شاعری میں تمثیلات فارسی شاعری کی دین ہیں اور فارسی شاعر صائبؔ کے اثرات کا نتیجہ بتائی جاتی ہیں۔ تمثیل کے تحت ایک مصرعے میں کوئی دعوا کرکے دوسرے مصرعے میں دلیل پیش کی جاتی ہے۔ کلیاتِ آتش طبع ۱۹۷۲ء سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

فیض نیکوں سے نہ ہو ان کو جو ہیں بدسرشت
کیا کرے باراں زمینِ شور میں اشجار سبز
(ص ۱۴۵)

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
(ص ۲۶۳)

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گُل میں گُل بوٹا کہاں ہے
(ص ۳۲)

آتش کی غزلیہ شاعری میں تلمیحات کی پیوندکاری لطف و لذت کا سبب ثابت ہوتی ہے۔ "تلمیح کے تحت کلام میں اختصار کے ساتھ حُسن یا زور پیدا کرنے کے لیے کسی قصے یا شعر یا کہاوت کی طرف اشارا کیا جاتا ہے۔" (بحوالہ "آغا محجو شرف — احوال و آثار": کاظم علی خاں، لکھنؤ ۱۹۹۰ء ص ۷۰)۔ کلیاتِ آتش (مطبوعہ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) سے کلامِ آتش میں تلمیحات کی چند مثالیں پیش ہیں ؎

شدّاد کو خدا سے نہ کرنی تھی ہمسری
دوزخ میں گھر بہشت کی تعمیر سے ہوا
(ص ۶۵)

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
(ص ۶)

نہ گورِ سکندر ہے نہ قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے
(ص ۳۰۲۔ دیوانِ دوم)

کلامِ آتش کا ایک وصف مسلسل غزلیں بھی ہیں، جن کے اشعار بہ اعتبارِ مضمون تسلسل رکھتے ہیں۔ مسلسل غزلوں کو نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا جس کی اس مختصر مقالے کے محدود دامن میں گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں استاد محترم خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب "مقدمہ کلامِ آتش" (ص ۶۹ تا ۸۱) ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

اُردو کی غزلیہ شاعری پر غیر ہندستانی عناصر کے سلسلے میں بعض حلقوں کی جانب سے اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ آتش کی غزلیہ شاعری میں ہندستانی عناصر اور ہندی الفاظ بھی جلوہ گر ملتے ہیں۔ ہندستانی پرندے اور ہندستان کے وہ پیڑ پودے یہاں جگہ جگہ نظر آتے ہیں جن کی صنفِ غزل میں گنجائش نہیں۔ اس سلسلے کی تفصیلات ہمارے مقالے "مطالعۂ غزلیاتِ آتش" (مطبوعہ تنقیدی تجربے۔ مطبوعہ ۱۹۷۲ء ص ۲۷۵ تا ۲۷۷) میں دیکھی

جاسکتی ہیں جن کا اعادہ کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے :ے

خوش حال ہیں مٹا کے مجھے ہفت آسماں
یوسف کو کھا کے ہوگئے ہیں شیر بھیڑیے

——— (تنقیدی تجزیے، کاظم علی خاں ص ۲۷۶)

تیرہ روزانِ ازل کو نور سے بہرہ نہیں
شور اکثر کرتے ہیں کوّے شبِ مہتاب میں

——— (ایضاً ص ۲۷۷)

تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گُل کر دیا
صبح کو کوّے اُٹھا کر شمعِ تربت لے گئے

——— (ایضاً ص ۲۷۷)

مضموں کہو آتش انہیں یا آم انہیں سمجھو
ہاتھ آئے ہیں دو چار یہ تعقید کے ٹپکے

——— (ایضاً ۲۷۶)

ع تمہاری ابروئے کج پر تھا دوج کا دھوکا (ص ۲۷۶)

آتش کی غزلیہ شاعری انسان کے داخلی جذبات کی آئینہ داری اور مظاہرِ کائنات پر غور و فکر کے رجحان سے عاری نہیں۔ اُن کے کلام میں تصوف کی راہ سے فکری عناصر کی روشنی بھی جگہ جگہ جلوہ گر ملتی ہے۔ مگر فکری سطح پر وہ میر و غالب اور اقبال کی ہمسری کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ آتش کی غزلیہ شاعری انسانی عظمت اور انسان دوستی کے تصورات سے بھی معمور ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی موضوعات بھی موجود ہیں۔ وہ صوفی ہونے کے باعث قانع ضرور ہیں مگر ان کی قناعت میں قنوطیت نہیں۔ مجموعی طور پر غالب کی غزلیہ شاعری میں رجائیت کی صحت مند فضا، ہمتِ مردانہ کی دعوت مشکلات سے مردانہ وار نبرد آزمائی کا حوصلہ، دشواریوں پر قابو پانے کی اُمنگ جیسے مثبت عناصر پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ملتے ہیں۔ فن کا احترام بھی ان کے کلام کا اہم وصف ہے۔ لیکن ان تمام مثبت عناصر کے ساتھ ساتھ آتش کی غزلیہ شاعری غیر ضروری اشعار سے بھی عاری نہیں۔ قادر الکلامی کی دُھن میں کہیں کہیں وہ قافیہ پیمائی کے ہاتھوں معنی آفرینی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اپنے دور میں رائج دو غزلوں، سہ غزلوں کی منفی روایت کی تقلید میں انہوں نے غیر معیاری شاعری کے انبار در انبار نمونے چھوڑے ہیں جن میں غیر اخلاقی اور مبتذل اشعار کے ساتھ ساتھ بے اثر اور ایسے کمزور اشعار بھی نظر آتے ہیں جو زبان و بیان کی ناہمواریوں سے پاک نہیں کلیاتِ آتش کو خس و خاشاک سے یک سر پاک سمجھنا وہ خوش فہمی ہے جو معیاری اور معروضی تنقید میں کسی طرح جائز نہیں۔ بڑے سے بڑے سخن ور اور صاحبِ کمال کا کلام "ایک ڈال" نہیں ہوتا۔ میر و غالب کا کلام بھی بلند و پست اشعار کے باعث نشیب و فراز کی ناہمواریوں سے مبرّا نہیں۔ اس صورتِ حال پر آتش کے حریف ناسخ کا یہ شعر پوری طرح صادق نظر آتا ہے ے

نہیں ممکن کہ کلکِ فکر لکھے شعر سب اچھے
برستا ہے بہت نیساں گُہر ہوتے ہیں کم پیدا

خواجہ آتش کی غزلیہ شاعری میں ایسے متعدد معیاری اشعار موجود ہیں جو زبان زدِ خواص و عوام ہو کر ضرب المثل کی حیثیت سے عوامی حافظے کا حصّہ بن چکے ہیں۔ آتش کی شاعری کی شہرت و مقبولیت کے ایوان میں ان یادگار اشعار کو کلیدی محراب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں کلیاتِ آتش سے چند مثالیں حاضر ہیں :ے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

——— (ص ۶)

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

——— (ص ۶)

طبل و علم ہی پاس نہ اپنے، نہ مُلک و مال!
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

——— (ص ۷)

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گِلہ جاتا رہا

——— (ص ۱۵)

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا   جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

——— (ص ۱۵)

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

(صفحہ ۳۸)

سمجھا، یا نہ اسے آتش سمجھتا ۔۔۔ دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

(ص ۵۹)

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے ۔۔۔ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

(ص ۷۴)

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُوبرُو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بیتاب گفتگو کرتے

(ص ۲۰۹)

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صُورتیں
رو یئے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

(ص ۱۸۰)

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی ۔۔۔ قبائے گُل میں گُل بُوٹا کہاں ہے

(ص ۲۲۷)

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا ۔۔۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

(ص ۳۰۲)

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا ۔۔۔ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

(ص ۳۰۲)

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ۔۔۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

(ایضاً)

سفر ہے شرط مُسافر نواز بہتیرے ۔۔۔ ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

(ص ۳۰۴)

آتش اُردو غزل کے ایک قد آور فن کار تھے اور ان کے کلام کے کمال کا اعتراف کرنے والوں میں جو باکمال شخصیتیں ملتی ہیں ان میں درج ذیل مشاہیر کے نام شامل ہیں،

مصحفی ۔ تذکرۂ ریاض الفصحا ۔ دہلی ۱۹۳۴ء ص ۳ تا ۹ (متن)

مرزا غالب ۔ اُردوئے معلّٰی حصّۂ اوّل۔ اکمل المطابع دہلی۔ طبعِ اوّل، مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۵۰ (مکتوبِ غالب بہ نام عبدالغفور سرور)

میر انیس ۔ بہ حوالہ فکرِ بلیغ : شاد عظیم آبادی ۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد لکھنؤ اگست ۱۹۷۴ء ص ۲۷۲ (بشکریہ ڈاکٹر نیّر مسعود)

یاس یگانہ چنگیزی ۔ بہ حوالہ یگانہ حوال و آثار : نیر مسعود ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۔ ۱۹۹۱ء ص ۶۲ تا ۶۹

فراق گورکھپوری ۔ بہ حوالہ مقدمہ کلامِ آتش ؛ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھنؤ ۔ دسمبر ۱۹۵۹ء ص ۴۵ تا ۶۰ ۔

خواجہ آتش کے ایک ہم عصر حسین علی تاسف نے اپنے دیوان "دیوانِ صد غزل" میں آتش اور ناسخ دونوں کے کلام پر برہمی کا اظہار کیا ہے (بحوالہ دیوان صد غزل ۔ تقدیم و ترتیب "؛ حسین علی تاسف ۔ مرتبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی ۔ لکھنؤ ۔ دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۴۰ تا ۴۲ ' ۶۸ تا ۶۹) ۔ آتش کے سلسلے میں دیوانِ صد غزل ایک ایسا غیر معروف ماخذ ہے جو استاد محترم پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی کی تلاش و تحقیق کی بدولت شائع ہوا ہے ۔

خواجہ آتش کے سلسلے میں مجھے ایک اور ایسا قدیم و غیر معروف ماخذ "آتش کدہ" بھی ملا ہے جس کا حوالہ دینے سے ناقدینِ کلامِ آتش تا مرفوع نظر آتے ہیں۔ "آتش کدہ" دراصل میر انیس کے شاگرد نواب مرزا زکی علی خاں رشید و زکی لکھنوی کے ان خمسوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے آتش لکھنوی کی غزلوں پر کہے تھے ۔ زکی لکھنوی خواجہ آتش کے معصروں میں تھے اور خواجہ صاحب سے قربت رکھتے تھے۔ "آتشکدہ میں شامل زکی لکھنوی کے مخمس اخبار کارنامہ لکھنؤ میں چھپا کرتے تھے جنھیں کتابی شکل میں جمع کر کے "آتش کدہ" کے عنوان سے مطبع کارنامہ لکھنؤ سے باہتمام محمد یعقوب (غالبًا انیسویں صدی عیسوی میں) شائع کیا گیا تھا۔ اس کا سنہ اشاعت معلوم نہیں۔ "آتش کدہ" کا ایک قدیم و بوسیدہ مطبوعہ نسخہ مجھے جناب پروفیسر نیّر مسعود (لکھنؤ) سے عاریتًا ملا ہے۔ "آتش کدہ" کے مصنف زکی علی خاں زکی لکھنوی کی مطبوعہ کتابوں میں مثنوی "اختر جناں" اور "مطلع الشمین" جیسی کتابیں شامل ہیں۔ زکی علی خاں زکی لکھنوی شاگرد میر انیس راقم الحروف کے سگے سکڑ دادا (یعنی دادا کے دادا) تھے۔ "آتش کدہ" سے آتش کی غزل پر کہے جانے والے زکی لکھنوی کے ایک خمسے کا نمونہ سطور ذیل میں حاضر کرتا ہوں ملاحظہ ہو ۔

جو سوئے منزلِ جانانہ عزم ہوں تیرے
یہ جانالے کہ ہیں مشتاق ہر جگہ گھیرے
اٹھا لے شہر سے دل بخت ہیں رسا تیرے

"سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

تمام روز زکی ہے یہ صدمۂ دل کش
قریب شام ہے منزل وہاں ہے وہ مہوش
ہزار آبلے ہوں لاکھ بار آئے غش
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ تھم آتش
گلِ مراد ہے منزل پہ، خار راہ میں ہے

آتش کی جس غزل پر زکی لکھنوی نے یہ خمسہ کہا ہے وہ کلیات آتش مطبوعہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء (ص ۳۰۴) میں موجود ہے۔

"آتش کدہ" کے مصنف میرے بزرگ زکی علی خاں زکی لکھنوی نے خواجہ آتش کے ایک شعر کی شانِ نزول کے بارے میں جو روایت بیان کی تھی وہ میرے بزرگوں سے سینہ بسینہ مجھ تک یوں پہنچی ہے:

"ایک بار خواجہ آتش مع صبح زکی لکھنوی اور اپنے بعض دوسرے مخلصین کے ہمراہ عشرۂ محرم کے بعد لکھنؤ کی مشہور تال کٹورے کی کربلا تعزیے دفن ہونے والے گڑھوں کی زیارت کے لیے جا رہے تھے۔ کربلا میں تعزیے دفن ہونے والے گڑھوں پر گزشتہ شب جو موم کی شمعیں روشن کی گئی تھیں انھیں صبح کے وقت بے شمار کوّے اپنی منقاروں میں دبائے درختوں پر بیٹھے تناول فرما رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر زکی لکھنوی اور دوسرے ہمراہیوں نے خواجہ آتش سے شعر کہنے کی فرمائش کی۔ مخلصین کی فرمائش پر خواجہ آتش نے اسی وقت یہ شعر کہہ ڈالا ؎

تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گل کر دیا
صبح کو کوّے اٹھا کر شمع تربت لے گئے"

کلیاتِ آتش مطبوعہ ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء (ص ۱۸۶) میں یہ شعر موجود و محفوظ ملتا ہے۔ آتش کی اس غزل پر بھی زکی علی خاں زکی لکھنوی نے خمسہ کہا ہے۔ "آتش کدہ" میں آتش کے منقولہ بالا شعر کو زکی علی خاں زکی لکھنوی نے یوں پیش کیا ہے ؎

بلبلوں نے فاتحہ خوانی کا جب غل کر دیا
قبر پر عاشق کے فرش چادرِ گل کر دیا
ہائے پروانوں کو پھر مایوس بالکل کر دیا
تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گل کر دیا
صبح کو کوّے اٹھا کر شمعِ تربت لے گئے

اُردو شعر و سخن کی تاریخ میں خواجہ آتش کا یہ کارنامہ بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی میں درجنوں شاگردوں کی تربیت کی۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے قابلِ قدر تحقیقی مقالے "دبستانِ آتش" (مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۷ء) میں آتش کے جن ۱۰۷ شاگردوں کی نشاندہی فرمائی ہے ان پر میں مزید درجن ناموں کا اضافہ کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو مقالہ "آتش کے غیر معروف شاگرد" مطبوعہ "ادبی مقالے" کاظم علی خاں، لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۸۳ء ص ص ۱۴۳ تا ۱۵۹۔ میرا یہ مقالہ رسالہ آجکل نئی دہلی جولائی ۱۹۸۲ء میں بھی شائع ہو چکا ہے)۔

□□

حواشی: لہ بحوالہ خواجہ حیدر علی آتش، محمد ذاکر۔ دہلی ۱۹۸۹ء ص ۲۶

۲ہ یہ دراصل آتش کے دوسرے دیوان کی پہلی غزل ہے۔ دیوان دوم خواجہ حیدر علی آتش مطبع ولی محمد (لکھنؤ) مطبوعہ چہاردہم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۱ھ (مطابق چہار شنبہ ۱۲ مئی ۱۸۴۵ء) ص ۲ (کلیات ص ۲۵۲) مطبع ولی محمد (لکھنؤ) مطبع محمدی بھی کہا جاتا تھا۔

۳ہ دیکھیے تلامذۂ مصحفی: افسر صدیقی امروہوی۔ شیخ شوکت علی پرنٹرز کراچی۔ ۱۹۷۹ء ص ۱۷۔

۴ہ تفصیل کے لیے دیکھیے، (۱) آب حیات، محمد حسین آزاد۔ الہ آباد۔ ۱۹۶۳ء ص ۳۸۹
(۲) گلِ رعنا، حکیم عبدالحئی۔ اعظم گڑھ۔ ۱۳۷۰ھ ص ۳۶۳ تا ۳۶۴
(۳) انتخاب کلام خواجہ حیدر علی آتش، مرتبہ ولی الحق انصاری۔ نشاط پریس ٹانڈہ۔ ۱۹۸۴ء۔ ص ۱۰
(۴) مختصر تاریخ ادبِ اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ الہ آباد ۱۹۸۴ء ص ۹۷
(۵) کلیاتِ آتش۔ مطبع محمدی لکھنؤ مطبوعہ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۱ھ/ ۲۱ مئی ۱۸۴۵ء ص ۳۰۶۔

۵ہ برائے تفصیل دیکھیے، (۱) انتخاب غزلیات ناسخ: مرتبہ کاظم علی خاں لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۱۱ تا ۱۲۔ (۲) تذکرۂ ماہ و سال، مالک رام۔ نئی دہلی نومبر ۱۹۹۱ء (مذکورہ شعراء کے سنینِ وفات اس ماخذ میں بھی موجود ہیں)
(۳) شیعہ کالج میگزین لکھنؤ۔ عزیز لکھنوی نمبر ۱۹۹۲ء - ۱۹۹۱ء۔ مرتبہ کاظم علی خاں ص ۱۸۴۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

غزلیں

کسی کو دیکھ کے جب دل بہلنے لگتا ہے
تو وہ بھی چہرے پہ چہرا بدلنے لگتا ہے

عجیب حال ہے جب میں سنبھلنے لگتا ہوں
مرا عزیز مسیحا بدلنے لگتا ہے

وہ بے وفا ہی سہی، دل سے چاہ کر دیکھو
کہ چاہتوں سے تو پتھر پگھلنے لگتا ہے

تمام رات مرا دل بجھا بجھا سا رہا
عجب چراغ ہے دن ہو تو جلنے لگتا ہے

وہ کون شخص ہے، جب گھر سے میں نکلتا ہوں
تو سایہ بن کے مرے ساتھ چلنے لگتا ہے

کبھی کبھی مری زنجیرِ پا کا نغمہ بھی
شراب بن کے رگ و پے میں ڈھلنے لگتا ہے

وہ انقلاب ادھورا کبھی نہیں آتا
وہ انقلاب جو بچوں میں پلنے لگتا ہے

عجیب شوق ہیں اس کے کبھی مجھ سے وہ افسرؔ
کبھی نگاہ، کبھی دل بدلنے لگتا ہے

خورشید افسر بسوانی

بسواں۔ ضلع سیتاپور

بجھے بجھے سے چراغوں سے سلسلہ پایا
ہجومِ یاس میں بھٹکے تو راستہ پایا

کسی خیال میں ابھرا امید کا چہرا
کسی امید میں پرتوِ خیال کا پایا

نہ جانے کتنے گھروندوں کو ٹوٹتے دیکھا
کسی کھنڈر میں تمنا کا نقشِ پا پایا

قدم قدم پہ ملے یوں تو قہقہے بکھرے
درونِ جسم کوئی شخص چیختا پایا

طلسم ٹوٹ گیا، دھند چھٹ گئی شاہدؔ
کہیں پہ ٹھہر کے سوچیں کہ ہم نے کیا پایا

شاہد ماہلی

کے-۲۰ سی، شیخ سرائے، فیز ۱۱
نئی دہلی
۱۱۰۰۱۷

ڈاکٹر ناظم جعفری
حکیم محمد جعفر روڈ - دال منڈی
وارانسی

نذیر بنارسی

حضرت علیؑ کا قول ہے کہ: اگر کسی شخص کو پہچاننا ہو تو اس کے ساتھ سفر کرو۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ نذیر بنارسی کے ساتھ مجھے سفر کرنے کے کئی مواقع ملے۔ کبھی ایران کلچر ہاؤس دہلی کے مقاصدے میں کبھی عبّاس ڈے الہ آباد کی محفل میں، کبھی جلال پور، فیض آباد و لکھنؤ کی محافل میں۔ اور یہ سفر کار سے بھی ہوا اور ٹرین سے بھی۔ اگر یہ لکھوں کہ نذیر صاحب مجھ سے بڑے تھے تو یہ ایک مذاق ہوگا کیوں کہ نذیر صاحب تو میرے والد سے بھی بڑے تھے، مگر دورانِ سفر وہ برابری کے قائل تھے۔ کبھی اپنے ہم سفر کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ سفر دشوار بھی ہوتا ہے راستے میں اس طرح خاطر تواضع کرتے تھے کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ نذیر صاحب خود مہمان بن کر نہیں جا رہے ہیں بلکہ وہ صاحب خانہ کے نمائندے کی حیثیت سے شعراء کو لینے آئے ہیں۔ کار کا سفر بھی دلچسپ ہوتا، کبھی گاڑی رکوا کر پھل خرید رہے ہیں، کبھی لمکا کی بوتل۔ اگر راستے میں کچھ نہ ملے تو کچی گری سے بھی کام چل جاتا تھا۔ ٹرین کی تو بات ہی الگ تھی کوئی اسٹیشن خالی نہیں جانے پاتا تھا۔ مہمان نوازی کرتے کرتے جب منزلِ مقصود پر پہنچتے تو وہاں بھی ان کی غیر معمولی توجہ کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ کمرے کا معائنہ کرتے۔ بستر سب کو ٹھیک ملا ہے کہ نہیں۔ کمبل کیسا ہے جائے تو نہیں چاہیے۔ جس نے بھی اُن کے ساتھ پہلی بار سفر کیا وہ اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے اتنا متاثر تو ہو ہی جاتا تھا کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو ان سے کہنے لگتا۔ وہ یہ بھول جاتا تھا کہ نذیر صاحب بھی اسی کی طرح مہمان ہیں۔ نذیر صاحب کی یہ توجہ عام تھی مگر مجھ سے کچھ زیادہ ہی شفقت فرماتے تھے۔ محفل شروع ہونے سے قبل اپنا کمرہ بند کر لیتے تھے اور اپنا وہ کلام سناتے تھے جو پڑھنا ہوتا تھا۔ کلام سنانے کے بعد پوچھتے تھے "کیسا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔؟"

پھر وہ میرا کلام سُنتے تھے اور اپنے تجربے سے مفید مشورے بھی دیتے تھے کہ یہ پڑھو، یہ نہ پڑھو۔ ان کا یہ انداز خلوص و محبّت پر مبنی ہوتا تھا۔ مگر یہ رویّہ سب کے ساتھ نہیں تھا۔ ممکن ہے کچھ اور بھی ایسے لوگ ہوں مگر اس کا علم مجھ کو نہیں۔

نذیر بنارسی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب مجھ کو شعر سمجھنا ہی نہیں آتا تھا، شعر کہنا تو بڑی بات ہے۔ نذیر صاحب کے بڑے بھائی حکیم لٰسین مرحوم میرے والد حکیم محمد کاظم مرحوم کے دوستوں میں تھے، اور یہ دوستی بے تکلّفی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ دونوں حضرات برابر ملتے رہتے۔ چونکہ میرے والد حکیم لٰسین مرحوم کے دوستوں میں تھے اور وہ نذیر صاحب کے بڑے بھائی تھے اس لیے نذیر صاحب میرے والد کو کاظم بھائی کہتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ حکیم کاظم صاحب عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن کیا کروں کہ وہ میرے بڑے بھائی کے دوست ہیں لہٰذا احترام لازم ہے۔

نذیر صاحب حالات سے سمجھوتہ کرنے میں ماہر تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح ان تک غم کا شائبہ بھی نہ پہنچے۔ وہ اپنے چاروں طرف ایسا ماحول بنائے رکھنا چاہتے تھے کہ اس حلقے میں آنے والا ہر شخص خوشی اور نشاط کی کیفیت سے سرشار رہے۔ وہ مسکرا کر استقبال کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ آنے والا بھی مسکراتا ہوا آئے اور جب تک ان کے قریب رہے مسکراہٹ پھیلتی رہے۔ دوسروں کا کلام بڑے غور سے سنتے تھے اور اچھے شعر پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ نوجوان شعراء کی ہمّت افزائی بھی خوب کرتے تھے۔ نذیر صاحب کا تعلق طبیب گھرانے سے تھا مگر وہ خود وقت کے نباض تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کب کیسی شاعری کرنا چاہیے اور کہاں کیا پڑھنا چاہیے۔ سیاسی نظمیں

ہو یا حبّ الوطنی کی، وہ موقع اور محل کا خیال رکھتے تھے، مجمع کو پہچاننا بھی ایک فن ہے اور نذیر صاحب ایک ماہرِ فن کی طرح مجمع کو دیکھ کر کلام کا انتخاب کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مشاعرہ ہو یا محفل، نذیر صاحب ہمیشہ کامیاب رہتے تھے۔ وہ تحت اللفظ میں پڑھتے تھے اور اس رمز سے بخوبی واقف تھے کہ کس لفظ پر کب اور کتنا زور دینا ہے۔ ان کا لہجہ بھی ایک مخصوص انداز کا تھا۔ آواز کچھ میٹھی میٹھی تھی اور اس میں ان کے مزاج کے برخلاف غم کی آمیزش تھی۔ سامعین ان کو بے حد پسند کرتے تھے۔

نذیر صاحب اُردو شاعری میں فارسی تراکیب کے دخل کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، مجبوری کی بات الگ ہے۔ عموماً وہ اسی زبان میں شعر کہتے تھے جو وہ خود بولتے تھے یا جو ان کے ماحول میں بولی جاتی تھی۔ میری مراد اُردو زبان سے ہے، ان کے محلے کی زبان سے نہیں۔ وہ آسان زبان کے قائل تھے اور ہندی کے عام فہم اور روزمرّہ میں شامل الفاظ کے استعمال پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں ہندو اور مسلمان دونوں کی کثیر تعداد تھی۔ اس طرح ان کی شاعری بھی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے رنگ و آہنگ کی حامل تھی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ تھا کہ وہ لوگ بھی جو صرف ہندی جانتے تھے، نذیر صاحب کی شاعری کو بخوبی سمجھ لیتے تھے اس لیے نذیر صاحب ہندی والوں میں بھی کافی مقبول تھے۔ میرا خیال ہے کہ بنارس کا کوئی دوسرا اُردو کا شاعر ہندی والوں میں اتنا مقبول کبھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر صاحب کی کئی کتابیں ہندی میں شائع ہوئیں۔ میری نظر میں بنارس کا اور کوئی اُردو شاعر نہیں ہے جس کی شاعری ہندی میں کبھی چھپی ہو، سوائے ایک نام کے یعنی شیو مورت لال قیس بنارسی، جن کا مجموعہ ہندی میں بہت پہلے شائع ہوا تھا، مگر ان کا پورا ماحول ہندی کا تھا، اور وہ تنہا اُردو کا چراغ جلائے ہوئے تھے۔ ہاں میرے ایک دوست ڈاکٹر علیم مسرور کا اُردو ناول "بہت دیر کردی" ہندی میں بھی شائع ہوا تھا، مگر وہ ناول تھا، شاعری الگ چیز ہے۔ نذیر صاحب مشاعروں کے ساتھ ساتھ کوی سمیلنوں میں بھی بلائے جاتے تھے اور خاصے مقبول تھے۔ مشاعروں کے سلسلے میں انھوں نے تقریباً پورا ہندستان دیکھا تھا۔ مشاعروں میں بنارس کی نمائندگی کا دوسرا نام نذیر بنارسی تھا۔ شہر میں اور بھی اچھے اچھے شعرا موجود تھے، لیکن جو مقبولیت اپنے عہد میں نذیر صاحب نے پائی وہ کسی دوسرے کے نصیب میں نہیں آئی۔

ایک طبقہ شہر میں ایسا بھی تھا جو نذیر صاحب کی شاعری کا مذاق اڑاتا تھا اور ان کو شاعروں کی صف میں شمار نہیں کرتا تھا مگر نذیر صاحب ان باتوں سے بے پروا اپنے حال میں مگن تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ان لوگوں کو بھی قائل کر لیا جو ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نذیر صاحب چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن کر جب مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو کچھ لوگ ازراہِ مذاق ان سے کہتے تھے کہ براہِ کرم کھڑے ہو کر غزل پڑھیے۔ پستہ قد ہونے کا احساس ان کو بھی بہت دنوں رہا، پھر وہ اس جملے کے عادی ہو گئے۔

نذیر صاحب نے ایک بار اپنی ایک غزل لکھنؤ ریڈیو سے پڑھی جس کا غالباً مطلع کا دوسرا مصرعہ تھا ؂

محبّت کی یہ قسمت تھی کہ پیدا ہو گئے ہم تم

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی (جو اُس وقت حیات تھے) نے اعتراض کیا اور یہ خبر بنارس تک پہنچ گئی۔ نذیر صاحب نے تو اس وقت کے شعرا نے کچھ نہیں کہا مگر ایک ہزل اسی زمین میں تیار ہو گئی اور جس مشاعرے میں نذیر صاحب موجود تھے، پڑھی گئی، جس کے دو اشعار مجھے آج بھی یاد ہیں ؂

زمانے والے ہم دونوں کو ابن الوقت کہتے ہیں
نوازش جانے کس کی تھی کہ پیدا ہو گئے ہم تم

یہ ناٹا پن تمھارا اور ہمارے قد کی لمبائی
بجائے حسن و الفت گلّی ڈنڈا ہو گئے ہم تم

یہ سلسلہ کچھ دنوں خوب چلا۔ نذیر صاحب کی ایک اور غزل جس کا مصرع ہے:

کلی کھلنے نہیں پاتی کہ بھونرا ٹوٹ پڑتا ہے

اس پر ایک اور ہزل تیار ہو گئی، جس کے یہ اشعار اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں ؂

اُجالا کیا اندھیرے میں بھی اب تو عشق لڑتا ہے
دیا جلنے نہیں پاتا پتنگا ٹوٹ پڑتا ہے

لہو پیتی ہے تب ہوتا ہے اس مٹی میں رس پیدا
یہ آزادی کا جھنڈا ہے بڑی مشکل سے گڑتا ہے

ہمارا توسنِ عمرِ رواں مہمیز ہے ترکش
یہ وہ ٹٹو نہیں جو راستہ چلنے میں اڑتا ہے

اس طرح کی چشمک بنارس میں چلتی تھی۔ لیکن اس سے نذیر صاحب کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے مذاق کا ہدف صرف اس شخص کو بناتے ہیں جو سب کی توجہ کا مرکز ہو۔ ورنہ ایسے اشعار دوسروں کے لیے بھی کہے جا سکتے تھے۔

نذیر بنارسی انتہائی متواضع، خوش اخلاق اور مخلص انسان تھے یہی نہیں کہ شہر کے باہر بنارس کی نمائندگی کرتے تھے، اپنے شہر میں بھی ان کی ذات ایک مرکزی حیثیت کی حامل تھی۔ شہر میں آنے والا بڑے سے بڑا شاعر ان کے گھر جاکر ان سے ملتا تھا۔ بہت سے لوگ نذیر صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے، اور اگر قیام کہیں اور ہوتا تھا تو ان کے یہاں ان کی دعوت ضرور ہوتی تھی۔ شہر کی ادبی شخصیات بھی اکثر ان سے ملنے جایا کرتی تھیں، جب تک نذیر صاحب کی صحت اس قابل تھی، وہ خود بھی لوگوں سے جاکر ملا کرتے تھے، میں ان کے سامنے بچے کی حیثیت رکھتا تھا مگر وہ مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے، اگر موڈ ہوا تو دن بھر قیام فرماتے تھے، اپنے اشعار خوب خوب سنایا کرتے تھے اور مجھ سے فرمائش کر کے اشعار سنتے تھے۔

"اور سناؤ۔ ایک غزل اور۔"

مجھ سے اکثر کہتے کہ "تم مشکل پسند بہت ہو۔ آسان کہو، ورنہ یہ زبان اب کون سمجھے گا۔" بات ان کی سو فیصد درست تھی۔ اب وہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو اردو اچھی طرح جانتے ہوں۔ زبان تو جانتے نہیں شعر کیا سمجھیں گے۔ مگر نذیر صاحب کے انداز میں شعر کہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے ایک مخصوص مزاج اور ذہنی ساخت کی ضرورت ہے جو نذیر صاحب اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک بہت دل چسپ واقعہ نذیر صاحب کے سلسلے میں مجھ کو یاد آرہا ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۸ء کا ہے۔ مدن پورہ میں جہاں نذیر صاحب کا مکان ہے اور شہر کا ایک مشہور خطہ ہے۔ شعرا کی تعداد بھی کافی تھی۔ مسلم الحریری، ڈاکٹر شوکت مجید، ڈاکٹر علیم مسرور، جوہر صدیقی، راشد اور انور بنارسی اس علاقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ مگر چوک اور دال منڈی میں شعرا کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی، عباس بیگ محشر، حکیم محمد کاظم، خواجہ اسد، اقبال بنارسی، اشتیاق حسین شوق، عبدالقدوس نیرنگ، آغا جمیل کاشمیری، آغا منظر کاشمیری، مکش غازی پوری روشن بنارسی وغیرہ ان میں نمایاں اور پیش پیش رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک لمبی فہرست تھی۔ جب کسی مشاعرے کے لیے شعراء کا انتخاب ہوتا تھا تو فہرست دال منڈی کے شعرا ہی سے مکمل ہو جاتی تھی، دوسری جگہ کے خاص خاص شعرا ہی اس فہرست میں شامل کیے جاتے تھے۔ نتیجے کے طور پر دو باقاعدہ گروپ بن گئے تھے جو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہتے تھے۔ بعد میں مدن پورہ اور دال منڈی کے ان دو گروپوں میں مزید تقسیم ہوئی اور اس طرح کئی گروپ بن گئے تھے۔ مگر میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس وقت تک اس تقسیم در تقسیم کی نوبت نہیں آئی تھی اور دونوں گروپ بہت مضبوط اور شمشیر برہنہ تھے۔ اس زمانے میں ایک مشاعرہ نئے چوک میں ہوا تھا۔ بیرونی شعرا کی تعداد بہت تھی۔ وجہ میرے ذہن میں نہیں ہے، مگر چوک کے چند شعرا نے مشاعرے میں نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ان شعرا میں مکش غازی پوری اور میں بھی تھا۔ وقت گزارنے کے لیے ادھر ادھر گھومتے رہے۔ میری شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ مشاعرے میں شرکت کی بے چینی بھی تھی۔ رات تقریباً ایک بجے میں نے اور مکش صاحب نے طے کیا کہ اب بیرونی شعرا کا دور چل رہا ہوگا۔ مقامی شعرا پڑھ چکے ہوں گے، لہٰذا مشاعرہ سننے کی غرض سے چلنا چاہیے اور ہم دونوں وہاں پہنچ گئے۔ وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ صدارت حکیم محمد کاظم صاحب اور نظامت آغا رشید منظر صاحب فرما رہے ہیں۔ مجمع بہت تھا۔ بیرونی شعرا سے اسٹیج بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج ایک بڑے تخت پر بنا تھا۔ تخت کے اگلے حصے پر ہی آغا منظر صاحب مائک سنبھالے بیٹھے تھے اور ان کے بالکل قریب فرشِ محفل پر جناب نذیر صاحب تشریف فرما تھے۔ اس کے بعد ان کا گروپ بیٹھا تھا۔ اس وقت بزمی چریا کوٹی ترنم سے غزل پڑھ رہے تھے۔ مشاعرہ ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے لوٹ لیا ہے

مجھ کو اطمینان سا ہو گیا کہ اب میرے اور مکیش صاحب کے بچ جانے کا قوی امکان ہے۔ نذیر صاحب داد دیتے یا کوئی بات کرتے تو ناظم مشاعرہ آغا رشید منظر کے مائک سے وہ آواز شاعرے کے پنڈال کے کونے کونے میں پہنچ جاتی۔ اس روز نذیر صاحب خود فراموشی کے عالم میں تھے اور اسی عالم میں داد بھی دے رہے تھے۔ ان کا گروپ ان کے ساتھ ساتھ داد دیتا تھا۔ آغا رشید صاحب نے مجھ کو اور مکیش صاحب کو آتے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی بڑی چریا کوٹی نے غزل ختم کی، آغا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں میرا نام پکار دیا۔ یہ لمحہ میرے لیے بہت بھاری تھا۔ میں ذہنی طور پر پڑھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس پر قیامت یہ کہ والد صاحب یعنی حکیم محمد کاظم صاحب کی صدارت میں غزل پڑھنے کا یہ پہلا موقع تھا میں نے تردد کے ساتھ اُٹھنے کی کوشش کی تو آواز آئی کہ "صدر سے اجازت ضرور لے لیجئے گا۔"

کسی نے ٹکڑا لگایا ـــ "گھر سے اجازت لے کر آئے ہیں۔"

بہرحال میں ذہنی طور پر بالکل ماؤف تھا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے ایک قطعہ پڑھا ؎

کچھ حسن بڑھا دیتا ہے اندازِ حیا اور
شرماتا ہے جب کوئی تو لگتا ہے بھلا اور

دونوں ہی خطا وار سرِ بزم ہیں لیکن
جلووں کی خطا اور ہے نظروں کی خطا اور

قطعہ کافی پسند کیا گیا۔ خوب خوب داد ملی، مگر نذیر صاحب نے کہا،

"تیسرے مصرعے میں "سرِ بزم" کی جگہ "سرِ طور" کر دو تو شعر اور بلند ہو جائے گا۔"

ان کی اس اصلاح کو مائک نے پورے مشاعرے میں پہنچا دیا۔ بدن پورہ کے لوگوں کو ایک موقع ہاتھ آگیا چنانچہ انھوں نے نذیر صاحب کی اُستادی کے گُن گانا شروع کر دیے۔ چوک کے حلقے کے لوگ بالکل خاموش تھے۔ اس وقت تک میری حالت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا،

"نذیر صاحب! آپ کی اصلاح قابلِ قبول نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خطا کے معنی گناہ کے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ طور پر جلوہ کس کا تھا۔ اس لیے میں اسے خطا سے منسوب نہیں کر سکتا۔"

اس جوابی حملے کے بعد چوک کے لوگوں کی باری تھی۔ خوب واہ واہ ہوئی اور قطعہ بار بار پڑھوایا گیا۔ میں اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اس ماحول میں غزل بھی بے حد کامیاب رہی۔ اس واقعہ سے اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اتنا ضرور ہوا کہ لوگ یہ سمجھ گئے کہ شعر میں خود کہتا ہوں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی نذیر صاحب کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ میرے ساتھ ہمیشہ بزرگانہ شفقت و محبت سے پیش آتے رہے اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

نذیر صاحب مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے علاوہ مذہبی محفلوں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ غریب خانے کی سالانہ طرحی محفل میں وہ برابر شریک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مدرسۂ ایمانیہ اور مدرسۂ جوادیہ کے مقاصدوں میں بھی بڑی مستقل مزاجی سے شرکت فرماتے تھے اور خوب خوب داد لیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اگر آدابِ محفل سیکھنا ہوں، داد دینے کا طریقہ جاننا ہو اور اپنے اندازِ فکر و فن کو جلا دینی ہو تو مقاصدے میں شرکت ضروری ہے۔ نذیر صاحب شہر کے باہر بھی محفلوں میں اکثر مدعو کیے جاتے تھے اور اس کی وجہ ان کی کامیابی اور مقبولیت تھی۔ ان کے متعدد اشعار شرکائے محفل کو اب تک یاد ہیں۔ ان ہی میں سے ایک شعر جو انھوں نے تقریباً بیس برس پہلے پڑھا تھا، اب بھی زبان زدِ خاص و عام ہے ؎

تہِ شمشیر سجدہ اور اتنا معتبر سجدہ
بتا او بے نیاز اب بندگی کا اعتبار آیا

الہ آباد کی 'عباس ڈے' کی محفل میں جہاں کا مصرع طرح تھا، "عباسِ جری تاجِ شجاعت کا نگیں ہے" نذیر صاحب نے بڑے معرکے کا قصیدہ پڑھا تھا، ان کا مطلع تھا ؎

احباب کی یہ چھیڑ بھی کس درجہ حسیں ہے
پوچھیں گے وہی بات جو کہنے کی نہیں ہے

نذیر صاحب ایک مخصوص مزاج کے شاعر تھے۔ یہی مزاج ان کے نعتیہ اور منقبتی کلام میں بھی جھلکتا تھا۔ ان کی زبان اور ان کا مخصوص لہجہ ہر جگہ یکساں رہتا تھا اور یہ کیفیت آخر تک برقرار رہی۔ ایک دوسری محفل جو مدرسہ ایمانیہ میں منعقد ہوئی تھی، مصرع طرح تھا "مریم کی جا نماز ہے دامانِ فاطمہؑ"

نذیر صاحب نے اس محفل میں بھی عمدہ قصیدہ پڑھا تھا اور مصرع طرح میں ذرا سی ترمیم کر کے اسے حاصلِ محفل بنا دیا تھا۔ شعر یوں تھا ؎

خاکِ قدمِ پاک پہ مریم پڑھیں نماز
دامانِ فاطمہ تو ہے دامانِ فاطمہ

ان ہی محفلوں کی یادگار نذیر صاحب کے کچھ اور مشہور شعر یہ ہیں،

یہاں پیوند ہیں دھبّے نہیں ہیں
الگ دُنیا سے دامانِ علی ہے

یا

بظاہر تو زباں چوسی بہ باطن ابنِ حیدر نے
زباں دے دی پیمبر کو زباں لے لی پیمبر سے

یا

گھر میں خدا کے فضل سے خاکِ شفا بھی ہے
اُٹھ دردِ لا علاج کہ تیری دَوا بھی ہے

ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے ؎

گھٹا اُٹھی ہَوا سنکی فضا بہکی زمیں بھیگی
کسی کی یاد آئی اور ہماری آستیں بھیگی

نذیر صاحب بے حد بامروّت اور وضع دار انسان تھے۔ وہ تعلقات کو ہمیشہ دوسری تمام چیزوں پر مقدم رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار مالے گاؤں (مہاراشٹر) سے کچھ لوگ ان کو مقاصدے میں شرکت کے لیے لینے آئے۔ اتفاق سے یہ وہی تاریخ تھی جس دن مدرسہ ایمانیہ کی محفل ہونا تھی، لہٰذا نذیر صاحب ان لوگوں کو لیے ہوئے مولانا سید احمد حسن جوادی کے پاس گئے اور انھیں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں گے تو جاؤں گا ورنہ نہیں۔ مولانا نے مالے گاؤں کے بیرونی شعرا کی فہرست دیکھی اور نذیر صاحب کو مدعو کرنے کے لیے آئے ہوئے لوگوں سے کہا کہ آپ کے یہاں تو بہت سے شعرا ہیں، مگر میری محفل کے لیے اکیلے نذیر صاحب ہیں لہٰذا میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ نذیر صاحب مالے گاؤں نہیں گئے اور مدرسۂ ایمانیہ کی محفل میں شرکت کی جہاں مالی منفعت کا کوئی سوال نہ تھا۔ پیسے کی ضرورت سب کو ہوتی ہے مگر پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے، نذیر صاحب نے عملاً اس کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔

نذیر صاحب تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک علیل رہے۔ اس دوران کئی بار اسپتال میں داخل کیے گئے۔ جب کچھ صحت بہتر ہو جاتی تو پھر گھر آ جاتے۔ عیادت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ بھی برابر قائم رہا۔ بعض لوگ ملاقات سے صرف اس لیے گھبراتے تھے کہ تیسری منزل پر ان کے کمرے تک پہنچنے کے لیے اندرون خانہ سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ گھر کے لوگوں کو بہرحال زحمت ہوتی تھی۔ کوئی کچھ بولے یا نہ بولے، محسوس کرنے والے تو اس کو محسوس کرتے ہی تھے۔ اس کے باوجود شاید ہی کسی روز ایسا ہوا ہو کہ صرف ایک یا دو آدمی آئے ہوں۔ سیاسی رہنما، سماجی کارکن، فلم ایکٹر، ادبی شخصیتیں اور ان سب سے بڑھ کر نذیر صاحب کے مخلصین اور ارادت مند، یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔

۱۰ر مئی ۱۹۹۲ء کا واقعہ ہے کہ نذیر صاحب نے ایک غزل سنائی۔ بہت کمزور ہو چکے تھے آواز بہت نحیف تھی اور زبان میں بھی کچھ لکنت کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے الفاظ بہ آسانی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ کان ان کے منھ کے قریب کرنے پر بات سمجھ میں آتی تھی۔ انھوں نے اس وقت جو غزل سُنائی تھی اس کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں ؎

وقتِ آخر بھی اگر لب پر ترا نام آگیا
میں یہ سمجھوں گا مرا مرنا مرے کام آگیا

جا کے کہہ دو میرے سارے ملنے والوں کو سلام
آفتابِ زندگی میرا لبِ بام آگیا

لاش دیوانے کی تیرے چیل کوّے کھا گئے
تو تو کہتا تھا نکمّا ہے مگر کام آگیا

پوری غزل نوٹ نہ کی جا سکی، الفاظ مشکل سے سمجھ میں آتے تھے۔ اور نذیر صاحب غزل سُناتے سُناتے تھک جاتے تھے۔ اس ضعف اور کمزوری کے عالم میں بھی جب لوگ اُن تک پہنچ جاتے تھے تو ان کا اخلاق قابلِ دید ہوتا تھا۔ اپنے بچّوں سے طرح طرح کی فرمائشیں شروع کر دیتے تھے۔ بچّے ان کے لہجے اور ان کی آواز سے "

غزلیں

دھانی سُرمئی سبز گُلابی جیسے ماں کا آنچل شام
کیسے کیسے رنگ دکھائے روز لبالب چھاگل شام

چرواہے کو گھر پہنچائے پہریدار سے گھر چھڑوائے
آتے جاتے چھیڑتی جائے دروازے کی سانکل شام

سُورج کے جاتے ہی اصلی رنگ پہ آجاتی ہے دُنیا
جانے بُوجھے چُپ رہتی ہے شب کے بور پہ کومل شام

سانسوں کی پُرشور ڈگر پہ رقص کرے گا سنّاٹا
چپکے سے جس روز اچانک چھنکا دے گی پائل شام

بدرؔ تمھیں کیا حال سُنائیں اتنا ہی بس کافی ہے
تنہائی میں کٹ جاتی ہے جیسے تیسے مخمل شام

بدر واسطی
۹۔ مقابل مسجد ملنگ شاہ۔ بوہرہ کی امباڑہ روڈ
بھوپال۔ ۱
(مدھیہ پردیش)

ہے انجُم کے لیے آغوشِ جاں شب
تو کیا ہے مونسِ آشفتگاں شب

سحر سے رابطہ قائم ہوا تھا
ہوئی حائل ہمارے درمیاں شب

ستارے ہیں کہ سوتے جا رہے ہیں
لیے بیٹھی ہے کیسی داستاں شب

دیارِ شرق کو محصور کرکے
کرے گی دیکھنا اپنا زیاں شب

ستاروں سے فلک خالی ہوا ہے
کسے سونپے گی اسرارِ نہاں شب

ہے شاید یہ دیارِ شب پرستاں،
ہے دن کو بھی یہاں وردِ زباں شب

پروفیسر حامدی کاشمیری
مسعود منزل شالیمار
سری نگر۔ (کشمیر)

سید احتشام حسین ٹانڈوی
لیکچرر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

سلام مچھلی شہری کی غزلیں

سلام مچھلی شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا مگر مالی حالات اچھے نہ تھے لہٰذا ان کی خواہش اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے باب اللہ قاسم صاحب جو مچھلی شہر کے رہنے والے تھے اور فاربس اسکول فیض آباد میں انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے، انھیں اپنے ساتھ فیض آباد لے آئے اور ان کے طعام و قیام کا انتظام اپنے ذمہ اس شرط پر لیا کہ سلام ان کے بچوں کو پڑھا دیا کریں گے۔ اس طرح سلام مچھلی شہری فاربس ہائی اسکول فیض آباد میں تعلیم حاصل کرنے لگے، لیکن دوران تعلیم ہی تحریک آزادی ہند سے خاصے متاثر ہو گئے اور ایک ایسی انقلابی نظم کہہ دی کہ ان کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس اسکول کے اندر آ گئی۔ وہ تو کہیے صدر مدرس سعید صاحب نے سمجھا بجھا کر اور یہ یقین دلا کر کہ اب ایسی حرکت نہیں کریں گے، کسی طرح پولیس کو روانہ کر دیا۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

فخرِ مادرِ وطن ہاں یونہی بڑھے چلو
حاصلِ شباب کو کامیاب خواب کو، روزِ انقلاب کو
کیا سکون چاہیے اک جنون چاہیے خون خون چاہیے
تیز تر بڑھے چلو، بے خطر بڑھے چلو شعلہ در بڑھے چلو

اس نئی دلچسپی کے نتیجے میں تعلیم کی طرف توجہ میں کمی آ گئی اور ہائی اسکول کے امتحان میں فیل ہو گئے، لیکن ایک مساوی امتحان پاس کر کے میٹرک ہو گئے ان کی نیم انقلابی نظموں کا ایک مجموعہ "میرے نغمے" برطانوی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ غالباً ان کی یہی شہرت آچاریہ نریندر دیو اور دیگر سوشلسٹ لیڈروں سے قربت کا باعث بنی۔ اسی زمانے میں ہتکاری پریس فیض آباد والوں نے "نغمہ" کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء کیا، جس کی ادارت کے فرائض سلام صاحب کو تفویض کیے گئے۔ سلام صاحب کو اپنے عہد کے نامور شعراء، ادباء اور ناقدین کو منظوم خطوط لکھنے کا خبط کی حد تک شوق تھا وہ ایک منظوم خط ہی تھا جو سلام مچھلی شہری نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امر ناتھ جھا کو لکھا تھا، جس سے موصوف نے متاثر ہو کر انھیں الٰہ آباد بلا کر یونیورسٹی لائبریری کے اسٹاف میں شامل کر لیا تھا۔ یہیں سے سلام کی باضابطہ ملازمت کا آغاز ہوا اور انھیں خاطر خواہ مطالعہ کا موقع ملا نیز ان کی ادبی سرگرمی کا باقاعدہ آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ پھر کچھ دنوں بعد ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر جھا ہی کی سفارش پر بطور اسکرپٹ رائٹر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ان کا تقرر ہوا۔ اُن دنوں اسرار الحق مجاز، سید سبط حسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر محمد حسن، ن م۔ راشد، شوکت تھانوی، عشرت رحمانی اور بہزاد لکھنوی وغیرہ لکھنؤ ہی میں تھے لہٰذا ان لوگوں سے بہت جلد سلام مچھلی شہری کے تعلقات قائم ہو گئے بالخصوص اسرار الحق مجاز سے تو ان کے اتنے گہرے روابط ہو گئے کہ اپنے دلی قیام کے دوران جب انھوں نے "دلی شہر میں" کی ردیف میں غزل کہی تو اس غزل کے ایک شعر میں اس کا اظہار یوں کیا ہے ؎

اب بھی اک طوفاں اٹھا سکتا ہوں پر بعد از مجاز
کون ہوگا مرا ذمہ دار دلی شہر میں

بہر حال قیامِ لکھنؤ کے دوران وہ یونیورسٹی کے رسالہ "مضراب" کے مدیر اعزازی بھی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ سری نگر ہو گیا اور میعاد پوری کر کے وہ پھر لکھنؤ آ گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کا تبادلہ دہلی ریڈیو اسٹیشن ہو گیا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس میں کام کرتے رہے اپنی اعلا کارکردگی، علمی صلاحیت اور شعری کارناموں کی بنا پر ترقی کر کے وہ اردو سروس کے پروڈیوسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور تا دمِ آخر اسی عہدے

غزلیں

دھانی سُرمئی سبز گُلابی جیسے ماں کا آنچل شام
کیسے کیسے رنگ دکھائے روز لبالب چھاگل شام

چرواہے کو گھر پہنچائے پہریدار سے گھر چھڑوائے
آتے جاتے چھیڑتی جائے دروازے کی سانکل شام

سُورج کے جاتے ہی اصلی رنگ پہ آجاتی ہے دُنیا
جانے بُوجھے چُپ رہتی ہے شب کے بور پہ کومل شام

سانسوں کی پُرشور ڈگر پہ رقص کرے گا سنّاٹا
چُپکے سے جس روز اچانک چھنکا دے گی پائل شام

بدرؔ تمھیں کیا حال سُنائیں اتنا ہی بس کافی ہے
تنہائی میں کٹ جاتی ہے جیسے تیسے مخمل شام

بدرؔ واسطی
۹۔ مقابل مسجد ملنگ شاہ۔ چوکی امباڑہ روڈ
بھوپال۔ ۱
(مدھیہ پردیش)

ہے انجُم کے لیے آغوشِ جاں شب
تو کیا ہے مونسِ آشفتگاں شب

سحر سے رابطہ قائم ہوا تھا
ہوئی حائل ہمارے درمیاں شب

سِتارے ہیں کہ سوتے جا رہے ہیں
لیے بیٹھی ہے کیسی داستاں شب

دیارِ شرق کو محصوُر کر کے
کرے گی دیکھنا اپنا زیاں شب

سِتاروں سے فلک خالی ہوا ہے
کِسے سونپے گی اسرارِ نہاں شب

ہے شاید یہ دیارِ شب پرستاں،
ہے دن کو بھی یہاں وردِ زباں شب

پروفیسر حامدی کاشمیری
مسعود منزل شالیمار
سری نگر۔ (کشمیر)

سید احتشام حسین ٹانڈوی
لیکچرر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

سلام مچھلی شہری کی غزلیں

سلام مچھلی شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا مگر مالی حالات اچھے نہ تھے لہٰذا ان کی خواہش اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے بابُ اللہ قاسم صاحب جو مچھلی شہر کے رہنے والے تھے اور فاربس اسکول فیض آباد میں انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے، انھیں اپنے ساتھ فیض آباد لے گئے اور ان کے طعام و قیام کا انتظام اپنے ذمہ اس شرط پر لیا کہ سلام ان کے بچوں کو پڑھا دیا کریں گے۔ اس طرح سلام مچھلی شہری فاربس ہائی اسکول فیض آباد میں تعلیم حاصل کرنے لگے، لیکن دورانِ تعلیم ہی تحریکِ آزادیٔ ہند سے خاصے متاثر ہو گئے اور ایک ایسی انقلابی نظم کہہ دی کہ ان کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس اسکول کے اندر آ گئی۔ وہ تو کہیے صدر مدرس سعید صاحب نے سمجھا بجھا کر اور یہ یقین دلا کر کہ اب ایسی حرکت نہیں کریں گے، کسی طرح پولیس کو روانہ کر دیا۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

فخرِ مادرِ وطن ہاں یونہی بڑھے چلو
حاصلِ شباب کو، کامیاب خواب کو، روزِ انقلاب کو
کیا سکون چاہیے اک جنون چاہیے خون خون چاہیے
تیز تر بڑھے چلو، بے خطر بڑھے چلو شعلہ ور بڑھے چلو

اس نئی دلچسپی کے نتیجے میں تعلیم کی طرف توجہ میں کمی آ گئی اور ہائی اسکول کے امتحان میں فیل ہو گئے، لیکن ایک مساوی امتحان پاس کر کے میٹرک ہو گئے۔ ان کی نیم انقلابی نظموں کا ایک مجموعہ "میرے نغمے" برطانوی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ غالباً ان کی یہی شہرت آچاریہ نریندر دیو اور دیگر سوشلسٹ لیڈروں سے قربت کا باعث بنی۔ اسی زمانے میں ہتکاری پریس فیض آباد والوں نے "نغمہ" کے نام سے ایک رسالہ کا اجرا کیا، جس کی ادارت کے فرائض سلام صاحب کو تفویض کیے گئے۔ سلام صاحب کو اپنے عہد کے نامور شعراء، ادباء اور ناقدین کو منظوم خطوط لکھنے کا خبط کی حد تک شوق تھا وہ ایک منظوم خط ہی تھا جو سلام مچھلی شہری نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امرناتھ جھا کو لکھا تھا، جس سے موصوف نے متاثر ہو کر انھیں الٰہ آباد بلا کر یونیورسٹی لائبریری کے اسٹاف میں شامل کر لیا تھا۔ یہیں سے سلام کی باضابطہ ملازمت کا آغاز ہوا اور انھیں خاطر خواہ مطالعہ کا موقع ملا نیز ان کی ادبی سرگرمی کا باقاعدہ آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ پھر کچھ دنوں بعد ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر جھا ہی کی سفارش پر بطور اسکرپٹ رائٹر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ان کا تقرر ہوا۔ اُن دنوں اسرار الحق مجاز، سید سبط حسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر محمد حسن، ن م۔ راشد، شوکت تھانوی، عشرت رحمانی اور بہزاد لکھنوی وغیرہ لکھنؤ ہی میں تھے لہٰذا ان لوگوں سے بہت جلد سلام مچھلی شہری کے تعلقات قائم ہو گئے بالخصوص اسرار الحق مجاز سے تو ان کے اتنے گہرے روابط ہو گئے کہ اپنے دلی قیام کے دوران جب انھوں نے "دلی شہر میں" کی ردیف میں غزل کہی تو اس غزل کے ایک شعر میں اس کا اظہار یوں کیا ہے

اب بھی اک طوفاں اُٹھا سکتا ہوں پر بعد از مجاز
کون ہوگا میرا ذمہ دار دلی شہر میں

بہرحال قیامِ لکھنؤ کے دوران وہ یونیورسٹی کے رسالہ 'مضراب' کے مدیر اعزازی بھی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ سری نگر ہو گیا اور میعاد پوری کر کے وہ پھر لکھنؤ آ گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کا تبادلہ دہلی ریڈیو اسٹیشن ہو گیا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو مجلس میں کام کرتے رہے اپنی اعلا کارکردگی، علمی صلاحیت اور شعری کارناموں کی بنا پر ترقی کر کے وہ اُردو سروس کے پروڈیوسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور تادمِ آخر اسی عہدے

پر رہے اور دورانِ ملازمت ہی ۱۲ نومبر ۱۹۰۳ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے ملازمتوں کی وجہ سے سلام کو فکرِ معاش سے کسی حد تک گلو خلاصی رہی لیکن اس ملازمت کی وجہ سے اکثر اوقات اپنے فطری اور فکری رجحانات کا گلا بھی گھونٹنا پڑا اور ستم ظریفی یہ کہ اس کرب کا اظہار بھی بڑے ہی محتاط انداز میں کرنا پڑا ہے

خوابوں نے انقلاب کے نغمے کو ڈس لیا
امواجِ گل نے آگ کے شعلے کو ڈس لیا

انساں ہوں اور مجھ کو یہ دُنیا عزیز ہے
اے روشنیِ صبح نہ جینا محال کر

کیا زندگی بھی دیکھ سکے ہو سلام کی
اے ناقدانِ شعر مرا یہ سوال ہے

دراصل سلام اپنے اس مقطع کے ذریعے ناقدین سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے اشعار کو ان کے حالاتِ زندگی کے آئینے میں دیکھا جانچا اور پرکھا جائے اور ان کا یہ مطالبہ۔ معقول، جائز اور حق بجانب بھی ہے

سلام مچھلی شہری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزلوں میں بھی ایک طرح کی انفرادیت نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے غزلیں کیوں کہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

سلام آزاد شاعری کی طویل و دُشوار راہ میں ہم
کبھی کبھی بربطِ تغزّل پہ گنگنا بھی جاتے ہیں

محولہ بالا شعر کو اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو یہی مفہوم سامنے آئے گا کہ آزاد نظمیں کہتے کہتے سلام جب اُکتا جاتے ہیں تو تفننِ طبع کے لیے غزل کہنے لگتے ہیں ۔۔۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو ایک دوسرا ہی مفہوم سامنے آتا ہے ۔۔۔ زندگی کی سختیوں اور تلخیوں کو بھگتنے والا سلام آزاد شاعری کی طویل دُشواری سے کیا گھبراتا، البتہ یہ دُشواری ضرور تھی کہ وہ راست اظہار کی طالب تھی اور سلام جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کا راست اظہار سرکاری نوکری کرتے ہوئے ناممکن تھا۔ دوسری طرف غزل میں استعاروں، اشاروں اور کنایوں کا سہارا لے کر اپنی بات کہہ دینے کی گنجائش موجود تھی لہٰذا غزل کہنا ان کے لیے ناگزیر تھا۔ اپنی بات کی تصدیق و توثیق میں محولہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے کا ایک لفظ "گنگنانا" پیش کروں گا کہ اس سے آہنگ اور کیفیت کا اظہار تو بالکل واضح ہوتا ہے لیکن الفاظ کی بندش کسی اور ہی مفہوم کا اشاریہ بنی ہوئی ہے۔ اسی حوالے سے ایک اور شعر ملاحظہ کریں تاکہ بات کچھ اور واضح ہو جائے ؎

میں چھیڑتا ہوں ہر اک بار اک نیا نغمہ
صدائے ساز کچھ ایسی دبی دبی ہے کہ ہائے

یعنی ۔۔۔ سلام نئے نئے احساسات اور خیالات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں مگر مجبوری کی وجہ سے مضراب کی چوٹ ہلکی پڑتی ہے اور ساز (بربطِ تغزّل) کی آواز دبی دبی سی لگتی ہے جسے وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ کچھ مخصوص موضوعات پر راست اظہار نہ کر پانے کی ان کی مجبوری بھی کسی حد تک اُجاگر ہوتی ہے۔

سلام کی زندگی ہر نفس مسائل کا شکار رہی جسے انھوں نے اپنی غزلوں میں سمیٹ لیا۔ ہمیشہ حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات سے نبرد آزما رہنے والے سلام کے یہاں "رجائیت" جو کہ ترقی پسند شاعری کے بنیادی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہی وہ اسلحہ تھا جس کے سہارے وہ مایوس کن حالات میں بھی مسائل سے برسرِ پیکار رہے، یہاں تک کہ بسترِ علالت (جو بسترِ مرگ ثابت ہوا) پر بھی اُمید افزا باتیں اور خوبصورت شعر کہتے رہے ؎

بہت علیل ہو لیکن یہ بُزدلی ہے سلام
کہ تم کو موت کا سایہ دکھائی دینے لگے

اب عیادت کو مری کوئی نہیں آئے گا
پھر ہوں بیمار کسی کو نہ یقیں آئے گا

غم مسلسل ہو تو احباب بچھڑ جاتے ہیں
اب نہ کوئی دلِ تنہا کے قریں آئے گا

محولہ بالا اشعار میں موت کا سایہ دکھائی دینے پر سلام خود اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہیں۔ اس سے بڑی حوصلہ مندی کی بات اور اس سے زیادہ رجائیت اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ اشعار انھوں نے اسپتال میں بستر علالت پر کہے تھے۔ سلسلۂ علالت طویل ہو جانے کی وجہ سے عیادت کے لیے آنے والوں میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی۔ تنہائی کا یہی احساس دوسرے شعر پر حاوی ہے اور تیسرے شعر میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر کے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غزل کہتے ہوئے انھوں نے غزل کے فارم اور اس کے رنگ و آہنگ نیز سبک روی کو باقی رکھا ہے بڑی سے بڑی بات اور سنگین سے سنگین موضوع کو بھی غزل کی مخصوص لفظیات کے سہارے بھرپور تغزل کے ساتھ اشعار میں ڈھالا ہے ملاحظہ ہو ؎

شاید کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ
میری تباہیوں میں تمھارا بھی ہاتھ ہے

مزدور کے پیالوں کی تب و تاب ہے جب تک
شرمندہ نہ ہو ساغر جم اور پئیں گے

میں خزاں میں بھی پرستار رہا ہوں اس کا
موسم گل میں چمن زار کو کیسے چھوڑوں

تم اپنی بجلیوں کی نزاکت کو دیکھ لو
ہم جانتے ہیں اپنا نشیمن سنبھالنا

جب سلام کو اپنی "مجبوریوں" کا احساس شدید ہو جاتا ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

میری فکر کی خوشبو قید ہو نہیں سکتی
یوں تو میرے ہونٹوں پر مصلحت کا تالا ہے

اور پھر نسیم غزل گلہائے موضوعات ممنوعہ کو چھیڑ کر سلام کی فکر کی خوشبو کو فضائے ادب میں یوں بکھیرتی ہے ؎

صبح کی حسیں کرنیں ناگ بن کے ڈس لیں گی
میں انھیں سمجھتا ہوں میں نے اُن کو پالا ہے

بزمِ نو کی شمعوں کو یہ خبر نہیں ہو گی
کس نے ظلمتِ شب کو روشنی میں ڈھالا ہے

کس نے خوابِ انساں کے نقرئی سفینے کو
سخت تر تلاطم کی زد میں بھی سنبھالا ہے

اور بھی درخشاں ہو لے مرے نئے سورج
اب بھی میرے آنگن میں روشنی نہیں آئی

تمام شہر بظاہر حسین ہے لیکن
تمام شہر میں کچھ ایسی بے بسی ہے کہ ہائے

اور بیک وقت حالات کے تقاضوں اور اپنی افتاد طبع سے الجھتے ہوئے سلام کو سمجھوتے کا خیال آتا ہے تو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے ؎

پھر اپنے غنچۂ زخم و جگر کا کیا ہوگا
نسیم صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

اور اب لیجیے سلام کے یہاں ناکامیوں سے کامرانیوں کے پہلو تراشنے کا فن ملاحظہ کیجیے ؎

تم بزم سیم و زر کی تنہائیاں تو دیکھو
ہم مفلسوں میں اب بھی خوددار آدمی ہیں

اور دیکھیے کس طرح سلام زورِ بیان اور منطق کا سہارا لے کر ایک تصویر کے دونوں رُخ ایک ہی مصرعے میں پیش کر کے دوسرے مصرعے میں اسے اپنے فن کی سند قرار دیتے ہیں ؎

تم تتلیوں سے بہتر، تم ناگنوں سے بڑھ کر
ہم بھی تو اے حسینو! فن کار آدمی ہیں

کچھ زندگی بھی چھیڑ رہی ہے مجھے سلام
کچھ میں بھی کم شریر نہیں زندگی کے ساتھ

ذرا انھیں کسی مفلس کے خواب بتلادو
تڑپ رہے ہیں جو دنیائے رنگ و بو کیلئے

غمِ حیات و غمِ دل بہت سہی لیکن
کوئی سوال کیا ہے ابھی گھٹاؤں نے

سلام مچھلی شہری کو کچھ مبصروں نے شامِ اودھ کا شہزادہ کہا تو میرے خیال میں بجا ہی کہا ہے کیوں کہ اکثر اوقات غم ہائے زمانہ کو طرح دے کر سلام مچھلی شہری اپنے تعمیر کردہ "شہرِ تخیل" میں ساغر بدست بہ شانِ شہزادگی داخل ہوجاتے ہیں۔ اس کی صبح میں صبحِ بنارس اور شام میں شامِ اودھ کا حسن پایا جاتا ہے۔ سلام نے ساری زندگی تلخیِ حیات کو آبِ حیات بنا کر پیا اور زندگی کے بانکپن کو اپنی شاعری کا بانکپن بنایا۔ سلام کی زندگی اگرچہ شکن در شکن ہی رہی لیکن انھوں نے اپنی شاعری کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آنے دی۔ وہ اگر کبھی بہت زیادہ تلخ ہوجاتے تو ایسا انداز اختیار کرتے کہ اُردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر محمد حسن کو کہنا پڑا،

"کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے سلام کے نزدیک شاعری تخیل آرٹ، شراب اور ماڈرن زندگی کا سارا رنگ رُوپ محض سماج سے انتقام ہو۔ اس سماج سے جس نے اُسے اور اس کے طبقے کو اور اس جیسے نوجوانوں کو زندگی کی ساری نعمتوں سے محروم کر رکھا ہو اور وہ ساری حد بندیوں کو توڑتا اور آئینہ خانوں کو چکنا چور کرتا ہوا ابوالحسن کی طرح اس الف لیلوی دربار میں در آیا ہو اور جی بھر کر تخیل کی اس زندگی سے بدلہ لے رہا ہو"

آخری بار ولنگڈن اسپتال کے بستر پر کھانا کھاتے وقت اتنا ضرور کہا تھا:

"گھبراؤ نہیں، میں مروں گا نہیں"

اور اب جبکہ سلام کا انتقال جسمانی ہوئے تقریباً ۲ سال ہو رہے ہیں سلام کا کلام میرے پیش نگاہ ہے اور میں پرزور الفاظ میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ سلام مچھلی شہری ابھی مرا نہیں ہے۔

□□

نیتاجی اور جنگِ آزادی ۔۔۔ صفحہ ۶ کا بقیہ

نے رنگون خالی کر کے انڈین نیشنل آرمی کے حوالے کر دیا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں برطانوی فوج نے انڈین نیشنل آرمی کو شکست دے کر رنگون پر قبضہ کر لیا۔

انڈین نیشنل آرمی ہندوستان کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکی مگر اس نے سامراجی طاقت کو یہ احساس ضرور دلا دیا کہ اب اس کا ہندوستان پر اقتدار قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔

اور پھر

۱۹۴۷ء میں واقعی ہندوستان کو مکمل آزادی مل گئی۔

□□

ماخذ:

۱. کرانتی کاری سبھاش، شنکر سلطان پوری (ہندی)
۲. گلمپسز آف ہسٹری۔ حصہ دوم (انگریزی)
۳. لائف اینڈ ٹائمس آف سبھاش چندر بوس (انگریزی)
۴. نیتاجی اینڈ انڈین انڈی پنڈنس (انگریزی)

نذیر بنارسی ۔۔۔ صفحہ ۳۱ کا بقیہ

اس پر فوراً عمل کرتے۔ آنے والا لاکھ منع کرتا مگر نذیر صاحب کی فرمائش پوری ہوتی تھی، یعنی آنے والوں کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کمی نہ ہوتی۔ نذیر صاحب صحیح معنی میں مجسم اخلاق تھے۔

بسترِ مرگ پر بھی ان کی ذہنی حالت قابلِ رشک تھی۔ لیٹے لیٹے وہ اشعار کی دنیا میں گم رہتے تھے۔ ڈاکٹر سید حنیف نقوی صاحب کو انتقال سے کچھ دنوں پہلے ایک غزل کے چند اشعار سنائے تھے اس کا مطلع ہے ؎

دوا کیجیے گا دُعا کیجیے گا
نہ اچھے ہوئے ہم تو کیا کیجیے گا

نذیر صاحب بہرحال ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو فراموش نہیں کی جا سکتی۔

□□

افسانہ

اقبال مجید

۴۷، شملہ ہلس ۔ بھوپال

مانُو

مانُو کا کمرہ بہت دنوں تک اسے ٹماٹر کی طرح لگتا رہا۔ وہ بہت دنوں تک گھر والوں سے یہ شکایت کرتا رہا کہ کمرے کو اس چھوٹے سے اوزار کے درمیان ٹماٹر کی طرح رکھ کر دبا کیوں نہیں دیا جاتا تاکہ ٹماٹر کی طرح اس کمرے کے بھی برابر کے اور سلوتر ایک جیسے گول گول چھلّے بن جائیں۔ مانو کی اس خواہش پر اسے یہ کہہ کر سمجھا دیا جاتا کہ پہلی بات یہ کہ کمرہ ٹماٹر نہیں ہے اور پھر کمرے میں دوسرا سامان بھی ہے، وہاں مانو کی تین پہیوں والی گاڑی ہے، پلنگ ہے، کپڑے اور جوتے ہیں۔ اگر کمرے کو اس طرح کاٹ دیا جائے تو سارے سامان کے اور خود مانو کے بھی چھلّے بن جائیں گے۔ مانو کو یقین تھوڑی دیر کو آ جاتا لیکن کچھ ہی وقفہ گزرنے پر وہ پھر کمرے کے لیے اپنی اس خواہش کو دُہرانے لگتا۔

مانو کی وقت گزاری کے لیے اس کی کرسی کمرے کی کھڑکی کے برابر ڈال دی گئی تھی۔ مانو کا ہاتھ منھ کوئی دوسرا نہیں دُھلاتا تھا۔ یہ کام وہ خود کرتا تھا۔ کھانا بھی وہ اپنے ہاتھ سے کھاتا، کپڑوں کا انتخاب بھی وہ اپنے آپ کرنے لگا تھا۔ دراصل مانو کی طرح اس کے گھر والوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ مانو نے ہمیشہ تعلیم کے زمانے میں امتحانوں میں بڑی امتیازی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ایم۔اے اس نے اس قدر کم عمری میں کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ چھوٹے درجوں میں اسے دوبار ڈبل پروموشن ملا۔ ایم۔اے میں گولڈ میڈل پانے پر نہ تو اس کو حیرت ہوئی اور نہ دوسروں کو۔

مانو کو جب اس کے دوست سڑک کے کنارے پرانی کتابوں کے لگے ڈھیر کے پاس کھڑے ہوئے دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ وہ جس کتاب کو کھڑا غور سے پڑھ رہا ہے وہ کوئی ناول نہیں بلکہ میتھمیٹکس کی کوئی کتاب ہوگی جس کے کسی مشکل سوال کو حل کرنے میں وہ ڈوبا ہوا ہوگا۔ مزہ تو اس کے دوستوں کو تب آتا تھا جب وہ کسی سوال کو سمجھانے کے لیے کاغذ پر لکھتے لکھتے کاغذ کے ختم ہو جانے پر سوال کے بقیہ حصّے کو سفید رنگ کے صاف ستھرے تکیے کے غلاف پر اس طرح حل کرنے لگتا جیسے وہ غلاف بھی کاغذ ہی کا ایک حصّہ ہو۔ پھر تکیے کے غلاف کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے بھی الجبرے کا وہ سوال حل نہ ہو پاتا تو مانو کے دودھیا لٹھے کے پاجامے تک وہ سوال پہنچ جاتا اور بڑی تیزی سے پاجامے پر مانو کا قلم چلنا شروع ہو جاتا۔

ایک دن مانو صبح کا ناشتہ کر رہا تھا، ماں نے اسے دُودھ اور دلیا دیا تھا۔ اس نے کٹورے میں چمچا ڈالا ہی تھا کہ اسے لگا کہ کٹورے میں دُودھ اور دلیے کے درمیان کوئی موٹی سی بھینس کھڑی ہے اور بھینس کے سر پر اس کے کانوں کے درمیان کوئی مینا بیٹھی ہے جو بار بار اپنی چونچ سے بھینس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے کیچڑ کو کھا رہی ہے۔ مانو نے پاس ہی رکھی خالی رکابی کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ رکابی کی صاف ستھری سطح پر بارات کے آگے آگے بینڈ بجانے والے لال لال وردیاں پہنے بینڈ کلارنٹ اور مجیرہ وغیرہ بجا رہے ہیں اور پیچھے پھولوں کی چادر سے ڈھکی ایک موٹر چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہے۔

مانو کو باجے گاجے اور شور شرابے سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ وہ بڑا خاموش طبیعت اور تنہائی پسند تھا۔ سڑکوں پر بارات کا جلوس دیکھ کر وہ کوشش کرتا کہ آس پاس کی کسی گلی سے نکل جائے اور اس طرح وہ اس سڑک کو بھی چھوڑ دیتا۔ اس لیے مانو نے فوراً رکابی کی طرف سے نگاہیں ہٹالیں اور کٹورے میں پھر جھانکنے لگا لیکن مانو کو یہ دیکھ کر کچھ حیرت ہوئی کہ کٹورے سے وہ موٹی بھینس غائب ہو چکی تھی اور وہاں صرف وہ مینا رہ گئی تھی جو بھینس کے سر پر بیٹھی بھینس کی آنکھوں کا کیچڑ اپنی چونچ سے نوچ رہی تھی۔ مینا نے مانو کی طرف دیکھا۔ مانو کو اس کا دیکھنا اچھا لگا۔ مانو کو پرندے اچھے لگتے تھے۔ اس کی ماں بچپن میں اکثر مانو کے دودھ نہ پینے پر، جھوٹ موٹ منڈیر پر بیٹھے کوّے کو بُلایا کرتی تھی۔

"آؤ کوّے مانو کا دُودھ پی جاؤ۔" ماں کے اس طرح منڈیر کی طرف

دیکھ کر کسی فرضی کوّے کو مانو کا دودھ پی جانے کی دعوت دینے پر مانو جلدی سے اپنی نگاہیں منڈیر پر ڈال دیا کرتا۔ مانو کو انتظار ہونے لگتا تھا کہ کوا منڈیر پر سے اترے گا اور اس کا دودھ پی جائے گا۔ پھر کالا کوا دودھ پینے کے بعد کالا نہیں رہے گا وہ گورا ہو جائے گا کیوں کہ ماں کو اکثر وہ یہ بھی کہتے سنتا تھا کہ جو بچے دودھ پیتے ہیں وہ خوب گورے ہو جاتے ہیں۔

اسی وقت کٹہرے میں بیٹھی مینا نے آواز لگائی۔

"مانو۔!"

مینا کو اپنی طرف دیکھتے اور اپنا نام لے کر پکارتے دیکھ کر اُسے بڑا اچھا لگا۔ وہ زور سے بولا

"مینا باہر آؤ۔" پھر بار بار وہ مینا باہر آؤ۔ مینا باہر آؤ کی رٹ لگانے لگا۔ ناشتے کی میز پر پاس بیٹھی اس کی بہن، جو اس سے دو سال بڑی تھی اور اپنی سسرال سے باپ کی بیماری کے سبب اُن دنوں آئی ہوئی تھی، مانو کو غور سے دیکھنے لگی۔ اسی وقت مینا کے کٹہرے سے باہر نہ آنے پر مانو نے کٹورے کا دودھ اور دلیا اس رکابی میں اُلٹ دیا جس میں بینڈ باجے والے بارات کے آگے باجا بجا رہے تھے۔ سارا دلیا رکابی میں پھیل گیا، لیکن مینا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ مانو اُداس ہو گیا کہ اتنی پیاری مینا نہ جانے کہاں اُڑ گئی لیکن مانو کے گھر والوں پر بجلی سی گر پڑی۔

جب مانو کا میڈیکل چیک اپ ہوا تو ذہنی امراض کے ماہرین کافی دنوں تک اسے ایک ماہر سے دوسرے ماہر کی جانب اُچھالتے رہے۔ مانو کے دیکھنے کا انداز کبھی کبھی یکسر بدل جایا کرتا۔ اس کی مسکراہٹ اور اس کی نظروں میں اور اس وقت چہرے پر آنے والے تاثرات میں کوئی تال میل نہ ہوتا۔ دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر وہ بار بار جکڑتا اور کسی کل دار کھلونے کی طرح اپنی گردن کو اِدھر اُدھر گھماتا۔ اس وقت اس کی آنکھیں چھت کو تاکتی ہوتیں۔ ایسی حالت میں اس کے ہونٹوں میں بے ہنگم سی جنبش ہوتی اور ہونٹوں کا کساؤ اس کو بدرو بنا دیتا۔ لیکن جب کچھ عرصہ گزر جاتا اور آسمان پر چمکنے والے چاند کا قطر گھٹنے لگتا اور ایک دن وہ ناخن برابر باریک ہو جاتا تو مانو کے کٹورے کے ذریعے سے مینا غائب ہو جاتی اور رکابی سے باجے والے اور بارات بھی، اس کے ہاتھ، انگلیاں، نگاہیں، ہونٹ، چہرہ اور دیکھنے کا انداز بے ربط جملے، بے معنی ہنسی۔ یہاں تک کہ ہونٹوں کے کنارے سے کبھی کبھی بہنے والا منہ کا لعاب وغیرہ سب غائب ہو جایا کرتا، اس کی جگہ شیو کیا ہوا چکنا چمک دار اور توانا و پرکشش چہرہ اُبھر آتا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک واپس آجاتی، ہونٹوں پر شادابی کی ہلکی سُرخی جھلکنے لگتی۔ وہ ذہنی امراض کے ماہرین سے ایسی باتیں کرتا اور ایسے موضوعات پر باتیں کرتا جو خود ان ماہرین کا میدان تھا اور مانو کی ان میدانوں میں بھی علمیت اور واقفیت دیکھ کر وہ دنگ رہ جایا کرتے۔

مانو کے ذہن میں کون سی ترنگیں اُٹھتی تھیں، یا ایسا کبھی کچھ ہوتا بھی تھا اس خبر کو گھر سے باہر نہ جانے دینے کے لیے سب ہی احتیاط برتا کرتے تھے خود مانو کو تو اپنا گزرا ہوا بیماری کا وہ عرصہ تو یاد بھی نہ رہتا۔ مانو پھر کُرتا پاجامہ پہن کر چہرے پر مردانے حسن کے ساتھ بڑی بُردباری سے اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ جایا کرتا۔

ایک بار مانو کو اس کے باپ نے ممبئی لے جانے اور وہاں کے ایک ماہر کو جس کے بڑے چرچے تھے، دکھانے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں مانو کی کیفیت اس پر پڑنے والے پرانے دوروں سے مختلف تھی۔ اس کی آنکھیں، چہرہ، ہاتھوں کی حرکت اور مسکراہٹ وغیرہ سب ہی ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اس پر ایک عجیب سی جذب والی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس حالت میں یوں تو وہ ساری باتیں عام سی ہی کر رہا تھا لیکن رنگوں کی شناخت میں ایسی غلطیاں کرنے لگا تھا جو بچے بھی نہیں کرتے۔ ایک دن ماں کے دھانی دوپٹے کو دیکھ کر اس نے ماں سے پوچھا کہ وہ کالا دوپٹہ کیوں اوڑھے ہے؟ ماں بھونچکا رہ گئی۔ بہن کی شلوار دیکھ کر مانو کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ نیلے جمپر پر کالی شلوار پہنے ہے جبکہ شلوار کا رنگ کالا نہیں بلکہ سفید تھا۔ مانو کو ایک بار بہن نے پانی پینے کے لیے دیا تو اس نے پانی پی تو لیا لیکن تھوڑے سے تردد کے ساتھ، وہ بھی یہ شکایت کرتے ہوئے کہ اس پانی کا رنگ آخر اس قدر سُرخ کیوں ہے؟ بہن نے گلاس کی تہہ میں پانی کی بچی ہوئی کچھ بوندوں کو غور سے دیکھا تو ایسا کچھ بھی نہ تھا اور پانی بالکل صاف شفاف تھا۔

ممبئی میں مانو کی بہن کی کھاتی پیتی سسرال تھی۔ مانو کے والد جب وہاں پہنچے تو انھیں ان امراض کے ماہر کے بارے میں، اس کے پیشے کے علاوہ جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بڑی دل چسپ تھیں انھیں میں ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ وہ ماہر فطرتاً بڑا لالچی تھا اور دولت کی لالچ میں اس قدر مبتلا تھا کہ اسے ریس کھیلنے کی لت سی پڑ گئی تھی۔ اس پر جنون کی حد تک تازے تازے کڑکڑاتے نوٹوں کو

چھونے اور انھیں تاش کی گڈی کی طرح پھڑپھڑانے کا دورہ سا پڑا کرتا تھا۔ قیمتی شرابیں اور لگاتار گھوڑ دوڑ میں ہارتے رہنے سے اس کے گھر کا منظر کسی دیوالیے کی آماجگاہ کے مانند تھا جہاں یوں تو قیمتی سامان بکھرا پڑا دکھائی دیتا لیکن نہ تو اس کے رکھنے کا کوئی قرینہ نظر آتا اور نہ سلیقہ۔ ایک ایسی بے ترتیبی اور منحوسیت وہاں طاری رہتی کہ بیٹھنے والا تھوڑی دیر بعد اس جگہ سے متنفر ہو کر اٹھ پڑنے کے لیے کروٹیں بدلنے لگتا۔

جب اس ڈاکٹر سے مانو کو ملایا گیا تو ڈاکٹر کی مانو سے سوالات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مانو ڈاکٹر کی میز کی سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہی نہیں، وہ کلینک کے اس بے ترتیب کمرے کے فرش پر ڈاکٹر کو نظر انداز کر کے چہل قدمی کرنے لگا اور ڈاکٹر کی فریم میں لگی اور دیواروں پر ٹنگی اسناد کو غور سے دیکھتے ہوئے اُلٹا اسی سے سوال کرنے لگا۔

"ریس کھیلتے ہو۔؟" اس نے ڈاکٹر سے سوال کیا

ڈاکٹر مسکرایا اور بولا۔ "ہاں۔"

"اس بار بھی غلطی کر رہے ہو۔؟" مانو کی اس بات پر دو پل خاموشی رہی، پھر ڈاکٹر کی آواز آئی۔

"کیسی غلطی۔؟"

"بلیک ڈائمنڈ۔!"

"مطلب؟" ڈاکٹر نے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا۔

"بلیک ڈائمنڈ پر داؤں لگانے جا رہے ہو۔؟"

"ہاں لگا تو رہا ہوں۔"

"وہ گھوڑا نہیں ٹٹو ہے ٹٹو۔ نیپولین تھنڈر پر لگاؤ۔ مالا مال ہو جاؤ گے۔"

ابھی اس نے جملہ پورا ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر کی جوان اور بلا کی خوبصورت لڑکی اپنے چھوٹے سے کتے کو گود میں لیے اندر آئی اور باپ کی میز کی دراز میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

"ہیلو۔" مانو بڑے انداز سے لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"آپ واقعی بہت خوبصورت ہیں۔"

لڑکی نے مسکرا کر اس کامپلی منٹ پر اظہارِ تشکر کیا ہی تھا کہ مانو نے اسے آگاہ کیا۔ "اپنے باپ سے کہیے کہ میری بات مانیں اور کل کی ریس میں نیپولین تھنڈر کھیلیں۔"

ڈاکٹر نے ویسا ہی کیا۔ یہ خود ڈاکٹر کو بھی پتہ نہیں تھا کہ اس نے ایک مریض کے کہنے پر ایسا کیوں کیا۔ لیکن ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے اپنی دوربین میں نیپولین تھنڈر کو سب سے آگے پایا۔

لیکن جب اگلی ریس میں بھی یہی ہوا اور مانو کا بتایا ہوا گھوڑا فاتح قرار پایا تو شام کو ڈاکٹر مع اپنی بیٹی کے مانو سے اس کی بہن کی سسرال والے گھر پر قیمتی تحائف کے ساتھ ملنے آیا۔ ڈاکٹر کی لڑکی مانو کو بڑے دلبرانہ انداز سے دیکھ کر بار بار سیکڑوں ڈالروں میں بھی نہ ملنے والی نظروں اور مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتی رہی۔

دوسرے دن کی شام کو ڈاکٹر کی خوبصورت لڑکی مانو کو لے کر اوبرائے کے لان میں بیٹھی تھی اور میز پر بیئر کے جھاگ اڑاتے کٹ گلاس والے مگ رکھے تھے جو خالص فرانس سے ہوٹل والوں نے منگوائے تھے۔ پھر تو یہ ہوا کہ رات کا کھانا مانو اپنی بہن کے گھر پر نہیں بلکہ اس خوبصورت لڑکی کے منتخب کیے ہوئے کسی ہوٹل میں کھاتا جس کا بھاری بل وہ لڑکی ادا کرتی۔ ایک بار اس لڑکی نے کھانے کے دوران کانٹے میں فِش وِدھ کریم کا ٹکڑا منھ میں رکھتے ہوئے مانو سے بڑی ادا سے کہا:

"مانو ڈیئر! کوئی گھوڑا مجھے بھی بتاؤ نا۔"

"شارک۔" مانو دھیرے سے بولا۔ بعد میں لڑکی نے اپنے بستر میں جب ریس کی کتاب کھول کر دیکھی تو اگلے مہینے کی دوسری ریس میں، جس کو ابھی پانچ دن باقی تھے، 'شارک' نام کا ایک گھوڑا موجود تھا۔ لڑکی نے وہ گھوڑا کھیلا اور مالا مال ہو گئی۔ اس کے دوسرے ہی دن لڑکی نے اپنے باپ کو آگاہ کر دیا کہ اس کو اس کا گھوڑا مل گیا ہے اور وہ باپ کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔

لڑکی نے مانو کے ممبئی کے قیام کے دوران کئی گھوڑے جیتے تو اس کو مانو سے والہانہ عشق ہو گیا جس کو اس نے مانو کے ساتھ آرام دہ بستر پر بیان کرنے کی کوشش بھی کرنا چاہی لیکن مانو بڑی اُلجھن میں تھا۔ انھیں دنوں میں سے ایک دن مانو بڑا اُداس تھا۔ حُسن، جوانی، جسم کا جادو، ہزار رنگوں میں زندگی اور اس کی آسائش اور ان آسائشوں کی سرشاری سب اس کے آگے پیچھے رقصاں تھیں۔ مانو نے اس لڑکی کو مینا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ ایک بار بیئر کی چسکی لیتے ہوئے اس نے اس خوبصورت مینا سے پوچھا۔

"مینا ڈیئر! یہ بتاؤ یہ زندگی کیا ہے۔"

"ہم سب کے لیے ایک داؤں۔"

"داؤں — ؟!"

"ہاں! گھوڑے پر لگایا گیا ایک داؤں۔" مینا ادا سے بولی۔

انھیں دنوں کی بات ہے کہ کئی بار ڈاکٹر کے پوچھنے پر بھی جب مانو نے کسی گھوڑے کا نام نہیں لیا اور وہ صرف خالی دیوار کو تاکتا رہا، تو ڈاکٹر نے اس کے مرض کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر کے یہاں سے مایوس ہو جانے پر مانو کے باپ وہاں سے واپسی کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ تبھی ناشتے کی میز پر اپنے دودھ اور دلیا کے کٹورے میں ایک بار پھر مانو کو بھینس اور اس کے سر پر مینا دکھائی دی۔

مانو نے مینا کو پیار سے دیکھا اور بولا۔

"مینا! مجھے بھی کوئی گھوڑا بتاؤ نا۔"

"گھوڑا — ؟" مینا نے حیرت سے سوال کیا۔

"اچھا گھوڑا نہ سہی، گھوڑی ہی بتا دو۔"

مینا چہک کر بولی — "مینا۔"

پھر مانو نے خوش ہو کر اپنے حصے کا دودھ اور دلیا خالی رکابی میں اُلٹ دیا مگر کچھ نہ ہوا — مانو نے مینا کو ریس کورس کے میدان میں ہوٹلوں کے لانوں میں بھی بہت تلاش کیا۔ مگر وہ مینا تو کئی گھوڑوں پر سوار ہو کر نہ جانے کہاں اُڑ چکی تھی۔

مانو ممبئی سے واپس آ گیا ہے، اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر بیٹھا ہے کھڑکی کے سامنے کسی فلیٹ کے اندر اسے مینا جیسی کوئی لڑکی چلتی پھرتی آتی جاتی کبھی نظر آتی ہے مگر اب اس کے دونوں ہاتھوں کی سب انگلیاں ایک دوسرے سے جکڑی ہوئی ہیں ہونٹوں کے کونوں سے رال بہہ رہی ہے۔ آنکھیں ادھر اُدھر گھوم کر چھت سے چپک رہی ہیں۔ اس نے اپنے پیجامے کا ایک پائینچا پھاڑ ڈالا ہے۔ وہ بار بار کھڑکی کی سلاخوں سے اپنا ماتھا ٹکراتا ہے لیکن اس کو درد محسوس نہیں ہوتا۔ غیر معمولی طور پر اس کا سوتا تو کبھی جاگتا ذہن کسی ماہر ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ پا رہا ہے۔ دوسرے کمرے میں مانو کا باپ بھیگی آنکھوں سے دل پر ہاتھ رکھے سسک رہا ہے۔

"میرا مانو —"

اسی وقت مانو کی آواز آتی ہے۔

"ابا ابا — دیکھو کیا میرا گھوڑا ہار گیا —"

باپ ڈاکٹروں سے سوال کرتا ہے۔

"کیا میرا مانو پاگل ہوا جا رہا ہے — ؟"

ڈاکٹروں کے پاس ایک ہی بندھا ٹکا جواب ہے

"جو آدمی سماجی طور پر قابلِ قبول نہ رہے اسے پاگل بھی کہتے ہیں۔"

□□

خرمنِ احساس

آبلے نشترِ کیف میں ڈوبے
گلشنِ ہستی جذب و جنوں

جلوۂ رنگیں حادثہ ٹھہرا
پردہ نشیں عالم کا خوں

چشمِ عنایت بادہ و ساغر
زہرِ ہلاہل ان کا فسوں

دستِ حنائی بادۂ عرفاں
شومیٔ قسمت حالِ زبوں

نقشِ خیالی وحشتِ خاطر
ختم ہوا ہے دل کا سکوں

زود حسی اور تلخ نوائی
سایہ گریزاں کس سے کہوں

سوزشِ دل اور چشم نمائی
زخم ہے کاری کیسے جیوں

فکرِ سخن اب ترک کرو تم
ہے یہ سلام اب دورِ جنوں

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام
شعبۂ عربی۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

غزلیں

جتنا جی چاہے مصلحت کرنا
خود کو بے اعتبار مت کرنا

نسلِ آدم کو تقویت پہنچے
پیدا ایسی کوئی صفت کرنا

کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا
کیا کسی سے مفاہمت کرنا

میرا منشا صداقتیں لکھنا
اُن کا شیوہ مخالفت کرنا

روشنی کے ہزار معنی ہیں
رات کا کاروبار مت کرنا

جس کو دعوا ہو رہبری کا رشید
کچھ سوالات اَن گنت کرنا

رشید قریشی
۳۰۔ محمد علی لین، امین آباد
لکھنؤ
۲۲۶۰۱۸

چشمِ نم پہلے شفق بن کے سنورنا چاہے
اور پھر ریت کے دامن پہ بکھرنا چاہے

کچھ عجب اُس سے تعلق ہے کہ اُسکی ہر بات
موجِ خوں بن کے مرے سر سے گزرنا چاہے

سارا دن دھوپ کے صحرا میں رہے سرگرداں
شام ہوتے ہی سمندر میں اُترنا چاہے

دلِ وحشی ہدفِ طعن و ملامت بن کر
خود ہو رسوا اُسے بدنام نہ کرنا چاہے

آئینۂ جاں کا مکدر ہی سہی لیکن شاہین
دل کی تصویر تو آنکھوں میں اُترنا چاہے

سلمیٰ شاہین
ایف۔۱۲۲، سید العجائب
ایم بی روڈ، نزد ساکیت
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۳۰

ہمیں تھا صبح سے مطلب نہ کوئی رات سے تھا
ہمارا قصد تو اصلاحِ کائنات سے تھا

کسی کی ناز و ادا سے نہ التفات سے تھا
مری وفا کا تعلق مری حیات سے تھا

خوشا نصیب کہ پروانۂ نجات ملا
ہمیں تو کام ہی پروانۂ نجات سے تھا

اسی نے توڑ دیا میرے شیشۂ دل کو
وہ طنز جس کا تعلق تمہاری بات سے تھا

سمجھ سکیں گے بھلا کیا اُسے جہاں والے
کہ میرا سامنا کس درجہ مشکلات سے تھا

بجھا گیا مری تشنہ لبی کو اے شاکر
وہ ربطِ خاص جو پیرِ مغاں کی ذات سے تھا

شاکر فتحپوری
۸۹/۸۸۔ جگر اکادمی
چمن گنج
کانپور

افسانہ

عطیہ جعفری

ٹورانٹو۔ کینیڈا

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بڑی امّاں ناشتے سے فارغ ہو کر خوبصورت ڈیزائن کی سُتلی سے بنی ہوئی رنگین پایوں والی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ اکثر اس محرابی دالان میں یوں بیٹھا کرتی تھیں کہ سامنے صحن اور باورچی خانے پر نظر رکھ سکیں۔

انھوں نے پاندان کھول کر پہلے پان کا ٹکڑا نکالا۔ اس کو ہتھیلی پر رکھ کر ملا۔ پھر باریک کٹی ہوئی تھوڑی سی چھالیا اور پتے کا تمباکو پان میں ملایا۔ پھر بیچ کی انگلی پر چمچی سے کتھا لگایا۔ اس کے بعد کلمے کی انگلی پر چونا لگایا۔ پہلے انگلی پر لگا کتھا چاٹا پھر چونا اور ہتھیلی پر رکھی ہوئی چیزوں کو پھانک لیا، اور منھ چلا کر پان کا مزہ لیتی رہیں۔ چند منٹ کے بعد بلند آواز میں بولیں ــ

"ارے محمدی بیگم! تم نے سُنا حسن علی کی بیٹی شمّو (جس کا اصلی نام شمس النساء تھا) کریم آباد آ رہی ہیں۔ ان کے میاں کا تبادلہ یہیں ہو گیا ہے"۔ ہمیں تو ان کو دیکھے مدّت ہو گئی ہے۔"

محمدی خالہ نے باورچی خانے کی کھونٹی پر ٹنگے تولیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے ویسی ہی اونچی آواز میں جواب دیا ــ

"بڑی امّاں! خدا بھلا کرے آپ کا۔ آپ نے تو صبح ہی صبح ہمارا دل خوش کر دیا۔"

خالہ ہمیشہ سے مشفق اور ملنسار واقع ہوئی تھیں۔ مہمان نواز بھی تھیں، اس لیے اس خبر سے ان کا خوش ہونا لازمی تھا۔

اس زمانے میں کریم آباد درمیانہ درجے کا شہر تھا۔ نہ تو وہاں جرائم اور حادثات بے شمار ہوتے تھے اور نہ ہی غیر آباد قبرستان تھا۔

محمدی خالہ کی کوٹھی شہر سے باہر ذرا اونچائی پر بنی ہوئی تھی۔ باہر نیم اور پیپل کے بڑے بڑے درخت تھے۔ مہندی کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ باغیچے میں خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ گرمی کے موسم میں رات کی رانی فضا کو معطر رکھتی تھی۔ چنبیلی کے پھولوں کے گچھے اترتے تھے، جن کے بھابی (خالہ کی بہو) اور کرائے دار خواتین گجرے بناتی اور بالوں میں سجاتی تھیں۔ ادھیڑ اور معمر خواتین پھولوں کو بالیوں میں پرو کر پہنتی تھیں۔

بڑے پھاٹک سے کوٹھی کے اندر داخل ہونے کے بعد سامنے کی جانب ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا، اس کے اوپر چق پڑی رہتی تھی۔ پھاٹک سے کمرے کا راستہ باغیچے کے درمیان سے آتا تھا اس لیے وہاں کا منظر بڑا خوش گوار معلوم ہوتا تھا سڑک پر سے یونیفارم پہنے اسکول جاتے ہوئے بچے، طرح طرح کے لوگ، تانگے اور موٹریں وغیرہ گزرتے رہتے تھے، لیکن ان کا شور پریشان نہیں کرتا تھا۔ میں اکثر فرصت کے اوقات وہاں، اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھ جایا کرتی تھی۔

ڈرائنگ روم سے اندر جانے کے لیے ایک دروازہ محرابی دالان میں کھلتا تھا۔ وہاں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ دالان کے بعد بڑا صحن اور دوسرے سرے پر باورچی خانہ اور سامان کا کمرہ تھا۔ بائیں جانب کے حصّے کو دو الگ رہائشی مکانوں میں تبدیل کرا دیا گیا تھا جہاں دو خاندان کرائے پر آباد تھے۔ بائیں جانب ہی غسل خانے اور گودام وغیرہ بنے ہوئے تھے، بائیں جانب سب گھر والوں کے کمرے بھی تھے۔ درمیان میں صدر دروازہ اور ڈیوڑھی تھی۔ ان کمروں کے سامنے ایک پتلا سا برآمدہ تھا۔ دائیں جانب سردی کا سامان یعنی لحاف، گدّے اور دوسرے سامان کے صندوق رکھنے کے لیے دو کمرے تھے۔ کتابیں زیادہ تر ڈرائنگ روم میں رکھی رہتی تھیں۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق بچّے صبح سے اسکول چلے جاتے۔ مرد صاحبان دفتروں کا رخ کرتے لیکن بیبیاں امورِ خانہ داری میں لگ جاتیں۔ دوپہر میں دست کاری یعنی بنائی، کڑھائی، سلائی وغیرہ میں مصروف ہو جاتیں۔ دوپہر میں تھوڑا آرام کرنا بھی معمول میں شامل تھا۔ اس کے بعد نماز اور پھر چائے وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ رات کو کاموں سے فارغ ہو کر دینی کہانیاں، حکایتیں، تمثیلی قصّے اور بیت بازی وغیرہ کا دَور چلتا۔

شمّو پھوپھی کے آنے کی خبر میرے لیے محمدی خالہ سے بھی زیادہ خوشی کا

باعث تھی کیونکہ گھر میں میرا کوئی ہم عمر نہ تھا، یا تو چھوٹے بچے تھے یا سب بڑے تھے مجھے اپنی ہم عمر سہیلی کی کمی اکثر محسوس ہوتی تھی۔ شمّو پھوپھی کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑی ذکیہ آپا، پھر حسن آرا، جن کا گھریلو نام حُسنہ تھا۔ ان سے چھوٹے ضیغم۔ پھر اختر۔ ان سب میں چھوٹی امیرہ تھیں۔ شمّو پھوپھی اور پھوپھا انصار دونوں بہت خوش شکل تھے لیکن ان کے بچّے تو ان دونوں پر سبقت لے گئے تھے۔ خصوصاً حسنہ، ضیغم اور اختر تو اتنے اچھے لگتے تھے کہ ان پر سے نظر ہٹنا مشکل ہوتا۔ صاف، چمک دار گلابی مائل رنگ، گھنے، چمک دار، کسی کے گھرے اور کسی کے ہلکے بھورے بال، بڑی بڑی مسکراتی سی آنکھیں، گھنی پلکیں، کمان سے ابرُو۔ غرض خوبصورتی کے معاملے میں خدا نے ان کے ساتھ خاصی رعایت برتی تھی۔ پھر اسی ہفتے شمو پھوپھی اور ان کا خاندان کریم آباد آگئے۔

پھوپھا انصار ریلوے میں ملازم تھے اس وجہ سے ان کو ریلوے کے محکے کی جانب سے اسٹیشن کے قریب بنگلہ مل گیا تھا۔ یہ جگہ ہمارے یہاں سے کافی فاصلے پر تھی۔ لیکن بہت پر فضا اور صاف ستھری تھی۔ گو کہ بنگلے میں مکانیت کم تھی لیکن باہر چار دیواری میں بہت سا کھلا میدان ہم سب کے لیے آزادی سے گھومنے اور کھیلنے کے لیے بہت مناسب تھا۔ نیم کے درخت میں جھولا بھی ڈال دیا گیا تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے یہاں ملنے آتے جاتے رہتے تھے۔ پھوپھی وغیرہ کا دل کریم آباد میں جلد ہی لگ گیا۔

ہم ایک مرتبہ دو دن کے لیے ان کے یہاں رہ گئے۔ وہاں ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ سب بچّے مل کر مجلس کرتے، گھر کے اندر سے من مانا تبرک لاکر بانٹ کر کھاتے۔ لنگڑی، آنکھ مچولی، رسّی کودنا، کیرم وغیرہ کے کھیل کھیلے جاتے۔ ہمارے اس قیام کے دوران ہی شمّو پھوپھی کے یہاں پلی ہوئی گائے نے بچہ بھی دیا۔ گائے کا بچّہ دیکھ کر ہم کو جتنی خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ یہ ہمارا پالتو گائے اور اس کا بچّہ دیکھنے کا پہلا اتفاق تھا۔ ہمارے یہاں کبھی گائے نہیں پالی گئی تھی۔

وہ تمام کھیل تماشے ابھی تک نظروں میں پھرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے اچھا وقت ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ شمّو پھوپھی کے کُنبے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ایک روز وہ سب ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب مختلف مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ بھابھی یعنی محمدی خالہ کی بہونے پھوپھی سے کہا:

"اختر کے سوئٹر کا نمونہ بہت پیارا ہے۔ آپ میرے لیے ڈال دیجئے۔"

امیرہ اس وقت سو گئی تھی۔ کرائے داروں میں سے ایک خاتون جن کا نام قدسیہ تھا، دوپہر گزارنے ہماری طرف آگئی تھیں۔ ان کا سات آٹھ ماہ کا ایک لڑکا تھا، اس کی پیدائش کے وقت قدسیہ آپا کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اس بچّے سے قبل ان کے کئی بچّے جاتے رہے تھے۔ ان کے میاں باقر صاحب بہت نیک انسان تھے۔ ہر طرح بیوی کی دلجوئی کرتے اور جتنی دیر گھر میں رہتے، بچّے کی نگہداشت میں قدسیہ آپا کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ بھابھی کا دل قدسیہ آپا کے لیے بہت دُکھتا تھا۔ وہ اکثر ان کو اپنی طرف بلا لیا کرتی تھیں۔ امیرہ جہاں سو رہی تھی وہیں قریب میں قدسیہ آپا بیٹھی تھیں۔ نمونہ ڈالتے ہوئے پھوپھی باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ امیرہ کی جانب ان کی پشت تھی نیند پوری ہونے پر امیرہ جاگی تو شاید قدسیہ آپا نے اسے اپنا بچّہ سمجھ کر فوراً گود میں اٹھا کر دُودھ پلانا شروع کر دیا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بچّی کتنی دیر تک دُودھ پیتی رہی۔

شمو پھوپھی نے احتیاطاً بچّی کی طرف سے اطمینان کرنے کی خاطر مڑ کر جو دیکھا تو بچّی کو قدسیہ آپا کی گود میں دودھ پیتا دیکھ کر وہ جلدی سے اس طرف بڑھیں اور بولیں ـــــ

"ارے! آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔ بغیر اجازت بچّے کو کوئی دُودھ نہیں پلایا کرتا۔ یہ تو شرعی معاملہ ہے۔ کوئی مذاق نہیں!"

اتنے میں قدسیہ آپا کے بچّے نے بھی رونا شروع کر دیا۔ وہ اس کو گود میں لے کر ٹٹولتی ہوئی اپنے رہائشی حصّے کی طرف چل دیں۔ شمّو پھوپھی بہت سراسیمہ سی نظر آرہی تھیں۔ محمّدی خالہ اور بڑی اماں بھی حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تک رہی تھیں۔ کسی سے کچھ کہتے نہ بنتا تھا۔ تھوڑی دیر میں شمو پھوپھی امیرہ کو گود میں لیے پھر سے باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ محمدی خالہ اور بڑی اماں نماز کے لیے چلی گئیں۔ بھابھی نے وہیں بیٹھے بیٹھے بڑی بی سے کہہ دیا کہ وہ باہر بھی چائے بھجوا دیں اور اندر بھی لگا دیں۔

چائے کے بعد شمو پھوپھی نے گھر جانے کو کہا تو محمدی خالہ نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"واہ! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ آئے ہوئے دیر نہیں ہوئی کہ چلنے کے لیے

تیار ہیں۔ میں تم کو بغیر کھانا کھائے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جاتے ہی کھانے کے تردد میں پڑو گی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ امیرہ کو ایک بڑی اُبکائی آئی۔ وہ کانپ کانپ کر رونے اور بلکنے لگی۔ سب لوگ بہت پریشان ہو گئے۔ کسی نے پیٹ سینکا کسی نے ہینگ کا لیپ کیا۔ لیکن بچی کو کسی طرح چین نہ آیا۔ ثمو پھوپھی جلد ہی بچی کو لے کر ڈاکٹر کو دکھانے چلی گئیں اور اس روز ان لوگوں نے ہمارے یہاں کھانا نہیں کھایا۔

دوسرے روز معلوم ہوا کہ امیرہ کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ پیاری سی ننھی امیرہ اس منحوس بیماری کی نذر ہو گئی۔ ہم سب کو امیرہ کی موت سے بہت دھچکا لگا۔ پھوپھی کے گھر میں تو گویا سارے پھول مرجھائے ہوئے نظر آنے لگے۔ امیرہ کے بعد اختر کو بہت تیز بخار آیا جو اُن کی جان لے کر گیا۔ ثمو پھوپھی کو ان غموں سے گھن سا لگ گیا۔ ہر وقت کڑھتی رہتی تھیں۔ ان کی صحت گرتی چلی گئی۔ ذکیہ آپا ماں کی ہر وقت تشفی اور تیمارداری میں لگی رہتیں۔ بچوں کی دیکھ بھال میں وہ بھی ماں کی ہر وقت کی شریک رہتی تھیں۔ اختر اور امیرہ کی کمی اور ماں کی بیماری میں وہ اپنے آپ کو بالکل بھول بیٹھی تھیں۔ ہمیشہ سے نازک سی تھیں۔ ہر وقت ماں کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔ ایک روز صبح ہی صبح معلوم ہوا کہ ثمو پھوپھی کی طبیعت اچانک بہت بگڑ گئی ہے۔ سب لوگ ان کی مزاج پرسی کو گئے۔ شام تک وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے اپنے بچوں سے جا ملیں۔

پھوپھا انصار بہت ہی خاموش طبع انسان واقع ہوئے تھے۔ وہ شاید اندر ہی اندر سلگتے رہے اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ ان کے اوپر کیا بیت رہی ہے۔ وہ بھی خاموشی سے راہی ملک عدم ہوئے۔ ذکیہ آپا کا تو زندہ رہنا بہت ہی مشکل تھا۔ ان کو چھوٹے بھائی بہنوں کی جدائی نے ہی ڈھا دیا تھا پھر والدین کی موت نے اُن کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی، اور وہ بھی اس ظالم دُنیا سے رخصت ہو گئیں۔ تین سال کے قلیل عرصے میں اس خاندان نے ایسے ستم جھیلے جن کا ذکر ہی تکلیف دہ ہے۔

جب ثمو پھوپھی کریم آباد آئی تھیں تو امیرہ سوا مہینے کی تھی۔ اچھی تندرست بڑھتی ہوئی بچی یوں موت کی چپیٹ میں آ گئی۔ اختر کو شدید بخار آیا۔ والدین اور ذکیہ آپا مصیبت کی تاب نہ لا سکے۔

اس بھرے پُرے کنبے کے صرف دُو افراد باقی رہے۔ باقی سب کے سب ختم ہو گئے۔ میں ابھی تک اس اُمید میں ہوں کہ شاید کبھی ان سے ملاقات ہو جائے۔ ان کی خوبصورتی یاد کر کے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں وہ سب انسانوں کے رُوپ میں فرشتے تو نہیں تھے، کیوں کہ وہ لوگ فرشتہ خصلت بھی تھے۔

قدسیہ آپا کا وہ لڑکا جس کی پیدائش میں ان کی آنکھیں جاتی رہی تھیں زندہ رہ گیا۔ البتہ قدسیہ آپا کی آنکھوں کی روشنی واپس نہ آئی۔ اگر ان کے دُودھ میں کوئی خرابی تھی تو ان کا وہ بچّہ کس طرح زندہ رہ گیا۔ دُودھ کا اثر تو صرف امیرہ تک ہی ہو سکتا تھا۔ سارے خاندان کا ہمارے ذہن پر اپنی یادوں کا خاکہ چھوڑ کر صفحۂ ہستی سے مٹ جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

واللہ اعلم بالصواب۔

□□

غزلیاتِ آتش ۔۔۔ صفحہ ۲۵ کا بقیہ

۶ دیکھیے: (۱) کلیات شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی۔ مطبع محمدی لکھنؤ۔ طبع الاوّل مطبوعہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ / دوشنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۴۳ء ص ۲۳۴
(۲) انتخاب غزلیات ناسخ ص ۱۵۲

۷ بحوالہ: (۱) ناسخ۔ تجزیہ و تقدیر، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی۔ لکھنؤ فروری ۱۹۷۵ء ص ۲۸، ۳۶ تا ۳۹۔ (۲) انتخاب غزلیات ناسخ: مرتبہ کاظم علی خاں۔ یو، پی اُردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۱۵ تا ۱۶۔

۸ کلیاتِ سخن شیخ امام بخش ناسخ۔ مطبع محمدی لکھنؤ۔ طبع اوّل مطبوعہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ (مطابق دوشنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۴۳ء) ص ۷۶

۹ (کلیات) خواجہ حیدر علی آتش مطبع محمدی چوک لکھنؤ۔ مطبوعہ چہاردہم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۱ھ (مطابق ۲۱ مئی ۱۸۴۵ء) سے مثالیں مع حوالہ صفحات ملاحظہ ہوں۔

۱۰ ذکی علی خان ذکی لکھنوی کے حالات میری کتاب تلاش و تحقیق لکھنؤ مطبوعہ جولائی ۱۹۸۹ء (ص ۲۹۷ تا ۳۰۰، ص ۳۴۲ تا ۳۴۴) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "قاضی محمد عدیل عباسی"
مصنف: ڈاکٹر اختر بستوی   قیمت ۲۵/ روپے
ناشر: ساہتیہ اکادمی۔ رویندر بھون، ۳۵۔ فیروز شاہ روڈ
نئی دہلی۔۱

زیرِ نظر کتاب "قاضی محمد عدیل عباسی" ایک مونوگراف ہے جسے نامور شاعر نقاد اور ادیب ڈاکٹر اختر بستوی نے لکھا ہے اور جس کو "ہندستانی ادب کے معمار" سیریز کے تحت ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم مجاہدِ آزادی اور مجاہدِ اردو بھی تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بلند پایہ صحافی، نقاد اور ادیب بھی۔ آزادی سے قبل ان کی تحریر اور ان کے عمل کا سارا زور اپنے وطن کی آزادی کے لیے صرف ہوا اور آزادی کے بعد انھوں نے خود کو اردو زبان کے حقوق کی بازیافت کی پُر امن آئینی جدوجہد اور اپنے صوبے اترپردیش میں ابتدائی دینی تعلیم کے نظام کے استحکام کی کوششوں کے لیے وقف کر دیا۔ تصنیف و تالیف کا کام وہ زندگی کے ہر دور میں کرتے رہے۔ ان کی متعدد گراں قدر کتابیں آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں۔ قاضی صاحب کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالنے کے لیے ڈاکٹر اختر بستوی نے ساہتیہ اکادمی کے اس مونوگراف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے حصۂ اول کا عنوان "حالاتِ زندگی، شخصیت اور خدمات قوم و وطن" ہے۔ اس میں ان کی پیدائش کی تفصیلات اور خاندانی پس منظر کے ساتھ آزادی سے قبل کی ان کی زندگی کے وہ سارے اہم حالات و واقعات بھی پیش کیے گئے ہیں جو آزادیٔ وطن کے سلسلے میں ان کے مجاہدانہ کردار کو عیاں کرتے ہیں اور آزادی کے بعد کی موصوف کی ان خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے اردو اور دینی تعلیم کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ اس ضمن میں "دینی تعلیمی تحریک" کا ذکر خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے قاضی صاحب بانی تھے اور جس کی بدولت اترپردیش میں اُردو میڈیم کے ہزارہا آزاد و خودکفیل دینی مکاتب قائم ہوئے اور ان کی مرکزیت کا بھی انتظام ہوا۔ حصۂ دوم کا عنوان ہے "علمی و ادبی خدمات" اس میں قاضی محمد عدیل عباسی کی تحریروں کی قدر و قیمت انھیں چار زمروں میں تقسیم کر کے واضح کی گئی ہے۔ یہ زمرے ہیں، صحافت، ترجمہ، تاریخ اور ادب تنقید۔ مونوگراف کا یہ حصہ قاضی صاحب کی قلم کاری کے مختلف النوع نمونوں کی وسعت و منزلت کو بہت ہی عمدہ انداز میں اجاگر کرتا ہے اور ان کی شاہکار تصنیفات مثلاً "تحریکِ خلافت" اور "اقبال کا فلسفۂ حیات و شاعری" وغیرہ کی تاریخی اور ادبی اہمیت سے قاری کو بطرزِ احسن واقف کراتا ہے۔

اس مونوگراف کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس میں تسلسل کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ابتدا سے آخر تک تحریر ایسی مربوط ہے کہ پڑھنے والا اسے شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس کی ایک اور اہم خوبی زبان و بیان پر اس کے مصنف کی غیر معمولی قدرت ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی یونیورسٹی میں اُردو کے استاد بھی ہیں اور ایک کہنہ مشق شاعر و ادیب بھی، اس لیے انداز بیان کی سحر انگیزیوں پر انھیں زبردست تصرف حاصل ہے جس کا اظہار اس مونوگراف سے بھرپور طور پر ہوتا ہے۔

یہ مونوگراف اختصار میں جامعیت کے اظہار کا بہترین مظہر ہے۔ اس میں ڈاکٹر اختر بستوی نے جس طرح قاضی محمد عدیل عباسی کی زندگی اور ان کے کارناموں کے تمام پہلوؤں کا محدود صفحات میں احاطہ کیا ہے وہ انھی کے بس کی بات تھی۔

——— (پروفیسر) فاروق احمد صدیقی

نام کتاب: "موجِ سراب" (شعری مجموعہ)
شاعر: رہبر جون پوری   قیمت: ۵۰/ روپے
ملنے کا پتہ: ۴۲۴۔ این تھری۔ اے سیکٹر، گووند پورہ
بھوپال۔۲۳

"موجِ سراب" کے شاعر رہبر جون پوری اپنی عمر، خدمات، اور تجربات شعری کے لحاظ سے ایک مشاق اور عمیق مشاہدے کے فن کار ہیں اور ان کی حسیت کا آئینہ دار ہے کتاب میں موجود وہ انتساب جس کے حوالے سے انھوں نے بوسنیا کے مظلومین کو غم انگیز خراج پیش کیا ہے۔ کتاب بھوپال کی ایک ادبی تنظیم ادارۂ کاروانِ سخن کے زیرِ اہتمام ظہور میں آئی ہے۔ ان کے کلام میں قوم و وطن

کی پرچھائیوں والی سوچ موجزن ہے۔ وہ غزلوں کے اچھے شاعر تو ہیں ہی نظموں میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے آہنگ، اسلوب اور لفظیات میں (تضمینی محاسن کے باوصف) جابجا اقبال اور جوش جیسے شاعروں کی گرم خیالیاں رواں دواں ہیں، شاعری کے معاملے میں ان کے یہاں احتیاط فن اور زبان و بیان کی سلاست و نفاست خاصے کی چیزیں ہیں۔

بہت جامع مناجات اور خوبصورت نعت کے آغاز سے دعوتِ مطالعہ دیتی ہوئی اس کتاب میں "غبار باطل" (سلمان رشدی سے خطاب) "حرفِ انتشار" (تسلیمہ نسرین کے نام) اور "اردو" جیسی منظومات اپنی منفرد کشش رکھتی ہیں مزید برآں کئی نظمیں اور ایسی ہیں جو فراموش نہ کی جا سکیں گی۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی یہ رائے کہ "زبان پر دروبست کلاسیکی روایت سے کماحقہ واقفیت اور فنی رموز پر مضبوط گرفت کے ساتھ ساتھ ہمسفر زندگی کی پیچیدگیوں اور مشینی دور کے مسائل سے آگہی کے وافر ثبوت ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ مُشک وہ ہے جو آپ سے خود اپنے خوشبودار ہونے کا اعتراف کرالے۔" ان کے رشحاتِ فکر پر صادق آتی ہے۔

اپنے امتیازی رنگ و آہنگ کے ساتھ رہبر جون پوری شاعروں کے بھی پُرتاثیر شاعر ہیں اور جرائد کے سنجیدہ قارئین کے لیے بھی تحفۂ نگاہ ہیں۔ پختہ افکار کے شانہ بشانہ ان کے یہاں نئی علامتیں اور نئی سمتوں کے منظر نامے بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں ؎

تخلیق کسے کہتے ہیں، ہے عظمتِ فن کیا   آواز فروشوں کے لیے شعر و سخن کیا

کچے مکان اپنی تباہی پہ رو پڑے   کالونیوں میں جب نئے گھر کی ہوا چلی

اگر چراغِ تغزل کہیں پہ روشن ہے
تو میرا نام غزل کی جبیں پہ روشن ہے

۱۹۸۸ء میں ان کا پہلا دیوان "آوازۂ زنجیر" شائع ہوا تھا جس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ ۱۹۹۷ء کا یہ مجموعہ بھی اپنے گٹ اپ، طباعت اور آراستگی کے اعتبار سے بہترین ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ بے کم و کاست "موجِ سراب" ایک اچھی کتاب ہے۔ اسے لائبریریوں میں مقام ملنا چاہیے۔ ——— تسنیم فاروقی

نام کتاب: "قندیل" (شعری مجموعہ)
شاعر: احسان جعفری   قیمت: ۷۲/- روپیے
ملنے کا پتہ: گجرات اردو بورڈ، ۱۹۔ گلمرگ سوسائٹی، چمن پورہ
——— احمد آباد۔ ۱۶

قندیل احسان جعفری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو بیشتر غزلوں، چند نظموں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ احسان جعفری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل اردو کی وہ صنف ہے جو اپنی مستحکم روایات کے ساتھ اپنے، بیگانوں دونوں سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے۔ اس نے یہاں تک وسعت حاصل کر لی ہے کہ حیات و کائنات کی پہنائیاں اس میں سمٹ آئی ہیں۔

ہمارے وہ شعراء واقعی داد و تحسین کے حق دار ہیں جو دور دراز علاقوں میں بھی، جہاں اردو کا چلن برائے نام ہے، اردو شاعری کی قندیل روشن کیے ہوئے ہیں۔ احسان جعفری بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں جو گجرات جیسے اردو کے بنجر علاقے میں گیسوئے سخن سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ شروع سے ہی مزدور تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے محنت کشوں اور غریبوں کے دکھ درد اور ان کے مسائل کو قریب سے دیکھا ہے اور زندگی کی تلخیوں اور فرقہ واریت کے المناک مظاہر سے بھی ان کا سابقہ پڑا ہے جس کا عکس ان کی شاعری میں صاف نظر آتا ہے۔ ان کے شعروں میں صفائی بھی ہے اور سادگی بھی، جذبے کی گرمی بھی ہے اور زبان و بیان کی دلآویزی بھی۔ ان کا اسلوب صاف ستھرا اور عام فہم ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

حق کی کشتی کو ہے درکار لہو کا دریا
ابنِ حیدر کوئی میداں میں اتارا جائے

یوں مسیحاؤں کے در سے ہر سُو   دی جو دستک تو ستم گر نکلے

ہر ستم ظالم کا ہم سہتے رہے   بات جو کہنی تھی ہم کہتے رہے

مجروح سلطان پوری ان کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"احسان جعفری نے روایت کا احترام کیا ہے مگر اس کے ہو نہیں رہے درایت و جودت سے کام لیتے ہوئے اپنا ہر بات پر انفرادیت کی مہر لگاتے چلتے

ہیں اور آپ کی شاعری اس سطح سے ہرگز نیچی نہیں ہے جسے معیار کہتے ہیں"۔
احسان جعفری نے اگر اسی طرح اپنا شعری سفر جاری رکھا تو وہ بہت جلد ارباب نظر کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔

———— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: "ترچھے راستے"
مصنف: سید معین اشرف   قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ دہلی، بمبئی، علی گڑھ

سید معین اشرف کی حیات و شخصیت بڑی ہمہ گیر ہے۔ آبائی سلسلے سے آپ خانوادۂ اشرفیہ کچھوچھہ شریف کے چشم و چراغ ہیں۔ ماضی قریب کی ایک برگزیدہ شخصیت سید شاہ عبدالحی اشرف سجادہ نشین آستانہ مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھہ شریف، آپ کے سگے عم زاد تھے۔

سید معین اشرف لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد ملک کی تقسیم سے پہلے کناڈا چلے گئے، وہاں کے سول سروسز امتحان میں انھوں نے کامیابی حاصل کی اور اس ملک کے اعلا ترین عہدوں پر فائز رہے اور وہیں کی شہریت اختیار کر لی۔ اگرچہ زندگی کی نصف صدی مغربی ممالک کے ماحول میں گزری مگر چونکہ علمی و ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا اس لیے اس کی جلا و تسکین کے لیے متاع لوح و قلم سینے سے ہمیشہ لگائے رہے۔

زیر نظر کتاب "ترچھے راستے" سید معین اشرف کے ۱۲ افسانوں اور ایک عدد خاکے کا مجموعہ ہے۔ ان کے یہاں افسانہ نگاری کی خداداد صلاحیت موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں حسنِ بیان اور تہذیب و شائستگی کا زبردست مظاہرہ ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے توسط سے مشرق و مغرب کے تہذیبی اور اخلاقی اقدار کے پس منظر میں کرداروں کی نفسیات و عادات اور خصائل کو خوبصورت زبان و بیان اور منفرد اسلوب میں پیش کیا ہے۔

معین اشرف کے انداز نگارش میں شگفتگی اور ندرت ہے زبان نہایت صاف، شستہ اور سلیس ہے، ان کے افسانوں میں مزاحیہ عناصر غالب ہیں جو قاری کو زیر لب تبسم کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ "ترچھے راستے" کے سبھی افسانے ایک لطفِ خاص رکھتے ہیں اور مشرق و مغرب کے ثقافتی رشتوں کے تضادات کو نہایت دلپذیر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے سارے افسانوں میں ایک مرکزی کردار "جعفری" حاوی نظر آتا ہے۔ کتاب میں مشاہیر اہلِ قلم کی آرا بھی موجود ہیں۔ پروفیسر منظر عباس نقوی (شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"معین اشرف کی ان تحریروں میں آپ کو کہانی کا ایک نیا رنگ و آہنگ ملے گا، ایک ایسا موضوع اور ماحول جس سے ہمارا افسانوی ادب پہلی بار متعارف ہوا ہے جن میں ایک فطری اور بے تکلف اسلوب کی تازہ کاری بھی ہے اور ایک جدید تعلیم یافتہ "یورپیے" کی گل افشانیٔ گفتار بھی اس کے ساتھ ہی بیشتر کہانیوں کے مرکزی کردار جعفری کے وسیلے سے اس مضحکہ خیز صورت حال کا بیان بھی جو دو مختلف تہذیبوں کے ملاپ اور ٹکراؤ سے ناگزیر طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور جس کے تجربے مصنف کو اپنے قیام یورپ و امریکا کے دوران خوب خوب ہوئے ہیں"۔

"ترچھے راستے" صوری و معنوی دونوں اعتبار سے معیاری ہونے کی بنا پر یقیناً اردو کے افسانوی ادب میں ایک لائق تحسین اضافہ تصور کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر) آفاق فاخری

نام کتاب: "خراجِ حیات"
مصنف: سید محسن نقوی   ترتیب: مرزا شفیق حسین شفق
ملنے کا پتہ: 'لوح و قلم' قصر شکیل۔ قصبہ سانکھنی۔ بلند شہر
قیمت: ۲۵/ روپئے

زیر تبصرہ کتاب "خراجِ حیات" اردو کے خوش فکر شاعر سید محسن نقوی کے پانچ مضامین، علامہ عرفان حیدر، سید محمد جابر باقری صاحب، مولانا سید آغا روحی صاحب، غضنفر عباس صاحب، جعفر عسکری صاحب جیسی ادبی و دینی شخصیتوں کی گراں قدر تقریظوں نیز نامور شعراء کے منظوم نذرانۂ عقیدت پر مشتمل ہے۔

محسن نقوی بیک وقت شاعر، صحافی، خطیب، نثر نگار اور مصلح قوم تھے ان کی شعری فضا ذکر اہلِ بیتؑ اور کردارِ حسینی سے رچی بسی ہے۔ بحیثیت شاعر جس طرح ان کی فکر میں ندرت، لفظوں کے تصرف میں انفرادیت اور تخیل کی پرواز جداگانہ پائی جاتی ہے اسی طرح نثری ادب میں بھی ان کا امتیازی مقام ہے

مرزا شفیق حسین اپنے ابتدائیے میں ایک مقام پر ان کے متعلق یوں رقمطراز ہیں :

"ان کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور بلند تھا ، ان کو زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی ۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا لیکن باختلاف تنوع عبارت روانی میں فرق نہیں ہے ۔ ان کی تحریروں میں نفاست نزاکت اور الفاظ کے انتخاب کی جو شان پائی جاتی ہے وہ موجودہ دور کے نثر نگاروں کے یہاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے ۔ ان کے طرزِ تحریر کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ چاہے جملے طولانی ہوں مگر توازن اور تسلسل میں فرق نہیں آنے پاتا ۔ ایک جملے کے بعد دوسرا بھی اسی انداز سے آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عبارت میں اتنا ربط ہوتا ہے کہ ذرا بھی آپ ترتیب میں فرق نہیں ڈال سکتے ۔ اگر ایک لفظ کو اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا چاہیں تو تمام عبارت کے بے ربط ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔"

مرزا شفیق حسین نے ان کے مضامین کو مرتب کر کے نثری ادب میں ایک اہم اضافہ کیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ "خراجِ حیات" ادبی اور علمی حلقوں میں حیاتِ دوام پائے گا ۔ کتاب مجموعی طور پر نہایت پرکشش ہے ۔

———— ارشاد امروہوی

نام کتاب : "جذب و فکر" (تصوف)
مصنف : ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی ، قیمت درج نہیں ،
ملنے کا پتہ : کتب خانہ انوریہ ۔ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ ، کاکوری لکھنؤ

زیرِ نظر کتاب "جذب و فکر" ڈاکٹر مسعود انور علوی ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بصیرت افروز مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ۔ اپنے عنوان کی بھرپور عکاسی کرنے والے اس مجموعے میں جذبے کی محسوس کی جانے والی لہریں بھی ہیں اور فکر کی گہرائی اور گیرائی بھی ۔ سب سے پہلے جو چیز حد درجہ متاثر کرتی ہے وہ مصنف کے سلسلے میں لکھے گئے مقدمے میں پیرِ طریقت خواجہ سید حسن ثانی نظامی کے الفاظ ہیں جن میں پنہاں خلوصِ دل نمودِ صبح کی طرح جھلک رہا ہے ۔ ڈاکٹر مسعود انور نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن پر کچھ نہیں لکھا گیا یا بہت کم لکھا گیا ہے ۔ انھوں نے جن مقالات کا انتخاب کیا ہے وہ بڑے معلومات افزا بھی ہیں ۔ نکھری ، ستھری عالمانہ عبارت میں شوخی بھی موجود ہے اشعار کی متصوفانہ تشریح میں معنی کا ایک جہانِ صد رنگ نظر آتا ہے ۔

خوبصورت کتابت اور طباعت سے آراستہ یہ کتاب لائقِ پذیرائی ہے ۔

———— سہیل کاکوروی

نام کتاب : "مدینے سے کربلا تک" (سفرنامہ)
مصنف : عسکری رضا زیدی سلطان پوری ، قیمت : ۱۰۰/- روپئے
ملنے کے پتے : دانش محل ، امین آباد ۔ (۲) امامیہ مشن عبدالعزیز روڈ (۳) عباس بک ایجنسی ۔ درگاہ حضرت عباس لکھنؤ

عسکری رضا زیدی سلطان پوری چند سال قبل اپنی والدہ اور ضعیف العمر خالہ کے ہمراہ عمرہ اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے گئے تھے ۔ واپسی پر انھوں نے اپنی آپ بیتی کو "مدینے سے کربلا تک" کے عنوان سے کتابی شکل میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع کرایا ۔

۲۳ ، ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مکۂ معظمہ ، مدینہ منورہ ، جنت البقیع نجف ، کربلا ، کوفہ ، سامرہ (کاظمین) ، مشہد ، قم اور دمشق وغیرہ کے مقاماتِ مقدسہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب حج بیت اللہ ، عمرہ اور زیارت کی غرض سے جانے والوں کے لیے کارآمد گائڈ ثابت ہو سکتی ہے ۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے بے حد سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ میں جیسا دیکھا ، جو کچھ دیکھا ، اسے بیان کر دیا ۔

مصنف اور ان کے ہمراہیوں کو اس سفر میں کیا دشواریاں پیش آئیں ، کہاں اور کب ہمت چھوٹ گئی اور کس طرح دستِ غیب نے مدد کر کے ہمت بندھائی ، ان سب کا تفصیلی ذکر اس میں موجود ہے ۔ یہ معلوماتی کتاب دراصل ایک نادر تحفہ ہے جسے یقیناً ادب و احترام کے ساتھ قبول کیا جائے گا ۔

———— واصف اعظمی

"ہم کو اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے ۔
سرزمینِ ہند پر ہمارا پورا حق ہے
اور جب تک ہندوستان کی سرزمین پر ایک بھی
ہندوستانی زندہ باقی ہے ہمارا یہ حق قائم و دائم
رہے گا ۔"
———— سبھاش چندر بوس

جلد ۵۲ شمارہ (۱۲)

عنوانات

اپنی بات

اُردو شعر و ادب کی صورتِ حال' اب یہ ہے کہ افسانہ علامتی اور تجریدی اظہار سے سادگیِ بیان کی جانب لوٹ آیا ہے۔ شاعری بھی گنجلک ابہام کے حصار سے نکل آئی ہے، اسی لیے تنقید میں جدیدیت کے بعد کیا' کی بحث چل پڑی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ افسانے کی واپسی کے بعد' اس کی حقیقی صورتِ حال اب کیا ہے؟ افسانے کی زبان اور اسلوب کی وہ کون سی خصوصیات ہیں، جن کی بنا پر اب اس کی شناخت ہوگی؟ اور اب افسانے میں کون سے نئے نام نمایاں ہوئے یا ہو رہے ہیں؟ اسی طرح شاعری کا تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ شاعری میں کون سے نام اُبھرے یا اُبھر رہے ہیں؟ پوری غیر جانب داری کے ساتھ نئے ناموں کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ہمارے ناقدین یا دانش ورانِ ادب نئے لکھنے والوں کی تخلیقات پڑھتے بھی ہیں؟ اس سوال کے جواب میں جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ حوصلہ افزا نہیں بلکہ مایوس کُن رہی ہے۔ کیوں کہ ہمارے ناقدین یا دانش ورانِ ادب نئے لکھنے والوں کو نہیں پڑھتے اور پڑھتے بھی ہیں تو ان کے بارے میں کوئی رائے دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ کبھی رائے دیتے بھی ہیں تو وہ اتنی غیر واضح ہوتی ہے کہ اس سے نئے لکھنے والوں کی نہ کوئی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ رہنمائی ـــــ پتہ نہیں نئے لکھنے والوں کے سلسلے میں اُن کا وہ کون سا ریزرویشن ہے، جو مستقل ایک رویّہ بنتا جا رہا ہے۔ زیادہ تر ناقدین اور دانش ور نئے لکھنے والوں کو (جن کی تعداد اور امکانات دن بہ دن کم ہوتے جا رہے ہیں) لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ بس یہی رونا رویا کرتے ہیں کہ نئے لکھنے والوں کو نہ فن آتا ہے نہ زبان ـــــ اگر ایسا ہے بھی تو انھیں فن اور زبان سے واقف کرانے کی ذمّہ داری کس کی ہے!

جدیدیت سے پہلے یہ ہوا کہ ہر تخلیق میں مزدور اور کسان ڈھونڈا جاتا تھا۔ پھر اظہارِ ذات کا ہجّہ چلا، جس کے تحت ابہام پر زور دیا جانے لگا۔ فرد کی تنہائی اور کرب کی تصویر کشی گویا لازمی ہو گئی۔ ۱۹۷۵ء میں جدیدیت کے علمبردار ایک رسالے نے ایک نئے لکھنے والے کا افسانہ یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ "اس کا اختتام واضح ہو گیا ہے" ـــــ یعنی اس رسالے میں چھپوانا ہو تو اس کے اختتام کو مبہم بنایا جائے۔

جدیدیت سے پہلے بھی یہی ہوا کہ ہر تخلیق اور تخلیق کار کو ایک مخصوص عینک سے دیکھا گیا۔ جدیدیت کے علمبرداروں نے بھی یہی کیا کہ ایک مخصوص اندازِ فکر سے ہر تخلیق اور تخلیق کار کو دیکھا، اور جسے اس اندازِ فکر سے ہم آہنگ پایا، اسی کو وقیع جانا ـــــ کیا یہ ادبی اور تخلیقی ایمان داری ہے ـــ؟

اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ـــــــــ شاہ نواز قریشی

غزل

آخر وہ اضطراب کے دن بھی گذر گئے — جب دل حریفِ آتشِ قہر و عتاب تھا
جاں دوستوں کی چارہ گری سے لبوں پہ تھی — سر دشمنوں کی سنگ زنی سے عذاب تھا
دامن سگانِ کوئے ملامت سے تار تار — چہرہ خراشِ دستِ جنوں سے خراب تھا
وہ قتل پر بضد تھے ہم افشائے قتل پر — اُن کی نظیر تھی نہ ہمارا جواب تھا
در پردہ جامِ زہر پلانے کی فکر تھی — ظاہر میں ذکرِ شاہد و شمع و شراب تھا
کچھ پھول، کچھ نسیمِ بہاراں، کچھ آبشار — کیا رنگِ ہمکلامی و طرزِ خطاب تھا
ہر بات صوفیوں کی طرح پیچ و خم لیے — ہر لفظ شاعروں کی طرح انتخاب تھا
ہر جلوہ ایک دفترِ آشوبِ روزگار — ہر غمزہ علمِ فتنہ گری کی کتاب تھا
خوابیدہ ہر نظر میں بنائے فسادِ خلق — پوشیدہ ہر روش میں نیا انقلاب تھا
وہ مسکرا کے دل پہ گراتے تھے بجلیاں — ایسی عنایتوں کا بھلا کیا جواب تھا

آج اس غزل میں ہم پہ قیامت گزر گئی
کیا گرمیِ خیال تھی کیا التہاب تھا

پروفیسر وارث کرمانی
دیویٰ - بارہ بنکی

علی جواد زیدی
۱۹/۲۳ وشواس کھنڈ ۲، گومتی نگر، لکھنؤ

یادوں کی رہگزر

(۱۵)

نام

عام طور سے "چھٹی" کو یا پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ ان کی تفصیلات میں آپ کو الجھانا نہیں چاہتا لیکن بچوں کی زندگیوں میں اس کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اسی دن نومولود کو ایک نام عطا کیا جاتا ہے۔ ویسے تو پیدائش کے پہلے ہی عزیز اور دوست سوچنے لگتے بلکہ آپس میں گفتگو بھی کرنے لگتے تھے کہ اگر لڑکا ہوا تو یہ نام رکھنا اور لڑکی ہوئی تو یہ۔ بے کاری کے یہ کام ایک مسرت آمیز مشغلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں مائیں شرم کے مارے ان مشوروں میں شریک ہی نہیں ہوتی تھیں، لیکن اس خوشی بھرے، دل چسپ مشغلے کی خبریں سن سن کر خوش ضرور ہوتی تھیں۔ نومولود اس کے لیے خوشیوں کا ایک پورا سلسلہ اپنے ساتھ لاتا تھا۔ ماں ـــ جس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ اپنی مشکلیں، تکلیفیں، ذمہ داریوں کے بوجھ، سب کچھ بھول کر اس آنے والے انسان کی تعمیر و تربیت کی خوشیوں میں محو ہو جاتی تھیں۔ کچھ مہینوں بلکہ برسوں کے لیے وہی اس کی محبّتوں اور شفقتوں کا واحد مرکز بن جاتا تھا۔ اُنھیں میں اِس نومولود کا نام بھی شامل تھا۔

وہ جو شیکسپیر کے حوالے سے کہا جاتا تھا کہ "نام میں کیا دھرا ہے" صرف حاشیائی سچائی تھی۔ نام میں بہت کچھ دھرا ہے۔ اس کے پیچھے ایک روایت ہے، ایک وراثت ہے، کچھ معتقدات ہیں، کچھ رسمیات اور کچھ توہمات ہیں۔ کچھ نسلی اور نسبی مختارات ہیں اور علم یا جہل کے عطیات ہیں۔ پہلے معتقدات کو لے لیجیے، جس مذہب میں مولود پیدا ہوا ہے اس کے عظیم بزرگوں سے عقیدت کا اظہار ان ناموں کا مقصود ہے۔ یہاں گفتگو اپنی ذات تک محدود رکھتے ہوئے ہمارے یہاں جو نام رکھے جاتے تھے، ان میں اللہ، رسولؐ، ائمۂ اطہار، اصحابِ کبار سے عقیدت و توسّل کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً عبداللہ، عبدالعلی، عبدالعلیٰ، غلام محمد، یا پھر: علی امام، حسن مجتبیٰ، مرتضیٰ، مصطفیٰ، وارث علی، ندیم محمد اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ بعض اوقات دو نام ملا دیے جاتے تھے جیسے: حسن علی، محمد حسین، محمد علی۔ بچیوں کے نام خدیجہ، آمنہ، سیّدہ، فاطمہ، زینب، کلثوم، زہرا وغیرہ۔ زمانے نے کروٹ لی تو بعض حضرات نے سوچا کہ پُرانے نام دہرانے کے بجائے نئے نام ہونا چاہئیں۔ اب مرتضیٰ، شہریار، بدرِ عالم سے خورشید الاسلام اور اختر الایمان تک نوبت آ پہنچی اور ملّایانِ مدارس چلّاتے ہی رہ گئے کہ موخر الذکر دونوں نام قواعد کے رو سے دُرست نہیں۔ جب رَو چل پڑتی ہے تو رُکتی نہیں۔ بعض سادہ لوح طبقات ان جھنجھٹوں سے دُور رہ کر کوئی سادہ سا نام یومِ پیدائش یا ماہِ ولادت سے اخذ کر لیا کرتے تھے، مثلاً رمضانی یا جمعراتی۔ میں بھی پنجشنبہ یعنی جمعرات کو پیدا ہوا۔ یہ اتفاق ہے کہ میں ایسے احاطوں سے باہر پیدا ہوا اور "جمعراتی" ہونے کے اعزاز سے محروم رہ گیا۔ پھر ایک رو چل پڑی۔ بڑی ہستیوں کے نام رکھنے کی۔ مثلاً جب نظام حیدرآباد کے یہاں شاہی خاندانوں کی دو بہوئیں بیاہ کر آئیں تو بہتوں نے اپنی بیٹیوں کے نام "دُرِّ شاہوار" اور "نیلوفر" رکھ دیے۔ کچھ صاحبزادوں کے نام "ابوالکلام" پڑ گئے۔ یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔

یادوں کے توسنِ تیز گام کی لگام کھینچتے ہوئے رُخ اپنے گھر کی طرف موڑتا ہوں۔ میرے پردادا کا نام سید محمد جواد جواد تھا۔ اچھے عالم اور فارسی کے شاعر تھے، تحصیل دار بھی ہو گئے تھے۔ طویل عمر پائی۔ گھر بھر کو عزیز تھے اور سب کے لیے محترم۔ جب میں پیدا ہوا تو دادی مرحومہ نے کہا کہ میرا نام علی جواد رکھا جائے کہ باعثِ برکت ہو، نام پیدا کرے اور طول عمر ہو۔

پردادا مرحوم کے زمانے سے یہ تجویز ہوئی کہ اب نام باعتبار قرانی

رکھے جائیں اور فوراً اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔

میرے دادا کا نام سید علی حمّاد رکھا گیا۔ وہ بھی عربی و فارسی کے عالم اور شاعر تھے۔ حمّاد ہی تخلص کرتے تھے۔ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ ایرانی فلٹ کی سیاہ ٹوپی، بڑی موری کا پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے۔ بڑی شان دار داڑھی تھی اور مونچھیں بھی اسی کے تناسب سے لیکن شرعی حدود کے اندر۔ دیندار اور شریف النفس تھے فریضۂ حج بھی ادا کر چکے تھے سب سے پیار محبّت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے ہمارا گھر ڈپٹی صاحب کا گھر کہلانے لگا تھا مرحوم کے چھوٹے بھائی میر علی عُبّاد صاحب مرحوم بھی عابد و زاہد تھے لیکن داڑھی نہ رکھتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ یہ بھی حج کر آئے تھے۔

ان بزرگوں کے بعد اسی قافیے میں نام رکھے جانے لگے۔ میرے چچا علی الترتیب سید حسن امداد، سید زین العباد، سید علی اِسعاد تھے اور والد مرحوم سید علی امجاد افسر — مرحوم شاعر بھی تھے اور داغ کے اتباع میں غزلیں کہتے تھے۔ میرے چچازاد بھائیوں کے نام سید حسن ارشاد (ڈسٹرکٹ جج)، مولوی سید علی اصفاد، سید علی مُنقاد تھے۔ میرے نام کے سلسلے میں دادی مرحومہ کی تجویز نے قوافی کا سلسلہ ہی نہیں توڑا بلکہ ایک ہی نام کی تکرار ہو رہی تھی لیکن مرحومہ کے جذبات کا خیال کر کے یہ بات مان لی گئی۔ دادا مرحوم کے انتقال کے بعد وہ اب بزرگِ خاندان بھی ہو گئی تھیں، پھر ان کے جوان فرزند سید علی اسعاد کا یکایک انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے پہلے پوتے کے لیے اپنے خسر معظم کا نام تجویز کیا کہ اس کی برکت سے بڑی عمر پائے گا۔ ان کی نیک نیتی سے ان کی اس خواہش کو حسنِ قبول بھی ملا۔ یہ اور بات ہے کہ قدرت نے ایسی زندگی دی جس میں ملازمتِ سرکارِ انگلسیہ کی بجائے اس کے خلاف جہاد لکھا تھا

؎ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

میں اپنی زندگی سے خوش ہوں کہ ایسا کام انجام دے سکا۔

ناموں کی تازہ روایت سے انحراف میری ذات تک محدود رہا۔ اور بھائی سجّاد، بنیاد، اعتماد اور اعتقاد بدستور پابند قوافی رہے۔ میرے نام کے سلسلے میں قباحت یہ آ پڑی کہ عام رواج کے مطابق عورتیں اپنے خسر، شوہر یا سسرالی بزرگوں کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ابھی تو میری پردادی یعنی دادی اماں زندہ تھیں وہ اپنے شوہر کا اور دادی جان اپنے خُسر کا نام کیسے لیتیں؟ ایسی ہی الجھن ہماری پھپھیوں وغیرہ کو بھی تھی۔ عورتوں نے مشورہ کر کے میرا نام "پیارے" رکھ لیا۔ لیکن یہ عرفیت صرف عورتوں تک ہی رائج رہی۔ غرض میرے علاوہ ناموں میں قافیے کی پابندی کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ چند ناموں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس سلسلے کے دوسرے ناموں کا اندازہ ان ناموں سے لگایا جا سکتا ہے: نقّاد، اتحاد، وداد، مُراد، شمشاد، اعتماد، ایجاد، شہزاد، احفاد، اولاد وغیرہ۔ آہستہ آہستہ شگفتہ قوافی ختم ہونے لگے۔ بعض اوقات لغتوں اور قصائد کے مجموعوں کے اوراق پلٹے جاتے۔ کبھی کبھی ناموں کی تلاش میں قریبی احباب بھی رضا کارانہ شامل ہو جاتے۔ روایت ہے کہ ایک صاحب نے جن سے دوستانہ نوک جھونک چلتی رہتی تھی، ایسے ہی ایک موقع پر مزاحاً اَوراد و وظائف کی کتاب "زاد المعاد" کا نام پیش کر دیا اتفاق سے انھیں دنوں اُن کے یہاں بچّی پیدا ہوئی تھی۔ ان کو فی البدیہہ جواب مل گیا کہ "آپ کی بچّی کے لیے بھی اسی روایت کی تاسّی میں دینیات کی ایک کتاب کا نام مل گیا ہے "تحفۃ العوام!" وہ حضرت جھینپ کر رہ گئے۔

میرؔ کے بہتّر نشتر

ہمارے اطراف میں ایک رسم یہ ہے کہ عقیقے میں بچّے کے ہاتھوں میں کوئی قیمتی چیز دی جاتی ہے۔ مجھے قلم دیا گیا۔ معلوم نہیں یہ کس کی فکرِ عالی کا نتیجہ تھا، لیکن اس شگونِ نیک نے میری قسمت کی راہ متعین کی۔ میری آپا بھکن بہو، جو اماں جان کی بھی آپا رہ چکی تھیں اور جو مجھ پر جان چھڑکتی تھیں، کہتی تھیں کہ میں بچپن میں قلم دوات ہی کا کھیل کھیلا کرتا تھا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ کوئی کھیل نہیں بلکہ بڑا ریاض چاہتا ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ میرے اس شوق کو ماحول سے بڑی مدد ملی۔ گھر پر بھی اور ننہال میں بھی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ ان میں ادبی اور علمی کتابیں بھی تھیں۔ علمی چرچے برابر کانوں میں پڑتے اور بوڑھے اور جوان پابندی سے مطالعۂ کتب میں مصروف رہتے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بھی مطالعہ کا شوق ہوا۔ جو کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتیں ان میں میرؔ کا کلیات بھی تھا۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ یاد یہ ہے کہ مختلف حضرات نے میرؔ کے "بہتّر نشتر" تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہتّر نشتر کی بات کسی نے کلامِ میرؔ کی عام نشتریت کو واضح کرنے کے لیے استعارۃً کہی ہوگی۔ یاروں نے اُسے لفظی معنوں میں لیا اور ایسے شعروں کی تلاش شروع کر دی جن میں زیادہ نشتریت ہو۔ ہر شخص نے ایک الگ نشان

بنایا۔ کسی نے صاد (ص)، کسی نے چلیپا (+)، کسی نے نظری کا نشان (ﻇ) کسی نے صحیح (صح)، کسی نے دُہرے صحیح (صح صح)، کسی نے مختصر دائرہ (٥)، کسی نے منتخب کی علامت (م) اور کسی نے دُہرے صاد (صص) وغیرہ۔ غرض کلیاتِ میرؔ کے حواشی ان نشانات سے بھر گئے اور بہتر کیا سیکڑوں شعر انتخاب میں آگئے۔ سب نے اپنے اپنے خیال کے مطابق نشتر ڈھونڈے تھے، کچھ بہت تیز، کچھ کند، کچھ ٹوٹے ہوئے نشتر یکجا ہو گئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، میں نے بھی طبع آزمائی کی لیکن مہم سر نہ کر پایا۔ اس انتخاب کو دیکھ کر جو شعر ذہن میں کوندے کی طرح لپکا وہ تھا ؂

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

کلیات و دواوینِ میرؔ و غالبؔ و میر حسنؔ و آتشؔ و ناسخؔ و سوداؔ کے علاوہ مراثی و سلام و نعت و قصائد کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا اور جستہ جستہ میں اپنی استعداد کے مطابق ان سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع تھا جب میں ان شعراء کو سمجھنے کی پوری صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس "گفتگوئے معترضہ" کے لیے معذرت نہیں کروں گا، کیونکہ عقیقے کا تعلق بسم اللہ سے مربوط ہے!

بسم اللہ

"بسم اللہ" کی باضابطہ رسم پانچویں برس انجام پائی۔ قصبہ محمد آباد گہنہ کی آبادی کے باہر، دریائے ٹونس کے ساحل پر ایک قدیم امام باڑہ واقع ہے، اس کی ایک بے سقف مسجد میں جس کی عمر ساڑھے پانچ سو سال ہو گی، یہ تقریب منعقد ہوئی۔ اس سادہ تقریب میں صرف اہلِ خاندان اور بہت ہی عزیز دوست شریک ہوئے۔ ایک سرخ رنگ کے چمکدار کاغذ پر زرّیں حروف میں لکھے ہوئے الف بائے بغدادی اچھی خطاطی کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ یہ میرے سامنے تھا۔ مجھ سے پہلے "بسم اللہ" کہلایا گیا اور پھر:

رَبِّ يَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَيْرِ

(اے پالنے والے! آسانی پیدا کر اور کمی نہ کرنا اور خیر سے ختم کرنا) کا ورد کرایا گیا۔ پھر رک رک کر ایک ایک حرف پڑھایا گیا۔ میں طالب علمانہ سنجیدگی سے پڑھتا چلا گیا۔ حاضرین نے والد اور بزرگوں کو مبارک باد دی، پھر امرتیاں تقسیم ہوئیں۔ ہمارے قصبے کی امرتیاں دور دور مشہور تھیں۔ یہاں کے حلوائی تھال کے برابر امرتیاں بنا لیتے تھے جو خوش مزہ بھی ہوتی تھیں اور خوش رنگ بھی۔ اب یہ امرتیاں بھی افسانہ بن چکی ہیں۔ اس پوری رسم کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی تھا کہ میں رسمی بسم اللہ کے پہلے ہی پورا قاعدہ بغدادی سبے قاعدہ ختم کر کے قرآنِ مجید کا تیسواں پارہ پڑھنے لگا تھا۔

اماں جان نے مجھے پہلے انگشتِ شہادت اٹھا کر "اللہ ایک" کہنا سکھایا۔ اسی استادِ اوّل نے نماز یاد کرائی اور اصولِ دین و فروعِ دین یاد کرائے۔ "بسم اللہ" کے بعد مولوی صاحب کا باضابطہ تقرر ہوا (نام اب یاد نہیں آ رہا ہے)۔ انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کا ننھا طالبِ علم ان کے ابتدائی کام کو بہت کچھ آسان کر چکا ہے۔ سنہ یاد نہیں لیکن غالباً ذی الحجہ کا مہینہ تھا کیوں کہ جلد ہی محرم آگیا اور ہم لوگ کرہان چلے گئے۔ وہاں عنایت خاں کے ایک عزیز ملّا ناصر محرم کی طویل چھٹیوں میں وثیقہ عربی کالج فیض آباد سے گھر آجاتے اور تدریس کی ذمہ داری انھیں سونپ دی جاتی تھی۔ وہ ننہال والوں کی رعایا تھے اور ان کے گھر والے ہمارے یہاں پشتوں سے ملازم تھے لیکن ملّا ناصر صاحب بڑے خود دار لوگوں میں تھے۔ انھوں نے کبھی معاوضہ نہیں لیا اور نہ ہمارے گھر پر تعلیم دینے آئے بلکہ اصرار کیا کہ ہم لوگ ان کے گھر جاکر پڑھیں۔ وہاں ہمیں تخت پر نہیں بلکہ زمین پر کھجور کی بنی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ علم اور جاگیرداری میں سمجھوتہ کر کے ان کی شرطیں مان لی گئیں۔ ملّا ناصر کے ہاتھ میں ایک قمچی ہوتی تھی جو ان کی زبان سے زیادہ چلتی۔ کوئی آموختہ بھولا یا سُنانے میں رکا اور یہ قمچی ہوا میں لہرائی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک بار ان کی قمچی سے میں بھی نوازا گیا ہوں۔ میں بھول نے یا رکنے والا طالبِ علم تو تھا نہیں لیکن مجھ پر یہ الزام لگا کہ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوں اور کسی بات پر مسکرا بھی دیا تھا۔ اس زمانے میں استاد واجب التعظیم تھا اور اس کی مار کا منتر نہ تھا لیکن ان کی سرزنشوں کا میں اپنے کو مستحق نہیں سمجھتا تھا اور جب تک وہ حیات تھے ان کا تصوّر کر کے میرے ذہن میں بغاوت کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ اگر اس وقت طلباء کی کوئی تحریک موجود ہوتی تو ملّا صاحب کا مقدمہ بار بار پیش ہوتا!

وطن میں میں نے دو ایک اور بزرگوں سے بھی پڑھا ہے۔ سب سے آخری مولوی جن کو میں کبھی بھول نہیں سکتا، مولوی سید محمد تقی صاحب مرحوم

پرانی وضع قطع کے تھے۔ عربی صرف و نحو پر عبور تھا، کہنے کو تو ملازم تھے لیکن رعب داب یہ تھا کہ والد کو کچھ کہنا ہوتا تو خود ان کے پاس جاتے سبقت سلام کرتے اور مطلب بیان کرتے۔ پھر ہم کس شمار میں تھے؟ ہم ان کے لیے چلمیں بھرتے، حقہ تازہ کرتے، ان کے پاؤں دابتے۔ وہ قمچی بھی چلا سکتے تھے، گوشمالی بھی کر سکتے تھے، طمانچوں سے گال لال بھی کر سکتے تھے، مرغا بھی بنا سکتے تھے، اور کوئی داد فریاد نہیں تھی۔ یہ سب ذاتی واردات نہ سہی، لیکن آنکھوں دیکھی سچائی ہے۔ بچے گھر جاکر ماں باپ سے شکایت کرتے تو اُلٹے ڈانٹ کھاتے بلکہ مارے بھی جاتے۔ خوش قسمتی سے مولوی صاحب مجھ پر مہربان تھے کیوں کہ میں کبھی آموختہ نہ بھولتا اور آگے کا سبق بھی پہلے سے پڑھ کر آتا اور جو کچھ پڑھتا بہت جلد یاد کر لیتا۔ انھیں مولانا سے میں نے میزان۔ منشعب۔ پنج گنج۔ صرف میر۔ نحو میر اور ہدایۃ النحو عربی میں اور گلستاں۔ بوستاں اور کریما فارسی میں پڑھی۔ انھوں نے حسب دستور عشق والا باب نہیں پڑھایا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ باب پڑھنے والا ہے بھی نہیں۔ جس نے بھی عشق کا باب پڑھا، زندگی کی کتاب سے پڑھا، شیخ سعدی کی کتاب سے نہیں۔ مولوی صاحب نے حافظ کی چند غزلیں بھی پڑھائی تھیں۔ وہ بیشتر اشعار کی متصوفانہ تشریح و تعبیر کیا کرتے تھے۔ رہی سہی کمی اردو دواوین کے ذاتی مطالعے سے پوری ہونے لگی، جو گھر کے ذاتی کتب خانوں میں موجود تھے اور خود دیوانِ حافظ کو سبقاً پڑھنے کے بعد کچھ کچھ اور سمجھ میں آنے لگے تھے۔

ناول

والد مرحوم کے پاس ناولوں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ ہمیں ناول پڑھنے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ کم سنوں کے لیے ناولوں کو مخرب اخلاق سمجھا جاتا تھا یہ سب ناول الماری میں مقفل رہتے۔ اس بے جا قدغن نے نامعلوم کے حصول کا جذبہ بہت شدید دیا تھا۔ دوپہر کے وقت جب گھر کے بزرگ سو جاتے، یا روپئے وغیرہ نکالنے کے لیے کنجی میرے حوالے ہوتی تو الماری کھولتے ہی میں کوئی ناول چُراتا اور نیفے میں ٹھونس کر دامن سے چھپا کر باہر لاتا۔ گوشۂ تنہائی میں خود پڑھتا اور ہم سنوں کو پڑھاتا۔ یہ ناول ہاتھوں ہاتھ گردش کرتے ان کا الماری سے نکال لینا تو آسان ہوتا لیکن مناسب جگہ پر رکھنا بے حد دشوار اس لیے واپس نہ رکھا جاتا اور چکر لگاتے لگاتے کھو جاتا۔ میں نے اس نادر ذخیرے سے بہت سے ناول ضائع کر دیئے۔ آج افسوس کرتا ہوں کہ ان ناولوں میں سے اکثر نایاب ہو چکے ہیں۔ بس یہ تسکین ہے کہ یہ ناول میں نے خود بھی پڑھے ہیں اور دوسروں کو بھی پڑھائے ہیں، البتہ یہ کارِ خیر جاری نہ رہ سکا۔ اس زمانے میں ہم نے محمد علی طبیب، عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، محمد احسن احسن، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا رسوا، کسی کو نہیں چھوڑا بلکہ بہت سے سستے قسم کے ناول بھی پڑھ ڈالے جن کے نام اور مصنف بھی اب یاد نہیں اور اگر آپ یقین کرنے کو تیار ہوں تو عرض کردوں کہ ہم میں سے کسی کے اخلاق پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔

آغازِ شاعری

میرے ننہال اور ددھیال دونوں ہی جگہ شعر و شاعری کے چرچے عام تھے۔ شاعری بھی جاگیرداری کی شان اور آن بان تھی، فرصت اور بے فکری کی فضا میں خوب پھلتی پھولتی تھی۔ لوک روایتیں بھی شاعری کی پرورش کرتی ہیں، لیکن لوک ادب کو جاگیردارانہ سرپرستی کم ملتی ہے۔ متوسط طبقے کی ضروریات اور رسومات کی وجہ سے شاعری کو سرپرستی ملتی رہی ہے اور اسی میں مذہبی مقاصد بھی شامل ہیں۔ محرم میں مرثیہ خوانی کا عام رواج تھا۔ تحت اللفظ کا بھی اور سوز کا بھی۔ تحت اللفظ میں زیادہ تر انیس اور کبھی کبھی انیدو نفیس کے مرثیے اور انیس و مونس کے سلام پڑھے جاتے تھے۔ سوز خوانی میں دبیر اور ضمیر کے مرثیے نسبتاً زیادہ مقبول تھے۔ پھر نوحوں کا بڑا رواج تھا۔ سوز اور نوحوں دونوں کے لیے دھنیں بنائی جاتیں اور اس کے لیے ہلکی کلاسیکی موسیقی کا بھی سہارا لیا جاتا۔ میرے بڑے ماموں سید علی وصی صاحب اور سید محمد اختر ماموں اور ان کے صاحبزادگان سید اعظم حسین اعظم اور شمیم کرہانی بڑے خوش گلو ہی نہیں رموزِ فن سے اچھی واقفیت بھی رکھتے تھے۔ "بگڑے گویے مرثیہ خواں" بھی کئی تھے۔ تحت اللفظ کا خاصا رواج تھا۔ دیوکٹھیا (ضلع غازی پور) کے میر اقبال حسین کا شمار ماہرینِ فن میں تھا، لیکن وہ جنگ ہی اچھی پڑھتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ماموں جان سید محمود رسا رزم، بزم، بین اور جنگ سب اچھا پڑھتے تھے اور عوام و خواص میں یکساں مقبول تھے۔ نوحوں کا بڑا رواج تھا۔ خاص کر زنانی مجلسوں میں تو ان پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ربیع الاول کے شروع ہوتے ہی نعتیہ مشاعروں اور نعتیہ اور منقبتی مقاصدوں کی بہار آجاتی۔ قصیدوں اور نعتوں کے علاوہ

قوالیوں اور سماع کی محفلوں میں بھی سماں بندھ جاتا اور بڑے اچھے قوال فارسی اور اُردو کے اساتذہ کے علاوہ دوسری سطح پر شاعروں کا کلام بھی سناتے تھے۔ پھر محافلِ میلاد کا انعقاد ہوتا۔ ماہ ربیع الاول کے علاوہ مقاصدے رجب، شعبان رمضان اور ذی الحجہ میں بھی ہوتے۔ غرض ان اجتماعات میں ایک ثقافتی اور ادبی کیفیت تھی جو مذہبی مندرجات پر چھائی رہتی تھی۔ بچپن میں بعض مقاصدوں کے لیے میں نے بھی قصیدے لکھے تھے، لیکن شریک تو تقریباً ہر مقاصدے میں ہونا پڑتا تھا کیوں کہ یہ قصبے کی اجتماعی زندگی کے لوازم میں داخل تھا۔ غرض ماحول میں رچی ہوئی اس شعریت سے ذہن طفولیت ہی سے متاثر ہوتا رہا اور میں کبھی کبھی مصرعے یوں ہی گنگنانے لگتا۔

ایک سال کربلا میں ایامِ محرم میں لکھنؤ کے یتیم خانے سے دو بچوں سے یتیم بچے آئے اور انھوں نے نہایت ہی دل نشین اور پُرسوز آواز میں ایک نوحہ پڑھا جس نے دلوں کو ہلا دیا اور آنکھوں کو رُلا دیا۔ میں خود بچہ تھا، مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ جب بستر پر لیٹا تو کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔ یکایک میں اسی نوحے کی بحر میں گنگنا اُٹھا۔ ایک پورا شعر موزوں ہو گیا جو کاغذ قلم دوات کے سپرد کر دیا، دو تین شعر اور بھی ہو گئے۔ میں لیمپ کی روشنی میں لکھ رہا تھا۔ سامنے کے دالان میں والد مرحوم استراحت فرما رہے تھے انھوں نے سو جانے کا حکم دیا۔ صبح کو پیشی ہوئی —

"اتنی رات کو کیا پڑھ رہے تھے۔؟"

"جی! بس کچھ لکھ رہا تھا، یوں ہی۔"

"آخر، کیا لکھ رہے تھے، لاؤ میں بھی تو دیکھوں"۔

"میں ڈرتے ڈرتے اپنی شاعری کا پہلا نمونہ لے گیا۔ والد مرحوم اس کے لیے تیار نہیں تھے۔

"یہ تو شعر ہیں! کیا تم نے کہے ہیں۔؟"

"جی ہاں۔" مجھے تسلیم کرنا پڑا۔

ایک گھنٹے کے بعد باہر "سوتی" میں طلبی ہوئی۔ دونوں ماموں سید احمد علی احمد عرف ابوذر اور سید محمد رسا عرف مُنّو میاں موجود تھے۔ والد صاحب نے بتایا — "آپ کے بھانجے شاعر ہو گئے ہیں۔!"

پھر مجھ سے وہ طفلانہ کلام سُنا گیا تو داد دی گئی اور ساتھ ہی یہ فہمائش بھی کی گئی کہ "پڑھائی پر توجہ دینے کی ضرورت کہیں زیادہ ہے۔"

بہر صورت، جو وقت مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری دینے اور پڑھنے سے بچتا تھا وہ میں کھیلوں میں بہت کم اور کتابوں میں بہت زیادہ صرف کرتا رہا۔ اسی کے ساتھ شاعری بھی کرتا رہا۔ کبھی کبھی شاعری کے لیے کتابوں کی آڑ لیتا۔ میرے پاس بڑی تقطیع کی "گلستاں" تھی۔ مکتب کے اور بچے زور زور سے آموختہ پڑھتے اور میں یہ دیکھ کر کہ مولوی صاحب ذرا اونگھ گئے ہیں، کتاب کو منہ کے سامنے گھٹنوں پر رکھ کے مولوی صاحب پر یہ اثر جماتا کہ پڑھ رہا ہوں لیکن درحقیقت سفید کاغذ کا ایک ٹکڑا کھلے ہوئے صفحے پر رکھ کر کچھ نہ کچھ موزوں کرتا رہتا اور مولوی صاحب کو خبر بھی نہ ہو پاتی۔

اتنی کم سنی میں شاعری تیز روی سے چلتی رہی اور دھیرے دھیرے میں اپنے زعم میں غزلیں بھی کہنے لگا اور قصیدے، منقبتیں اور نعتیں بھی۔ یہ سب اپنے ہم درس دوستوں کو بھی نہیں سُناتا تھا۔ لیکن اس سے مشق بڑھتی جاتی تھی اور زود گوئی بھی آنے لگی تھی۔ میرے ماموں جان سید محمد رسا نے مجھ سے ایک بار میرے کچھ اشعار اصرار کر کے سُنے۔ شاید میرے دلی دوست شمیم (شمیم کرہانی) سے یا اپنے صاحبزادے سید خورشید احمد سے یہ اطلاع ملی تھی کہ میں غزلیں بھی کہنے لگا ہوں۔ انھوں نے میرے امتحان کے لیے علی میاں کامل کا یہ مصرع طرح کیا ؎

شامیانہ بن گیا جب سر پہ چادر تان لی

آٹھ برس کا بچہ اس مصرع طرح پر غزل کہنے بیٹھا! گھر کے مشاعروں، علمی چرچوں اور کتب بینی کا یہ فیض تھا کہ شام تک چار پانچ شعر کہہ ڈالے، جن میں سے تین یاد آ گئے ہیں:

دل کے ٹکڑے کیا ہوئے کچھ بھی پتہ چلتا نہیں
کوچۂ جاناں کی ساری خاک ہم نے چھان لی

ہے مرے بازار کی داد و ستد کچھ اور ہی،
جان دی اس پر ہمیشہ جس نے اپنی جان لی

اور گرہ لگائی ؎

اک طرح کی شانِ شاہانہ فقیروں میں بھی ہے
شامیانہ بن گیا جب سر پہ چادر تان لی

(باقی)

ناسور

اِک اِک کر کے دوست بچھڑتے جاتے ہیں
تم بھی ــ مُجھ کو چھوڑ گئے ــ !
برسوں تم سے اچھّے ذاتی رشتے تھے
(ادبی بحثیں ــ دُور کھڑی تکتی رہتی تھیں)
صبح سویرے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھا کے آتے تھے
قہوہ پی کر بھر سے باتیں کرتے تھے
دُنیاوی جھگڑوں کے قصے مزے مزے سے سنتے تھے
جیسے جیسے شام کے سائے بڑھتے تھے
ہاتھ ہمارے جام اُٹھا کر ہنستے تھے
تم مجھ کو سمجھاتے تھے ــ " جینا کتنا مشکل ہے "
اور تم کیسے " چُوہا دوڑ " میں جیت گئے !
گمنامی کے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے میں
ہم کتنا خوش رہتے تھے !
آج یہ آنسو کہتے ہیں :
جانے والا زخم تو اپنا چھوڑ گیا
جب تک یہ ناسور بنے
یاد تمھیں وہ آئے گا ــ !

(محمود ایاز کی پہلی برسی پر)

جناب باقر مہدی
ای/۱ - روی درشن ، کارٹر روڈ
باندرہ (ویسٹ)
بمبئی - ۴۰۰۰۵۰

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
چنبیلی لاج، ۹۹ - ۱ - ۱۰ - ۱ سری نگر
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

فیض احمد فیض کا شعری سفر

کوئے یار سے سوئے دار اور آگے ......

فیض نہ صرف برصغیر کے عظیم اُردو شاعر تھے، بلکہ ان کی شہرت دُنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پھیل چکی تھی۔ وہ واقعی نئی دُنیا کے شاعر تھے۔ اُن کی شاعری کا سفر بہت طویل اور کوئی چھ دہوں سے زائد مدت پر محیط تھا۔ اس دور کے سارے آتار چڑھاؤ فیض کی ادبی شخصیت کی تعمیر و تکمیل میں کارفرما تھے۔

غالب نے کہا تھا ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

فیض کی ساری شاعری، غالب کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ وہ "جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں" کے شاعر رہے ہیں۔ یہ "جنوں" بھی کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ کبھی "کوئے یار" کے چکر لگواتا ہے تو کبھی یہی "جنوں" سارے زمانے کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے اور ہم انھیں جھومتے ہوئے "سوئے دار" جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور وہ اس سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

فیض ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی اور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء کے تین سال بڑے ہی تہلکہ مچا دینے والے سال تھے۔ انقلابِ روس سے لے کر جلیان والا باغ تک تاریخ ساز واقعات رونما ہو رہے تھے۔ نو دس برس کے لڑکے فیض احمد پر ان واقعات کا کیا اثر پڑتا ہے؟ ان کے ننھے دماغ پر کیا ارتسامات مرتسم ہو رہے تھے؟

اُدھر جنگ ختم ہوئی اور اِدھر ہندستان میں یارانِ وفادار فتح کے جشن منانے لگے اور انگریز آقاؤں کو خوش کرنے میں لگ گئے۔ اور کانگرسی رہنما، جنھوں نے اس امید پر کہ انگریز لڑائی کے بعد ہندستان کو آزادی بخش دیں گے، لڑائی کی حمایت کی تھی، سخت مایوسی سے دوچار تھے۔ عوام بپھرے ہوئے تھے۔ آزادی کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ گرفتاریاں، پکڑ دھکڑ اور پھر ان کے خلاف احتجاج — بازار بند۔

اسی زمانے میں اخباروں نے بڑی بڑی سرخیوں میں اعلان کیا: "روس میں زار شاہی کا تخت اُلٹ گیا۔ لینن نے مزدور طبقے کی حکومت قائم کرلی۔"

اس واقعہ نے دُنیا کی تقدیر بدل ڈالی اور ہندستان کی آزادی کی تحریک کو مہمیز کیا۔

پھر جلیان والا باغ کا قتلِ عام!

نوخیز فیض احمد فیض پر ان سب باتوں کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ فیض نے خود "مہ و سال آشنائی" کے پہلے ہی باب میں "تصور" کے عنوان سے اس بیتے ہوئے زمانے کی یادوں کو یوں پیش کیا ہے:

"اللہ دیا پہلوان، چراغ دین ...، اللہ رکھا ...، خوشیا ... اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے تھے — ارے بھئی کچھ سُنا بھی ہے مہاتما گاندھی اور محمد علی، شوکت علی نے مل کر اعلان کر دیا ہے کہ ایک سال کے اندر اندر سب انگریز 'لاٹ'، کمشنر، ڈپٹی کمشنر نکال دیئے جائیں گے اور ان کی جگہ ہمارے لوگ لگائے جائیں گے ... اور بھئی یہ بھی سنا ہے ... روس کے بادشاہ زار کا تختہ تو اُلٹ گیا ہے نا۔ وہاں کوئی لیڈر پیدا ہوا ہے لینن، اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے ... روس کے بادشاہ زار کو بھگا کر سب روپیہ لوگوں میں بانٹ رہا ہے اور مزدوروں کا مورچہ بھی بنا دیا ہے۔ شاباش! شیر دے پُتر۔ یار اپنے

آغا صفدر سے کہو وہ بھی ترکیب لڑائیں، کچھ ہمارا بھی بھلا ؟
(آغا صفدر شہر کے سیاسی لیڈر تھے) کوئی ایسی ترکیب لڑائے
تو مزہ آجائے۔ یہ سامنے والا ساہوکار .... اس کا مال بٹے
تو ہم سب کے وارے نیارے ہوجائیں ۔"

تو یہ تھیں وہ آوازیں جو کم سن فیض احمد کے کانوں میں پڑ رہی تھیں اور یہ تھے وہ ارتسامات جو ان کے ننھے ذہن پر ثبت ہو رہے تھے۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہے۔ اٹھارہ بیس سال کا سن تو ہنگامہ خیز ہوتا ہی ہے۔ ایسے میں چاند چڑھتا ہے تو اس کے انداز ہی اور ہوتے ہیں چاند کی کرنیں مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں تو عشق گنگنا اٹھتا ہے۔

پھر یہ وہ دور ہے جب اردو شاعری کے افق پر حسرت موہانی اور اختر شیرانی چھائے ہوئے تھے اور اردو غزل نشاۃ ثانیہ کے دور سے گزر رہی تھی۔

امیر اور داغ کا زمانہ (جنھیں مجنوں گورکھپوری نے "انحطاطی غزل سرائی کی آخری کڑی" کہا ہے) ختم ہو رہا تھا۔

شاعری نے زبردست کروٹ لی۔ جہاں یہ شعر کہے جاتے تھے ؎

آج کل میں داغ ہوں گے کامیاب کیوں مرے جاتے ہو دو دن کے لیے

—— اور ——

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سرِ شام کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

—— یا ——

صبح کو آئے ہو بھولے شام کے جاؤ بھی اب تم رہے کس کام کے

وہاں حسرت نے انقلاب برپا کر دیا، اور پرانی معاملہ بندی کی جگہ ایسے اشعار نے لی ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اب عشق معتبر ہو گیا اور معشوق باوقار ۔ عاشق میں رکھ رکھاؤ آگیا، اور شعر کا مزاج بدل گیا۔

اختر شیرانی نے رومان کو نیا احترام بخشا۔

ایسی صحت مند اور پاکیزہ رومانی شاعری کے زیر اثر فیض نے شعر کہنا شروع کیا اور یہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ "نقش فریادی" کا ابتدائی کلام کچھ اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے ؎

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

یا پھر "سرود شبانہ" کے یہ شعر ؎

آسماں پر روشن ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آکر تھوڑا سا پیار کرلیں ہم
زندگی زرنگار کرلیں ہم

یا غزل کے یہ اشعار ؎

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے
نہ ہم اپنی نظر سمجھے، نہ ہم ان کی ادا سمجھے
فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

یا یہ قطعہ ؎

وقف حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

مگر رومان کی اس لہلہاتی کھیتی پر غم دوراں کا سایہ پڑتا ہی ہے اپنے مجموعے "دست تہ سنگ" کے ابتدائیے میں خود فیض نے کہا ہے کہ "ابتدائے عشق کا یہ تحیر بہت عارضی ثابت ہوا۔ اس دور کی جھلک ٹھیک طور پر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد، پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک چھاننے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آبیٹھیں ۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں۔

نظم "یاس" کے یہ شعر اسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں ؎

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے — ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل — بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

یا "ایک منظر" میں یوں کہا ہے ؎

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور — آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور — شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی — مضمحل لے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

۱۹۳۴ء میں کالج سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء میں فیض نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کرلی۔ اور یہاں سے فیض کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ "زحمتِ گریہ و بکا" کے بے سود احساس کی جگہ "کیوں نہ جہان کا غم اپنا لیں" کے جذبے نے لے لی۔ یہیں فیض کی ملاقات محمود الظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔ فیض خود "دستِ تہ سنگ" میں لکھتے ہیں:

"ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔ مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا یہ تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کرکے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں بہر حال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں ..... غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی مرحلے کے دو پہلو ہیں۔"

اس دور کی پہلی نظم "نقشِ فریادی" کے دوسرے حصے کی پہلی نظم ہے:

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کی تنوروں سے
پیپ بہتی ہے گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

یا پھر فیض کی نظم "رقیب سے" ملاحظہ فرمایئے۔ فیض نے رقیب کو ایک رازداں اور واقفِ معشوق کی شکل میں دیکھا ہے۔ معشوق کی کرم فرمائیوں سے سرشار ہے اور فیض اس سے مخاطب ہیں اور نظم کے ختم ہوتے ہوتے قاری ان بندوں تک پہنچتا ہے ؎

جب کبھی بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

فیض کی نظم "چند روز اور مری جان" بے کسوں کو یہ بشارت دیتی ہے ؎

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اور "بول" کا یہ ٹکڑا ؎

دیکھ کر آہن گر کی دکان میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے

فیض کی نظم "کتے" ملاحظہ ہو —

زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا اک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو

یہاں تک پہنچنے پر لگتا ہے، فیض وہی کہتے ہیں جو پریم چند اپنی کہانی "کفن" میں بتاتے ہیں یعنی غلامی اور افلاس نے انسان کو ذلت کی اس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں اس میں انسانیت کی خو بو باقی نہیں رہتی لیکن نظم ایک موڑ لیتی ہے اور فیض پریم چند سے آگے نکل جاتے ہیں اور کہتے ہیں —

یہ مظلوم مخلوق اگر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

اسی زمانے میں فیض نے غزلیں بھی کہیں۔ لیکن یہاں بھی اپنے ماقبل کے دور کی غزلوں سے اُن کا رنگ الگ ہے —

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بیگم ایلیس فیض نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے :

"فیض نے غم کا ایک روشن اور اثباتی پہلو بھی تلاش کر لیا ہے۔ یعنی غم کے باوجود حصولِ مسرت کے لیے مسلسل جدوجہد"

یہی غالب اور فیض کے ادوار کا فرق بھی ہے۔ غالب کے پاس بھی "غم" ہے اور وہ ہے محفلِ نشاط کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا۔ آسودگی کی نایابی کا۔ پھر نہ قوتیں وجود میں آئیں جو نظامِ دہر کو بدل ڈالیں۔ ایسے میں غالب "نشاطِ آرزو" کے سہارے زندہ ہیں اور دوسروں کو بھی اسی سہارے زندہ رہنے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن فیض کا عہد اور ہے۔ اس کا مزاج اور ہے اور اس کے تیور اور ہیں۔ یہ انقلابات کا دور ہے ظلمت، غلامی و استحصال کے ختم ہونے اور مزدور کی صبح کے طلوع ہونے کا دور ہے۔ فیض کی شاعری میں اس نئے دور کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہند و پاکستان آزاد ہوئے لیکن وہ خواب جو انقلابیوں اور شہیدوں نے دیکھا تھا۔ مخدوم نے کہا ہے

رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا اُجالا بھی ہے

اور پھر —

اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی، منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں

فیض کہتے ہیں —

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

اور پھر یہ بشارت دی —

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ فیض، سجاد ظہیر اور دوسرے رفقا کے سر "راولپنڈی سازش کیس" منڈھا گیا۔ فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار ہوئے اور

اپریل ۱۹۵۵ء تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ جیل کے تجربے کے بارے میں "دستِ تہ سنگ" میں کہتے ہیں:

"..... جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے
جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے چنانچہ
اول تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حیات پھر تیز ہو جاتی
ہیں۔ اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمانوں کی نیلاہٹ، ہوا
کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے
یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے
ہیں۔ نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک
اور فردا اور دی کا تفرقہ کچھ اس طرح مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ
قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ
ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن
کے ظاہری بناؤ سنگار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔"

چنانچہ "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کا کلام اسی "فراغتِ ہجراں" کی دین ہے۔ یہاں فکر کی گہرائی بھی ہے اور فن کا کمال بھی ہے۔ جیل کے اندر کی دنیا کی تنہائی اور تنہائی کا کرب بھی ہے تو ساتھ ہی جیل کے اندر اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک نیا شعوری اور فن کارانہ ربط بھی نظر آتا ہے۔

"دستِ صبا" کے ابتدائیے میں فیض نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے اپنے شعورِ فن و ادب کی پختگی کا مظہر ہے۔ کہتے ہیں کہ مشقِ سخن (یا کسی اور فن) کے لیے غالب کا "دیدۂ بینا" ہی کافی نہیں جو "قطرہ میں دجلہ" دیکھ سکے۔ شاعر یا ادیب کو قطرہ میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دوسروں کو دکھانا بھی ہوتا ہے۔ اور اگر:

"دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو
ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ
دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رُخ، اس کے
بہاؤ، اس کی ہیئت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری
بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔"

"یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ
بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی
کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا
اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز
ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر
.... اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور
جدوجہد چاہتے ہیں۔
حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد
میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہے۔"

فیض ابتدا میں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں تھے اور تین مہینے قیدِ تنہائی میں کاٹے جبکہ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط سب چیزیں ان پر ممنوع تھیں ــــــ

اس پر فیض نے کہا تھا ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور یہ بھی کہا ــــ

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رُخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

اس زمانے کا بہت کچھ کلام ذہن سے اتر گیا۔ جو یاد رہا وہ "دستِ صبا" میں محفوظ ہے ؎

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ــــــــ "لوح و قلم"

ہاں جُرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

—————— "دامنِ یوسف"

قفس ہے بس میں تمھارے، تمھارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

—————— "طوق و دار کا موسم"

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

—————— (ایک قطعہ)

اسی دَور کی غزلوں کا یہ رنگ ہے ؎

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

——————

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے
ہمیں سے سُنّتِ منصوؔر و قیسؔ زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

قیدِ تنہائی کے کرب سے تو انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے، ذہنی توازن کھو دیتا ہے اور یہی جابروں کا منشا بھی ہوتا ہے۔ لیکن فیض کے اس زمانے کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ جیسے شعر کی دیوی نے انھیں اپنی باہوں میں بھینچ لیا ہو۔ فن کے سوتے پھوٹ پڑے۔ وطن کی پکار، غریبوں کی آہیں، مظلوموں کی تڑپ اور پھر آنے والے دور کی آہٹیں، سبھی کچھ ان پر اثر انداز ہوا۔ پھر اعلا آدرش سے گہری وابستگی کرشمے دکھاتی ہے۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

——————

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

اور "زنداں کی ایک شام" میں یوں کہتے ہیں ؎

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

جیل کی چار دیواری میں حریت کی دیوی کی "یاد"، ہجر کے دن کے ڈھل جانے اور وصل کی رات کی آمد کی بشارت دیتی ہے ؎

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پر اس وقت تری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آبھی گئی وصل کی رات

اور جیل "ایک رات کی جُدائی" ہی تو ہے، جبکہ جابروں کی خدائی بھی "چار دن کی خدائی" ہے ؎

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

ایسے میں فیضؔ کو بجا طور پر فخر ہے ؎

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیض کا تعلق مزدور تحریک سے راست رہا ہے۔ وہ پوسٹل ملازمین کی یونین کے رہنما اور پاکستان کی ٹریڈ یونین فیڈریشن کے سربراہ رہے۔ جیل میں بھی لگتا ہے فیض یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ جیل کے باہر محنت کشوں کے مصروف قدموں سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ اپنی نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" میں وہ محنت کشوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر — دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں — کیا آس لگائے بیٹھے ہو

پھر دنیا والوں نے تم سے — یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہادی مٹی میں — مہمان کا شہپر توڑ دیا

ناداری، دفتر، بھوک اور غم — ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ — یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں — یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے — سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں — جو آنکھ اُٹھے وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں — ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی — دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں — یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر — یہ پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو — نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر — یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی — ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے — تب بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں — ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اُٹھو! سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

جولائی/اگست ۱۹۵۲ء میں فیض بغرضِ علاج جناح اسپتال کراچی لائے گئے یہاں انھیں کچھ آزاد ہوا ملی۔ دوستوں، ملاقاتیوں سے ملنے کا موقع حاصل ہوا۔ مگر پھر وہ منٹگمری جیل پہنچا دیے گئے۔ پھر وہی قید و بند وہی زنجیریں۔ لیکن اب "کروٹیں لینے میں جھنکار کا شور" کچھ فزوں تر ہو گیا تھا۔ ایسے میں جو شعر کہے وہ "زنداں نامہ" میں شامل ہیں۔

جناح اسپتال میں کہا گیا کلام کچھ یوں ہے ؎

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
آخرِ شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

فیض کی مشہور نظم "ملاقات" ہوئی تو منٹگمری جیل میں لیکن بقول سابق میجر محمد اسحاق (جو فیض کے رفیقِ زنداں تھے) "فیض اس کے جراثیم کراچی سے لائے تھے۔"

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تم سے عظیم تر ہے
بہت سیاہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

حیدرآباد (سندھ) اور منٹگمری جیل میں فیضؔ نے اپنی بعض بہترین غزلیں کہیں ۔

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تیری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

بات بس سے نکل چلی ہے　　دل کی حالت سنبھل چلی ہے
اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے　　اب طبیعت بہل چلی ہے

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

(سجاد ظہیر نے بلوچستان جیل سے ۲۱ فروری ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں جو سابق میجر محمد اسحاق کو لکھا تھا، اس شعر کے متعلق کہا ہے: "اس شعر کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے، جعفر علی خاں اثر تو الگ رہے) ۔

لب پہ ہے تلخیٔ مئے ایام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں، اب ہجر کی کوئی رات نہیں

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے　　دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے
دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے　　لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں　　دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے
مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

بیدادگروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں، خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں، فریاد جو در در جاتی ہے
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے
ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

غزل کی روایتی علامتوں کو فیضؔ نے نیا عصری مفہوم بخشا۔ بیدادگروں کی بستی ہے۔" یہاں ستم کی ایسی رسم چلی ہے کہ "خطائے نظر" سے پہلے "سزا" اور "جرمِ سخن" سے پہلے "عتاب" نازل رہتا ہے۔ لیکن حوصلوں کی بلندی دیکھیے کہ شاعر نے جیل کی تاریکی کو بھی امید و بیم کے نور سے منور کر رکھا ہے اور ہر روز "نسیمِ صبحِ وطن" خلوتِ ہجر میں وطن کی یادوں سے معطر آتی ہے اور شاعر کے سارے وجود کو اپنی روح افزا خوشبو سے بھر دیتی ہے۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں فیضؔ کو تین ہفتوں کے لیے لاہور جیل لایا گیا۔ لاہور سے فیضؔ کو بے انتہا پیار تھا۔ اب اسی شہر کے جیل میں رہیں، یہ ان کے لیے انتہائی گراں بارِ خاطر تھا۔

"روشنیوں کا شہر" جیسی نظم کہتے ہیں جس پر لاہور جس قدر فخر کرے کم ہے اور پھر شاعر کا کرب ملاحظہ ہو ؎

اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج میرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی ان سے یہ کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

منٹگمری جیل میں کہی ہوئی نظم "دریچہ" میں کچھ یوں کہا ہے ؎

گڑی ہیں کتنی صلیبیں میرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے
اور آئے دن میری نظروں کے سامنے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں۔

"درد آئے گا دبے پاؤں" میں کہتے ہیں :

اور کچھ دیر میں جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

منٹگمری جیل میں جب ایتھل اور جولیس روزنبرگ کی شہادت کی کی خبر ملی تو فیض مضطرب ہو گئے اور اپنی مشہور نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کہی ؎

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل ہی کی ایک معرکۃ الآرا نظم "آجاؤ افریقہ" ہے حبِ وطن ایک آفاقی جذبہ ہے۔ انسان دوستی سے جب اس کی سرحدیں ملتی ہیں اور مل کر گڈمڈ ہو جاتی ہیں تو پھر ہر محبِ وطن دوسرے کے وطن میں ہونے والے جور و ستم سے تڑپ اٹھتا ہے جیسے یہ اسی پر ڈھایا جا رہا ہو۔ افریقہ کی تحریک آزادی فیض کی اپنی تحریک بن جاتی ہے، اور فیض ان میدانوں میں پہنچ جاتے ہیں ؎

دھرتی دھڑک رہی ہے میرے ساتھ افریقہ
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں افریقہ ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے ببر کی چال
"آجاؤ افریقہ"

اپریل ۱۹۵۵ء میں فیض آزاد ہوئے لیکن دسمبر ۱۹۵۸ء میں پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اس بار لاہور جیل میں رہے اور پھر رسوائے زمانہ قلعہ لاہور کے جیل میں بند رہے۔ ۱۹۵۹ء کے وسط میں رہا ہوئے۔ اپنے مجموعے "دستِ تہہ سنگ" میں لکھتے ہیں :

"ایک بار پھر جیل خانہ گئے۔ مارشل لا، کا دور آیا
اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ
اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔"

"انسدادِ راہ" کا احساس بڑا ہی کرب ناک ہوتا ہے اور "نئی راہوں کی طلب" کا احساس کچھ امید افزا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن قید و بند کے ماحول میں ان دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ بھی ہوتا ہے۔ اسی عالم سکوت و کرب میں اپنی نظم "شام" میں کہتے ہیں ؎

دامن وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی، نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا
آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی کوئی پائل بولے
کوئی بت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

لاہور جیل سے فیض کو عدالت لانا تھا۔ بند موٹر کا انتظام نہ ہو سکا۔ وہ تانگے سے لائے جا رہے تھے۔ لوگوں نے پہچان لیا اور تانگے کے پیچھے انسانوں کا ایک ہجوم تھا۔ اسی کیفیت کو فیض نے ایک نظم میں بیان کیا ہے ؎

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں

آج بازار میں پا بجولاں چلو
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو

زندان قلعہ لاہور میں کہی ہوئی نظم "قیدِ تنہائی" میں یوں گویا ہیں:

عدم آباد جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیِ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے

غزل کے یہ اشعار اس زمانے میں فیض کے موڈ کو ظاہر کرتے ہیں ۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا! قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے

کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

اس کے بعد فیض کا "شام شہر یاراں" کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب فیض اس برصغیر کے نہیں، سارے افریقہ اور ایشیا کے شاعر ہیں۔ "کوئے یار" سے چلے تھے "سوئے دار" لیکن "دار و رسن" کی منزل سے بھی آگے نکل گئے اب ساری مظلوم انسانیت کے شاعر ہو گئے۔ لیکن پھر بھی وطن سے دوری وطن کی یاد تڑپا دیتی تھی ۔

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں

کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

اس قطعہ سے فیض کا درد و کرب ظاہر ہوتا ہے ۔

ہزار درد شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اترے

اسی دور کی فیض کی غزلوں کا کچھ یہ رنگ ہے ۔

یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل فیض چھپاؤ تہِ داماں
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا، ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا، ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا، ایسے نہیں ہوتا

اب فیض مجاہدِ ایشیا اور ساری امن پسند دنیا کے شاعر ہو چکے تھے۔ وہ لینن امن انعام سے سرفراز کیے گئے۔ جو مجاہدین امن کی صفِ اول میں ان کے مقام کا مظہر تھا۔ وہ افرو ایشیائی ادیبوں کے رسالے "لوٹس" کے ایڈیٹر بھی رہے اور اس غرض سے بیروت میں قیام رہا۔ یہاں بھی انھوں نے دربدری دیکھی۔ لبنانیوں اور فلسطینیوں کی جاں بازی دیکھی۔ معصوم بچوں کو تڑپتا، بلکتا، دم توڑتا دیکھا۔ تو عرب نوجوانوں کو آزادی کے لیے نبرد آزما بھی دیکھا۔ فلسطینی بچے کی لوری لکھی تو یہ بھی بشارت دی کہ بیروت پھر سے اُٹھے گا بہ ہزاراں جبروت۔

فیض برصغیر کی سرحدوں کو پار کر کے اب امن عالم کے مجاہدوں، آزادی اور جمہوریت کے علمبرداروں اور جنگ و جدال، غلامی و استحصال سے محفوظ و مامون دنیا کی تعمیر کے لیے لڑنے والوں کی صفِ اول میں مقام حاصل کر چکے تھے۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

دو ہندی نظمیں

لیلا دھر جگوڑی
[illegible]

آبادی اور گھر

جو لوگ اَب نہیں ہیں اُن کے بغیر جو لوگ
اَب رہتے ہیں اُنھیں آبادی کہتے ہیں
جس کی بُنیاد کسی نے، چھت کسی نے ڈالی
دَروازے کسی نے بنوائے
رہنے والے جس میں کوئی اور ہیں
ایسے کئی گھر تھے، جو آباد نہیں تھے
پر اُن میں آبادی تھی
جس گھر کی ہمارے پاس تصویر تھی
وہ اُجاڑ تھا
وَقت وہاں کچھ بے نام اجنبی پھُول پَودے
اُگا کر رہتا تھا
اب بھی جن کے سائے میں افراتفری بھری
کوئی پُرانی گونج چمک جاتی ہے
ساری آوازیں وہاں منظروں میں بدلی ہوئی ہیں
انھیں منظروں سے کئی گھر
کئی لفظ اُبھر آتے ہیں
ایک گھر ایسا، رات کو جو کھلکھلاتا
نئے کپڑوں میں سوتا ہے
ایک گھر ایسا جس میں نئی چیزیں آتی ہیں
پُرانے کپڑوں سے،
ہر گھر کا کھنڈر دیکھتا ہے، ہمیں
آبادی کی طرح۔

□□

گھوڑا

میں ایسے گھوڑے پر سوار ہوں
جس کی کاٹھی سمندر کی لہریں ہیں
اور جس کی لگام ایورسٹ کے ہاتھوں میں ہے
میں سمندر اور ہمالہ پر ایک ساتھ سوار ہوں
سمندروں اور پہاڑوں سے بنی اس کاٹھی کا
گھوڑا بھی میں ہوں اور سوار بھی میں ہوں
آکاش میں جڑی ہوئی یہ دُنیا
میرا اصطبل ہے۔

ترجمہ: شکیل صدیقی
نیکیت رائے تالاب کالونی لکھنؤ

عابد سہیل
علی گنج لکھنؤ

پنڈت آنند نرائن مُلّا: چند یادیں

پنڈت آنند نرائن مُلّا کو تقریباً ۴۹ سال قبل کی سردیوں میں پہلی بار دیکھا۔ میری ماموں زاد بہن کی شادی تھی، دعوت نامہ اُن تک پہنچانے کی ذمہ داری میرے سپرد ہوئی۔ گولا گنج میں ان کا بڑا سا مکان جس بہت بڑی عمارت کا حصّہ تھا وہ ساری کی ساری سُرخ تھی اور شاید اسی مناسبت سے ریڈ گیٹ کہلاتی تھی۔ غالباً اس زمانے میں بجلی کی گھنٹی کا رواج نہیں تھا یا ممکن ہے مجھے اس کا علم نہ رہا ہو۔ میں نے زنجیر کھٹ کھٹائی۔ ملازم باہر آیا جس سے میں نے مُلّا صاحب کے بارے میں دریافت کیا اور کارڈ دے دیا۔

مجھے فوراً ہی واپس آجانا چاہیے تھا لیکن شاید اس خیال سے کہ کوئی جواب ملے یا معلوم نہیں کیوں میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ اتنے میں کرتے پاجامے اور گرم سیاہ واسکٹ میں ایک سرخ و سفید شخص مکان سے برآمد ہوا۔ آنکھ کے اشارے سے دریافت کیا کہ کیا دعوت نامہ میں ہی لایا ہوں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ دروازہ ایک بڑے سے صحن میں کھلتا تھا جہاں ایک تخت پر سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک خاتون انگریزی کا کوئی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ نظر اٹھا کر انھوں نے ہماری طرف دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے لگیں۔

بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ یونیورسٹی کی مشہور و معروف طالبہ اور مُلّا صاحب کی بیٹی چترا مُلّا تھیں۔

مُلّا صاحب مجھے اپنے سادگی سے سجائے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے گئے، علیم صاحب کو سلام کہلایا، شادی کی تقریب میں شرکت کا وعدہ کیا اور چائے پلانے کے بعد ہی رخصت ہونے دیا۔ یہ دن اتوار کا رہا ہوگا۔

میں اسی سال ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے لکھنؤ آیا تھا۔ یہاں کے اخلاق و آداب سے واقف نہ تھا۔ یہ تک نہیں جانتا تھا کہ مُلّا صاحب کا شمار شہر کے ممتاز ترین وکیلوں میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے میں نے اُن کی جانب اس عزّت و احترام کا مظاہرہ نہ کیا ہوگا جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن مجھ جیسے خام کار نوجوان سے وہ جس محبت سے پیش آئے تھے اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

مُلّا صاحب کو پہچانا دس برس بعد، جب اولڈ انڈیا کافی ہاؤس میں میرا آنا جانا شروع ہوا۔ کار کی چابی کی زنجیر ان کی انگلیوں میں رقصاں رہتی۔ ہر شخص ان سے یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کے سربراہ ڈی۔ پی۔ مکرجی، ڈاکٹر عبدالعلیم اور نیشنل ہیرالڈ کے مشہور ایڈیٹر ایم جیلا چی راؤ کی طرح عزّت و احترام سے پیش آتا۔ ایک ایک لفظ تول کے ان سے گفتگو کرتا۔ مجاز اور سلام مچھلی شہری کے علاوہ، جن پر سات خون معاف تھے۔

مُلّا صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت کرتے، پابندی سے نہیں، لیکن اکثر و بیشتر۔ کبھی کبھی اپنا کلام سُناتے اور بحث و مباحثے میں حصّہ لیتے۔ نپے تُلے مختصر جملے ٹھہر ٹھہر کر بولتے۔ کبھی کبھی ان کی دلیلوں میں قانون کی چھینٹ بھی نظر آتی۔

بعد میں بزمِ ادب کے جلسوں میں جو سید صدیق حسن، حبیب احمد صدیقی، چند دوسرے آئی سی ایس افسران اور مُلّا صاحب کے دولت کدوں پر ہوتے اور جن کے سلسلے میں امین سلونوی، رضا انصاری اور عمر انصاری صاحب خاصے سرگرم رہتے، کبھی کبھی میرا گذر بھی ہو جاتا۔ ایسی ہی ایک نشست میں جو پریس کلب کے پاس اور سابق امریکن لائبریری کے سامنے مُلّا صاحب کے مکان پر ہوئی تھی، اُس وقت کے وزیر اعلا سمپورنانند نے اپنی غزل سُنائی تھی۔ یہ غزل انھوں نے اُردو رسم الخط میں لکھی تھی اور بعد میں انہی کی تحریر میں اور ان کے دستخط کے ساتھ قومی آواز میں شائع ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں قومی آواز میں غالباً سب سے جونیر سب ایڈیٹر تھا۔

مُلّاصاحب یوپی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو انھوں نے کافی ہاؤس اور ادبی نشستوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ سبب اس کا صرف یہ تھا کہ وہ عہدے کا وقار قائم رکھنے کے لیے ذرا الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ اس میں کسی قسم کا غرور ہرگز شامل نہ تھا۔ اس عہدے سے سبک دوش ہونے کے شاید اگلے ہی دن وہ حسبِ سابق کار کی چابی کا چھلا انگلیوں میں گھماتے، سفید شیروانی، سفید ٹوپی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس کافی ہاؤس کچھ اس طرح آئے جیسے وہاں جانا انھوں نے کبھی ترک ہی نہ کیا ہو۔

شاعری، اُردو پرستی اور اپنے پیشے میں مہارت کے سبب وہ اہم شخصیت پہلے بھی تھے لیکن اس دوران جب وہ ہائی کورٹ کے جج تھے، ان کے ایک فیصلے نے انھیں یکایک ملک گیر شہرت کا مالک بنا دیا، جو یوپی پولیس کے خلاف تھا۔ ان کا یہ فیصلہ شاہ سرخیوں کے ساتھ ہندستان کے سارے اخباروں میں شائع ہوا اور اس پر اداریے لکھے گئے۔ بعد میں سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو مسترد کردیا، لیکن اس سے مُلّاصاحب کی شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اتفاق سے محمد نعیم نامی میرے ایک عزیز، جو مشہور صحافی لکشمی کانت تیواری کے کلاس فیلو اور انھی کی طرح ہاکی کے معروف کھلاڑی تھے، بطور پولیس انسپکٹر اس مقدمہ میں ماخوذ تھے اور مُلّاصاحب کے فیصلے کا اصل نشانہ وہی تھے۔ برسوں بعد میں نے مُلّاصاحب سے نعیم صاحب اور اپنے رشتہ داروں کا ذکر کیا تو یکایک وہ خاموش ہو گئے۔ چند لمحوں بعد انھوں نے کہا:

"میں نعیم صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے یہ سوچ کر کہ نعیم بھائی کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے، انھیں اپنے ساتھ لے کر آنے کا وعدہ کرلیا۔ لیکن میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب نعیم بھائی نے مُلّاصاحب سے ملاقات کرنے سے انکار کردیا۔

کئی دنوں بعد جب میں مُلّاصاحب کے یہاں گیا تو میرا خیال تھا کہ وہ اس بات کو بھول چکے ہوں گے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انھوں نے پوچھا،

"آپ نعیم صاحب کو نہیں لائے؟"

میں نے نعیم بھائی کے دوٹوک انکار میں گل بوٹے ٹانک کر نرم ترین الفاظ میں انھیں صورتِ حال سے مطلع کیا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ان کے چہرے پر رنج و غم کی علامات ظاہر تھیں۔ میری جانب خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں نم ہیں۔ حالات کے اس غیر متوقع موڑ کے لیے میں قطعاً تیار نہ تھا، بے حد پریشان ہوگیا۔ میری پریشانی بھانپتے ہوئے انھوں نے کہا:

"میں عدالت کے باہر اُن کا نقطۂ نظر جاننا چاہتا تھا۔"

جواب کیا دیتا، خاموش رہا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

برسوں بعد کانگریس نے شہر کے مشہور صنعت کار وی۔ آر۔ موہن کو کانگریس کا ٹکٹ دیا تو ساری مخالف سیاسی جماعتوں نے، جن میں کمیونسٹ پارٹی پیش پیش تھی، مُلّاصاحب کو بطور آزاد امیدوار مقابلہ کے لیے آمادہ کرلیا۔ میں اُن دنوں نیشنل ہیرالڈ میں سب ایڈیٹر تھا۔ نیشنل ہیرالڈ کانگریس بلکہ نہرو خاندان کا اخبار ہونے کے باوجود وی۔ آر۔ موہن کی مخالفت کررہا تھا۔ چیلاپتی راؤ نے کانگریس کے فیصلے کے خلاف اداریے بھی لکھے تھے اور کھل کر مُلّاصاحب کی حمایت کی تھی۔ دلیل ان کی یہ تھی کہ کانگریس میں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی بالادستی سے پارٹی کے اصولوں کو ضرب پہنچے گی۔

اُن دنوں اندرا گاندھی وزیرِ اعظم اور کانگریس کی صدر تھیں۔ کانگریس کو ووٹ دینے کی اپیل پورے صفحہ کے اشتہار کی صورت میں بڑے روزناموں میں شائع ہوتی۔ اس اشتہار میں اندرا گاندھی کی تصویر اور عبارت تو وہی رہتی، بس حلقۂ انتخاب کی مناسبت سے اُمیدوار کا نام بدل جاتا۔ لکھنؤ اور کان پور کے علاوہ متعدد مقامات کے کانگریسی امیدواروں کے سلسلے میں اشتہارات نیشنل ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون میں شائع ہوتے۔ ایک دن شعبۂ اشتہارات کے منیجر نے ڈرتے ڈرتے چیلاپتی راؤ سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ ملاقات اگلے دن ہوئی جس کے دوران انھوں نے کانگریس کا وہ اشتہار جس میں وی۔ آر۔ موہن کو ووٹ دینے کی اپیل کی گئی تھی، انھیں دکھایا۔ اشتہار دیکھتے ہی راؤ صاحب آگ بگولہ ہوگئے اور اشتہار ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے انھوں نے انگریزی میں کہا:

"اخبار کی پالیسی کے خلاف کوئی اشتہار نیشنل ہیرالڈ میں کیسے شائع ہوسکتا ہے؟"

چنانچہ یہ اشتہار نیشنل ہیرالڈ میں شائع نہیں ہوا اور اخبار مُلّاصاحب کی انتخابی مہم کی خبریں تفصیل سے شائع کرتا رہا۔

اس واقعہ کا مُلّا صاحب سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں، لیکن اس سے اس وقت کی سیاست، صحافت اور خود لکھنؤ کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے جس کی ایک اہم شخصیت آنند نرائن مُلّا تھے۔ افسوس! اب یہ سب کچھ داستان پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی سے تعلق اور مُلّا صاحب سے تھوڑی سی قربت کے سلسلے میں اپنی بساط بھر میں بھی ان کی انتخابی مہم میں سرگرم تھا۔ ڈالی گنج کا سارا علاقہ وی۔ آر۔ موہن کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اتفاق سے ڈالی گنج میں نعیم بھائی کا مکان فیض آباد روڈ پر تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد سلیم ڈالی گنج میں بے حد مقبول تھے اور برسوں سے وہاں کی مشہور رام لیلا کمیٹی کے سب کچھ۔ کچھ دن قبل بطور آزاد امیدوار انھوں نے میونسپل بورڈ کی ممبری کے لیے الکشن لڑا تھا۔ دُور کنی حلقے میں کمیونسٹ پارٹی نے ڈالی گنج سے سوہن لال اور شنکر لال کو اپنا امیدوار بنایا تھا۔ سلیم بھائی کے لیے ایک نشست جیتنا کچھ ایسا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا، کیوں کہ شنکر لال مقابلتاً کمزور امیدوار تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سے اپنے تعلق کی وجہ سے میں نے سوہن لال اور شنکر لال کے لیے کھل کر کام کیا تھا۔ سلیم بھائی کا سامنا ہو جاتا تو ایک عجیب سا احساس ضرور ہوتا لیکن نظریات کی لڑائی میں رشتہ داری کی کیا اہمیت۔ یادش بخیر وہ زمانہ سیاست تک میں نظریے کی بالادستی بلکہ حکمرانی کا تھا۔ سلیم بھائی صرف چند ووٹوں سے ہار گئے اور محلہ والوں نے کہا کہ بھیّا گھر کے داماد کی مخالفت کی وجہ سے ہار گئے۔

وی۔ آر۔ موہن رام لیلا کے سلسلے میں خاصی مدد کیا کرتے تھے اس لیے سلیم بھائی سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے ملّا صاحب کی حمایت کرنے کی درخواست کی تو انھوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن چند دنوں کے بعد جب میں نے مُلّا صاحب کی انتخابی مہم کے سلسلے میں ڈالی گنج میں جلسہ کا انتظام کیا تو اسٹیج میری اہلیہ کے مکان کے چبوترے پر بنایا گیا۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل یکایک میری نظر سلیم بھائی پر پڑی تو انھوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا:

"عابد بھیّا! میں مُلّا صاحب کے لیے کام کروں گا۔"

سلیم بھائی مجھے ہمیشہ عابد بھیّا ہی کہتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف جلسے میں شرکت کی بلکہ اس کی صدارت بھی کی اور مُلّا صاحب کی حمایت میں تقریر بھی۔ مُلّا صاحب کی تقریر تو نہایت عمدہ تھی ہی۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹڈہ والی مسجد سے ڈالی گنج پل کے اطراف میں مُلّا صاحب کو بالادستی حاصل ہو گئی اور وی۔ آر۔ موہن کا گڑھ ٹوٹ گیا۔ لیکن ابھی اس واقعہ کا ذکر باقی ہے جسے بیان کرنے کے لیے میں نے یہ سارا پس منظر پیش کیا ہے۔

برسوں پہلے میں نے نعیم بھائی کا ذکر کرتے ہوئے شاید ملّا صاحب کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا مکان کہاں ہے۔ ملّا صاحب کو یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ سلیم بھائی نعیم صاحب کے بھائی ہیں۔ جلسہ ختم ہو گیا تو دوسری باتیں کرتے کرتے مُلّا صاحب نے کہا:

"نعیم صاحب شاید یہیں کہیں رہتے ہیں۔ میں جاؤں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔" میں کیا جواب دیتا۔ ان کے ساتھ نعیم بھائی کے گھر کی طرف جو بمشکل چند قدم کے فاصلے پر سڑک کی دوسری جانب تھا، چل پڑا۔ اتفاق سے نعیم بھائی موجود تھے۔

نعیم بھائی نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ چائے اور ناشتے سے ضیافت کی۔ دوران گفتگو ملّا صاحب کے استفسار پر نعیم بھائی نے کہا:

"ہمارے لیے سچ اور جھوٹ کے پیمانے عام پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ جب ہم کو کسی ملزم کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ مجرم وہی ہے تو اس پر الزام ثابت کرنے کے لیے جھوٹی گواہیاں فراہم کرنے کو ہم جھوٹ نہیں سمجھتے۔ کسی خونخوار مجرم کے خلاف کوئی شریف انسان گواہی دینے کے لیے کیسے تیار ہوگا؟"

مُلّا صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملاتے ہوئے انھوں نے نعیم بھائی سے کہا:

"آپ بھی سچے تھے اور قانون بھی سچا۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ اس ملاقات کے دوران انتخابات کے سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

یہ تھے پنڈت آنند نرائن مُلّا۔

مُلّا صاحب کو دوسری ملک گیر بلکہ اُردو دنیا گیر شہرت ان کے اس جملے کی وجہ سے ملی جس میں انھوں نے کہا تھا:

• میں اپنا مذہب بدل سکتا ہوں لیکن زبان نہیں بدل سکتا۔

یہ جملہ مُلّا صاحب کی اس عالمانہ تقریر کا حصہ تھا جو انھوں نے اُردو متحدہ محاذ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کی تھی۔ جہاں سے ایک بھی جذباتی تقریر نہیں کی گئی تھی۔ اُردو کے مسئلہ کو عملی، اصولی اور منطقی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا تھا چنانچہ اس کی گونج ایوانِ اقتدار میں دیر تک سُنائی دیتی رہی۔ سچ پوچھیے تو اُردو کے حق میں ذاکر صاحب اور حیات اللہ انصاری صاحب کی قیادت میں لاکھوں دستخطوں کے حصُول اور انھیں اس وقت کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیے جانے کے بعد مدلّل طور پر اٹھائی جانے والی یہ پہلی آواز تھی۔

اس کانفرنس کی تیاریوں کے دوران مجھے مُلّا صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کیوں کہ اس کی تیاری کے لیے جو ۹ رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں آخری نام میرا بھی تھا۔ اُردو ان کا جزوِ ایمان تھی، ہر کام وہ نہایت سلیقے سے کرتے تھے، ایک ایک تفصیل پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔ انھیں ہندی پریمیوں کے خدشات کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ اُردو کا مقدمہ اس قدر مدلّل اور غیر جذباتی طریقے سے پیش کیا گیا تھا کہ کسی ہندی پریمی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا موقع نہ ملا۔

اُردو اور اپنے مذہب کے متعلق مُلّا صاحب کا یہ جملہ الفاظ کی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دُہرایا جاتا رہا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ انھوں نے ان خیالات کا اظہار جامعہ میں تقریر کرتے ہوئے کیا تھا اور بعض دوسرے اسے جے پور کانفرنس سے منسوب کرتے ہیں جب کہ ان کا یہ جملہ رفاہِ عام کلب کی اس کانفرنس کی دین ہے جس میں سید احتشام حسین، مولانا اسحاق سنبھلی، قاضی عدیل عباسی اور ڈاکٹر فریدی ایسے مستند ادیب اور سیکولر ذہنیت کے مالک افراد شریک تھے۔ یہ واقعہ غالباً اگست ۱۹۶۴ء کا ہے۔

مُلّا صاحب اتر پردیش اردو اکادمی کی خشتِ اوّل رکھنے والوں میں شامل تھے اور ان کے دَور میں اس ادارہ کی کیا آن بان تھی۔ بعد میں اُردو اکادمی نے "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا" کے جو نمونے پیش کیے ان کے پیشِ نظر اب اس دَورِ زرّیں کو یاد کرنا بھی مشکل ہے۔

بعد میں مُلّا صاحب دہلی منتقل ہو کر سپریم کورٹ میں وکالت کرنے لگے، کانگریس کے ٹکٹ پر دو بار راجیہ سبھا کے ممبر چُنے گئے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر رہے، ہندو پاک ٹریبونل کے چیرمین تھے لیکن ان عہدوں سے ان کی عزت و وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔

مُلّا صاحب فرد ہی نہیں، انجمن بھی تھے۔ اُردو سے ان کی محبّت عملی تھی محض جذباتی نہیں۔ شاعر وہ بہت بڑے نہیں تھے۔ ان کی شاعری اور خاص طور سے نظموں پر اقبالؔ کا اثر دیکھا جا سکتا ہے، کہیں براہِ راست اور کہیں کچھ اس قسم کا جس کے سبب شبلی سرسیّد اسکول سے متعلق گردانے جاتے ہیں۔

وہ مشاعروں کے شاعر بھی نہ تھے تاہم ان میں شرکت کرتے تھے اور بیشتر صورتوں میں خاصے ناکامیاب ثابت ہوتے تھے۔ ان کی ناکامی کا سبب ان کی غزل یا نظم کا معیار ہرگز نہ تھا کیوں کہ خراب تخلیق پیش کرنے والے تک اکثر داد کے ڈونگرے بٹور لے جاتے تھے۔ مشاعروں میں ان کی ناکامی کا اصل سبب ترنّم سے کلام سُنانے پر ان کا اصرار تھا اور کمرۂ عدالت میں گونجنے والی ان کی آواز مشاعروں میں جادو جگانے سے قاصر رہتی جس کے سبب اچھے اشعار سُنا کر بھی وہ اکثر ہوٹ ہو جاتے تھے۔

مُلّا صاحب کو مشاعروں میں ہوٹ ہو جانا منظور تھا لیکن ترنّم کے بغیر، جسے مشکل ہی سے یہ نام دیا جا سکتا تھا، غزل سُنانا منظور نہ تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ آپ چاہیں تو باتیں کے بجائے ضدیں بھی کہہ سکتے ہیں۔

مُلّا صاحب کے اُٹھ جانے سے ہم ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئے جو شرافت، مروّت، اُردو پرستی اور لکھنوی تہذیب و اخلاق سے عبارت تھی۔ پنڈت سندر لال کی طرح اب اُن کے ایسا اُردو کا دوسرا شیدائی شاید ہی ان آنکھوں کو دیکھنے کو ملے۔

نعرۂ گرم انقلاب میں نے بھی ہاں سُنا تو ہے
جام و سبُو کے آس پاس دار و رسن سے دُور دُور

ہر طرف عقل ہی کے ہنگامے
دل کی آواز کھو گئی ہے کہاں

آنند نرائن مُلّاؔ

बुन्देले हरबोलों के मुँह हमने सुनी कहानी थी,
खूब लड़ी मर्दानी वह तो झाँसी वाली रानी थी।

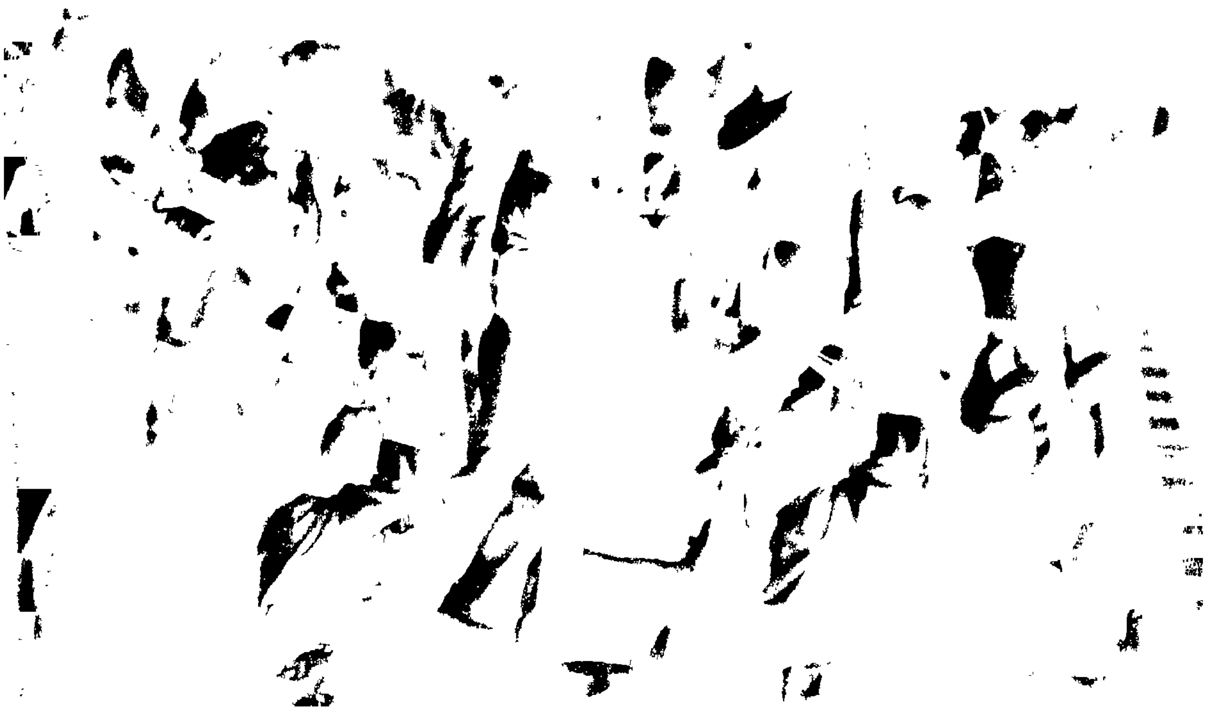
50







[illegible]



ایک غزل = ہولی کے نام

ادائے بے نیازی وہ بھی اس تیوہار ہولی میں
ہمارے ساتھ آ اور رقص کر اے یار ہولی میں

کسی بھی آئینے میں دیکھ لے تو اپنے چہرے کو
نکھر آیا ترا رنگِ لب و رُخسار ہولی میں

گلابی سبز نظاروں نے دیوانہ بنا ڈالا
ہمیں جینے کا لُطف آ ہی گیا اے یار ہولی میں

یہ رنگوں کی بہاریں اور یہ خوش رنگ نظارے
برس جا کھُل کے تو بھی گیسوئے دلدار ہولی میں

گِلے شکوے بھُلا بھی دیجیے اس موسمِ گُل میں
محبّت اور وفا کا کیجیے اظہار ہولی میں

نہ جانے کب اُجالے ڈوب جائیں شام ہو جائے
ملا لو اے عزیزو دل سے دل کے تار ہولی میں

یہی دل چاہتا ہے یہ سہانی رُت ٹھہر جائے
میں بڑھ کر روک ہی دوں وقت کی رفتار ہولی میں

وطن کی سرزمیں پر نقش بکھرا دو محبّت کے
بھرو پچکاریاں رنگوں کا ہے تیوہار ہولی میں

بشیر ایسے میں سینے میں دھڑک جائے نہ دل کیونکر
بلا کا حسن ہے رنگوں کے اس تیوہار ہولی میں

بشیر فاروقی،
۵۱۵۰ مراد علی لین
رودھان سبحانی گلی، لکھنؤ

دوہے

پھیلی ہے چاروں طرف نظاروں کی دھوپ
دل ڈھونڈے لیکن وہی، چھاؤں سا تیرا روپ

حاصل ہے شاید مجھے، حد درجہ آرام
ورنہ کیسے بھولتا داتا تیرا نام

یہ بھی اس کا میت ہے، وہ بھی اس کا میت
پھر کیوں دونوں کے قدم پڑتے ہیں وپریت

سناٹوں کو چیرتی، کوئل تیری کوک
بن جاتی ہے کس طرح، من میں اُٹھتی ہوک

حرص و ہوس کی باڑھ میں ڈوب چکا ہے شہر
اہلِ نظر پر اور کیا ٹوٹے گا اب قہر

ہو جاتا ہے بے صدا، جیسے ٹوٹا چنگ
کرنی پڑتی ہے جسے تنہائی سے جنگ

کل تک تھی جو زیست کے گلدانوں کا پھول
آج وہی شائستگی چاٹ رہی ہے دھول

احترام اسلام
۵۱۶/۵۳۷ اتر سوئیا
الہ آباد
۲۱۱۰۰۳

بلراج کومل
اے ۱۳۹، کالکاجی - نئی دہلی
۱۱۰۰۱۹

آزادی کے بعد

اُردو ناول : انسانی اور سماجی سروکار

طلوعِ آزادی اور برصغیر کی تقسیم نے ہندستان اور پاکستان میں بہت سے ایسے پیچیدہ سیاسی، اقتصادی، ثقافتی، معاشرتی مسائل پیدا کیے جو وقت گزرنے کے ساتھ بتدریج پیچیدہ تر ہوتے گئے۔ طلوعِ آزادی کے بعد جو مسئلہ فوری طور پر پیدا ہوا وہ وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ اور اس کے نتیجے میں ہندستان سے پاکستان میں اور پاکستان سے ہندستان میں لاکھوں کروڑوں بے سروسامان افراد پر مشتمل آبادی کا انتقال تھا۔ یہ عمل محض ایک جسمانی یا ارضی نوعیت کا عمل نہیں تھا، پورے معاشرے کی شکست و ریخت کا عمل تھا مستحکم رشتوں، مستحکم تہذیبی ثقافتی اداروں اور قدروں کے ٹوٹنے کا عمل تھا۔ جڑوں سے کٹنے اور ازسرِنو جڑوں کی تلاش کرنے کا عمل تھا۔ تقسیم ہند نے نہ صرف انسانی ذہن کو مجروح کیا اور سیاسی اور سماجی تضادات کے ایک لامختتم سلسلے کو جنم دیا بلکہ ایسے منفی عناصر کو دونوں ملکوں کے معاشرے پر حاوی ہونے کا موقع فراہم کیا جو نجی مفادات کو سماجی تقاضوں پر ترجیح دیتے تھے۔

ادب کے جملہ سروکار انسانی اور سماجی ہیں۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر کارزارِ حیات کے مظاہر کے درمیان ابلاغ اور ترسیل کی رمزوں سے سرفراز بالکمال تخلیق کاری تک ـــ سب سروکار انسانی اور سماجی ہیں۔

آزادی کے بعد کے اُردو ناول کا ایک حصّہ ان ناولوں پر مشتمل ہے جو تقسیم ہند اور تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے کچھ برسوں میں رونما ہونے والے ناخوشگوار واقعات، فسادات اور آبادی کی کرب آمیز ہجرتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کے بحران کو دائرہ اظہار میں لاتے ہیں جو صدیوں کے سفر میں ہماری ثقافت کی بنیادی قدر کے طور پر مستحکم ہو چکی تھی۔ قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، عبداللہ حسین، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، جوگندر پال سب اقدار کے زوال و انہدام کے نوحہ خواں ہیں۔ کرشن چندر، شوکت صدیقی اور کسی حد تک عبداللہ حسین کے یہاں جبکہ اقدار کے زوال و انہدام کا یہ منظرنامہ سادی انداز میں وکٹورین انداز کی سماجی دستاویز کے قریب ہے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے یہاں یہ منظرنامہ بنیادی انسانی نوعیتوں کی داستان بن جاتا ہے اور اس داستان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں محض حالات و واقعات کا دستاویزی بیان چونکہ ان مصنفین کے نزدیک ناکافی ہے اس لیے ان کے یہاں تاریخ، روایت، قصّہ کہانی، دیومالا، تمثیل، علامت اور کئی دیگر متفرق عناصر تخلیقی عمل کا حصّہ بن جاتے ہیں اور ان کی تخلیقات کو وسیع ہمہ جہت تناظر عطا کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے بیشتر ناول اگرچہ عہدِ حاضر میں طلوع ہوتے ہیں لیکن وقت کی تجسیم، تاریخ کی ناگزیریت اور انسانی ہمدردیوں کے جزیروں کی سرسبزی و شادابی ان ناولوں کو ماورائے حدود کون و مکان لے جاتی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں وقت اور اقدار کے زوال و انہدام کا تصور قرۃ العین حیدر کے مقابلے میں قدرے مختلف نوعیت کا ہے۔ استعارہ، داستان، کتھا، علامت، تمثیل، لے جنڈ، دیومالا، Allegory Fable Parable Myth سب مل کر ماضی کی بازیافت سے لے کر عصرِ حاضر کے ادراک کا ایک بھرپور فن کارانہ تجربہ عطا کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول 'بہاؤ'، فن کارانہ تہذیبی اور ثقافتی بازیافت کی ایک اور عمدہ مثال ہے۔ نیّر مسعود کے ناولٹ پُراسرار تہذیبی تناظر میں بنیادی انسانی سروکاروں کی اعلیٰ تجسیم کے نمونے ہیں۔

ہجرت کے کرب کا ایک پہلو جہاں جڑوں سے کٹنے سے متعلق ہے وہیں اس کا دوسرا پہلو دیارِ غیر میں جڑوں کی تلاش سے عبارت ہے۔ جڑوں سے کٹنے کے کرب اور دیارِ غیر میں جڑوں کی تلاش کے کرب کا اظہار قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور دیگر ناول نگاروں کے یہاں اگرچہ ہمہ گیر انداز میں موجود ہے لیکن دیارِ غیر میں ازسرِنو رشتے، وابستگیاں، ہمدردیاں استوار کرنے کے کرب ناک عمل کا تخلیقی اظہار جس انداز میں جوگندر پال نے 'خواب رو' میں کیا ہے

وہ اپنے آپ میں ایک منفرد مثال ہے۔

تضاد، شدید ردعمل، تشدد اور ہجرت سمیت ان سب کے متعلقات اگرچہ ازلی اور ابدی طور پر انسانی تاریخ کا حصہ رہے ہیں لیکن آزادی کے بعد کے دور میں ہندستان اور پاکستان ــــ دونوں ملکوں میں ان کی صورت قدرے مخصوص نوعیت اختیار کر گئی ہے۔ ایک ہجرت وہ ہے جو جبر و تشدد کے ماحول میں ناگزیر ہو جاتی ہے۔ دوسری ہجرت وہ ہے جو خود اختیاری ہے۔ ایک طرف وہ جو سماجی قدریں ہیں جو مشترکہ وابستگیوں کو جنم دیتی ہیں۔ انسانی یک جہتی کا ماحول پیدا کرتی ہیں۔ دوسری جانب وہ قدریں ہیں جو محدود وابستگیوں کی حد تک محفوظ ہونے کے باوجود منافق سماجی ردعمل کو جنم دیتی ہیں، انتشار کا ماحول پیدا کرتی ہیں۔ اگر کسی سماج میں کوئی فرقہ تعداد کے اعتبار سے چھوٹا یا اقلیتی ہونے کے باوجود اپنے سے مقابلتاً بڑے فرقے یا فرقوں کے ساتھ ترسیل و ابلاغ کی راہیں استوار کر لیتا ہے تو وہ نام سے اقلیتی ہونے کے باوجود سماجی ہم آہنگی کے ماحول کا حصہ بن جاتا ہے۔

فسادات ــــ مذہبی، سیاسی، فرقہ وارانہ ــ چاہے وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں۔ عام طور پر اقتصادی ناہمواریوں سے جنم لیتے ہیں اور قبائلی وابستگیوں کے درمیان نجی مفادوں کے حصول کے ماحول میں منافق، مفاسد، افراد، گروپ، فرقے اور سیاسی عناصر فسادات کے ذریعہ غارت گری کو ایک منظم کاروبار بنا دیتے ہیں۔

جبر و تشدد اور ذاتی مفادات کے حصول اور سوچی سمجھی ہوئی سازشوں کے تحت وسیع انسانی آبادیوں پر نازل کی گئی ہجرتیں بیسویں صدی میں عالمی سطح پر انسانی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہندستان اور پاکستان بھی ان سب سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ عصری اردو ناول نے بھی ان سب مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ خود اختیاری ہجرت لوگ یا تو اس وقت اختیار کرتے ہیں جب وہ اقتصادی، جذباتی، احساساتی سطح پر اپنے آپ کو اپنے اردگرد کے افراد، فرقوں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتے۔ آزادی کے بعد کے برسوں میں جبری اور خود اختیاری ہجرتیں اور گاؤں اور چھوٹے قصبوں سے بڑے شہروں کی جانب آبادی کا انتقال گاؤں اور شہر دونوں کے مسائل کو پیچیدہ تر بنانے کے موجب ثابت ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال کے آزادانہ تخلیقی اظہار کی مثالیں ہمیں دیگر متفرق عناصر کے ساتھ عہدِ حاضر میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبد الصمد، ظفر پیامی، عبد اللہ حسین، جوگندر پال، جتندر بلو، پیغام آفاقی، ہرچرن چاولہ، انور خاں، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی اور الیاس احمد گدی کے یہاں ملتی ہیں۔

ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں عہدِ حاضر کا گاؤں وہ گاؤں نہیں رہا جو پریم چند کے زمانے کا گاؤں تھا یا پریم چند کے ناولوں کے صفحات سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔ یہ گاؤں بھی بحران کی زد میں آ گیا ہے۔ ذرائع ترسیل اور مواصلات کی یلغار میں اس گاؤں کے خدوخال مسخ ہو گئے ہیں۔ وہ گاؤں چاہے غلام الثقلین نقوی کا گاؤں ہو یا بلونت سنگھ کا یا راجندر سنگھ بیدی کا قصبہ، یا گیان سنگھ شاطر کا گاؤں ــــ بنیادی معصومیتوں کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں بتدریج شہری آلائشوں کی زد میں آتا جا رہا ہے۔ گاؤں اور شہر کے تعلق سے جمیلہ ہاشمی، بلونت سنگھ، گیان سنگھ شاطر اور مستنصر حسین تارڑ (اپنے ناول 'راکھ' میں) انسانی رشتوں کے تضاد و توازن کا ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جو جزئیات و تفصیلات کی ریل پیل میں بعض ناقابلِ فراموش نمائندہ کرداروں کی جسمانی، روحانی اور جذباتی رزم گاہ بن جاتا ہے۔

حال کے برسوں میں کچھ ایسے اہم ناول سامنے آئے ہیں جو اقلیتوں، استحصال کی زد میں آئے ہوئے لوگوں، مردوں، عورتوں کے مسائل مشروط خوابوں اور خوش گوار امکانات کا سہارا لیے بغیر پیش کرتے ہیں۔ عبد الصمد کے ناول 'دو گز زمین' اور 'خوابوں کا سویرا'۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول 'بیان' اس سلسلے کی قابلِ ذکر مثالیں ہیں۔

آزادی کے بعد وجود میں آنے والے عصری ناول کا ایک قابلِ ذکر پہلو روایتی، مذہبی، اخلاقی روایتوں سے انحراف ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ممتاز مفتی، مستنصر حسین تارڑ، گیان سنگھ شاطر، ریوتی سرن شرما، شموئل احمد اس نوعیت کے انحراف کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہ لوگ نروان، نجات، مکتی کی کوئی راہ نہیں سجھاتے صرف جذباتی، فکری یا احساساتی دریافت کی ایسی اوڈیسی رقم کرتے ہیں جو اپنے آپ میں انسانی آویزشوں کی جاری و ساری داستان ہے۔ جو سفر 'آگ کا دریا'، 'خدا کی بستی'، 'علی پور کا ایلی' سے شروع ہوا تھا وہ 'گردشِ رنگِ چمن'، 'چاندنی بیگم'، 'تذکرہ'، 'آگے سمندر ہے'، 'الکھ نگری'، 'راکھ'، 'نزی'، 'سفر بے منزل' اور گیان سنگھ شاطر تک پہنچتے پہنچتے انکار و اثبات کی ہمہ جہت کیفیتوں سے سرفراز ہو گیا ہے ــــ

جہاں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین انسانی رشتوں کے زیر و بم سے گزرتے وقت رسمی اخلاقی یا مروجہ رکھ رکھاؤ کے احترام کی حدود میں رہتے ہیں وہاں ممتاز مفتی، گیان سنگھ شاطر، مستنصر حسین تارڑ، ریوتی سرن شرما (سفر بے منزل) شموئل احمد پورا سچ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین عورت اور مرد کے رشتے کے مختلف پہلوؤں کا ذکر اکثر و بیشتر محفوظ حدود میں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ممتاز مفتی، گیان سنگھ شاطر، تارڑ اور ریوتی سرن شرما کے یہاں نسبتاً کھلا اور کشادہ رویہ ہے۔ ممتاز مفتی، گیان سنگھ، ریوتی سرن اور شموئل احمد نے کچھ ایسے نسوانی کردار تخلیق کیے ہیں جو اپنی راہ اپنے طور پر تلاش کرنے کے کفیل ہیں۔

اقدار کے زوال و انہدام کا منظر نامہ کم و بیش تمام عصری ناولوں کا حصہ ہے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے یہ منظر نامہ ایک ہمہ گیر ثقافتی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خالص سامنے کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی بہترین مثالیں ہمیں شوکت صدیقی، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، عبدالصمد، حسین الحق، ظفر پیامی، انیس ناگی، مشرف عالم، پیغام آفاقی اور الیاس احمد گدی کے یہاں ملتی ہیں۔ ان تخلیق کاروں نے براہ راست انداز میں سیاسی، مذہبی اخلاقی ابتری اور پراگندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ عبدالصمد، شفق، حسین الحق، اور مشرف عالم ذوقی نے بطور خاص تعلیمی اداروں اور ثقافتی تنظیموں کی پراگندگی کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ عبدالصمد نے 'خوابوں کا سویرا' میں ایک مثبت امکان کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ انسانی ہمدردی کا ایک محدود جزیرہ بھی ایک نئے مثبت سفر کا امکان ہو سکتا ہے۔ جوگندر پال، نظر الزماں اور غضنفر نے حقیقت پسندانہ اور علامتی رویوں کی آمیزشوں سے تصویر عصر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کے حوالے سے اور تاریخ کے تناظر میں عصر کو سمجھنے کی بہترین مثالیں ہمیں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، حیات اللہ انصاری، قاضی عبدالستار، مستنصر حسین تارڑ کے یہاں ملتی ہیں۔ عصری اُردو ناول میں نجی انفرادی احتجاج تو کہیں کہیں موجود ہے لیکن الیاس احمد گدی کا ناول 'فائر ایریا' اجتماعی احتجاج کی جانب واضح اشارہ ہے۔

خالص تانیثی ناول غالباً اُردو زبان میں ابھی اس صورت میں پیدا نہیں ہوا جس صورت میں دیگر زبانوں میں موجود ہے۔ جہاں جیلانی بانو حیدرآباد کے مخصوص تناظر میں نسوانی مسائل کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ ساجدہ زیدی کا ناول "موجِ ہوا پیچاں" میری نظر میں ایک خاتون کا لکھا ہوا ایسا ناول ہے جو عورتوں اور مردوں کے نارمل باہمی جنسی رشتوں کے علاوہ کچھ نسبتاً پیچیدہ رشتوں کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ نسوانی خود مختاری کی مثالیں ہمیں شموئل احمد کے ناولٹ "ندی" اور ریوتی سرن شرما کے ناول "سفر بے منزل" میں ملتی ہیں۔ شموئل احمد کے ناولٹ میں عورت کی خود مختاری اور پہچان کی تلاش ازدواجی رشتے کی ناکامی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ریوتی سرن شرما کے یہاں یہ تلاش ازدواجی رشتے سے بے نیاز ہے۔

عہدِ حاضر حادی انداز میں یک جہتی کے بجائے انتشار اور شکست و ریخت کا دور ہے۔ بڑی اکائیاں ہمارے دیکھتے دیکھتے چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم ہوگئی ہیں۔ برصغیر ہند کی ۱۹۴۷ء میں تقسیم اسی صدی کی لاتعداد مثالوں میں سے ایک ہے۔ حال کے برسوں میں ہمارے آنکھوں کے سامنے سوویت یونین چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بکھر گئی۔ بوسنیا، چیکوسلواکیہ کے ٹکڑے ہو گئے۔ خود برصغیر کی تقسیم کے طور پر وجود میں آنے والے ملکوں میں مرکز سے دُور ہٹ کر اپنی نجی انفرادی شناخت پر اصرار کرنے کا رویہ عام ہو گیا۔ تشدد صرف محدود تصوّر نہیں رہا بلکہ اپنی کارکردگی اور دہشت کے پھیلاؤ کے باعث ملکی، بین الملکی سطح پر غارت گری کا سلسلہ بن گیا۔ ہجرت کا تجربہ صرف کچھ محدود لوگوں، فرقوں، آبادیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ خطرناک حد تک عالمی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ آدم کشی محض آدم کشی نہیں رہی اجتماعی انسان کشی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ لوگ اپنے ممالک کی جغرافیائی حدود میں بے گھری کا شکار بن گئے ہیں۔ سیاسی دہشت گردی مذہبی بنیاد پرستانہ دہشت گردی اور نجی مفاد پرستانہ دہشت گردی زندگی کا معمول بن گئی ہیں۔ شکست و ریخت اور تہذیبی انتشار کا روز افزوں سلسلہ جب گھر کے اندر تک پہنچ گیا تو رشتوں کی آویزشیں تمام مثبت وابستگیوں پر حاوی ہو گئیں گھر کے اندر اور باہر دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک لامحدود بحران ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی، ماحولیاتی آلودگی، مفاد پرستی، خود غرضی، انا پسندی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی، ثقافتی پراگندگی رو بہ زوال تہذیبی سفر اس بحران کو مزید گہرا اور شدید تر کرتا جا رہا ہے۔

اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والے تمام تر سروکار انسانی اور سماجی ہیں۔ آزادی کے بعد اُردو ناول نگاروں نے ان سب کا احاطہ کیا ہے جاگیرداری کے خاتمے کے بعد 'میرے بھی صنم خانے' کی زخشندہ بقول شخصے

'زوال، ویرانی، افلاس اور اُداسی کی تصویر بن گئی ہے ':

" رخشندہ آتش دان کے پاس ایک پُرانے سُرخ رنگ کے مَیلے صوفے پر، جس کے ٹوٹے ہوئے اسپرنگ نیچے کو دھنس گئے تھے، اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے بیٹھی رہی اور پلکیں جھپکاتی رہی۔ "سارا دن گزر گیا"۔ اس نے پھر دُہرایا۔

دریچے کے باہر ہوائیں زرد پتوں کو اِدھر سے اُدھر اُڑاتی ہیں ـــــ سارا دن گزر گیا کوئی نہیں آیا۔ کوئی نہیں آیا' سارا دن گزر گیا۔"

"آگ کا دریا" میں قرۃ العین حیدر وقت کے دریا کے ہمراہ سفر کرنے اور تمام مراحل اور تاریخ کے نشیب و فراز کو اپنے وجود میں جذب کرنے کے بعد جب "چاندنی بیگم" کے پاس پہنچیں تو اس احساس کے ساتھ:

" ندی میں بڑا زبردست سیلاب آیا۔ ریڈ روز کا ملبہ بہا لے گیا ساتھ ہی متوفین کی ہڈیاں بھی ندی میں پہنچ گئیں....."

اقدار کے زوال اور نجی مفادات سے خودغرضانہ وابستگی نے انسان کی تصویر مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ انیس ناگی کا اعتراف ملاحظہ کیجئے:

" میں ایک خودغرض معاشرے کا باشندہ ہوں جس کی سوچ صرف اپنی ذات تک محدود ہے' مجھے دوسروں سے صرف اس حد تک دلچسپی ہے کہ وہ مجھے کسی حد تک فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ میں پہلے سالم تھا' پھر مجھے مسمار کر دیا گیا۔ اب کچھ بھی نہیں ہوں' صرف ایک ڈھیر ہوں، اس لیے خطرے کی اخلاقیات سے آزاد ہوں"۔

(دیوار کے پیچھے)

عبدالصمد نے 'خوابوں کا سویرا' میں اگرچہ ہندستان کی مسلم اقلیت کے مسائل کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ انھوں نے اس تعلق سے بلالحاظ مذہب و ملت ان تمام لوگوں کے مسائل کی تصویر کشی کی ہے جو ہندستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں لاتعداد متفرق وجوہ کی یلغار میں بے یار و مددگار الگ تھلگ پڑ گئے ہیں۔ غارت گری کے عمل میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب برباد ہو جاتے ہیں لیکن غارت گری' دہشت گردی اور تشدد کے ہدف سب سے زیادہ عورتیں اور بچے ہی بنتے ہیں۔

" یہاں جوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھی عورتیں تھیں' ان کے چہرے پر کچھ عجیب قسم کے تاثرات تھے۔ آنکھیں بہتے بہتے خشک ہو چکی تھیں اور آنکھوں کی روشنیوں سے اب کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا کیوں کہ وہ سب کی سب بنا سمت آنکھیں کھولے بہتی تھیں۔ ان کے مرد مار ڈالے گئے تھے، کسی کا شوہر، کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا باپ ـــ اب ان کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ جو ہاتھ ان کی حفاظت میں اٹھے ہوئے تھے وہ کاٹ دیے گئے ۔"

(خوابوں کا سویرا)

'خوابوں کا سویرا' کی کلثوم اور 'فائر ایریا' کا سہدیو اور ختو نیا احتجاج کی متکلم صورتیں ہیں۔

میں نے یہ اقتباسات منظرِ عصر کے کچھ پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کے لیے پیش کیے ہیں۔ آزادی کے بعد اُردو ناول کے سروکار۔ انسانی اور سماجی سروکار اگرچہ متنوع اور ہمہ گیر تھے اور مختلف ناول نگاروں نے اپنی بساط کے مطابق ان کی تخلیقی تجسیم کاری کی (اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے) لیکن یہ تجسیم کاری بعض اوقات جزئیات و تفصیلات کا انبوہِ گراں بن کر رہ گئی بعض اوقات کرب عصر کی جزوی تصویر' بعض اوقات محض خاکہ بعض اوقات صحافتی دستاویز۔ مستثنیات کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہے' لیکن ایسی کچھ کم بھی نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڈ، جوگندر پال، عبدالصمد، گیان سنگھ شاطر، الیاس احمد گدی اعلیٰ فنی حصول کی چند نمائندہ مثالیں ہیں۔ آگ کا دریا۔ اُداس نسلیں۔ خدا کی بستی۔ بہاؤ۔ راکھ۔ خواب رو۔ راجہ گدھ۔ خوابوں کا سویرا۔ فائر ایریا ـــ اور گوتم نیلمبر' رخشندہ' چمپا۔ علی پور کا ایلی۔ بھائی امی (رتن سنگھ) ہمیں سب عزیز ہیں۔ لیکن وہ اُردو ناول جو رزمیہ انداز میں عصر کے سارے منظر نامے کو اس کے تمام تر تضادات اور امکانات کے ساتھ پیش کر سکے اور دوستوفسکی کے میتا اور کزنتزاکی کے زوربا دی گریک جیسا کوئی کوہ قامت اور ہمہ جہت کردار تخلیق کر سکے فی الحال معرضِ امکان میں نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر کے الفاظ میں، ہر سال گومتی کی باڑھ ملبہ سمیٹ لے جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ زمین اب ہموار ہو چکی ہے۔ سرسبز اور زرخیز۔ موسم گل جب

بسنت

ہر ایک سمت مسرت کی ہے گھٹا چھائی
صبا کے دوش پہ فطرت نے لی ہے انگڑائی
روش روش پہ مچلنے لگی ہے رعنائی
بسنت آتے ہی صحن چمن لہکنے لگا
کلی کا جسم گلوں کا بدن مہکنے لگا

ہرے بھرے یہ مناظر یہ پیارا پیارا سماں
یہ زندگی کا ترنم یہ آرزو کا جہاں
ہر ایک شے ہے سہانی ہر ایک دل ہے جواں
بسنت پھولوں کا میلہ ہے کیف و رنگ لیے
مسرتوں کا خزانہ ہے اپنے سنگ لیے

پپیہا آم کے باغوں میں گنگناتا ہے
لچکتی شاخوں پہ بھونرا سکون پاتا ہے
زمیں کے فرش پہ سبزوں کو وجد آتا ہے
عروس نو کا تبسم لیے بہار آئی
گلوں کی بزم میں بجنے لگی ہے شہنائی

سہانی صبح سے بڑھ کر سہانی شام لگے
کلی کا روپ مجھے میکدے کا جام لگے
کسی حسین کا یہ حسن انتظام لگے
جدھر بھی دیکھیے فطرت کا بول بالا ہے
ہر اک شجر کے گلے میں گلوں کی مالا ہے

شبنم گورکھپوری
۱۵۴۔ رودر پور۔ گورکھپور-۱۔۲۷۳۰۰۱

پُروائی

پیپل کے سائے سائے
پُروائی گیت سنائے
ڈال کے بادل کا گھونگھٹ
وہ پیا مِلن کو جائے
دُھوپ کی ڈوری پر وہ اپنی
چُنری کبھی سُکھائے
اور کبھی شبنم کے موتی چُن چُن رُوپ سجائے
آئے ہیں پردیس سے ساجن
لال دوپٹہ لے کر
پائل، جھُومر، بندیا، مہندی، ٹیکا، کنگنا لے کر
برہن کی ماری کو ظالم کیسے خواب دکھائے
پُروائی گیت سُنائے

مَلِکہ نسیم
۳۵۴۳، باریوں کی گلی
موتی کٹلہ بازار
جے پور

رئیس احمد نعمانی
۱۸/۱۱۸ اے، کوکو کالونی (نئی آبادی)
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

کتب خانۂ شبلی نعمانی لکھنؤ کے

طبّی مخطوطات اردو

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا کتب خانہ "کتب خانۂ شبلی نعمانی" کے نام سے موسوم ہے اور مشرقی علوم وفنون سے متعلق مختلف موضوعات پر تلاش وتحقیق سے دل بستگی رکھنے والوں کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس کتب خانے کی ایک لاکھ سے زائد کتابوں کے ذخیرے میں ایک گراں بہا حصّہ مخطوطات کا بھی ہے جو عربی، فارسی اور اُردو کے پونے چار ہزار خطی نسخوں پر مشتمل ہے۔ یہ خطی نسخے گوناگوں علوم وفنون کا گنجینہ ہیں، جن میں سے ایک معروف فن "طب" بھی ہے، اور اس اعتبار سے کہ فنِ طب کا تعلق انسان کی ذات اور اس کے جسم کی صحت و ثبات سے ہے اور دیگر جملہ علوم وفنون کا تعلق پوری کائنات سے ہے۔ یہ فن (طب) تنہا، دوسرے سیکڑوں فنون کے مساوی اہمیت کا حامل ہے۔

اسی اہمیت کے پیشِ نظر راقم سطور نے مختلف کتب خانوں میں محفوظ طبّی مخطوطات کے تعارف کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کی ابتدا اپنی مادرِ علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ "شبلی نعمانی لکھنؤ" سے کی ہے۔ چنانچہ اس کتب خانہ کے عربی اور فارسی کے طبّی مخطوطات پر راقم کے دو مضامین "خدابخش لائبریری جرنل" پٹنہ اور مجلّہ "علوم اسلامیہ" علی گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اس سلسلے کا تیسرا مضمون ہے جس میں اُردو کے طبّی مخطوطات کا مختصر تعارف قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

کتب خانہ شبلی نعمانی میں اُردو کے غیر مکرّر طبّی مخطوطات کی تعداد گیارہ ہے جن کو مندرجہ ذیل تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) ان کتابوں کے خطی نسخے جو طبع ہو چکی ہیں:

۱۔ ترجمہ رسالہ دلائل البول

متن از یوسف بن محمد ہروی متوفی ۹۵۰ھ۔ مترجم محمد حسن علی

۲۔ ترجمہ رسالہ دلائل النبض

متن از یوسف محمد ہروی۔ مترجم محمد حسن علی

۳۔ ترجمہ رسالہ مختصر البیان فی ضروریات البحران

متن از حکیم بدرالدین۔ مترجم محمد حسن علی

۴۔ ترجمہ میزان الطب

متن از حکیم محمد اکبر ارزانی دہلوی متوفی ۱۱۳۰ھ۔ مترجم محمد حسن علی

۵۔ طبِ نبوی

کتاب ۱ تا ۴ کے قلمی نسخے درگا پرشاد شاہجہاں پوری کے ہاتھ کے خوش خط نستعلیق میں ۱۲۷۹ھ کے لکھے ہوئے ہیں اور ان پر کتب خانۂ قصر معلّٰی ریاست محمد گڑھ" کی ۱۳۶۸ھ کی مہر ثبت ہے۔

کتاب نمبر ۵ (طب نبوی) کے مؤلف کا نام نہ مخطوطے میں ہے نہ اس کے مطبوعہ نسخے میں۔

(ب) مجہول النسبت غیر مطبوعہ بیاض ورسائل

۱۔ بیاض مجربات

۵، ۱۶×۱'۲۱ سنٹی میٹر سائز پر ۱۴۰ اوراق کی بیاض ہے۔ ہر صفحہ میں سطور کی تعداد ۲۲ تا ۲۵ ہے، خط نستعلیق شکستہ آمیز۔

اس بیاض میں ۲۰ طبیبوں اور مولویوں نیز ۶ ویدوں اور پنڈتوں کے مجربات بے ترتیب جمع کیے گئے ہیں۔ جامع کا نام موجود نہیں۔

ابتدا: " حب جہت اسہال معدی مجرب حکیم سید برکات احمد ٹونکی،
ص: اذراقی کوفتہ...."

انتہا.... "مرہم ناسور مجرب حکیم سید عبدالرحیم صاحب ریاست چرکھاری۔
.... سپاری کہنہ باریک کر کے... سوختہ کرلیں"۔

۲. متفرق نسخے

یہ ۵ ورق کی ایک بیاض ہے جو ۱۵٫۱ × ۲۲٫۸ سنٹی میٹر سائز پر معمولی نستعلیق خط میں ۱۲۶۴ھ میں لکھی گئی ہے۔ مرتب اور کاتب کا نام درج نہیں سطور کی تعداد ہر ورق میں مختلف ہے۔

ابتداء: "نسخۂ کایا پلٹ: روغن مالکنگنی کو ہی ایک سیر...."

انتہا: "...نسخۂ مجربۂ حکیم میرن صاحب لکھنوی ..... دوسرا نسخہ... ہمراہ شیر گاؤ باضافہ قدرے شکر بخورند۔"

۳. منتخب طب نبوی

۱۶٫۴ × ۲۱٫۸ سنٹی میٹر سائز پر ۱۹ اوراق پر مشتمل معمولی نستعلیق خط میں ۱۲۹۰ھ کا کتابت کیا ہوا نسخہ ہے۔ سطور کی تعداد ۱۱، ۱۲ ہے۔

یہ اسی طب نبوی کا انتخاب ہے جو بغیر مؤلف کے نام کے متعدد بار چھپی ہے۔

ابتداء: "مطالب المومنین میں روایت ہے حضرت علیؓ سے کہ اگر کسی کو حاجت غسل ہو...."

انتہا: "... اور بعد اس کے یعنی درود کے یہ کلمہ کہے ذکر اللہ لخیر من ذکری۔"

(ج) باقاعدہ تالیفات جو بظاہر اب تک غیر مطبوعہ ہیں:

۱۔ تحفۃ الشائقین

۱۹٫۳ × ۲۹٫۹ سنٹی میٹر کے مسطر پر محمد فضل بن غلام احمد گوپامؤی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۲ ورق کا رسالہ ہے، ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۲۷ ہے۔

رسالے کے مؤلف کا نام حکیم محمد جعفر گوپامؤی ہے۔ رسالے کا موضوع ضعف... کا علاج ہے۔ موجودہ نسخہ ۱۲۹۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔

ابتداء: "عزیزو! ادای شکر اُس خدا کا کرتا ہوں جس نے قطرۂ ناچیز سے قالب خاکی انسان کو بنایا...."

انتہا: "..... اگر ضرورت ہو تو قرابادینیات میں تلاش کریں۔"

۲. حمائے دقیقہ

حکیم اشرف محمد بن یوسف خاں بھوپالی متوفی بعد ۱۲۹۸ھ کا مختصر مگر اپنے موضوع پر بہت مفید رسالہ ہے۔ جیسا کہ مؤلف نے لکھا ہے یہ رسالہ دیگر اطباء کی تصنیفات سے مستفاد ہونے کے علاوہ حکیم اشرف صاحب کے آبا و اجداد اور خود مؤلف کے چالیس سال کے ذاتی تجربات کا ماحصل ہے۔

یہ رسالہ مؤلف نے نواب شاہ جہاں بیگم ملکۂ بھوپال متوفی ۱۳۱۹ھ کے نام منتسب کیا ہے اور زیر نظر نسخہ بظاہر وہی ہے جو خود مؤلف نے اپنے ہاتھ سے ۱۳٫۱ × ۲۰٫۹ سنٹی میٹر کے مسطر پر عمدہ نستعلیق خط میں لکھ کر شاہجہاں بیگم کی نذر کیا تھا۔ اوراق کی تعداد ۱۳ ہے اور ہر صفحے میں ۱۳ ہی سطریں ہیں۔ کتابت کا سال ۱۲۹۸ھ ہے اور یہی اس کا سال تالیف بھی ہے۔

رسالے کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے، تپ دق یا میعادی بخار ہے۔

ابتداء: "بسم اللہ الشافی بسم اللہ الکافی .... اما بعد ..... خاکسار.... متوطن قدیم دار الاقبال بھوپال، گزارش کرتا ہے کہ مقدمہ حمیات اور اسہال کا حال علم طب میں نسبت دیگر امراض کے بہت غور طلب ہے ..."

انتہا: "..... اور جو ارادے کہ اقسام اطعمہ واشربہ سے مریض رکھتا ہو باز نہ رکھیں کہ زمانہ قریب موت کا ہے کوئی خواہش یا آرزو باقی نہ رہے اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ فقط۔"

۳۔ رسالۂ غذا

مؤلف کا نام زیر نظر نسخے یا کسی دوسرے مصدر سے معلوم نہ ہو سکا۔ اس رسالے کی ہم نام جتنی بھی مطبوعہ کتابیں میری دسترس میں تھیں، یہ ان سب سے الگ ہے۔ اس کے مشتملات پر نمبر یا ابواب و فصول کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ بلکہ جہاں سے نیا مضمون شروع ہوتا ہے وہاں پر عنوان ذرا جلی قلم سے لکھ دیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر اس رسالے کی جامعیت کا اندازہ اس کے مطالب کے عنوانات سے لگایا جا سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

پانی برسنے کا حال۔ درختوں کے اُگنے کا حال۔ حیوانات کا حال۔ انسان کا حال۔ انسان کی ضرورتوں کا حال۔ غذا کی ضرورت میں اطباء کی رائے۔ غذا کی ضرورت میں عوام کی رائے۔ انسان کو کس قسم کی غذا کھانا ضروری ہے۔ ہر روز کتنی غذا کھانا ضروری ہے۔ اشیائے خورد و نوش کے اجزائے پرورش کی مقدار و تعداد۔ اشیائے خورد و نوش کے پرورش کنندہ اجزاء کی مقدار دریافت کرنے کا طریقہ۔ کون سی شے کس رطوبت کے ذریعہ ہضم ہوتی ہے۔ کون سی شے کتنی دیر

میں ہضم ہوتی ہے۔ آلاتِ ہضم کی تشریح و تصویر۔ غذا کے ہضم ہونے کا طریقہ۔ ہر شخص کے لیے غذا کی مقدار اور جنس یکساں نہ ہونی چاہیے۔ اختلاف مزاج۔ اختلاف حیثیت۔ طریقۂ تناولِ طعام۔ کھانے کے برتنوں کا صاف ہونا۔ وقتِ معمول پر کھانا۔ کھانے کی مقدار۔ حرکت و سکون بعدِ طعام۔ کون کون سی شے کس قدر مفید اور مضر ہے۔ چند اشیائے خوردنی کا ذکر۔ چند اشیائے نوشیدنی کا ذکر۔ بیماری میں کیا غذا دینی چاہیئے۔ خاص صورتوں میں خاص خاص غذا۔ بیماروں کی غذا بنانے کا طریقہ۔ کھانا پکانے میں کیا احتیاط کرنا چاہیے۔ اشیا کی صفائی۔ پکانے کی عمدگی۔

کتاب میں متعدد نقشے بھی شامل ہیں، جن کے عنوانات اس طرح ہیں:

نقشہ مقدار اجزا اشیار خوردنی بحساب فیصد

نقشہ مقدار اجزا اشیار بقدر جذب رطوبت

نقشہ اشیار خوردنی بحساب مقدار اجزار خاکستر

نقشہ ماہیت اشیار تغذیہ بخش انسان۔

نقشہ ماہیت شیر۔

پیش نظر نسخہ ۱۹۰۲ × ۲۹۰۲ سنٹی میٹر کے سطر پر نستعلیق شکستہ آمیز خط میں ۱۲۹۷ھ کا کتابت شدہ ہے۔ کاتب کا نام محمد حسنین ہے۔ اوراق کی تعداد ۵۳ ہے اور ہر صفحے میں ۱۶ تا ۲۱ سطریں ہیں۔ بظاہر اس کا دوسرا نسخہ کہیں مکشوف نہیں۔

ابتدا: "پاک اور سچے نبی کی ہدایت نے ہمارے نزدیک پہنچ کر جس صانع بیچون کی صفات سے ہم کو مطلع کیا ...."

انتہا: "..... مگر بے گلی یا جلی چیز کھانے سے ضرور ہضم میں فتور پڑجاتا ہے۔"

□□

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ کے قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جا رہی ہیں

۱۔ مقام اشاعت : لکھنؤ

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہوار

۳۔ پرنٹر کا نام : جناب راجیو اروڑا

قومیت : ہندستانی

پتہ : یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس۔ گوتم بدھ مارگ لکھنؤ

۴۔ پبلشر کا نام : ڈاکٹر انوپ چندر پانڈے

قومیت : ہندستانی

پتہ : ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : شاہ نواز قریشی

قومیت : ہندستانی

پتہ : ایڈیٹر ماہنامہ نیا دور، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش، لکھنؤ

۶۔ اُن اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالے کے مالک یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں : "نیا دور" سرکاری جریدہ ہے

میں انوپ چندر پانڈے اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

(دستخط)

(ڈاکٹر) انوپ چندر پانڈے
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

ـزرتی ہے کسی پر جانتا کوئی نہیں
ـرفت کی مجبوریاں ہیں بے وفا کوئی نہیں

آج آدابِ وفا سے آشنا کوئی نہیں
دوست اور دشمن کو بھی پہچانتا کوئی نہیں

کھٹکھٹاتی پھر رہی ہے کُنڈیاں پاگل ہوا
بند دروازے ہیں لیکن بے صدا کوئی نہیں

دل کی دھڑکن ہر قدم پر یہ صدا دیتی رہی
تیری منزل کا اِدھر سے راستا کوئی نہیں

کل نظر آتے تھے جس بستی میں سب اپنے ہمیں
آج اس بستی میں اپنا ہمنوا کوئی نہیں

اپنی اپنی جستجو میں گامزن تو ہیں مگر
کس کی منزل کون سی ہے جانتا کوئی نہیں

شام ہی سے ہر صدا خاموش ہوتی جاتی ہے
جیسے اس بستی میں حامدؔ جاگتا کوئی نہیں

حامدؔ مینائی
تارین تنگلی۔ شاہجہاں پور

اعتبارِ نگاہ مت کرنا
دیکھو خود کو تباہ مت کرنا

شوقِ منزل رسی ضروری ہے
خود کو گم کردہ راہ مت کرنا

راز افشا کسی کا ہو جائے
دوستو! یہ گناہ مت کرنا

آئینہ دل کا ٹوٹ جائے گا
پتھروں سے نباہ مت کرنا

اپنے چہرے کے داغ دھو ڈالو
آئینے کو سیاہ مت کرنا

دیکھنا تم زمیں کے ذرّوں کو
آسماں پر نگاہ مت کرنا

سنگِ در سنگِ در رہے اے رازؔ
تم اُسے بارگاہ مت کرنا

رازؔ ملیح آبادی
اے۔ ۹، ایل۔ ڈی۔ اے۔ کالونی
راجندر نگر۔ لکھنؤ

شادماں کوئی نہیں اب شادمانوں کی طرح
مسکرا دینا بھی ہے جھوٹے بیانوں کی طرح

بات صرف اتنی تھی لیکن ہو گئی تر آستیں
حالِ دل پوچھا تھا اُس نے مہربانوں کی طرح

کیسے اب رکھوں خدایا میں غریبی کا بھرم
گھر کا شیرازہ ہے بکھری داستانوں کی طرح

اب خیالِ سرخوشی بھی دل میں آنا ہے محال
کوہِ غم کا سلسلہ ہے پاسبانوں کی طرح

جانے والے جا، مگر یہ جان لے تیرے بغیر
ایک اک لمحہ گزرتا ہے زمانوں کی طرح

تیر کی صورت جو طے کرتے تھے کل تک فاصلے
اب وہی جاں باز ہیں ٹوٹی کمانوں کی طرح

ذہن میں نیّرؔ خیالِ خاطرِ احباب تھا
حالِ دل کہنا پڑا مجھ کو فسانوں کی طرح

نیّرؔ تلہری
معرفت شمیم ٹیلرس
صدر بازار، قصبہ تلہر
شاہ جہاں پور

غزلیں

مراٹھی افسانہ

جی۔ اے۔ کلکرنی

ترجمہ: سلام بن رزاق
۹/۱۱۔ ایل آئی جی کالونی، ونوبابھاوے نگر
کرلا (ویسٹ) ممبئی۔ ۴۰۰۰۷۰

باوَلا

وہ ایک چلچلاتی دوپہر کو شمشان گھاٹ میں داخل ہوا۔ راستے کی دھول پر اس کے قدموں کے نشانات دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ گاؤں پیچھے رہ گیا تھا۔ شمشان گھاٹ کے گرد گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہ ہانپتا، لڑکھڑاتا ان کی چھاؤں میں آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک سستاتا رہا۔ پھر جیب سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا۔ کاغذ پر وقفے وقفے سے جھک کر کچھ لکھتا رہا۔ شمشان گھاٹ کسی دیو کی غضب ناک آنکھ کی طرح جل رہا تھا۔ جھاڑیاں ہولے ہولے سرسرا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی پرند کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی — درختوں پر نئی کونپلیں شمع کی ساکت لو کی طرح تنی کھڑی تھیں۔ ان کی گہری ٹھنڈی چھاؤں زمین پر بسری ہوئی تھی، اور وہ اس چھاؤں میں لیٹا رہ رہ کر کاغذ کے پُرزے پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کا لباس میلا چیکٹ ہو رہا تھا، بال اس کی گردن تک بڑھ آئے تھے۔ حلیے سے وہ ایک مفلس، شکستہ حال شخص لگ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت تھی۔ ایک ایسی طمانیت جو ہمیشہ خوابوں میں ڈوبے رہنے والے شخص کے چہرے پر ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر سے پُرزے پر کچھ لکھتا، لکھ کر چند لمحوں تک ان لفظوں پر غور کرتا اور پھر ایک سرخوشی کے عالم میں گنگنانے لگتا۔ اس کی آواز سے دبے دبے جوش کا اظہار ہوتا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے شمشان کے سکوت میں دراڑ سی پڑنے لگی.... شمشان کے پاس ہی ویران شکستہ جھونپڑیوں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک دو دو کر کے کتنے ہی کتے جھونپڑیوں سے نکل کر میدان میں جمع ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اب وہ علی الاعلان اجنبی کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنے لگے۔ ان کے جبڑے کھلتے اور تیز نکیلے دانتوں کی لمبی قطار کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔ یوں لگتا جیسے ان کے بھونکنے کی آوازیں ان کے دانتوں کے شگافوں سے پھوٹ رہی ہیں۔ ان کا بے پناہ غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس جھنڈ میں ایک بلند قامت سیاہ کتے نے اپنی خونخوار آنکھیں اجنبی کے چہرے پر گاڑتے ہوئے غرّا کر کہا:

" عجیب آدمی ہے یہ! ایسی چلچلاتی دھوپ میں شمشان میں کیا کررہا ہے؟ "

" تس پر مزے سے گا بھی رہا ہے۔" !!

ایک پستہ قد کتے نے لقمہ دیا۔ اس بلند قامت کتے کو اس کا درمیان میں یوں لقمہ دینا پسند نہ آیا اور اس نے "عف" کر کے اپنے نکیلے دانت اس کی گردن میں پیوست کردیے اور اسے ہوا میں اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ دیگر کتوں نے بہ یک آواز بھونک کر اس کی جے جے کار کا نعرہ بلند کیا پھر اسی سیاہ فام کتے نے اسی جملے کو اس طرح دُہرایا جیسے وہ جملہ اسی کی اختراع ہو:

"تس پر مزے سے گا بھی رہا ہے ...."

اجنبی کتوں کی زبان سے تو نابلد تھا، لیکن اسے زخمی کتے کی حالتِ زار پر ترس آگیا۔ اس نے اپنی جیب میں پڑی سوکھی پاؤ روٹی کا ایک ٹکڑا نکالا اور پچکار پچکار کر اس کتے کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس کے یوں جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے ہی کتوں میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ سب ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر دھول اور مٹی میں تڑپتے اُس پستہ قد زخمی کتے کو گود میں اٹھالیا۔ اس کی گردن پر ایک گہرا زخم تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ اس نے زخم کو باندھنے کے لیے جیب سے رومال نکالا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے

زخم پر رومال باندھتا، کتے نے اپنے تیز دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیے اور تڑپ کر اُس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ پھر بے تحاشا گرتا پڑتا بھاگا اور اپنے ہانپتا ہوا اپنے جھنڈ میں شامل ہوگیا۔

بلند قامت سیاہ کتے کی آنکھیں اور بھی سُرخ ہوگئیں۔ اس کے منھ سے کف نکلنے لگا۔ وہ زور سے بھونکا...

"یہ آدمی باؤلا ہوگیا ہے۔"

"ہاں! یہ آدمی باؤلا ہوگیا ہے۔"

دوسرے کتوں نے اس کے سُر میں سُر ملایا

"یہ ہمیں ٹھوکر مارنے کے بجائے روٹی دیتا ہے۔"

"ہاں ہاں! روٹی دیتا ہے۔"

"دوسرے لوگ ہمیں دھتکارتے ہیں، یہ پیار کرتا ہے۔ گود میں بٹھا کر پچکارتا ہے۔ یہ آدمی دوسرے آدمیوں جیسا نہیں ہے — یہ باؤلا ہوگیا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی کتوں کے جبڑے عجیب وحشیانہ انداز میں وا ہوگئے۔ مگر وہ سب اجنبی سے بری طرح خوف زدہ تھے گویا اس کے صرف ایک لمس ہی سے ان کی موت واقع ہوجائے گی۔ دھونکنی کی طرح پھولتی پچکتی ان کی پسلیوں کی ہڈیاں کمانوں کی طرح تن گئیں۔ وہ کالا کتا کسی رینگتے سائے کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ان کی آنکھیں اجنبی پر گڑی ہوئی تھیں اور ان کی سرخ باچھوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ قریب پہنچ کر کالے کتے نے یک بیک آدمی پر چھلانگ لگا دی اور اپنے تیز سلسلاتے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیے۔ اس کی تقلید میں دوسرے کتے بھی آدمی پر ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں تک غضب ناک غراہٹوں سے دوپہر کا سناٹا کانپتا رہا اور آدمی کتوں کے غول میں چھپ کر رہ گیا۔ گھنی جھاڑیوں سے دو چار پرند پھڑپھڑا کر اُڑے۔ تھوڑی دیر بعد تمام کتے ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے۔ آدمی بے حس و حرکت پڑا تھا اور اس کے نیچے کی زمین سُرخ ہو رہی تھی۔ کاغذ کا پُرزہ ہوا سے اُڑ کر ایک جھاڑی میں پھنسا پھڑپھڑا رہا تھا۔

زخمی کتے نے پاس ہی پڑی دھول میں سے پاؤ روٹی کا ٹکڑا اٹھا کے منھ میں دبا کر ایک طرف کھسک جانا چاہا۔ تبھی وہ قد آور کالا کتا نہ جانے کہاں سے ایک بار پھر اس پر جھپٹا، اور اس کے تیز نوکیلے دانت ایک بار پھر اس کی گردن میں پیوست ہوگئے۔ پستہ قد کتے کے جبڑے سے پاؤ روٹی کا ٹکڑا اُچھل کر دُور جاگرا — اور وہ ایک بار پھر دُھول اور مٹی میں لوٹتا ہوا کیوں کیوں کرنے لگا۔ کالے کتے نے جھپٹ کر پاؤ روٹی کے ٹکڑے کو اپنے مضبوط جبڑے کی گرفت میں لے لیا اور ایک طرف کو چل دیا۔

اب پیڑوں کے پتوں سے پیدا ہوئی اداس سرسراہٹ کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ کہیں کہیں ایک آدھ پرند کی پھڑپھڑاہٹ ضرور سنائی دے جاتی — درختوں کی نئی کونپلیں شمع کی ساکت لَو کی طرح تنی کھڑی تھیں اور زمین پر آدمی کی خون آلود لاش اس جلتی ہوئی دوپہر میں یوں لگ رہی تھی جیسے کسی دُودھیا گرم بدن پر تازہ رِستا ہوا زخم۔

□□

غزل

اپنی ہی شکل ہم سے جُدا ہوگئی ہے آج
کچھ عکس آئینے کی طرح ہوگیا سماج

چاروں طرف سے آتے رہے سنگِ خواہشات
اپنا وجود بکھرا نہیں صورتِ زجاج

اُن سے ملے تو ہم کو یہ محسوس بھی ہوا
جلوت پسند ہوتا ہے تنہائی کا مزاج

تہذیبِ فقر زندہ ہے، دل بھی ہے سربلند
ایسے میں کیوں دراز ہوا دستِ احتیاج

ہم سے تمام عمر گریزاں رہی حیات
جیسے کسی غریب کا خاموش احتجاج

رفعت عزمی
رُدولی۔ ضلع بارہ بنکی

افسانہ

رضوان احمد
اُردو بھون ۔ اشوک راج پتھ ، پٹنہ (بہار)

الوداع

"آپ انھیں رخصت کر دیجئے .... میڈم اب ان کو الوداع کہہ دیجیے۔" خاموشی کو تار تار کرتی ہوئی ڈاکٹر کی آواز گونج رہی تھی ۔ وہ بالکل گم سم تھی ۔ سامنے بیڈ پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا ۔ بالکل بے حس و حرکت ، ہڈیوں کا ڈھانچہ جس میں جنبش تک نہیں ہو رہی تھی ۔

" میڈم اب ان کی رخصتی کا وقت آگیا ہے ۔ آپ اس فارم پر دستخط کر دیجیے ۔" ڈاکٹر نے اس کے سامنے قلم اور فارم رکھ دیا ۔

وہ ابھی اس فارم پر دستخط کر دے گی ۔ اس کے بعد ڈاکٹر سرنج میں تھوڑا سا رقیق لے کر اسے بڑ پر پڑے ہوئے شخص کی شریان میں سرایت کر دیگا اور شریانوں سے ہوتا ہوا وہ رقیق پورے جسم کے خون میں حل ہو جائے گا اور وہ مشت استخواں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا ۔ آج یہ شخص جو راکھ کا ڈھیر نظر آرہا ہے ۔ کبھی شعلہ جوّالہ ہوا کرتا تھا ۔ اس کی تحریر میں ایسی جان ہوتی تھی کہ وہ بے جان افراد میں جینے کی خواہش پیدا کر دیتا تھا مگر آج وہ خود راکھ کا تودہ بن کر رہ گیا ہے ۔ جس میں اب کوئی چنگاری دبی ہوئی نہیں ہے ۔ جہاں اب جینے کی خواہش نہیں ہے ۔ حالاں کہ اُمید اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک سانس چلتی رہتی ہے ۔ مگر اُمید کے اس کمزور دھاگے کو اس نے یہ کہہ کر توڑ دیا تھا کہ :

" تارا ! میں اب اس کرب سے نجات پانا چاہتا ہوں ۔ مجھے مرنے کی اجازت دے دو ۔ ڈاکٹر سے کہو کہ وہ میرے جسم میں زہر کا انجکشن دے کر میرا کام تمام کر دے ۔ کیوں کہ میں اب اس درد و کرب سے اور گزرنا نہیں چاہتا ۔۔ میں ہمت ہار گیا ہوں ۔"

" کیسی بات کہتے ہو ۔ کیا ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں نہیں کھائی تھیں ۔ اس بے آب و گیاہ جنگل میں جہاں انسانی درندے گھوم رہے ہیں ، تمھیں تو میری ڈھال ہو ۔ تمھارے بعد ان معصوم بچوں کو کون دیکھے گا ۔ ان کو کون سہارا دے گا ۔ ؟"

" میں تھک گیا ہوں تارا ۔ ظلم اور ناانصافی کے خلاف صداقت کی شمشیر بھی کند ہو چکی ہے اور میں ہار گیا ہوں ۔ ہر محاذ پر ہار گیا ہوں ۔"

۔۔۔۔ وہ واقعی ہر محاذ پر ہارتا چلا گیا تھا ۔

یونیورسٹی سے اعلا ترین سند لینے کے بعد اس کے لیے ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے مگر اس نے کافی غور و خوض کے بعد ظلم اور ناانصافی سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اس نے اپنے قلم کو ہی شمشیر بنا لیا اس کی شعلہ بار تحریروں کو مدیران چھاپنے سے انکار کرتے تھے کہ ان کے اخبار کے صفحات ہی کہیں اس شعلے سے نہ جل اٹھیں ایسے میں اُسے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ وہ خود اپنا اخبار نکالے ۔ مگر اخبار نکالنے کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے ۔ اس کے پاس قلم کے سوا اور کچھ نہیں تھا ۔ کافی جد و جہد کے بعد اس نے کچھ سرمایہ جمع کر لیا اور اللہ کا نام لے کر اس نے اپنا اخبار نکال لیا ۔ "ان تھک" ۔

اب اس کی بے سمت زندگی کو ایک سمت مل گئی اور وہ واقعی 'ان تھک' کے لیے بغیر تھکے ہوئے کام کرنے لگا ۔ وہ اس اخبار کا ایڈیٹر سے لے کر ہاکر اور چپراسی تک تھا ۔ اس کے دوست اس کا حلیہ دیکھ کر حیرت کرتے ۔ یونیورسٹی کی اعلا ترین ڈگری لینے کے بعد اپنا کیریر آگ میں جھونک دینے کے معنی ان کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے ۔ وہ ان سے کہتا کہ میں سماج کو بدلنا چاہتا ہوں سماجی تبدیلی لانے کے لیے کیریر کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے ۔ کوئی کیریرسٹ سماج میں انقلاب نہیں لاسکتا ۔"

مگر وہ اس کی باتوں پر کیا توجہ کرتے ۔ ان کی تو سمتیں متعین ہو چکی تھیں وہ اپنے راستوں پر گامزن تھے اور انھیں راستوں پر چل کر ہی ان کو منزل تک پہنچنا تھا ۔ امتیاز ۔۔ پروفیسر ، انور ۔۔ آئی اے ایس ، ونود ۔۔ بڑی

فرم میں اکزی کیوٹیو، آذر — بڑا کاروباری، اور وہ خود — کچھ بھی نہیں۔

اس کے دوست کہتے کہ کوئی اچھی سی ملازمت کر لو۔ تمھاری بے سمت زندگی کو بھی ایک سمت مل جائے گی۔ مگر یہ باتیں راجن کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ کہتا کہ میں بے سمت کہاں ہوں۔ میری تو سمت متعین ہے، مجھے سماج کو تبدیل کرنا ہے، اس میں انقلاب لانا ہے۔ مگر اس کے احباب اس کا مذاق اڑاتے کہ تحریروں سے کبھی انقلاب آیا ہے کہ تمھاری تحریر انقلاب لا دے گی۔

بہر حال وہ اپنے راستے پر گامزن رہا۔ اور اسی درمیان اس کی زندگی میں تارا داخل ہو گئی۔ پتھریلے راستوں پر چلتے چلتے اس کے پیروں کے آبلوں پر زخموں کی تہہ جم گئی تھی۔ مگر وہ نہ تو تھک کر بیٹھنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنا راستہ تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

تارا پڑھی لکھی تھی، سمجھدار تھی، خود بھی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ وہ بھی ایک آئیڈیلسٹ تھی مگر اس کے بھی کچھ خواب تھے، جو ہر جوان لڑکی کے ذہن میں پرورش پاتے ہیں۔ مگر وہ اپنے ارمانوں کو کچل کر اس کے ساتھ ساتھ انھیں پتھریلے راستوں پر چلنے لگی تھی۔ راجن محسوس کرتا تھا کہ اس نے تارا کے ارمانوں کو کچل کر اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ مگر اسے پھر سماج میں بکھری ہوئی ناانصافیوں کا خیال آتا تھا جن سے اُسے لڑنا ہے۔ مگر وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے اندر کمزوری آتی چلی جا رہی ہے۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹتا چلا جا رہا ہے۔ تارا کے دل میں جتنے شیش محل چکنا چور ہوتے تھے ان کی کرچوں کی چبھن وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا، اور اس کا سارا وجود لہولہان ہو جاتا تھا۔

پھر دو ننھی کرنیں اس کی تاریک راہوں میں بکھر گئیں۔ پہلے کرن داخل ہوئی پھر دانش۔ ان دونوں نے اسے مستقبل کے بہت سے خواب بننے پر مجبور کر دیا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو جس قدر سمیٹنے کی کوشش کرتا اتنا ہی بکھرتا چلا جاتا۔

اس درمیان "انتھک" کے پیر بھی تھک گئے۔ اس کی فکر کو زیر دام کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں، جن میں غیروں کے ساتھ ساتھ اپنے بھی شامل ہو گئے۔

اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

راجن گھر آیا تو اس کے کپڑے لہولہان تھے، تار تار تھے۔ اُسے کرائے کے غنڈوں نے زدوکوب کیا تھا۔

تارا نے پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ بار بار پوچھنے پر وہ پھٹ پڑا —

"اس سماج میں ایک ادیب کر ہی کیا سکتا ہے؟ بھالے اور خنجر کے مقابلے میں قلم کی کیا حیثیت ہے۔ وہ جیت گئے، میں ہار گیا!"

اور اس دن سے راجن نے دفتر جانا بند کر دیا۔ دن بھر خاموش گھر پر پڑا رہتا۔ بیوی بچوں سے بھی باتیں نہیں کرتا۔ بس جیسے کسی نے اس کے ہونٹوں پر مہر لگا دی ہو۔

کرن اور دانش اپنی توتلی زبان میں باتیں کرتے تو جیسے اس کی زبان گنگ ہو جاتی۔ وہ ان کا مجرم ہے انھیں کیا جواب دے۔ وہ اور تارا تو اپنا بہت سا سفر پورا کر چکے تھے مگر کرن اور دانش کی ساری زندگی پڑی ہوئی ہے۔ انھیں کو ان کا مستقبل سنوارنا ہے مگر جب وہ اپنے ہی لیے کچھ نہیں کر سکا تو ان کے لیے کیا کر پائے گا۔

اس کے ساتھ زندگی نے عجیب مذاق کیا تھا، وہ سماج کو بدلنے نکلا تھا اور سماج نے اس کی زندگی کے دھارے کو ہی موڑ دیا۔ اس کے اسلحے کو ہی کند کر دیا۔ اس کے جسم کو خون سے نہلا دیا۔

اب تو جیسے وہ ایک مجسمہ تھا۔ بالکل بے حس و حرکت۔ سارے مظاہر اس کے سامنے تھے۔ وہ انھیں دیکھ سکتا تھا، سب کچھ سُن سکتا تھا مگر اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اب تارا کا لہجہ بھی تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر وہ اس کے اوپر بھی تو ایک بوجھ تھا کب تک وہ اس بوجھ کو تنہا ڈھوتی — اس نے تو ہاتھ پیر ڈال دیئے تھے۔ ذمہ داریوں سے فرار حاصل کر لیا تھا۔

مگر اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔؟

جب اخبار تھا تو اپنے پرائے سبھی اسلحے تان کر کھڑے ہو گئے اور اس نے ہمت ہار دی۔

اب وہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتا تو قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی۔ اس نے خود اعتمادی کھو دی تھی۔ دُنیا تھی کہ بس ایک سمت بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے دوست احباب بھی اسی دھارے میں بہہ رہے تھے۔ کوئی مکان پر مکان بنا رہا تھا، کوئی کاروں پر کاریں خرید رہا تھا۔ کسی نے دولت کے انبار لگا رکھے تھے۔

آذر اس سے کہتا۔ "دولت کمانا اور دنیا بھر کی آسائشیں خریدنا ہی زندگی کا مقصد ہے۔" مگر اب اسے زندگی بے مقصد معلوم ہو رہی تھی اور اس کی

آواز گنگ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کی نظر میں قابل رحم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن آذر نے کہا:

"راجن! تمہارے پاس اعلا تعلیمی لیاقت ہے۔ تم کیوں نہ نوکری کر لو؟"

اُسے لگا جیسے کسی نے پھوڑے پر نمک ڈال دیا ہو۔ وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"اب اس عمر میں میرے لیے نوکری۔!؟ کیوں مذاق کرتے ہو آذر!"

"نہیں راجن! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ آخر تمہارے بھی بیوی بچے ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں ہیں، ان کا مستقبل ہے۔ تم کیوں نہیں سوچتے ہو۔ شاید تم خوابوں میں رہنے کے عادی ہو چکے ہو۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ساری دُنیا ریاکار ہے۔ میں اس زمانے کا آدمی نہیں ہوں۔ میرے اندر ایک چھٹپٹاہٹ ہے۔ دنیا جس چمک دمک کے پیچھے بھاگ رہی ہے، میں نہیں بھاگ سکتا۔ یہ سب کچھ سراب ہے اور میں سرابوں کا تعاقب نہیں کر سکتا۔"

"لیکن ہمیں اسی سماج میں جینا اور مرنا ہے۔ اس سماج کو بدلنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اسی دھارے میں بہنے لگیں، جس میں ساری دُنیا بہہ رہی ہے۔؟"

اس کے دوست احباب اور خیر خواہ اسے سمجھا کر تھک گئے۔ مگر اس کا بس ایک ہی جواب ہوتا کہ وہ اس دھارے میں نہیں بہہ سکتا جس میں ساری دنیا بہہ رہی ہے۔ "حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں، وہ زیادہ دُور تک نہیں جا سکتا کیوں کہ یہ راستہ پُرخار ہے اور ننگے پاؤں اس پر چلنا آسان نہیں ہے۔"

اخبار سے علاحدہ ہوتے ہی جیسے اس کا سارا رویّہ تبدیل ہو گیا تھا جیسے اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ وہ کبھی کتابیں پڑھتا۔ پھر کچھ لکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر اسے نامکمل چھوڑ کر ادھر ادھر ٹہلنے کے لیے نکل جاتا جیسے اس کے اندر کوئی بے قرار روح تڑپ رہی ہو اور جسم کے قفس سے باہر آجانے کے لیے بے قرار ہو۔

ننھے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ان کی ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ ان کی تعلیم اور تعلیم کے لوازمات ـــ مگر وہ ہر چیز سے یکسر بیگانہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کے اس رویّے سے تارا کی بھی مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا جس کے باعث گھریلو ماحول میں تلخیاں گھلتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ جتنا زیادہ بولتی، راجن اتنا ہی خاموش ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کئی کئی دنوں تک بالکل خاموش اور گم سُم رہتا۔ بہت پوچھنے پر صرف اتنا ہی کہتا ـــ

"میں ٹوٹ کر اتنا زیادہ بکھر گیا ہوں کہ اب خود کو سمیٹ پانا ناممکن ہے۔"

سیدھے راستے پر چلتے چلتے شاید وہ ایک گڑھے میں گر گیا تھا جس میں صرف اور صرف مہیب اندھیرا تھا، جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا اور وہاں سے واپس نکلنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔

مگر ڈاکٹر اس کے مرض کی تشخیص کرنے میں یکسر ناکام تھے۔ ہر طرح کے ٹسٹ ہونے کے باوجود کسی مرض کا پتہ نہیں چل رہا تھا اور وہ روز بروز لاغر اور کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

اسے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

علاج شروع ہوا۔ مگر بے اثر۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کے اندر خود اعتمادی ختم ہو چکی ہے، جس کے سبب وہ توازن کھوتا جا رہا ہے۔ جب تک یہ خود اعتمادی واپس نہیں آجاتی اس کی صحت کی بحالی ممکن نہیں۔ مگر یہ خود اعتمادی کون واپس لاتا۔ اس کی ضرورت کس کو تھی؟ جب وہ کام کے لائق تھا تو ساری دنیا اس کے گرد تھی۔ جب کام کے لائق نہیں رہا تو کوئی اسپتال یہ دیکھنے کے لیے بھی نہیں آتا کہ وہ کس حال میں ہے۔

اس کے لیے فکر مند تھے تو بس تارا، کرن اور دانش ـ مگر کرن اور دانش تو ابھی معصوم تھے۔ وہ ابھی اس حد تک نہیں سوچ سکتے تھے ـ دنیا کی عیاریوں اور ریاکاریوں سے ان کے دل ابھی پراگندہ نہیں ہوئے تھے اور دنیا کی چالبازیوں سے وہ ناواقف تھے۔ مگر دنیا میں آئے ہیں تو کل انھیں بھی ان ساری باتوں کا علم ہو جائے گا کہ ان کے باپ کو دُنیا والوں نے کس طرح بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔

راجن دن بھر اسپتال کے بستر پر پڑا چھت کو تکتا رہتا۔ وہ سوچتا تو بہت کچھ تھا مگر کچھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ کبھی سوچتا کہ اپنی ہی سرگزشت لکھے کہ اب اس کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ مگر اب اس کے ہاتھ جواب دے رہے تھے۔

اب اس کے جسم کا گوشت بھی گلنے لگا تھا۔ اور وہ اب صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔

ایک روز وہ ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر گڑگڑانے لگا:

"ڈاکٹر! مجھے اس قید سے آزاد کردو..... اس قید بامشقت سے رہائی دلادو۔ میں تمھارا بے حد احسان مانوں گا۔"

"مگر تم مرنا کیوں چاہتے ہو۔؟"

"اس لیے کہ میں جی کر دیکھ چکا ہوں — میں ایک چہرے پر کئی چہرے نہیں لگا سکتا۔ میں ریاکاری نہیں کر سکتا... جھوٹ اور مکر و فریب کا کاروبار نہیں کر سکتا، اس لیے مجھے اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے آج ایمان داری حماقت ہے — آج شرافت کا مذاق اڑایا جاتا ہے — فریب اور جعل سازی ذہانت ہے۔ میں خود کو اس سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ میں اس دنیا کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا — اسی لیے میں بہت پیچھے چھوٹ جاتا ہوں — آج میری تحریریں میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ میں اپنی ہی کہانیوں کے لیے ایک سوالیہ نشان ہوں۔ میں تھک گیا ہوں ڈاکٹر! اس لیے میں سوجانا چاہتا ہوں — ایک ایسی طویل نیند سو جانا چاہتا ہوں کہ پھر مجھے کوئی جگا نہ سکے۔"

ڈاکٹر اس کا علاج کرتے مگر سب بے اثر — وہ اور بھی بے جان ہو جاتا۔

"ڈاکٹر! میری خود اعتمادی واپس نہیں آسکتی۔ اب یہ زندگی میرے کسی کام کی نہیں ہے — اب جینا لاحاصل ہے۔ خدا کے لیے ڈاکٹر مجھے مرنے کی اجازت دلوادو۔"

ڈاکٹر چپ رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، مگر ایسا لگا جیسے وہ اس کی بات سے مطمئن ہو گیا ہو۔ شاید اب اس نے اس کے مرض کی تشخیص کر لی تھی۔

"تارا! اب میں تمھیں بہت سے دکھ دے کر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمھارا مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دو اور اس قید سے رہا کر دو۔ میں جانتا ہوں میں نے تمھیں بہت سے دکھ دیے ہیں۔ تمھارے خواب چکنا چور کیے ہیں — اب میں تم سب کے لیے ایک بوجھ ہوں میں بوجھ بن کر جینا نہیں چاہتا۔ دنیا میں باعزت طریقے سے جینے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے میں ان سے یکسر عاری ہوں۔ مگر تمھیں ایک بات کا اطمینان ہو جانا چاہیے کہ اس کالک کی کوٹھری میں بھی میں نے تمھارے لباس پر ایک داغ بھی نہیں لگنے دیا۔ مگر اس چمک دمک اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی دنیا میں میرے حصے میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ہے اس لیے اب مجھے سو جانے کی اجازت دے دو۔"

آخر ڈاکٹر نے اس کے مرنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

وہ دن آپہنچا۔

وہ غنودگی کے عالم میں تھا مگر ڈاکٹر کے الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے —

"اب انھیں رخصت کر دیجیے۔ میڈم اب انھیں الوداع کہہ دیجیے۔ اب اس فارم پر دستخط کر دیجیے۔"

تارا نے کانپتے ہاتھوں سے اس فارم پر دستخط کر دیے۔ دو آنسو ٹپک کر کاغذ کو گیلا کر گئے — "الوداع .... الوداع" — اس نے نحیف آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے سرنج اس کے بازو میں لگادی۔

اور گھٹی گھٹی سسکیاں سناٹے کا سینہ چیرتی رہیں —

"الوداع! — الوداع!" —

□□

غزل

منجدھار سے نزدیک کنارا تو نہیں ہے
ساحل سے کہیں تم نے پکارا تو نہیں ہے

وہ چاہے تو ہم جان کی بازی بھی لگادیں
لیکن اُسے یہ بات گوارا تو نہیں ہے

پُرکیف زیادہ ہی ہے کچھ شام اودھ آج
اس شوخ نے زلفوں کو سنوارا تو نہیں ہے

کیوں دشت نوردی کی طرف ذہن ہے مائل
یہ کچھ ان کی نگاہوں کا اشارا تو نہیں ہے

مہ جبیں کاظمی
وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

غزل

حرفِ شکوہ زباں پہ لائے نہیں
کون کہتا ہے مُسکرائے نہیں

انتظار اب بھی جن کا رہتا ہے
مدّتیں ہوگئیں کہ آئے نہیں

کیسے دامن کشاں رہیں اُن سے
غم یہ اپنے ہیں کچھ پرائے نہیں

لَو بھڑک اُٹھتی جس سے اُلفت کی
وہ دیے آپ نے جلائے نہیں

آرزو ایک تھی وصیّہ کی
وہ مری زندگی سے جائے نہیں

فاطمہ وصیّہ جائسی
۴۷۔ ساتویں گلی، نشاط گنج
لکھنؤ

غزل

ہر موڑ پہ ہستی کے قضا ہم کو ملی ہے
کِس جُرم کی جانے یہ سزا ہم کو ملی ہے

ہم جتنا بلندی کی طرف بڑھتے گئے ہیں
پہلے سے بھی کچھ تند ہوا ہم کو ملی ہے

کیا کیا ہیں اثر دوستو اک جرعۂ مے کے
نشّہ تمھیں اور لغزشِ پا ہم کو ملی ہے

رُخ کوچۂ جاناں کی طرف جب بھی کیا ہے
ہر گام پہ اک تازہ بَلا ہم کو ملی ہے

پابند کسی کی نہ کبھی ہوگی یہ فُرقت
قسمت سے طبیعت ہی جُدا ہم کو ملی ہے

عبدُالقیوم فُرقت
مولوی گنج۔ لکھنؤ

غزل

آشنائے لذّتِ غم ہوگیا
رفتہ رفتہ درد ہی کم ہوگیا

کاروانِ اشک رُک جا دو گھڑی
اب تو دامن رات کا نم ہوگیا

گردشِ حالات کی کیا پُوچھیے
زیست کا شیرازہ برہم ہوگیا

اب ہمیں کیا حاجتِ چارہ گری
اب نمک زخموں کا مرہم ہوگیا

حال پروانہ کرے کیسے بیاں
سارا ماضی اس کا مبہم ہوگیا

مَنظُور پروانہ
مقابل مجنب بلڈنگ۔ نظیر آباد لکھنؤ

مزاحیہ

محسن خان
۵ شنکر پوری پھول باغ
لکھنؤ ۱

گربۂ کشتن روزِ اول

کسی تجربہ کار نے سچ فرمایا ہے جلدی کا کام شیطان کا۔ ہمیشہ سوچا کرتا ہوں کہ آئندہ جو بھی کام کروں گا، تحمل کے ساتھ کروں گا اور جب بھی قدم بڑھاؤں گا اطمینان کے ساتھ بڑھاؤں گا مگر ــــ کسی نقیر کی دُعا ہے یا والدین کی "محبتوں" کا نتیجہ کہ جب بھی کوئی کام کرنے لگتا ہوں ہاتھ پاؤں تھرکنے لگتے ہیں اور چلتا ہوں تو غیر شعوری طور پر رفتار تیز اور بے ڈھنگی ہو جاتی ہے۔ جانا کہیں چاہتا ہوں، پہنچ کہیں اور جاتا ہوں ــ کرنا کچھ چاہتا ہوں، کر کچھ اور ڈالتا ہوں۔ حال ہی کا واقعہ ہے بلکہ حادثہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

بیگم نے کہا، " ذرا نخاس تک جا کر پان لے آؤ۔ صبح سے نہیں کھایا ہے منہ کڑوا ہو رہا ہے۔ اگر پندرہ منٹ کے اندر پان نصیب نہیں ہوا تو آپے سے باہر ہو جاؤں گی " عقل مند کو اشارہ کافی ہے ــ پیروں میں جوتیاں ڈالیں، بدن پر شیروانی چڑھائی اور آنکھوں پر عینک لگا کے بے تحاشا نخاس کی طرف چل پڑا۔ ایک تو بیگم کا حکم دوسرے طبعی جلد بازی ــــ نہ پوچھئے کہ وحشت کا کیا عالم تھا۔ کچھ دُور جانے کے بعد یہ بھول گیا کہ کس ارادے سے گھر سے نکلا تھا کہاں جانا تھا۔ لہٰذا بے خودی اور وحشت کے عالم نے امین آباد پہنچا دیا۔ امین آباد پوسٹ آفس کے پاس ٹریفک کانسٹبل کا اشارہ پا کر جیسے ہی مُڑا تو خیال آیا۔ آخر اس تیز رفتاری سے چلنے اور یہاں پہنچنے کا مقصد کیا تھا۔ بہت سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد یاد آیا کہ بیگم نے صرف پندرہ منٹ کی مہلت دے کر پان لانے کے لیے بھیجا تھا ــــ اسی رفتار سے پا بجولاں چلتا ہوا نخاس آیا۔ پان خریدے اور گھر پہنچا۔ اب یہ نہ پوچھیے کہ گھر میں کیا صورتِ حال پیش آئی۔ جگ ہنسائی کا خیال نہ ہوتا تو یہ تاریخی اور عبرت ناک واقعہ سُنا کر آپ کو بھی رُلاتا اور اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالتا۔ ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ روزانہ کسی نہ کسی الجھن میں کچھ اس طرح پھنس جاتا ہوں جیسے مکڑی کے جالے میں مکھی پھنس جاتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں ہمیشہ ہی سے مکڑی کے جالے میں پھنسا ہوا ہوں ــــ یعنی پیدائشی الجھن ہوں۔ خدا معاف کرے، والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب سے یہ شیطان پیدا ہوا ہے الجھنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ایک والد ہی کو کیا سب کو یہی شکایت رہی ہے بلکہ خود مجھے اپنے آپ سے شکایت ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں اپنے آپ سے نبرد آزما ہوں۔ خدا جانے نبرد آزمائی کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا اور کب یکسوئی کا احساس ہوگا۔

اب اس وقت عجیب صورتِ حال سے دوچار ہوں۔ صبح لوگ اپنے گھر میں بیدار ہوتے ہیں تو انھیں بیوی بچوں کی محبت بھری آوازیں سُنائی دیتی ہیں اُن کی پیاری پیاری شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ بیٹیاں منہ دھونے کے لیے دوڑ دوڑ کر جاڑوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا پانی لا کے دیتی ہیں ــ لیجیے ابّا جان! منہ دھو لیجیے ــ اگر باپ کے ہاتھ پیروں میں دم نہیں ہے تو اپنے ہاتھ سے منہ ہاتھ دُھلاتی ہیں۔ بیویاں صبح کی چائے سے تواضع کرتی ہیں اور اک میرا گھر ہے کہ جہاں صبح ہی نہیں ہوتی۔ ہوتی بھی ہے تو ایسی ڈراؤنی کہ محسوس ہوتا ہے شہرِ خموشاں میں آنکھ کھلی ہے، بس ابھی فرشتے نازل ہو کر بہی کھاتا کھولنا شروع کر دیں گے ــ بچوں کا بھی دُور دُور تک پتہ نہیں چلتا۔ کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں ــ صبح ہوتے ہی سب کے سب جنگلی کبوتروں کی طرح چرائی پر نکل جاتے ہیں اور شام کو بسیرا کرنے کے لیے آجاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھی حسبِ معمول کسی پڑوسی کے گھر میں میٹھی باتیں بنا بنا کے پان چبا رہی ہوں گی۔ ممکن ہے ناشتے سے فارغ ہو چکی ہوں۔ ویسے مالی نقطۂ نظر سے یہ خصلتیں کچھ بُری نہیں ہیں سمجھدار عورتیں اسی طرح دوسروں کے گھروں میں ڈٹی رہتی ہیں اور ان کے مالی بحران کا سبب بنتی ہیں۔

صبح ہوئے ایک زمانہ ہوگیا۔ لوگ نہ معلوم کتنے کام نپٹا چکے ہوں گے۔ بازار لگ چکے ہوں گے، دکانیں کھل چکی ہوں گی، سینما ہالوں اور راشن کی دکانوں پر سو سو گز لمبی قطاریں لگ چکی ہوں گی۔ ٹریفک جام ہو چکے ہوں گے اور میں ہوں کہ گھر میں بیٹھا افیونچیوں کی طرح مکھیاں اُڑا رہا ہوں۔ پہلے جوتے مل گئے تھے تو موزے نہیں مل رہے تھے، اب جو ٹوپی مل گئی ہے تو عینک نہیں مل رہی ہے نہ جانے کون لے کر اُڑنچھو ہوگیا۔ یہ اسی کی شرارت ہے ورنہ میں اس ڈھابے ایسے گھر میں جہاں کپڑے تبدیل کرتے وقت ہاتھ پاؤں کھڑکیوں سے باہر کرنا پڑتے ہوں۔ ایک عینک کا غائب ہوجانا گویا گدھے کے سر سے سینگوں کا غائب ہوجانا ہے۔ اجی عینک تو عینک یہاں پاجامے اور شیروانیاں تک غائب ہو جاتی ہیں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے صبح سو کر اُٹھا تو موڈ اچھا تھا۔ سوچا چلو بندو کے چائے خانے میں چائے پی جائے۔ یارانِ نکتہ داں سے حالاتِ حاضرہ اور لاٹری پر تبادلۂ خیال بھی کرنا تھا۔ مگر خدا نے میری قسمت میں لکھ دیا ہے کہ جو تو سوچے گا وہ قیامت تک نہ ہوگا۔ لہٰذا عین وقت پر کہ جب تیاری کے تمام مراحل تقریباً مکمل ہو چکے تھے صرف شیروانی کی کسر رہ گئی تھی، معلوم ہوا کہ شیروانی ہی غائب ہو چکی ہے۔ تمام کھونٹیوں، الگنیوں، دروازوں اور دریچوں حتیٰ کہ غسل خانے اور باورچی خانے تک کھنگال ڈالے مگر شیروانی ــــ اجی توبہ کیجیے، نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ اس تلاشِ بسیار میں اعصاب شل ہوگئے۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ اور اتنا دم خم نہیں رہا کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ پاتا۔ لہٰذا پلنگ پر ڈھیر ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد بیگم میری بے چارگی پر ہنستی ہوئی آئیں اور شیروانی میرے سامنے پھینک کر بولیں :

" یہ اُسی کھونٹی میں ٹنگی تھی جہاں روزانہ ٹنگی رہتی ہے "۔

بیگم کی بات پر کیسے یقین کرتا کہ میں تقریباً ساڑھے تین منٹ تک اُس کھونٹی کو کچھ اس طرح پکڑے شیروانی سے اپنی وابستگی اور اس کی افادیت کے بارے میں سوچتا رہا تھا جیسے مجنوں شاخِ شجر کو پکڑ کے لیلیٰ کے تصوّر میں کھویا رہتا تھا۔ لیکن بیگم کی بات پر بادلِ ناخواستہ یقین کرنا پڑا۔ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ شیروانی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہونا پڑتا۔

غرضیکہ شیروانی اس وقت ملی جب رُوح بدن میں پھڑپھڑا رہی تھی اور اتنی قوت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے ہاتھ سے اپنا بدن ٹٹول کے اپنے آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا، لہٰذا دن بھر پلنگ پر پڑا بیگم کی پینترے بازیاں دیکھتا اور شعلہ فشانیاں سنتا رہا۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ بیگم تھالی میں بیگن اور چھری لے کر آئیں اور حکم صادر کیا۔

" بلاوجہ لیٹے مکھیاں مار رہے ہیں۔ بیگن ہی چھیلیے بنائیے ــ قتلے برابر کے ہونا چاہیے "۔

بیگن کے قتلے اور وہ بھی برابر کے ہاں ــ اس ذہنیت کے پیچھے ایک پوری تحریک سرگرم ہے۔ سوڈو تحریک۔ بیگم کو خوب معلوم ہے کہ مجھے بیگن سے سخت چڑ ہے۔ جس دسترخوان پر بیگن کی ترکاری رکھی ہو میں وہاں کھانا نہیں کھا سکتا۔ خواہ وہاں ہزار اقسام کی ڈشیں کیوں نہ رکھی ہوں بہرحال ــ ناچار بیگن چھیلے، انگلی سے ناپ کے قتلے کیے اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا تاکہ اس زہرِ قاتل کو بھلا سکوں۔

اس وقت کمبخت بیگن کا خیال کہاں سے آگیا۔ اب شام تک اسی کا خیال آتا رہے گا۔ کسی کا قول ہے کہ جو چیز اچھی نہ لگتی ہو اسے بھول جاؤ۔ اب کون سمجھاتا اِن دانش مندانِ خوش خیال کو کہ دوستوں کو بھلایا جاسکتا ہے، محبوبہ کو بھلایا جاسکتا ہے، مرنے والوں کو بُھلایا جاسکتا ہے مگر اس ظالم کو کون بھلا سکتا ہے جو ہر دوسرے دن نہ صرف یہ کہ چھینکے میں رونق افروز رہتا ہے بلکہ زہر مار بھی کرنا پڑتا ہے۔ دراصل خطا بیگن کی نہیں بیگم کی ہے جو آئے دن بیگن دکھا دکھا کر اور کھلا کھلا کر مجھ سے میری کردہ اور ناکردہ خطاؤں کا حساب چکایا کرتی ہیں ــ عجیب زندگی ہے۔ کیسا دردناک اور عبرت ناک انجام ہوا ہے میری عاقبت نااندیشی کا۔ تمام عمر بھاگنے اور دفاع کی حکمتِ عملی پر غور کرنے میں گزر گئی۔ میں اپنی کہتا ہوں، وہ اپنی کہتی ہیں میں مشرق کی طرف رخ کرتا ہوں تو وہ مغرب کی طرف منھ پھیر لیتی ہیں۔ میں دال کھانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہوں اور وہ بیگن پکا کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ میں سردی سے گرگراتا ہوں اور وہ پنکھا جھلنے لگتی ہیں۔ غرضیکہ تکرار اور کھینچا تانی کا ایک اذیت ناک اور عبرت ناک سلسلہ ہے جو سہاگ رات سے شروع ہوا تھا اور شبِ ظلمات تک قائم رہے گا ــ دراصل مولا شاہیں سے نبرد آزما ہے۔

نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا اور کیا سوچنے لگا۔ ہاں ــ عینک، عینک نہیں مل رہی ہے۔ نہ معلوم کہاں اڑنچھو ہوگئی۔ یہ سب اُسی کی منصوبہ بندی ہے۔ اس نے سوچا ہوگا نہ عینک ملے گی نہ بُڈھا باہر جا سکے گا ــ میں

پڑے بچھڑوں گی اور یہ گھر بجھ جائے گا۔ اب کہاں جا کے ڈھونڈوں۔ کہاں کہاں کنوئیں "آثار تا پھروں"، کس کس پڑوسی کے گھر کنڈی بجا بجا کے پوچھوں کہ ـــــ

"کیوں جناب! میاں میری بیگم آپ کے گھر میں براجمان ہیں۔"؟

ان کا گھر سے نکلنا گویا "روح" کا بدن سے نکلنا ہے کہ پھر ڈھونڈھے نہیں ملتیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ روح واپس نہیں آتی اور یہ شام کو لوٹ آتی ہیں۔ لعنت ہے ـــ عینک نہیں ہے تو آنکھیں نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا ہی نہیں۔

اس وقت قیامت بھی سامنے سے گزر جائے تو مجھے دکھائی نہیں دے گی۔ کیا بتاؤں ـــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس مشکل میں پھنس گیا ہوں جی چاہتا ہے کسی دن گریباں چاک کر کے جنگلوں اور صحراؤں کی طرف نکل جاؤں اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے گاتا پھروں ـــ

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مگر آج کل کے زمانے میں وحشت ہی وحشت رہ گئی ہے۔ صحرا اور جنگل تو ختم ہو گئے ـــ یاروں نے بستیاں جو بسا لیں۔

اصل میں خطا میری ہی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو شروع ہی سے نکو بنائے رکھا۔ اگر نفسیاتی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور خود اعتمادی قائم رکھتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ کسی نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔ "گربہ کشتن روز اوّل۔" یعنی اگر پہلے ہی دن بلّی مار لی تو سمجھو ہو گئے فتح یاب۔ اب گزاریے زندگی شیر ببر بن کے۔ اور اگر چوک گئے تو بلّی کی طرح دوڑتے بھاگتے اور میاؤں میاؤں کرتے زندگی گزر جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ ذہن نشین رکھیے:

ایک صاحب کی شادی ہوئی اور انھوں نے سوچا پہلی ہی رات کو بلّی مار لوں تو زندگی بھر سر فخر سے اونچا رہے گا۔ لہٰذا دولھا میاں ایک ہاتھ میں ننگی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں بلّی لے کر حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ انھوں نے پہلے تو تلوار پر ڈیڑھ گھنٹے تک دھار رکھی اور جب ماحول پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تو بلّی فضا میں اچھالی اور ایک وحشیانہ آواز نکال کر بلّی پر وار کیا ـــ دولھا میاں ڈال ڈال تو بلّی پات پات ـــــ اس نے ایک جست لگائی اور ان کی دست رس سے نکل بھاگی۔ کبھی دولھا میاں آگے آگے، بلّی پیچھے پیچھے۔ کبھی بلّی آگے آگے اور دولھا میاں پیچھے پیچھے۔ غرض دولھا میاں اس کوشش میں نڈھال ہو کر گر گئے۔ تب دلہن نے گھونگھٹ کنارے رکھا اور ان کے ہاتھ سے تلوار لے کر بلّی پر ایسا وار کیا کہ بلّی تو بلّی اگر شیر بھی ہوتا تو چوں نہ کرتا ـــ بس اسی وقت سے تلوار بیوی کے ہاتھ میں ہے اور میاں "میاؤں میاؤں" کرتے پھر رہے ہیں۔

تو کنوارے نوجوانو! مدّعا یہ ہے کہ آپ خواہ کتنے ہی جواں مرد اور حوصلہ مند کیوں نہ ہوں "گربہ کشتن روز اوّل" والے مقولے پر عمل ہرگز مت کیجیے گا ورنہ ہوگا وہی جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ـ یعنی آپ پینترے بدلتے رہ جائیں گے اور بلّی ـــــ وہ کسی اور کی دست رس میں ہوگی۔ !!

□□

فیض احمد فیض .... صفحہ ۱۹ کا بقیہ

فیض شروع ہوتے ہیں غالب سے، پھر حسرت اور اختر شیرانی اور جوش و اقبال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے فیض ہی پر آکر ختم ہوتے ہیں۔ کوئے یار سے چلے تھے سوئے دار لیکن آگے نکل گئے۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو خالقِ کائنات نے اس مسیحائے انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن اس کا سفر انسانیت کا سفر جانب منزل امن و حریت ختم نہیں ہوا۔ جاری ہے۔ جاری رہے گا۔

□□

"رہ گزر" (نعت و تبصرہ) ـــــــــ صفحہ ۴۸ کا بقیہ

لیکن جس مقصد کے لیے یہ طرز اختیار کیا گیا ہے وہ اظہار میں شدّت لانے کے لیے ضروری تھا۔ جاوید عہد حاضر میں انسانیت کے زوال پر بے حد سنجیدہ نظر آتے ہیں ؎

جانے یہ کیسی بھول بھلیوں میں کھو گیا
انسان اب کہاں رہا، انسان تو گیا

ان کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زبان اور لہجہ وہ اختیار کیا ہے جس میں بچّوں جیسی معصومیت ہے، اس کے ساتھ ہی برمحل الفاظ کا انتخاب اتنا دل کش ہے کہ اپنی جانب فوراً توجہ مبذول کرا لیتا ہے۔ عموماً لوریاں سُنا کر بچّوں کو سُلایا جاتا ہے مگر جاوید لوریاں سُنا کر انسانوں کو جگاتے ہیں۔

ـــــــــ ناہید فرزانہ

□□

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: اُردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات
مصنّف: ڈاکٹر عامر ریاض ۔ قیمت: ۱۸۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: دانش محل ۔ امین آباد، لکھنؤ

"اُردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات" ڈاکٹر عامر ریاض کا گراں قدر تحقیقی مقالہ ہے، جسے انھوں نے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی نگرانی میں بڑی جاں فشانی کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے غزل سے یہ سوچ کر انحراف کیا تھا کہ اس کا نشاطیہ و غنائیہ لہجہ شاید انقلابات آمیز نعروں کا متحمل نہیں ہو سکے گا، جو ترقی پسندوں کا طرۂ امتیاز تھا، لیکن پھر بھی کچھ جیالوں نے غزل کی پُرانی لفظیات کو نئے معنی دیے اور کچھ نے اسی ڈکشن کو جو لفظوں میں برتا جا رہا تھا نیز انقلابی نعروں کا اعلامیہ تھا، غزل کا حصّہ بنا دیا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کے اثرات کے تحت غزل کا ایک نیا لہجہ وجود میں آیا جو فیض و مجروح کے یہاں ملتا ہے۔

ڈاکٹر عامر ریاض کی یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل صرف غزل، اس کی اصلاح اور اس کی تنقید سے متعلق ہے۔ باب دوم میں ترقی پسند غزل کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں مفکرین کے نظریات، موضوع و فن کے اعتبارات، ادب اور زندگی کے رشتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب سوم "ترقی پسند غزل آزادی سے قبل" ہے۔ اس میں انجمن ترقی پسند مصنّفین اور اس کی غرض و غایت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان شعراء کے فکر و فن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو ترقی پسندوں کے ہراول دستے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی فیض، فراق، مجروح، مخدوم، جاں نثار اختر وغیرہ۔ باب چہارم ہے "ترقی پسند غزل آزادی کے بعد"۔ اس میں سیاسی آزادی اور معاشی و اقتصادی ناہمواریوں کا غزل کے تعلق سے ذکر آیا ہے، اس باب میں نازش پرتاپ گڑھی، احتشام حسین، مظہر امام، سلیمان اریب، خلیل الرحمٰن اعظمی کے فکر و فن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ بابِ پنجم حرفِ آخر ہے جس میں ترقی پسند تحریک کے انحطاط، جدیدیت کے آغاز اور غزل پر اس کے اثرات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں "محاکمہ" کے عنوان سے ڈاکٹر عامر ریاض نے ایک طویل مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔

۲۵۲ صفحات پر مشتمل یہ تنقیدی مقالہ اس نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے کہ اس میں غزل کے تقریباً تمام ادوار موجود ہیں۔ اُردو غزل پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب یقیناً ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

——— عشرت ظفر

نام کتاب: "مرزا غالب"
مصنّف: ڈاکٹر نتالیا پری گارنا (ترجمہ: محمد اُسامہ فاروقی)
قیمت: ۱۴۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر۔ ایوانِ اُردو، پنجہ گٹا حیدر آباد

گارساں دتاسی سے شروع ہونے والی اہم کڑیوں میں نکلسن، اناّمیری شمل، ڈیوڈ میتھیوز، رالف رسل، مارگریٹ گریکو وغیرہ ہیں۔ ڈاکٹر نتالیا پری گارنا بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ انھوں نے اقبال کو اپنا تحقیقی موضوع بنایا تھا اور ان کی فلسفیانہ غنائی شاعری پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ پھر مئی ۱۹۹۵ء میں انھوں نے سبک ہندی اور فارسی ادبیات میں اس کا مقام" پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر پری گارنا کے نام سے بہت کم ہی لوگ واقف ہیں لیکن ان کے کارناموں کی فہرست پر جب نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ۳۵ برس سے وہ اُردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

زیرِ نظر کتاب جس کا عنوان "مرزا غالب" ہے، ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد نے شائع کی ہے۔ اصل کتاب روسی زبان میں تھی جس کا ترجمہ ڈاکٹر اُسامہ فاروقی نے اُردو میں براہِ راست روسی سے کیا ہے۔ ڈاکٹر اُسامہ فاروقی کے ترجمے پر وہی تبصرہ کرنے کا حق رکھتا ہے جو روسی زبان جانتا ہو لیکن عبارت میں جو روانی، سلاست، شستگی اور شائستگی ہے

اس کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بے حد کامیاب مترجم ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر نتالیا پری گارنا سے اردو دنیا کو متعارف کرایا۔

اصل کتاب چودہ عنوانات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر پری گارنا نے بڑے خوبصورت اور شاعرانہ انداز میں غالب کی شاعری کو پرکھا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس تاریخی تناظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے جس کی حیثیت غالب کی شاعری کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہے۔ دہلی کا بیان ہو یا آگرہ اور بنارس کا، یا پھر حیدر آباد کا، مصنفہ نے تاریخی حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ غالب کا نسب نامہ بھی بے حد دل چسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر پری گارنا نے ان امور پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف اردو میں ابھی توجہ نہیں کی گئی۔ مثلاً صفحہ ۵۶ پر یہ عبارت ملتی ہے:

"..... حال ہی میں اُن (غالب) کا سات سال کی عمر میں لکھا ہوا خط دستیاب ہوا۔ خط میں مکتوب نویسی کے تمام آداب اور حفظِ مراتب کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس میں سب سے دل چسپ چیز اس چھوٹی سی مہر کا نقش ہے جو کم سن مرزا کے لیے خاص طور سے بنوائی گئی تھی جو دستخط کا کام دیتی تھی۔ اس چہار پہلو مہر میں صاحبِ مُہر کا نام اور سنہ ۱۸۰۴ء کندہ ہے۔"

غالب کی جنسی زندگی یا ڈومنی سے ان کے عشق کا بیان بے حد شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی حقائق کو نظر انداز نہیں کرتا۔

اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ موصوفہ نے جس سے بھی استفادہ کیا ہے اس کا اعتراف کیا ہے۔ غالب کے فارسی کلام کی تفہیم کے لیے وہ ظ انصاری کی مرہونِ منت ہونے کا بھی اعتراف کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر پری گارنا نے حیدر آباد میں جن لوگوں سے استفادہ کیا ان میں انور معظم صاحب، غلام عمر خاں صاحب، محترمہ اشرف رفیع صاحبہ، ان کے شوہر ڈاکٹر مصطفےٰ فاطمی صاحب اور عالم خوندمیری مرحوم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر اُسامہ فاروقی کی یہ کاوش اس لیے بھی مستحسن ہے کہ اس سے قاری ایک اہم شخصیت کے علمی اور ادبی کارنامے سے واقف ہو جاتا ہے۔

——— ڈاکٹر منہاج احمد صدیقی

نام کتاب: "مُرقعِ اقبال"
مرتب: جگن ناتھ آزاد قیمت: ۲۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو۔ راؤز ایونیو
نئی دھلی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ماہرینِ اقبالیات میں ہیں۔ مذکورہ مجلہ میں انھوں نے حیاتِ اقبال کا تصویری جائزہ لیا ہے جو ۱۲۸ تصاویر پر مشتمل ہے۔ ان میں اقبال کے خاندان کے اہم افراد، ملک کی اہم علمی و ادبی شخصیتوں ـــــ سر راس مسعود، سید سلیمان ندوی وغیرہ کی تصاویر شامل ہیں۔ اقبال کی تصانیف کی اولین اشاعتوں کے سرورق کے ساتھ اقبال کی اُردو اور انگریزی تحریر کا عکس بھی موجود ہے۔ اقبال ان تصاویر میں مختلف موڈ اور مختلف کیفیتوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کی دو تصاویر پھولدار کپڑوں کی شیروانیوں میں ہیں ایک تصویر میں جو ۱۸۹۹ء کی ہے، ٹوپی کا پھندنا آگے ہے۔ ان تصاویر کے ساتھ دو بے حد اہم گوشے اقبال کا شجرۂ نسب اور توقیتِ اقبال کے عنوان سے ملتے ہیں۔ ابتدا میں دو صفحے کا ابتدائیہ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرقع پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعتِ سوم پیشِ نظر ہے۔

توقیتِ اقبال کے سلسلے میں بعض بے حد اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں مثلاً "نالۂ یتیم"۔ "ابرِ گہربار"۔ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی تاریخِ تخلیق متعین کر دی گئی ہے۔ البتہ اقبال کی ولادت کی تاریخ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۹ نومبر سنہ ۱۸۷۷ء درج کی ہے جبکہ پروفیسر اکبر حیدری نے دلائل کے ساتھ سنِ ولادت ۱۸۷۳ء متعین کیا ہے۔ اکبر حیدری کی دلیلیں اتنی مضبوط ہیں کہ اس سے انکار ممکن نظر نہیں آتا۔

"مُرقعِ اقبال" میں اگر اقبال کا سنِ ولادت بھی طے کر دیا گیا ہوتا تو یہ کتاب اور بھی اہم بن جاتی۔

مجموعی طور پر یہ کتاب بڑی معلوماتی اور دل چسپ ہے۔ جس کی پذیرائی ادبی حلقوں میں یقیناً ہوگی۔

——— اقبال اعجازی

نام کتاب : **آغائی صاحب** (سوانحی تالیف)
مصنف : عبدالحلیم شرر   قیمت : ۵۰/- روپئے
ترتیب جدید : مرزا تقی رضا ایڈوکیٹ
ملنے کا پتہ : الخطاط پرنٹرس ۔ امام باڑہ ناظم صاحب
وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

زیر نظر کتاب، سوانحی اور تاریخی ادب کا ایک نادر نمونہ ہے جو اُردو کے مشہور ادیب اور ناول نگار عبدالحلیم شرر لکھنوی کی تالیف ہے۔ شرر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، وہ اُردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی فہرست میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ کے ماحول، یہاں کی ثقافت اور تہذیب کی جس چابکدستی اور باریک بینی سے وہ عکّاسی کرتے تھے اس میں کوئی دوسرا ان کا مدمقابل نہیں۔

یہ کتاب گزشتہ لکھنؤ کی ایک مشہور شخصیت مرزا آغا علی خاں آغائی جنھیں لوگ سلطنت اَودھ کی جانب سے حاصل عہدۂ جلیلہ کی بنا پر "ناظم صاحب" کہتے تھے، کی سوانح حیات ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی، ۵۰ سال بعد مرزا تقی رضا ایڈوکیٹ متولی امام باڑہ ناظم صاحب نے اسے دوبارہ شائع کرایا ہے۔

کتاب عبدالحلیم شرر کے انداز نگارش کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے جس کا مطالعہ قاری کو اس ماحول میں پہنچا دیتا ہے جب سلطنتِ اودھ کا سورج غروب ہو رہا تھا اور برٹش حکومت ظلم و تشدد کی ایک نئی تاریخ کی ابتدا کر رہی تھی ۔ یہ معلومات افزا کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کیے۔

یہ کتاب اس دَور کے بدلتے ہوئے عبرت انگیز حالات، لکھنؤ کے اُمرا، شرفاء اور صاحبانِ ہنر کی کس مپرسی اور بدحالی کی تصویر کشی کے ساتھ آغائی صاحب مرحوم کی زمانہ شناسی اور باشندگان لکھنؤ کی حوصلہ مندی سے بھی واقف کراتی ہے۔ یقیناً آغائی صاحب مرحوم کی شخصیت اس پرآشوب اور یاس انگیز حالات میں باشندگانِ لکھنؤ کے لیے ایک شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی تھی ـــــ آج بھی ان کے "آثار" کتب خانۂ ناصری کھجوہ، مدرسۂ عالیہ ناظمیہ اور ناظم صاحب کے امام باڑے کی شکل میں موجود ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب، ایک تاریخی ماخذ ہونے کے علاوہ ماضی سے عبرت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔

ـــــــــ ڈاکٹر پیام اعظمی

نام کتاب: "**نوائے کبیر**"
ترجمہ: یوسف ناظم   قیمت: ۲۵/- روپئے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ۔ جامعہ نگر
دہلی ـ ۲۵

کبیر فہمی کے اس دَور میں جب مختلف زبانوں میں ان کے فکر و فلسفے پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے نیز ان کے مرتبے و مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اُردو کے معروف ادیب اور مشہور مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے برج بھاشا سے اُردو میں کبیر کا منظوم انتخاب کرکے اُردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ موصوف کی اس کوشش نے اُردو والوں کو کبیر کے افکار سے کچھ اور قریب کر دیا ہے۔

یوسف ناظم اس سے پہلے ارمغانِ سنسکرت بھرتری ہری اُردو میں شائع کر چکے ہیں جس سے ان کی بے پناہ صلاحیت اور علمی و فکری بصیرت کے نئے پہلو سے ہم سب روشناس ہوئے۔ بلاشبہ "نوائے کبیر" میں بھی یوسف ناظم کے جوہر کچھ اور نمایاں ہوئے ہیں۔ اُردو زبان میں کبیر کے اشعار کا ترجمہ انتہائی مؤثر اور برجستہ و سادہ ہے۔ مثلاً "بے خودی" کے عنوان سے یہ نظم دیکھیے :

خورشید و قمر چاروں طرف رقص کناں ہیں
آفاق میں نغموں کی صدا گونج رہی ہے
افلاک سے دھرتی پہ ہے انوار کی بارش
بھگتی کا نشہ دل میں لیے عاشقِ دلشاد
محبوب کی قربت کی تمنا میں گرفتار
خالق سے لگائے ہوئے لَو جھوم رہا ہے

"نوائے کبیر" یقیناً مقبول خاص و عام ہوگی۔

ـــــــــ شاذیہ کلیم

نام کتاب: "روشن افکار" (شعری مجموعہ)
شاعر: حفیظ محمود بلند شہری
قیمت: ۱۲۵/- روپے

حفیظ محمود بلند شہری اپنی کاروباری مصروفیات کے باوجود شعروادب سے خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور اچھے اشعار کہے ہیں لیکن حمد گوئی اور نعت گوئی سے انھیں خاص لگاؤ ہے اور ان کی نعتیہ شاعری میں عشق رسولؐ کا پہلو نمایاں ہے۔

"روشن افکار" حفیظ صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے انھوں نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ حمد، نعت، منقبت اور غزلوں پر مشتمل ہے۔

خداوند کریم کی عظمت کا ذکر وہ اپنے مجموعہ کلام میں حمد کے اس پہلے شعر میں اس طرح کرتے ہیں ؎

نام سے تیرے جو آغازِ سفر کرتا ہے
راہ دشوار بھی ہوتی ہے تو سر کرتا ہے

رسولِ مقبولؐ سے اپنے بے پناہ عشق کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

تم وجۂ کائنات تمھیں رحمتِ جہاں
تم سے ہے سب جہان وزمان ومکاں کا رنگ

حفیظ صاحب کی بعض غزلیں اچھی ہیں لیکن کچھ عامیانہ سی ہیں۔
امتِ مسلمہ کے سلسلے میں اپنے درد کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں ؎

جو پایا تھا کبھی قربانیوں میں
وہ کھویا ہم نے تن آسانیوں میں

حفیظ صاحب کو اللہ نے بے شمار مادی آسائشوں سے نوازا ہے لیکن انھیں بنی نوع انسان کے مصائب، دکھ اور کرب کا احساس رہتا ہے۔
ان کا شعری سفر اگر اسی طرح جاری رہا تو وہ یقیناً باذوق حضرات کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔

——— واصف رضا

نام کتاب: "شکن در شکن"
مصنفہ: شاہدہ صدیقی — قیمت: اسّی روپے
ملنے کا پتہ: بی ۱/۱۵۶ آر۔ڈی۔ایس۔او کالونی لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۱

شاہدہ صدیقی ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کے مضامین، بالخصوص انشائیے ملک کے مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی پہلی کتاب "گر تو بُرا نہ مانے" کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہو چکی ہے — "شکن در شکن" اُن کی دوسری کوشش ہے، اس میں ان کے (۳۰) انشائیے شامل ہیں۔

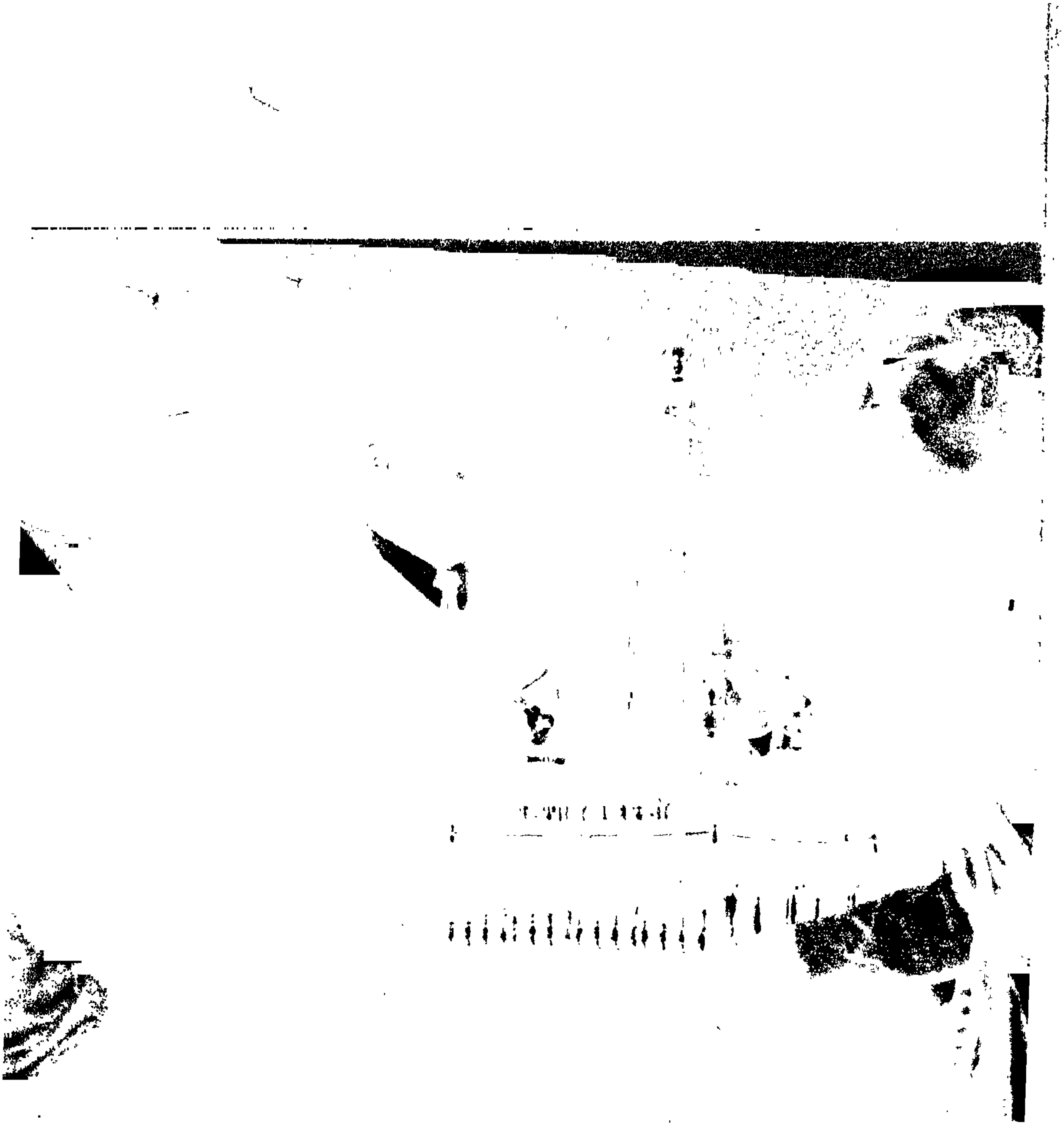
شاہدہ صدیقی کے انشائیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت آسان عام فہم اور سادہ زبان میں اس طرح لکھے گئے ہیں کہ قاری کی دل چسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ ان کے قابلِ ذکر انشائیوں میں عید قرباں تیرا جانا، اُدھار کھاتہ، جانے نیند کیوں آنے لگتی ہے، غلامی کی نشانی، لیڈیز پرس، ماڈرن لیٹریچر، آنٹی جی اور چوکیدار شامل ہیں۔

"شکن در شکن" میں جابجا کتابت کی غلطیاں بے حد کھٹکتی ہیں۔

——— عاصم قدوائی

نام کتاب: "رہ گزر" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر جاوید جمیل — قیمت: ۱۰۰/- روپے
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر جاوید جمیل۔ محلہ قاضی، سہارن پور (یو.پی)

ڈاکٹر جاوید جمیل کا شعری مجموعہ "رہ گزر" زندگی، انسانیت اور معاشرے کی انتہائی کربناک رہ گزر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید نے زندگی کی حقیقتوں کو شعری پیکر میں اس خوبی سے ڈھالا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔
ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار نظم کے زمرے میں آتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۶۰ پر)




نیا دور